طوفانی رات میں فرار

اے حمید



کمانڈو کی بیٹی

روبی نے فائر کرنے کے لئے اسٹین گن کی نالی کو ذرا نیچے کیا ہی تھا کہ شیر خان نے اس کا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا' "پاگل ہو گئی ہو؟" اس کو شیر خان کا سخت پنجابی لہجہ بہت برا لگا۔

روبی کی رگوں میں بھی پنجابی باپ کا خون دوڑ رہا تھا اس کی ماں انڈونیشیا کی تھی تو کیا ہوا روبی نے بھڑک کر اسٹین گن کا رخ شیر خان کی طرف کر دیا۔ "خبردار جو مجھے پھر پاگل کہا۔

شیر خان نے روبی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا' وہ اپنی اسٹین گن کی نالی سے آگے آئی ہوئی جھاڑی کی ٹہنی پرے ہٹا کر ٹیلے کی ڈھلان کے نیچے دیکھنے لگا' نیچے ایک پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ چھوٹی سڑک جا رہی تھی' سڑک کے کنارے سیکورٹی گارڈز کی جیپ کھڑی تھی' نیلی وردیوں والے سیکورٹی گارڈ جیپ کے پاس کھڑے پیچھے سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے جو آگے جا کر درختوں میں گم ہو گئی تھی روبی کی آنکھیں بھی ان سپاہیوں پر جمی تھیں' اس نے اپنی کشادہ پیشانی پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ کو جھٹک کر پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے کسی نے مخبری کر دی ہے' یہ ہمیں گھیرے میں لے رہے ہیں ان دو آدمیوں کو ہم آسانی سے ہلاک کر کے یہاں سے فرار ہو سکتے ہیں ان کی پوری پارٹی آ گئی تو جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔"

شیر خان نے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی پر الٹا ہاتھ پھیرا اور گہرا سانس بھر کر بولا۔

"یہ صرف دو نہیں ہیں' ان کے باقی آدمی ضرور آس پاس ہوں گے' تم صبر کرو۔"

روبی دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹتی ہوئی نیچے دیکھنے لگی' دونوں نوجوان تھے' دونوں کے خون گرم تھے' دونوں ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے تھے اور ایک دوسرے سے لڑتے بھی رہتے تھے' شیر خان کی عمر انیس بیس سال ہو گی مگر اس کے شانے چوڑے' قد نکلتا ہوا

جسم بھرا بھرا اور ورزشی تھا' وہ اپنی عمر سے زیادہ جوان لگتا تھا۔

روبی سولہ سترہ برس کی منہ زور ضدی قسم کی خوبصورت مگر سخت جان لڑکی تھی۔

یہ دونوں کون تھے؟ وہ کون سے حالات تھے جن کا شکار ہو کر یہ دو محبت کرنے والے زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے؟ یہ ساری باتیں میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا' ایک بات کی وضاحت میں ضروری سمجھتا ہوں چونکہ یہ ایک سچی داستان ہے اور اس کے کچھ کردار آج بھی پاکستان کے دور افتادہ علاقوں میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے نہ تو میں اس کہانی میں اپنی طرف سے کسی واقعے کا اضافہ کروں گا اور نہ ہی ان میں سے کسی بھی کردار کا اصل نام لکھوں گا' یوں سمجھ لیں کہ واقعات سب کے سب سچے اور جوں کے توں بیان ہوں گے' مقامات کو کہیں کہیں سے بدل دوں گا' عشق و محبت' غیرت و خودداری' سکون قلب اور نیکی و انسانیت کی راہ پر چلتے رہنے کی کوشش میں شیطانی طاقتوں سے جنگ کرنے کی یہ لرزہ خیز اور خون ریز داستان مجھے کس نے سنائی؟ میں آپ کو یہ بھی نہیں بتاؤں گا۔

شیر خان نے روبی کے بازو کو دباتے ہوئے نیچے اشارہ کیا' سیکورٹی فورس کے دونوں سپاہی جیپ کی طرف بڑھ رہے تھے' وہ جیپ میں سوار ہو گئے' جیپ اسٹارٹ ہوئی اور سڑک پر آگے کی طرف چل دی' جب سڑک خالی رہ گئی اور خطرہ بظاہر ٹل گیا تو شیر خان نے پہلو بدلا اور درخت کے ساتھ ٹیک لگا لی' اس جانب ٹیلے کی ڈھلان زیادہ گہری نہیں تھی' خودرو جنگلی جھاڑیاں اور درخت ہی درخت تھے' سورج کو بادلوں نے چھپا رکھا تھا' فضا میں حبس تھا' درختوں کے تنوں میں سے دور ایک بوسیدہ سے لکڑی کے کیبن کی کھپریل کی چھت نظر آ رہی تھی' جس کے برآمدے میں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پڑی تھی' شیر خان نے اپنی خاکی جیکٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور اس کا کش لگاتے ہوئے بولا۔

"شہاب اور فیروز کو اب تک آ جانا چاہئے تھا۔" اسٹین گن روبی کی گود میں تھی' اس نے شیر خان کے ہاتھ سے سگریٹ لے لیا' ایک گہرا کش لگا کر دھواں اڑاتے ہوئے بولی۔

"شیر خان کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

شیر خان اپنی گردن کھجانے لگا جہاں ابھی ابھی اسے ایک مچھر نے کاٹا تھا' اس کے

ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں ساری زندگی تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں روبی تاکہ تم سے محبت بھی کر سکوں اور لڑائی بھی کر سکوں"

روبی نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے سگریٹ شیر خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن جن حالات میں ہم زندگی گزار رہے ہیں ان حالات میں رہتے ہوئے تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہ ہو گا۔"

شیر خان نے روبی کو اپنے ساتھ لگا لیا' ہم جلد ہی اس جال سے نکل جائیں گے روبی' مجھے یقین ہے۔ روبی نے جسم کو جھٹک کر الگ کیا اور طنزیہ لہجے میں بولی۔

"تمہارا نام شیر خان ضرور ہے مگر تم میں شیروں والی کوئی بات نہیں۔" پھر اس نے شیر خان کے کندھوں پر اپنے کھردرے ہاتھ رکھ دیئے اور ہلکا سا جھٹکا دے کر بولی۔

"کیا ہم اس جال کو ابھی ...... اسی وقت نہیں توڑ سکتے؟"

یہ سارا علاقہ ہمارا جانا پہچانا ہے' ہم اسی سرزمین پر پیدا ہوئے ہیں' ہم فرار کا راستہ آسانی سے تلاش کر لیں گے۔"

شیر خان کی آنکھیں روبی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں' سولہ سترہ سال کی اس خوبصورت دوشیزہ کا چہرہ جرائم پیشہ ماحول میں رہتے ہوئے کرخت سا ہو گیا تھا' زردی مائل رنگت سنولانے لگی تھی' اس نے روبی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

"تم شہاب اور فیروز کو جانتی ضرور ہو مگر انہیں پہچانتی نہیں' یہ دو آدمی نہیں ہیں' یہ ایک بہت بڑا اور بہت خطرناک گروہ ہے' جس کا جال اس ملک میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے تقریباً ہر ملک میں پھیلا ہوا ہے۔" روبی کو غصہ آ گیا۔

"تو کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟"

"نہیں! ایسی بات نہیں ہے' میں مناسب موقع کا انتظار کر رہا ہوں' جب وہ موقع آ گیا تو تم دیکھ لینا کہ ہم اس مکروہ اور انسانیت سوز ماحول سے نکل چکے ہوں گے' ابھی کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو اس کا انجام سوائے ہم دونوں کی موت کے اور کچھ نہیں ہو گا اور میں حرام موت نہیں مرنا چاہتا۔" شیر خان نے کہا۔

روبی نے ناپسندیدگی کے اظہار میں کندھے اچکاتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا'

اتنے میں دور سے جیپ کی آواز آئی' شیر خان اور روبی اٹھ کھڑے ہوئے اور کیبن کی طرف چل دیئے' جیپ درختوں کے درمیان بنے ہوئے کچے راستے سے نکلتی ہوئی کیبن کے سامنے آکر رک گئی' اس میں شہاب اور فیروز سوار تھے' یہ دونوں بھی نوجوان ہی تھے مگر چہروں سے کرختگی اور سنگ دلی ٹپکتی تھی' انہوں نے شیر خان اور روبی کو کیبن کی طرف آتے دیکھا تو فیروز نے شیر خان سے کہا۔

"جلدی سے آکر مال اندر رکھواؤ ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہرنا' سیکورٹی پولیس نے اسی علاقے کو مارک کر لیا ہے۔"

شیر خان قریب آکر بولا۔"ہم نے ان کی جیپ نیچے سڑک پر دیکھی تھی۔ فیروز نے شہاب کی طرف دیکھا اور اسٹین گن کاندھے سے نکالی۔ شہابو میری اطلاع غلط نہیں تھی' جتنی جلدی ہو سکے مال لگا کر یہاں سے نکل چلو۔ روبی جیپ کے پاس کھڑی بے تعلقی کے انداز میں ان کی طرف دیکھ رہی تھی فیروز اسے گالی دیتے دیتے رک گیا' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ روبی ایسی لڑکی نہیں ہے جو اس کی گالی کے جواب میں خاموش رہے' پھر بھی وہ اس پارٹی کا سرغنہ تھا اور اسے ہر حالت میں اپنا دبدبہ برقرار رکھنا تھا' وہ کڑک کر بولا۔

"تم کیا تک رہی ہو وہاں کھڑی' مال اٹھواؤ ان کے ساتھ۔"

روبی کے چہرے پر نفرت کے اثرات نمایاں ہو گئے' مگر وہ خاموش رہی اور شیر خان شہاب وغیرہ سے مل کر پلاسٹک کے بڑے تھیلے میں رکھے مال کو کیبن میں لے جانے لگی' پلاسٹک کے ان تھیلوں میں بڑی اعلیٰ قسم کی کوکین بھری ہوئی تھی جسے ان لوگوں کو وہاں سے پچاس میل دور ساحل سمندر کی ایک ویران جگہ پر جنوب مشرقی ایشیا کے ایک دوسرے گروہ کے سرغنہ کے حوالے کر کے اسی سے رقم وصول کرنی تھی' یہ رقم بیس لاکھ ڈالر تک پہنچتی تھی۔

شہاب اور فیروز اس انسان دشمن دھندے کے مختار کل نہیں تھے' وہ ایک بہت بڑے گروہ کے آلہ کار تھے جس کا جنوبی سمندروں کے سارے علاقے پر کنٹرول تھا اور عرصے سے یہ ناپاک دھندا چل رہا تھا' اس گروہ میں بحر ہند اور اس سے ملحق سمندروں کے ممالک

کے ارب پتی تاجر بھی شامل تھے جن کا اصل کام منشیات کی سپلائی کرنا تھا' شہاب اور فیروز کو لاکھوں روپوں کی صورت میں کمیشن ملتی تھی' جس میں سے وہ کچھ ہزار شیر خان اور روبی کو ادا کرتے تھے۔

روبی اور شیر خان کو ان دونوں نے ایک طرح سے پھانس رکھا تھا' شیر خان کے ماں باپ فوت ہو چکے تھے' وہ پنجابی والدین کا بیٹا تھا جو پنجاب سے لنکا آکر آباد ہو گئے تھے' شیر خان کی پیدائش بھی لنکا کے ایک شہر میں ہی ہوئی تھی' وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا ابھی نو عمر تھا کہ پہلے باپ کا انتقال ہوا اور کچھ دنوں بعد ماں بھی اللہ کو پیاری ہو گئی' شیر خان کی پرورش اور نگہداشت کرنے والا کوئی نہیں تھا' وہ ادھر ادھر موٹر گیراجوں اور ریستورانوں میں چھوٹی موٹی مزدوری کرنے لگا' اٹھارہ انیس برس کا ہوا تو اس پر فیروز اور شہاب کی نظر پڑ گئی وہ اسے روپے پیسے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ لے گئے' یہاں آکر جب شیر خان کو پتا چلا کہ اسے ایک مکروہ دھندے میں الجھا لیا گیا ہے تو وہ بھاگ نکلا' لیکن شہاب اور فیروز کے آدمی جزیرہ نما میں بلکہ اس کے باہر کے علاقوں میں بھی پھیلے ہوئے تھے' شیر خان بہت جلد پکڑ لیا گیا' تب شیر خان پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ وہ سر سے پاؤں تک دلدل میں دھنس چکا ہے۔

چند ماہ بعد اس کی ملاقات روبی سے ہوئی اور وہ پہلی ہی نظر میں اس سرکش منہ زور دوشیزہ کا اسیر ہو گیا' روبی کی ماں انڈونیشیا کی رہنے والی تھی اور پنجابی باپ سماٹرا میں کانسٹیبل تھا ماں باپ کے مرنے کے بعد روبی بھی نوجوانی میں ہی اکیلی رہ گئی' وہ تعلیم حاصل نہ کر سکی تھی' وہ بھی جرائم پیشہ لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی اور پھر ایک دن فیروز اور شہاب کے جال میں آن پھنسی' وہ بھی شیر خان سے محبت کرتی تھی اور ایک بار دونوں اکٹھے فرار بھی ہوئے مگر ساحل سمندر تک پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ لیے گئے' شہاب اور فیروز نے انہیں سخت اذیتیں دیں اور کئی دن تک بھوکا رکھا' پھر ان پر دو ٹوک الفاظ میں واضح کر دیا کہ وہ جب تک زندہ ہیں ان کے جال سے نہیں نکل سکتے' روبی اور شیر خان نے عارضی طور پر فیروز اور شہاب کے گروہ سے سمجھوتہ کر لیا تھا مگر اندر ہی اندر وہ اسی مکروہ دھندے سے نجات حاصل کرنے کے موقعے کی تلاش میں تھے۔

جنگل کے بوسیدہ کیبن کی واحد کھڑکی بند کر دی گئی تھی اور فیروز تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے خفیہ سوراخ میں سے جھانک کر باہر دیکھ لیتا تھا' شہاب' شیر خان اور روبی پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں کوکین کا پاؤڈر بند کر رہے تھے' انہوں نے تھیلیوں کو کمر کے گرد باندھنے والی چار پٹیاں تیار کر لیں' ایک ایک پٹی ان سب نے کپڑوں کے نیچے اپنی اپنی کمر کے ساتھ باندھ لی' جو مال بچ گیا شہاب نے اسے کیبن کے نیچے تہہ خانے میں چھپا دیا' وہ تیزی سے کیبن سے نکل کر جیپ میں سوار ہوئے اور جیپ جنگل میں آگے کی طرف چل دی' شہاب خود جیپ چلا رہا تھا' شہر میں ان دونوں نے لاکھوں روپے کاروبار میں لگا رکھے تھے۔ شہر کے مضافات میں ایک ایک فارم بھی خریدا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی لاکھوں ڈالر ان کے حساب میں بینکوں میں جمع تھے۔ شیر خان اور روبی کو جو کمیشن ملتی تھی ان کا کھاتہ بھی شہاب اور فیروز نے شہر کے ایک بینک میں کھلوا رکھا تھا اور کمیشن بینک میں ان کے حساب میں جمع کرا دی جاتی تھی۔

شیر خان اور روبی انگریزی اور سنہالی زبانوں میں اپنے ٹیڑھے میڑھے دستخط کر لیتے تھے' سنہالی وہ روانی سے پڑھ لکھ اور بول لیتے تھے مگر انگریزی کا کوئی کوئی لفظ ہی اٹھا سکتے تھے۔

جیپ جنگل میں اونچے نیچے پتھریلے راستوں سے گزرتی ساحل سمندر کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی' فیروز اگلی سیٹ پر شہاب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ جب کہ روبی اور شیر خان پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے' ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں اور عقابی نظریں آس پاس کے جنگل کا جائزہ لے رہی تھیں' انہیں خطرہ تھا کہ کہیں سے سیکورٹی پولیس کی پارٹی نکل کر ان

پر فائرنگ نہ شروع کر دے۔ مگر پولیس پارٹی ادھر نہ آئی اور یہ لوگ جنگل پار کر کے وقت سے کچھ پہلے ہی ساحل سمندر پر پہنچ گئے۔ شہاب نے جلدی سے جیپ ایک طرف جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑی کی اور باہر نکل کر ماحول کا جائزہ لیا' بھوری اور سیاہ چٹانیں کنارے کے ساتھ ساتھ دور تک چلی گئی تھیں' شہاب نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور فیروز سے کہا۔

"ہم کچھ پہلے آ گئے ہیں۔"

"ہم اتنی دیر میں مال لگا لیتے ہیں۔" فیروز نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر شہاب نے شیر خان اور روبی کو بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہاں جھاڑیوں کے درمیان زمین میں ایک بڑا گڑھا بنا ہوا تھا۔ انہوں نے جیپ میں سے پلاسٹک کا بڑا تھیلا نکالا اور گڑھے میں بیٹھ کر کمر کے گرد لپٹی ہوئی پٹیاں کھولیں اور کوکین کی تھیلیوں کو بڑے تھیلے میں ڈالنے لگے۔ جب پلاسٹک کا تھیلا بھر گیا تو فیروز نے نائیلون کی رسی سے اس کا منہ بند کر کے ایک طرف رکھ دیا شہاب نے ایک بار پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"ابھی آدھا گھنٹہ رہتا ہے وانگ کے آنے میں۔" پھر متفکر نگاہوں سے گڑھے میں سے نکل کر جنگل میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اس کو ابھی تک خطرہ تھا کہ سیکورٹی گارڈ کے سپاہی ضرور ان کی کھوج میں ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کے آنے سے پہلے وہ مال وانگ کے حوالے کر کے اس سے دو کروڑ ڈالر کی رقم وصول کر کے جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے نکل جائیں۔ مال دے کر انہوں نے ہمیشہ ڈالر کرنسی کی شکل میں رقم وصول کی تھی' چونکہ ہر پارٹی اسی مکروہ دھندے کی وجہ سے بے حد عیش و آرام کی بلکہ عیاشی کی زندگی بسر کر رہی تھی اس لئے کاروبار میں کسی طرف سے بھی بددیانتی نہیں کی جاتی تھی۔

شہاب نے شیر خان اور روبی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم مال کے پاس ٹھہرو' فیروز تم میرے ساتھ آؤ ہو سکتا ہے وانگ کے آدمی چٹانوں کی دوسری طرف بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے ہوں۔" شیر خان اور روبی وہیں گڑھے میں بیٹھ گئے۔

شہاب اور فیروز گڑھے سے نکل کر ساحل سمندر کی طرف چل دیئے۔

روبی گڑھے کی دیوار سے ٹیک لگائے اس طرح بیٹھی تھی کہ اسٹین گن اس کی گود میں تھی' اس کے ہونٹوں کے اوپر پسینے کے موتی چمک رہے تھے' شیر خان بھی وہیں قریب ہی نیم دراز تھا اور اسٹین گن اس نے اپنے سینے پر رکھی ہوئی تھی' روبی نے اپنے گھٹنے پر بیٹھے ہوئے مچھر کو کچلتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

"شیر خان! ہم جس موقع کی تلاش میں ہیں وہ موقع کبھی آئے گا بھی کہ نہیں؟ بول میرے یارا۔"

شیر خان نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور گھاس کے تنکے سے دانتوں کو کرید رہا تھا۔ ویسے ہی آنکھیں بند کئے ہوئے بولا۔

"خدا جانتا ہے کہ ہم اس مکروہ دھندے میں پھنسا دیئے گئے ہیں۔ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا' ہماری نیت صاف ہے۔"

"نیت صاف ہونے سے کیا ہو گا؟ ہمیں خود بھی ہمت کرنی ہو گی۔"

شیر خان نے خاکی کپڑے کا ہیٹ اپنی آنکھوں پر کر لیا۔

"گھبراؤ نہیں روبی' موقع آلینے دو۔"

روبی نے اسٹین گن کی نال تڑپ کر شیر خان کی گردن میں چبھو دی اور غصے میں کہا۔

"میں تمہاری اس بک بک سے تنگ آگئی ہوں' برسات گزرنے کے بعد تم نے کوئی ہاتھ پاؤں نہ مارے تو میں تمہیں چھوڑ کر اکیلی بھاگ جاؤں گی' پھر مجھے تلاش کرتے پھرنا۔"

شیر خان نے کوئی حرکت نہ کی' اس طرح نیم دراز آنکھوں پر ہیٹ آگے کیے پڑا رہا' صرف چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ہاتھ بڑھا کر روبی کا بازو تھام لیا اور بولا۔

"میں تیرا مرزا جٹ ہوں روبی' تو میری صاحباں ہے۔ تو جہاں بھی ہو گی میں اٹھا کر لے آؤں گا۔ پھر وہ دبی ہوئی آواز میں گنگنانے لگا۔

چڑھدے مرزے خان نوں
جٹ و بھل ویندا مت
بھٹ رناں دی دوستی
تے کھری جناں دی مت

روبی نے شیر خان کو ایک بے ضرر سی گالی دی اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اتنے میں مشین گن کے برسٹ کے فائر کی آواز سے جنگل گونج اٹھا' شیر خان اور روبی تیزی سے اٹھے اور گڑھے کے باہر سر نکال کر دیکھنے لگے۔ مشین گن کی فائرنگ مسلسل ہو رہی تھی یہ آوازیں ساحل سمندر کی طرف سے آرہی تھیں' دونوں گڑھے سے باہر نکلے اور جھک کر سمندر کی جانب دوڑے

جس وقت سیکورٹی گارڈ کی پارٹی نے شہاب اور فیروز کو دیکھا کہ وہ ساحلی چٹان کے درمیان ان کی مشین گنوں اور کلاشنکوفوں کی زد میں آگئے ہیں تو انسپکٹر کے حکم سے فائرنگ شروع کر دی گئی' انہیں یہ آرڈر تھا کہ کسی بھی اسمگلر کو ہلاک نہ کیا جائے' بلکہ زندہ حالت میں گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ پوچھ گچھ سے گروہ کے باقی لوگوں کا پتا چلایا جا سکے' پولیس شہاب اور فیروز کے سروں کے اوپر اور دائیں اور بائیں فائرنگ کر رہی تھی' شہاب اور فیروز ایک دم بیٹھ گئے اور انہوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی مگر سیکورٹی پولیس چٹانوں اور درختوں کی آڑ میں تھی۔

انسپکٹر نے اسپیکر پر سنہالی ہندوستانی اور انگریزی زبان میں باری باری اعلان کیا کہ تم چاروں طرف سے گھیرے میں لے لئے گئے ہو تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ہتھیار پھینک کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔ شہاب اور فیروز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا انہیں بھی اوپر سے ہدایت تھی کہ اگر کبھی ایسا موقع آجائے تو مال ضائع کر دو یا چھوڑ دو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو' کیونکہ اوپر والے لوگوں کا ہر جگہ اثر و رسوخ تھا' لاکھوں ڈالر کی رشوت چلتی تھی۔ ہر محکمے میں ان کے آدمی موجود تھے۔ جن کو ماہانہ ملتا تھا اور وہ اپنے آدمیوں کو چھڑا لیتے تھے' چنانچہ شہاب اور فیروز نے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا دیئے' اس وقت روبی اور شیر خان ایک درخت کی اوٹ میں سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے' روبی نے آہستہ سے کہا۔

"یہ دونوں پکڑے گئے ہیں وہ مال کی نشاندہی نہیں کریں گے' یہ موقع ہے شیر خان بھاگ چلو۔"

شیر خان کے دماغ میں بھی جیسے بجلی سی چمکی' موقع آگیا تھا' جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ کم

از کم شہاب اور فیروز اب ان کی تلاش میں ان کے پیچھے نہیں آسکیں گے۔ شیر خان نے روبی کا ہاتھ پکڑا اور دونوں درختوں سے نکل کر پیچھے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے، جنگل میں ایک طرف ان کی جیپ کھڑی تھی، شیر خان نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور کہا۔

"ہم جیپ نہیں لیں گے، سیکورٹی پولیس گاڑی کی آواز سن کر ہمارے پیچھے لپکے گی اور ہم بھی پکڑ لیے جائیں گے۔"

انہوں نے جیپ وہیں چھوڑی اور جنگل میں مشرق کی طرف دوڑ پڑے، راستے میں وہ گڑھا آگیا جس کے اندر کوکین کی تھیلیوں سے بھرا ہوا پلاسٹک کا بڑا لفافہ ویسے ہی پڑا تھا۔ روبی نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا اور شیر خان کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا اور کہا۔

"شیر خان! یہ تھیلا سیکورٹی والوں کے ہاتھ آگیا تو وہ بھی اسے فروخت کر دے گی اور نہ جانے کس کس نوجوان کا مستقبل تباہ ہو گا، اسے آگ لگا دیتے ہیں۔ اس طرح یہاں آگ دیکھ کر پولیس کی توجہ اس طرف ہو جائے گی اور ہم نکل جائیں گے۔"

انہوں نے سوکھی جھاڑیاں اور سوکھے پتے جمع کر کے تھیلے پر رکھے اور شیر خان نے سگریٹ لائیٹر جلا کر آگ لگا دی، اس کے ساتھ ہی وہ گڑھے سے باہر نکلے اور جتنی تیزی سے بھاگ سکتے تھے بھاگنے لگے۔

itsurdu.blogspot.com

سیکورٹی پولیس کے انسپکٹر نے شہاب اور فیروز کو ہتھکڑیاں لگا کر پولیس وین میں بند کیا اور حکم دیا کہ انہیں ہیڈ کوارٹر لے جاؤ اور خود علاقے کی تلاشی لینے سپاہیوں کے ساتھ جنگل میں داخل ہوا، اچانک ایک طرف آگ کے شعلے نظر آئے وہ اس طرف دوڑے ان کے آنے تک کوکین کا تھیلا جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ فضا میں کوکین کے پاؤڈر کی مخصوص بو پھیلی ہوئی محسوس کرتے ہی انسپکٹر نے اپنے آدمیوں کو دوسری طرف جانے کا اشارہ کیا انہیں بہت جلد شہاب اور فیروز کی جیپ بھی مل گئی جس میں باقی ماندہ کوکین کی تھیلیاں لکڑی کے باکس میں محفوظ تھیں، انسپکٹر نے اسے اپنی تحویل میں لیا اور ساحل سمندر پر گھات لگا کر اس پارٹی کا انتظار کرنے لگے، جنہیں یہ مال سپلائی کرنا تھا مگر وانگ کا ایک آدمی حسب دستور پہلے سے موقع پر آگیا تھا جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے شہاب اور فیروز کو گرفتار ہوتے اور سیکورٹی پولیس کی گاڑیوں کو کھڑے دیکھ لیا تھا اس نے واپس جا کر وانگ

کو خبر کر دی کہ چھاپہ پڑ گیا ہے اور وانگ وہیں سے اپنی لانچ میں واپس چلا گیا۔

آخر وہ دن آگیا تھا جس دن کا شیر خان اور روبی کو ایک عرصے سے انتظار تھا، وہ پنجرہ توڑ کر نکل گئے تھے، مگر ابھی وہ شہاب فیروز اور اس کے اوپر والے خطرناک گروہ کے جال سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے تھے۔ اس حقیقت کی ان دونوں کو بھی پوری طرح خبر تھی لیکن انہوں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اب نہیں تو پھر کبھی بھی نہیں۔

انہیں کس طرف جانا تھا؟ ان باتوں کا انہیں پوری طرح علم تھا پہلے وہ مغرب کی طرف چلتے گئے۔ جب راستے میں ایک دریا آیا تو اس کا رسوں کا پل عبور کر کے انہوں نے اپنا رخ جنوب مغرب کی طرف کر لیا یہاں انہیں تھوڑی دور تک چلنے کے بعد چھوٹی سی پکی سڑک مل گئی۔

روبی اور شیر خان پکی سڑک پر نکل آئے۔ سڑک کی دوسری طرف اترنے پر درختوں میں گھرا ہوا ایک پرانا ایک منزلہ مکان تھا جس کے باہر دو پرانی جیپیں کھڑی تھیں۔ یہ شہاب اور فیروز کا ایک اڈہ تھا جہاں سے مال آس پاس کے علاقوں میں اپنے خفیہ آدمیوں کے ذریعے تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہاں کے آدمی شیر خان اور روبی کو پہچانتے تھے، شیر خان نے انہیں بتایا کہ آگے چھاپہ پڑ گیا ہے اور شہاب اور فیروز پکڑ لئے گئے ہیں۔ مال ہم نے جلا دیا ہے اور اب ہمیں جیپ چاہئے تاکہ شہر والے اڈے پر جا کر سیٹھ کو خبر کریں تاکہ ان دونوں کی ضمانت کا بندوبست ہو سکے۔ اگرچہ وہاں پر ٹیلی فون موجود تھا مگر یہ لوگ اس قسم کے معاملات میں خفیہ الفاظ میں بھی فون پر بہت کم باتیں کیا کرتے تھے ان لوگوں کے لئے شیر خان اور روبی کوئی اجنبی نہیں تھے۔ ان دونوں کو فوراً جیپ مہیا کر دی گئی، وہ دونوں وہاں منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوئے اور شہر کی طرف روانہ ہو گئے اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ ان کی جیپ جزیرے کے جنوب مغربی ساحلی شہر میں داخل ہو گئی۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں سیٹھ سے ہرگز ہرگز ملاقات نہیں کرنی ہے۔ انہوں نے جیپ کا رخ اپنے چھوٹے سے بنگلے کی طرف کر دیا۔ یہ بنگلہ سمندر کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں ایک ٹیلے پر بنا تھا یہاں ایک نوکر اور نوکرانی ہروقت موجود رہتے تھے انہوں نے شیر خان اور روبی کو آتے دیکھا تو جلدی سے بنگلے کا گیٹ کھول دیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں کمرے میں بیٹھ گئے اور وہاں سے فرار کے منصوبے پر غور کرنے لگے۔

"ایک بات طے ہے کہ ہماری منزل پاکستان ہے۔ پاکستان ہمارا آزاد اسلامی وطن ہے۔ ہم وہاں جا کر ایک نئی زندگی شروع کریں گے' میرے ماں باپ اور تمہارے والد پاکستان ہی سے بغرض تجارت اس ملک میں آئے تھے اور ہم دو بار خود بھی پاکستان کی سیر کر چکے ہیں اب وہاں جانے کے دو ہی ذریعے ہیں۔ ایک بحری جہاز اور دوسرا ہوائی جہاز اگر ہم نے ان میں سے کوئی بھی ذریعہ استعمال کیا تو ہمیں دیکھ لیا جائے گا۔ کیونکہ تم بھی خوب جانتی ہو کہ ائر پورٹ اور بندرگاہ پر بڑے سیٹھ اور شہاب اور فیروز کے خاص جاسوس چوبیس گھنٹے موجود رہتے ہیں اور وہ اپنے آدمیوں کی نگرانی کرتے ہیں اور مال کے لے جانے لانے والوں کو بھی سہولت مہیا کرتے ہیں۔ یہ سارے آدمی ہم دونوں کو جانتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی ہمیں دیکھ لیا تو وہ ایک منٹ گزرنے سے پہلے پہلے ہمیں وہاں ڈھیر کر دیں گے۔ ہم انہیں جل بھی نہیں دے سکتے کیونکہ جزیرے میں سے گروہ کے جس آدمی کو ملک سے باہر جانا ہوتا ہے اس کی اطلاع باقاعدہ سب سے پہلے بندرگاہ اور ائر پورٹ پر ان لوگوں کو پہنچا دی جاتی ہے۔"

"تم بات مختصر کرو' یہ بتاؤ کہ ان کے علاوہ ہمارے پاس یہاں سے نکلنے کا کونسا راستہ ہے؟"

شیر خان نے پیالی میز پر رکھ دی اور بولا۔

"صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہم انڈیا اور تھائی لینڈ کے درمیان گرم مسالوں اور جواہرات کی اسمگلنگ کرنے والوں سے مدد حاصل کریں ان کی لانچیں راتوں کو ملک برما کی طرف بھی جاتی ہیں۔ میں کچھ آدمیوں کو جانتا ہوں ان کو تھوڑی سی رقم دے کر ہم برما پہنچ سکتے ہیں' وہاں سے پاکستان جانا مشکل نہ ہو گا۔"

روبی اٹھ کر کھڑکی کے پاس گئی باہر چاندنی میں سمندر کی پر سکون لہریں ساحل کی ریت پر آہستہ آہستہ بازو کھولے چلی آ رہی تھیں' اس نے پردہ گرا دیا اور شیر خان کی طرف پلٹ کر بولی۔

"تو پھر کس بات کا انتظار ہے۔ آج ہی رات یہاں سے نکل چلتے ہیں۔" شیر خان بولا۔

"تم بھول رہی ہو کہ یہاں کے بینک میں ہم دونوں کی کچھ رقم جمع ہے۔ ہمیں وہ رقم کراچی کی کسی شاخ کو منتقل کروانی ہو گی۔"

روبی نے جھڑک کر کہا۔

"یہ حرام کی کمائی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ پاکستان نہیں لے جاؤں گی۔ ہمیں پاک صاف ضمیر کے ساتھ پاکستان میں نئی زندگی شروع کرنی چاہیے۔ اگر تم یہاں سے ایک پائی بھی پاکستان اپنے ساتھ لے گئے تو میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی۔"

شیر خان سوچ میں پڑ گیا۔ بینک میں اس کی کافی رقم جمع تھی وہ اپنے موقف کے جواز میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ روبی نے غصیلی آواز میں کہا۔

"مت بھولو کہ یہ رقم ہم نے کوکین فروخت کرنے کے عوض میں بطور کمیشن پائی ہے اور جو کوکین ہمارے ہاتھوں سے نکل کر دوسرے شہروں میں پہنچی ہے اس نے نہ جانے کن کن گھرانوں کو تباہ و برباد کر دیا ہو گا۔ کیسے کیسے ہونہار طالب علموں کے مستقبل کو تباہ و برباد کر دیا ہو گا۔ ہمیں یہ رقم غریبوں میں بانٹ دینی چاہیے شاید اسی طرح خدا ہمارے گناہ معاف کر دے۔"

شیر خان کے ذہن میں یہ بات آ گئی۔ اس نے کھڑے ہو کر روبی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے گرم جوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

"روبی! قسم ہے کہ میں بھی تمہاری طرح اپنے جمع شدہ سرمائے میں سے سوائے سفر خرچ کے ایک پائی نہیں نکالوں گا ہم یہ ساری رقم یہاں کے ایک فلاحی ادارے کو دے دیں گے۔"

روبی مسکرائی' شیر خان نے شاید پہلی بار روبی کے چہرے پر ایک نورانی روشنی دیکھی تھی' روبی نے اسے بتایا اس وقت یہی نورانی روشنی شیر خان کے چہرے پر بھی ابھر آئی تھی' سچ ہے نیکی کرنے سے تو جو اجر ملتا ہے سو ملتا ہی ہے۔ لیکن نیکی کرنے کے خیال سے ہی انسان کی روح ایک بار روشن ہو جاتی ہے۔ اگلے دن روبی اور شیر خان نے ٹیلی فون پر بینک میں جمع اپنے کل سرمائے کا حساب لگوایا اور پھر انہوں نے ساری رقم بینک سے نکلوانے کی

بجائے صرف سفر خرچ کے طور پر بیس ہزار امریکی ڈالر نکلوا لیے اور باقی کی ساری رقم کے دو چیک روبی اور شیر خان نے اسی شہر کے ایک فلاحی ادارے کو خود جا کر دے دیئے جو اس علاقے میں جذام کے مریضوں کے علاج کے لئے کام کر رہے تھے۔ اس کے بعد شیر خان نے شہر سے شمال کی جانب اسی ملک کے آخری بندرگاہی شہر کے واسطے ہوائی جہاز کے دو ٹکٹ خریدے اور بنگلے پر آ گیا۔

ان کی فلائیٹ کا وقت شام پانچ بجے تھا۔ ٹھیک چار بجے شہر کے گینگ کے سرغنہ بڑے سیٹھ کا فون آیا۔ شیر خان نے ریسیور اٹھایا سیٹھ نے شہاب اور فیروز کی گرفتاری کے بارے میں دریافت کرتے ہوئے سخت الفاظ میں شیر خان کی سرزنش کی کہ وہ سیدھا اس کے پاس اطلاع کرنے کیوں نہیں آیا شیر خان فون اٹھا کر غلطی کر بیٹھا تھا مگر وہ گھبرایا بالکل نہیں اس نے کہا۔

"سیٹھ میں ابھی وہاں سے لوٹا ہوں۔ آپ کی طرف خود آ رہا تھا۔ جنگل والے سینٹر پر میں نے خبر کر دی تھی۔"

"جلدی پہنچو میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" سیٹھ نے غصیلی آواز میں یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

روبی شیر خان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شیر خان نے دانت پیستے ہوئے ریسیور زور سے رکھ دیا۔ روبی اپنی مردانہ جیکٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے بولی۔

"اس سور کو شوٹ کر کے جانا چاہئے تھا۔ نہ جانے اس کی وجہ سے کتنے گھرانے تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔"

پھر پلٹ کر اس نے شیر خان کی طرف دیکھا۔ روبی کی آنکھوں میں بجلیاں سی چمک رہی تھیں، کہنے لگی۔

"شیر خان کیوں نہ اس بدکار ناپاک سیٹھ کو قتل کر کے یہاں سے جائیں؟ یہ کام میں کر لوں گی۔" شیر خان اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"ان باتوں کو چھوڑو اور جلدی سے اپنا بریف کیس تیار کرو ہمیں ابھی ائر پورٹ بھی پہنچنا ہے جو کافی دور ہے۔"

شیر خان نے نوکر اور نوکرانی سے یہی کہا کہ ہم ایک ضروری کام پر جا رہے ہیں دو ایک دن میں واپس آ جائیں گے۔ نوکر ان باتوں کے عادی تھے ایک کام شیر خان نے اور کر رکھا تھا جس کی خبر اس نے روبی کو نہیں دی تھی۔ اس نے اپنے بنگلے کو اپنے بوڑھے سنہالی نوکر کے نام منتقل کر دیا تھا اور اس کے باقاعدہ کاغذات بھی تیار کروا لیے تھے۔ جاتے ہوئے اس نے لفافہ بوڑھے نوکر کے حوالے کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"یہ میرے جانے کے بعد کھولنا۔"

روبی اس وقت جیپ کی طرف جا رہی تھی شیر خان بھی جیپ میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہ اس کی اپنی جیپ تھی جو کافی پرانی تھی، مگر اس کا انجن بہترین حالت میں تھا، شیر خان نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے بنگلے کے احاطے سے نکال کر آگے لے گیا۔ سڑک کی طرف گھومتے ہوئے اس نے اپنے بنگلے پر آخری الوداعی نگاہ ڈالی اور پھر جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ آدھے گھنٹے میں ائر پورٹ تک کا راستہ طے ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ سیٹھ نے اس دوران اس کے بنگلے پر فون کیا ہو گا شیر خان نے دونوں نوکروں کو سمجھا دیا تھا کہ سیٹھ کا فون آئے تو اسے کہیں کہ وہ ان کی طرف آ رہے ہیں پھر بھی سیٹھ کو شک پڑ سکتا تھا۔ اس لئے ائر پورٹ پر پہنچتے ہی شیر خان نے سیٹھ کو خود فون کر دیا۔ سیٹھ بری طرح دھاڑا۔

"تم کہاں مر گئے ہو؟ ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟" شیر خان نے بہانہ بنایا کہ راستے میں جیپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اب ٹیکسی لے کر آ رہا ہوں سیٹھ کا بنگلہ بھی شہر کے جنوب کی طرف کافی دور ایک پر فضا مقام پر تھا۔ سیٹھ نے شیر خان کو برا بھلا کہا اور حکم دیا کہ وہ ابھی اسی وقت پہنچے۔ "یس سر" کہہ کر شیر خان نے ریسیور رکھ دیا اور پنجابی میں سیٹھ کو ایک موٹی سی گالی دی، گالی سن کر روبی مسکرائی پندرہ منٹ بعد وہ ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوئے تھے اور جہاز اڑان بھرنے کے لئے رن وے پر پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد وہ جزیرے کے شمالی ساحلی شہر پہنچ گئے۔ ائر پورٹ سے وہ سیدھے ہوٹل پہنچے۔ شیر خان نے روبی کو کمرے میں ہی ٹھہرنے کو کہا اور خود اپنے خاص آدمی کی طرف چل پڑا یہ ایک تھائی اسمگلر تھا جس سے شیر خان کی پرانی جان پہچان تھی۔ شیر خان نے اس سے کہا کہ ہمیں ایک خاص مشن پر برما پہنچنا ہے۔ یہ بات تم بھی راز میں

ہی رکھنا تھا۔ تھائی اسمگلر ان باتوں کا عادی تھا وہ خود یہی کام کرتا تھا۔ شیر خان نے اسے ایک ہزار ڈالر کی رقم اسی وقت ادا کر دی۔

"کل رات گیارہ بجے یہاں پہنچ جانا میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

دوسرا دن روبی اور شیر خان نے ہوٹل کے کمرے میں ہی گزار دیا وہ لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ کیونکہ اس وقت تک سیٹھ کو پتا چل گیا تھا کہ شیر خان اور روبی فرار ہو گئے ہیں۔ مگر شیر خان کو اب سیٹھ کی پروا نہیں تھی۔ اس نے پاکستان پہنچ کر روبی سے شادی کر کے ایک نئی پاک صاف زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا اور اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ کسی بھی بدکار سیٹھ کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا روبی بڑی خوش تھی کہ آخر شیر خان اسے لے کر یا وہ شیر خان کو لے کر گناہ اور جرائم پیشہ زندگی کی دلدل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ شیر خان نے امریکی ڈالروں کے کرنسی نوٹ پلاسٹک کی تھیلیوں میں ڈال کر کچھ اپنی کمر کے گرد اور کچھ روبی کی کمر کے گرد باندھ رکھے تھے۔ دونوں کے بریف کیس میں معمولی سفر کی ضروری چیزوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ تھوڑی بہت اس ملک کی کرنسی ان کی جیب میں تھی' امریکی ڈالر جنوب مشرقی ایشیا کے سارے ملکوں میں بڑی خوشی سے کیش کر دیا جاتا تھا۔ ساڑھے دس بجے رات تک روبی اور شیر خان کھانا کھانے کے بعد ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے کافی اور سگریٹ پیتے رہے۔ پھر وہ ہوٹل سے نکل کر کریک پوائنٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ تھائی اسمگلر ان کے انتظار میں پہلے سے موجود تھا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ ایک اسٹیمر لانچ پہلے سے سمندر میں کھڑی تھی اس میں کچھ سامان لدا تھا اور دو چار آدمی منہ سر لپیٹے ایک طرف لگ کر بیٹھے تھے۔ تھائی اسمگلر نے شیر خان سے سنہالی زبان میں کہا۔

"میں نے لانچ مین کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ لانچ رات بھر سمندر میں سفر کرے گی۔ صبح منہ اندھیرے تمہیں برما کے قریبی جزیرے پر پہنچا دے گی۔ وہاں سے تم کسی بھی اسٹیمر میں بیٹھ کر چلے جانا۔"

"ٹھیک ہے دوست! شکریہ۔" شیر خان نے سنہالی کی زبان میں ہی جواب دیا۔

روبی اور شیر خان نے پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی جو وہاں کے نوجوانوں کا عام

لباس ہوتا ہے۔ لانچ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ مگر اس کا انجن کیبن کافی بڑا تھا۔ ان دونوں کو انجن کیبن میں جگہ دے دی گئی جہاں وہ آمنے سامنے والی برتھوں پر لیٹ گئے۔ لانچ کا رسا کھول دیا گیا اور وہ اندھیرے میں روانہ ہو گئی۔ اگرچہ لانچ ساحل سے زیادہ دور نہیں تھی مگر سمندر آخر سمندر ہوتا ہے اور بحرہند کا سمندر بارہ مہینے چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ لانچ چھوٹی ہونے کی وجہ سے ڈول رہی تھی۔ مگر وہ دونوں سمندر میں اس طرح سفر کرنے کے عادی تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے برتھ پر خاموشی سے لیٹے سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ رات کے تین بجے تک اسمگلر لانچ سمندر میں خاموشی سے سفر کرتی رہی اس کے بعد لانچ میں کچھ شور سا ہوا۔ روبی اور شیر خان سو رہے تھے۔ ان کی آنکھ کھل گئی۔ کیبن کے شیشوں پر سرچ لائٹ کی روشنی پڑتے ہی ایک بار کیبن کا ماحول روشن ہو گیا۔ شیر خان اور روبی نے غیر شعوری طور پر سر نیچے کر لئے۔ لانچ مین گھبرایا ہوا اندر آیا اور بولا۔

"کوسٹ گارڈ کی لانچ آ گئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ باہر بھاگ گیا وہ دونوں جانتے تھے کہ اسمگلنگ میں جب اس قسم کے حالات پیدا ہو جائیں تو کوئی کسی کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ ہر کسی کو اپنی جان آپ ہی بچانی ہوتی ہے۔ باہر سے فائرنگ کی آواز آئی۔ گولیاں کیبن کے شیشے پر لگیں۔ شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔ شیر خان روبی کو بازو سے پکڑ کر دوسرے دروازے سے لانچ کے عقب میں لے آیا۔ سمندر میں کوسٹ گارڈ کی تین لانچیں چکر لگا رہی تھیں۔ وہ اسمگلر لانچ پر فائر بھی کر رہی تھیں اور اسپیکر پر اسمگلروں کو اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنے کے لئے بھی کہہ رہی تھیں۔ لانچ مین اور دوسرے آدمیوں نے سمندر میں چھلانگیں لگا دیں۔ شیر خان نے دیکھا کہ تھوڑے فاصلے پر سمندر کے کنارے پر دھندلی دھندلی روشنیاں ہو رہی تھیں۔ وہ یہی سمجھا کہ ملک برما کے ساحل کا قریبی جزیرہ آ گیا ہے۔ اس نے روبی سے کہا

"ہمیں بھی سمندر میں کود جانا چاہئے۔ جزیرہ سامنے ہی ہے پکڑے گئے تو آٹھ دس سال کے لئے ضرور اندر کر دیے جائیں گے۔"

روبی ایک دلیر لڑکی تھی۔ اس قسم کی مشکلات کی وہ عادی تھی۔ دونوں بڑے اچھے تیراک بھی تھے۔ ان کی لانچ ذرا اندھیرے میں آئی تو وہ بھی باری باری سمندر میں کود گئے۔

شیر خان آگے آگے تھا۔ روبی اس کے پیچھے تھی ان کی نگاہیں کنارے کی دھندلی روشنیوں کی طرف تھیں۔ وہ اس طرف ہی تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے جو ان کی اپنی لانچ اور کوسٹ گارڈ والوں کی لانچیں تھیں ان کے انجنوں، آدمیوں اور اکا دکا فائر کی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ شیر خان اور روبی نے کپڑوں سمیت ہی چھلانگ لگائی تھی۔ ان کے بریف کیس لانچ میں ہی رہ گئے تھے۔ رات کا اندھیرا ان کی مدد کر رہا تھا۔ کسی کی نظر ان پر نہیں پڑی تھی۔ جزیرے کی روشنیاں قریب آنے لگی تھیں روبی تیرتے تیرتے شیر خان کے قریب آگئی۔ اس نے روشنیوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا ادھر ایک اونچی جگہ سے سرچ لائٹ کی روشنی بار بار گھومتی ہوئی سمندر پر پڑ رہی تھی۔ شیر خان نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔ وہ دونوں لائٹ ہاؤس کو داہنی طرف چھوڑتے ہوئے چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے درمیان آگئے یہاں سمندر کی لہروں میں کافی زور تھا۔ ان چٹانوں کے درمیان تیرتے ہوئے وہ دونوں پتھریلے ساحل پر چڑھ گئے۔ ان کی پتلونیں اور جیکٹس پانی میں شرابور تھیں وہ وہیں بیٹھ کر سانس درست کرنے لگے شیر خان نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے ڈالر ہم نے کمر کے ساتھ باندھ لئے تھے۔ بریف کیسوں میں ہوتے تو بڑی مشکل پیش آتی۔" روبی نے ارد گرد دیکھا اور کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ ہم برما کے ساحل پر آگئے ہیں۔" شیر خان کی بائیں جانب جو چند ایک روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر لانچ مین نے تو مجھے یہی کہا تھا۔" شیر خان نے کلائی کی گھڑی پر ٹائم دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے اندھیرے میں کچھ پتا نہ چل سکا، بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں دن نکلنے سے پہلے پہلے کسی محفوظ جگہ پہنچ جانا چاہئے۔"

وہ دونوں ساحل والی روشنیوں کی طرف چل دیئے۔ یہ روشنیاں ایک قطار میں بنی ہوئی بیرکوں کی تھیں۔ بیرکوں کے آگے خار دار تار کی باڑھ لگی تھی۔ روبی نے کہا

"یہ کوئی فوجی بیرک لگتی ہے۔ اسی طرف چلتے ہیں۔"

دوسری طرف سے ہو کر وہ ایک پتلی سی پکی سڑک پر آگئے جو آگے جا کر ایک طرف گھوم گئی تھی۔ شیر خان کو ایک جگہ ٹریفک سائین لگا نظر آیا۔ اس نے قریب جا کر اسے غور سے دیکھا اور بولا۔

"روبی! مجھے خطرہ ہے کہ یہ برما کا علاقہ نہیں ہے بلکہ ہم انڈیا کے جنوب مشرقی ساحل پر نکل آئے ہیں۔" روبی کا دل ایک بار زور سے دھڑک کر معمول پر آگیا۔

"یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا۔" اس نے رک کر پوچھا۔

جس چھوٹی سی سڑک پر وہ کھڑے تھے اس کے دونوں جانب بانس کے گھنے جھنڈ تھے۔ شیر خان کو دور سے کسی ٹرک کی روشنیاں نظر آئیں۔ اس نے جلدی سے روبی کو بانس کے درختوں کی طرف کھینچ لیا۔ یہ ایک فوجی ٹرک تھا۔ جو تیزی سے گزر گیا۔ اندھیرے میں شیر خان کو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ ٹرک کس ملک کی فوج کا تھا۔ روبی کو تشویش ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ انڈیا اور پاکستان کے آپس میں بڑے اختلافات ہیں۔ خاص طور پر کشمیر کے مسئلے پر دونوں ملکوں کے درمیان کافی تناؤ رہتا ہے۔ اسی اعتبار سے انڈیا ایک دشمن ملک تھا اور ان دونوں میں سے کسی کے پاس کوئی پاسپورٹ وغیرہ نہیں تھا۔ ان کے تمام کاغذات بریف کیس میں ہی رہ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ برما پہنچ کر انہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ وہ پاکستانی سفارت خانے جا کر اپنی کہانی سچ سچ سنا دیں گے اور سفارت خانہ ان کی پوری مدد

کرے گا۔ لیکن اگر یہ واقعی انڈیا کی زمین ہے تو پھر انہیں کافی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔
اس قسم کے خیالات روبی کو وقتی طور پر پریشان کیے ہوئے تھے۔ ٹرک کے گزر جانے کے بعد روبی نے شیر خان سے کہا۔

"فرض کرو کہ ہم انڈیا کے علاقے میں آگئے ہیں۔ ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا ہو گا کہ ہم پاکستان پہنچ سکیں۔" شیر خان کہنے لگا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے ہم کسی طرح پاکستانی سفارت خانے پہنچنے کی کوشش کریں گے۔"

"اور اگر پاکستانی سفارت خانے پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں بھارتی پولیس نے پکڑ لیا تو کیا ہو گا؟ وہ تو ہمیں پاکستانی جاسوس سمجھ کر جیل میں ڈال دیں گے اور پاکستانی سفارت خانے کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔" شیر خان نے ہنس کر کہا۔

"تم کیوں ڈر رہی ہو۔ پہلے اس بات کی تصدیق تو ہو جائے کہ ہم کس ملک میں آگئے ہیں۔" شیر خان نے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے روبی کو ساتھ لیا اور سڑک سے نیچے اتر کر شمال کی طرف چل دیا۔

آسمان پر بادل بھی تھے اور کہیں کہیں کوئی تارا بھی چمکتا نظر آجاتا تھا۔ رات حبس آلود نیم گرم تھی۔ ان کے کپڑے کافی حد تک خشک ہو گئے تھے۔ جس وقت دن کا اجالا پھیلا تو وہ مچھیروں کی ایک بستی کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ماہی گیروں کے رنگ کالے تھے، شیر خان بولا۔

"روبی ہم انڈیا آگئے ہیں۔ یہ ہندوستانی تامل مچھیرے ہیں۔ میں انہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔" اب روبی کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ انڈیا میں ہیں اور یہاں سے پاکستان پہنچنے میں انہیں بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا ہو گا۔ ایک شہر کے مضافات شروع ہو گئے۔ انہیں جنوبی انڈیا کے خاص قسم کے مندر دکھائی دیے ایک کافی کشادہ سڑک شہر کی طرف جا رہی تھی۔ جس پر بھاری ٹریفک گزر رہی تھی۔ شیر خان اور روبی ایک درخت کے پیچھے ہو کر بیٹھ گئے۔ وہاں انہوں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے انہیں کسی ہوٹل میں جا کر کپڑے تبدیل کر کے اپنا حلیہ درست کرنا ہو گا۔ اس کے بعد شہر میں پاکستانی سفارت خانے وغیرہ کا

پتا چلانا ہو گا۔ یہ فیصلہ کر کے وہ اٹھے اور شہر میں داخل ہو گئے۔ یہ کافی بڑا شہر تھا۔ اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ انہیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ تامل ناڈو کا صوبہ ہے اور اس شہر کا نام ناگا پٹنم ہے۔ یہاں ایک درمیانے درجے کا ہوٹل نظر آیا تو وہ اس میں داخل ہو گئے۔ اپنے آپ کو سنہالی میاں بیوی سیاح ظاہر کیا اور ایک کمرہ کرائے پر لے لیا سب سے پہلے انہوں نے ناشتہ کیا پھر بازار میں آکر کپڑے خریدے۔ ہوٹل میں واپس آکر انہیں پہنا۔ شیر خان نے شیو بنائی روبی نے نئی پتلون جیکٹ پہن لی۔ اس نے ہمیشہ یہی لباس پہنا تھا اور انڈیا میں لڑکیاں یہ لباس عام پہنتی ہیں۔ کسی نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی شیر خان کہنے لگا۔

"اس شہر سے ہمیں آگے کسی بڑے شہر میں جانا ہو گا کیونکہ کسی بڑے شہر میں ہی پاکستان کا سفارت خانہ ہو گا۔"

یہ بات انہوں نے معلوم کر لی تھی کہ اس سے آگے بڑا شہر مدراس پھر حیدر آباد ہے۔ روبی نے مشورہ دیا کہ ہمیں حیدر آباد جانا چاہئے وہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ وہاں ہمیں زیادہ خطرہ نہیں ہو گا۔ شیر خان کو یہ مشورہ پسند آیا وہ بینک گیا اور خود کو سنہالی سیاح ظاہر کر کے کچھ امریکی ڈالروں کو انڈین کرنسی میں تبدیل کروا لیا۔ اس شام وہ ٹرین میں بیٹھ کر مدراس کی طرف روانہ ہو گئے مدراس تک انہیں کسی نے کچھ نہ کہا۔ پولیس والے بھی جگہ جگہ ملے مگر کسی نے ان پر کوئی شک نہ کیا۔ مدراس میں اسٹیشن کے سامنے ایک ہوٹل میں انہوں نے رات بھر قیام کیا۔ یہاں سیاحوں والے دو چمڑے کے تھیلے بھی خرید لئے اب وہ پوری طرح سے سیاح جوڑا نظر آرہے تھے اگرچہ ان کے پاس پاسپورٹ وغیرہ بالکل نہیں تھے امریکی ڈالروں کی تھیلیاں ابھی تک ان کی کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ اگلے روز مدراس سے انہوں نے ایک گاڑی پکڑی اور وجے واڑہ کی طرف چلے جہاں سے انہیں حیدر آباد (دکن) والی گاڑی پکڑنی تھی۔

یہ سارا سفر خیر و عافیت سے گزر گیا۔ حیدر آباد پہنچتے ہی انہوں نے حسب دستور ایک انگریزی فیشن کے ہوٹل میں اپنے آپ کو میاں بیوی ظاہر کر کے ایک کمرہ لے لیا اور اپنے اگلے پروگرام پر غور کرنے لگے۔ شیر خان کہنے لگا۔

"تم ہوٹل میں ہی ٹھہرو میں شہر میں جا کر پاکستانی سفارت خانے کا پتا چلاتا ہوں۔" روبی

کو ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ کر شیر خان شہر میں آگیا۔ اسے ایک بڑی عظیم الشان مسجد نظر آئی۔ مسجد کے نیچے ایک قطار میں کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں ایک مسلمان دکاندار سے جس کی باقاعدہ شرعی داڑھی تھی شیر خان نے سلام علیکم لی اور کہا۔

"محترم کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہاں پاکستانی سفارت خانے کی عمارت کہاں ہے؟"

دکاندار نے اوپر سے نیچے تک شیر خان کو دیکھا پھر بولا۔

"برخوردار! یہاں تو پاکستانی سفارت خانہ موجود نہیں مگر تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" شیر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے کہ جی کہ میں سنہالی مسلمان سیاح ہوں۔ اپنی بیوی کے ساتھ یہاں سیرِ سیاحت کرنے آیا ہوا ہوں۔ سوچا کیوں نہ آگے پاکستان کی بھی سیر کرتے چلے اسی وجہ سے پاکستانی سفارت خانے کا پتا پوچھا تھا کہ ان سے معلومات حاصل کروں کہ یہاں سے پاکستان کیسے جایا جا سکتا ہے۔" مسلمان دکاندار نے کہا۔

"برخوردار! تم ایسا کرو کہ یہاں سے راجدھانی دلی جاؤ' وہاں پر تمام ملکوں کے سفیر رہتے ہیں۔ پاکستانی سفیر بھی وہاں رہتا ہوگا۔ ان کا سفارت خانہ بھی ہوگا دلی سے ہی تمہیں معلومات مل سکتی ہیں۔" شیر خان نے مسلمان دکاندار کا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے واپس چل دیا۔ ہوٹل میں آکر اس نے ساری بات روبی کو بتا دی وہ بولی۔

"تو کیا اب ہمیں دلی جانا ہوگا؟" شیر خان نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو جانا ہی پڑے گا۔ کیونکہ پاکستان کا سفیر وہیں رہتا ہے اور وہی اس حالت میں ہمارے کام آسکتا ہے۔" روبی نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"تو پھر نکل چلتے ہیں۔ یہاں بیٹھنا تو بیکار ہے۔" شیر خان نے کہا۔

"ٹرین کی بجائے ہوائی جہاز سے سفر کریں گے۔ جلدی دلی پہنچ جائیں گے۔ ٹرین کا سفر بھی لمبا ہے اور راستے میں اگر کسی پولیس والے کو شک پڑ گیا تو ہم پر مصیبت بھی ٹوٹ سکتی ہے۔" چنانچہ اسی تجویز پر عمل کیا گیا۔

دونوں بذریعہ ہوائی جہاز حیدر آباد سے دلی آگئے دلی اس سے پہلے بھی روبی اور شیر خان دیکھ چکے تھے۔ رات انہوں نے ہوٹل میں آرام کیا۔ اگلے روز شیر خان نے حسب

دستور روبی کو ہوٹل میں ہی چھوڑا اور خود پاکستانی سفارت خانے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اسے پاکستانی سفارت خانے تک پہنچا دیا۔

شیر خان کا خیال تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ اس کے ماں باپ پاکستانی تھے۔ بڑی آسانی سے اس کا کام ہو جائے گا اور اسے اور روبی کو پاکستان پہنچا دیا جائے گا مگر دفتری کارروائی اور خاص طور پر ایک دشمن ملک میں کام کرتے سفارت خانے کی کارروائی کس قدر محتاط اور پیچیدہ ہوتی ہے اس کا شیر خان کو احساس نہیں تھا۔ ایک تو وہ نوجوان تھا۔ دوسرے وہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ اسمگلنگ کے کاروبار میں ہی اس نے اپنی نو عمری اور نوجوانی گزاری تھی۔ اس میں لوگوں کو پہچاننے کی صلاحیت ضرور پیدا ہو گئی تھی مگر سفارتی دنیا کی مصلحت کوشیوں سے وہ بالکل واقف نہیں تھا۔ پہلے تو اسے کسی نے اندر ہی نہ جانے دیا۔ اس کے پاس پاکستانی پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اس کی ملاقات ایک سفارتی اہلکار سے ہوئی۔ شیر خان نے سادہ دلی اور جذباتی رو میں اسے سب کچھ بتا دیا کہ وہ کون ہے۔ روبی کون ہے اور یہ کہ اب وہ اپنے پیارے وطن پاکستان جا کر ایک نیک اور صاف ستھری رزق حلال کمانے کی زندگی شروع کرنا چاہتے ہیں۔ سفارتی عہدیدار محتاط ہو گیا کسی حد تک یہ کام اس کے لئے بھی مشکل ہی تھا۔ اس نے شیر خان سے کہا کہ وہ پہلے اپنے اور روبی کے سنہالی نیشنل ہونے کا سرٹیفکیٹ لائے اور یہ بھی ثابت کرے کہ اس کے ماں باپ پاکستانی تھے۔ اس کے بعد کچھ غور کیا جا سکے گا۔ شیر خان پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا

"سر! میں اگر واپس گیا تو جرائم پیشہ گروہ کے لوگ مجھے اور میری منگیتر روبی کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔" سفارتی عہدیدار نے کہا۔

"پھر ہم مجبور ہیں" سفارت خانے والے بھی سچے تھے۔ بغیر کسی دستاویز یا تصدیق کے وہ شیر خان کو کیسے پاکستانی پاسپورٹ بنا کر دے سکتے تھے۔ اس طرح سے تو کوئی دشمن ملک کا جاسوس بھی پاکستانی پاسپورٹ بنوا کر پاکستان میں داخل ہو سکتا تھا۔

شیر خان نے ساری کارروائی ہوٹل میں آکر روبی کو سنا دی۔ وہ بھی سفارت خانے والوں کی مجبوری اور فرض شناسی کو نہ سمجھ سکی۔ سفارت خانے والوں پر غصہ کرنے لگی۔ شیرخان نے صوفے پر بیٹھ گیا سگریٹ سلگایا اور کہنے لگا۔

"لگتا ہے ہم ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ بھلا ہم واپس کیسے جاسکتے ہیں؟ مجھے تو یہ بھی خطرہ ہے کہ ہمارے گروہ کے قاتل جاسوس کہیں یہاں بھی ہمارے پیچھے نہ چلے آرہے ہوں۔ کہاں یہ کہ ہم خود موت کے منہ میں واپس جائیں۔"

"پھراب کیا سوچا ہے تم نے؟" روبی نے تلخی سے پوچھا۔ شیر خان کی اب تک کی زندگی زیادہ تر غیر قانونی کام کرتے ہوئے گزری تھی۔

"کسی جگہ سے بارڈر کراس کریں گے اور کیا ہو سکتا ہے۔"

روبی کے لئے بھی یہ بات کوئی انوکھی یا پریشان کر دینے والی نہیں تھی۔۔ البتہ انہیں اس بات کا احساس نہیں تھا کہ پاک بھارت سرحد پر دونوں طرف سے کس قدر سختی برتی جاتی ہے اور ناجائز طور پر سرحد پار کرنا کتنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے پر فوراً تیار ہو گئے۔ روبی کہنے لگی۔

"اس کے لئے سب سے پہلے تو ہمیں کسی سرحدی گاؤں میں جاکر کسی اسمگلر سے بات کرنی ہو گی اسے رشوت دینی ہو گی اور اس کے علاوہ ہمیں کہیں سے اپنی حفاظت کے لئے اسلحہ بھی حاصل کرنا ہو گا۔ کیونکہ انڈین اسمگلر بھی ہم پر کسی لالچ کی وجہ سے حملہ کر سکتے ہیں۔"

شیر خان خاموشی سے سگریٹ پیتا اور سوچتا رہا۔ وہ اس سے پہلے پاک بھارت سرحد پر کسی سرحدی گاؤں میں نہیں گیا تھا یہ وہ ضرور جانتا تھا کہ دنیا کے ہر ملک کی سرحد پر پیشہ ور اسمگلر ضرور رہ رہے ہوتے ہیں۔ شیر خان کو اسمگلروں سے بات کرنے کا گر آتا تھا۔ اس کے پاس امریکی ڈالر بھی تھے۔ اس معاملے میں اسے کافی سوجھ بوجھ تھی کہنے لگا۔

"روبی! میرا خیال ہے ہمیں پنجاب کی بجائے راجستھان کی طرف سے سرحد پار کرنی چاہئے۔ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ راجستھان کی طرف سے ہم نکل جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

روبی کے لئے سارے کا سارا بارڈر ایک جیسا تھا اور ہر جگہ ایک جیسا ہی خطرہ تھا۔ اس نے کہا۔

"چاہے جس طرف سے نکلیں لیکن ہمیں پاکستان ہر حالت میں پہنچنا ہو گا۔ اگر انڈین بارڈر پولیس سے مقابلہ بھی کرنا پڑا تو مقابلہ کریں گے۔ کاش اس وقت ہمارے پاس ہمارا اپنا اسلحہ ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں راجستھان کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ علاقہ یہاں سے کتنی دور ہے کہاں تک ریل گاڑی جاتی ہے۔ وغیرہ..."

دلی جیسے شہر میں ایسی معلومات حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ شیر خان نے بہت جلد معلوم کر لیا کہ اسے دلی سے راجستھان کے سرحدی شہر جودھ پور جانا ہو گا۔ وہاں سے آگے پاکستان کا بارڈر شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے اتنی معلومات ہی کافی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک روز ٹرین پکڑی اور دلی سے اجمیر شریف آگئے۔ یہاں سے "جودھ پور" جانے کے لئے دوسری ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ابھی تک وہ بڑی آسانی سے سفر کر رہے تھے۔ کسی جگہ بھی وہ انڈین انٹیلیجنس والوں کی نظر میں نہیں آئے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ سیاحوں کے حلیئے میں تھے اور دونوں نوجوان تھے اور کالج کے اسٹوڈنٹ لگتے تھے۔ لیکن اجمیر شریف سے جب وہ "جودھ پور" جانے والی گاڑی میں سوار ہوئے تو سی آئی ڈی انسپکٹر کمنہ لعل ان کے پیچھے لگ گیا۔ اس ہندو خفیہ انسپکٹر نے دیہاتیوں ایسا حلیہ بنا رکھا تھا۔ یہ بڑا گھاگ قسم کا سی آئی ڈی انسپکٹر تھا اور اس کے تجربے اور زیرکی کی وجہ سے محکمے نے اس کی ڈیوٹی بارڈر کے علاقے میں لگا رکھی تھی۔ انسپکٹر کمنہ لعل نے شیر خان اور روبی کو ٹرین میں سوار ہوتے دیکھا تو اسے خیال آیا کہ یہ دونوں بظاہر سیاح لگتے ہیں مگر اس موسم میں راجستھان میں سیاح بہت ہی کم آتے ہیں۔ پھر یہ غیر ملکی بھی نہیں لگتے۔

شیر خان اور روبی کے چہروں پر قدرتی طور پر جو ایک تجسس کی کیفیت طاری تھی اسے بھی انسپکٹر کمنہ لعل نے پڑھ لیا تھا۔ یہ لڑکا لڑکی کون ہیں اور انڈین سرحد کی طرف کیا کرنے جا رہے ہیں جب کہ جودھ پور کی طرف ایسی کوئی جگہ بھی نہیں تھی جس میں سیاحوں کے لئے زیادہ دلچسپی ہو ہندو انسپکٹر جان بوجھ کر پلیٹ فارم پر ایک طرف چھپ کر کھڑا رہا۔ جب گاڑی چل پڑی تو وہ لاٹھی اٹھائے گنواروں کی طرح پلیٹ فارم پر دوڑتے ہوئے شیر خان اور روبی کے ڈبے میں گھس گیا۔ ٹرین رفتار پکڑ چکی تھی۔ ہندو انسپکٹر وہیں ڈبے کے دروازے

میں بیٹھ کر سانس درست کرنے کی جھوٹ موٹ کوشش کرنے لگا۔ ڈبے میں تین چار مسافر ہی تھے۔ یہ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ تھا۔ ایک مسافر نے انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"ابے تو یہاں کیوں چڑھ آیا ہے۔ یہ سیکنڈ کلاس ہے۔"

انسپکٹر کمنہ لعل ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس نے سر پر راجستھان دیہاتیوں والی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ بدن پر انگر کھا طرز کی چولی اور نیچے دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج! غریب آدمی ہوں۔ دوسرے ڈبے میں جگہ نہیں ملی۔ معافی دے دیں۔"

شیر خان اور روبی نے اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ اپنے تھیلے اتار کر ایک طرف رکھنے میں مصروف رہے دوسرا مسافر بھی اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ٹرین پلیٹ فارم سے نکل چکی تھی اور اس کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی۔

انسپکٹر کمنہ لعل وہیں دروازے کے پاس ہی گھٹنے چھاتی سے لگائے گنواروں ایسے انداز میں بیٹھا رہا۔ مگر کبھی کبھی وہ بڑی گہری نگاہوں سے شیر خان اور روبی کو دیکھ لیتا۔

جودھ پور تک انسپکٹر برابر دونوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے ایک اور خاص بات بھی نوٹ کی تھی۔ اس علاقے میں جو بھی سیاح آتے تھے ان کے پاس تصویریں اتارنے والے کیمرے ضرور ہوتے تھے جب کہ ان دونوں کے پاس کوئی کیمرہ نہیں تھا۔ دوسری طرف شیر خان نے بھی محسوس کیا کہ ڈبے کے دروازے کے پاس بیٹھا گنوار دیہاتی کبھی کبھی ان کی جانب گہری نظروں سے دیکھ لیتا ہے۔ ایک بار شیر خان اور انسپکٹر کی آنکھیں چار ہو گئیں تو ہندو انسپکٹر نے جلدی سے نظریں دوسری طرف کر لیں۔ شیر خان کا جنوب مشرقی ایشیا میں اسمگلنگ کی جرائم پیشہ زندگی کے دوران کئی تجربہ کار انٹیلیجنس افسروں سے پالا پڑ چکا تھا اور وہ ان لوگوں کی حرکات و سکنات سے بخوبی واقف تھا۔ سب سے پہلے تو اسے یہی شک گزرا کہ ہو نہ ہو یہ آدمی ان کے گینگ کا کوئی جاسوس ہے جو دیہاتی کے روپ میں ان کے پیچھے لگ گیا ہے۔ شیر خان نے روبی سے اس کا بالکل ذکر نہ کیا مگر وہ دل ہی دل میں اس جاسوس سے چھٹکارا حاصل کرنے اور اسے جل دے کر نکل جانے کے منصوبے پر غور کرنے لگا۔

"جودھ پور" ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد شیر خان اور روبی دوسرے درجے کے

ویٹنگ روم میں آ گئے۔ یہاں شیر خان نے اپنے پیچھے لگے ہوئے دیہاتی آدمی کے بارے میں روبی کو بتایا تو وہ بولی۔

"اگر یہ ہمارے گروہ کا آدمی ہے تو اسے کسی طریقے سے قتل کر دینا چاہیے۔ ورنہ ہم دونوں کی خیر نہیں ہے۔"

شیر خان نے کہا کہ ہمارے پاس تو چھوٹا چاقو بھی نہیں ہے۔ روبی کسی بڑے خطرے کو قریب آتے دیکھ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لنکا میں ان کے بین الاقوامی جرائم پیشہ گروہ کے انچارج سیٹھ نے دونوں کے فرار کی اطلاع علاقے کے سارے ملکوں میں اپنے آدمیوں کو کر دی ہو گی اور یہ قاتل پیشہ لوگ ان دونوں کی تلاش میں ہوں گے۔ روبی کو اس بات پر حیرانی بھی ہو رہی تھی کہ ابھی تک کوئی ان کے تعاقب میں کیوں نہیں آیا۔ جب شیر خان نے دیہاتی جاسوس کی بات بتائی تو ایک بار تو اس سرکش منہ زور اور بہادر لڑکی کا دل بھی بیٹھ گیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ان کے گروہ کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں اور وہ دنیا کے جس حصے میں جس کو چاہیں قتل کروا سکتے ہیں اور روبی قتل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے شیر خان کے ساتھ شادی کر کے پاکستان میں ایک صاف ستھری نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس نے شیر خان سے کہا۔

"اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو میں اسے ختم کر دوں گی۔ تم کہیں سے مجھے پیاز کاٹنے والی چھری ہی لا دو۔" شیر خان نے روبی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جذبات کی رو میں بہنے سے کچھ نہیں ہو گا روبی اگر یہ ہمارے گروہ کا آدمی ہے تو یقینی بات ہے کہ اس نے اطلاع کر دی ہو گی کہ میں نے شکار تلاش کر لیا ہے اور اس کے پیچھے جودھ پور جا رہا ہوں۔ یوں ایک کو مار دیا تو دوسرا اس کی جگہ پر آ جائے گا اور پھر یہ لوگ ہمیں ہلاک کرنے میں ذرا سی بھی تاخیر نہیں کریں گے۔"

"تو کیا پھر ہم اپنے آپ کو ان درندوں کے حوالے کر دیں۔" روبی نے تلخ انداز میں پوچھا شیر خان چمڑے کے تھیلے کا زپ بند کرتے ہوئے بولا۔

"ہمیں ہوشیاری سے کام لینا ہو گا۔ کوئی اسکیم بنانی ہو گی تاکہ اس آدمی کی نظروں سے غائب ہو جائیں۔" روبی ریلوے ویٹنگ روم کی آرام کرسی پر بیٹھی تھی ویٹنگ روم

میں ان کے سوا کوئی نہیں تھا۔ شیر خان نے بند دروازے کے پاس جا کر پردے کو ذرا سا کھسکایا اور جالی میں سے باہر دیکھا اسے جاسوس دیہاتی نظر نہ آیا وہ تیزی سے پلٹا اور اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی پٹی کو کھولتے ہوئے بولا۔

"تم بھی کمر کی پٹی کھول کر ڈالر کرنسی نوٹ مجھے دے دو۔" روبی نے پتلون سے قمیص باہر نکالی پھر کمر کے ساتھ بندھی پٹی کھول کر شیر خان کے آگے رکھ دی۔ شیر خان اپنی پٹی بھی باہر نکال چکا تھا اس نے دونوں پٹیوں کے ساتھ بندھی ہوئی پلاسٹک کی تھیلیاں پھاڑ کر ان میں سے سارے کے سارے ڈالر نکال کر تھیلے میں بھر لئے یہ ہزار ہزار ڈالر کے کرنسی نوٹ تھے جن کی سات گڈیاں بن گئی تھیں۔ اس کے بعد شیر خان نے روبی سے کہا۔

"تم یہیں ویٹنگ روم میں ہی بیٹھو اور میرا انتظار کرو۔ میں آتا ہوں۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟" روبی نے پوچھا شیر خان نے کہا۔ "میں اس رقم کو کسی محفوظ جگہ پر چھپا دینا چاہتا ہوں جب تک پیچھے لگے ہوئے اس قاتل سے چھٹکارا نہیں مل جاتا۔ ہم نہ بارڈر کراس کر سکتے ہیں اور نہ یہ رقم اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ تم باہر مت نکلنا یہاں سے میں بڑی جلدی واپس آ رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر شیر خان نے تھیلا کاندھے سے لٹکایا اور ویٹنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

پلیٹ فارم پر گاڑی ابھی تک کھڑی تھی جو خالی ہو چکی تھی اور ریلوے کے آدمی ڈبوں کی صفائی وغیرہ کر رہے تھے۔ مسافر بھی پلیٹ فارم پر کہیں کہیں سامان وغیرہ قلیوں سے اٹھواتے نظر آ رہے تھے۔ شیر خان کی نظریں دیہاتی گنوار یعنی سی آئی ڈی انسپکٹر کمنہ لعل کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ اسے چائے کے اسٹال یا کسی بینچ پر بھی بیٹھا دکھائی نہ دیا۔ لیکن شیر خان کو یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی جگہ چھپ کر اسے ضرور دیکھ رہا تھا اس کا اندازہ غلط نہیں تھا انسپکٹر کمنہ لعل پلیٹ فارم کے پل کے ستون کے پیچھے بیٹھا شیر خان کو دیکھ رہا تھا۔ شیر خان دل میں ایک منصوبہ بنا کر نکلا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس شہر میں جو مسلمان آباد ہیں وہ ان میں سے کسی ایک کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا کر سکتا ہے۔ گیٹ پر ٹکٹ چیکر کھڑا تھا شیر خان نے اسے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دکھایا اور کہا۔

"جناب میں اور میری بیوی دلی سے آئے ہیں میرے ایک دوست نے ہمیں لینے آنا تھا' وہ نہیں آیا' میری بیوی ویٹنگ روم میں ہی ہے۔ میں اپنے دوست کا پتا کرنے جا رہا ہوں۔ ابھی واپس آ جاؤں گا۔"

ٹکٹ چیکر نے شیر خان کا ٹکٹ چیک کر کے اپنے پاس رکھ لیا اور کہا۔ "تم واپس بھی آ سکتے ہو۔ میں یہیں ڈیوٹی پر ہوں گا۔"

شیر خان اسٹیشن کے باہر آ گیا۔ شہر کو وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ کسی مسجد کی تلاش میں تھا کیونکہ ایسے ہی علاقے میں اسے کوئی مسلمان مل سکتا تھا اس نے ریل بازار میں ایک طرف چلنا شروع کر دیا اسے کسی بھی جگہ کسی مسجد کے مینار نظر نہ آئے بازار ختم ہو گیا۔ ایک طرف چھوٹا سا ریتلا میدان تھا جہاں پہلے کچھ سرسبز

کھیتیاں تھیں۔ ہندوانسپکٹر بھی ایک خاص فاصلہ رکھ کر شیر خان کا تعاقب کر رہا تھا۔ شیر خان نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مشتبہ شخص ضرور اس کا پیچھا کر رہا ہو گا۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ آخر اسے ایک مسجد کے مینار نظر آگئے۔ یہ مسجد آبادی سے ذرا باہر بنی ہوئی تھی۔ احاطے کی دیوار کے اندر کھجور کے کچھ درخت اگے تھے۔ شیر خان نے مسجد کی چار دیواری کے گرد ایک چکر لگایا اسے امید کی ایک کرن دکھائی دی مسجد کی عقبی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ جو ایک باغ میں کھلتا تھا۔ اس باغ میں آم اور کیکر کے درخت ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ شیر خان مسجد کے دروازے پر آکر رک گیا مسجد کا دروازہ کھلا تھا اندر پختہ صحن میں صف بچھی ہوئی تھی جس پر کچھ لڑکے بیٹھے سیپارے پڑھ رہے تھے۔ شیر خان نے جوتا اتارا اور مسجد کے صحن میں آکر بچوں کے پاس ہی بیٹھ گیا مسجد کے حجرے بھی تھے۔ بچوں نے سیپارہ پڑھتے ہوئے ایک نظر شیر خان کو دیکھا اور پھر سیپارہ پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ مسجد میں اجنبی مسافر آیا ہی کرتے تھے۔ شیر خان کی تیز آنکھوں نے پل بھر میں مسجد کا جائزہ لے لیا۔ حجرے کے پہلو میں دو چار سیڑھیاں صحن میں اترتی تھیں۔ یہاں چند قدم کے فاصلے پر مسجد کی عقبی دیوار تھی جس میں وہی چھوٹا سا دروازہ تھا جو باغ میں کھلتا تھا۔ شیر خان کو اسی دروازے کی تلاش تھی۔ جوتا اس نے تہہ کر کے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا وہ اٹھ کر مسجد کے سامنے والے دروازے پر آیا۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔

انسپکٹر کمنہ لعل کہیں نہیں تھا۔ شیر خان یہی سمجھا کہ وہ شخص کسی جگہ چھپ کر اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے بعد کہ شیر خان مسجد میں ہی ہے اس نے جوتے پہنے مسجد کی اندرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا عقبی دروازے ہی سے تیزی سے باغ میں نکل گیا۔ یہاں آکر اسے معلوم ہوا اس باغ میں پندرہ بیس کچی پکی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ایک خیال شیر خان کے دماغ میں لہرا گیا باغ بالکل خالی تھا چاروں طرف جھاڑیوں کی قد آدم باڑھ بنی ہوئی تھی باہر سے نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ شیر خان جھک کر چلتا قبروں میں سے گزرنے لگا۔ کیکر کے ایک چھتاروں والے درخت کے نیچے پرانی کچی قبر ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔ ایک جانب اس میں سوراخ بن گیا تھا شیر خان وہاں بیٹھ گیا۔ اس نے سوراخ میں ہاتھ ڈالا۔

اندر ریت اور مٹی تھی۔ اس نے چمڑے کے تھیلے میں سے ڈالروں کے نوٹوں والا پلاسٹک کا بند پیکٹ نکالا اور قبر کے سوراخ کے کافی اندر کر کے رکھ دیا اور سوراخ کو روڑوں سے بند کر کے اوپر مٹی ڈال دی اور اسے اچھی طرح سے دبا دیا پھر چاروں طرف دیکھا۔ اسے کوئی دوسرا آدمی وہاں دکھائی نہ دیا۔ شیر خان نے دل میں کہا اب یہ ڈالر خدا کے سپرد۔ زندگی رہی تو پاکستان جاتے وقت یہاں سے نکال لیں گے۔ نہیں تو پھر جو خدا کو منظور!
باغ سے گزرتا وہ واپس مسجد میں آگیا شیر خان مسجد کے سامنے والے دروازے سے باہر آگیا۔ چمڑے کا تھیلا اس نے اسی طرح کاندھے پر ڈال رکھا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ بار بار چہرے پر پھیر کر یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مسجد میں نفل ادا کر کے آرہا ہے۔
وہ اپنی طرف سے بڑا چوکس ہو کر ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا جب وہ ریل بازار میں داخل ہوا تو اچانک ایک ذیلی گلی میں سے پولیس کی جیپ تیزی سے نکل کر اس کے سامنے آکر رک گئی۔ جیپ میں سے ایک تھانیدار اور پانچ چھ سپاہی اترے اور انہوں نے شیر خان کو گھیرے میں لے لیا۔ گنوار دیہاتی یعنی انسپکٹر کمنہ لعل بھی تھانیدار کے ساتھ تھا۔ شیر خان کو اب معلوم ہوا کہ جس مشتبہ شخص کو وہ اپنے گینگ کا آدمی سمجھ رہا تھا اصل میں وہ انڈین سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔ شیر خان نے جس قسم کی جرائم پیشہ زندگی بسر کی تھی اس کی وجہ سے اس کے اعصاب لوہے کے بن چکے تھے۔ وہ بغیر کسی گھبراہٹ کے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے جناب؟"

تھانیدار کے ہاتھ میں بید تھا۔ کمر کے ساتھ پستول لٹک رہا تھا۔ سپاہیوں کے پاس بھی صرف لاٹھیاں ہی تھیں۔ انسپکٹر کمنہ لعل نے تھانیدار کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ تھانیدار ایک ہاتھ سے بید دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر آہستہ آہستہ بجاتے ہوئے شیر خان کے قریب آگیا اور بولا۔

"کہاں سے آئے ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

شیر خان نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ "وہ دلی سے اپنی بیوی کے ساتھ یہاں کی سیر کرنے آیا ہے اور بیوی اسٹیشن پر ہے۔" تھانیدار نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

"اسے تھانے لے چلو۔" شیر خان جب بھی نہ گھبرایا اسے ابھی تجربہ نہیں تھا کہ انڈین پولیس جب کسی مسلمان کو بھارت میں مشتبہ حالات میں گرفتار کرتی ہے تو اس کے ساتھ کس قدر بہیمانہ سلوک کرتی ہے۔ خاص طور پر جب وہ بھارت کا رہنے والا نہ ہو اور مسلمان بھی ہو تو اسے پاکستانی جاسوس سمجھ کر ایسی ایسی ناقابل برداشت اذیتیں دی جاتی ہیں کہ وہ جیل کے اندر ہی مر جاتا ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے یہ سوچ کر پولیس کے ساتھ چل پڑا پولیس کے پاس اسے مجرم ثابت کرنے کے لئے کوئی ثبوت تو ہے نہیں۔ اس لئے اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ میری بیوی اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ہے اسے اطلاع کر دی جائے۔ تھانیدار نے شیر خان کو جیپ میں سوار کراتے ہوئے کہا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ اسے بھی ہم تمہارے پاس لے آئیں گے۔" پولیس کی گاڑی ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔ انسپکٹر مکند لعل شیر خان کی ساتھی لڑکی روبی کو بھی اسی وقت گرفتار کرنا چاہتا تھا۔

شیر خان کو گئے جب کافی دیر ہو گئی تو روبی ویٹنگ روم سے نکل کر پلیٹ فارم پر ایک طرف کھڑی ہو گئی اس کی بے قرار نظریں شیر خان کو تلاش کر رہی تھیں۔ اسٹیشن کے گیٹ سے نکل کر ایک سڑک شہر کی طرف اور دوسری بائیں جانب اس پرانی مسجد والے قبرستان کی طرف جاتی تھی۔ جدھر شیر خان گیا تھا۔ روبی پلیٹ فارم پر ٹی اسٹال کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ اچانک اس کی نظر پولیس کی کھلی جیپ پر پڑی جو اسٹیشن کی طرف چلی آ رہی تھی۔ شیر خان کو جیپ میں پولیس کے نرغے میں بیٹھا دیکھا روبی کا ماتھا ٹھنکا وہ ایک دم ہوشیار ہو گئی یقیناً پولیس شیر خان کو پکڑنے کے بعد اب اسے گرفتار کرنے آ رہی تھی۔ روبی تیزی سے پیچھے ہٹی تیز تیز قدموں سے ویٹنگ روم میں گئی وہاں سے اپنا تھیلا اٹھا کر کاندھے سے لٹکایا اور پلیٹ فارم سے ریلوے لائن پر کودی اور دوسری طرف نکل کر جنگلہ پار کر کے ریت کے چھوٹے سے ٹیلے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

پولیس ویٹنگ روم میں گھس گئی۔ روبی وہاں نہ ملی تو انسپکٹر مکند لعل نے تھانیدار سے کہا۔" وہ بھاگ کر کہاں جائے گی۔ اسے ہم پکڑ لیں گے۔" پولیس سیٹیاں بجاتی روبی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑ پڑی۔

شیر خان جیپ میں خاموش بیٹھا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ روبی فرار ہو گئی ہے تو جانے کیوں اس کو کچھ اطمینان سا ہوا تھانیدار نے شیر خان کو اسی وقت ہتھکڑی لگوا دی اور دو سپاہیوں کے ساتھ تھانے روانہ کر دیا اور خود دو آدمی لے کر روبی کی تلاش میں اسٹیشن کی دوسری طرف نکل گیا۔ مگر روبی کہیں نہیں تھی۔

روبی بھی کوئی عام قسم کی گھریلو زبان لڑکی نہیں تھی۔ اس نے بھی جرائم پیشہ اسمگلروں کے گروہ میں آنکھ کھولی تھی اور اس قسم کے حالات سے اسے کئی بار واسطہ پڑ چکا تھا۔ ٹیلے کے پیچھے آتے ہی روبی کی نگاہ ایک مال گاڑی پر پڑی جو کسی طرف جا رہی تھی۔ یہ سائیڈ لائین تھی۔ مال گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ اس جگہ سے دور ہو جانے کا روبی کے لئے یہ ایک ایسا سنہری موقع تھا جو شاید قدرت نے خود اس کے لئے مہیا کیا تھا۔ مال گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ ایک خالی ڈبہ کھلا تھا اس کی زنجیر کو پکڑ کر روبی ڈبے میں گھس گئی۔ اس نے ایک نظر اسٹیشن کی طرف ڈالی پلیٹ فارم پر اسے پولیس کے آدمی ویٹنگ روم کی طرف جاتے نظر آتے۔ وہ ڈبے کی آہنی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی مال گاڑی ست رفتار سے جا رہی تھی روبی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔

مال گاڑی جب جودھ پور ریلوے اسٹیشن سے اتنی دور نکل آئی کہ ریلوے اسٹیشن نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو روبی نے سوچنا شروع کیا کہ اب شیر خان سے ملاپ کیسے ہو گا۔ وہ اسی علاقے میں رہنا چاہتی تھی تا کہ وہاں رہ کر کسی طریقے سے شیر خان کو پولیس کے چنگل سے رہا کرائے۔ وہ شیر خان سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اب تو ان دونوں نے جرائم پیشہ زندگی سے توبہ کر کے پاکستان جا کر شادی کے بعد نیک زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ شیر خان اگر صرف ان کے گروہ کا ایک ساتھی ہوتا تو روبی کے دل میں کبھی اس علاقے میں رہنے کا خیال نہ آتا۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتی کہ اس کی جان پولیس سے بچ گئی ہے۔ لیکن شیر خان اس کا ساتھی ہی نہیں اس کا محبوب بھی تھا۔ دونوں نوجوان تھے دونوں کے دل ایک دوسرے کی محبت میں لبریز تھے اور محبت کا یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب آدمی طوفانی جذبات کی رو میں بہہ کر کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ شیر خان کے بغیر روبی کو اپنی زندگی ادھوری اور خالی خالی لگ رہی تھی۔ اس نے ڈبے میں سے باہر جھانک کر دیکھا مال گاڑی

ایک طرف گھوم گئی تھی اور نصف دائرہ بناتے ہوئے مڑ رہی تھی۔ اس کی رفتار بھی اب تیز ہو گئی تھی۔ روبی کو قدرے اطمینان ہوا کہ ٹرین اس علاقے سے باہر نہیں جائے گی پھر بھی دل میں ایک خیال ضرور کانٹے کی کھٹک رہا تھا کہ کہیں کسی جگہ وہ پکڑی نہ جائے باہر رہ کر وہ شیر خان کی مدد کر سکتی تھی۔ اگرچہ علاقہ اس کے لئے اجنبی تھا مگر روبی کے پاس تجربہ تھا۔ جرات اور دلیری تھی۔

مال گاڑی کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ روبی نے جھانک کر دیکھا۔ دور اسے ریلوے کے سگنل نظر آئے۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ مال گاڑی عام طور پر چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر کھڑی نہیں ہوا کرتی مگر یہاں شاید گاڑی کے ساتھ کوئی ڈبہ لگنے والا تھا۔ روبی کے پاس چمڑے کا چھوٹا سفری تھیلا ہی تھا۔ اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ شیر خان ڈالر کرنسی نوٹوں کو کسی خفیہ مقام پر چھپانے میں کامیاب ہوا ہے کہ نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ پولیس نے اس سے کرنسی نوٹ بھی برآمد کر لئے ہوں۔ یہ بات روبی کے لئے بلاشبہ تشویش ناک تھی۔

ٹرین کے ارد گرد اب دو مزید ریلوے لائین نمودار ہو گئی تھیں۔ ٹرین کی رفتار مزید کم ہو گئی تھی۔ روبی ڈبے کی دیوار سے اسی طرح لگ کر بیٹھی تھی کہ باہر سے اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ یہ کوئی چھوٹا اسٹیشن تھا۔ ٹرین ریلوے یارڈ میں ہی ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ روبی نے سر باہر نکال کر دیکھا گارڈ کے ساتھ دو آدمی چلے آ رہے تھے۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ گارڈ اور ریلوے کے آدمی ڈبے کے قریب سے گزر گئے۔ ان میں سے کسی کی آواز آئی۔

”دلی تک ٹرین رن تھرو جائے گی۔ بریکیں ایک بار پھر چیک کر لینا۔“

روبی کے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ مال گاڑی یہاں سے دلی جا رہی تھی۔ روبی دلی نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ شیر خان کے بغیر کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جب گارڈ وغیرہ کی آوازیں دور چلی گئیں تو روبی نے ڈبے کی دوسری طرف جھانک کر دیکھا ادھر اونچی نیچی چھوٹی چھوٹی بنجر ٹیکریاں تھیں۔ اس نے ڈبے میں سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگاتے ہی وہ بھاگ کر ایک ٹیکری کے پیچھے ہو گئی۔ وہ جتنی تیز چل سکتی تھی چلنے لگی۔ اس کا حلیہ سیاحوں جیسا تھا۔

مٹیالے رنگ کی پتلون اور جیکٹ کاندھے سے لٹکا ہوا چمڑے کا تھیلا اس کے پاس انڈین کرنسی میں کچھ نقدی موجود تھی۔ جب وہ اسٹیشن سے کافی دور نکل آئی تو کیکر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور فضا میں گرمی تھی۔ روبی کو پسینہ آ گیا تھا۔ اسے پیاس محسوس ہوئی مگر وہاں پانی کہیں نہیں تھا۔ اسے کچھ انسانی آوازیں سنائی دیں۔ ان میں عورتوں اور بچوں کی آوازیں بھی تھیں۔ پھر بکری کے ممیانے کی آواز آئی یہ ساری آوازیں بائیں جانب جو ریت کے ٹیلوں نے ایک دیوار سی کھڑی کر دی تھی اس کی دوسری طرف سے آ رہی تھیں۔

روبی ٹیلے کی طرف چلنے لگی۔ ٹیلے کے اوپر جا کر اس نے دیکھا کہ دوسری طرف کچھ فاصلے پر خانہ بدوشوں نے ڈیرا ڈال رکھا ہے ایک اونٹ اور بکریاں بندھی ہیں۔ سرخ چولیوں اور گھگھریوں والی عورتیں ادھر ادھر کام میں لگی ہیں۔ مرد بھی وہیں بیٹھے تھے۔ روبی کو سخت پیاس لگ رہی تھی۔ ان خانہ بدوشوں کے قریب پہنچ کر روبی رک گئی۔ ایک عورت جو کلہاڑی سے سوکھی شاخیں کاٹ رہی تھی روبی کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر اپنے کام میں لگ گئی اس کا لباس دوسری عورتوں کی طرح راجستھانی لباس تھا روبی کو دیکھ کر دوسری لڑکیاں بھی آ گئیں۔ روبی نے پینے کے لئے پانی مانگا۔ یہ چار خواتین تھیں ان میں ایک ادھیڑ عمر کی تھی باقی تینوں جوان اور خوش شکل تھیں۔ رنگ گہرے سانولے آنکھوں میں صحرائی ہرنیوں والی وحشی چمک' بال بھورے' مینڈھیاں نکلی ہوئیں۔ یہ عورتیں روبی کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ ایک جگہ انہوں نے پھولداری لگا رکھی تھی۔ باہر چارپائی پر ایک بوڑھا بیٹھا ناریل کی گڑگڑی پی رہا تھا۔ اس کی سفید داڑھی راجپوتوں کی طرح اوپر کو کھینچی ہوئی تھی اور سر پر بھاری پگڑھ تھا۔ دو چار نوجوان بھی تھے سب اپنے اپنے کام میں لگے تھے۔

ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یہ لڑکی کون ہے؟“

عورت نے بتایا کہ سیر کرنے آئی ہے ادھر پانی پیئے گی۔ روبی نے انہیں یہی بتایا تھا کہ وہ سیر و سیاحت کے لئے گھر سے نکلی ہے۔ ایک جواں سال لڑکی نے روبی کو پانی پلایا وہ روبی کی جیکٹ اور پتلون دیکھ دیکھ کر شرماتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ کسی مرد نے روبی کی طرف

زیادہ توجہ نہ دی۔ روبی کو یہ لوگ بڑے اچھے لگے ان لوگوں میں وہ کچھ وقت کے لئے اپنے آپ کو روپوش رکھ سکتی تھی۔ اس نے لڑکی سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" وہ چنری کا پلو دانتوں میں دبا کر ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"لاکھی۔" روبی کو یہ نام اچھا لگا۔ روبی نے تھیلے میں سے چاکلیٹ اور بسکٹ نکال کر انہیں دیئے۔ لڑکیاں بڑی خوش ہوئیں ان سے باتیں کرنے کے بعد روبی کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ خانہ بدوش ہی نہیں ہیں بلکہ اصل میں نوٹنکی والے ہیں علاقے میں جہاں کہیں گاؤں میں کوئی بیاہ شادی یا خوشی کا موقع ہو تو یہ وہاں بلاوے پر جا کر نوٹنکی کرتے ہیں۔ ناچتے اور گاتے ہیں روبی کو موقع مل گیا اس نے لاکھی سے کہا۔

"لاکھی بہن! میں دلی کے اخبار میں بھی کام کرتی ہوں۔ اگر تم لوگ نوٹنکی کرتے ہو تو میں تم لوگوں پر ایک مضمون لکھنا چاہتی ہوں۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ میں کچھ روز تم لوگوں کے ساتھ رہوں۔ اخبار میں تمہاری تصویریں بھی چھاپوں گی۔ کیا تم لوگ مجھے اس کی اجازت دو گے؟"

لاکھی ہنسنے لگی۔ اس نے اپنی اماں کو آواز دی۔ ادھیڑ عمر عورت پاس آگئی لاکھی نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ روبی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تم ہمارے ساتھ رہ لوگی چھوکری؟" روبی نے اسے بسکٹوں کا ڈبہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اماں! میں ضرور رہ لوں گی۔ مجھے بڑا مزا آئے گا۔ تم دو تین روز مجھے اپنے پاس رکھ لو۔ تمہاری نوٹنکی دیکھوں گی۔ پھر اخبار میں سارا حال چھاپوں گی دلی گجرات کے لوگ بھی تمہیں جان جائیں گے اور تمہیں بلایا کریں گے۔" یہ بات ادھیڑ عمر خانہ بدوش عورت کو بہت پسند آئی۔ اس طرح سے اس کے کاروبار میں ترقی ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے بات کی جو چارپائی پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ بوڑھے نے ساری بات غور سے سنی۔ پھر سر کو اثبات میں ہلایا۔ روبی بڑی خوش ہوئی۔ خانہ بدوش لڑکی لاکھی نے باری باری سب کو روبی سے ملایا ان میں اس کا خاوند اس کے دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔ یہ سب آپس میں رشتے دار تھے۔ دو چھوٹے لڑکے بھی تھے جن کے بارے میں لاکھی نے روبی کو بتایا کہ

یہ دونوں نوٹنکی میں شیشہ ترنگ بجاتے ہیں اور اس کے ساتھ ناچتے بھی ہیں اور رام لچھمن کی نوٹنکی بھی کرتے ہیں۔ روبی نے انہیں اپنا نام کوشلیا بتایا تھا۔ تب روبی بوڑھے کے پاس گئی اور جیب سے پچاس پچاس کے دو نوٹ نکال کر اس کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا جسے بوڑھے نے بڑی جلدی قبول کر لیا اور روبی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ دوپہر کو روبی نے ان کے ساتھ ہی کھانا کھایا روبی لاکھی کے ساتھ ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو گئی۔ دھوپ کے ڈھلتے ہی خانہ بدوشوں نے چلنے کی تیاری شروع کر دی۔ روبی نے لاکھی سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں سے کس طرف جاؤ گی؟ لاکھی نے بتایا کہ ہول گڑھ گاؤں کے رانا کے بیٹے کی سالگرہ ہے وہاں رات کو نوٹنکی کریں گے۔ ابھی چلیں گے تو شام تک ہول گڑھ پہنچ جائیں گے۔ سامان اور چھولداریاں اونٹ پر لاد دی گئیں۔ عورتیں بچے دوسرے اونٹ پر بیٹھ گئے۔ روبی اور لاکھی گدھوں پر سوار ہو گئیں اور یہ خانہ بدوش کنبہ ایک طرف چل پڑا۔

کوشلیا یعنی روبی کو ان نوٹنکی والے خانہ بدوشوں کے پاس چھوڑ کر ہم واپس شیر خان کی طرف چلتے ہیں۔ جب تھانیدار نے اسے ہتھکڑی لگوا کر سپاہیوں کے ساتھ تھانے کی طرف روانہ کیا تو شیر خان کو روبی کے بارے میں تشویش ہوئی۔ ظاہر تھا کہ پولیس پارٹی سی آئی ڈی انسپکٹر کمنہ لعل کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر جا کر روبی کو بھی حراست میں لے لے گی اور خدا جانے اسے کہاں رکھا جائے اور اس پر کیسا کیسا تشدد کیا جائے۔ شیر خان کا ذہن روبی کی طرف سے سخت پریشان تھا۔ تھانے میں اسے حوالات کے اندر بند کر دیا گیا۔

تھانیدار جب انسپکٹر کمنہ لعل اور چار سنتریوں کے ساتھ اسٹیشن پر آیا تو ویٹنگ روم خالی تھا۔ روبی وہاں نہیں تھی۔ تھانیدار نے انسپکٹر کی طرف دیکھا "وہ یہیں کہیں ہو گی۔" انسپکٹر نے ویٹنگ روم سے باہر نکلتے ہوئے کہا اسی وقت سپاہی تھانیدار کے حکم سے ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر روبی کو تلاش کرنے لگے۔ مگر اس وقت تک روبی مال گاڑی میں سوار ہو کر ان کی پہنچ سے دور نکل چکی تھی۔ انسپکٹر کمنہ لعل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لڑکی کہاں نکل گئی۔ وہ تھانیدار کے ساتھ اسٹیشن کے گیٹ پر آیا۔ ٹکٹ چیکر سے پوچھا۔ ٹکٹ چیکر نے انہیں اپنے اور شیر خان کے درمیان ہونے والی گفتگو بتا دی۔

"کمنہ لعل! یہ دونوں پاکستانی جاسوس ہیں اور بڑے خطرناک جاسوس معلوم ہوتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ لڑکی کو کیسے معلوم ہو گیا کہ پولیس اس کے خاوند کو پکڑنے کے بعد اس کو پکڑنے آرہی ہے۔"

انسپکٹر بھی اپنی جگہ حیران اور تذبذب میں تھا۔

"وہ اس شہر میں اجنبی ہے۔ ہم اسے بہت جلد ڈھونڈ نکالیں گے۔ تم شہر کی ناکہ بندی

کرا دو"

"وہ تو میں ابھی کرا دوں گا مگر یہ مت بھولو کہ ان پاکستانی جاسوسوں کے آدمی ضرور یہاں موجود ہوں گے۔ جنہوں نے لڑکی کو چھپا لیا ہو گا۔" تھانیدار نے کہا۔

پولیس نے شہر کی ناکہ بندی بھی کر دی اور شہر میں روبی کی تلاش بھی شروع ہو گئی۔

شیر خان سے بھی پوچھ گچھ کی گئی کہ اس کی بیوی یا ساتھی لڑکی کہاں جا سکتی ہے اور یہ کہ جودھ پور میں ان کے دوسرے ساتھی کہاں رہتے ہیں ان کا اڈہ کہاں ہے۔ شیر خان نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا کہ روبی پولیس کے قابو نہیں آئی تھی مگر ساتھ ہی اسے فکر بھی لگی کہ روبی کے لئے یہ ملک اجنبی ہے وہ کہاں جائے گی؟ اس نے پولیس کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ لنکا سے انڈیا میں آئے ہیں اور پاکستان جا کر نئی زندگی شروع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ دونوں کی منگنی ہو چکی ہے اور انہوں نے پاکستان جا کر شادی کرنی تھی۔ تھانیدار نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"شادی تو ہم تمہاری یہیں کرائیں گے اب ......" رات شیر خان پر تشدد شروع ہو گیا۔ اگر اسے سخت جانی کی عادت نہ ہوتی تو پولیس تشدد سے بہت جلد اس کی موت ہو جاتی۔ مگر وہ زندہ رہا اسے روبی کے لئے زندہ رہنا تھا روبی کی محبت اور نئی زندگی کا خواب شیر خان کو بڑی طاقت دے رہا تھا۔

شیر خان کو مارا پیٹا گیا۔ اس کے بازوؤں اور گردن کو شکنجوں میں کسا گیا۔ مگر وہ زندہ رہا اور یہی کہتا رہا کہ میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ روبی میری منگیتر ہے۔ ہم مسلمان ضرور ہیں مگر کسی بھی ملک کے دشمن نہیں ہیں۔ ہم بھاگ کر لنکا سے آئے ہیں۔ ہم بہا جا رہے تھے کہ طوفان میں پھنس گئے اور ٹوٹی ہوئی کشتی نے ہمیں انڈیا کے ساحل پر لا پھینکا۔ مگر پولیس کو یقین تھا کہ شیر خان زیادہ دیر تک تشدد برداشت نہ کر سکے گا اور انڈیا میں اپنے دوسرے پاکستانی ساتھیوں کا ٹھکانہ ضرور بتا دے گا شیر خان کے بیان پر پولیس کو کبھی اعتبار نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ اس پر تشدد جاری رکھا۔ اس قسم کی شدید جسمانی تکلیف سے شیر خان کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس کا کوئی پاکستانی ساتھی انڈیا میں ہوتا تو وہ اس کی نشاندہی کرتا۔ اسے تو کسی کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ پولیس کا تشدد برداشت کرتا رہا اور

روبی کے بارے میں یہی سوچتا رہا کہ وہ کہاں ہو گی۔ راجستھان پولیس نے شیر خان کے خلاف جاسوسی اور غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہونے کا پرچہ درج کر کے عدالت سے دس روز کا ریمانڈ لے لیا تھا۔ یہ دس روز قیامت کے دن تھے۔ جب پولیس شیر خان سے اپنے مطلب کا بیان حاصل کرنے میں ناکام رہی تو اس نے عدالت سے مزید دس روز کا ریمانڈ لے لیا۔

روبی اپنے محبوب اور جیون ساتھی شیر خان کی حالت سے بے خبر مگر دل میں طرح طرح کے وسوسے لئے خانہ بدوش راجستھانی نوٹنکی والوں کے ساتھ اس گاؤں میں پہنچ گئی جہاں زمیندار رانا جے سنگھ کے بچے کی سالگرہ کی تقریب میں ان کو نوٹنکی کا پروگرام پیش کرنا تھا۔ روبی کو اس حقیقت کا شدت سے احساس تھا کہ پتلون اور جیکٹ کے لباس میں وہ دوسروں کی نظروں میں آسکتی ہے چنانچہ اس نے لاکھی سے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تمہاری ہی طرح کے کپڑے پہن کر تمہارے ساتھ رہوں تاکہ مجھے تم لوگوں میں اجنبیت محسوس نہ ہو۔ اس طرح سے میں تم لوگوں کے زیادہ قریب ہو جاؤں گی اور اپنے آپ کو اجنبی ماحول میں محسوس نہ کروں گی۔" ان لوگوں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ لاکھی نے روبی کو خانہ بدوش عورتوں کا لباس پہنا دیا۔ اس لباس میں روبی ان لوگوں کی طرح نظر آنے لگی۔ اس کے بال گردن تک کٹے ہوئے تھے جس کی اس نے لاکھی سے مینڈھیاں گندھوالیں اور ماتھے پر چاندی کا ٹیکا بھی سجا لیا۔ اب اسے کوئی مشکل ہی سے پہچان سکتا تھا۔ چنانچہ جب نوٹنکی والوں کی یہ ٹولی رانا جے سنگھ کے گاؤں میں پہنچی تو روبی خانہ بدوش لڑکی کے بھیس میں تھی وہ لوگ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے گاؤں پہنچے۔ گاؤں والوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ رانا جے سنگھ نے انہیں ایک حویلی میں ٹھہرایا۔ رات کو نوٹنکی کا پروگرام تھا لاکھی اور دوسری عورتوں اور مردوں نے رات کے کھانے کے بعد تیاریاں شروع کر دیں۔ گاؤں کے باہر ایک کھلی جگہ پر دریاں بچھا دی گئیں۔ گاؤں کے مرد عورتیں دائرے کی شکل میں آکر بیٹھ گئے۔ گیس کے ہنڈے روشن کر کے بانس کے ڈنڈوں کے ساتھ لٹکا دیئے گئے۔ نوٹنکی والوں نے ایک طرف پردے کی اوٹ میں اپنے لئے جگہ بنا لی تھی لاکھی کی ماں اور روبی دونوں ان سازندوں کے پہلو میں

بیٹھی تھیں لاکھی کی ماں کو بھی مردوں کے ساتھ گانا تھا۔ رانا جے سنگھ اپنے چھ سالہ بیٹے کو لئے آگیا۔ بچے نے زرق برق لباس پہن رکھا تھا۔ رانا جے سنگھ ایک جوان خوبرو تھا۔ اس کی بیوی ساتھ نہیں آئی تھی بلکہ جیسا کہ راجپوت شرفا میں رواج ہوتا ہے وہ اپنی حویلی کے جھروکے میں بیٹھی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

صحرائی رات خاموش اور سحرزدہ سی تھی۔ نوٹنکی والوں کی ٹولی میں لاکھی اور ویر بالا دو بہترین گانے اور ناچنے والیاں تھیں دونوں کو پردے کی اوٹ میں تیار کیا جا رہا تھا۔ رانا جے سنگھ اپنے بیٹے کو اپنے پہلو میں بٹھائے ایک کاؤچ پر براجمان تھا اور بڑا قیمتی سگار پی رہا تھا۔ اس نے اپنے مختار کار کو اشارہ کیا اور کہا

"انہیں کہو شروع کریں۔"

سازندوں نے رانا کا اشارہ دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ مختار کار ان کو کچھ کہتا نقارچی نے نقارے پر چھڑیاں چلانی شروع کر دیں۔ شیشہ ترنگ والے لڑکے بھی اپنے شیشے کے ساز بجانے لگے۔ روپ مستی باز بہادر کی داستان الفت کا یہ کھیل صحرائی رات میں ستاروں کی چھاؤں میں جاری رہا روبی نے اس دوران محسوس کیا کہ رانا جے سنگھ کبھی کبھی بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ لیتا ہے۔ اس نے کوئی خیال نہ کیا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ اپنے گورے رنگ اور دلکش شہری نین نقش کی وجہ سے وہ خانہ بدوشوں کے لباس میں بھی ان خانہ بدوش لڑکیوں سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ وہ گیس کے ہنڈے کی روشنی میں بیٹھی تھی جہاں رانا جے سنگھ کی نظریں اس پر بڑی آسانی سے پڑ سکتی تھیں۔

رات کے تین بج رہے تھے جب نوٹنکی ختم ہوئی۔ روبی نے پردے کے پیچھے جا کر لاکھی اور ویر بالا کو مبارک باد دی اور اس کے رقص کی بڑی تعریف کی۔ سب لوگ اپنی اپنی چیزیں سمیٹ کر حویلی میں آگئے جہاں ان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ لاکھی ویر بالا روبی اور دوسری عورتیں پردہ لگا کر قالین پر سونے کے لئے لیٹ گئیں۔ دوسری طرف ادھیڑ عمر عورت اور اس منڈلی کا سربراہ بوڑھا جگو وہ نوٹ گن رہا تھا جو رانا نے گانے والیوں پر نچھاور کیے تھے۔ وہ بڑا خوش تھا۔

"آج تو لکشمی دیوی بڑی مہربان ہے رانی۔ ابھی ٹھاکر سے انعام کی رقم بھی ملنے والی

ہے۔" اتنے میں رانا کا خاص نوکر اندر آیا اور اس نے جگو سے کہا

"تمہیں رانا جی نے یاد کیا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔" جگو نے مسکرا کر ادھیڑ عمر عورت رانی کی طرف دیکھا اور فوراً نوکر کے ساتھ چل پڑا۔ رانا اپنی حویلی کی سجی سجائی بیٹھک میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ پرانی وضع کے آبنوسی کاؤچ لگے تھے۔ دیواروں پر رانا کے اجداد کی بڑی بڑی رنگین تصویریں سجی تھیں جگو نے اندر داخل ہوتے ہی جھک کر پرنام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ رانا نے نوکر کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ پھر جگو کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"تمہاری نوٹنکی ہمیں بہت پسند آئی۔" پھر لکڑی کے کام والی پرانی الماری کھول کر اس میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر جگو کی طرف بڑھائی۔ "یہ تمہارا انعام ہے۔" جگو نے بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلا دیے۔ رانا نے ہاتھ ذرا پیچھے کھینچ لیا اور پوچھا "تمہارے پاس گورے رنگ والی لڑکی کون تھی جگو؟ اس نے نوٹنکی میں حصہ کیوں نہیں لیا؟" جگو ایک تجربہ کار ہوشیار اور بڑا کائیاں آدمی تھا اس نے ایسے کئی عیش پرست زمیندار رانا اور ٹھاکر دیکھے تھے۔ فوراً سمجھ گیا کہ رانا نے یہ بات کس غرض کے لئے پوچھی ہے۔ رانا کا اشارہ روبی کی طرف تھا۔ جگو نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"مائی باپ کس لڑکی کا پوچھتے ہیں؟"

رانا نے مزید وضاحت کرتے ہوئے روبی کا حلیہ بھی بیان کر دیا۔ جگو نے بڑی عیاری سے کام لیتے ہوئے فوراً ایک کہانی دل میں گھڑلی اور بولا۔

"مائی باپ! اس لڑکی کا نام کوشلیا ہے۔ وہ ہماری منڈلی میں نئی نئی آئی ہے۔ ابھی ناچ گانا سیکھ رہی ہے۔" جگو سمجھ گیا تھا کہ عیاش رانا کا جی اس لڑکی پر آگیا ہے اور مال کمانے کا یہ سنہری موقع ہے۔ روبی نہ جانے کون تھی اور کہاں سے آگئی تھی۔ جگو بڑی آسانی کے ساتھ اسے رانا کے پاس فروخت کر کے وہاں سے رفو چکر ہو سکتا تھا۔ خانہ بدوشوں کا کیا ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ پھر روبی کا کوئی والی وارث بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی والی وارث کھوج لگاتا رانا جے سنگھ کی حویلی میں آبھی گیا تو وہ لڑکی برآمد نہ کر سکے گا۔ ایک بار لڑکی رانا کی حویلی میں داخل ہوئی تو پھر اس کی لاش بھی کسی کو نہ مل سکے گی۔ نہ جانے ایسی کتنی

لڑکیاں ان جاگیرداروں ٹھاکروں کی عیاشیوں کی بھینٹ چڑھ کر حویلی کے تاریک تہ خانوں میں دفن ہو گئیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ جگو ہاتھ باندھے رانا کے حضور کھڑا تھا رانا جے سنگھ نے سو سو کے نوٹوں کی گڈی جگو کے ہاتھ میں تھمائی اور کہا۔

"پانچ ہزار روپوں کی ایک گڈی میری الماری میں پڑی ہے وہ بھی تمہارا انعام ہے مگر یہ انعام تمہیں اس وقت ملے گا جب اس لڑکی کو میرے پاس چھوڑنے آؤ گے۔" جگو نے نوٹوں کی گڈی کو اپنی صدری میں ڈالتے ہوئے عرض کی۔

"مائی باپ! آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔ پر ایک بات ہے۔ لڑکی کا ماموں بھی ہمارے ساتھ ہے مجھے اسے ادھر ادھر کرنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم ایک دن مزید یہاں ٹھہر جاؤ۔ کل کی رات بھی نوٹنکی کا کھیل کرنا۔"

جگو یہی چاہتا تھا۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"جو حکم مائی باپ۔ اب اجازت دیں۔" رانا نے اپنی شارک رسکن کی سفید اچکن کی جیب میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر جگو کو دیے اور کہا۔

"کل رات لڑکی میرے پاس چھوڑ کر تم صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جاؤ گے۔ باقی ساڑھے چار ہزار روپے تمہیں اس وقت ملیں گے جب لڑکی کو میری اس بیٹھک میں لاؤ گے۔" جگو نے پانچ سو روپے کے نوٹ صدری کی دوسری جیب میں ٹھونسے اور دونوں ہاتھ ماتھے پر لے جا کر پرنام کیا۔

"لڑکی کل رات آپ کے قدموں میں ہو گی سرکار پر ہجور کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔ ہم غریب آدمی ہیں پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو کوئی پوچھنے والا نہ ہو گا۔" رانا نے گردن اٹھا کر کہا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ لڑکی ایک بار ہمارے پاس آگئی تو پھر ہم جانیں اور ہمارا کام پولیس کی کیا مجال کہ ادھر آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے۔ ہاں اگر لڑکی کے ماموں نے کوئی گڑ بڑ کی تو اس کے ساتھ تمہاری لاش بھی کسی کو نہ ملے گی۔" جگو نے سر جھکا دیا اور عاجزی سے بولا۔

"مائی باپ میں اسے سنبھال لوں گا۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ آدھی رقم اسے دے

دوں گا مگر آپ کو پریشان نہیں ہونے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب جاؤ آرام کرو۔ کل رات بارہ بجے کے بعد میں اس بیٹھک میں تمہارا اور لڑکی کا انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر رانا جے سنگھ نے چاندی کے راکھدان میں سگار مسل دیا۔ جگو جھک جھک کر پرنام کرتا بیٹھک سے نکل آیا۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ دو ہزار انعام ملا تھا۔ پانچ سو روپے الگ مل گئے تھے۔ اور ساڑھے چار ہزار کی رقم کل رات ملنے والی تھی۔ حویلی میں آکر اس نے دو ہزار کی رقم ادھیڑ عمر عورت رانی کے حوالے کی اور کہا۔

"رانا جے سنگھ جی نے یہ انعام دیا ہے۔ اسے سنبھالو باقی انہوں نے کہا ہے کہ وہ کل بھی نوٹنکی دیکھیں گے۔" رانی دو ہزار روپے لے کر بڑی خوش ہوئی۔ اسے اتنے روپوں کی توقع نہیں تھی کہنے لگی۔

"ارے جگو! کل کی نوٹنکی کا بھی انعام ملے گا نا؟"

"کیوں نہیں۔ وہ کوئی ہماری طرح غریب غربا ہیں کیا؟" جگو نے پانچ سو روپے کے نوٹ اپنی صدری کی جیب میں ہی رکھے یہ تو اس کا مال تھا۔ وہ ایک طرف چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اس کا عیار دماغ بڑی تیزی سے کوشلیا یعنی روبی کو پھانس کر رانا کی بیٹھک میں لے جانے کے منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ اس کے لئے یہ کوئی انوکھا اور وقت طلب مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے خانہ بدوشوں میں آنکھ کھولی اور خانہ بدوشوں کے ماحول میں ہی زندگی گزاری تھی۔ اپنی طویل زندگی میں اس نے کئی چھوٹے موٹے جرم کیے تھے۔ چنانچہ بہت جلد ایک ترکیب اس کے دماغ میں آگئی اور وہ سو گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو سب خانہ بدوش سو کر اٹھے۔ لاکھی اور روبی تالاب پر نہانے کے لئے گئی ہوئی تھیں جگو کے منصوبے کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ اسے رات کو دس بجے نوٹنکی ختم کرتے ہی اس گاؤں سے کوچ کر جانا تھا۔ رانی چولہے کے پاس بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ جگو گڑگڑی لے کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

"نوٹنکی ختم کرتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ رات کو آرام کر کے صبح چلے جائیں گے۔" جگو نے اسے

ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

"جس بات کی خبر نہ ہو چپ رہا کرو۔" پھر حقے کے دو تین کش لگا کر بولا۔ "میرے آدمیوں نے خبر دی ہے کہ اس گاؤں میں کوئی جیل توڑ کر بھاگا ہوا قاتل چھپا ہے۔ ہو سکتا ہے آج رات پولیس یہاں چھاپہ مارے۔ پولیس ہمیں بھی شک شبے میں پکڑ سکتی ہے۔ اس لئے نوٹنکی کے ختم ہوتے ہی یہاں سے چلتے بنیں گے۔ رانا جی آج بھی تماشا دیکھنا چاہتے ہیں کیا کروں۔ مجبور ہو گیا ہوں۔ ورنہ ہم آج ہی یہاں سے کوچ کر جاتے۔" ادھیڑ عمر رانی چپ رہی اس نے جگو کے آگے کبھی زیادہ تکرار نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جگو ضدی آدمی ہے کسی کی نہیں سنتا اس نے رانی کی طرف متوجہ ہو کر رازداری کے انداز میں کہا۔

"ہمارے آج رات یہاں سے جانے کی لاکھی ویر بالا اور کوشلیا کو خبر نہ ہو۔ ورنہ یہ بات سارے گاؤں میں پھیل جائے گی۔ پولیس کو پتا چل جائے تو ہو سکتا ہے وہ رات ہونے سے پہلے ہی قاتل کی تلاش میں یہاں چھاپہ مار دے۔"

جگو اور رانی صرف پولیس کے چھاپے سے ڈرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی زندگیاں ان گنت قسم کے چھوٹے موٹے جرائم سے داغ دار تھیں اور انہیں معلوم تھا کہ ایک بار پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو پھر کوئی انہیں بچانے نہ آئے گا۔ رانی روٹیاں چنگیر میں رکھتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ میں ان لڑکیوں سے بات نہیں کروں گی۔ تم کہاروں سے کہہ دینا کہ اونٹنیاں تیار رکھیں۔"

"یہ سب میں سنبھال لوں گا۔" جگو نے تیز نگاہوں سے ادھر ادھر تکتے ہوئے کہا۔

"بس لڑکیوں کے آگے تم زبان بند رکھنا۔ انہیں عین وقت پر بتا دیں گے کہ پولیس کے چھاپے کے ڈر سے کوچ کر رہے ہیں۔"

رانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ شام ہونے سے پہلے پہلے جگو نے منڈلی کے ان آدمیوں کو بھی یہی پولیس چھاپے کی من گھڑت کہانی سنا کر ہوشیار کر دیا کہ وہ گدھوں اور اونٹوں پر ضروری سامان پہلے سے لاد کر تیار رکھیں گے تاکہ تماشا ختم ہوتے ہی وہ گاؤں خالی کر دیں۔ روبی کو رانا کے پھندے میں پھانسنے کے لئے جو جال تیار کیا جا رہا تھا وہ اس سے بالکل

بے خبر دن بھر لاکھی اور ویر بالا کے ساتھ چھوٹے موٹے کام کرتی اور باتیں کرتی رہی۔ اس دوران کئی بار اس کا خیال شیر خان کی طرف گیا اور وہ سوچتی رہی کہ شیر خان کو پولیس کی حراست سے کیسے چھڑایا جا سکتا ہے۔ ابھی اس کے دماغ میں کوئی ترکیب نہیں آئی تھی لیکن اسے ایک اطمینان ضرور تھا کہ وہ اس علاقے میں ہی ہے جہاں شیر خان حوالات میں بند ہے۔ شام کے وقت جب نوٹنکی کھیلنے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو روبی اچانک اس خیال سے پریشان ہو گئی کہ کہیں پولیس شیر خان کو دلی نہ لے گئی ہو۔ یہ پتا چلانے کے لئے پولیس اسٹیشن جانا ضروری تھا۔ وہ خانہ بدوش لڑکی کے حلیئے میں تھی۔ وہ اس حلیئے میں اگر جودھ پور پولیس اسٹیشن پر گئی تو شاید اسے کوئی نہیں پہچانے گا۔ مگر اس میں خطرہ زیادہ تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ کیوں نہ لاکھی کو اعتماد میں لے کر ایسا انتظام کرے کہ یہ لوگ نوٹنکی دکھانے جودھ پور چلے چلیں پھر وہ لاکھی کے ساتھ مل کر شیر خان کا سراغ لگا سکتی ہے۔ بلکہ اسے حوالات سے نکال لے جانے کی کوشش بھی کر سکتی ہے۔ روبی نے فیصلہ کر لیا کہ کل صبح وہ لاکھی کو شیر خان اور اپنے بارے میں ساری بات بتا دے گی اور اس سے امداد کی طلب گار ہو گی۔ لاکھی کی بات جگو بھی نہیں ٹالتا تھا۔ وہ منڈلی کو جودھ پور لے جانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

روبی یہ سوچ رہی تھی اسے کوئی خبر نہیں تھی کہ جگو اسے رانا کے پاس فروخت کرنے کی اسکیم تیار کر چکا ہے۔ سورج غروب ہونے کے کچھ ہی دیر بعد جگو کی تجویز کے مطابق کھلی جگہ دریاں بچھا دی گئیں اور نوٹنکی شروع ہو گئی۔ گاؤں کے لوگ بڑے خوش تھے۔

رانا جے سنگھ بھی وہاں موجود تھا اور اپنے کاؤچ پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ آج اس کا بیٹا ساتھ نہیں تھا۔ نوٹنکی شروع کروا کر جگو اس طرف درختوں میں چلا آیا جہاں اندھیرے میں اس کے خاص آدمی اونٹوں اور گدھوں پر چھوٹا موٹا سامان لاد رہے تھے۔ چھولداری بھی لپیٹ دی گئی تھی۔ جہاں نوٹنکی ہو رہی تھی ادھر سے گھنگھروؤں نقارے شہنائی اور شیشہ ترنگ بجنے کی آواز آ رہی تھیں۔ جگو نے ایک نظر تمام تیاریوں کو دیکھا اور پھر ناریل کی گڑگڑی منہ سے لگائے ہلکے ہلکے کش لیتا منڈلی والوں کے پیچھے آ کر بیٹھ گیا اس وقت ویر بالا

اور لاکھی راجستھانی لوک ناچ ناچ رہی تھیں۔

رانا کاؤچ پر بیٹھے بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ جگو اس عیاش زمیندار کی بے چینی کو خوب جانتا تھا۔ روبی قریب ہی بیٹھی بڑی دلچسپی سے ناچ دیکھ رہی تھی۔ جگو کے دماغ میں پوری اسکیم موجود تھی۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ نوٹنکی کا آخر حصہ پیش کیا جا رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق ٹھیک ساڑھے نو بجے اپنی گھڑی پر نظر ڈالنے کے بعد رانا جے سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک نظر جگو کو دیکھا اور اپنے ملازم کے ساتھ حویلی کی طرف چل دیا۔ کام شروع کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ روبی جگو کے قریب ہی بیٹھی ناچ دیکھ رہی تھی۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ روبی کی سگریٹ پینے کی عادت کو سامنے رکھتے ہوئے جگو نے اسکیم بنائی تھی۔ ان لوگوں کو جنگلی، صحرائی جڑی بوٹیوں کی بڑی واقفیت تھی۔ کوئی بیمار پڑتا تو یہ لوگ جڑی بوٹیوں سے ہی علاج کر لیتے تھے۔ ایک خاص بوٹی کا سفوف تیار کر کے جگو ہمیشہ اپنے پاس حاضر اسٹاک میں موجود رکھتا تھا اس سفوف کی یہ تاثیر تھی کہ اس کی چٹکی بھر خوراک پانی میں گھول کر کسی کو پلا دی جائے تو وہ بے ہوش ہو جاتا تھا۔ جگو نے موقع محل کی مناسبت سے ایک سگریٹ تیار کر رکھا تھا جس میں یہ سفوف بھر دیا گیا تھا۔

رانا جے سنگھ اٹھ کر اپنی حویلی کی طرف گیا تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جگو اپنی جگہ سے اُٹھ کر روبی کے پیچھے آکر بیٹھ گیا اور اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر بولا۔

"بیٹی کوشلیا تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ گاؤں کے باہر جو کنواں ہے وہاں چلو۔"

روبی نے تعجب بھری نگاہوں سے جگو کی طرف دیکھا۔ وہاں ڈھولک اور نقارے اور گانے والوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ جگو اپنا منہ روبی کے کان کے قریب لے گیا۔

"بیٹی یہاں میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا تم کنویں پر چلو۔ ایک آدمی نے تمہارے نام بڑا خاص پیغام بھیجا ہے جو تم تک پہنچانا ہے۔"

روبی کے کان کھڑے ہو گئے کہیں شیر خان نے تو کوئی پیغام نہیں بھجوایا۔ ہو سکتا ہے اسے کسی طریقے سے یہ خبر ہو گئی ہو کہ روبی خانہ بدوشوں کی منڈلی میں ہے۔ وہ فوراً اٹھی اور گانے والوں کے عقب سے ہوتی ہوئی گاؤں والے کنوئیں کی طرف چل پڑی۔ اسے پکا یقین تھا کہ شیر خان نے کسی کے ہاتھ اس کے لئے کوئی ضروری پیغام بھیجا ہے۔ دوسری طرف جگو نے یہ حربہ اس وجہ سے آزمایا تھا کہ یہ لڑکی شہر دلی سے آئی ہے شہر میں ضرور اس کے ماں باپ رہتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کسی کے ساتھ اس کا عشق بھی چل رہا ہو۔ چنانچہ وہ یہ پیغام سننے کے لئے ضرور بے تاب ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

روبی کو گئے دس منٹ گزر گئے تو جگو نے گڑگڑی لکڑی کے ایک کھوکھے پر رکھی اور بڑے سکون سے چلتا اونٹنیوں کی طرف سے ہوتا ہوا گاؤں کے باہر والے کنوئیں کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ گاؤں میں

صرف رانا جے سنگھ کی حویلی کے اوپر والی منزل میں روشنی ہو رہی تھی۔ گاؤں والے کنوئیں کا انتخاب جگو نے اس لئے کیا تھا کہ یہاں سے رانا کی بیٹھک چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ اس وقت جگو کی جیب میں لکڑی کا ایک سگریٹ کیس بھی تھا۔ اس سگریٹ کیس میں صرف دو سگریٹ تھے۔ ایک عام سگریٹ تھا اور دوسرے سگریٹ میں بے ہوشی کا سفوف بھرا ہوا تھا۔ اس سگریٹ کے فلٹر کو جگو نے چاقو کی نوک سے کھردرا کر دیا تھا تاکہ رات کے اندھیرے میں اس کی انگلیاں اسے پہچان لیں۔ وہ کنوئیں کے پاس آیا تو روبی کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھی بے چینی سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جگو نے جاتے ہی روبی کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

کوشلیا! تم میرے لئے بیٹی کی جگہ ہو۔ تمہیں ہماری منڈلی میں آئے ہوئے کچھ روز ہی ہوئے ہیں۔ مگر مجھے تم سے بیٹیوں جیسی محبت ہو گئی ہے۔"

روبی نے جلدی سے پوچھا۔" جگو بابا بات کیا ہے۔ کس نے پیغام بھیجا ہے میرے لئے؟" روبی کی بے چینی کو دیکھ کر جگو سمجھ گیا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے اور اس لڑکی کے پیچھے ضرور کوئی ایسا آدمی ہے جس کے بارے میں یہ پریشان ہے۔ جگو کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ منڈیر کافی چوڑی تھی اور جگو کو یقین تھا کہ بے ہوش ہونے کے بعد یہ لڑکی کنوئیں میں نہیں گرے گی۔ اگر ایسی کسی بات کا خطرہ ہوتا تو وہ روبی کو وہاں سے اٹھا کر دوسری طرف لے جاتا۔ جگو نے جیب سے ماچس اور سگریٹ کیس نکال لیا اور سانس بھر کر بولا۔

"بیٹی! جس آدمی نے یہ پیغام بھیجا ہے اسے کسی طریقے سے پتا چل گیا ہے کہ تم ہماری منڈلی کے ساتھ ہو پیغام سے لگتا ہے کہ وہ تم سے پریم کرتا ہے۔"

جگو یونہی قیاس آرائی کے ساتھ اندھیرے میں تیر چلا رہا تھا۔ اور اس کا ہر تیر ٹھیک نشانے پر جا کر لگ رہا تھا۔ روبی کی بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ پیغام شیر خان کا ہی ہے۔

"بابا! جلدی بتاؤ نا کس نے پیغام بھیجا ہے؟ کیا اس کا نام شیر خان تو نہیں؟"

جگو بڑا خوش ہوا۔ روبی نے خود اس کے ہاتھ میں ترپ کا پتا تھما دیا تھا۔ وہ بولا

"تم نے ٹھیک پہچانا بیٹی کوشلیا! شیر خان نے ہی تمہارے لئے پیغام بھجوایا ہے۔ مگر گھبراؤ مت۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم اطمینان سے بیٹھو میں ساری بات تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ لو سگریٹ پیئو۔ ولایتی سگریٹ ہے۔ جے پور میں ایک گورے سیلانی نے مجھے اس کی ڈبی دی تھی۔"

روبی کو اس وقت سگریٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر جگو کا دل رکھنے کے لئے اس نے سگریٹ لے لیا۔ جگو نے پوری احتیاط کے ساتھ روبی کو کھردرے فلٹر والا سگریٹ دیا تھا۔ دوسرا سگریٹ اس نے خود لے لیا۔ اس نے ماچس جلائی اور بولا۔

"میری بچی! شیر خان نے تمہیں آج رات دو بجے پرانی بارہ دری کے کھنڈر میں بلایا ہے۔"

روبی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ جگو نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسکیم بڑی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اسی دوران روبی نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ جگو اپنے سگریٹ کا لمبا کش لگا کر کہنے لگا۔ "بیٹی! زمانہ بڑا خراب ہے مجھے تم اپنی بچی کی طرح عزیز ہو۔ ڈر ہے تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔ ویسے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے بتاؤ گی کہ یہ شیر خان کون ہے؟ تم ہندو ہو اور یہ شخص مسلمان ہے۔ کیا تم اس سے پریم کرتی ہو بیٹی؟"

اس دوران روبی سگریٹ کے دو تین کش لگا چکی تھی شیر خان سے ملنے کے تصور نے اس کے جذبات میں ہلچل مچا دی تھی۔ کہنے لگی۔

"بابا! میں شیر خان سے پیار کرتی ہوں مگر دنیا والے ہمیں ایک جگہ اکٹھے نہیں دیکھنا چاہتے۔"

جگو روبی کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بوٹی کے سفوف کا اس پر اثر کیوں نہیں ہو رہا؟ کہیں سفوف کی تیاری میں کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہو گئی؟ جگو یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بات کرتے کرتے روبی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ جگو جلدی سے بولا۔

"کیا بات ہے بیٹی! سر درد کرنے لگا ہے؟"

روبی کو ایک چکر آیا اور وہ جگو کی گود میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ جگو نے فوراً اسے اپنے کاندھے پر ڈالا اور حویلی کی طرف چلا۔ حویلی کی بیٹھک میں روشنی ہو رہی تھی۔

دروازے کے دونوں پٹ کھلے تھے مگر پردہ گرا ہوا تھا۔ اس نے بیٹھک میں جاتے ہی بے ہوش روبی کو پلنگ پر ڈال دیا۔ رانا نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور روبی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اسے کیا ہو گیا ہے؟" جگو بولا۔

"سرکار میں نے اسے ایک بوٹی پلا کر بے ہوش کیا ہے۔ ایسا نہ کرتا تو میں اسے آپ کے پاس کبھی نہ لا سکتا تھا۔ اس کے ماموں کو میں نے دوپہر کو ہی جے پور بھجوا دیا تھا۔ ہم راتوں رات یہاں سے کوچ کر رہے ہیں۔ آپ کی امانت آپ کو پہنچا دی ہے۔ اب آگے جا کر میرا جو حال ہو سو ہو۔ بھگوان جانے ماموں مجھے زندہ بھی چھوڑے گا یا نہیں ...... اسے سنبھالئے۔ دن نکلنے تک بوٹی کا اثر رہے گا پھر اسے ہوش آجائے گا۔" رانا نے روبی کو جھک کر غور سے دیکھا۔ اس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ روبی کی نبض بالکل ٹھیک چل رہی تھی۔ وہ سانس بھی نارمل طریقے سے لے رہی تھی۔ اس کے جسم کی حرارت بھی نارمل تھی۔ سانس لیتے ہوئے بے ہوش روبی کا سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ رانا جے سنگھ الماری کے پاس گیا۔ اندر سے ساڑھے چار ہزار روپے کے کرنسی نوٹ نکال کر جگو کو دیئے اور کہا۔

"اب تم میں سے کبھی کوئی اس گاؤں کا رخ نہ کرے۔" جگو نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مائی باپ ہم تو اس گاؤں کو بھول جائیں گے پر آپ بھی اس چھوکری کا خیال رکھئے گا۔ یہ بڑی ہوشیار لڑکی ہے۔"

رانا نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

"وہ میں جانوں میرا کام' تم اب یہاں سے نکل جاؤ۔"

جگو نے عاجزی سے کہا۔

"سرکار! میرا انعام آپ نے وعدہ کیا تھا؟" رانا نے جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر جگو کے حوالے کیے۔ جگو سلام کرنے کے بعد بیٹھک سے نکل کر گاؤں کی اندھیری گلی میں غائب ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی رانا جے سنگھ نے اپنا الٹا ہاتھ بے ہوش روبی کی گردن کے ساتھ لگایا۔

روبی کا دل نپی تلی تال کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ اس کا بدن گرم تھا۔ رانا کے چہرے

پر ہوسناک جذبوں کا ایک سایہ سا لہرا گیا۔ مجھے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا ہو گا رانا پیچھے ہٹ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

خانہ بدوش جگو نے کہا تھا کہ لڑکی کو صبح ہوش آئے گا۔ صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی ۔ رانا اس وقت تک جام و مینا سے دل بہلانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی راز دار نوکرانی کو دوسرے کمرے میں بھجوا دیا تھا۔ رانا کی پتنی حویلی کے اوپر والی منزل میں اپنے بیڈ روم میں سو رہی تھی۔ وہ ایک مجبور اور خاندانی رسم و رواج اور وضع داریوں میں جکڑی ہوئی عورت تھی اور اپنے خاوند کی بد عادتوں سے اچھی طرح واقف تھی ۔ مگر وہ محل نما حویلی میں رہ کر اپنے بچوں کی اچھی طرح سے پرورش کرنا چاہتی تھی۔

رانا جے سنگھ نے ایک جام بنایا اور وکٹورین طرز کی اونچی پشت والی کرسی پر قد آدم آئینے کے سامنے بیٹھ کر ہلکے ہلکے گھونٹ بھرنے لگا۔ دیوار سے لگا لمبے پنڈولم والا کلاک آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ رات کا پچھلا پہر آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ دوسری طرف ایسا ہوا کہ روبی کو ہوش آ گیا۔ شاید یہ اس کی قوت مدافعت تھی یا جوانی کے خون کا جوش تھا کہ بے ہوشی کے سگریٹ کا اثر وقت سے پہلے زائل ہو گیا۔ روبی نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے محسوس ہوا کہ نرم نرم بستر پر لیٹی ہے۔ چھت کے ساتھ چھوٹا سا فانوس جل رہا تھا۔ جس کی روشنی میں روبی کو سامنے دیوار پر لگی کافی بڑی رنگین تصویر نظر آئی۔ اس نے فوراً پہچان لیا یہ رانا کی تصویر تھی۔ جو رات نوٹنکی میں بیٹھا اسے بری نظروں سے دیکھتے ہوئے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ روبی کے دماغ میں الٹی فلم چلنے لگی۔ سارا معاملہ ایک دم اس کی سمجھ میں آ گیا جگو نے اسے شیر خان سے ملاقات کرنے کے بہانے رانا کے حوالے کر دیا تھا۔ روبی پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی کلاک کی ٹک ٹک کے سوا کمرے میں اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

روبی کا ذہن بڑی تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ یہ بات اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ اگر رانا نے اسے خرید لیا ہے تو وہ اس کی قید سے اتنی آسانی سے نہیں نکل سکے گی۔ جب کہ وہ ابھی اسی علاقے میں رہنا چاہتی تھی مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ روبی کا دماغ گرم ہو گیا۔ وہ پلنگ سے اٹھ کر دروازے کے پاس گئی دروازے پر موٹا تالا پڑا تھا کمرے میں کوئی کھڑکی بھی

نہیں تھی۔ ایک دروازے پر پردہ گرا ہوا تھا۔ روبی پردے کے قریب گئی اور اس نے ذرا سا پردہ انگلیوں سے کھسکا کر دیکھا۔ دوسری جانب رانا شراب سے جی بہلا رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتی واپس پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی اسے ہر حالت میں راجستھان کے اس علاقے سے اپنے جیون ساتھی اور محبوب دوست شیر خان کو ساتھ لے کر پاکستان کی سرحد پار کرنی تھی۔ اسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ رانا جے سنگھ دوسرے کمرے سے نکل کر روبی کے پلنگ کے پاس آیا۔ اسے جھک کر دیکھا اور پھر قالین پر ٹہلنے لگا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سگار سلگ رہا تھا۔ کمرے کی بند فضا میں سگار کی تلخ سی بو پھیل گئی تھی روبی نے دل ہی دل میں ایک بار پھر اپنی اسکیم پر غور کیا اور پھر آنکھیں کھول کر مصنوعی گھبراہٹ کے ساتھ بولی

"میں کہاں ہوں جگو بابا' جگو بابا؟" رانا جلدی سے پلنگ کی طرف آ گیا۔ اور روبی پر جھک کر سخت لہجے میں بولا۔

"جگو بابا تمہیں میرے پاس بیچ گیا ہے اب تم میری ملکیت ہو۔ میری کنیز ہو میری داسی ہو' خبردار! اگر شور مچایا تو تمہاری لاش بھی کسی کو نہ ملے گی۔"

روبی نے اپنی سوچی سمجھی اسکیم پر عمل کرتے ہوئے بڑی دلربائی کے انداز میں رانا کی طرف دیکھا اور بولی۔

"کنور جی! جگو بابا سے مجھے خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو پہلے ہی آپ کے ہاتھ بک چکی تھی۔ نوٹنکی میں آپ کو دیکھا تو آپ پر سو جان سے فدا ہو گئی۔ میرے دھن بھاگ کہ کام دیو نے مجھے آپ کے قدموں میں لا کر ڈالا۔"

رانا جے سنگھ کے چہرے کے تاثرات ایک دم سے بدل گئے وہ روبی کی جوانی اور اس کے حسن سے بے حد متاثر تھا۔ مگر اسے یقین نہیں تھا کہ یہ خانہ بدوش لڑکی خود بھی اس پر فریفتہ ہو گی۔ اور اس کے سامنے اتنی جلدی ہتھیار ڈال دے گی۔ آج تک رانا جے سنگھ نے اپنی بدکاریوں اور عیاشیوں کے سلسلے میں جتنی عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا ان سب نے زبردست مزاحمت کی تھی۔ مگر رانا نے ان مظلوم عورتوں کو مروا کر حویلی کے تہہ خانے میں ان کی لاشوں کو دبا دیا تھا۔ روبی ان سب لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت اور

جوان تھی۔ اور خود سپردگی کی انتہائی کیفیت میں تھی ۔ عیاش رانا کا دل بھی اس پر آگیا تھا اور وہ اسے کافی دیر تک اپنی داشتہ رکھنا چاہتا تھا اور خوش قسمتی سے کھل کھیلنے کے لئے اسے میدان صاف مل گیا رانا نے روبی کے کاندھے کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔

"تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی کوشلیا؟" روبی نے مصنوعی اداؤں کے تیر چلاتے ہوئے کہا۔

"کنور جی! آپ نے موقع ہی نہیں دیا۔" پھر ہاتھ سے اپنا ماتھا دباتے ہوئے بولی۔

"کم بخت جگو دادا نے مجھے ناحق بے ہوشی کا سگریٹ پلا دیا۔ آپ ایک اشارہ کرتے میں بے دام داسی بن کر آپ کے پاس آجاتی۔" رانا پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر سگار کو انگلیوں سے گھماتے ہوئے بولا۔

"وہ بد بخت تو مجھ سے بھاری رقم لے اڑا۔ کہہ رہا تھا تمہارے ماما کا بھی منہ بند کرنا ہے۔"

"یہ ماما کہاں سے ٹپک پڑا؟" روبی نے دماغ پر زور دیا۔

فوراً سمجھ گئی کہ جگو نے پورا ڈراما کھیلا ہے۔ وہ اسے برا بھلا کہتے ہوئے بولی۔

"جگو میرا اصلی باپ نہیں ہے۔ ہاں میرا ماما ضرور ہمارے ساتھ تھا۔"

رانا نے روبی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیر کوئی پروا نہیں۔ اب وہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ تم بے فکر ہو کر یہاں رہو گی۔" روبی نے جلدی سے رانا جے سنگھ کا بازو تھام لیا اور آنکھوں میں مصنوعی آنسو بھر کر بولی۔

"کنور جی! آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے۔ بھگوان کے لئے ایسا کبھی نہ کیجئے گا۔ میں آپ کی داسیوں کی داسی بن کر رہ لوں گی۔ بس صرف آپ کے درشن کر لیا کروں گی۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔"

اس قسم کی جذباتی محبت کا اظہار تو رانا جے سنگھ کی اپنی پتنی نے بھی اس کے آگے کبھی نہیں کیا تھا۔ رانا جے سنگھ کو یوں لگا جیسے وہ پہلی بار محبت کی بولی سن رہا ہے۔ اس کے جذبات میں ہیجان سا برپا ہونے لگا۔ اس نے روبی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ روبی نے رانا

کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی اور شرما کر کہا۔

"کنور جی میں تو اب آپ ہی کی داسی ہوں۔ جیون بھر آپ ہی کی سیوا کروں گی۔ مگر۔"

"مگر کیا؟" رانا جے سنگھ کے خون میں فرانسیسی وائین جوش مار رہی تھی۔ روبی نے رانا کے کان میں سرگوشی کی اور لجا کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ رانا جے سنگھ نے روبی کا ماتھا چوم لیا اور بولا "کوئی بات نہیں' روبی نے رانا جے سنگھ کے بازو تھام لئے اور بولی

"صرف چار پانچ دن کی تو بات ہے کنور جی مجھے اتنے ہی دن لگتے ہیں۔ پھر میں آپ کے قدموں میں پڑی رہوں گی۔"

رانا پلنگ کی پٹی سے اٹھ کھڑا ہوا اس کے ہاں داشتاؤں کی کمی نہیں تھی۔ کہنے لگا۔

"تم اب آرام کرو کوشلیا۔ میں دن میں آؤں گا نوکرانی تمہارا ہر طرح سے خیال رکھے گی۔" اس نے روبی کے ماتھے کو چوما اور تیز تیز قدموں سے نکل گیا۔

دوسرے دن دوپہر کے بعد رانا نے روبی کو اس حویلی سے تھوڑی دور ایک دوسری حویلی میں پہنچا دیا۔ جو نسبتاً ویران جگہ پر کسی پرانے محل کی خستہ چار دیواری کے اندر بنائی گئی تھی محل کھنڈر بن چکا تھا مگر حویلی کی حالت بہتر تھی۔ یہاں ستونوں والے دالان بھی تھے۔ چھجے دار کھڑکیاں بھی اور نیم روشن برآمدے بھی تھے۔ چار دیواری کے اندر چھوٹا سا باغیچہ تھا جس کے آمنے سامنے لکڑی کے منقش پرانی وضع کے دروازوں والی کوٹھریاں تھیں۔

روبی کو دوسری منزل کی ایک ایسی کوٹھری میں رکھا گیا جس کی واحد عقبی کھڑکی نیچے گہرے کھڈ کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڈ میں چٹانوں کے نوکیلے پتھر ابھرے ہوئے تھے۔ اپنے جذباتی لگاؤ اور روبی کے والہانہ اظہار عشق کے باوجود رانا روبی کے بارے میں محتاط تھا۔ اگرچہ روبی کو حویلی کی دوسری منزل میں چلنے پھرنے کی اجازت تھی لیکن وہ نچلی منزل میں نہیں اتر سکتی تھی۔ زینے کے دروازے پر دوسری طرف سے تالا لگا دیا گیا تھا۔ روبی نے اس سلسلے میں رانا سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس لئے تو صرف دو چار دن کی مہلت چاہتی تھی کہ اس کی عزت بھی محفوظ رہے اور وہ شیر خان کو جیل سے

فرار کروانے کے بارے میں کسی اسکیم پر غور بھی کر سکے اور یہ مہلت اس نے اپنی عیاری اور ہوشیاری سے حاصل کی تھی۔ حویلی میں رانا کا خاص راز دار نوکر روبی کے لئے کھانا لے کر آجاتا تھا۔ حویلی کے باہر رانا کے دو ہٹے کٹے باڈی گارڈ چوبیس گھنٹے پہرہ دیتے تھے اور ان کے پاس ریوالور اور خنجر بھی تھے۔ رانا روزانہ شام کو روبی سے ملنے آتا اور وہ بے پناہ محبت کی اداکاری کرتی مگر رانا کو اپنی قدرتی بیماری کا بہانہ بنا کر اسے ایک خاص حد سے آگے کبھی نہیں بڑھنے دیتی تھی۔ کسی وقت ضرورت سے زیادہ اداکاری کرتے ہوئے وہ رانا کی محبت میں آنسو بھی بہانے لگتی اور رانا بھی اسے جھوٹی تسلیاں دینے لگتا کہ تم فکر نہ کرو میں تم سے بیاہ کرلوں گا۔ تمہارے لئے اودھے پور میں ایک الگ حویلی بنوا کر تمہیں وہاں رانی بنا کر رکھوں گا۔ اسی طرح تین دن گزر گئے۔ خطرہ قریب سے قریب تر آرہا تھا اور اس سے روبی کا بچنا قریباً ناممکن تھا۔ اس شکستہ کھنڈر حویلی میں روبی کو دن میں دو بار باقاعدہ کھانا پہنچ جاتا تھا۔ کھانا لے کر ایک ادھیڑ عمر ہندو عورت آتی جو روبی سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھی۔ خاموشی سے کھانا وغیرہ رکھ کر چلی جاتی۔ پہلے ہی روز جب وہ دوپہر کو کھانا لے کر آئی تو کھانے کے ساتھ کچھ پھل بھی تھے۔ رانا روبی یا کوشلیا کو صحت مند دیکھنا اور رکھنا چاہتا تھا۔ کھانے کے ساتھ پھل کاٹنے والی ایک چھری بھی تھی۔ روبی کی نگاہ چھری پر پڑی تو اس نے ہندو نوکرانی سے آنکھ بچا کر چھری اٹھا کر سرہانے کے نیچے چھپا کر رکھ لی تھی۔ اس چھری کی اسے کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یہ چھری فولاد کی تھی۔ آگے سے نوک مڑی ہوئی تھی۔ دن کے وقت دو ایک بار اس نے اس چھری کی مدد سے زینے کے دروازے کا تالہ کھولنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے حویلی کی دوسری منزل میں بند تھی یہ منزل زمین سے کوئی چالیس پچاس فٹ اونچی تھی اور کھڑکی میں سے نکل کر نیچے اترنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر روبی کے لئے خطرے کا دن قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ چھ دن گزرنے کے بعد اس کی عزت اور عصمت عیاش رانا کے ہاتھوں میں کھلونا بننے والی تھی۔ اور روبی نے ہر حالت میں اپنی عزت بچانے کا عزم کر رکھا تھا۔ دن بھر اسی ادھیڑبن میں رہتی۔ یہاں سے فرار کا اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کا بستر صاف ستھرا تھا اور اس پر دو ریشمی چادریں بچھی ہوئی

تھیں روبی کو ایک ترکیب سوجھی اگر وہ ریشمی چادر کو پھاڑ کر اس کا رسا بنالے تو کھڑکی سے نیچے اتر کر فرار ہوسکتی تھی۔ مگر رانا دن میں ایک بار شام کو اس سے ملاقات کرنے ضرور آتا تھا۔ بستر پر سے چادر غائب دیکھ کر اسے شک پڑ سکتا تھا اور اس کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ پھر رانا اس کے ساتھ درندوں جیسا سلوک کرے۔

جب چوتھا دن بھی گزر گیا اور روبی کو یقین ہو گیا کہ اب رانا زیادہ انتظار نہیں کرے گا تو روبی بستر پر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی کھڑکی کا پٹ کھول کر دیکھا اگر ریشمی چادر کی رسی ٹوٹ گئی یا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تو دو سو فٹ گہرے کھڈ میں گرتے ہی چھلنی ہو جائے گی۔

رانا جے سنگھ دوپہر کو ہو کر چلا گیا تھا۔ اب اسے کل آنا تھا اس لئے کہہ گیا تھا۔

"کوشیلا! میں تمہیں صرف کل تک کی مہلت دوں گا پھر اس کوٹھری میں بھگوان کو اپنے سامنے حاضر جان کر شادی کرلوں گا۔"

روبی خوب جانتی تھی کہ یہ شادی کس قسم کی ہو گی۔ اس نے جرائم پیشہ لوگوں قاتلوں اور اسمگلروں میں رہ کر یہی سیکھا تھا کہ انسان کو اپنی — — — — — — — عزت بچانے کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دینی چاہئے مگر اپنی جان قربان کرنے سے پہلے پوری کوشش کرنی چاہئے کہ حملہ کرنے والے کی جان لے لی جائے یہ سارے خیالات روبی کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے روبی کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہی تھی مگر جرائم پیشہ ماحول نے اسے نڈر دلیر اور خونخوار بنا دیا تھا۔ رانا جے سنگھ کے ساتھ اس نے انکساری اور لجاجت سے جو کام لیا تھا تو اس لئے صرف اپنی عزت محفوظ رکھنے اور شیر خان کو تھانے کی حوالات سے نکال لے جانے کی کسی اسکیم پر عمل کے لئے مہلت حاصل کرنے کی خاطر کیا تھا۔

روبی نے کھڑکی بند کر دی اور کوٹھری میں ٹہلنے لگی۔ پھر سرہانے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور چھری کو نیچے سے نکال کر پلنگ کی پٹی کے قریب گدے کے نیچے چھپا دیا۔

رات کا اندھیرا پھیل گیا روبی نے کونے کی تپائی پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ اس کے شیڈ کا رنگ گہرا تھا اور کوٹھری میں اس کی دھیمی دھیمی روشنی ہی پھیلی رہتی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اگر وہ ایک طرف سے چادر کی پوری نیچے تک چوڑی چوڑی کترنیں کاٹنی

شروع کرلے تو اس کی رسی کھڑکی میں سے نیچے سطح زمین کی اس پٹی تک پہنچ سکتی تھی۔ یہ حویلی کی دیوار کے ساتھ سطح زمین کے لیول پر بنی ہوئی پتھر کی کوئی چھ سات انچ چوڑی پٹی تھی۔ اس کے نیچے گہرا کھڈ تھا۔ اگر دیوار کو پکڑ کر اس پٹی پر احتیاط سے چلا جائے تو دس بارہ فٹ کے فاصلے پر زمین تک پہنچا جا سکتا تھا۔ یہ سارے اندازے اور قیاس روبی نے کتنی کتنی دیر تک کھڑکی میں کھڑے رہ کر نیچے جھانکتے ہوئے لگائے تھے۔ اس نے چادر میں سے ایک لمبی کترن پھاڑ ڈالی اور پھر اسے بل دے کر زور سے کھینچا۔ ریشمی ہونے کی وجہ سے وہ کافی مضبوط تھی اور روبی کا بوجھ سہار سکتی تھی۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر روبی نے ساری چادر کو پھاڑ کر اس کی رسی بنا ڈالی پھر اسے کھڑکی میں سے نیچے گرا کر دیکھا باہر اندھیرا تھا۔ مگر آسمان پر جو ستارے چمک رہے تھے ان کی پھیکی پھیکی روشنی بھی پھیلی ہوئی تھی۔ روبی کا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا رسی کا آخری سرا نیچے دیوار کی باہر کو نکلی ہوئی پٹی کو چھو رہا تھا اس نے رسی اوپر کھینچ لی اور اسے پلنگ کے نیچے ایک طرف چھپا دیا رات کے پچھلے پہر کا وقت روبی نے اس لئے چنا تھا کہ اس وقت اسے دور ریتلے خشک بنجر ٹیلوں کے پیچھے کسی سڑک پر سے گزرتے کسی ٹرک وغیرہ کی آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی سڑک ہے جو شہر کو جاتی ہے۔ اب اس نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ وہ شہر میں جا کر کسی جگہ روپوش ہو جائے گی اور وہاں بیٹھ کر اپنے محبوب شیر خان کو چھڑانے کی کوئی اسکیم تیار کرے گی۔ اگر رانا کی حویلی میں اس کی عزت خطرے میں نہ ہوتی تو وہ اسی جگہ رہ کر کسی اسکیم پر غور کر سکتی تھی مگر یہاں تو اسے اپنی عزت کے لالے پڑ گئے تھے۔

ٹیبل لیمپ کی دھیمی دھیمی بیمار سی روشنی کوٹھری میں پھیلی ہوئی تھی راجستھان کے علاقے کی نیم صحرائی رات خنک تھی اور کھلی کھڑکی میں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ روبی نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ عین اسی وقت اسے ایک آواز سنائی دی۔ یہ موٹر کی آواز تھی۔ روبی کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس وقت کون آیا ہو گا؟ موٹر حویلی کے باہر آ کر رک گئی تھی کہیں رانا جے سنگھ نے اسے لے جانے کے لئے کوئی آدمی تو نہیں بھیجا؟ روبی جلدی سے اٹھ کر گیلری میں آ گئی پھر اس نے کھڑکی کا پٹ ہٹا کر نیچے حویلی کے صحن میں دیکھا دیوار والے کھمبے کے ساتھ جلتے بلب کی روشنی میں اسے رانا جے سنگھ

نظر آیا جس کی سفید ریشمی اچکن کے بٹن کھلے تھے وہ اوپر والے زینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دو آدمی بھاگ کر زینے کی طرف گئے تا کہ اوپر والے دروازے کا تالا کھول دیں۔

روبی کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ مصیبت کی گھڑی آ گئی تھی۔ جو حادثہ اس کے خیال میں کل ہونے والا تھا اس نے آج کی رات چن لی تھی۔ روبی نے زینے کے دروازے میں قدموں کی آوازیں سنیں وہ بھاگ کر کوٹھری میں آ گئی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ریشمی چادر کی رسی کھڑکی کی دوسری طرف لٹکا کر فرار ہو سکتی اسے فوراً پکڑ لیا جاتا اور پھر نہ صرف یہ کہ اس کی عزت لٹتی بلکہ رانا جے سنگھ بعد میں اس کے ساتھ داشتاؤں سے بھی بدتر سلوک کرتا باہر گیلری میں کوئی کوٹھری کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر دروازہ کھل گیا روبی کے سامنے رانا جے سنگھ موجود تھا۔ اس کی سفید ریشمی شیروانی کے سارے بٹن کھلے تھے۔ گولڈن کلر کی اصلی سلک کی قمیص پر پان کے دو چار دھبے پڑے تھے۔ ہاتھ میں سگار سلگ رہا تھا۔ اس نے پی رکھی تھی اور وہ ہلکے ہلکے سرور میں مسکرا رہا تھا اس نے بازو کھول دیئے اور پلنگ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"کوشیلا! میرے پاس آؤ۔ آج ہماری سہاگ رات ہے۔"

روبی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ رانا جے سنگھ آج فیصلہ کر کے آیا ہے اور اسی لئے اس نے شراب بھی پی رکھی ہے۔ روبی نے بھی اپنے سارے تجربے اپنی ساری چالاکیوں اور ہوشیاریوں سے کام لیتے ہوئے اداکاری کرنی شروع کر دی۔ دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کہا۔

"کنور جی! داسی آپ پر قربان مگر ہمارا بیاہ تو کل ہو گا کل آپ کی داسی اشنان کر کے دلہن بن کر یہاں بیٹھی ہو گی۔" رانا جے سنگھ ایکدم بپھر گیا اور گرج کر بولا۔

"نہیں ..... نہیں ..... ہماری شادی آج ہی ہو گئی ہے یہ ہماری سہاگ رات ہے۔" اس نے شیروانی کی جیب سے چاندی کی چھوٹے سائز کی چوڑی سی بوتل نکالی۔ دانتوں سے اس کا کاگ اڑایا اور اس میں جو کچھ بھی تھا غٹا غٹ پی گیا۔ پھر سگار کو فرش پر پھینک کر پاؤں سے مسلا اور روبی کو بانہوں میں لینے کے لئے پلنگ پر آ گیا۔ روبی تڑپ کر اس کی آغوش سے نکل گئی۔ رانا کی سرخ آنکھیں اور سرخ ہو گئیں۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"تم مجھے بے وقوف بنا رہی ہو۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے تمہارے جگو کو دس ہزار روپے دیے ہیں۔ تم میری خریدی ہوئی لونڈی ہو۔" اور رانا نے روبی کو دبوچ لیا۔ روبی کوئی نرم و نازک لڑکی نہیں تھی زبان سے وہ بڑی نرمی کے ساتھ کنور جی کنور جی کہتی رہی اور بازوؤں سے اسے اپنے اوپر سے پرے بھی دھکیل دیا۔

رانا کو چڑھی ہوئی تھی پھر بھی مرد آخر مرد ہوتا ہے۔ عورت چاہے کتنی بہادر ہو ایک بھرپور مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن روبی کے اندر ایک ناقابل شکست طاقت آگئی تھی۔ عیاش رانا نے اسے پلنگ پر گرا لیا۔ روبی تڑپ کر دوسری طرف ہو گئی۔ اچانک روبی کو اس چھری کا خیال آگیا جو اس نے پلنگ کے گدے کے نیچے چھپا رکھی تھی۔ اس نے پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے گدیلے کے نیچے ہاتھ ڈال کر چھری نکال لی اور اسے اپنے پیچھے چھپا لیا۔ نشے کی حالت میں رانا کو کچھ پتا نہ چل سکا۔ روبی پلنگ کے پیچھے کھڑی رانا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کنور جی! آج مجھے معاف کر دیجئے۔"

"عیاش رانا اسے گالیاں دینے لگا۔ اس نے شیروانی اتار کر پرے پھینک دی اور روبی کی طرف بڑھا۔ جونہی اپنے زور میں لئے روبی کو دبوچنے کے لئے اس کے پاس آیا روبی نے اپنا سیدھا ہاتھ باہر نکالا اور پوری طاقت سے چھری رانا کے پیٹ میں گھونپ دی۔ روبی کو اس کی ٹریننگ ملی ہوئی تھی کہ دشمن اسمگلر یا دشمن سپاہی کو پیٹ میں چھرا گھونپ کر کس طرح ہلاک کیا جاتا ہے۔ اگر چھری بالکل سیدھی پیٹ میں گھونپ کر نکال لی جائے تو دشمن کو پہلے پہل ذرا بھی پتا نہیں چلتا۔ اس کے جسم کی ساری توانائی ویسے ہی بحال رہتی ہے اور کوئی کارگر جوابی حملہ کر سکتا ہے۔ پیٹ میں چھرا گھونپنے کا صحیح طریقہ اس کو یہ بتایا گیا تھا کہ چھرا گھونپنے کے فوراً بعد ہاتھ کو اوپر کی طرف دو چار زبردست جھٹکے دے کر بائیں یا دائیں جانب آخری جھٹکا دے کر چھرا اس طرح باہر نکالا جائے کہ دشمن کی ساری انتڑیاں کٹ کر باہر آجائیں۔ اس طرح سے دشمن پر نقاہت سے زیادہ گھبراہٹ طاری ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی پہلو بچا کر اور دشمن کی گھبراہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیچھے سے اس کی گردن پر کاری وار کیا جائے۔

روبی اس وقت سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی ہی نہیں تھی بلکہ ایک تجربہ کار قاتلہ کی شکل

اختیار کر چکی تھی۔ رانا جے سنگھ کے پیٹ میں چھری گھونپنے کے ساتھ ہی اس نے اوپر کی طرف چار جھٹکے دیے اور پیٹ کو اوپر پسلیوں تک پھاڑنے کے بعد بائیں جانب آخری اور زبردست جھٹکا دے کر چھری باہر کھینچ لی اور جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ رانا کی انتڑیاں رسی کے گچھوں کی طرح پیٹ سے باہر نکل کر نیچے جھولنے لگیں۔ خون پرنالے کی طرح بہنے لگا۔ رانا جے سنگھ دہشت زدہ ہو کر اپنی باہر نکلی ہوئی انتڑیوں کو دیکھنے لگا۔ پیٹ کے کٹنے سے آدمی کو زیادہ درد نہیں ہوتا اور جب آدمی نے نشہ کر رکھا ہو تو درد بالکل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن خون کے بہہ جانے سے نقاہت طاری ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے کہ عیاش رانا جے سنگھ چیخ مار کر پہریداروں کو بلاتا روبی نے پیچھے سے اس کی گردن پر آگے کی جانب چھری رکھ کر تیزی سے پیچھے کھینچ لی۔ اس کی شہ رگ کٹ گئی۔ یہاں خون کا فوارہ نکلا۔ روبی اچھل کر کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ رانا کے حلق سے خر خر کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں ہاتھوں سے اپنی باہر نکلی ہوئی انتڑیوں کو سنبھالتا دائیں پہلو کی طرف گر پڑا۔ شہ رگ کٹ جانے سے خون فوارہ کی طرح ابل رہا تھا۔ اب رانا کے جسم میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ کسی کو مدد کے لئے پکار سکتا۔ روبی چھری ہاتھ میں لئے بالکل تیار کھڑی تھی کہ اگر اس نے کوئی آواز نکالی تو اس کا نرخرہ بھی کاٹ دے گی۔ مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ تھوڑا سا تڑپ کر رانا جے سنگھ بے ہوش ہو گیا یا مر گیا۔ روبی نے ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں اسے جھک کر دیکھا۔ عیاش رانا کی آنکھیں بند تھیں ہونٹ کھلے تھے اور اس کے اردگرد خون کا چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا جو ساتھ ہی ساتھ جمتا چلا جا رہا تھا۔ روبی نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی اس نے ایسی تجربہ کاری سے چاقو چلایا تھا کہ اس پر خون نہیں گرا تھا۔ چھری دشمن کے خون سے ضرور لال تھی۔ روبی نے پیچھے ہٹ کر چھری کو ایک طرف پھینک دیا اور پلنگ کے نیچے سے ریشمی چادر کی بنائی ہوئی رسی نکالنے لگی۔ اچانک زینے والے دروازے پر کسی نے بلند آواز میں پکار کر کہا۔

"کنور جی مہاراج! کنور مہاراج" روبی کے ہاتھ رک گئے۔ یہ شاید پہرے دار یا باڈی گارڈ تھا زینے کا گیلری والا دروازہ کھلا تھا مگر کوئی شخص رانا جے سنگھ کے حکم کے بغیر آگے نہیں آسکتا تھا۔ روبی نے اپنے بال اور لباس درست کیا اور کچھ سوچ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

کوٹھری کا دروازہ بند کر کے روبی زینے کے دروازے کے پاس آکر بولی۔"کون ہے جو کنور جی کو بے آرام کرنے آگیا ہے۔" زینے کے دروازے کے پٹ بند تھے۔ دوسری طرف سے پہرے دار کی آواز آئی۔

"میں ہوں جی کنور مہاراج کا داس پرتاپ سنگھ۔" روبی نے برہمی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ کنور جی آرام کر رہے ہیں" پہرے دار نے جواب میں کہا۔

"کنور مہاراج پان کی ڈبیا موٹر گاڑی میں بھول گئے تھے وہ لے کر آیا ہوں۔

روبی نے سوچا کہ یہ ڈبیا اس کم بخت سے لے ہی لینی چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دوبارہ اس وقت آجائے جب وہ کھڑکی سے نیچے اتر کر ٹیلوں تک ہی پہنچ پائی ہو۔ اس طرح سے رانا جے سنگھ کے قتل کا دن نکلنے سے پہلے ہی پتا چل جاتا اور روبی کو اس علاقے سے نکل جانے کا موقع نہیں مل سکتا تھا اس نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لاؤ مجھے دے دو اور خبردار اب آواز نہ دینا کنور جی سو رہے ہیں۔" پہریدار نے ڈبیا روبی کے ہاتھ میں دے دی اور واپس سیڑھیاں اتر گیا اب روبی نے ایسا کیا کہ زینے کا دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھادی۔ تاکہ صبح کو اگر کوئی آئے بھی تو اسے دروازہ توڑ کر ہی آنا پڑے اور یوں روبی کو وہاں سے بھاگ کر روپوش ہونے کا مزید کچھ وقت مل جائے وہ تیز تیز قدموں سے چلتی کوٹھری میں آگئی۔ کوٹھری کے دروازے کی بھی کنڈی لگا دی۔ اب اسے رانا جے سنگھ کی لاش سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے پلنگ کے نیچے سے چادر پھاڑ کر بنائی ہوئی ریشمی رسی نکالی۔ اسے کھڑکی کے ساتھ خوب مضبوطی سے باندھا اور

دوسری طرف نیچے پھینک دیا۔ یہ مرحلہ بڑا خطرناک تھا۔ اتنی بلندی سے جب کہ نیچے دو سو فٹ گہرا کھڈ ہو نیچے اترنے کا روبی کو پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ مگر اس کا حوصلہ بلند تھا۔ اپنی عزت کی خاطر ایک ہوس پرست بدمعاش کو قتل کر دینے سے اس کا دل شیرنی کا دل بن گیا تھا۔ اس بدکردار آدمی نے نہ جانے کتنی مظلوم لڑکیوں کی عزتیں برباد کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار کر حویلی کے تہہ خانوں میں دفن کر دیا تھا۔ روبی نے اللہ کا نام لیا۔ کھڑکی پر چڑھ کر دونوں ہاتھوں سے رسی کو اچھی طرح سے پکڑا۔ اس کا ایک بل اپنی کمر کے گرد دیا اور دونوں پاؤں دیوار کے ساتھ ٹکا کر آہستہ آہستہ نیچے کھسکنے لگی۔ اسے بس ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں رسی ٹوٹ نہ جائے مگر رسی بڑی مضبوط نکلی۔ اس ریشم میں نائیلون کے ریشے بھی شامل تھے وہ تھوڑا تھوڑا اچھل کر نیچے اتر رہی تھی۔ آخر اس کے پاؤں دیوار کے ساتھ باہر نکلی ہوئی پتھریلی پٹی سے جا کر لگ گئے۔ اتنی دیر میں اس کی ہتھیلیاں جیسے دہکنے لگی تھیں بعد میں روبی نے دیکھا تو دونوں ہتھیلیوں میں لمبے نشان پڑ گئے تھے اور ایک دو جگہوں سے خون بھی رسنے لگا تھا۔ اس نے رسی چھوڑ دی اور دیوار کو دونوں بازوؤں میں لے لیا۔ وہ گویا ایک دو سو فٹ گہرے کنوئیں کی منڈیر پر چل رہی تھی نیچے گہری کھڈ تھی۔

روبی کے اندر زندہ رہنے اور شیر خان کو وہاں سے نکال کر پاکستان لے جانے اور شادی کر کے سیدھی سادی نیک زندگی بسر کرنے کا جذبہ موجزن تھا۔ یہ جذبہ اسے ہر حالت میں طاقت بخش رہا تھا۔ زمین اندھیری رات میں صرف تین قدم کے فاصلے پر اسے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دل میں خدا کو یاد کر رہی تھی۔ جب کھڈ کے کنارے اگی ہوئی نسواری جھاڑیاں اسے بالکل سامنے نظر آنے لگیں تو اس نے اچھل کر اپنے آپ کو جھاڑی پر گرا دیا۔ اسے پسینہ آگیا تھا۔

رانا جے سنگھ کو قتل کرتے وقت اس کا دل نہیں دھڑکا تھا مگر اب وہ یوں ہانپ رہی تھی جیسے کہیں سے سرپٹ بھاگتی ہوئی آرہی ہو۔ وہ جلدی سے اٹھی اور اب واقعی اس نے ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ پتھر کی طرح سخت ریتلے ٹیلوں کے درمیان بنی ہوئی قدرتی کھڈ کے کنارے دوڑ رہی تھی۔ آسمان پر تارے بھی اسے جیسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ جوان تھی۔ اس کی رگوں میں جوانی اور نوعمری کا تازہ خون گردش کر رہا تھا۔ وہ جانے کتنی

دیر تک بھاگتی چلی گئی۔ وہ اس خونی حویلی سے جتنی دور ہو سکے چلے جانا چاہتی تھی۔ وہ تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئی ذرا سانس ٹھیک ہوا تو روبی کو اس بات کا افسوس ہونے لگا کہ اس نے آتی دفعہ لاش کی تلاشی کیوں نہ لی۔ رانا کی جیب میں ضرور کچھ نہ کچھ رقم موجود ہو گی۔ روبی کے پاس پندرہ بیس روپے ہی تھے اور اس نے پتلون کی بجائے راجستھانی دیہاتی عورتوں کی طرح لال اور زرد رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں کچھ نہیں تھا۔ اس علاقے میں صحرائی سانپ بڑے زہریلے ہوتے تھے۔ روبی اٹھ کر چلنے لگی۔ اب وہ دوڑنے کی بجائے تیز تیز چل رہی تھی۔ اسے تھوڑا سا اطمینان تھا کہ رانا کی لاش صبح سے پہلے کسی کو نہیں ملے گی۔ جب تک روبی ان کی دسترس سے دور نکل چکی ہو گی۔ ابھی آدھی رات کا وقت تھا اور اسے اس سڑک کی تلاش تھی جہاں سے اس کے قیاس کے مطابق رات کے پچھلے پہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی ٹرک کے گزرنے کی آواز سنا کرتی تھی۔ وہ جس علاقے سے رات کے وقت گزر رہی تھی وہ ریگستانی علاقہ تھا۔ وہاں نرم ریت بھی تھی اور پتھر کی طرح سخت چٹانیں بھی زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کہیں کوئی درخت رات کے وقت ستاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں نظر آتا تھا۔ روبی سخت زمین سے بچ کر نرم ریت پر چل رہی تھی۔ جفاکشی کی عادی تھی اس لئے اسے زیادہ تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی ننگے پاؤں چلتے چلتے اس کے پاؤں اکڑ سے گئے۔ چلنے میں اس کی ساڑھی بھی الجھ رہی تھی۔ اگر اس نے پتلون قمیص پہن رکھی ہوتی تو اسے آسانی ہوتی۔ اب اسے بار بار ایک ہاتھ سے ساڑھی کو سنبھالنا پڑ رہا تھا۔

اندھیرے اور ستاروں کی روشنی میں اسے کچھ فاصلے پر کالے کالے دھبے سے نظر پڑے۔ وہ ان کی طرف بڑھنے لگی۔ یہ دھبے کسی گاؤں کے دس بارہ کچے مکان تھے جن پر گہری خاموشی اور اندھیرا چھایا تھا۔ گاؤں سے باہر کیکر کے درختوں کا ایک کالے رنگ کا جھنڈ تھا۔ روبی قریب آئی تو دیکھا کہ وہاں ایک اونٹ بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ اونٹ نے اپنی لمبی خم کھائی ہوئی گردن گھما کر روبی کی طرف کی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اونٹوں سے روبی خانہ بدوشی کے دنوں میں کافی روشناس ہو گئی تھی۔ یہ اونٹ اسے پیدل چلنے کی مشقت اور اس علاقے سے نکال کر دور لے جا سکتا تھا۔ روبی اونٹ کے قریب

آ گئی۔ اونٹ نے گردن دوسری طرف کر لی۔ جیسے روبی کو اس نے کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ روبی نے قریب آ کر اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اونٹ نے کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔ آخر اونٹ تھا۔ روبی نے دیکھا کہ اونٹ پر کجاوہ تو نہیں تھا مگر ایک کھیس ضرور اس کی کمر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ روبی نے جھک کر درخت پر سے اونٹ کی رسی کھول دی۔ یہی اس اونٹ کی باگ بھی تھی۔ پھر آہستہ سے اونٹ پر بیٹھی اور بڑے پیار سے اونٹ کی پسلیوں کے ساتھ اپنا گھٹنا مارا۔ اونٹ کو اٹھانے' بٹھانے اور چلانے بھگانے کا فن روبی نے خانہ بدوشوں کے ساتھ رہ کر سیکھا تھا۔ اونٹ کے حلق سے ہلکی سی آواز نکلی اور پھر کھڑا ہو گیا۔ روبی نے اس کی باگ کو بائیں طرف کر کے آہستہ سے کھینچا اور دونوں گھٹنے اونٹ کی پھولی ہوئی پسلیوں پر ہلکے ہلکے مارنے لگی۔ اونٹ کیکر کے جھنڈ سے نکل کر رات کی تاریکی میں اس جانب روانہ ہوا۔ سوال اب صرف یہ تھا کہ اونٹ روبی کو کہاں لیے جا رہا تھا۔ وہ ستاروں کو دیکھ کر چل رہی تھی۔ اور اس جانب اونٹ کو بھگائے لئے جا رہی تھی جدھر سے سورج کو نکلنا تھا۔ اب اسے شیر خان کے پاس پہنچنے کی جلدی نہیں تھی بلکہ سب سے پہلے خود کو کسی جگہ روپوش کرنے کی ضرورت تھی۔ دور اسے لال رنگ کی روشنی دکھائی دی۔ روبی کو دور سے ریلوے کے سگنل کی روشنی نظر آئی یہ روشنی اس کے لئے .... امید کی کرن بھی تھی۔ روبی نے اونٹ کا رخ سگنل کی روشنی کی طرف کر دیا۔ اونٹ نے بہت جلد اسے صحرا میں بچھی ہوئی ریلوے لائن پر پہنچا دیا۔

روبی نے کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ریلوے اسٹیشن کی دو چار بتیاں جھلملاتی ہوئی دیکھیں۔ روبی کو رانا کے آدمیوں کے علاوہ اودھے پور کے تھانیدار اور سی آئی ڈی انسپکٹر کمنہ لعل کے ہاتھوں پکڑے جانے کا بھی خطرہ تھا۔ روبی سوچنے لگی کہ کیا وہ یہاں سے ریل گاڑی کے ذریعے کسی دوسرے شہر چلی جائے یا اس علاقے میں کسی جگہ چھپ کر شیر خان کو جیل یا حوالات سے نکال لے جانے کی کوشش کرے؟ علاقے کی پولیس اس کی کھوج میں تھی اور رانا جے سنگھ کے آدمی دن نکلتے ہی اس کی تلاش میں نکلنے والے تھے۔ ظاہر ہے رانا کے قتل کی رپورٹ پولیس تھانے میں درج کرائی جائے گی اور پولیس کو بہت جلد پتا چل جائے گا کہ یہ قتل اسی لڑکی نے کیا ہے جس کو شیر خان اپنی بیوی بتاتا ہے اور جو

خانہ بدوش رقاصہ بن کر سفر کر رہی تھی اور راناجے سنگھ اسے اپنی حویلی میں لے آیا تھا۔ تب پولیس زیادہ مستعدی سے اس کی کھوج میں نکل کھڑی ہوگی۔

"نہیں ...... نہیں۔ مجھے یہاں سے دور کسی شہر میں چلے جانا چاہیئے۔ اس ملک میں لاکھوں مسلمان گھرانے آباد ہیں۔ مجھے کسی بھی گھر میں پناہ مل سکتی ہے۔ بس ذرا چالاکی اور ہوشیاری سے اداکاری کرنے کی ضرورت ہوگی۔" یہ سوچ کر روبی نے اونٹ کو ریلوے اسٹیشن کی روشنیوں کی طرف بڑھا دیا بہت جلد وہ ریلوے اسٹیشن کے پاس پہنچ گئی۔ یہاں اس نے اونٹ کو زمین پر بٹھایا۔ نیچے اتر کر دائیں بائیں ماحول کا جائزہ لیا۔ آسمان پر مشرق کی جانب رات کے پچھلے پہر کی پہلی نیلی جھلک نمودار ہونے لگی تھی۔ ریلوے اسٹیشن ویران ویران سا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا دیہاتی اسٹیشن تھا اور یہاں صرف پسنجر گاڑیاں ہی رکتی تھیں۔ روبی کے کانوں میں ریل کے انجن کی سیٹی کی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا جس طرف سے وہ آئی تھی ادھر سے دور ریل کے انجن کی روشنی جھلملا رہی تھی۔ یہ لائٹ آہستہ آہستہ بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ روبی کو یہ علم نہیں تھا کہ یہ گاڑی یہاں رکے گی یا نہیں۔ اونٹ کو وہیں چھوڑ کر وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف دوڑی اسٹیشن واقعی ویران پڑا تھا صرف اسٹیشن ماسٹر کے واحد کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ انجن کی سیٹی کی آواز سن کر گیٹ کے باہر ایک چارپائی پر سویا ہوا بوڑھا آدمی اٹھ کر پگڑی باندھ رہا تھا۔ روبی نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"بابا یہ گاڑی دلی جائے گی ناں؟" بوڑھے نے جلدی جلدی پگڑی باندھتے ہوئے روبی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"ہاں۔" اور یہ کہہ کر کھاٹ کو درخت کے ساتھ لگایا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔

پسنجر ٹرین اسٹیشن میں داخل ہوگئی تھی۔ جس بوڑھے نے روبی کو نیند کے عالم یہ کہہ دیا تھا کہ یہ گاڑی دلی جا رہی ہے اصل میں اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ دلی جانے والی پسنجر ٹرین ایک گھنٹہ پہلے وہاں سے جا چکی تھی اور یہ ٹرین کتھا اور میواڑ سے ہوتی ہوئی احمد آباد جا رہی تھی۔ رات کے وقت اس چھوٹے سے اسٹیشن کا ٹکٹ گھر بھی نہیں کھلا تھا۔ صرف ایک اسٹیشن ماسٹر ہی تھا جو ہاتھ میں لالٹین لئے ویران پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا

تھا۔ ٹرین سے ایک بھی مسافر نہیں اترا تھا۔ روبی دوسری طرف والی ریلوے لائن سے گزر کر ایک ڈبے میں سوار ہو کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ ٹرین یہاں بمشکل ایک منٹ کے لئے رکی انجن نے سیٹی بجائی اور چھک چھک کرتی چل پڑی۔ روبی کی بلا جانے کہ ٹرین کا رخ شمال کی طرف نہیں بلکہ جنوب کی طرف تھا۔ شمال کی طرف دلی کا شہر تھا اور جنوب کی طرف احمد آباد کا شہر تھا جو گجرات کاٹھیاواڑ کا دارالحکومت تھا۔ روبی اس علاقے میں کبھی نہیں آئی تھی۔ ڈبے میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی سوار تھے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہوں پر سو رہے تھے۔ ٹرین چلی تو کھلی کھڑکیوں میں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ روبی پر بھی نیند نے حملہ کر دیا۔ وہ ساری رات کی جاگی ہوئی تھی۔ وہ بیٹھی بیٹھی اونگھنے لگی۔ سر نیچے کو ڈھلکتا تو جلدی سے آنکھ کھول دیتی تھوڑی دیر بعد پھر اونگھنے لگ جاتی اس کے پاس ٹکٹ نہیں تھا دس پندرہ روپے ضرور ساڑھی کے پلو میں بندھے ہوئے تھے۔ رات ڈھلنے لگی تھی۔ ٹرین ایک خاص رفتار سے جا رہی تھی۔ مشرق کی جانب صبح کاذب نمودار ہو رہی تھی۔ کوئی اسٹیشن آیا جہاں ڈبے میں سے کچھ سواریاں اتر گئیں۔ اوپر والی ایک برتھ خالی ہوگئی روبی برتھ پر چڑھ کر لیٹ گئی۔ گاڑی آگے روانہ ہوئی تو اسے نیند نے آلیا اور وہ سو گئی۔

جب روبی کی آنکھ کھلی تو ٹرین کی رفتار ہلکی ہوگئی تھی اور ڈبے میں مسافر اپنا اپنا سامان باندھ رہے تھے۔ وہ برتھ سے نیچے اتر آئی۔ اس نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رکنے والی تھی۔ دن نکل آیا تھا۔ یہ کسی قصبے کا اسٹیشن تھا اور زمین سرسبز ہوگئی تھی۔ ریت کے ٹیلے اور سنگلاخ ٹیکریاں غائب ہوگئی تھیں۔ ٹرین اسٹیشن پر رکی تو روبی دوبارہ برتھ پر چڑھ کر لیٹ گئی وہ اپنے آپ کو پولیس کی نظروں سے بچانا چاہتی تھی۔ مگر وہاں پولیس کا سپاہی کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک موٹا آدمی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ڈبے میں سوار ہوا جس نے سفید دھوتی سفید کرتا اور سفید کپڑے کی کانگریسی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تھیلا تھا۔ بیوی بھی بھاری بھرکم تھی۔ بچوں میں ایک لڑکی دس گیارہ سال کی ہوگی اور ایک لڑکا پانچ چھ سال کا تھا۔ انہوں نے آتے ہی ڈبے میں دروازے کے پاس ہی جگہ بنائی اور بیٹھ گئے۔ یہ کوئی کانگریسی لیڈر لگتا تھا۔ روبی ابھی تک برتھ پر ہی لیٹی

تھی۔ گاڑی چلی تو اس نے منہ دوسری طرف کر لیا اور دل میں سوچنے لگی کہ دلی کب آئے گا؟ شیر خان کس حال میں ہو گا رانا جے سنگھ کے قتل کا اسے کوئی افسوس نہیں تھا پولیس کا خوف بھی اب اس کے دل سے نکل چکا تھا شاید اس لئے بھی کہ وہ جائے واردات سے بہت آگے نکل آئی تھی۔

ٹرین ایک خاص رفتار سے چل رہی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کانگریسی لیڈر اپنی بیوی سے اونچی آواز میں کسی جلسے جلوس کی بابت باتیں کر رہا تھا جن سے روبی کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ گاڑی اسٹیشن سے کافی دور نکل آئی تھی اور ایک گھنے جنگل سے گزر رہی تھی۔ اچانک ٹرین کو ایک دھچکا لگا اور روبی برتھ سے نیچے گرتے گرتے بچی کانگریسی لیڈر کی بیوی بچوں کی چیخیں نکل گئیں۔ اس کے بعد ایک اور دھچکا لگا اور روبی نے برتھ کی زنجیر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ٹرین کو جیسے ایک دم سے بریک لگائی گئی تھی۔ ٹرین کی رفتار گھٹتے گھٹتے رک گئی۔ کانگریسی لیڈر نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر کہا۔

"کوئی گائے بھینس لائن پر آگئی ہو گی" پھر انجن کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اب روبی نے چونک کر نیچے دیکھا کانگریسی لیڈر نے جلدی سے سر اندر کر لیا تھا۔ اس کے بچے ماں کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ عورت کا رنگ اڑ گیا تھا۔ کانگریسی لیڈر اسے حوصلہ دے رہا تھا۔ "اری کچھ نہیں ہوا۔ کوئی شکاری ہو گا یونہی فائر کر رہا ہو گا۔" فائر کی آوازیں رک گئی تھیں۔

"یہ کیا ہو سکتا ہے؟" روبی سوچنے لگی۔ دوسرے ڈبوں سے مسافروں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ سب پریشان تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ گولی کہاں چل رہی ہے؟ ٹرین کیوں رک گئی ہے۔ پھر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی دو فائر ہوئے اور کسی نے کرخت آواز میں پکار کر پوچھا۔

"ارے وہ کانگریس کا چیتا دیو در دھن کہاں ہے رے؟"

اس کے ساتھ ہی ڈبے میں جو کانگریسی لیڈر بیٹھا تھا تھر تھر کانپنے لگا۔ روبی نے دیکھا کہ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اس کی بیوی کو تو جیسے غش آنے لگا تھا۔ اتنے میں دو گھڑ سوار ڈبے کے باہر لائن کے پاس آکر رک گئے۔ انہوں نے ہاتھوں میں رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔

سروں پر پگڑ بندھے تھے۔ چہرے دہشت ناک تھے۔ جو گھڑ سوار آگے تھا۔ اس کی نظر کانگریسی لیڈر پر پڑی تو ہوائی فائر کرنے کے بعد بلند آواز میں بولا۔

"واہ! شکار یہاں چھپا بیٹھا ہے۔" پھر انجن کی طرف سے کوئی گھوڑا دوڑاتے ڈبے کے سامنے آگیا۔ روبی برتھ پر ہی لیٹی رہی۔ وہ یہ سارا ڈراما دیکھ رہی تھی۔ جو گھڑ سوار اب آیا تھا اس نے کیسری رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ گلے میں کنٹھا تھا۔ ایک رائفل کندھے کے پیچھے سے باہر نکلی ہوئی تھی اور ایک رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ یہ ادھیڑ عمر کا سخت جان تھا۔ بڑی بڑی خوفناک مونچھیں تھیں اور آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ ڈبے کے اندر آگیا اور رائفل کی نالی دہشت کے مارے کانپتے ہوئے کانگریسی لیڈر کی گردن کے ساتھ لگا کر بولا۔

"مجھے پہچانا لالا......؟" کانگریسی لیڈر کی ٹوپی رائفل کی نالی سے اوپر اٹھائی اور نالی کا رخ کھڑکی سے باہر کر کے فائر کر دیا۔ ایک دھماکہ ہوا اور کانگریسی کی ٹوپی خدا جانے کدھر چلی گئی۔

ڈبے کے باہر کھڑے گھڑ سوار قہقہے لگانے لگے۔ کانگریسی لیڈر کے بچے سہمے ہوئے آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہے تھے۔ ان کی ماں کا خوف کے مارے برا حال تھا۔ کانگریس لیڈر سے تو مارے دہشت کے بات نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہاتھ باندھے بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس وحشی آدمی نے اب رائفل کی نالی کا رخ سہمی ہوئی لڑکی کی طرف کر دیا اور بولا۔

"کیوں نہ پہلے سانپ کے بچوں کو ختم کیا جائے؟" بے چاری ماں وحشی آدمی کے پاؤں پر گر پڑی۔

"بھگوان کے لئے رحم کرو میری بچی کو نہ مارو۔" وحشی آدمی نے اسے ٹھوکر مار کر پرے گرا دیا۔ خدا جانے روبی کے اندر کہاں سے ایک طوفان سا ایک دم بیدار ہو گیا۔ اس کے ہونٹ غصے سے پھڑپھڑانے لگے۔ وہ بھول گئی کہ وہ خود مجرمہ ہے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے اور یہ اجنبی ملک ہے اور اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ شاید یہ اس کی جرائم پیشہ زندگی کا اثر تھا کہ وہ ظلم ہوتا دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر وہ عام سی لڑکی ہوتی تو شاید وہ بھی اس وحشی مرد کے آگے ہاتھ جوڑنے لگتی۔ مگر روبی کی خصلت ایسی

بزدلی اور منافقت سے پاک تھی۔ وہ برتھ پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی

"تم کیسے مرد ہو ایک معصوم بچی پر گولی چلا رہے ہو؟" وحشی مرد دراصل اس علاقے کا بلکہ پورے ہندوستان کا بدنام اور خونی ڈکیت بھوپت ڈاکو تھا جو کانگریسی لیڈروں کو چن چن کر قتل کیا کرتا تھا۔ اس کانگریسی لیڈر کو وہ اس لئے قتل کرنے آیا تھا کہ اس نے بھوپت کے خلاف مخبری کر کے اس کے دو آدمیوں کو پولیس مقابلے میں مروا دیا تھا۔ بھوپت ڈاکو کو اطلاع ملی تھی کہ کانگریسی لیڈر ٹرین میں احمد آباد جا رہا ہے۔ چنانچہ اس نے راستے میں ہی جنگل میں ایک جگہ ریلوے لائن کی فش پلیٹیں اکھاڑ دی تھیں اور اب اپنے کانگریسی دشمن کو خون میں نہلانے والا تھا۔ بھوپت ڈاکو نے گردن گھما کر خونی آنکھوں سے روبی کی طرف دیکھا۔ وہ دل میں بڑا حیران ہوا کہ برتھ پر بیٹھی ایک عام قسم کی راجستھانی دیہاتی لڑکی میں یہ جرات کہاں سے آ گئی ہے کہ وہ ایک خونخوار ڈاکو کو چیلنج کرے۔ اس کے ساتھ ایسی دلیری سے بات کرے۔ بھوپت کے دو ساتھی بھی ڈبے میں گھس آئے۔ بھوپت ڈاکو نے اب رائفل کی نالی کا رخ روبی کی طرف کر دیا اور تھوڑا مسکراتے ہوئے پوچھا

"تو کون ہے ری؟" روبی نے بے خوفی سے جواب دیا۔

"میں ایک عورت ہوں اور اتنا جانتی ہوں کہ کوئی مرد کا بچہ کسی عورت اور بچے پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔" بھوپت ڈاکو نے رائفل نیچی کر لی اور پوچھا۔

"کیا تو جانتی ہے کہ کس سے بات کر رہی ہے؟" روبی بڑے اطمینان سے برتھ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی اس کے اندر کی بہادر اور بے خوف عورت پوری طرح سے بیدار ہو چکی تھی اور اب اسے آگے پیچھے کی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ وہ موقع محل کے مطابق اپنا رنگ نہیں بدل سکتی تھی۔ اگر دشمن ہے تو دشمن ہے۔ اگر محبت ہے تو پھر محبت ہی ہے۔ یہ خالصتاً جبلی جذبہ تھا اس میں کسی ضابطہ اخلاق کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ روبی نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔

"تم جو کوئی بھی ہو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن تم عورتوں بچوں کو گولیاں مارتے پھرتے ہو تو پھر تم مرد کے بچے نہیں ہو۔"

بھوپت ڈاکو کے ایک ساتھی نے اس پر بندوق تان لی۔

وہ روبی کو گولی سے اڑانے ہی والا تھا کہ بھوپت ڈاکو نے ہاتھ سے اس کی نالی پرے کر دی اور روبی سے پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا......؟" روبی نے بھوپت ڈاکو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"شیرنی......"

بھوپت ڈاکو کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ روبی کے بے خوف اور دلکش چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

"اس شیرنی کو پکڑ کر لے چلو۔" جونہی ایک ڈاکو روبی کی طرف بڑھا روبی نے برتھ پر بیٹھے بیٹھے اسے زور سے لات مار کر پیچھے گرا دیا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔ مگر روبی کی ساڑھی بار بار الجھ رہی تھی اور روبی سے جیسے کہہ رہی تھی۔ منافقت سے کام لو روبی۔ مصلحت سے کام لو موقع محل کو پہچانو۔ مگر روبی ساڑھی کی زبان نہیں سمجھتی تھی وہ سیٹ پر گری اور وہیں سے اچھل کر اس نے ڈاکو کی گردن کو دبوچ لیا۔ بھوپت ڈاکو بڑے مزے سے ایک طرف کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مگر ڈاکو زیادہ تھے۔ انہوں نے بہت جلد روبی کو قابو کر لیا؟ اسے کھینچتے ہوئے ڈبے سے اتار کر لے گئے۔ بھوپت ڈاکو نے کانگریسی لیڈر کی طرف توجہ کی جس کا برا حال ہو رہا تھا۔ بھوپت نے رائفل کی نالی اس کے سینے سے لگائی اور بولا۔

"لالا!! اس شیرنی نے تمہیں آج مجھ سے بچا لیا۔" یہ کہہ کر بھوپت ڈاکو تیزی سے ڈبے سے اترا۔ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر یکے بعد دیگرے چار ہوائی فائر کیے اور اپنے آدمیوں کو لے کر جنگل میں غائب ہو گیا ان دنوں بھوپت ڈاکو کا ڈیرہ دھاری سر کے جنگل میں دلدلی میدان کے پار ایک پہاڑی کے دامن میں جھلیا ندی کے کنارے پر تھا۔ روبی کو ایک کچی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا تھا۔ بھوپت ڈاکو روبی کی جرات اور بے خوفی سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ ڈیرے پر پہنچنے کے دو گھنٹے بعد اس نے روبی کے لئے دو روٹیاں اور ساگ کوٹھری میں بھجوا دیا۔ خود کوٹھری کے قریب ہی کھڑی چارپائی پر رائفل رکھے بیٹھا اپنے ساتھی اور نائب دیوکانت سے باتیں کرنے لگا۔

"ایسی دلیر لڑکی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی دیوا۔"

دیوکانت اپنی رائفل کی نالی صاف کر رہا تھا بولا۔

"دادا! مجھے تو پولیس کی بھیجی ہوئی عورت لگتی ہے۔ میری مانو اسے یہیں ختم کر دیتے ہیں۔" بھوپت ڈاکو کی بھوئیں اوپر اٹھ گئیں کہنے لگا۔

"دیوا! پولیس کی بھیجی ہوئی عورت میں اتنی دلیری نہیں ہوتی اور پھر پولیس کو کوئی عورت بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔" دیوکانت بولا۔

"دادا! پولیس ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیا کرتی ہے۔ اچھا اگر یہ نہیں تو پھر اس عورت کا کیا کریں گے ہم؟ میری مانو میں ابھی جا کر اسے ختم کیے دیتا ہوں۔" بھوپت ڈاکو نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں دیوا نہیں میں کسی عورت کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا۔ بھوپت ڈاکو نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ ابھی اسے پڑی رہنے دو۔ پھر سوچ لیں گے۔"

رات ڈاکوؤں کے ڈیرے میں لالٹینیں روشن ہوگئیں۔ وہ کھانے پینے میں مشغول ہو گئے۔ بھوپت کھاٹ پر نیم دراز رائفل پاس رکھے گراموفون پر کملا جھریا کی ٹھمری سن رہا تھا۔ یہ گراموفون پرانی وضع کا تھا جس کے ساتھ ایک بھونپو لگا تھا۔ بھوپت ڈاکو کو کملا جھریا بڑی پسند تھی اور وہ کبھی کبھی موڈ میں ہوتا تو اس کے ریکارڈ بڑے شوق سے سنتا تھا۔ اچانک اس نے ساؤنڈ بکس اٹھا دیا۔ پھر اپنی رائفل اٹھائی اور اس کوٹھری کی طرف چلا جس میں روبی بند تھی۔ کوٹھری کے باہر بھی ایک مدھم سی لالٹین جل رہی تھی۔ ایک ڈاکو باہر لکڑی کے کھوکھے پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ بھوپت نے اسے وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھولنے ہی لگا تھا کہ اسے اندر سے روبی کی آواز سنائی دی۔ وہ خدا سے دعا مانگ رہی تھی۔ بھوپت نے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا۔ کوٹھری میں مٹی کا دیا روشن تھا۔ روبی زمین پر دوزانو بیٹھی تھی اس کے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں کھلے تھے اور وہ کہہ رہی تھی۔

"یا اللہ! تم میرے دل کا حال جانتا ہے۔ میں تیری گناہ گار ہوں۔ میرے گناہ معاف کر دے اور مجھے شیر خان سے ملا دے۔"

پھر اس نے چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور سر کو آگے کی طرف جھکا دیا۔ بھوپت ڈاکو جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے کوٹھڑی کے اندر وہ دیکھا اور سنا تھا جس کو

دیکھنے اور سننے کی اسے بالکل ہی توقع نہیں تھی۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا اور پھر اندر داخل ہوگیا۔ روبی جلدی سے سیدھی ہو کر صف پر بیٹھ گئی۔ وہ بھوپت ڈاکو کو مشتبہ نظروں سے تکنے لگی۔ بھوپت نے رائفل زمین پر رکھ دی اور صف کے کنارے آہستہ سے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم ہندو عورت نہیں؟ ہندو عورت میں اتنی جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ بھوپت ڈاکو کو للکارے۔ اب سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں سے آرہی تھیں اور یہ شیر خان کون ہے جس سے ملنے کے لئے تم اپنے خدا سے دعا مانگ رہی تھیں؟"

روبی سمجھ گئی کہ بھوپت نے اسے دعا مانگتے سن لیا۔ اس کے باوجود وہ اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی۔ بھوپت ڈاکو کا نام روبی نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ اسے بھوپت ڈاکو کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ بھوپت ڈاکو بڑے کردار کا مالک ہے اور ہندوستان کی اس وقت کی حکمران کانگریس پارٹی کا جانی دشمن ہے۔ اور اس نے کبھی کسی بچے اور کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ٹرین میں اس نے کانگریسی لیڈر کو محض اذیت دینے کی خاطر اس کی بچی پر رائفل تانی تھی وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ روبی اس عجیب و غریب حقیقت سے بھی بے خبر تھی کہ بھوپت ڈاکو کو اسلامی کلچر اور اسلامی طرز زندگی بہت اچھا لگتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے پاکستان سے بھی ایک طرح کا لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ کیونکہ پاکستان ایک اسلامی ملک تھا۔ (یہاں ہم قارئین کو یہ ضرور بتانا چاہیں گے کہ اپنے آخری دنوں میں بھوپت ڈاکو اپنی مرضی سے اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہو گیا تھا۔ یہاں اس نے بارڈر پولیس کے آگے ہتھیار ڈال کر کہا تھا کہ میں پاکستان میں باقی زندگی گزارنا چاہتا ہوں چنانچہ اس پر کراچی میں مقدمہ بھی چلا تھا اور وہ قید کاٹنے کے بعد ایک پرامن ذمے دار شہری بن کر کراچی میں چھوٹا موٹا کاروبار کرنے لگا تھا میں نے کراچی اور لاہور کے اخباروں میں بھوپت ڈاکو کا انٹرویو بھی پڑھا تھا) بھوپت روبی کے سامنے صف پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ رائفل اس کی گود میں تھی۔ سینے پر کارتوسوں کی بیلٹس کراس کی شکل میں لگی تھی۔ سر پر کیسری پٹکا بندھا تھا۔ مونچھیں

اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں چہرے پر مردانہ وجاہت اور خونخواری تھی۔ روبی کو یہ چہرہ اچھا لگا اسے ایسے ہی چہرے پسند تھے جن سے شیروں والی خونخواری اور شرافت ٹپکتی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا منگیتر اور محبوب شیر خان جب کبھی ذرا سی بزدلی دکھاتا تھا تو وہ اس کو برا بھلا کہنے لگتی تھی اور اس کی فطری دلیری اور غیرت کو بیدار کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

بھوپت بولا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ تمہارا نام کیا ہے اور یہ شیر خان کون ہے؟"

روبی نے ایک کہانی گھڑ کر کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے میں مسلمان ہوں اور شیر خان میرے منگیتر کا نام ہے میں اس سے ملنے دلی جا رہی تھی کہ تم مجھے زبردستی اٹھا کر یہاں لے آئے ہو۔" بھوپت ڈاکو نے مسکرا کر کہا۔

"مگر جس گاڑی میں تم بیٹھی تھیں وہ تو احمد آباد جا رہی تھی۔" تب روبی کو احساس ہوا کہ وہ غلط ٹرین میں سوار ہو گئی تھی۔ "مگر تم اکیلی سفر کر رہی تھیں؟ تمہارے ساتھ تمہارا کوئی بھائی یا مرد کیوں نہیں تھا؟" بھوپت کے اس سوال پر روبی نے کہا۔

"مجھے اکیلی سفر کرتے ہوئے کوئی خوف نہیں لگتا۔" بھوپت بولا۔

"وہ تو میں نے دیکھ لیا ہے۔" وہ اٹھ کر باہر جانے لگا تو روبی نے کہا۔

"تم نے مجھے کس لئے قید کر رکھا ہے۔ مجھے جانے کیوں نہیں دیتے۔" بھوپت بولا۔

"ابھی رات کا وقت ہے۔ صبح چلی جانا۔ میں تمہارے ساتھ ایک آدمی کر دوں گا جو تمہیں ریلوے اسٹیشن تک پہنچا دے گا۔" یہ کہہ کر بھوپت باہر نکل گیا۔ روبی کو بھوپت کی بات کا یقین آ گیا تھا وہ بڑی خوش ہوئی کہ صبح وہ ان ڈاکوؤں کی قید سے آزاد ہو جائے گی۔ لیکن ساتھ ہی اس کا چہرہ اداس ہو گیا۔ وہ جائے گی کہاں؟ دلی؟ پھر سرد آہ بھر کر اپنے آپ سے بولی۔ "ٹھیک ہے روبی۔ دلی ہی چلو شاید خدا وہاں شیر خان سے ملنے کا کوئی سربند کر دے۔"

دوسرے روز بھوپت نے روبی کو اپنے ایک ڈاکو کے ساتھ کر دیا۔ روبی گھوڑے پر سوار تھی۔ ایک ڈاکو دوسرے گھوڑے پر بیٹھا تھا بھوپت اسے کہہ رہا تھا۔

"اسے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑ کر آنا۔ راستے میں اس کی حفاظت کرنا۔" پھر بھوپت

نے اپنی واسکٹ کی جیب سے چاندی کے روپوں کی ایک تھیلی نکال کر روبی کی طرف بڑھائی اور کہا "اس میں سے سو روپے اپنے پاس رکھ لو۔ تمہارے کام آئیں گے۔ دلی کا سفر بڑا لمبا ہے۔" یہ کہہ کر بھوپت ڈاکو وہاں سے ہٹ گیا روبی کے دل میں اس کے لئے احترام کا نیا جذبہ ابھر آیا تھا۔ ڈاکو نے گھوڑا آگے بڑھایا۔ روبی نے اپنا گھوڑا اس کے پیچھے ڈال دیا۔ دونوں گھوڑے جنگل میں بنی ہوئی ایک پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چل پڑے۔ جنگل میں کافی اونچے اونچے درخت تھے۔ زمین پر جنگلی جھاڑیوں کی بھی بہتات تھی۔ مگر ڈاکو کو راستہ معلوم تھا وہ بڑے آرام سے گھوڑے کی باگ تھامے روبی کی راہ نمائی کر رہا تھا۔ اس کی رائفل کاندھے کے ساتھ لگی تھی۔ اس نے پانی کی بھری ہوئی چھاگل اور چار روٹیاں اور اچار ساتھ رکھ لیا تھا۔ دوپہر تک وہ جنگل میں سفر کرتے رہے۔ دوپہر کے وقت انہوں نے گھنا جنگل پار کر لیا اور ایک بڑی نہر کے کنارے آ کر ڈاکو گھوڑے سے اتر آیا۔ روبی بھی گھوڑے سے اتر پڑی۔ ڈاکو نے ایک جگہ کھیس بچھا کر روٹیوں کا رومال کھول کر رکھ دیا اور بولا۔

"پہلے کھانا کھا لیں۔ پھر تھوڑی دیر آرام کر کے آگے چلیں گے۔" روبی نے پوچھا۔

"ابھی کتنی دور اور جانا ہے؟" ڈاکو نے دو روٹیوں پر اچار ڈال کر روبی کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"شام ہونے سے پہلے پہلے اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے تم فکر نہ کرو میں تمہیں دلی جانے والی گاڑی میں بٹھا کر واپس آؤں گا۔" روبی روٹی کھانے لگی۔ روٹی کھاتے ہوئے روبی نے محسوس کیا ڈاکو کبھی کبھی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ لیتا ہے پہلے تو روبی نے کوئی خیال نہ کیا لیکن جب ایک بار پانی کی چھاگل روبی کی طرف بڑھاتے ہوئے ڈاکو نے جان بوجھ کر اپنا الٹا ہاتھ روبی کے رخسار سے مس کر دیا تو وہ ہوشیار ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ ڈاکو کی نیت خراب ہو گئی ہے اور اب اس کے سامنے ایک انسان نہیں بلکہ جنگلی ریچھ بیٹھا ہے۔ اور جنگلی ریچھوں کی کھوپڑی اڑانا روبی کو خوب آتا تھا۔ روبی نے رائفل پر نگاہ ڈالی۔ رائفل کو ڈاکو نے پیچھے اس طرح رکھا ہوا تھا کہ وہاں تک روبی کا ہاتھ نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ یہ لڑکی بڑی دلیر ہے اور ڈاکوؤں پر بھی ٹوٹ پڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے وہ بڑا محتاط تھا

لیکن اس کے دل کو یہ حوصلہ بھی تھا کہ آخر ایک لڑکی ہی ہے کوئی ہاتھی تو نہیں ہے۔ اس سنسان جنگل میں اس کا کتنا مقابلہ کر لے گی ۔ یہ ڈاکو بھی کوئی کم گرانڈیل نہیں تھا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے چوکس ہو گئے تھے۔ ابھی وہ اپنے ذہن میں کوئی منصوبہ تیار ہی کر رہی تھی کہ ڈاکو کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ جنگلی آدمی تھا معاملے کی نزاکت کو نہ سمجھ سکا اور روبی پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک بھی نہیں تھا مگر پھر بھی روبی کا ہاتھ رائفل تک نہ پہنچ سکا اور وہ گرانڈیل ڈاکو کے بوجھ سے دوسری طرف گر پڑی۔ ڈاکو نے روبی کو دبوچ لیا۔ لیکن روبی بجلی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی اور ایک طرف کو بھاگی بد قسمتی سے سے اس کی راجستھانی ساڑھی کا پلو ڈاکو کے ہاتھ میں آ گیا۔ یہاں بھی ہندوستانی ساڑھی اسے دغا دے گئی۔ ڈاکو نے ساڑھی کو زور سے کھینچا روبی ساڑھی کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔ ڈاکو وحشی بن چکا تھا۔ ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔

"اری! تو مجھ سے بھاگ تو سکتی نہیں پھر خوامخواہ کا کیوں جھگڑا کر رہی ہے۔ سیدھی طرح میرے پاس آ جا۔"

روبی نے کوئی فریاد نہ کی۔ اس کا رنگ زرد ہونے کی بجائے سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے شعلے برسنے لگے تھے۔ اس نے لپک کر ڈاکو کی گردن پر اتنی زور سے لات ماری کہ وہ پیچھے کی طرف گرا مگر ساتھ ہی اٹھا اور بھاگتی ہوئی روبی پر چھلانگ لگا کر اسے ایک بار پھر نیچے گرا لیا۔ عین اسی لمحے جنگل میں تھری ناٹ تھری رائفل کا دھماکہ ہوا۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے شور مچاتے ہوئے اڑ گئے۔ روبی نے اپنے چہرے پر سے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے دیکھا۔ ڈاکو اپنے پیٹ پر دونوں ہاتھ رکھے ڈگمگا رہا تھا۔ جہاں اس نے ہاتھ رکھے ہوئے تھے وہاں سے خون کی دھاریں بہنے لگی تھیں۔ پھر ایک مردانہ گرجدار آواز آئی۔

"رتو! تو میری امانت میں خیانت کرنے لگا تھا رے!" روبی نے پلٹ کر دیکھا درخت کے پاس بھوپت ڈاکو کھڑا تھا۔ وہ رائفل ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھی جس کی نالی سے نکلی ہوئی گولی ڈاکو کے پیٹ کی بائیں جانب سے گزر کر اس کے پھیپھڑوں کے پرخچے اڑاتی دوسری طرف سے نکل گئی تھی۔ ڈاکو زمین پر لڑھک گیا۔ بھوپت نے آگے بڑھ کر ساڑھی کا پلو روبی کی طرف اچھال کر کہا۔

"ستر پوشی کر لے بیٹی! یہ سانپ کا بچہ ابھی زندہ ہے۔" اور بھوپت کی نالی کا رخ نیم جان ڈاکو کی کھوپڑی کی طرف ہو گیا۔ ایک بار پھر جنگل میں رائفل کا دھماکہ گونجا اور دوسرے لمحے رتو کی کھوپڑی کا اوپر کا حصہ اڑ چکا تھا۔ روبی اٹھ کھڑی ہوئی وہ دوسری طرف منہ کر کے ساڑھی درست کرنے لگی۔ جتنی دیر تک وہ ساڑھی درست کرتی رہی بھوپت دوسری طرف منہ کر کے کھڑا رہا روبی بھوپت کے قریب آ گئی اس کی آنکھوں میں ایک ایسی محبت کی چمک تھی جس کا تجربہ شاید اسے زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا اس نے بھوپت کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بولی۔

"تم نے مجھے بیٹی کہا تھا؟" بھوپت ڈاکو نے اپنا رائفل والا دوسرا ہاتھ روبی کے سر پر رکھ دیا اور بڑے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیوں! ایک ڈاکو کی بیٹی نہیں ہو سکتی ......؟" روبی نے بھوپت کے ہاتھ کو بے اختیار چوم لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک عرصے بعد روبی کی آنکھوں نے اپنے آنسو دیکھے تھے۔ بھوپت ڈاکو بولا۔

"میں نے تمہیں اس کے ساتھ بھیج تو دیا تھا مگر میرے دل کو چین نہیں تھا یہ نیا نیا جیل توڑ کر بھاگا ہوا ہماری ٹولی میں آیا تھا۔ جانے کیوں مجھے چین نہ آیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ یہاں آکر میں تھوڑا پیچھے رہ گیا تھا پر خدا کا شکر ہے عین وقت پر پہنچ گیا۔ اس نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟" رتو کی لاش کو ٹھوکر مار کر روبی سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ بھوپت ڈاکو نے روبی کو کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا۔

"میری بیٹی واقعی شیرنی ہے۔ پر پھر بھی تجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔" روبی نے پوچھا۔

"دادا! تم خدا کیوں کہتے ہو؟ ہندو تو خدا کو بھگوان کہتے ہیں!" بھوپت ہنس پڑا اپنے گھوڑے کی باگ تھامتے ہوئے بولا۔

"مجھے خدا کا نام بڑا اچھا لگتا ہے۔" روبی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا" جانے کیوں مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ میں پہلے جنم میں مسلمان تھا اور اگلے جنم میں بھی کسی مسلمان کے

گھر میں پیدا ہوں گا۔" پھر سر ایک طرف ہلکے سے جھٹک کر بولا۔

"چھوڑو ان باتوں کو میں تمہیں خود اسٹیشن پر چھوڑ آتا ہوں۔" روبی نے آہستہ سے کہا۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" بھوپت نے پلٹ کر پوچھا۔ "کیا تم دلی نہیں جاؤ گی؟" روبی وہیں درخت کی چھاؤں میں اس کھیس پر بیٹھ گئی جہاں تھوڑی دیر پہلے بیٹھی وہ روٹی کھا رہی تھی۔ بھوپت بھی اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ وہ روبی کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو! مجھے لگتا ہے کہ تم مجھ سے بہت کچھ چھپا رہی ہو میں نے تمہیں بیٹی کہہ دیا ہے تو یقین کرو میں تمہیں ساری زندگی اپنی بیٹی ہی سمجھوں گا۔ پھر اپنے باپ کو بتا دو کہ تم کون اور کہاں جانا چاہتی ہو؟"

روبی نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور شروع سے لے کر آخر تک اپنی ساری کہانی بیان کر دی۔ بھوپت بڑے غور سے اس کی کہانی سنتا رہا جب روبی نے کہا۔

"یوں میں تمہارے پاس آگئی اب میرا کوئی راز تم سے پوشیدہ نہیں رہا دادا جان۔" بھوپت نے بڑے پیار سے کہا۔

"روبی! تم مجھے دادا نہیں بابا جان کہا کرو مجھے آج تک کسی لڑکی نے بابا جان نہیں کہا۔ مجھے حسرت ہی ہے کہ کوئی مجھے بابا جان کہے۔"

"کیوں نہیں تم میرے بابا جان ہی ہو" بھوپت اکھڑپن، سنگ دل اور خونخواری کا ایک پہاڑ تھا۔ ایک بار تو وہ بھی اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اس نے بے اختیار ہو کر روبی کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کا دل بھر آیا۔ جیسے سنگلاخ چٹان موم بن کر پگھلنے لگی۔ بھوپت کی آنکھوں میں زندگی میں پہلی بار آنسوؤں کے قطرے نکل نکل کر روبی کے سر کے بالوں میں جذب ہونے لگے۔ اس نے روبی کے سر کو اپنے چوڑے چکلے سینے سے الگ کیا اور دوسری طرف منہ کر کے آستین سے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھے اور روبی کی طرف دیکھ کر شفقت بھرے انداز میں مسکرایا۔

"بیٹی روبی!" ایک بات کا مجھے بڑا فخر ہے بلکہ غرور ہے کہ مجھے جو بیٹی ملی ہے وہ کمزور اور بزدل نہیں ہے بلکہ ایک بہادر شیرنی ہے۔ بھوپت ڈاکو بھی ایک شیر ہے۔ اس کی بیٹی ایسی ہی ہونی چاہئے تھی۔ چلو واپس ڈیرے پر چلتے ہیں باقی باتیں وہاں چل کر ہوں گی۔"

وہ اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ گئے۔ ایک گھوڑا خالی تھا۔ بھوپت نے اسے اپنے پیچھے لگا لیا۔ اب جنگل میں ان کی واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ رات ہونے سے پہلے وہ اپنی منہ بولی بیٹی روبی کو لے کر ڈیرے پر پہنچا تو اس کے دست راست سانولیا نے لڑکی دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔

"دادا! لڑکی کو پھر لے آئے؟ رتو کہاں ہے؟" بھوپت نے گھوڑے سے اتر کر تمام ڈاکوؤں کی طرف دیکھ کر اپنی رائفل لہراتے ہوئے کہا۔

"تم سب سن لو۔ یہ لڑکی نہیں ہے۔ آج سے میری بیٹی ہے۔ رتو کی لاش جھلار والی پہاڑی کے پاس پڑی ہے۔ اس نے میری بیٹی پر' بھوپت کی بیٹی پر بری نگاہ ڈالی تھی۔" اس کے ساتھ ہی بھوپت ڈاکو نے رائفل کی نالی اوپر کی اور یکے بعد دیگرے چار فائر کر دیئے۔ جنگل ان دھماکوں سے گونج اٹھا۔ اس کی ٹولی کے سارے ڈاکو ایک بار تو لرز سے گئے۔ بھوپت نے روبی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر سانولیا کی طرف دیکھا اور کہا

"سانولیا رے! میری بیٹی کے لئے ایک ایسی بوڑھی عورت کی ضرورت ہے جو اس کی سب باتوں کا خیال رکھ سکے بھوپت نے تو ساری عمر شادی نہیں کی۔ اس کے لئے ماں کہاں سے لاؤں گا۔" سانولیا کہنے لگا۔

"دادا! تم فکر نہ کرو۔ یہ اب ہماری بھی بیٹی ہے۔ میں اس کی خبر گیری کے لئے اپنی بڑی ماسی کو لے آؤں گا۔ وہ بیوہ ہے اور گھر میں اکیلی رہتی ہے۔" یہاں روبی نے بھوپت کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"بابا جان! مجھے کسی عورت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا خیال خود کر سکتی ہوں۔

آپ تکلیف نہ کریں۔" بھوپت نے اپنے سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی بیٹی۔" اس خونخوار ڈاکو کا سر شاید پہلی بار جھکا تھا۔ وہ رات گزر گئی۔ دوسرے روز دن نکلتے ہی بھوپت نے روبی کے لئے نئی ساڑھی اور چپل اور دوسرا سامان لانے کے لئے ایک آدمی کو خاص طور پر شہر روانہ کر دیا۔ اسے پیسے بھی دیئے۔ دوپہر کو وہ ایک اٹیچی کیس گھوڑے پر رکھے آ گیا۔ روبی نئے کپڑوں' جوتی' کنگھی' اور نیل پالش کو دیکھ کر خوش ہوئی۔ نیل پالش کی شیشی پکڑ کر کہنے لگی

"بابا جان! میں نے کبھی نیل پالش نہیں لگائی۔ بھوپت ڈاکو گردن کھجانے لگا۔

"بیٹی! مجھے بیٹی پالنے کا تجربہ نہیں ہے۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو سانولیا کو بتا دو میں وہ ساری چیزیں منگوا دوں گا۔" مگر روبی کو کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر ضرورت تھی تو صرف یہ کہ کس طرح وہ شیر خان کو پولیس کی قید سے نکال کر پاکستان چلی جائے۔

اس نے یہ بات بھوپت کو بھی بتا دی تھی جس کے جواب میں اس نے مسکرا کر کہا تھا

"ڈیرے پر چل کر بات کریں گے بیٹی۔" ڈیرے پر آئے دو دن گزر گئے اور بھوپت نے شیر خان کے بارے میں روبی سے کوئی ذکر نہ کیا۔ تیسرے دن شام کو روبی بھوپت کے پاس آئی۔ وہ ندی کنارے کھاٹ ڈلوا کر بیٹھا ہوا تھا۔ روبی کو دیکھ کر کھاٹ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"آؤ بیٹھو۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں تمہیں....؟" روبی کھاٹ پر بیٹھ گئی کہنے لگی۔

"بابا جان! میں شیر خان کو لے کر پاکستان جانا چاہتی ہوں۔ اگر تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تو مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہو گا بابا جان! تم صرف اتنا کرو کہ مجھے دلی پہنچا دو۔ میں وہاں جا کر شیر خان کو نکلوانے کا کوئی منصوبہ بناؤں گی۔" بھوپت بڑے اطمینان سے رائفل پر کپڑا مار رہا تھا۔ پھر اس نے رائفل ایک طرف رکھ دی اور شفقت بھرے لہجے میں بولا۔

"بیٹی! تمہارے سب سوالوں کا جواب تمہیں کل مل جائے گا۔ ٹھیک ہے میری بیٹی؟ اب تم اپنے بابا جان کے پاس بیٹھ کر کملا جھریا کا گانا سنو۔" اور بھوپت ڈاکو نے گراموفون پر ریکارڈ لگا دیا۔

دوسرے دن دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد روبی ندی کنارے شیر خان کے خیال میں اداس بیٹھی تھی۔ بھوپت اپنی کوٹھری میں شاید آرام کر رہا تھا کہ ایک گھڑ سوار آکر درختوں کے پاس رکا۔ ڈاکوؤں نے اسے گھیر لیا۔ وہ ان کا ساتھی ہی تھا۔ اس نے پوچھا۔

"دادا بھوپت کہاں ہے؟" اس کی آواز سن کر بھوپت کوٹھری کے باہر نکل آیا۔ "ویرم تم آگئے۔ کیا خبر لائے ہو؟ آؤ اندر آجاؤ۔" روبی نے دیکھا کہ گھڑ سوار بھوپت دادا کے ساتھ اس کی کوٹھری میں داخل ہو گیا اور دونوں دیر تک اندر نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ روبی کو کوئی خبر نہیں تھی کہ بھوپت ڈاکو نے دو روز پہلے اپنے خاص آدمی ویرم کو شیر خان کا پکا سراغ لگانے کے لئے بھیج دیا تھا۔ کافی دیر بعد کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ بھوپت دادا نے ویرم کو اپنے آدمیوں کے پاس بھیج دیا اور خود روبی کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ ایسے تھا جیسے وہ کوئی دلچسپ بات سنانے والا ہو۔ روبی خاموشی سے بھوپت کے چہرے کو تک رہی تھی۔

بھوپت نے گھاس کا ایک لمبا تنکا اکھاڑا اور اسے منہ میں ڈال کر چباتے ہوئے بولا۔

"بیٹی! شیر خان کا پتا چل گیا ہے۔" روبی خوشی سے ایک دم اچھل سی پڑی۔

"سچ بابا جان! کہاں ہے وہ؟" بھوپت ڈاکو نے کہا۔

"پولیس شیر خان کو جودھ پور سے گرفتار کر کے یہاں لائی تھی۔ جب تم خانہ بدوشوں کے ساتھ بدکردار رانا جے سنگھ کے گاؤں میں تھیں تو پولیس شیر خان کو اودھے پور سے نکال کر چتوڑ گڑھ اور اس کے بعد رتلام لے گئی۔ اب شیر خان رتلام کی ایک جیل میں ہے جہاں ایک خطرناک پاکستانی جاسوس کی حیثیت سے اس کی کڑی نگرانی ہو رہی ہے اور اس سے پوچھ گچھ بھی جاری ہے۔" روبی نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"پولیس نے اسے زیادہ تو نہیں مارا پیٹا؟" پھر دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

بھوپت ڈاکو ہنس پڑا۔

"اری! تو بھوپت کی شیرنی بیٹی ہے۔ تجھ کو نہیں رونا چاہئے تو گھبراتی کیوں ہے۔ تمہارا بابا شیر خان کو شیر کے منہ سے بھی نکال لائے گا۔" روبی نے چہرہ اٹھا کر بھوپت ڈاکو کو دیکھا۔ بھوپت ڈاکو کے چہرے پر پدرانہ شفقت کے ساتھ ساتھ ایک ایسا ہلکا سا کرب بھی تھا جو اپنی بیٹی کو پریشان دیکھ کر بیدار ہو گیا تھا۔ بھوپت ڈاکو نے واسکٹ کی جیب سے بیڑی نکال کر

سلگائی اور اس کا گہرا کڑوا کش لگاتے ہوئے بولا

"ویرم پوری پوری خبر لایا ہے۔ اس نے مجھے سارا نقشہ سمجھا دیا ہے رتلام کا وہ جیل خانہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ میں شیر خان کو وہاں سے نکال کر تمہارے سامنے لا کھڑا کر دوں گا تو اب خوش ہو جاؤ۔"

روبی نے آنکھیں بند کر لیں بھوپت اٹھ کر سانولیا کے پاس چلا آیا۔ سانولیا برگد کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھا ویرم سے باتیں کر رہا تھا۔

روبی درخت کے نیچے بنے ہوئے چولہے پر چائے بنا رہی تھی۔ وہ بھوپت کے لئے چائے کا گلاس لے کر آئی تو اس نے گلاس لے کر کہا۔" بیٹی! ابھی اپنے بابا جان کے پاس مت آنا۔ ہم بڑی ضروری باتیں کر رہے ہیں۔" روبی خاموشی سے واپس چلی گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ بھوپت دادا شیر خان کو نکال لانے کے کسی منصوبے پر ہی سانولیا سے مشورہ کر رہا ہے۔ وہ دل میں بڑی خوش ہوئی اور خدا سے منصوبے کی کامیابی کی دعا کرنے لگی۔ وہ اپنی کوٹھری میں جا کر لیٹ گئی۔ بھوپت ڈاکو آہستہ آہستہ گرم چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا اور سانولیا کہہ رہا تھا

"رتلام جانے کا ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم کھیدا ریلوے اسٹیشن سے رات کی گاڑی پکڑیں۔ وہاں سے ودھورا پہنچیں۔ ودھورا سے گودھار اور بانس وارہ سے ہوتے ہوئے رتلام پہنچ جائیں اور دوسرا راستہ پنچ محل کے گھنے جنگلوں سے ہو کر رتلام کو جاتا ہے۔ دادا تم ان سارے راستوں کو اچھی طرح سے جانتے ہو ہم کئی بار پنچ محل کے جنگلوں سے گزرے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" بھوپت ڈاکو نے سانولیا سے اس کی رائے طلب کی سانولیا اپنی خشخشی داڑھی کو انگلی سے کھجاتے ہوئے بولا

"جنگل کا راستہ لمبا ہے۔ ہمیں کچھ نہیں تو تین دن ضرور لگ جائیں گے۔ پھر یہ بھی خطرہ ہے کہ راستے میں پولیس پارٹی سے آمنا سامنا ہو جائے۔ کیونکہ وہ ہماری تلاش میں پنچ محل کے جنگل میں کئی جگہ موجود ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں ریل گاڑی کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ رات کے نو بجے احمد آباد سے رتلام تک ایک ڈاک گاڑی چلتی ہے۔ ہمیں

کھیدا اسٹیشن پر وہ دس بجے رات کو مل جائے گی۔ یہ گاڑی ہمیں صبح ہونے سے پہلے رتلام پہنچا دے گی۔"

بھوپت ڈاکو غور کر رہا تھا وہ چپ تھا اور آہستہ آہستہ اپنے دانتوں سے ہونٹوں کو کاٹ رہا تھا جب سانولیا خاموش ہو گیا تو بھوپت بولا۔

"رتلام میں کانتی لعل کو خبر کر دی تھی؟"

"ہاں۔" سانولیا نے بیڑی نکالتے ہوئے کہا۔ "ویرم آتی دفعہ اسے کہہ آیا تھا کہ دادا کل یا پرسوں کسی وقت اپنے آدمیوں کے ساتھ پہنچ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" بھوپت نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "ہم رتلام جانے کے لئے کل رات والی گاڑی پکڑیں گے تم باقی ساری تیاری کر لو اپنا اسلحہ ہم ساتھ لے کر جائیں گے وہاں فالتو اسلحے کی ضرورت پڑی تو کانتی لعل اس کا انتظام کر دے گا۔" یہ کہہ کر بھوپت ڈاکو ندی پر نہانے کے لئے چل دیا۔ دوسرے دن جب روپی کو پتا چلا کہ شیر خان کو چھڑانے بھوپت دادا اپنی پارٹی لے کر رات کو جا رہا ہے تو وہ بھوپت کے پاس آ گئی اور بولی۔

"بابا جان! میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" بھوپت چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھا بیلٹ میں کارتوس ڈال رہا تھا کہنے لگا۔

"نہیں میری بچی! یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ جب تک تیرا بابا زندہ ہے تجھے کوئی فکر نہیں کرنی چاہئے۔" روپی نے کہا۔

"مگر بابا جان! تم شیر خان کو کیسے پہچانو گے؟ تم میں سے تو کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا ہوا۔" بھوپت مسکرایا کہنے لگا: "ہمیں پتا چل جائے گا بیٹی گھبراؤ نہیں ہم شیر خان کو ہی لے کر واپس آئیں گے۔" پہلے تو روپی نے بہت ضد کی مگر جب بھوپت نے اسے ہلکا سا ڈانٹ دیا تو وہ چپ ہو گئی بھوپت ڈاکو نے روپی کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار کیا اور کہا۔

"میری بچی! تو اپنے بابا کو کیا سمجھتی ہے۔؟ کیا وہ کوئی بزدل اور کمزور اور شریف شہری ہے؟ نہیں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ تو جنگل کا شیر ہے۔ اس کی گرج سن کر تو بڑے بڑے تھانیداروں کا دم نکل جاتا ہے۔ پھر تمہیں میرے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم ڈیرے پر آرام سے بیٹھو۔ میں شیر خان کو واپس لے کر ہی آؤں گا۔" بھوپت ڈاکو نے سفر

کی تیاری شروع کر دی۔

بھوپت ڈاکو ان جنگلوں میں چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے بھی گجرات ضلع کی پولیس لگی ہوئی تھی۔ بھوپت نے چاروں طرف اپنے مخبر چھوڑ رکھے تھے جو پولیس پارٹی کے پہنچنے سے پہلے اسے اطلاع پہنچا دیتے تھے اور وہ اپنا ٹھکانہ بدل لیتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار وہ کوئی نہ کوئی بھیانک قسم کا ڈاکہ ضرور مارتا تھا جس میں پانچ آدمیوں کو ضرور موت کی نیند سلا آتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ بڑے بڑے سیٹھوں کی تجوریاں توڑتا اور موٹی موٹی توندوں والے کانگریسی لالاؤں کا مال لوٹتا۔ اگر کوئی مزاحمت کرتا تو اسے وہیں بھون کر رکھ دیتا۔ واپسی پر وہ جس گاؤں سے گزرتا لوٹے ہوئے مال کی کافی رقم وہاں کے غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ سارے علاقے میں غریب کسان اور مزدور لوگ بھوپت سے محبت کرتے تھے۔ اور پولیس پارٹی کو بالکل نہیں بتاتے تھے کہ ادھر سے نکل کر بھوپت کدھر کو گیا ہے۔ بھوپت ڈاکو کی تو ایک الگ داستان ہے۔ اگر کبھی موقع ملا تو اس عجیب و غریب بہادر اور شریف النفس ڈاکو کی کہانی بھی آپ کو سناؤں گا۔

اس وقت تو وہ ایک ایسے مسلمان پاکستانی نوجوان کو پولیس کی قید سے چھڑانے کی تیاریاں کر رہا تھا جو پاکستانی جاسوس نہیں تھا۔ جو اپنی ہونے والی بیوی کے ساتھ بارڈر کراس کر کے پاکستان جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پولیس نے اسے پکڑ لیا اور اب اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگا کر اپنے تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ بھوپت جانتا تھا کہ شیر خان کیا بلکہ کسی بھی ایسے پاکستانی کا جس پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا ہو بھارت میں کوئی والی وارث نہیں ہوتا اور پولیس کو جب یقین ہو جاتا ہے کہ بے پناہ تشدد کے باوجود ان کو کوئی خاص معلومات نہیں مل سکیں تو اس بے گناہ پاکستانی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جاتا تھا اور اس کی لاش کسی گڑھے میں پھینک دی جاتی تھی۔ اس سے پہلے کہ شیر خان کے ساتھ بھی بھارتی پولیس ایسا ظالمانہ سلوک کرے بھوپت ڈاکو اسے قید سے نکال لانا چاہتا تھا یہ اس کا اپنی منہ بولی بیٹی روپی سے وعدہ تھا جو اسے بابا جان کہہ کر بلاتی تھی۔

بھوپت ڈاکو نے اپنے ساتھ دست راست سانولیا کے علاوہ ویرم اور بھابھا کو بھی لے لیا۔ ویرم نے وہ جگہ دیکھ رکھی تھی جہاں شیر خان قید میں پڑا تھا بھابھا بھوپت کا وفادار اور

دلیر ساتھی تھا۔ اور سیدھی سے سیدھی دیوار پر کمند پھینکنے میں بڑا ماہر تھا یہ کل چار ڈاکو تیار ہو گئے۔ بھوپت ویرم سانولیا اور بھابھا۔ پیچھے بھوپت نے رانجی کو ڈیرے کا سردار بنا دیا اور اسے خاص ہدایت کی کہ وہ اس کی بیٹی روپی کا خیال رکھے اور اگر پولیس پارٹی نے چھاپہ مارا تو اس کا مقابلہ کرے۔ اگر پولیس کی نفری زیادہ ہو تو وہاں سے اپنے آدمیوں کو نکال کر دھار کے جنگل میں سیتا کنڈ والی رکھ میں جا کر چھپ جائے۔

بھوپت نے ایک بھی رائفل ساتھ نہ لی۔ اس کی بجائے ہر ایک کو ایک ایک ریوالور اور ایک ایک گراری دار چاقو دے دیا۔ سب نے کپڑے کی ایک لمبی گتھلی سی بنا کر اس میں گولیاں بھریں اور اسے اپنی اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیا۔ بھوپت نے کچھ انڈین کرنسی نوٹ بھی اپنے پاس رکھ لئے۔ شام کے وقت انہوں نے گجرات کاٹھیاواڑ کے عام دیہاتوں ایسا حلیہ بنایا اور اپنی خطرناک مہم پر روانہ ہو گئے۔ جانے سے پہلے بھوپت ڈاکو نے روپی کے پاس جا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"بیٹی اگر میں واپس نہ آیا تو اپنے خدا سے کہہ کر میری آتما کو بخشوا دینا۔ میں نے آج تک کسی بت کی پوجا نہیں کی۔"

اس سے پہلے کہ روپی کوئی جواب دیتی بھوپت ڈاکو وہاں سے جا چکا تھا۔ بھوپت ڈاکو کی منڈلی بلتام کے جنگل میں ڈیرہ لگائے ہوئے تھی یہاں سے انہیں کھیدا ریلوے اسٹیشن جانا تھا یہ لوگ جنگل کے تمام راستوں سے واقف تھے۔ ان میں وہ راستے بھی تھے جہاں دیہاتی لوگ دن کے وقت گڈوں ریڑوں پر گزرتے تھے اور وہ خطرناک راستے بھی تھے جس طرف پولیس پارٹی بھی رخ کرتے ہوئے گھبراتی تھی۔ بھوپت نے ایسے ہی ایک خطرناک خفیہ راستے کو چنا اور یہ لوگ گھوڑے دوڑاتے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی کھیدا اسٹیشن کے قرب و جوار میں پہنچ گئے۔ جہاں جنگل کی حد ختم ہوتی تھی بھوپت اور اس کے ساتھی گھوڑوں سے اتر پڑے۔ گھوڑوں کا رخ پیچھے کی طرف کر کے انہیں واپس بھگا دیا اور خود رات کے اندھیرے میں جنگل کی سرحد سے نکل کر جوار کے کھیت میں نکل آئے۔ کھیدا اسٹیشن کی روشنیاں بالکل سامنے تھیں۔ بھوپت ڈاکو اور اس کے ساتھی عام دیہاتیوں ایسے لباس میں تھے۔ سانولیا نے سر پر ایک پوٹلی اٹھا رکھی تھی جس میں دس بارہ روٹیاں اور اچار

تھا۔ ہر ڈاکو نے ایک ایک بھرا ہوا ریوالور اپنی قمیص کے اندر اس طرح چھپا رکھا تھا کہ وقت پڑنے پر وہ پلک جھپکنے میں .... نکال سکتے تھے۔ کھیدا گجرات کاٹھیاواڑ میں احمد آباد سے بھروچ اور آگے بمبئی جاتے ہوئے دوسرا بڑا اسٹیشن تھا۔ شہر بھی کافی بارونق تھا اسٹیشن کے دائیں بائیں کافی عمارتوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ سڑکوں پر ابھی ٹریفک جاری تھا۔ ڈاکوؤں کی ٹولی دیہاتیوں کے بھیس میں کھیتوں سے نکل کر ایک پگڈنڈی پر چلتی اسٹیشن پر آئی اور گیٹ کے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ جس طرح رات کے وقت ایسی جگہوں پر پولیس کانسٹیبل ہوا ہی کرتے ہیں ویسے ہی یہاں بھی ادھر ادھر کوئی کانسٹیبل چلتا پھرتا دکھائی دے جاتا تھا مگر بھوپت کو ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ کیونکہ آج تک کسی کانسٹیبل نے بھوپت ڈاکو کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ جس نے بھوپت کی شکل دیکھی اس بدقسمت کو بھوپت نے وہیں بھون ڈالا تھا۔ بھوپت نے سانولیا سے کہا۔

"جاؤ جا کر رتلام تک کے تھرڈ کلاس کے چار ٹکٹ لے آؤ۔ یہ بھی دیکھ لینا کہ یہاں کوئی پولیس پارٹی تو ساتھ نہیں جا رہی؟" سانولیا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اس نے ریل گاڑی کا ایک ایک ٹکٹ سب کو دیا اور بھوپت کے پاس بیٹھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"دادا! گاڑی آدھا گھنٹہ لیٹ ہے۔ پولیس پارٹی تو کہیں دکھائی نہیں دی۔ کیا آدھا گھنٹہ اسی جگہ پڑے رہیں؟" بھوپت نے بیڑی کا کش لگایا اور دائیں بائیں نظریں گھماتے ہوئے بولا۔

"ویٹنگ روم میں جانا ٹھیک نہیں۔ پلیٹ فارم پر بھی ہم نظروں میں آ سکتے ہیں۔ یہیں پڑے رہتے ہیں۔" یہ لوگ اسٹیشن کے گیٹ سے بائیں جانب سیڑھیوں میں بیٹھے تھے جہاں کچھ فاصلے پر ٹیکسی اور رکشا اسٹینڈ تھا۔ خیریت گزری کس کو ان لوگوں پر شک نہ گزرا دور سے ریل کے انجن کی آواز سنائی دی تو بھوپت نے سانولیا ویرم اور بھابھا کی طرف بھویں اٹھا کر دیکھا اور اشارہ کیا۔ وہ بڑے آرام سے اٹھے اور گیٹ کی طرف بڑھے۔ پلیٹ فارم والے گیٹ پر ایک ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔ سانولیا نے اسے چاروں ٹکٹ دے کر چیک کرائے اور دیہاتی لہجے میں ٹکٹ بابو سے پوچھا کہ یہ گاڑی دھارا کتنے بجے پہنچے گی۔ دھارا یا

دوھارا وہاں سے آگے تیسرا بڑا شہر تھا۔ سانولیا ٹکٹ بابو کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ دھارا جا رہے ہیں۔ ٹکٹ بابو نے ان دیہاتیوں میں کوئی دلچسپی نہ لی اور انہیں آگے کرتے ہوئے بولا۔ "آگے چلو۔"

ٹرین آکر پلیٹ فارم پر رکی۔ مسافروں میں شور سا مچ گیا۔ بھوپت ڈاکو اور اس کے تینوں ڈاکو ساتھی تھرڈ کلاس کے ایک ایسے ڈبے میں گھس گئے جو دیہاتی مسافروں سے بھرا تھا۔

ٹرین چلی اور کسی جگہ رکے بغیر پون گھنٹے میں وودودھرا پہنچ گئی بمبئی احمد آباد لائن پر یہ بروڑہ (بڑودہ) کا ایک گنجان آباد شہر ہے۔ جب کہ اس کا پہلا نام بڑودہ ہی تھا پھر اسے وودودھرا میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ بڑودہ ریاست کا کسی زمانے میں صدر مقام بھی تھا۔

بھوپت اور اس کے ساتھی ڈبے میں ہی بیٹھے رہے۔ یہاں گاڑی بیس منٹ تک رکی رہی کیونکہ اس میں ڈاک کی بوریاں لادی جا رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے انجن نے سیٹی بجائی۔ بھوپت نے سانولیا کی طرف دیکھ کر سکون کا لمبا سانس لیا۔ ویرم اور بھابھا نے ایک ایک بیڑی سلگا لی۔ آگے سفر لمبا تھا۔ اس کے بعد رتلام ہی بڑا شہر آتا تھا۔ چنانچہ ڈاک گاڑی نے اسٹیشن کے نکلتے ہی رفتار پکڑی۔ بھوپت نے سانولیا سے کہا۔

"تم لوگ تھوڑی دیر آنکھ لگا لو۔ میں جاگ رہا ہوں۔" سانولیا نے بھابھا اور ویرم کی طرف دیکھا دونوں نے نفی میں اپنا اپنا سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہمیں نیند نہیں آ رہی ہے۔

لیکن جب گاڑی بروڑہ شہر سے کافی آگے نکل گئی تو ڈبے کے ہچکولوں اور پہیوں کی خاص تال پر نکلتی آواز نے ان پر غنودگی طاری کر دی اور دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھے بیٹھے ویرم اور سانولیا کے سر ایک دوسرے کے کاندھوں پر جا لگے۔ گاڑی جب رتلام پہنچی تو دن کا اجالا چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ آدھا گھنٹہ لیٹ ہونے کی وجہ سے گاڑی یہاں صبح ہونے کے بعد پہنچی تھی۔ کانتی لعل کے اڈے کا ان چاروں کو علم تھا۔ چنانچہ یہاں سے وہ الگ الگ ہو گئے۔ بھوپت دیہاتیوں کی طرح بڑے بھولپنے کے ساتھ چلتا اسٹیشن سے نکل آیا۔ باہر ٹیکسیاں اور رکشے اور لوگوں کی موٹریں بھی کھڑی تھیں۔ رتلام بھی اجمیر سے کھنڈوا

برہان پور لائین پر ایک بڑا جنکشن اور مشہور شہر تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار پر جا رہے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک شروع ہو گئی تھی۔ بھوپت اسٹیشن سے نکلتے ہی بائیں جانب ہو گیا۔ یہاں سے اس نے ایک نالہ پار کیا اور کھیتوں میں سے ہوتا ہوا لاریوں کے اڈے کے قریب سے گزرنے کے بعد ایک کچے راستے پر چلنے لگا جس کی دونوں جانب کھیت اور آم کے باغ تھے۔ جہاں یہ باغ ختم ہوتے تھے وہاں سے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی ریلوے کالونی کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کالونی کے پیچھے کالی کا پرانا مندر تھا۔ مندر کے عقب میں تھوڑے فاصلے پر شمشان بھومی تھی۔ یعنی وہ جگہ جہاں ہندو اپنے مردوں کو نذر آتش کرتے تھے۔ اس شمشان کے پہلو میں ایک کوٹھری میں کانتی لعل رہتا تھا۔ کانتی لعل یہاں منشیات کا ناجائز دھندا کرتا تھا۔ علاقے کی پولیس کا اس نے ماہانہ لگا رکھا تھا اور چند ایک غنڈے بھی پال رکھے تھے جس کی وجہ سے کوئی اس پر ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔ کبھی وہ بھوپت کے گروہ میں شامل تھا مگر ادھیڑ عمر ہونے اور بیمار رہنے کی وجہ سے اس نے بھوپت کی اجازت سے اس کا گروہ چھوڑ دیا اور اپنے آبائی شہر رتلام میں منشیات کا دھندا شروع کر دیا۔ آج تک بھوپت کے بارے میں اس نے زبان نہیں کھولی تھی اور اپنے قریبی سے قریبی دوست کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ بھوپت ڈاکو کے ساتھ مل کر ڈاکے مارا کرتا تھا۔

بھوپت شمشان کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا کانتی لعل کی کوٹھری کے آگے جو چھوٹا سا باغیچہ لگا تھا اس میں داخل ہو گیا۔ کانتی لعل کی کوٹھری کا دروازہ بند تھا اور باہر چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک آدمی سرس کے درخت تلے گائے کا دودھ دھو رہا تھا۔ چھوٹے سے اکھاڑے کے پاس ہی پمپ لگا تھا جس کے نیچے بالٹی رکھے ایک پہلوان ٹائپ کا آدمی نہا رہا تھا۔ بھوپت چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور جس راستے سے آیا تھا اس طرف تکنے لگا۔ جو آدمی گائے کا دودھ دھو رہا تھا اس نے پلٹ کر بھوپت کی طرف دیکھا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ وہ یہی سمجھا کہ کوئی دیہاتی دیسی شراب کی بوتل لینے آیا ہے۔ دودھ کی بالٹی ایک طرف رکھ کر صافے سے ہاتھ صاف کرتا وہ آدمی بھوپت کے پاس آیا اور بے نیازی سے بولا

"سویرے سویرے دارو پینے کہاں سے آ گئے ہو۔ ابھی جاؤ سودا دینے والا آدمی ابھی

نہیں آیا۔" بھوپت نے کوئی جواب نہ دیا اور اطمینان سے بیڑی کے کش لگاتا رہا۔ اس آدمی نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"ارے کیا مزے سے کھاٹ پر بیٹھے بیڑی پی رہے ہو۔ کہہ دیا نہ جاؤ ابھی دارو نہیں ہے۔" تب بھوپت نے اپنی لال لال خونخوار آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور رعب دار آواز میں پوچھا۔

"کانتی لعل کہاں ہے رے؟" بھوپت ڈاکو کی آواز اور آنکھوں میں ایک ایسی دہشت تھی کہ وہ آدمی کچھ گھبرا سا گیا۔ سمجھ گیا کہ یہ کوئی اور ہی بلا ہے۔ گھگیا کر بولا۔

"سیٹھ اندر سو رہا ہے۔ جگا دوں اسے؟" بھوپت نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ آدمی ڈرتے ڈرتے کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تھوڑی دیر بعد کوٹھری میں سے ایک ادھیڑ عمر کا بھاری بدن والا آدمی باہر نکلا یہ کانتی لعل تھا۔ بھوپت کو دیکھتے ہی اس کے بازو کھل گئے۔ دوڑ کر بھوپت کے پاس آیا اور اس کے چرن چھو کر بولا۔

"دادا مجھے تو رات بھر تمہارا انتظار رہا۔" پھر اپنے آدمی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دادا کے لیے دودھ لاؤ۔" وہ آدمی صافہ جھاڑ کر دودھ والی بالٹی کی طرف لپکا۔

"ویرم بھی ساتھ آیا ہے کیا؟" کانتی لعل نے پوچھا بھوپت بولا۔

"ویرم بھی ہے۔ سانولیا اور بھابھا بھی میرے ساتھ آئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے۔" کانتی لعل وہیں چارپائی پر بھوپت کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

"دادا! یہ شیر خان کون ہے؟ تم اس کے لئے کیوں اتنا خطرہ مول لے رہے ہو؟"

بھوپت نے اپنی لال لال خونی آنکھیں کانتی لعل پر مرکوز کر دیں اور کہا "کانتی! شیر خان میرا بیٹا ہے اور ایک باپ اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لئے بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتا ہے۔ اس سے آگے کوئی سوال نہ کرنا۔" کانتی لعل چپ ہو گیا۔ بھوپت ڈاکو کے ساتھ اس نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ گزارا تھا اور وہ اس کی طبیعت سے پوری طرح واقف تھا۔ اس نے اس لمحے اپنے دل سے شیر خان کے بارے میں مزید کچھ پوچھنے کا خیال نکال دیا۔ کانتی کا آدمی گڑوی میں دودھ بھر کر لے آیا تھا جو بھوپت غٹاغٹ پی گیا۔ گڑوی واپس کرتے ہوئے بھوپت سے پوچھا۔

"یہ آدمی کون ہے؟" کانتی نے آہستہ سے کہا۔

"اپنا آدمی ہے۔" ساتھ ہی اس آدمی کو کہا۔ "جاؤ دھنیا جا کر بازار سے پوریاں کچوریاں لے آؤ۔ مہمان آنے والے ہیں۔" وہ آدمی ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔ بھوپت اٹھ کر جائزہ لینے لگا۔

"پمپ کے نیچے کون نہا رہا ہے۔" کانتی بولا۔

"دادا سب اپنے آدمی ہیں۔ ویسے کسی کو کچھ خبر نہیں ہے۔ یہ لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ باہر سے بیوپاری آئے ہیں۔" بھوپت نے دیکھا کہ پمپ کے نیچے جو آدمی اشنان کر رہا تھا وہ بالٹی ہاتھ میں لئے سامنے والی کوٹھری کی طرف جا رہا ہے۔ اس نے کانتی لعل سے کہا۔

"ہم کسی دوسری جگہ اپنا ٹھکانہ بنائیں گے۔ یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔" کانتی لعل نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا۔ وہ جانتا تھا کہ بھوپت نے اگر ایک بار کہہ دیا ہے تو وہ اب وہاں نہیں رہے گا۔ کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے دادا۔ ہم املی والے ٹیلے کے گودام میں چلے چلتے ہیں۔ وہاں میرے سوا کوئی نہیں آئے گا۔" بھوپت کو کانتی لعل کی یہ تجویز پسند آئی کہنے لگا۔

"مجھے گودام کی چابی دو۔ میں ابھی وہاں جاتا ہوں۔ ویرم بھابھا اور سانولیا پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ تم انہیں لے کر وہاں آجانا۔"

کانتی لعل نے آگے سے کچھ نہ کہا۔ جلدی سے صدری کی جیب میں سے چابی نکال کر بھوپت کو پکڑا دی۔ بھوپت وہاں سے چل دیا۔ املی والے ٹیلے کے گودام کا حدود اربعہ بھوپت ڈاکو کو اچھی طرح معلوم تھا۔ یہ جگہ وہاں سے کوئی ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر اونچی نیچی سنگلاخ زمین کو پیچھے چھوڑتی مغرب کی جانب ایک ہرے بھرے ٹیلے کے دامن میں تھی ٹیلے پر بے شمار جنگلی جھاڑیاں اگی تھیں۔ ٹیلے کے دامن میں ایک پرانا کنواں تھا جو اب خشک ہو گیا ہوا تھا۔ کنویں کے پاس ہی املی کے گھنے درخت کے پہلو میں ٹیلے کی دیوار کو کھود کر وہاں ایک گودام بنا دیا گیا تھا جہاں کانتی لعل نے دیسی شراب کے بڑے بڑے پلاسٹک اور لوہے کے ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ ہر ماہ کی ایک خاص تاریخ کو رات کے وقت

یہاں گاؤں میں کشید کی ہوئی دیسی شراب ریڑھوں پر لاد کر لائی جاتی اور پھران ڈرموں میں بھر کر بند کر دی جاتی تھی یہاں اٹھنے بیٹھنے کے لئے کانتی نے ایک طرف چھوٹی سی پھلواری لگا رکھی تھی جس کے کونے میں چھوٹی سی ایک کوٹھری بھی تھی۔ جس رات یہاں ناجائز شراب آتی تھی اس رات کانتی لعل اس کوٹھری میں سو جاتا تھا۔

بھوپت کھڈوں نالوں سے گزرتا املی والے ٹیلے پر پہنچ گیا اس نے گودام کھول کر اس کا جائزہ لیا۔ دیوار کے ساتھ دیسی دارو کے ڈرم لگے ہوئے تھے اس نے گودام کو بند کر دیا اور پھلواری میں آکر کوٹھری کے باہر بچھی ہوئی کھاٹ پر لیٹ گیا اگرچہ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا مگر اس نے نیند کو اپنے سے دور رکھا ہوا تھا نیند ہمیشہ سے بھوپت کی غلام رہی تھی۔ کوئی آدھا گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ کانتی لعل ویرم' سانولیا اور بھابھا کو بھی لے کر آگیا۔ ساتھ ہی اس نے ایک بڑا سا لفافہ اٹھا رکھا تھا جس میں ان لوگوں کے ناشتے کے لئے پوریاں کچوریاں اور حلوہ وغیرہ تھا۔ انہوں نے خوب سیر ہو کر ناشتا کیا۔ تب بھوپت کہنے لگا۔

"کانتی لعل! اب ہم سب لوگ دوپہر تک یہاں آرام کریں گے۔ تم دوپہر کے بعد آنا۔ تم سے پھر بات ہو گی۔"

کانتی لعل پرنام کر کے چلا گیا۔ وہ چاروں کے چاروں وہیں ادھر ادھر لیٹ گئے۔ بھوپت چارپائی پر اور تینوں ڈاکو گھاس پر پڑ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ دوپہر کے بعد کانتی لعل کوئی پچاس ساٹھ روٹیاں بیگن کی بھاجی اور ولایتی شراب لے کر آگیا۔ بھوپت جاگ رہا تھا اس نے باقی آدمیوں کو بھی جگا دیا۔ شراب کی بوتل دیکھ کر بھوپت بولا۔

"جب میں کام پر ہوتا ہوں تو تم جانتے ہو کہ میں دارو کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ اس کو زمین پر انڈیل دو۔" کانتی لعل نے فوراً بوتل کھولی اور ساری شراب زمین پر گرا دی۔ انہوں نے باغیچے میں ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد وہیں ان کی اہم ترین میٹنگ شروع ہو گئی۔ کانتی لعل نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر زمین پر بچھا دیا۔ کاغذ پر آڑی ترچھی لکیروں سے ایک مختصر سا نقشہ بنا ہوا تھا۔ سب اسے غور سے دیکھنے لگے۔ کانتی لعل سمجھانے لگا۔

"دادا! یہ وہ ٹیکری ہے جس پر مہارانا پرتاپ کے زمانے کا وہ قلعہ ہے جسے پولیس نے

خطرناک مجرموں کو قید رکھنے کے واسطے جیل میں بدل دیا ہے۔ اس قلعے کے نیچے چار تہہ خانے ہیں ان کے درمیان ایک تنگ راہ داری ہے جہاں رات کو دو بلب روشن رہتے ہیں۔ یہ راہ داری آگے جا کر بند ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ان تہہ خانوں کو ایک زینہ جاتا ہے۔ زینے کا دروازہ لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں والا ہے جو صرف اس وقت کھولا جاتا ہے جب کسی پولیس کے آدمی کو وہاں سے گزرنا ہوتا ہے۔ دروازے کے باہر ایک سپاہی ہر وقت پہرے پر اسلحہ لئے موجود رہتا ہے۔"

بھوپت بڑے غور سے نقشے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے سوال کیا۔

"اس قلعے کے اندر راستہ کہاں سے جاتا ہے۔" کانتی لعل نے ایک جگہ انگلی رکھ دی۔

"یہ قلعے کا مین گیٹ ہے مگر ہم لوگ یہاں سے نہیں گزر سکیں گے۔ اس دروازے سے کوئی بھی شخص شناختی کارڈ دکھائے بغیر اندر نہیں جا سکتا۔" پھر اس نے انگلی چلاتے ہوئے اوپر ایک نقطے پر آکر روک دی اور بولا۔

"یہ قلعے کی پچھلی دیوار ہے۔ یہاں قلعے کے اندر کا گندا پانی ایک جھلار میں گرتا ہے۔ قلعے کی دیوار کے نیچے ایک پائپ لگایا گیا ہے اس پائپ کا قطر چار فٹ کے قریب ہے۔ آدمی بیٹھ کر اس میں سے گزر سکتا ہے۔ لیکن ایک مشکل یہ ہے کہ جہاں اس پائپ کا پانی نیچے جھلار میں گرتا ہے وہاں پائپ کا منہ لوہے کی مضبوط جالی سے بند کر دیا گیا میں نے بہت سوچا ہے ویرم کے ساتھ بھی کافی مشورہ کیا ہے ویرم کو تو میں رات کو وہاں لے بھی گیا تھا۔ اسے پائپ کی جالی بھی دکھا دی تھی۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ہم قلعے میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو سوائے اس پائپ کے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

بھوپت نے پوچھا۔

"شیر خان کون سے تہہ خانے میں ہے؟" کانتی لعل نے جواب دیا۔

"وہ سب سے آخر والے تہہ خانے میں بند ہے جہاں راہ داری کی دیوار آگے سے بند ہو جاتی ہے۔ اس راہ داری میں بھی رات کو ایک سپاہی چل پھر کر گشت لگاتا رہتا ہے۔ چار گھنٹے بعد سپاہی کی ڈیوٹی بدل جاتی ہے۔ اب تم جس طرح مناسب سمجھو اسی طرح ہم کریں

گے۔" بھوپت ڈاکو نے بیڑی سلگالی۔ کہنے لگا۔

"کانتی لعل! قلعے میں راشن پانی لے کر بھی آخر کوئی جاتا ہوگا۔ دھوبی وغیرہ میلے کپڑے لے کر بھی آتے ہوں گے۔ کیا اندر باورچی خانہ نہیں ہے؟"

"ایک چھوٹا سا میس ہے دادا۔" کانتی نے کہا۔ بھوپت بولا۔

"تو پھر اندر راشن لے کر کون جاتا ہے؟" یہاں ویرم نے اپنی تحقیقات کی روشنی میں جواب دیا۔

"ٹھیکیدار کا ایک بوڑھا ملازم دن کے وقت صرف ایک بار سبزی دودھ وغیرہ لے کر اندر جاتا ہے۔ اس کے پاس شناختی کارڈ موجود ہوتا ہے۔ دھوبی وغیرہ کا مجھے کچھ علم نہیں ہے۔" کانتی لعل نے کہا۔ "دادا! اگر ہم گٹر کے پائپ کے ذریعے اندر داخل ہوں تو ہمارا کام کافی آسان ہو جائے گا۔ گٹر کا پائپ قلعے کے اندر ایک حوض میں نکلتا ہے جہاں نیچے اترنے کے لئے لوہے کی چھوٹی سی سیڑھی بھی لگی ہے۔ اس کی میں نے پوری طرح سے تصدیق کر لی ہے دادا۔ ایک بار ہم قلعے کے اندر داخل ہو گئے تو پھر ان لوگوں پر قابو پانا زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔ قلعے کے آفس میں کوئی وائرلیس نہیں ہے۔ صرف ٹیلی فون لگا ہے۔ ہم اس کے تار باہر سے بڑی آسانی سے کاٹ سکتے ہیں۔" بھوپت نے پوچھا۔

"قلعے میں پولیس کی نفری کتنی ہوتی ہے۔" کانتی لعل بولا .... "میری اطلاع کے مطابق رات کو پچاس ساٹھ آدمیوں سے زیادہ کی نفری نہیں ہوتی۔ آفس میں صرف ایک کانسٹیبل بیٹھا ہے جس کے پاس ٹیلی فون پڑا رہتا ہے۔ باقی گارڈز ہیں۔ پہرے دار ہیں دو گارڈ قلعے کے گیٹ پر ہوتے ہیں۔" بھوپت نے سانولیا کی طرف دیکھا۔ سانولیا ویرم اور بھابھا اتنی دیر تک خاموش تھے اور نقشے پر نظریں جمائے کانتی لعل کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ سانولیا نے بھوپت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دادا! گٹر کے پائپ کو ہی استعمال کرنا ہمارے لئے مفید ہوگا۔" کانتی لعل بولا۔

"میرے پاس ایسا پلاس پڑا ہے جو مضبوط سے مضبوط لوہے کی جالی پل بھر میں کاٹ ڈالتا ہے۔"

"ٹیلی فون کی تار کہاں سے گزرتی ہے؟" بھوپت نے کانتی سے پوچھا وہ بولا۔

"ٹیلے کے اوپر سے آتی ہے اور نیچے ایک کچے راستے پر لگائے گئے کھمبوں پر سے ہوتی ہوئی شہر کی طرف جاتی ہے۔ اسے تو ہم آسانی سے کسی بھی جگہ سے کاٹ ڈالیں گے۔"

"ہمیں دو مضبوط قابل اعتبار اور اچھی حالت والی جیپیں درکار ہوں گی۔ ایک جیپ اگر اسٹارٹ نہ ہوئی تو ہم دوسری جیپ پر آجائیں گے۔" کانتی لعل کہنے لگا۔

"ان کا بھی بندوبست ہو جائے گا دادا۔ ایک جیپ تو میرے پاس موجود ہے۔ دوسری جیپ میں جس وقت تم حکم دو گے شہر جا کر لے آؤں گا" بھوپت نے ویرم اور بھابھا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کل رات کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں آج رات ہی حملہ کر دینا ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے کانتی لعل؟" کانتی لعل نے کندھے اچکا کر کہا۔

"جو تمہاری مرضی دادا۔ سب کچھ تیار ہے میں دوسری جیپ کا ابھی بندوبست کرتا ہوں۔"

"بندوبست نہیں کانتی۔" بھوپت نے اپنے خاص کرخت لہجے میں کہا۔

"جیپ ساتھ لے کر آنا۔"

"ایسا ہی ہوگا دادا۔" یہ کہہ کر کانتی چپ ہو گیا۔ بھوپت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اسلحہ دکھاؤ۔" کانتی لعل سارے ڈاکوؤں کو گودام میں لے گیا۔ شراب کے ڈرموں کے پیچھے سے اس نے ایک بوری باہر نکالی اس میں سات ٹامی گنیں، فائف تھری ناٹ تھری کی رائفلیں، گولیاں اور دو پستول تھے۔ بھوپت نے سارے اسلحے کا غور سے معائنہ کیا۔ ایک ایک رائفل کو لوڈ کر کے دیکھا۔" ہمارے پاس ریوالور موجود ہیں ان میں سے ہم ایک ایک ٹامی گن اپنے پاس رکھیں گے کانتی تم ابھی جا کر دونوں جیپیں لے آؤ۔ ویرم تمہارے ساتھ جائے گا۔ ہم اس جگہ سے رات کو قلعے پر دھاوا بولیں گے۔" کانتی تم ابھی جا کر دونوں جیپیں لے آؤ۔ ویرم تمہارے ساتھ جائے گا۔ ہم اس جگہ سے رات کو قلعے پر دھاوا بولیں گے۔" کانتی لعل نے ویرم کو ساتھ لیا اور نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھوپت نے ایک بار پھر نقشے کو غور سے دیکھا۔ سانولیا اور بھابھا بھی اس کے پاس ہی

تھے۔ بھوپت کہنے لگا۔

"سانولیا! تم اپنی نگرانی میں ٹیلی فون کے تار کاٹو گے۔ بھابھا تم گٹر کی جالی کاٹو گے۔ میں تمہارے آگے آگے چلونگا۔ باقی موقع پر آرڈر دوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے دادا۔" سانولیا اور بھابھا نے یک زبان ہو کر کہا۔ انہوں نے اسلحہ کی بوری گودام سے باہر نکال لی اور دن کی روشنی میں ٹامی گنوں کی صفائی کرنے لگے۔ بھوپت نے ویرم سے پوچھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ شیر خان اس قلعے کے تہہ خانے میں بند ہے ویرم؟" ویرم بڑا قابل اعتبار ساتھی تھا کہنے لگا۔

"دادا! میں نے اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ دیکھتا تو بھی اسے پہچان نہیں سکتا تھا کیونکہ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا لیکن ایک آدمی کو میں نے کانتی لعل کے سامنے یہ کہتے سنا ہے کہ سب سے آخری تہہ خانے میں ایک پاکستانی جاسوس قید ہے جو نوجوان ہے اور جس کو شیرا شیرا کہہ کر بلایا جاتا ہے۔" بھوپت خاموش ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد ویرم اور کانتی لعل دو جیپوں میں سوار وہاں آ گئے۔ بھوپت نے جیپوں کے انجن چیک کیے۔ انہیں ایک بار پھر تیل دیا گیا۔ دونوں جیپیں اوپر سے بند تھیں۔ اتنی دیر میں آسمان پر بادل آنا شروع ہو گئے۔ بھوپت نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بھابھا کہنے لگا۔

"دادا! اگر بارش ہو گئی تو ......؟" بھوپت نے بھابھا کی طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"بارش ہو گئی تو پھر کیا ہو جائے گا؟" بھابھا آگے سے کچھ نہ بولا۔ رات کا کھانا بھی ان پانچوں نے اسی باغیچے میں بیٹھ کر کھایا۔ کانتی لعل نے وہاں لالٹین روشن کر رکھی تھی۔ رات کے گیارہ بجے تک وہ اس جگہ بیٹھے اپنے منصوبے پر غور کرتے اور باتیں کرتے رہے۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے بھوپت اٹھ کھڑا ہوا رائفل کاندھے سے لٹکائی اور بولا۔

"چلو میرے شیرو! آج کی رات کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ تم نے ہر مشکل میں جان کی پروا کیے بغیر میرا ساتھ دیا ہے آج بھی مجھے تمہاری ضرورت ہے۔" سب نے یک زبان کہا۔

"ہم تمہارے ساتھ ہیں دادا۔"

یہ پانچوں چار ڈاکو اور ایک سابق ڈاکو اور راہنما یعنی کانتی لعل دونوں جیپوں میں سوار ہو گئے آگے آگے کانتی لعل کی جیپ تھی' وہ اپنے ساتھی ڈاکوؤں کو راستہ دکھا رہا تھا اس نے جو راستہ چنا تھا وہ شہر کے باہر سے ہو کر قلعے والی ٹیکری کو جاتا تھا۔ یہ راستہ کانتی لعل کا دیکھا بھالا تھا' رتلام شہر کی عمارتیں اور ان کی روشنیاں بائیں جانب کافی دور دور تھیں اور مزید دور دور ہوتی جا رہی تھیں ان کی جیپیں ایک طرف گھومی تو دور اونچا ٹیلہ مہیب سیاہ دیو کی طرح نظر آ گیا۔ بھوپت ڈاکو کانتی لعل کی جیپ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کانتی نے سامنے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"دادا! یہ وہ ٹیکری ہے اور وہ جو روشنی دیکھ رہے ہو یہ قلعے کی اوپر والی بارک کے باہر رات بھر جلتی رہتی ہے۔" بھوپت نے کہا۔

"ٹیلی فون کے تار کہاں سے گزرتے ہیں؟" کانتی لعل بولا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔"

جیپیں ٹیکری کے پیچھے آ کر ایک چھوٹی سی سڑک پر ایک طرف کھڑی ہو گئیں کانتی لعل بھوپت اور دوسرے ڈاکو بھی جیپوں سے اتر آئے۔ کانتی لعل نے چند قدم چل کر اوپر اشارہ کیا۔ وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھمبے لگے ہوئے تھے جن کے ساتھ تاریں بندھی ہوئی تھیں۔ کانتی بولا۔

"دادا! یہ دونوں تار قلعے والی جیل کے ٹیلی فون کے ہیں۔" بھوپت نے بھابھا کو اشارہ کیا اس نے جیپ میں سے پلاس نکالا اور بندر کی طرح تیزی سے کھمبے پر چڑھ کر ٹیلی فون کے تار کاٹ ڈالے۔ پانچوں آدمی جیپوں میں سوار ہوئے اور کانتی لعل نے ٹیکری کے پیچھے اونچی پتھریلی دیوار کے ساتھ ساتھ جیپ کو آگے بڑھایا' پھر ایک جگہ جیپوں کو روک کر انجن بند کر دیے گئے۔ بھوپت کانتی لعل کے قریب آ گیا۔ یہاں اندھیر تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور تاروں کی دھیمی روشنی بھی نہیں تھی مگر ان ڈاکوؤں کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی تھیں جب کہ کانتی لعل کو معلوم تھا کہ قلعے کی جیل کا گٹر کس مقام پر گرتا ہے وہ بھوپت کو اسی جگہ لے آیا تھا۔ بھوپت نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک چکور سا گڑھا تھا جس میں قلعے کی دیوار سے پانی گر رہا تھا۔ کانتی اور بھوپت وہیں بیٹھ گئے کانتی نے

گٹر کی طرف اشارہ کیا۔ بھوپت نے بھابھا کو آہستہ سے کہا۔

"نیچے اتر کر گٹر کی جالی کاٹ ڈالو" بھابھا پلاس لے کر جھلار میں اتر گیا۔ اس نے دونوں پاؤں گٹر کے نیچے ایک جگہ جمائے اور گٹر کے منہ پر لگی تاروں کی جالی کاٹنی شروع کر دی۔ بھابھا اپنے کام کا ماہر تھا مگر یہ جالی کچھ زیادہ ہی مضبوط تھی۔ بھابھا دیر تک زور لگاتا رہا اوپر سے بھوپت نے دھیمے مگر سخت لہجے میں پوچھا۔

"دیر کیوں لگا رہے ہو؟ کیا بات ہے؟" نیچے سے بھابھا کی آواز آئی۔

"سب ٹھیک ہے دادا جالی سخت ہے۔" بادلوں میں ہلکی سی گرج کی آواز سنائی دی۔ بھوپت نے آسمان کی طرف دیکھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ابھی بارش ہو بارش کی وجہ سے اس کی مہم میں کچھ رکاوٹ پیدا ہو سکتی تھی۔ اگرچہ وہ اب پیچھے مڑنے والا نہیں تھا۔ بھابھا نے جالی ایک طرف سے آدھی کاٹ ڈالی اور منہ اوپر کر کے آہستہ سے بولا ...." دادا سب ٹھیک ہے آجاؤ۔" بھوپت نے کانتی لعل سے کہا۔

"کانتی! تم جیپوں کے پاس اسی جگہ رہو گے میں آدمی لے کر اندر جاتا ہوں۔" کانتی لعل نے کہا۔

"بھگوان تمہیں کامیاب کرے دادا۔" بھوپت نے دل میں دہرایا۔

"خدا میرے ساتھ ہے۔" اور جھلار میں اتر گیا گٹر میں ایک بڑی نالی کی طرح پانی بہ کر جھلار میں گر رہا تھا بھابھا گٹر کی کٹی ہوئی جالی سے ایک طرف کھڑا تھا بھوپت نے اس سے پلاس لے کر اوپر کانتی لعل کی طرف اچھال دیا اور جھک کر گٹر میں داخل ہو گیا۔ گٹر میں سیل اور تاریکی تھی اس کے پیچھے بھابھا ویرم اور سانولیا چلا آرہا تھا۔ ٹامی گنیں ان کے کاندھوں سے لٹک رہی تھیں۔ - - - - - - - - - - وہ گٹر کی چھت کو تھام کر چل رہے تھے۔ گٹر کی فضا متعفن تھی مگر سامنے سے تازہ ہوا بھی برابر آرہی تھی۔ جس سے انہیں راستہ طے کرنے میں زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ایک جگہ ہوا ٹھنڈی ہو گئی تو اسے احساس ہوا کہ گٹر کا منہ اب زیادہ دور نہیں رہا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ جہاں گٹر ختم ہوا وہاں نیچے ایک چوکور حوض میں گندا پانی جمع ہو کر گٹر کے ذریعے قلعے

سے باہر جاتا تھا۔ اس مقام پر کانتی کے کہنے کے مطابق لوہے کی ایک سیڑھی اوپر جا رہی تھی۔ بھوپت نے ہاتھ سے اپنے ساتھیوں کو چلے آنے کا اشارہ کیا اور لوہے کے زینے کو طے کر کے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی وہ ایک طرف ہو کر بھربھری زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے ساتھی بھی باہر نکل آئے اور وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ صافوں سے انہوں نے اپنے منہ سر پونچھے اور بھرے ہوئے ریوالور نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ سانولیا بھوپت کے قریب آگیا دونوں سامنے قلعے کی اونچی عمارت کو دیکھ رہے تھے جہاں ایک بلب اوپر والی بارک میں روشن تھا اور دوسرا بلب قلعے کی جیل کے گیٹ پر جل رہا تھا بھوپت نے سرگوشی میں کہا۔

"سانولیا! کیوں رے گیٹ کی طرف سے جائیں کہ پیچھے سے کوئی راستہ تلاش کریں؟" سانولیا بولا۔

"دادا کانتی لعل نے کہا تھا گیٹ کی طرف سے جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔" بھوپت نے کہا۔

"پیچھے کونسی کھڑکی ہمارے لئے کھلی ہو گی ہم گیٹ ہی کی طرف سے چلیں گے ہمارے پاس کافی اسلحہ ہے مگر جب تک میں گولی نہ چلاؤں کوئی شخص فائر نہیں کرے گا سمجھے۔" پھر اس نے ریوالور جیب میں رکھ لیا اور بڑا چاقو کھول کر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"سانولیا یہاں چاقو زیادہ ٹھیک رہے گا تم بھی چاقو نکال لو' ویرم اور بھابھا تم ٹامی گنیں ہی پکڑے رہنا اور چار قدم کا فاصلہ رکھ کر پیچھے آنا۔" اب انہوں نے جھک کر قلعے کے جیل والے گیٹ کی طرف چلنا شروع کیا۔ جب انہیں جیل کے گیٹ پر پہرہ دیتے دونوں سپاہیوں کے ہیولے بجلی کی روشنی میں صاف نظر آنے لگے تو بھوپت کے اشارے سے وہ زمین پر اوندھے لیٹ گئے اور کہنیوں کے بل آگے کھسکنے لگے۔ جب ان کے اور پہریداروں کے درمیان تھوڑا فاصلہ رہ گیا تو بھوپت رک گیا۔ اس نے غور سے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک طرف کوئی دفتر تھا جس کے برآمدے میں بتی جل رہی تھی اس کے اوپر چبوترے پر بھی کسی دفتر کا برآمدہ تھا وہاں بھی روشنی ہو رہی تھی مگر پہریدار یا سپاہی کوئی نہیں تھا۔ بھوپت نے سانولیا کے کان میں سرگوشی کی۔

"یہ پولیس کی نفری کہاں ہے؟" سانولیا نے جواب میں سرگوشی کی۔

"میرا خیال ہے سپاہی بارک میں سو رہے ہیں صرف رات کی ڈیوٹی والے لوگ ہی جاگ رہے ہیں۔" دو کانسٹیبل یہاں سے دور قلعے کی دیوار کے باہر بڑے گیٹ پر پہرہ دے رہے تھے۔ بھوپت اپنے ساتھیوں کو لے کر جس گیٹ پر آگیا تھا وہ قلعے کی جیل کا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ بھی لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں والا تھا دونوں سپاہی ایک دوسرے کے سامنے دروازے کی دونوں جانب اسٹولوں پر بیٹھے بیڑیاں پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے ان کی باتیں کرنے کی آواز بھوپت اور اس کے ساتھیوں کو برابر سنائی دے رہی تھیں ان کے پاس رائفلیں تھیں جو انہوں نے اپنے کاندھوں کے ساتھ لگا رکھی تھیں۔

بھوپت نے سانولیا کو ایک طرف جانے کا اشارہ کیا۔ سانولیا سمجھ گیا کہ بھوپت کی

حکمت عملی کیا ہے۔ وہ اندھیرے میں زمین پر رینگ رینگ کر ایک ٹیبے کے عقب سے ہو کر دروازے کی دوسری طرف آگیا بھوپت نے اپنے پیچھے بھابھا اور ویرم کو ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ تم لوگ اسی جگہ لیٹے رہو۔ بھوپت خود رینگتے ہوئے آگے بڑھا بادل ایک بار پھر گرجے پہریدار سپاہیوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ اتنی دیر میں سانولیا دوسری طرف والے پہریدار کے بالکل عقب میں پہنچ گیا اور بھوپت کی طرف سے سگنل کا انتظار کر رہا تھا۔ بھوپت بڑی آہستگی سے رینگ رینگ کر اس طرف والے پہریدار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب اس کے اور پہریدار کے درمیان صرف پندرہ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا ان کے آگے بجلی کی روشنی تھی۔ اگر وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو پہریدار اسے دیکھ سکتا تھا۔ بھوپت کو اس جگہ سے دشمن پر اچانک حملہ کرنا تھا۔ اب بھوپت کو ایک خاص سگنل کی آواز کے ساتھ اچانک اپنی طرف والے پہریدار پر جھپٹنا تھا جب کہ اس آواز کو سنتے ہی سانولیا نے دوسری طرف کے پہریدار کو جھپٹ کر موت کے گھاٹ اتارنا تھا ان کاموں کے یہ دونوں ڈاکو ماہر تھے انسانوں کے گلے یہ اتنی آسانی سے کاٹ ڈالتے تھے کہ کوئی گاجر مولی بھی کیا ہی کاٹتا ہو گا وہ منصوبے کے مطابق کام انجام پا رہا تھا کہ نہ جانے کیسے ایک سپاہی کی نظر بھوپت پر پڑ گئی اسے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر اندھیرے میں ایک انسانی سر ہلتا ہوا نظر آگیا وہ جلدی اسٹول پر سے اٹھا اور دوسرے لمحے اپنی رائفل تان کر بولا۔

کون ہے؟" یہ دیکھ کر اس کے سامنے والا پہریدار سپاہی بھی ہوشیار ہو گیا بھوپت نے اپنا سر پیچھے کر لیا مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ سامنے والے سپاہی نے اندھیرے میں انسانی سر کو پیچھے کھسکتا دیکھا تو فائر جھونک دیا رات کے سناٹے میں رائفل کے فائر کا دھماکہ گونجا تو جیل کے دوسرے پہریدار سپاہی خبردار ہو گئے بھوپت نے چاقو ایک طرف پھینکا اور ریوالور نکال رہا تھا کہ اس پر دوسرا فائر آگیا۔ گولی اس بار بھی اس کے قریب زمین میں دھنس گئی۔ بھوت نے چلا کر کہا۔

"ارے سانولیا! کس ماں ...... کا انتظار کر رہا ہے رے؟"

سانولیا کی طرف دونوں پہریدار سپاہیوں کی پشت تھی بھوپت کی آواز پر سپاہیوں نے

اندھا دھند فائر کرنے شروع کر دیے اس دوران سانولیا نے ریوالور نکال لیا تھا اس نے وہیں سے نشانہ لے کر گولی چلا دی پہلا پہریدار آگے گرا پھر دوسرے پر فائر کیا دوسرا سپاہی زخمی ہو کر گرا جیل کی دوسری منزل پر سپاہیوں کے بھاگنے دوڑنے اور ہوائی فائر کرنے کی آوازیں آنے لگیں اس کے ساتھ ہی خطرے کا الارم چیخ اٹھا بھوپت دوڑ کر جیل کے دروازے پر آگیا اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر بھابھا اور ویرم کی طرف مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہنے لگا

"ارے یہیں ڈٹے رہنا کوئی اندر آئے تو اسے بھون کر رکھ دینا۔" اس کے جواب میں ویرم اور بھابھا نے ٹامی گنوں کی ایک باڑ فضا میں فائر کر دی ٹامی گن کی فائرنگ کے تڑاکوں سے رات کی خاموشی میں شگاف پڑتے چلے گئے۔ سانولیا نے لوہے کے دروازے پر جو تالا پڑا تھا اس پر فائر کیا تالا ٹوٹ گیا دونوں نے لات مار کر دروازے کو کھولا اور زینہ اتر رہے تھے کہ راہداری میں جو دو سپاہی گارڈ ڈیوٹی پر تھے انہوں نے اوپر تلے چھ سات فائر کر دیے بھوپت اور سانولیا نے زینے پر سے راہداری میں چھلانگیں لگا دیں اور فرش پر لیٹ کر سامنے کی جانب گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ راہداری آگے سے بند تھی دونوں سپاہیوں کو انہوں نے بھون کر رکھ دیا۔ باہر سے رائفل کے فائروں اور ٹامی گن کی تڑاتڑ کی برابر آوازیں آ رہی تھیں بھوپت راہداری کے آخری تہہ خانے کی طرف دوڑا تہہ خانے کے سلاخ دار دروازے پر بھی تالا تھا اس نے گولی مار کر تالا توڑ دیا جھانک کر اندر دیکھا اور بلند آواز میں پوچھا۔

"ارے تم شیر خان ہو؟" ایک نوجوان لڑکا بوریے پر سے اٹھ کھڑا ہوا وہ کمزور آواز میں بولا۔

"ہاں میرا نام شیر خان ہے؟"

"تو پھر باہر آجاؤ ہمیں روبی نے تمہیں نکالنے کے لئے بھیجا ہے۔" یہ کہہ کر بھوپت نے شیر خان کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا اور اسے کھینچتا ہوا راہداری کے زینے کی طرف دوڑا سانولیا آگے آگے تھا کہنے لگا۔

"دادا! باہر پولیس مقابلہ ہو رہا ہے دیکھ کے نکلنا۔"

بھوپت نے کہا۔

"ارے ڈرتا کیوں ہے رے شیر بن پولیس مقابلہ ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔"

پھر شیر خان کی طرف پلٹ کر بولا۔

"سنا ہے تم بڑے بہادر لڑکے ہو ان لوگوں نے تم پر بڑا ظلم کیا ہے مگر بیٹا اب بہادری نہ دکھائی تو تمہاری لاش یہیں تڑپتی رہ جائے گی چلو۔" شیر خان کے لئے یہ سب کچھ اچانک ہی ہو گیا تھا مگر روبی کے نام سے وہ سنبھل بھی گیا اور سمجھ بھی گیا کہ روبی نے ضرور کوئی زبردست چکر چلایا ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ آخری زینے پر بیٹھ گئے۔ باہر اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی سانولیا نے غور سے سامنے کی طرف دیکھا اور کہا

"دادا! ہمارے آدمی زیادہ فائرنگ کر رہے ہیں لگتا ہے انہوں نے کئی پولیس والے مار گرائے ہیں۔" بھوپت نے غور کیا تو ٹامی گن کے فائر برابر ہو رہے تھے اس کے مقابلے میں رائفلوں کے فائر کم سنائی دیتے تھے بھوپت سر تھوڑا سا باہر نکال کر چلایا۔

"ارے ویرم! خبردار رہے ہم باہر آ رہے ہیں۔" پہلو کی جانب سے ویرم کی للکار سنائی دی۔

"دادا آ جاؤ مگر لیٹ کر آنا۔" بھوپت اور سانولیا زینے سے باہر نکلتے ہی ایک طرف کو دوڑے اور پھر ایک دم سے زمین پر گر پڑے شیر خان سمجھا کہ شاید اس کے محسنوں کو گولی لگ گئی ہے مگر ایسی بات نہیں تھی۔ بھوپت چلایا

"ارے شیر خان ہمارے ساتھ رینگتا ہوا چلا آرے۔"

کہنیوں کے بل بڑی تیزی سے لیٹے اور سانپ کی طرح لہرا لہرا کر رینگ کر بھوپت ڈاکو سانولیا اور شیر خان جیل کے دروازے کی روشنی سے نکل کر اندھیرے میں اس مقام پر آگئے جہاں ایک جگہ آڑ میں لیٹے ویرم اور بھابھا سامنے کی جانب پولیس کی بارک پر فائرنگ کر رہے تھے بھوپت نے اپنا ریوالور شیر خان کو دے دیا اور خود رائفل لے لی اور سانولیا سے کہا۔

"اوئے اب ہم قلعے کے بڑے گیٹ سے نکلیں گے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا ویرم! کتنے آدمی مارے ہیں؟" ویرم نے کہا۔

"دادا! بہت سے بھونے ہیں مگر بڑے گیٹ کی طرف سے گولیاں آرہی ہیں۔" بھوپت بولا۔

"اسے ہم سنبھال لیں گے تم دونوں ہمارے اوپر سے فائرنگ کرتے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" یہ کہہ کر بھوپت نے شیر خان کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

"اب شیر بن کر دکھانا۔" وہ دوڑ کر اندھیرے میں قلعے کی سامنے والی دیوار کے ساتھ آگئے یہاں سے ڈھلانی راستہ نیچے قلعے کے بڑے گیٹ کی طرف جاتا تھا جو بند تھا جیل کا الارم ابھی تک چیخ رہا تھا۔ اگر بھوپت نے ٹیلی فون کے تار نہ کٹوا دیے ہوتے تو اب تک شہر سے پولیس کی بھاری کمک وہاں پہنچ چکی ہوتی سانولیا نے بھوپت کو آہستہ سے کہا۔

"دادا میں آگے جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کہنیوں کے بل تیزی سے رینگتا ہوا گیٹ کی دیوار کی طرف نکل گیا۔ پیچھے جیل کی دوسری منزل والی بارک سے سپاہیوں کی ایک دوسرے کو گھبرائی ہوئی آوازیں سنائی دینے لگی اور فائر کرنے کی آوازیں برابر آرہی تھیں کسی وقت پیچھے منہ کر کے ویرم اور بھابھا ٹامی گن کی ایک باڑ مار دیتے تھے بھوپت کے پیچھے شیر خان رینگتا ہوا آرہا تھا۔ بھوپت نے پستول اس کی طرف پھینک دیا۔ شیر خان نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ سانولیا اس دوران فرش پر کھسکتا قلعے کے بڑے گیٹ کے پاس اس جگہ پہنچ گیا جہاں زمین پر لیٹے فائرنگ کرتے دونوں سپاہی اس کو نظر آنے لگے تھے سانولیا نے دونوں کو باری باری ٹھنڈا کر دیا اس کے ساتھ ہی وہ اٹھتے ہی چلایا۔

"دادا چلے آؤ۔" بھوپت اور شیر خان قلعے کے دروازے کی طرف دوڑے تھوڑی دیر بعد وہ قلعے سے باہر تھے قلعے کے اوپر والی بارک سے پولیس کا فائر آرہا تھا یہ لوگ دیوار کے ساتھ لگ کر جیپوں کی طرف دوڑ پڑے بادل گرجے اور ایک دم سے بارش شروع ہو گئی کانتی لعل جیپوں کے پاس بے چینی سے ٹہل رہا تھا گولیاں چلنے کی آواز سے وہ سمجھ گیا تھا کہ پولیس مقابلہ ہو رہا ہے اندھیرے میں اس نے کچھ لوگوں کو اپنی طرف بھاگ کر آتے دیکھا سب سے پہلے بھوپت اور شیر خان آئے بھوپت نے شیر خان کو جیپ میں بٹھایا اور کانتی لعل سے کہا...... "تم اسے لے کر یہاں سے نکل جاؤ اور گودام میں پہنچو میں باقی آدمیوں کو لے کر آتا ہوں جلدی کرو۔"

کانتی لعل اسی وقت شیر خان کو لے کر جیپ نکال کر لے گیا۔ دوسرے لمحے وہاں ویرم بھابھا اور سانولیا بھی آگئے سانولیا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا باقی چھلانگیں لگا کر جیپ میں سوار ہو گئے جیپ پوری تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گئی۔

بارش اور رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کانتی لعل بڑی جلدی جیپ کو خطرے کے مقام سے نکال کر لے گیا تھا اس نے شیر خان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"فکر نہ کرو۔ پولیس اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

شیر خان نے تشکرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اگر آپ لوگ نہ آتے تو میں وہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔" کانتی نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ارے بچو! ہمیں تو آنا ہی تھا۔" شیر خان کو ابھی تک یہ علم نہیں تھا کہ اس کو وہاں سے نکالنے والا انڈیا کا مشہور اور بہادر ڈاکو بھوپت ہے۔ جیپ بارش اور اندھیرے میں بھاگی جا رہی تھی پولیس کی گارڈ بھی ان کی تلاش میں نکل آئی تھی، مگر یہ لوگ پولیس کی پہنچ سے دور نکل چکے تھے گودام کے باہر کانتی لعل نے جیپ روک کر ایک طرف کھڑی کی اور شیر خان کو گودام کے اندر ایک جگہ بٹھا دیا تھوڑی دیر بعد بھوپت بھی اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ وہ آتے ہی بولا۔

"کانتی! اب ہمارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہم شیر خان کو لے کر راتوں رات اپنے ڈیرے کی طرف نکل جانا چاہتے ہیں۔ پیچھے اگر پولیس آئی تو تم جانتے ہی ہو تمہیں کیا کرنا ہو گا۔"

کانتی لعل کہنے لگا۔

"دادا! تم فکر کیوں کرتے ہو تمہارے واسطے تو جان بھی حاضر ہے۔" بھوپت نے اپنے چوڑے سرخ رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہاری جان کی ضرورت نہیں ہے کانتی مجھے اس بات کی ضرورت ہے کہ تم پولیس کو غلط راستے پر ڈال دو۔"

کانتی بولا۔

"ایسا ہی ہو گا دادا! تم نکل جاؤ۔" وہ سب ایک ہی جیپ میں گھس کر بیٹھ گئے بارش اس طرح موسلادھار ہو رہی تھی۔ رتلام شہر کے گلی کوچوں میں بارش کا پانی بہہ رہا تھا ڈاکوؤں کی جیپ شہر سے ہٹ کر ویران علاقے سے گزرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ انہوں نے ریلوے پھاٹک پار کیا اور جیپ کچے راستے پر آ گئی جو کھیتوں کے بیچ میں سے جاتا تھا آدھے گھنٹے کے بعد کھیتوں کے پار جیپ اس جگہ آ کر رک گئی جہاں سے گھنے جنگل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا بھوپت سمیت سارے ڈاکو اور شیر خان وہاں اتر پڑے بھوپت نے کانتی سے کہا۔

"اب تم جاؤ اور تمہارا کام ختم، ہم جاتے ہیں۔" بھوپت نے شیر خان کو ساتھ لیا اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور تاریک رات کے پچھلے پہر موسلادھار بارش میں گنجان اندھیرے جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل میں آتے ہی بھوپت نے اطمینان کا سانس لیا جنگل میں آتے ہی بھوپت کو تحفظ کا احساس ہوا جنگل نے بھوپت کا ہمیشہ ساتھ دیا تھا اور اسے اپنے دامن میں پناہ دی تھی۔ وہ بھی جنگل سے بڑی محبت کرتا تھا اور اس کے چپے چپے سے واقف تھا۔ جنگل بھوپت ڈاکو کی اور بھوپت ڈاکو جنگل کی زبان جانتا تھا۔ مسلسل چلتے چلے جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ صبح کی روشنی پھیلنے کے ساتھ ہی ایک ویران دیہاتی اسٹیشن پر پہنچ گئے وہاں سے انہوں نے ایک پسنجر ٹرین پکڑی اور کھیدا آ گئے اس وقت تک دن کے گیارہ بج چکے تھے اور بارش بھی تھم گئی تھی بھوپت ڈاکو اور اس کے ساتھی بڑے چوکس ہو کر سفر کر رہے تھے کھیدا ریلوے اسٹیشن سے وہ ایک بار پھر جنگل میں داخل ہو گئے مگر یہ ان کا اپنا جنگل تھا جہاں بھوپت کا ڈیرا تھا۔

جس وقت ڈاکوؤں کی یہ پارٹی اپنے ڈیرے پر پہنچی سورج کی روشنی مغربی افق پر بادلوں کے پیچھے سمٹ رہی تھی۔۔ ڈیرے میں بھوپت کے آدمیوں کے آنے کا شور ہوا تو روبی کوٹھری سے باہر آ گئی اس کی نگاہیں شام کے ملگجی اندھیرے میں شیر خان کو تلاش کر رہی تھیں اور شیر خان بھی روبی کے چہرے کو ڈھونڈ رہا تھا دوسرے لمحے ان دونوں نے ایک

دوسرے کو دیکھ لیا۔ بھوپت شیر خان کو لے کر روبی کے پاس آیا اور بولا۔

"یہ لو بیٹی تمہاری امانت لے آیا ہوں۔"

روبی اور شیر خان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بھوپت یہ کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا کہ تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو کھانا اور چائے تیار ہونے لگی شیر خان اور روبی کوٹھری کے باہر چارپائی پر بیٹھے باتیں کرنے لگے شیر خان نے پہلا سوال جو روبی سے کیا یہ تھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ روبی نے اسے سب کچھ بتا دیا اور شروع سے لے کر آخر تک اپنی ساری کہانی بیان کر دی کہ وہ کس طرح راجستھان میں بدکردار رانا جے سنگھ کو قتل کر کے بھاگی اور پھر کیسی کیسی پریشانیاں اٹھانے کے بعد بھوپت ڈاکو کی پناہ میں آئی اور پھر اس نے اسے اپنی بیٹی کیسے بنایا شیر خان بولا۔

"بھوپت جس طرح مجھے وہاں سے نکال کر لایا ہے مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔" روبی نے کہا۔

"مجھے یقین ہے بھوپت اب ہمیں انڈیا کا بارڈر کراس کروا کر پاکستان بھی پہنچا دے گا۔" شیر خان نے رازداری سے کہا۔

"مگر روبی! میں نے جودھ پور کی کچی آبادی والی مسجد کے قبرستان میں جو دولت ڈالروں کی شکل میں چھپا دی تھی اس کا کیا بنے گا کیا وہ ہم انڈیا میں ہی چھوڑ جائیں گے؟ اسی کی مدد سے تو میں پاکستان جا کر کوئی اچھا سا کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں۔" روبی سوچنے لگی۔ پھر بولی۔

"ہم اس کا ذکر بھوپت سے ضرور کر دیں گے ہو سکتا ہے وہ یہ رقم نکلوانے کے لئے اپنے کسی آدمی کو وہاں بھیج دے مجھے اس نے بیٹی بنا لیا ہے میری خاطر بڑے سے بڑا خطرہ بھی مول لے سکتا ہے۔" شیر خان نے کہا۔

"روبی تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں یہاں بھوپت ڈاکو ایسا عظیم انسان مل گیا۔ ذرا سوچو اگر یہ شخص تمہیں نہ ملتا تو ہم اس وقت نہ جانے کہاں ہوتے۔" سامنے سے بھوپت رائفل کاندھے سے لٹکائے ان کی طرف آیا وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ویرم چائے لایا ہے جب تک روٹیاں بھی پک جائیں گی۔ بھئی تم مسلمان ہو اور

گوشت کھاتے ہو میں بھی گوشت بڑے شوق سے کھاتا ہوں اس وقت ہانڈی میں مرغے ہی پک رہے ہیں۔" وہ ہنستا ہوا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تب روبی نے بھوپت کو مسجد کے قبرستان میں چھپائی گئی رقم کے بارے میں ساری بات بیان کر دی۔ بھوپت بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی مونچھیں مروڑ رہا تھا بولا۔

"یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے شیر خان تم میرے آدمی کو قبر کا ٹھیک ٹھیک نشان بتا دینا وہ وہاں سے رقم نکال کر لے آئے گا۔" شیر خان بولا۔

"دادا! اس کے بعد ہم جتنی جلدی ہو سکے پاکستان پہنچ جانا چاہتے ہیں کیا آپ کے آدمی ہمیں بارڈر پار کرا دیں گے۔" تو بھوپت ہنسا شیر خان کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"گھبراتے کیوں ہو یار تم میری بیٹی کے منگیتر ہو اور اس حساب سے میرے ہونے والے داماد ہو تمہارے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے اطمینان رکھو میں خود تم کو پاکستان کے علاقے میں چھوڑ آؤں گا۔" روبی اور شیر خان کے چہرے خوشی سے کھل گئے ویرم گلاسوں میں چائے لے آیا بھوپت نے ویرم کو اپنے سامنے زمین پر بٹھا لیا اور شیر خان سے کہا۔

"بیٹا اسے سمجھاؤ قبرستان والی وہ قبر کہاں ہے جس کے اندر تم نے رقم چھپائی تھی۔" شیر خان بولا۔

"دادا!" بھوپت نے وہیں شیر خان کو ٹوک دیا اور کہا۔

"تم مجھے بابا جان ہی کہا کرو، تم بھی میرے بیٹے ہو۔" شیر خان نے بھوپت کو بابا جان کے القاب سے ہی مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ویرم کو قبر کا پتا نہیں چل سکے گا مجھے اس کے ساتھ جانا ہو گا۔"

بھوپت غور کرنے لگا۔ پھر چائے کا گھونٹ بھرا گلاس زمین پر رکھ کر جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور بولا۔

"تو پھر اسکیم اس طرح بنے گی کہ ہم لوگ یہاں سے اکٹھے چلیں گے یعنی تم دونوں کے علاوہ روبی بیٹی ویرم اور سانولیا کے ساتھ گورچہ اور دیو کوٹ کے درمیان مدھ گڑھ کے قصبے کے باہر ٹھہریں گے میں شیر خان کو لے کر یہیں سے جودھ پور کی طرف روانہ ہو جاؤں گا ہم وہاں قبرستان میں چھپائی ہوئی رقم نکالیں گے اور پھر مدھ گڑھ میں اپنے ساتھیوں سے

آن ملیں گے۔ ذر وہاں سے انڈیا کا بارڈر کراس کرانے کا کام شروع ہو جائے گا۔"

روبی نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ شیر خان جودھ پور کے علاقے سے ہی فرار ہوا ہے کہیں پولیس کی سی آئی ڈی والے اسے پہچان نہ لیں۔ بھوپت بولا۔

"پولیس والے تو مجھے بھی پہچان لیں گے۔ بھوپت ڈاکو کے سر کے لئے تو ہزاروں روپے کا انعام بھی رکھا ہوا ہے لیکن ابھی تک تو کوئی ایسا پولیس والا مائی کا لعل پیدا نہیں ہوا جو بھوپت ڈاکو پر ہاتھ ڈال سکے۔" اس نے روبی کی طرف دیکھا اور شفقت بھرے لہجے میں کہا۔"بیٹی! تم اس بات کی فکر نہ کرو کہ شیر خان کو پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔ ہاں اگر شیر خان کو کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ بے شک جودھ پور نہ جائے اور مجھے قبر کا نشان بتا دے۔" شیر خان بولا۔

"نہیں بابا جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہو گا لیکن اگر میں ساتھ نہ گیا تو آپ قبر کو تلاش نہ کر سکیں گے کیونکہ ہو سکتا ہے وہاں اب تک کچھ نئی قبریں بھی بن گئی ہوں اس لئے میرا ساتھ جانا ضروری ہے۔" بھوپت نے کہا۔

"تو پھر بے خوف ہو کر میرے ساتھ چلو بھوپت اپنے بچوں کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔ تم ابھی مجھے نہیں جانتے شاید میری بیٹی روبی بھی ابھی مجھے پوری طرح سے نہیں جانتی۔" روبی جھٹ بولی۔

"بابا جان! آپ کی بہادری دلیری اور کردار کی عظمت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو آج میں آپ کی بیٹی بن کر یہاں نہ رہ رہی ہوتی آپ جیسا کہیں گے ویسے ہی ہو گا۔"

رات کے کھانے کے بعد بھوپت ڈاکو نے سانولیا سے مشورہ شروع کر دیا۔ سانولیا کہنے لگا۔

"دادا! اس سلسلے میں ہمیں مدھ گڑھ میں دیسا بھائی کے ڈیرے پر جانا ہو گا۔ پر کاش وہیں ہوتا ہے پر کاش ہی ان دونوں کو بارڈر پار کرا سکتا ہے۔ وہ سارے صحرائی راستوں سے واقف ہے۔" بھوپت نے سانولیا کی بات بڑی توجہ سے سنی اور جب سانولیا نے بات ختم کر لی تو بولا۔

"میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ مگر تم اپنی نگرانی میں ویرم کے ساتھ روبی کو لے کر دیسا بھائی کے ڈیرے کی طرف کوچ کرو گے۔ میں اور شیر خان جودھ پور جائیں گے۔" پھر بھوپت نے سانولیا کو سمجھایا کہ وہ جودھ پور شیر خان کے ساتھ کیوں جانا چاہتا ہے۔ سانولیا کچھ متفکر سا ہو کر کہنے لگا مگر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

دوسرے دن شام گہری ہوتے ہی یہ لوگ اپنے ڈیرے سے چل پڑے وہ سب کے سب بیکانیر کے دیہاتی لوگوں جیسے حلیئے میں تھے روبی نے بھی بیکانیری دیہاتی عورتوں والی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بھوپت ڈاکو نے بھی اپنا حلیہ کافی بدل لیا تھا یہ کل پانچ آدمی تھے۔ بھوپت ویرم اور سانولیا اور روبی اور شیر خان .... جنگل میں کافی دور تک انہوں نے گھوڑوں پر سفر کیا۔ پھر گھوڑے واپس روانہ کر دیے اور پیدل ہی چل پڑے۔ وہ بڑے مختصرا اور خاص راستوں سے ہو کر سفر کر رہے تھے۔ جنگل کے ایسے راستے جو صرف ڈاکوؤں کو ہی معلوم ہوتے ہیں اس بار وہ کھیدا ریلوے اسٹیشن کی طرف نہیں گئے۔ بلکہ وہاں سے چھ کوس اوپر کی طرف بانوڑہ نام کے ایک چھوٹے اسٹیشن پر پسنجر ٹرین میں سوار ہو گئے۔ یہ سارے برانچ لائین کے اسٹیشن تھے اور اکثر بے رونق رہتے تھے۔ جس گاڑی میں وہ بیٹھے وہ گودواڑے سے ہوتی ہوئی جودھ پور پہنچتی تھی۔ ساری رات وہ ریل میں سفر کرتے رہے گودواڑ کا اسٹیشن منہ اندھیرے آیا۔ یہاں سے ویرم اور سانولیا روبی کو لے کر بھوپت ڈاکو اور شیر خان سے الگ ہو گئے بھوپت جودھ پور کی طرف ٹرین میں اور دوسری پارٹی پیدل ہی اسٹیشن کی دوسری طرف سے نکل کر مدھ گڑھ کی سمت روانہ ہو گئی۔ مدھ گڑھ وہاں سے کافی دور تھا اور پیدل طے نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر سانولیا اور ویرم نے سب کچھ طے کر رکھا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ ابھی تک وہ ایسے علاقے میں تھے جہاں ریگستانی علاقہ بھی تھا اور کہیں کہیں سبزہ اور کیکر ببول کے درختوں کے جھنڈ بھی نظر آجاتے تھے۔ دونوں ڈاکو راستے سے واقف تھے۔ راستے میں ایک جگہ بیٹھ کر انہوں نے خود بھی روٹی کھائی اور روبی کو بھی کھلائی۔ دن نکل آیا تھا اور دھوپ میں گرمی اور حدت آگئی تھی پانی کی دو چھاگلیں انہوں نے ساتھ لے لی تھیں۔ سانولیا نے روبی سے کہا

"بہن جی! ہمیں کچھ دور پیدل ہی چلنا ہو گا تم تھک تو نہیں جاؤ گی؟"

روبی نے کہا۔

"نہیں ...... میں نہیں تھکوں گی تم میری فکر نہ کرو۔" سانولیا اس کے بعد اپنے ساتھی ڈاکو ویرم کی طرف متوجہ ہوا۔

"ویرے! زمیندار کی حویلی یہاں سے کتنی دور ہو گی تمہارے خیال میں؟" ویرم اندازہ لگا کر بولا۔

"تھوڑی دیر بعد زمیندار کی زمینوں میں جا پہنچیں گے۔" وہ اٹھے ایک خشک پگڈنڈی پر چل پڑے تھوڑی دیر بعد وہ ایک مقام پر سنگلاخ ٹیکریوں سے نکلے تو سامنے ہری بھری کھیتیاں اور ان کے پیچھے کچی دیواروں والا ایک بڑا سا گاؤں نظر پڑا۔ سانولیا بولا۔

"زمیندار کا گاؤں تو آگیا اب بتاؤ تم جاؤ گے کہ میں جاؤں؟" ویرم نے کہا۔

"میں جاتا ہوں تمہیں حویلی کے واڑے کا پتا نہیں ہے۔" یہ کہہ کر ویرم اٹھا اور کھیتوں میں داخل ہو گیا اس کے جانے کے بعد روبی نے پوچھا۔

"یہ کہاں گیا ہے بھیا؟" سانولیا کی نگاہیں ویرم کا برابر پیچھا کر رہی تھیں وہ ویرم پر سے نظریں ہٹائے بغیر بولا۔

"بہن جی! ویرم اونٹ لینے جا رہا ہے۔ اونٹوں کے بغیر ہم آگے سفر نہیں کر سکیں گے۔" دوپہر کا وقت تھا سخت تپش پڑ رہی تھی گاؤں پر سناٹا طاری تھا باہر گرمی تھی۔ زمیندار کے نوکر چاکر بھی حویلی کی ڈیوڑھی اور سامنے درختوں کے نیچے چارپائیوں پر سو رہے تھے۔ ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ ویرم کو معلوم تھا کہ اسے کس طرف سے کہاں جانا ہے۔ وہ اونٹوں کے باڑے کی طرف بڑھا تین اونٹ باڑے کے باہر ہی درختوں کی چھاؤں میں جگالی کرتے مل گئے۔ وہ درختوں کے ساتھ بندھے کھڑے تھے ویرم بڑا چالاک آدمی تھا اور جانوروں خاص طور پر اونٹوں کی عادات و خصائل سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ پہلے اونٹوں کے قریب سے ہو کر گزر گیا درخت کے پاس جا کر رکا اور مڑ کر دیکھا۔ اونٹوں نے ایک بار بھی گردن اٹھا کر ویرم کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ اونٹ ویرم کے بدن کی بو سے واقف ہو گئے۔ پھر بڑی احتیاط سے ایک اونٹ کو لے کر کھیتوں کی طرف بڑھ گیا۔ اسے چلتا دیکھ کر دوسرا اور پھر تیسرا اونٹ بھی پیچھے چلنے لگا۔ ویرم اونٹوں کو

درختوں کے پیچھے سے لے کر ان ٹیکریوں کی طرف آگیا جہاں سانولیا اور روبی اس کے انتظار میں تھے۔ انہوں نے پہلے ہی ویرم کو اونٹوں کے ساتھ آتے دیکھ لیا تھا روبی نے سانولیا سے کہا۔

"کیا یہ اپنے اونٹ ہیں دادا؟" سانولیا نے ہنس کر کہا۔

"بی بی! اس علاقے کے سارے اونٹ اپنے ہیں۔" یہاں سے یہ لوگ اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ اب سفر آسان ہو گیا تھا سورج ڈھل رہا تھا کہ یہ پارٹی سیتا بھاؤ کے ریگستانی علاقے کو عبور کر کے رانا سر کے گاؤں سے دو کوس دور دیسا بھائی کے ڈیرے پر پہنچ گئی۔

یہ ڈیرا رانا سر کے سرحدی گاؤں سے دور سنگلاخ ٹیلوں کے درمیان ایک ایسی جگہ پر واقع تھا جہاں پھلاہی اور کیکر کے درختوں نے سایہ دار چھت سی ڈال رکھی تھی دور سے تین اونٹ سواروں کو آتا دیکھ کر دیسا بھائی کے دو آدمی بندوقیں لے کر ڈیرے سے باہر نکل آئے تھے اور کیکروں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے ویرم کا اونٹ آگے آگے تھا۔ اس نے ڈیرے کی حدود میں داخل ہوتے ہی بلند آواز میں کہا۔

"دیسا بھائی کو کہو ہمارے جانوروں کے واسطے چارا دے دے۔" یہ ان اسمگلروں کا کوڈ تھا۔ جب اونٹ قریب آئے تو دیسا بھائی کے آدمیوں نے ویرم اور سانولیا کو پہچان بھی لیا۔ وہ درختوں کی اوٹ سے نکل آئے۔ وہ دونوں سے گلے ملے روبی کی طرف دیکھ کر ایک نے پوچھا۔

"یہ مال کہاں سے لوٹا ہے؟"

سانولیا نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "یہ اپنی ماں، بہن ہے آنکھیں نیچی کرو۔" اور دونوں سانولیا سے معافی مانگنے لگے انہوں نے روبی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا، ڈیرے کی ٹھنڈی کوٹھری میں دیسا بھائی سو رہا تھا۔ آواز سن کر جاگ پڑا، ویرم اور سانولیا کو دیکھا تو پوچھا کہ بھوپت ہمارا یار کہاں ہے وہ ساتھ کیوں نہیں آیا۔ یہ لڑکی کون ہے رے؟"

سانولیا اسی وقت دیسا بھائی کے پاس بیٹھ گیا۔ نوکر اونٹوں کو دوسری طرف لے گئے روبی اور ویرم کے آگے ٹھنڈا شربت پیالوں میں بھر کر رکھ دیا گیا۔ سانولیا نے دیسا بھائی کو ساری بات بیان کر دی اور بتایا کہ بھوپت دادا بھی شیر خان کے ساتھ کل تک پہنچ جائے گا

ویسا بھائی کی کوٹھری میں دیوار کے ساتھ چھ سات رائفلیں اور بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ کونے میں صندوق کے اوپر دیسی شراب کی بوتلیں پڑی تھیں۔ ایک کیلنڈر بھی لگا تھا جس میں ہنومان جی کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ویسا بھائی نے ساری کہانی سن کر کہا۔

"انڈیا کا بارڈر پار کرانا تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یہاں کی بارڈر فورس کے آدمی ہمارے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مشکل پاکستانی بارڈر کی ہے ان کی بارڈر فورس کے جوان آدمی کو دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں۔"

سانولیا نے پوچھا۔" پرکاشو بارڈر کراس نہیں کراسکتا؟ وہ تو سارے راستے جانتا ہے۔"

ویسا بھائی بولا۔

"پہلے کچھ نرمی تھی اب سختی ہو گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ پرکاشو بھی پاکستانی بارڈر کراس نہیں کرا سکے گا وہ گاؤں گیا ہوا ہے ابھی آجائے گا۔ اس سے بات کر لینا۔"

ان لوگوں نے منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھایا روبی نے سانولیا سے پوچھا کہ بارڈر پار کرنے کے بارے میں کیا بات ہوئی ہے۔ سانولیا نے اسے صرف یہی کہا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بھوپت دادا کو آلینے دو۔

شام کے وقت پرکاشو بھی گاؤں سے واپس آگیا ویرم اور سانولیا سے مل کر بڑا خوش ہوا اس نے بھی روبی کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔ سانولیا اسے ایک طرف لے گیا اور ساری بات سمجھائی پرکاشو اور سانولیا کوٹھری کے باہر ایک لکڑی کے شکستہ تخت پر بیٹھ گئے۔ ویسا بھائی بھی وہاں بیٹھا دارو سے دل بہلا رہا تھا اس نے پرکاشو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیوں رے پرکاشو! کیا کہتے ہو تم؟" پرکاشو پکی عمر کا بڑی بڑی راجپوتوں ایسی مونچھوں والا اسمگلر تھا اس کی آنکھوں میں صحرائی عقابوں ایسی چمک تھی کہنے لگا۔

"دادا بھائی! تم نے سانولیا کو جو بتایا ہے وہی میں بھی کہوں گا۔" وہاں ویرم بھی آکر بیٹھ گیا وہ دیر تک آپس میں تبادلہ خیال کرتے رہے ویسا بھائی کہنے لگا۔

"اکیلے مرد کا معاملہ ہوتا تو میں کہتا کہ چلو خطرہ مول لے لیتے ہیں پاکستانی بارڈر پولیس کی گولیوں سے بچ گئے تو پاکستان پہنچ جائے گا گولی لگ گئی تو اس کی قسمت مگر اس کے ساتھ ایک عورت بھی جا رہی ہے اس بے چاری عورت ذات کو کیوں مرواؤ گے؟ وہ تو ریت پر

زیادہ دور تک بھاگ بھی نہیں سکے گی۔"

پرکاشو بولا۔ "دیکھو یہ دونوں اسمگلر تو ہیں نہیں دونوں مسلمان ہیں انڈیا کے مسلمان بھی نہیں ہیں تم کہتے ہو کہ یہ ملک برما سے آئے ہیں۔ پاکستان جاکر رہنا چاہتے ہیں تو میرا مشورہ تو یہ ہے کہ میں ان دونوں کو انڈیا کا بارڈر پار کرا دیتا ہوں۔ پاکستانی بارڈر کے قریب پہنچتے ہی یہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑے ہو جائیں اور اپنے آپ کو پاکستانی چوکی کے حوالے کر دیں۔ وہاں ان پر غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہونے کے جرم میں تھوڑی سی سزا ہو جائے گی سزا دینے کے بعد یہ وہاں کی حکومت پر ثابت کر دیں کہ وہ اسمگلر نہیں ہیں اور ملک برما سے آئے ہیں اور پاکستان میں ہی رہنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے وہاں ان کو رہنے کی اجازت مل جائے گی۔ کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی اسمگلر یا جاسوس نہیں ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

سانولیا بولا۔" تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو روبی اور شیر خان میں سے کوئی بھی نہ تو اسمگلر ہے نہ جاسوس انہیں پاکستان میں پناہ مل جائے گی۔ لیکن اس بارے میں بھوپت دادا سے مشورہ ضروری ہے۔ وہ جودھ پور کے راستے شیر خان کو لے کر کل یا پرسوں کسی وقت یہاں ڈیرے پر پہنچ جائے گا فیصلہ اس کے آنے پر ہی ہو گا۔"

"ٹھیک ہے جب تک تم آرام سے یہاں رہو۔" اس نے یہ کہہ کر بوتل اور گلاس سانولیا کی طرف بڑھا دیا سانولیا اور ویرم دونوں نے ہاتھ اوپر اٹھا لئے اور سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہم نے بھوپت دادا کے سامنے قسم کھائی ہے کہ جب تک ہم اس لڑکی اور اس کے منگیتر کو پاکستان نہیں پہنچائیں گے دارو کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

اس نے مسکرا کر گلاس وغیرہ ایک طرف رکھ دیئے اور دوسری باتیں کرنے لگا۔

ان لوگوں کو ہم اسی جگہ چھوڑ کر بھوپت ڈاکو اور شیر خان کی طرف چلتے ہیں اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ ان پر کیا گزری۔

بھوپت اور شیر خان ٹرین میں سفر کرتے خیریت سے جودھ پور پہنچ گئے ایک تو ٹرین پسنجر تھی دوسرے رات کا وقت تھا راستے میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا۔ ٹرین دن

کے وقت جودھ پور پہنچی تھی دونوں ہی پولیس کو مطلوب، تھے دونوں کے لئے یہ خطر ترین علاقہ تھا اور دونوں ہی ہر قسم کی صورتحال سے نمٹنے کے لئے پوری طرح چوکر دونوں نے بھرے ہوئے ریوالور اپنے کپڑوں میں چھپا رکھے تھے۔ بھوپت کے پاس تو خنجر بھی تھا جودھ پور بھوپت کے لئے نیا علاقہ نہ تھا وہ اس شہر اور شہر کے گردو نوا چپے چپے سے واقف تھا اسٹیشن کے باہر کافی رونق تھی اور کچھ پولیس کانسٹیبل بھی نظر مگر شیر خان اور بھوپت دیہاتی لباس میں وہاں سے نکل گئے شیر خان کو شہر سے باہر مسجد کی طرف جانا تھا۔ وہ ایک طرف ہو کر سڑک کے کنارے کنارے روانہ ہوا۔ بھ چاروں طرف سے باخبر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ یہ راجستھان کا تاریخی اور پرانا اور اس زمانے میں یہاں کی آبادی ابھی اتنی زیادہ نہیں بڑھی تھی۔ مضافاتی بستیاں بھی زیادہ نہیں بنی تھیں۔ شیر خان بھوپت کو ریلوے لائن کی طرف لے آیا وہ اسی طرف گزر کر جنوب مشرق کی ایک چھوٹی سی بستی کے کونے والی مسجد میں گیا تھا جس کے ع میں ایک پرانا قبرستان تھا بھوپت نے چلتے چلتے پوچھا

"تمہیں راستہ یاد ہے نا شیر خان؟" شیر خان نے اثبات میں سر ہلا دیا ریلوے لائن ساتھ ساتھ کچھ دور تک چلنے کے بعد بائیں طرف شیر خان کو وہ بستی نظر آگئی وہ لائن اتر کر بستی کی طرف ہو لیا۔ بھوپت نے ایک بار مڑ کر دیکھا اسے ایسے لگا جیسے ایک آدمی کا پیچھا کر رہا ہے اس نے دوسری بار گردن نہ گھمائی اور بالکل سیدھا انجان بنا چلتا گیا بابت شیر خان سے بھی کوئی ذکر نہ کیا۔ بھوپت ایک تجربہ کار ڈاکو تھا اور پولیس والو سات پردوں میں بھی اور ایک میل کے فاصلے سے پہچان لیتا تھا۔ بستی کے کونے میں ا احاطے کی پرانی اینٹوں والی چار دیواری تھی جس میں سے مسجد کے مینار ابھرے ہوئے شیر خان بولا۔

"یہی مسجد ہے دادا اس کے پیچھے پرانا قبرستان ہے۔"

بھوپت نے کوئی جواب نہ دیا اس کی ساری توجہ اپنے پیچھے آنے والے مشتبہ آدمی طرف تھی مسجد کے احاطے میں داخل ہونے کی بجائے شیر خان احاطے کی پچھلی دیوار طرف مڑا جہاں قبرستان کا چھوٹا دروازہ تھا یہاں موڑ مڑتے وقت بھوپت نے گردن گھما

بہانے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی آدمی ان کے پیچھے چلا آرہا تھا اس نے تنگ پاجامہ اور ری پہنی ہوئی تھی اور سر پر کانگریسی ٹوپی کانگریسی ٹوپی دیکھ کر بھوپت ڈاکو کا ویسے ہی ے خون کھولنے لگا ایک دنیا جانتی ہے کہ بھوپت ڈاکو کانگریسی یعنی گاندھی کیپ سے ن الرجک تھا اور اپنے ڈاکے کے دوران اگر کوئی ایسا آدمی سامنے آجاتا جس نے کھدر کی ریسی کیپ پہنی ہوتی تو وہ اسے وہیں گولی سے اڑا دیتا تھا وہ کہا کرتا تھا کانگریسی ٹوپی قت اور لومڑی ایسی عیاری کی علامت ہے۔ یہ علاقہ سنسان تھا اوپر کوئی کھیت کھلواڑ نہیں تھا سامنے ایک ریتلا میدان تھا باغ کی چار دیواری میں کچھ درخت ضرور تھے ان یچ میں ایک طرف مسجد تھی اور باقی حصے میں قبریں بنی تھیں انہی قبروں سے کسی ایک ہیں شیر خان نے تقریباً سوا لاکھ ڈالر کے کرنسی نوٹوں کی تھیلی ایک پلاسٹک کے تھیلے میں کر چھپا دی تھی شیر خان قبرستانی باغ کے چھوٹے دروازے میں سے اندر داخل ہوا تو پت نے کہا

"تم مسجد میں جا کر بیٹھو خبردار باہر نہ نکلنا میں ابھی آتا ہوں۔" شیر خان نے حیرانی کے ف پوچھا کہ کیا بات ہے۔ بھوپت نے اسے مسجد کی طرف دھکیل کر کہا

"جو میں کہتا ہوں وہ کرو' جلدی چلے جاؤ۔" شیر خان سمجھ گیا کہ کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے' قبروں میں سے گزرتا مسجد کی طرف بڑھا' اس نے قبروں میں سے وہ قبر بھی دیکھ لی تھی ا کے نیچے ڈالروں کا تھیلا دبایا تھا' یہ قبر ویسی کی ویسی تھی صرف اس کی بائیں جانب دو قبریں بن گئی تھیں' وہ قبرستان کے دوسرے یعنی مسجد والے دروازے سے ہو کر مسجد صحن میں آکر ایک طرف بیٹھ گیا' ادھر بھوپت ڈاکو دوڑ کر قبرستان کے ایک درخت کی ے میں اگی ہوئی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا' اس نے جیب سے خنجر نکال کر اپنے ے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا' اس کی آنکھیں دیوار کے دروازے پر لگی تھیں' کچھ دیر بعد ر کی دوسری جانب آہٹ ہوئی جیسے کوئی خشک پتوں پر چل رہا ہو' پھر وہی کانگریسی ٹوپی آدمی قبرستان کے احاطے میں داخل ہوا' بھوپت نے اسے غور سے دیکھا' وہ چالیس الیس سال کا ایک مضبوط جسم والا آدمی تھا۔ وہ مشکوک انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا' بھوپت اور شیر خان کو ڈھونڈ رہا ہو' پھر اسے سامنے قبرستان کا دوسرا مسجد والا چھوٹا

دروازہ نظر آیا تو اس طرف چل پڑا' وہ قبروں کے درمیان پاؤں اٹھاتا چلا جا رہا تھا' بھوپت ک خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ شیر خان سے نہ الجھ پڑے' بھوپت شیر خان کو ناتجربہ کار لڑ سمجھتا تھا' اس کا خیال تھا کہ شیر خان آسانی سے اس کے قابو میں آجائے گا اور اگر شیر خا نے ریوالور کا فائر کرنے کی غلطی کر دی تو معاملہ خراب ہو جائے گا اور بستی کے لوگ وہاں جمع ہو جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ وہاں پولیس بھی آجائے اور پھر سارا منصوبہ دھرے ک دھرا رہ جائے گا۔

بھوپت جلدی سے درخت کی اوٹ سے نکلا اور قبروں سے گزرتے انٹیلیجنس والے کو آواز دے کر کہا۔

"ارے بھیا کدھر جا رہے ہو' ذرا بات تو سنو۔" وہ آدمی رک گیا' پلٹ کر بھوپت کو دیکھا' وہ جودھ پور پولیس انٹیلیجنس کا بڑا تجربہ کار افسر رام داس تھا' اگرچہ بھوپت دیہاتی حلیئے میں تھا مگر رام داس کی تیز عقابی نظروں نے اسے اس حلیئے میں بھی پہچان لیا۔

وہ ان دونوں کو مشتبہ آدمی سمجھ کر ان کے پیچھے لگا تھا یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا آمنا سامنا بھارت کے سب سے بڑے ڈاکو اور قاتل بھوپت سے ہو جائے گا' پہلے تو وہ گھبرا گیا جونہی وہ بھوپت کے سامنے آیا اس پر ایک ہیبت سی طاری ہو گئی' لیکن آخر وہ پولیس افسر تھا' اس کی ٹریننگ بڑے سخت ماحول میں ہوئی تھی' بڑی جلدی سے اس نے اپنے حواس پر قابو پالیا اور اب اس کے دل میں صرف ایک ہی خوش آئند خیال تھا کہ اگر اس نے بھوپت کو شدید زخمی کر کے گرفتار کر لیا تو نہ صرف یہ کہ اسے انعام کی بھاری رقم ملے گی' بلکہ اس کی ترقی بھی ہو جائے گی' رام داس کی جیب میں بھی بھرا ہوا پستول باقاعدہ موجود تھا' بھوپت کے سامنے آکر انٹیلیجنس افسر رام داس نے ہاتھ جوڑ کر بڑی عاجزی سے کہا۔

"مہاراج پردیسی ہوں' رہنے کے لئے کوئی ٹھکانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔"

بھوپت نے کہا۔"ارے بھیا رہنے کے لئے تمہیں قبرستان ہی رہ گیا تھا؟ ہیں بولو کون ہو تم؟" تو رام داس نے گھگیا کر کہا۔

"مہاراج! یہ دیکھ لیجئے میرے پاس ریل کا ٹکٹ ہے۔" اس کے ساتھ ہی انٹیلیجنس

افسر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا بھوپت ڈاکو کوئی اناڑی نہیں تھا کہ اسے جیب سے ہاتھ باہر نکالنے کی مہلت دے دیتا' جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ پولیس انٹیلیجنس کا آدمی ہے تو اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس کی جیب میں اسلحہ بھی ہو گا' چنانچہ جونہی رام داس نے جیب میں ہاتھ ڈالا' بھوپت ڈاکو نے اس کے پیٹ پر ناف کے نیچے اتنے زور سے لات ماری کہ رام داس وہیں دہرا ہو گیا' بھوپت ڈاکو نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ کو جیب کے اندر ہی دبوچ لیا اور اوپر دوسرے ہاتھ سے خنجر کا بھرپور وار اس کی پسلیوں میں کیا اور خنجر کو نیچے اس کی ناف تک کھینچ کر جھٹکے سے باہر نکال لیا' بھوپت نے بجلی ایسی تیزی سے سی آئی ڈی والے کا وہ ہاتھ باہر نکال دیا جو اس نے پستول والی جیب میں ڈال رکھا تھا اور اسے دوسری طرف لڑھکا دیا' رام داس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں اور خون کچی قبر کی مٹی میں جذب ہوتا چلا گیا' وہ خون کے جوش میں اٹھنے لگا تو بھوپت نے اسے لات مار کر گرا دیا اور خنجر کا دوسرا وار اس کی گردن پر کیا جس سے اس کی آدھی گردن آگے سے کٹ گئی۔ بھوپت نے رومال سے خنجر صاف کر کے جیب میں رکھا اور احاطے کے دونوں دروازوں کی طرف دیکھا' وہاں کوئی بھی نہیں تھا' رام داس کی بھی آواز نہیں نکلی تھی' اس کی لاش ذرا سی تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ بھوپت نے لاش کی جیب کی تلاشی لی تو وہاں سے بھرا ہوا سرکاری پستول اور رام داس کی پاس بک اور شناختی کارڈ نکلا' یہ پولیس کا شناختی کارڈ تھا جس کو بھوپت ڈاکو بڑی اچھی طرح سے پہچانتا تھا' اس نے ان چیزوں کو اپنی صدری کی جیب میں ڈال لیا اور رام داس کی لاش پر ادھر ادھر سے مٹی اور سوکھے پتے اٹھا کر ڈال دیئے۔ پھر مسجد میں آیا' شیر خان وہاں ایک طرف چھپ کر بیٹھا تھا۔ بھوپت کو دیکھ کر وہ مسجد کے باہر آگیا۔

"کیا ہوا دادا؟ کوئی ہمارے پیچھے لگا تھا؟" بھوپت نے بے نیازی سے کہا۔ "ہاں ایک آدمی لگا تھا' اسے میں نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ آؤ اب بتاؤ وہ قبر کہاں ہے۔" جب شیر خان رام داس کی لاش کے قریب سے گزرا تو اس نے بھوپت ڈاکو کی طرف دیکھا۔ بھوپت ڈاکو نے ہاتھ کے اشارے سے آگے چلنے کو کہا' شیر خان کونے والی قبر کے پاس آکر بیٹھ گیا' اس نے قبر کو پہچان لیا تھا' یہ قبر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس میں سرہانے کی طرف جو سوراخ تھا اسے جھاڑ جھنکار نے بند کر دیا تھا' مگر شیر خان نے اس کے اندر ہاتھ ڈال دیا' وہ اپنا بازو کاندھے

تک قبر کے اندر لے گیا۔ جب ہاتھ باہر نکالا تو پلاسٹک کا ایک پیکٹ بھی اس کے ساتھ تھا‘ انہوں نے اسے کھول کر دیکھا۔ ڈالروں کے نوٹوں کی گڈیاں ویسی کی ویسی محفوظ تھیں۔

بھوپت نے پلاسٹک کا پیکٹ شیر خان سے لے کر اپنی قمیص کے اندر کمر کے ساتھ باندھ لیا اور شیر خان سے کہا۔

"واپس چلو۔"

وہ قبرستان سے نکلے تو سیدھا ریلوے لائن کی طرف جانے کی بجائے ریت کے ٹیلوں کی طرف ہو گئے‘ راستے میں اس نے شیر خان کو رام داس کا پستول اور شناختی کارڈ دکھایا اور کہا۔

"یہ پولیس کا آدمی تھا‘ ہمیں مشتبہ سمجھ کر تعاقب کر رہا تھا‘ یہ ہمارے سارے کیے دھرے پر پانی پھیر سکتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ریلوے اسٹیشن پر خفیہ پولیس کے آدمی موجود ہیں‘ ورنہ یہ ہمارے پیچھے نہ لگتا‘ اب ہم ریلوے اسٹیشن کی طرف نہیں جائیں گے اگلے اسٹیشن سے گاڑی پکڑیں گے۔ وہاں تک کسی لاری یا تانگے پر بیٹھ کر جائیں گے۔"

اسی طرح باتیں کرتے یہ لوگ ٹیلوں اور پرانی بستی کے اوپر سے ہو کر ریلوے اسٹیشن کی کافی دور سے دوسری طرف نکل گئے۔ اسٹیشن سے کوئی دو کوس کے فاصلے پر سے انہوں نے ریلوے لائن عبور کی اور ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے‘ وہ ریلوے لائن کے ساتھ ہی ساتھ چل رہے تھے۔ ان کے بائیں جانب کچی سڑک تھی۔ پیچھے اسٹیشن کی طرف سے ایک لاری آ رہی تھی‘ بھوپت اور شیر خان سڑک پر آ گئے‘ لاری دیہاتی مسافروں سے بھری ہوئی تھی‘ بھوپت نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو موٹر رک گئی۔ ڈرائیور نے منہ باہر نکال کر کہا کہ موٹر کی چھت پر بٹھا سکتا ہوں۔ بھوپت بولا۔

"ٹھیک ہے بھیا۔" شیر خان اور بھوپت موٹر کی چھت پر بیٹھ گئے‘ موٹر چل پڑی‘ بھوپت کو یہاں سے باڑورہ کے اسٹیشن تک جانا تھا‘ جہاں سے گاڑی پکڑ کر مدھ گڑھ تک ٹرین میں سفر کرنا تھا۔ اس کے آگے دیسا بھائی کے سرحدی گاؤں تک صحرائی سفر تھا۔

باڑورہ یہ موٹر دو گھنٹے کے سفر کے بعد پہنچی وہاں اتر کر بھوپت نے کرایہ ادا کر دیا‘ وہ ریلوے اسٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ درخت کے نیچے بیٹھ گئے‘ شیر خان ایک

دکان سے کھانا لے آیا جو انہوں نے وہیں بیٹھ کر کھا لیا‘ کافی دیر بعد دور سے ریل گاڑی کے انجن کی چھک چھک سنائی دینے لگی‘ بھوپت اور شیر خان اٹھے اور اسٹیشن پر آ گئے‘ انہوں نے یہاں سے مدھ گڑھ کے دو ٹکٹ خریدے‘ جب گاڑی اسٹیشن پر آ کر رکی تو وہ ایک جگہ ستون کی اوٹ میں کھڑے رہے‘ وہاں انہیں پولیس کا کوئی بھی آدمی دکھائی نہیں دیا تھا‘ پھر بھی جب ٹرین پلیٹ فارم پر کھسکنے لگی‘ تو وہ بھاگ کر ایک ڈبے میں گھس گئے‘ یہاں سے مدھ گڑھ تک کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا‘ اس دوران بھوپت اور شیر خان ڈبے کے برتھ پر چڑھ کر لیٹے رہے اور انہوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی‘ مدھ گڑھ کے اسٹیشن پر وہ ٹرین سے اتر کر باہر آ گئے‘ گیٹ کی طرف آنے کی بجائے انہوں نے دوسری طرف سے ریلوے لائن پار کی اور ایک مال گاڑی کے پیچھے سے ہوتے ہوئے درختوں کی چھاؤں میں چائے کے ایک کھوکھے کے پاس آ کر بیٹھ گئے‘ سورج غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا‘ صحرائی علاقے میں بڑی خوشگوار ہوا چلنے لگی تھی۔ بھوپت نے شیر خان کو آہستہ سے کہا

"یہاں سے آگے صحرا میں سفر شروع ہو گا‘ یہ سارا سرحدی علاقہ ہے‘ یہاں بارڈر فورس والے اکثر گشت لگاتے رہتے ہیں‘ مگر ان کو دیکھ کر گھبرانا ہرگز نہیں‘ اگر کوئی پوچھے تو یہی کہنا ہے کہ دیول سار کے زمیندار کے مزارع ہیں ان کی زمینوں پر جا رہے ہیں دیول سار یہاں سے سرحد کی جانب چار پانچ کوس پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میں وہاں کئی بار جا چکا ہوں۔"

شیر خان نے سوال کیا۔

"یہ صحرائی سفر کتنا وقت لے گا۔؟"

بھوپت بولا "پو پھٹنے تک دیسا بھائی کے ڈیرے پر پہنچ جائیں گے۔"

"کیا ہمیں ریگستان میں پیدل چلنا ہو گا؟" شیر خان نے کچھ متفکر ہو کر پوچھا۔

بھوپت ہنس پڑا اور اس کے کاندھے کو ہاتھ سے دبا کر بولا "یہاں لوگوں نے گھوڑے اونٹ کس لئے پال رکھے ہیں؟" شیر خان سمجھ گیا کہ بھوپت کا اس فقرے سے مطلب کیا تھا‘ انہیں سنگلاخ علاقے میں چلتے چلتے جب شام ہو گئی تو بھوپت نے شیر خان کو ایک جگہ بیٹھنے کو کہا اور خود کچھ فاصلے پر نظر آتے ایک گاؤں کی طرف چل دیا‘ جب واپس آیا تو

گھوڑے پر سوار تھا اور ایک خالی گھوڑا ساتھ بھی تھا۔ یہاں سے وہ گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

بھوپت ڈاکو چونکہ اس علاقے کے سارے راستوں سے واقف تھا اس لئے وہ چلتے چلے گئے' رات جب کافی گہری ہو گئی تو بھوپت کہنے لگا۔

"اگر تم آرام کرنا چاہو تو یہاں تھوڑی دیر سو جاؤ۔" شیر خان کو منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی' کہنے لگا۔

"ڈیرے پر چل کر ہی آرام کر لیں گے دادا! کیا خیال ہے؟" بھوپت نے مسکراتے ہوئے گھوڑا آگے بڑھا دیا' یوں ویران صحرائی علاقے میں سفر کرتے یہ لوگ دیسا بھائی کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ اس وقت صحرا میں سورج طلوع ہو چکا تھا' روبی نے شیر خان کو دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا۔ دوپہر تک شیر خان اور بھوپت سوئے رہے' اس دوران ویرم کو بارڈر کی طرف بھیج دیا گیا تھا تاکہ وہ حالات کا جائزہ لے کر آئے۔ جب ویرم واپس آیا اس وقت بھوپت' سانولیا' دیسا بھائی اور شیر خان کوٹھری میں بیٹھے بارڈر کراس کرنے کے منصوبے پر غور کر رہے تھے۔ مشکل صرف پاکستانی بارڈر کراس کرنے کی تھی۔ ویرم نے آکر بتایا کہ انڈین سیکیورٹی فورس کے اپنے آدمی ایک خاص رقم کے عوض دونوں کو اپنے بارڈر سے نکال دینے پر تیار ہیں مگر آگے کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا۔ وہاں روبی بھی آگئی اور شیر خان کے پاس ایک طرف مونڈھے پر بیٹھ کر ان کی باتیں سننے لگی۔ دیسا بھائی بولا۔

"بھوپت دادا! ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ یہ انڈین بارڈر پار کر کے پاکستانی سرحد پر جاتے ہی اپنے آپ کو وہاں بارڈر پولیس کے حوالے کر دیں اور سچی بات بیان کر دیں' اس طرح ان پر مقدمہ چلے گا اور تھوڑی سی قید ہو جائے گی۔ اس دوران یہ ان پر ثابت کر سکتے ہیں کہ ان کا انڈیا سے۔۔۔۔کوئی تعلق نہیں اور یہ ملک برما سے فرار ہو کر پاکستان آنا چاہتے تھے جو ان کے باپ دادا کا وطن تھا اور جہاں وہ شادی کر کے نئی شریفانہ زندگی شروع کرنا چاہتے ہیں۔"

کافی دیر تک بحث مباحثہ کے بعد وہ لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ شیر خان اور روبی کو بارڈر کراس کر کے اپنے آپ کو پاکستانی بارڈر فورس کے حوالے کر دینا چاہئے' صرف یہی ایک

طریقہ پاکستان پہنچنے کا تھا۔ سانولیا نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ ہو سکتا ہے پاکستانی بارڈر فورس ان پر فائرنگ کر دے۔ اس پر دیسا بھائی بولا۔

"اگر یہ پاکستان کے بارڈر میں داخل ہونے سے پہلے ہی سفید جھنڈی لہرا دیں گے تو پاکستانی بارڈر فورس ان پر گولی نہیں چلائے گی۔"

بھوپت نے شیر خان سے اس کی رائے پوچھی' شیر خان بھی سمجھ گیا تھا کہ اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے اور روبی نے حامی بھر لی۔ اب سوال ڈالروں کے تھیلے کا تھا۔ یعنی یہ دولت ساتھ لے کر اگر وہ جاتے ہیں تو ظاہر ہے پاکستانی بارڈر پر اسے ضبط کر لیا جائے گا اور ان دونوں پر اسمگلنگ کے جرم میں ایک اور مقدمہ درج ہو جائے گا۔ اس کا حل دیسا بھائی نے ڈھونڈ نکالا کہنے لگا۔

"اگر شیر خان یہ ڈالر میرے پاس چھوڑ جائے تو میں اسے تھرپارکر میں ایک آدمی کے نام خط لکھ کر دے دوں گا' وہ ان ڈالروں کے بدلے پاکستانی کرنسی میں ساری رقم ادا کر دے گا۔" یہ بڑی اچھی ترکیب تھی۔ بھوپت ڈاکو نے روبی اور شیر خان سے کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ تمہاری ساری رقم پاکستانی کرنسی میں تمہیں مل جائے گی۔" پھر اس نے شیر خان اور روبی کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا کہ دیسا بھائی اور اس کے آدمیوں کا کاروبار ہی یہی ہے۔ ان سب پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔" شیر خان بولا۔

"مگر ہمیں تو بارڈر پر گرفتار کر لیا جائے گا۔ ہم تھرپارکر دیسا بھائی کے آدمی کے پاس کیسے پہنچیں گے؟"

تب بھوپت اسے دیسا بھائی کے پاس لے کر آیا۔ دیسا بھائی بولا۔

"میں تمہیں خط بھی نہیں دوں گا۔ کیونکہ تلاشی کے وقت یہ خط برآمد ہو کر تمہارے لئے پریشانی پیدا کر سکتا ہے۔ میں تمہیں تھرپارکر میں اپنے آدمی کا نام اور حلیہ بتا دیتا ہوں۔ ایک خفیہ لفظ بھی بتائے دیتا ہوں۔ اگر مقدمے میں تمہاری ضمانت ہو جائے یا کسی طرح تم بچ جاؤ یا پھر قید ہی کاٹنی پڑے۔ تب بھی تم جیل سے باہر آکر میرے آدمی کو مل کر اس کو اپنا نام اور اپنا کوڈ ورڈ بتا کر اس سے اپنی رقم وصول کر سکتے ہو۔ مجھ سے جیسے بھی ہو سکا میں تھرپارکر والے آدمی سے رابطہ پیدا کروں گا۔" دیسا بھائی نے روبی اور شیر خان کو تھرپارکر میں

اپنے خاص آدمی کا نام اس کا پتا اور خفیہ کوڈ بتا دیا۔ اس رات کے اندھیرے میں وہ بارڈر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت صرف بھوپت ڈاکو اور ویرم ہی روبی اور شیر خان کے ساتھ تھے۔ یہ بارڈر کا علاقہ تھا۔ یہاں جگہ جگہ ریت کے ٹیلے اور گڑھے تھے۔ سوکھی جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں۔ ویرم تاروں کی روشنی میں ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک گن پوسٹ نظر آئی۔ ویرم ان لوگوں کو وہیں چھوڑ کر خود انڈین بارڈر فورس کی گن پوسٹ کی طرف چلا گیا۔ یہ وہ بھارتی سپاہی تھے جن کو ویرم نے رشوت دے رکھی تھی ان کی طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد ویرم نے واپس آ کر بھوپت ڈاکو سے کہا۔

"داوا! سب ٹھیک ہے۔"

بھوپت ڈاکو نے روبی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور پدرانہ شفقت بھری آواز میں بولا۔

"جاؤ بیٹی! خدا تمہیں پاکستان میں نئی زندگی مبارک کرے۔ مجھے بھی پاکستان سے محبت ہے۔ خدا نے چاہا تو میں بھی ضرور پاکستان آجاؤں گا اور وہاں شریفانہ زندگی شروع کروں گا۔" پھر اس نے شیر خان سے بغل گیر ہو کر کہا "شیر خان! روبی کا خیال رکھنا شادی کے بعد اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔ یہ کبھی نہ بھولنا کہ یہ میری بیٹی ہے جاؤ۔ خدا تمہارا نگہبان ہو اور ایسا ہی کرنا جیسا تمہیں کہا گیا ہے۔"

ویرم نے رات کے اندھیرے میں ایک جگہ جھاڑیوں میں سے دونوں کو انڈیا کا بارڈر پار کرا دیا دونوں ملکوں کی سرحدوں کے درمیان جو تھوڑا سا علاقہ تھا وہ انہوں نے ریت پر رینگ کر پار کیا۔ جونہی انہیں سامنے پاکستانی چوکی نظر آئی شیر خان اٹھ کھڑا ہوا۔ بلند آواز میں کہا۔

"ہم پاکستانی ہیں، ہم اسمگلر نہیں ہیں ہمیں پاکستان میں پناہ چاہئے۔" تھری ناٹ تھری کے دو فائر ہوئے اور گولیاں شیر خان کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ روبی زمین پر ہی لیٹی تھی۔ ایک پاکستانی جیپ ٹیلے کے پیچھے سے نکل کر تیزی سے ان کی طرف بڑھی اور دوسری طرف سے ان پر سرچ لائٹ کی روشنی پڑی۔ دونوں کو اسی وقت گرفتار کر کے بارڈر سیکیورٹی آفس میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں پر موجود ایک پاکستانی افسر نے ان دونوں کو غور سے دیکھا اور پوچھا

"تم نے انڈیا کا بارڈر کیسے پار کر لیا۔ تمہارے ساتھ اور اسمگلر کون کون تھے؟" روبی نے شیر خان کی طرف دیکھا۔ شیر خان بولا۔

"اگر آپ مجھے موقع دیں تو میں آپ کو ساری کہانی سنا دیتا ہوں۔" اور پھر شیر خان نے شروع سے ساری داستان بیان کر دی۔ پاکستان کی سرزمین میں آتے ہی شیر خان کے دل میں اپنے بزرگوں کے وطن کی محبت کے جذبات بیدار ہو گئے تھے۔ اس نے پاکستانی افسر کو یہ بھی بتا دیا کہ ان دونوں کو انڈیا کے دیسا بھائی نے بارڈر کراس کرایا ہے۔ جو راجستھان کا مشہور اسمگلر ہے۔ شیر خان نے کہا۔

"میں آپ کو ایک سچے پاکستانی ہونے کے ناطے یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس لاکھوں ڈالر کے کرنسی نوٹ تھے جو ہم نے دیسا بھائی کو دے دیے ہیں جس کا ایک خاص آدمی تھرپارکر میں بیٹھا ہے، وہ ہمیں ان کے عوض پاکستانی کرنسی میں رقم ادا کرنے والا ہے۔ بے شک آپ ہماری ساری رقم ہم سے لے لیں مگر تھرپارکر والے اس اسمگلر کو ضرور گرفتار کریں۔ جو پاکستان میں رہ کر دشمن ملک کے ساتھ اسمگلنگ کا ناجائز دھندا کرتا ہے۔"

روبی نے حیران ہو کر شیر خان کی طرف دیکھا۔ شیر خان نے کہا۔

"روبی! میں نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک کیا ہے۔ اب ہمارا جینا مرنا سب کچھ پاکستان کے لئے ہے۔ پاکستان کی فضاؤں میں آتے ہی میرے دل سے جھوٹ اور جرائم کی میل دھل گئی ہے۔ میں پاکستان میں ناجائز طریقے سے لائی ہوئی رقم سے کاروبار نہیں شروع کرنا چاہتا۔"

پھر اس نے پاکستانی بارڈر فورس کے افسر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"جناب! آپ یقین کریں کہ میں نے جو بیان دیا ہے اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ شامل نہیں ہے۔" پاکستانی افسر شیر خان کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا تمہیں تھرپارکر والے آدمی کا نام پتا معلوم ہے؟"

"کیوں نہیں جناب۔" شیر خان نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ "اس کا نام دھیرج لعل بتایا گیا ہے اور وہ تھرپارکر شہر سے سات کوس دور ایک گوٹھ میں رہتا ہے جس کا نام بھی مجھے معلوم ہے۔ دیسا بھائی نے مجھے ایک خفیہ لفظ بھی بتایا ہے جس سے دھیرج لعل مجھے پہچان سکے گا۔" پھر شیر خان نے پاکستانی افسر کو وہ خفیہ لفظ بھی بتا دیا اور کہا۔ "میں یہ سب کچھ اس

itsurdu.blogspot.com

لئے کر رہا ہوں کہ میں پاکستان کو اپنا سب کچھ سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ پاکستان کا دشمن دھیرج لعل گرفتار ہو جائے۔ میری دولت جاتی ہے تو چلی جائے۔ میں پاکستان میں رہ کر محنت مزدوری کر کے پھر کما لوں گا۔" روبی کو شیر خان کے کردار کا یہ مجاہدانہ پہلو بہت اچھا لگا۔ پاکستانی افسر نے اسی وقت پیچھے ہیڈ کوارٹر ٹیلی فون کیا۔ روبی اور شیر خان کو جیپ میں بٹھایا ساتھ گارڈ لی اور ہیڈ کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں پاکستانی بارڈر سیکیورٹی کے افسر نے شیر خان کو صاف لفظوں میں بتایا کہ ان پر غیر قانونی طور پر پاکستان کی سرحد پار کرنے کے جرم میں مقدمہ ضرور چلے گا۔ شیر خان نے جواب دیا۔

"میں پاکستانی قانون کا احترام کرتا ہوں۔ ہمیں چاہے جتنی سزا ہو جائے۔ لیکن کم از کم اس پاکستانی دشمن اسمگلر کو ضرور گرفتار کراؤں گا۔ جو اس وقت میرے علم میں ہے۔"

راتوں رات بارڈر سیکیورٹی فورس کے جوان دھیرج لعل اسمگلر کے گوٹھ پہنچ گئے۔ انہوں نے شیر خان کو آگے بھیج دیا۔ دیسا بھائی نے جس دکان کا نقشہ شیر خان کو بتایا تھا شیر خان اسی کچے مکان کے دروازے پر جا پہنچا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ تین چار مرتبہ دستک دینے پر دروازہ کھلا اور ایک دبلا پتلا پکی عمر کا آدمی شیر خان کو نیند بھری آنکھوں سے تکتے ہوئے بولا

"کیا ہے سائیں۔ اس وقت کیوں تنگ کرنے آگئے ہو؟" شیر خان نے اس کے آگے دیسا بھائی کا نام لیا۔ پھر خاص خفیہ لفظ دہرایا۔ یہ لفظ بڑا کارگر تھا اور خاص خاص موقعوں پر استعمال کیا جاتا تھا۔ دھیرج لعل نے جلدی ہی کہا

"تو اندر آجاؤ سائیں باہر کیوں کھڑے ہو؟"

شیر خان بولا

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ تم ذرا میرے ساتھ آؤ ایک زنانہ بھی ساتھ ہے۔"

دھیرج لعل ٹھیک ہے سائیں چلو۔ کہہ کر شیر خان کے ساتھ گوٹھ سے باہر آگیا۔ شیر خان اور دھرج لعل جب ایک خاص جگہ پر پہنچے تو اچانک چاروں طرف سے پاکستانی بارڈر فورس کے جوان نکل آئے اور انہوں نے اسی وقت دھیرج لعل کو قابو کر لیا۔ شیر خان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے پر سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہے۔ اسے اپنا ضمیر بالکل پاک

اور بے داغ محسوس ہونے لگا۔ اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر خدا کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرے روز شیر خان اور روبی کو شہر کی ایک الگ عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان پر پاکستانی سرحد غیر قانونی طور پر پار کرنے کے جرم میں مقدمہ چلا اور دونوں کو ایک خاص مدت تک کی قید ہو گئی۔ دونوں نے قید بڑے سکون سے کاٹی۔ اس کے بعد شیر خان نے اپنے وکیل سے مل کر اپنا کیس تیار کر کے عدالت میں درخواست دائر کر دی کہ میرا انڈیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم لنکا کے علاقے سے آئے ہیں اور ہمارے رشتہ دار پاکستان میں ہی آباد ہیں۔ ہمارے بزرگ بھی پاکستان ہی کے رہنے والے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے منگیتر ہیں اور پاکستان میں آباد ہو کر میاں بیوی کی حیثیت سے نہایت شریفانہ زندگی کی ابتدا کرنا چاہتے ہیں۔ پنجاب کے ایک گاؤں میں شیر خان کے رشتے داروں کا پتا چلا لیا گیا۔ روبی کے باپ دادا اور دوسرے رشتے داروں کا سراغ مل گیا۔ اور انہوں نے تصدیق کر دی کہ شیر خان کے ماں باپ اور روبی کا باپ پنجاب چھوڑ کر ملک برما اور لنکا چلے گئے تھے اور یہ دونوں وہیں پیدا ہوئے اور ان کے بارے میں ان کے ماں باپ انہیں پاکستان میں اکثر خط لکھا کرتے تھے۔ تمام بیانات سننے کے بعد عدالت نے روبی اور شیر خان کے حق میں فیصلہ دے دیا اور انہیں پاکستانی شہری کی حیثیت سے پاکستان میں اپنی نئی زندگی شروع کرنے کی اجازت اور حق مل گیا۔ روبی اور شیر خان بڑے خوش تھے۔ شیر خان کا ایک چچا انہیں اپنے ساتھ گاؤں لے گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شیر خان اپنے ساتھ خفیہ طور پر کچھ دولت ضرور لایا ہو گا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس کے بھائی کا بیٹا سمندر پار اسمگلنگ وغیرہ کرتا ہے۔ اسی گاؤں میں روبی اور شیر خان کی شادی بھی ہو گئی۔ شیر خان کا خیال تھا کہ وہ گاؤں میں رہنے کی بجائے شہر میں جا کر کوئی مکان کرائے پر لے لے گا اور کسی کارخانے میں ملازمت کرنی شروع کر دے گا۔ مگر اس کا تایا تو اس کی خفیہ دولت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ آخر اس نے شیر خان سے پوچھ ہی لیا۔ شیر خان نے کہا۔

"چاچا جی! میرے پاس کچھ رقم تھی مگر میں وہ انڈیا میں ہی چھوڑ آیا ہوں۔ کیونکہ وہ ناجائز کمائی تھی۔ میں اسے پاکستان نہیں لانا چاہتا تھا۔" یہ سنتے ہی شیر خان کے چچا کا مزاج بگڑ گیا' کہنے لگا۔

"برخوردار! اگر یہ بات ہے تو پھر یہاں سے بوریا بستر اٹھاؤ اور شہر جا کر محنت مزدوری کر کے کماؤ اور کھاؤ۔ ہمارے ساتھ اب تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

شیر خان کو اپنے چچا سے اس سلوک کی امید نہیں تھی لیکن اب وہ وہاں رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی شہر جا کر رزق حلال کمانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی روز اس نے روبی کو ساتھ لیا۔ ایک ٹرنک میں کچھ کپڑے رکھے اور بس میں سوار ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ روبی نے راستے میں شیر خان سے کہا

"تم گھبرانا مت۔ میں تمہارے ساتھ کام کروں گی۔ ہم دونوں محنت مزدوری کر کے حلال کی روزی کما لیں گے۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ ہمیں یہاں ایک نیک پاک زندگی بسر کرنے کا موقع ملا ہے۔" دونوں جوان تھے۔ دونوں کے دل صاف تھے' نیتیں نیک تھیں' ارادے پاک تھے' رگوں میں نوجوانی کا گرم خون گردش کر رہا تھا۔ پاکستان کی فضاؤں میں انہیں اپنا اور اپنے بچوں کا بڑا روشن مستقبل نظر آرہا تھا۔ دونوں کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ انہیں جرائم پیشہ زندگی سے نجات مل گئی ہے اور اب وہ پاکستان میں حلال کی روزی کما کر اپنے ہونے والے بچوں کی پرورش کریں گے۔ اپنی گزشتہ زندگی کے گناہوں اور جرائم کو انہوں نے اپنے اندر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال کر پھینک دیا تھا۔ دونوں کے دل مطمئن تھے۔ دونوں کے ضمیر صاف تھے۔ دونوں میں سے کسی کو بھی دولت کا لالچ نہیں تھا۔ دولت انہوں نے بہت دیکھ لی تھی' اب تو وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ تھوڑا بہت کما کر اسی میں گزارہ کریں اور اپنے بچوں کو نیک شہری بنائیں۔ بس میں وہ اسی قسم کی باتیں آپس میں کرتے رہے بس لاہور شہر میں داخل ہو گئی تھی۔ یہ شہر روبی کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ شیر خان اس سے پہلے دو مرتبہ یہاں آچکا تھا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ مارچ کے مہینے کے آخری دن تھے۔ شیر خان کی جیب میں زیادہ پیسے نہیں تھے۔ لیکن وہ مطمئن تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ شہر میں جاتے ہی کسی ہوٹل یا کسی کارخانے میں نوکری تلاش کر لے گا۔ اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شیر خان ابھی نوجوان ہی تھا اس کی عمر بیس سال سے نیچے ہی تھی۔ مگر جرائم پیشہ ماحول کی زندگی نے اسے فولاد کی طرح سخت جان بنا دیا تھا۔

بس لاری اڈے پر جا کر رک گئی۔ شیر خان روبی کو لے کر بس سے اترا سامنے سڑک

پار کی عمارتوں کو دیکھا اور بولا

"اس علاقے کو میں جانتا ہوں روبی؟"

روبی نے پوچھا "مگر ہم جائیں گے کہاں شیرے؟" شیر خان نے بے نیازی اور اعتماد سے کہا۔

"اللہ مالک ہے وہی ہمارا بندوبست کرے گا۔" وہ وہیں لاری اڈے میں ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے پاس صرف ایک پرانا سا ٹرنک اور دری میں لپٹا ہوا بستر تھا۔ شیر خان سوچ رہا تھا کہ وہ اتنے بڑے شہر میں پہلے کسی جگہ جا کر نوکری کی کوشش کرے۔ اسے کوئی ہنر بھی نہیں آتا تھا۔ ہاں اسے ہیرے جواہرات کی پہچان تھی۔ یہ پہچان اسے جنوبی ملکوں میں اسمگلنگ کے دوران ہوئی تھی۔ مگر اس کام پر اسے بھلا کون اپنے ہاں نوکر رکھ سکتا تھا۔ لاہور شہر میں اس کا کوئی واقف کار بھی نہیں تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک درمیانے قد کا مضبوط جسم والا آدمی ان کے پاس آیا اس نے قمیض پتلون چپل پہن رکھی تھی۔ سلام کر کے شیر خان کے پاس بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ باتوں ہی باتوں میں وہ آدمی جس نے اپنا نام عمر بتایا تھا شیر خان سے کہا کہ وہ اسے ایک مقامی سینما گھر میں گیٹ کیپری کی نوکری دلوا سکتا ہے۔

"تمہیں ڈیڑھ سو روپے تنخواہ ملے گی۔ اوپر سے تم جتنی چاہو آمدنی بنا سکتے ہو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ والی کوٹھری بھی لے دوں گا' تمہارا زنانہ ساتھ ہے اور شہر بہت بڑا ہے' میں نہیں چاہتا کہ تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ' اگر پسند کرو تو ابھی میرے ساتھ چلو' میں سینما گھر کے منیجر سے تمہیں ملوائے دیتا ہوں۔"

روبی خاموش بیٹھی رہی' شیر خان کو اپنے پر اور اسلامی ملک پاکستان پر بڑا اعتماد تھا۔ اسے نوکری کی اشد ضرورت تھی اور ساتھ ہی رہنے کے لئے کسی کوٹھری کی اس آدمی نے ان دونوں کی پیشکش کی تھی شیر خان راضی ہو گیا۔ روبی نے چلتے وقت شیر خان کے کان میں اتنا ضرور کہا کہ ہمیں سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہئے۔ جس پر شیر خان نے مسکراتے ہوئے روبی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"اللہ مالک ہے۔ یہ اپنا ملک ہے' اپنے بھائی ہیں یہاں۔" وہ آدمی ان دونوں کو ایک

چھوٹی سی کوٹھری میں لے آیا جہاں مزدور طبقے کے لوگ رہ رہے تھے۔ ایک کوٹھری دونوں کو دے دی اور شیر خان سے کہا۔

"تم یہاں آرام کرو، میں سینما گھر کے منیجر سے مل کر آتا ہوں۔" وہ چلا گیا، کچھ دیر بعد واپس آیا تو بڑا خوش تھا۔ شیر خان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم خوش قسمت ہو شیر خان، منیجر صاحب نے میری خاص سفارش پر تمہیں نوکر رکھ لیا ہے۔ اب آج شام کو تم سینما گھر میں جا کر ڈیوٹی شروع کر دو گے۔"

پھر اس نے روبی سے بھی کہا: "بھابی مبارک ہو آپ کو بھی اتنی جلدی آج کل نوکری نہیں ملا کرتی۔" ساتھ ہی جیب سے دس دس روپے کے دس نوٹ نکال کر شیر خان کے سامنے رکھ دیئے۔

"منیجر صاحب کو کہہ کر میں نے تمہارے لئے یہ رقم ایڈوانس کے طور پر لے لی ہے۔ اسے رکھ لو، اور ہر ماہ تمہاری تنخواہ سے پانچ روپے کاٹ لئے جائیں گے۔"

شیر خان بڑا خوش ہوا، عمر یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ شام کو آکر اسے اپنے ساتھ سینما گھر لے چلے گا۔ شیر خان اسی وقت بازار جا کر نان کباب لے آیا، روبی برما لنکا کے جنگلوں میں سگریٹ پیا کرتی تھی مگر پاکستان میں آتے ہی اس نے سگریٹ کی عادت ترک کر دی تھی، پہلے اس کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ پتلون پہنا کرتی تھی مگر پاکستان میں آتے ہی اس نے بالوں کو بڑھانا شروع کر دیا تھا اور اب سیدھی سادی عورتوں کی طرح بالوں کی چوٹی کرتی تھی اور سر پر ہمیشہ دوپٹے کا پلو ہوتا تھا اور شلوار قمیص میں ملبوس ہوتی تھی، دونوں نے نماز بھی پڑھنی شروع کر دی تھی، شام کو عمر آیا اور شیر خان کو اپنے ساتھ لے گیا، روبی کوٹھری میں ہی رہی اور چارپائی پر بیٹھی اپنے اور شیر خان کے کپڑے ٹرنک سے نکال کر ٹھیک کرنے لگی، وہاں سے تھوڑی دور ایک پرانا سینما ہاؤس تھا، عمر نے شیر خان کو ایک آدمی سے ملایا جس نے اسے اسی وقت سینما ہال کے تھرڈ کلاس کے گیٹ کے باہر کھڑا کر دیا اور کہا۔

"آج صرف یہ دیکھتے رہو کہ میں ٹکٹ کیسے کاٹ کر ہال میں جانے والوں کو دیتا ہوں، کل سے تم باقاعدہ کام شروع کر دو گے۔"

شیر خان کی سینما گھر میں ڈیوٹی رات ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتی تھی جب فلم کا آخری

شو ختم ہوتا ہے۔ روبی شام تک کوٹھری میں ہی رہی پھر چادر اوڑھ کر کوٹھری سے باہر آئی کہ محلے کی عورتوں سے کوئی بات وغیرہ کرے، محلے کی عورتیں اپنے اپنے کام میں لگی تھیں، کسی نے روبی کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ بلکہ دو ایک نے تو اسے بڑی مشکوک نظروں سے دیکھا، ایک نے تو بلند آواز میں دوسری سے کہا۔

"اری نئی نئی آئی ہے۔"

روبی کو یہ جملہ اچھا نہ لگا، وہ کوٹھری میں چلی گئی، اسے عمر کہہ گیا تھا کہ شیر خان رات ایک بجے فلم ختم ہونے کے بعد ہی آئے گا، روبی نے اندر سے کنڈی لگالی، دوپہر کے بچے ہوئے تھوڑے سے کباب نان کے ٹکڑے کے ساتھ کھائے اور چارپائی پر لیٹ گئی، اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔ مگر وہ بڑی مطمئن تھی اس خیال سے کہ وہ گناہ اور جرائم کی دلدل سے نکل آئی ہے اور شیر خان کے ساتھ عزت آبرو کی زندگی بسر کرے گی۔ باہر کی مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز آئی تو روبی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی، دوپٹہ سر پر اوڑھے اس نے بڑے ادب سے ساری اذان سنی، پھر باہر مٹی کے مٹکے کے پاس بیٹھ کر اس نے وضو کیا اور کوٹھری میں واپس آکر نماز پڑھنے لگی، نماز سے فارغ ہو کر اس نے اللہ میاں سے شیر خان کی سلامتی اور اپنی نئی زندگی کی کامیابی کی دعا مانگی اور کوٹھری کو اندر سے کنڈی لگا کر چارپائی پر لیٹ کر خدا کو یاد کرتے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگی، روبی کی پچھلی جرائم پیشہ زندگی نے اتنا ضرور سکھا دیا تھا کہ عورت کو اپنی عزت آبرو کے تحفظ سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہئے، روبی کو ہمیشہ سے اس حقیقت کا بھی احساس رہا تھا کہ اس کے پاس نہ کوئی سماجی مرتبہ ہے، سوسائٹی میں اس کا کوئی مقام بھی نہیں ہے، لے دے کر اس کے پاس ایک ہی شے ہے جو اس کی عزت و آبرو ہے، یہی اس کی سب سے انمول دولت ہے اور روبی نے ہر ماحول میں ہر قسم کے حالات میں اپنی جان پر کھیل کر بھی اپنی عزت آبرو کی حفاظت کی تھی، یہاں اس کے پاس اپنی انمول دولت کے تحفظ کے لئے کوئی اسلحہ نہیں تھا، صرف ایک پیاز کاٹنے والی چھری تھی، جو اس نے شیر خان کے چچا کے گھر سے اپنے ٹرنک میں رکھ لی تھی۔ یہی چھری اس وقت بھی روبی کے سرہانے کے نیچے پڑی تھی۔ جب وہ کوٹھری کے اندر چارپائی پر لیٹی سونے کی کوشش کر رہی تھی اور شیر خان کو یاد

کر رہی تھی۔

اس پر غنودگی سی طاری ہونے ہی لگی تھی کہ باہر سے کسی نے دروازے پر دستک دی‘ روبی جلدی سے اٹھی اور اس نے پوچھا کون ہے؟ باہر سے آواز آئی۔

"بھابی میں ہوں‘ عمردین .... شیر خان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے‘ تمہیں لینے آیا ہوں۔ اس نے تمہیں بلایا ہے۔"

روبی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی‘ وہ اٹھ کر دروازہ کھولنے لگی تو پھر اسے چھری کا خیال آگیا۔ اس نے سرہانے کے نیچے سے چھری نکال کر اپنے کپڑوں کے اندر چھپا لی اور دروازہ کھول دیا۔

"کیا ہوا شیر خان کو بھائی وہ خیریت سے ہے نا؟" روبی نے گھبرا کر پوچھا۔ عمردین بولا

"پیٹ میں درد اٹھا اور وہیں دہرا ہو کر بے ہوش ہو گیا منیجر صاحب نے اسی وقت اسے کار میں لٹایا اور ہسپتال پہنچا دیا اب وہ ہوش میں ہے‘ فکر کی کوئی بات نہیں بھابی‘ بس تم جلدی سے چلو‘ وہ تمہیں بار بار یاد کر رہا ہے۔"

روبی واقعی پریشان ہو گئی تھی‘ وہ اس وقت عمردین کے ساتھ چل پڑی‘ رات کے گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ کوٹھری کے باہر ایک ٹیکسی کھڑی تھی‘ عمردین کہنے لگا۔

"میں منیجر صاحب کی گاڑی میں آ تا مگر انہیں شیر کا اتنا خیال تھا کہ خود گاڑی میں بیٹھ کر چھاؤنی کی ایک دکان سے اس کے لئے ٹیکے لینے چلے گئے۔ میں ٹیکسی پکڑ کر آیا ہوں‘ تم گھبراؤ نہیں بھابی‘ اب شیر خان کی حالت بہتر ہے‘ پہلے تو ہم سب کو فکر پڑ گئی تھی کہ اللہ خیر کرے‘ آج اس کا نوکری کا پہلا دن ہے اور ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے‘ اللہ نے بڑا کرم کیا کہ اسے ہوش بھی آگیا اور طبیعت بھی سنبھل گئی۔" عمر اس قسم کی باتیں کرتے جا رہا تھا اور ٹیکسی شہر کے بارونق سڑک سے ایک طرف گھوم کر نسبتاً ویران سی سڑک پر آگئی تھی‘ روبی کے دل میں کچھ شک شبہ بھی کسی وقت سر اٹھا لیتا مگر شیر خان کی بیماری کا خیال اس پر غالب آجاتا‘ وہ شیر خان سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کا محبوب خاوند تھا اور وہ اس کے لئے اپنی جان بھی قربان کر سکتی تھی‘ ایک بار روبی نے عمر سے پوچھا بھی کہ اسپتال کتنی دور ہے ابھی؟ جس کے جواب میں عمر نے بڑی اپنائیت سے جواب دیا۔

"بس بھابی وہ سامنے درختوں کے پیچھے ہے۔" درختوں کے پیچھے روبی کو کسی اسپتال کی کوئی ہلکی سی روشنی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی‘ پھر بھی اس نے کوئی خیال نہ کیا‘ اسے عمردین پر بھروسا تھا اور شیر خان کی بیماری نے اسے پریشان بھی کر دیا تھا‘ ایک جگہ درختوں کے پاس ٹیکسی رک گئی‘ اچانک دو آدمی ہاتھوں میں پستول لئے سامنے گئے انہوں نے نقاب پہن رکھے تھے‘ تب عمردین بھی مکاری سے ہنسا اور روبی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"لڑکی! بہتر یہی ہے کہ بڑے آرام سے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو‘ ہم نہیں چاہتے کہ تمہارا نوجوان بدن یہاں خاک و خون میں تڑپ رہا ہو۔" روبی عمر کا منہ تکنے لگی‘ عمردین نے کہا۔

"زندگی چاہتی ہو تو خاموشی سے باہر نکل آؤ اور جیسے ہم کہیں ویسے ہی کرو۔" عمردین نے یہ چیلنج اس لڑکی کو دیا تھا جو اپنی عزت بچانے کے لئے اب تک نہ جانے کتنے بدکار آدمیوں کے پیٹ پھاڑ چکی تھی۔

آسمان پر چاند تو نہیں نکلا ہوا تھا مگر ستاروں کی دھندلی روشنی میں روبی کو سب کچھ نظر آرہا تھا۔ عمردین کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ ایک نقاب پوش نے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے نشانے کی زد میں لے رکھا تھا کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔ دوسرے نقاب پوش کے پستول کا رخ بھی روبی کی طرف تھا۔ روبی کے پاس صرف ایک پیاز چھیلنے والی چھوٹی چھری ہی تھی جسے اس نے گھر سے نکلتے وقت اپنے ساتھ رکھی تھی۔ یہ چھری اس کے بائیں جانب شلوار کے نیفے میں لگی ہوئی تھی جہاں اس کا ہاتھ ایک سیکنڈ سے بھی کم مدت میں پہنچ سکتا تھا۔ مگر وہ پاکستان میں کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتی تھی اس وقت وہ اس حقیقت کو بھی فراموش کر چکی تھی کہ اس کا مقابلہ پاکستان کے کسی شریف شہری سے نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں سے ہے جو جرائم پیشہ ہیں جن کا کام پاکستان کے شریف لوگوں کی زندگیوں میں زہر گھولنا اور ان کے امن و سکون کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ روبی کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی کے آثار نہیں تھے۔ اس نے بڑے نارمل اور پر سکون انداز میں عمردین سے کہا۔

"عمردین! میرے خاوند شیر خان نے تم پر بھروسہ کیا ہے میں تمہیں اپنا بزرگ اور بھائی سمجھتی ہوں یہ جو کچھ تم کر رہے ہو تمہیں زیب نہیں دیتا۔" اس پر عمردین نے روبی کو گالی دی اور تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"بڑی نیک پاک بنتی ہو میں سب جانتا ہوں۔ سیدھی طرح میرے ساتھ چل نہیں تو یہاں تیسری لاش تڑپ رہی ہو گی۔" روبی کو آج تک کسی نے ایسی گندی گالی نہیں دی تھی۔ مگر وہ مشتعل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ خون کا گھونٹ پی گئی ایک بار پھر اس نے عمردین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں بگڑا عمردین مجھے گھر واپس جانے دو میں شیر خان سے بلکہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ تم سے وعدہ کرتی ہوں۔"

مگر اس بدکردار جرائم پیشہ کو کیا خبر تھی کہ اس کے سامنے کون عورت کھڑی ہے وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زخمی شیرنی کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ عمردین نے روبی کو ایک اور گالی دی اور اپنے نقاب پوش ساتھی سے کہا۔

"پکڑ کر نیچے گراؤ اوئے اس کو...... منہ کیا دیکھ رہے ہو اس کا؟"

ایک نقاب پوش نے ٹیکسی ڈرائیور کو پستول کی زد میں لے رکھا تھا دوسرا نقاب پوش روبی کی طرف تیزی سے بڑھا کہ اسے بالوں سے پکڑ کر نیچے گرا دے اب روبی کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے ان میں سے کسی کو ہلاک کرنے سے گریز ہی کیا۔ وہ انہیں تھوڑا سا سبق سکھانا چاہتی۔ جونہی نقاب پوش پستول لئے روبی کے قریب آیا روبی کا ہاتھ شلوار کے نیفے سے چھری نکال چکا تھا۔ پھر ایک بجلی سی چمک کر نقاب پوش بدمعاش پر گری اور دوسرے لمحے اس کا پستول روبی کے ہاتھ میں تھا اور اس کی گردن روبی کے بازو کے شکنجے میں تھی۔ روبی نے اوپر تلے دو فائر کر دیئے۔ ایک گولی ٹیکسی ڈرائیور کے پاس کھڑے نقاب پوش کے بازو پر لگی اور دوسری عمردین کی ران کو چیرتی ہوئی نکل گئی وہ لوگ روبی سے اس قسم کے دلیرانہ جوابی حملے کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ انہیں گولیاں بھی لگ چکی تھیں۔ روبی نے جان بوجھ کر ان کے بازو اور ٹانگ پر فائر کیا تھا۔ وہ انکی کھوپڑیاں بھی اڑا سکتی تھی لیکن وہ ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دونوں زخمی ہو کر جھک گئے تھے۔ روبی نے لپک کر ان کے پستول چھین لئے تھے۔ دونوں نقاب پوش اور عمردین بے بسی مگر شدید غصے کے عالم میں زمین پر بیٹھے تھے۔ روبی کے دونوں ہاتھوں میں بھرے ہوئے پستول تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ روبی دوڑ کر ٹیکسی ڈرائیور کے سر پر پہنچ گئی۔

"میرے بھائی تمہیں مجھے اس جگہ پہنچانا ہو گا جہاں سے تم مجھے لے کر آئے تھے۔" روبی نے عمردین کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"عمردین! اگر میں چاہتی تو جو گولی تمہاری ٹانگ میں لگی ہے وہ دل کے پار بھی ہو سکتی

itsurdu.blogspot.com

تھی مگر تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ایک اور موقع دینا چاہتی ہوں۔ اللہ کے حضور اپنی مجرمانہ زندگی سے توبہ کرو اور شریف لوگوں جیسی زندگی بسر کرو میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس واقعے کے بارے میں اپنے خاوند شیر خان یا کسی دوسرے کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔" یہ کہہ کر روبی ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور سے کہا

"جتنی جلدی ہو سکے مجھے اس جگہ لے جاؤ جہاں سے لائے تھے۔" ٹیکسی ڈرائیور خوف زدہ تھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور ٹیکسی کو ریورس کر کے واپس روانہ ہو گیا۔ روبی نے چلتی گاڑی میں سے دونوں پستول عمر دین کی طرف اچھال دیئے وہ چاہتی تھی کہ شیر خان کے گھر واپس آنے سے پہلے پہلے وہ کوٹھری میں پہنچ جائے۔ سینما کا آخری شو بارہ بجے چھوٹتا تھا اور شیر خان ساڑھے بارہ بجے واپس آجاتا تھا۔ ٹیکسی نے بڑی جلدی اسے کوٹھری کے باہر پہنچا دیا۔ روبی کے پاس کوئی پیسہ نہیں تھا اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"میرے بھائی دن کے وقت آکر کرایہ لے جانا وہ سامنے والی کوٹھری ہماری ہے اور ہاں اس واقعے کا ذکر تم بھی کسی سے نہ کرنا۔" ڈرائیور کے دل میں روبی کا احترام بھی پیدا ہو گیا تھا اور اس کی بہادری اور دلیری کا زبردست اثر بھی ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بہن جی! یوں سمجھ لیں کہ کرایہ میں نے لے لیا ہے" یہ کہا اور وہاں سے ٹیکسی بھگا کر لے گیا۔

کوٹھری سنسان پڑی تھی۔ لوگ اپنی اپنی کوٹھریوں میں گہری نیند سو رہے تھے۔ روبی کو یہی فکر تھی کہ کہیں شیر خان سینما سے واپس نہ آگیا ہو یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی کہ وہ ابھی تک سینما سے نہیں لوٹا تھا۔ کوٹھری کا دروازہ بند کر کے روبی نے کنڈی لگا دی اور لیمپ روشن کر کے چارپائی پر کمبل اوپر کر کے لیٹ گئی۔ سینما کا آخری شو ختم ہونے کے بعد رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب شیر خان آیا اس نے مخصوص انداز میں دروازہ کھٹکھٹایا۔ روبی جاگ رہی تھی مگر اس نے یہی ظاہر کیا کہ جیسے گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ شیر خان نے معمول کے مطابق حال احوال پوچھا اور کھانا کھا کر سو گیا۔ روبی نے لیمپ گل کر دیا وہ اپنی بات پر قائم رہی۔ اس نے اپنے ساتھ گزرنے والی سنگین واردات کے بارے میں شیر خان کو کچھ نہ بتایا۔ دوسری رات شیر خان رات کو آیا تو کھانا

کھاتے وقت روبی سے کہنے لگا۔

"عمر دین کی ٹانگ حادثے میں زخمی ہو گئی ہے۔ بے چارا تھوڑی دیر کے لئے سینما آیا تھا لکڑی کے سہارے چل رہا تھا۔"

روبی کو تسلی ہوئی کہ عمر دین نے بھی اس واردات کی کسی کو خبر نہیں ہونے دی۔ ویسے وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کیونکہ وہ حملہ آور تھا۔ مگر چونکہ پستول کی گولی لگنے سے زخمی ہو گیا تھا اس اعتبار سے وہ روبی کے خلاف تھانے میں رپٹ درج کروا سکتا تھا۔ پولیس میں اس کا اثر و رسوخ بھی بہت تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا اور روبی کو اس کی یہ بات اچھی لگی تھی کہ عمر دین شریفانہ زندگی کی طرف واپس آرہا ہے۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ پاکستان میں امن و امان بحال رہے اور جرائم کو ختم کرنے میں ہر پاکستانی اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔ اور ایک ہفتے کے بعد عمر دین شیر خان کے گھر آیا اس وقت شیر خان سینما گھر میں ڈیوٹی پر تھا۔ روبی نے دروازے پر دستک کی آواز سن کر پوچھا۔ "کون ہے؟" باہر سے عمر دین نے بڑی عاجزانہ آواز میں کہا۔

"روبی بہن میں ہوں عمر دین۔ تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔" یہ دیکھ کر عمر دین اپنی مجرمانہ زندگی سے توبہ کر کے راہ راست پر آگیا ہے۔ روبی کو بڑی خوشی ہوئی اس نے دروازہ کھول دیا۔ عمر دین لکڑی کے سہارے چل کر کوٹھری میں آیا اور چارپائی پر بیٹھتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر رقت آمیز لہجے میں بولا۔

"بہن! مجھے معاف کر دو۔ تم نے معاف نہ کیا تو حشر کے دن خدا بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔ میں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا وہ میری پچھلی گناہ آلود زندگی کا حصہ تھا۔ اب میں نے گناہوں سے توبہ کر لی ہے اور عہد کر لیا ہے کہ ساری زندگی شریف آدمیوں کی طرح گزاروں گا میں نے سارے برے لوگوں سے دوستی ختم کر دی ہے۔ اب میں نماز بھی پڑھنے لگا ہوں مگر جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گی میری بہن مجھے سکون نصیب نہیں ہو گا۔"

روبی کا دل ایک عجیب پرسکون کیفیت میں ڈوب گیا۔ اس نے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی! میں خود گناہگار ہوں کسی کو معاف کرنے کے لائق نہیں ہوں۔" عمر

دین بچوں کی طرح رونے لگا اور روبی کے قدموں پر گر گیا۔ روبی جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔

"یہ کیا کرتے ہو بھائی!" عمردین نے سسکی بھر کہا۔

"بہن! میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی تم نے مجھے معاف نہ کیا تو قیامت کے دن میری رسوائی ہو گی۔ اللہ بھی شاید مجھے معاف نہیں کرے گا۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں ایک بار اپنی زبان سے کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔" روبی نے جب دیکھا کہ عمر دین پر رقت طاری ہے تو اس نے کہہ دیا۔

"ہاں بھائی میں خدا کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ میں نے تمہیں معاف کیا۔ مجھے تم سے کوئی گلہ شکایت نہیں ہے۔" عمردین جلدی سے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر چھت کی طرف چہرہ اٹھا کر بولا۔

"میرے پروردگار! میری بہن نے مجھے معاف کر دیا اب تو بھی میرے گناہ بخش دے۔ تو بڑا رحیم و کریم ہے۔" اس کے بعد عمردین نے روبی کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے پولیس میں رپورٹ نہیں کی تھی۔ روبی بولی۔

"بھائی عمردین! میں نے تو تمہیں اسی وقت کہہ دیا تھا کہ میں چاہتی ہوں کہ تم برائی چھوڑ کر نیکی کا راستہ اختیار کرو اس واسطے میں کسی سے اس واردات کا ذکر نہیں کروں گی۔ میں نے شیر خان کو بھی کچھ نہیں بتایا بھائی! پاکستان اسلامی ملک ہے اس ملک میں ہمیں اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر نیک پاک زندگی بسر کرنے چاہئے۔ تاکہ ہم دنیا میں اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں۔"

عمردین فرط عقیدت سے بار بار سر ہلاتا اور کہتا۔

"سبحان اللہ! میری بہن کے خیالات کتنے اچھے ہیں۔ بہن! میں اب کبھی کوئی برا کام نہیں کروں گا۔ میں نے سب برے دوستوں سے ناتا توڑ لیا ہے۔ میری بہن! اگر کبھی تمہیں اپنے بھائی کی مدد کی ضرورت محسوس ہوئی تو مجھے صرف اطلاع کر دینا۔ تم دیکھنا کہ تمہارا یہ بھائی، عمردین تم پر اپنی جان بھی نثار کر دے گا۔" یہ کہا اور عمردین پرنے کے پلو سے آنسو پونچھتا باہر نکل گیا۔

روبی کا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ اس کی پہلی کامیابی ہے۔ اس کے

اچھے سلوک نے ایک برے شخص کو سیدھے راستے پر ڈال دیا ہے۔ یہ بہت بڑی بات تھی روبی نے اللہ کے حضور سجدہ شکر ادا کیا اور پاکستان کی سلامتی کے لئے دل سے دعائیں مانگنے لگی۔

ایک روز عمردین مٹھائی کا ڈبہ لے کر آ گیا۔ وہ دن کے گیارہ بجے آیا جب شیر خان بھی گھر پر تھا۔ علیک سلیک کے بعد چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شیر خان نے پوچھا۔

"عمر! یہ مٹھائی کا ڈبہ کس خوشی میں لائے ہو۔" عمردین جذباتی لہجے میں بولا۔

"شیر خان! تم جانتے ہی ہو کہ میں نے برے کاموں سے توبہ کر لی ہے۔" شیر خان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے اور مجھے اس کی بڑی خوشی ہے۔" روبی زیر لب مسکراتی ہوئی کیتلی میں چائے کے لئے چولہے پر پانی رکھ رہی تھی۔ عمردین کہنے لگا۔

"لیکن شاید یہ تمہیں معلوم نہیں ہو گا کہ مجھے سیدھی راہ دکھانے میں سب سے زیادہ ہاتھ تمہاری بیوی اور میری چھوٹی بہن روبی کا ہے۔" شیر خان نے روبی کی طرف دیکھا۔ عمر دین بولا۔

"ہاں شیرے! میں نے تمہیں کبھی بتایا نہیں ایک روز میں تمہیں سینما منیجر کا کوئی پیغام دینے تمہارے گھر آیا تو روبی بہن نے میری صدری کی جیب میں رکھا ہوا پستول دیکھ لیا پھر اس نیک بہن نے کچھ ایسے انداز میں مجرموں والی زندگی چھوڑ کر نیک زندگی اپنانے کے بارے میں سمجھایا کہ میری کایا ہی پلٹ گئی۔ میری بہن کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے ایسی تاثیر پیدا کر دی تھی کہ میں نے اسی وقت گناہوں سے توبہ کر لی۔ تب سے میں نے اپنے سارے برے ساتھیوں کی صحبت کو ترک کر دیا ہے اور تمہیں معلوم ہی ہے کہ اب میں کسی جرائم پیشہ شخص سے نہیں ملتا۔ اب میں تمہارے سامنے روبی کو اپنی چھوٹی بہن بنانے کا اعلان کرتا ہوں اور یہ مٹھائی اسی خوشی کے موقع کے لئے لایا ہوں۔ شیر خان! تم بڑے خوش قسمت ہو جو تمہیں روبی جیسی بیوی ملی ہے۔ میں نے ایسی بلند کردار والی عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔" شیر خان مسکرانے لگا۔

روبی کی آنکھوں میں خدا کی محبت سے آنسو آ گئے۔ اس کے دل پر رقت طاری ہو گئی

شیر خان نے صدری کی جیب میں سے ایک لفافہ نکال کر کھولا۔ اس میں نائیلون کا ایک سبز رنگ کا دوپٹہ تھا۔ یہ دوپٹہ اس نے اٹھ کر روبی کے سر پر اوڑھا دیا اور بولا۔

"میری بہن! اپنے بڑے بھائی کی طرف سے یہ حقیر تحفہ قبول کرو۔ آج سے تم میری سگی بہن ہو۔ تمہاری عزت میری عزت ہے۔ تمہاری غیرت میری غیرت ہے اور اگر ایسا وقت آیا تو تمہارا بھائی تمہاری عزت کے واسطے اپنی جان بھی تم پر قربان کر دے گا۔" شیر خان کی کوٹھری میں ایک دم سے بڑی جذباتی فضا پیدا ہو گئی۔ عمر دین نے مٹھائی کا ڈبہ کھول کر روبی کی طرف بڑھایا۔

"میری بہن! تھوڑی مٹھائی لے کر اپنے بھائی کی عزت بڑھاؤ۔" تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد عمر دین چلنے کے لئے اٹھا۔ شیر خان سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور روبی کے سر پر شفقت بھرے انداز میں ہاتھ رکھا اور خدا حافظ بہن کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شیر خان نے روبی سے کہا۔

"یہ تو تم نے کمال کر دیا۔ میں بھی کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ عمر دین کافی بدل گیا ہے وہ دن میں دو ایک بار میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ کبھی نماز کا وقت پوچھتا۔ کبھی قبر کے عذاب اور آخرت کی باتیں کرنے لگتا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کارنامہ تمہارا ہے۔" روبی نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔

"میں کس قابل ہوں شیرے! یہ تو سب اللہ کا کرم ہوا ہے عمر دین پر اللہ نے میری زبان میں تاثیر عطا کی اور پھر عمر دین کا دل پلٹ دیا۔" پھر وہ شیر خان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"شیرے! تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہماری زندگی گناہوں میں گزری ہے۔ نہ جانے ہمارے ہاتھوں سے کتنے آدمی قتل ہوئے ہیں۔" شیر خان بولا "مگر وہ سب کے سب قاتل تھے۔ وہ بھی کئی خون کر چکے تھے۔" روبی نے کہا "ٹھیک ہے تم ٹھیک کہتے ہو لیکن شیرے یہ کوئی اچھی زندگی نہیں تھی۔ مجھے تو اس وقت بھی یہ احساس رہتا تھا کہ میں گناہ کی دلدل میں پھنس گئی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم پاکستان آ گئے اور میں اس دلدل سے نکل آئی۔ خدا نے ہمیں اپنے آزاد اسلامی ملک پاکستان کا شریف شہری بنا دیا ہے۔ ہم پوری آزادی اور

اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہئے شیرے؟ کتنی دولت ہم نے نہیں دیکھی؟ کروڑوں کے ہیرے جواہرات اور ہیروئن کے تھیلے ہمارے ہاتھوں سے اسمگل ہوئے۔ برما اور سیلون کے جنگلوں میں ہم عیش کی زندگی بسر کرتے تھے مگر یہ زندگی گناہ کی زندگی تھی۔ موت کی زندگی تھی چنانچہ جب ہم وہاں سے جان بچا کر بھاگے تو کوئی دولت ہمارے کام نہ آئی۔ وہ دولت ہماری جان کی دشمن بن گئی تھی۔ ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ اس وقت آزاد مسلمان ملک میں عزت آبرو کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رزق حلال کما رہے ہیں۔" شیر خان بولا "اس میں کوئی شک نہیں روبی۔ ہم گناہوں کی دلدل سے نکل آئے ہیں۔ ورنہ دوسرے جرائم پیشہ لوگوں اور اسمگلروں کی طرح آج ہماری ہڈیاں بھی برما یا سیلون کے کسی جنگل میں یا کسی دریا کی تہہ میں بے گور و کفن پڑی ہوتیں۔ ویسے یہ تم نے بڑے ثواب کا کام کیا ہے جو عمر دین ایسے عادی مجرم کو سیدھی راہ پر لے آئی ہو۔" روبی نے گہرا سانس بھر کر کہا۔

"میری کیا بساط ہے شیرے! میں تو گناہ گار عورت ہوں۔ اللہ میاں کی توفیق نہ ہوتی تو میری زبان میں کبھی تاثیر پیدا نہ ہوتی۔ خدا میرے گناہ معاف کرے۔"

اس روز سینما ہاؤس میں میٹنی شو تھا۔ شیر خان کھانا کھانے کے بعد ایک بجے سینما ہاؤس چل دیا۔ روبی نے برتن وغیرہ صاف کر کے اپنی جگہ پر رکھے۔ بستر ٹھیک کئے کوٹھری اور صحن میں جھاڑو دے کر منہ ہاتھ دھویا۔ پھر سامنے والے کوارٹر سے سکینہ کو آواز دے کر بلایا اور دونوں تخت پوش پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ روبی نے اپنے حسن سلوک اور اچھے اخلاق سے کوٹھری والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ ہر ایک سے اس کا حال پوچھتی ان کے بچوں کو پیار کرتی۔ گھریلو مسائل میں ان کو مشورے دیتی۔ ان میں سے کسی کو بھی روبی کی گزشتہ زندگی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ روبی نے بھی اپنی پرانی جرائم پیشہ زندگی کا باب بند کر دیا تھا وہ بڑی خوش تھی کہ غریب لیکن مخلص لوگوں میں شریفانہ زندگی بسر کر رہی ہے۔

عمر دین بڑے بھائی کی حیثیت سے ہفتے میں ایک آدھ چکر ضرور لگاتا۔ وہ خاص طور پر اس وقت آتا جب شیر خان گھر پر موجود ہوتا تھا۔ عمر دین کبھی خالی ہاتھ نہ آتا۔ کبھی تھوڑی

مٹھائی اور کبھی پھل فروٹ لے آتا۔ روبی کی خیر خیریت معلوم کرتا۔ تھوڑی دیر بیٹھتا اور پھر چل دیتا۔ اس طرح وقت گزرتا چلا گیا سردیوں کا موسم نکل گیا تھا۔ فروری مارچ کے خوشگوار بہار کے دن تھے کہ ایک روز عمردین نے شیر خان سے کہا

"آؤ یار کنٹین میں چل کر چائے پیتے ہیں۔" شام کا شو شروع ہو چکا تھا۔ شیر خان کو گیٹ پر کھڑے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر سنیما کی کنٹین بھی قریب ہی ایک کمرے میں بنی ہوئی تھی۔ دونوں چائے منگوا کر پینے لگے۔ عمردین نے شیر نمان کو سگریٹ پیش کیا اور اسے لائٹر سے سلگاتے ہوئے بولا۔

"شیر خان! بھائی بن کر ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں کیا تم اس کی اجازت دیتے ہو؟" شیر خان نے سگریٹ کا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"عمرا یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم ہمارے ہی گھر کے آدمی ہو۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔" عمردین شیر خان کی طرف ذرا سا جھک گیا کہنے لگا۔

"تمہاری شادی کو دو سال تو ضرور ہو گئے ہیں۔ مگر تمہارے ہاں ابھی تک کوئی اولاد کیوں نہیں ہوئی، تم ابھی نوجوان ہو اس عمر میں اولاد پیدا ہو جائے تو وہ تمہاری جوانی میں ہی تمہارا بازو بن جائے گی۔" شیر خان نے اپنے چمکیلے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"اولاد تو اللہ کی طرف سے دی جاتی ہے۔ ویسے میں نے روبی کا ایک دائی سے معائنہ کرایا تھا اس نے کچھ عجیب سی بات بتائی کہنے لگی اولاد دیر سے ہو گی جو اللہ کو منظور، یار۔" عمردین نے کہا۔

"نہیں شیرے۔ اولاد بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اولاد کے ساتھ ہی تو مرد کا نام چلتا ہے۔ خاندان کا نام چلتا ہے اور اولاد اسی عمر میں ہونی چاہئے دیر سے ہوئی تو تم بوڑھے ہو چکے ہو گے اور اولاد ابھی چوتھی جماعت میں ہی ہو گی۔" شیر خان بولا۔

"لیکن اس میں میرا کیا عمل دخل ہے۔ میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ باقی جب اللہ کی مرضی ہوئی گھر میں بچہ بھی آجائے گا۔" عمردین خاموشی سے چائے پینے لگا۔ پھر پیالی میز پر رکھی اور بڑی اپنائیت کے انداز میں کہنے لگا۔

"شیر خان! سب کام اللہ کی مرضی سے ہی ہوتے ہیں مگر اس کے لئے وہ وسیلہ بھی پیدا

کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی مرضی سے جو کام بھی ہوتا ہے اس میں کسی نہ کسی کا وسیلہ ضرور ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" شیر خان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ عمردین کہنے لگا۔

"میرے بھائی اس وقت ایک وسیلہ موجود ہے اگر تم پسند کرو تو اللہ کی مرضی اور اس شخص کے وسیلے سے تمہارے گھر میں بہار آسکتی ہے۔" شیر خان نے عمردین کی طرف دیکھا پوچھا۔

"وہ کیا وسیلہ ہے؟" عمردین بولا۔

"بس یوں سمجھ لو شیرے کہ ایک بیٹا تمہارے گھر میں آگیا ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ تمہارے سنیما گھر میں آنے سے پہلے کی بات ہے کہ میں گجرات شہر کے ایک ہوٹل میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ ایک اونچا لمبا گھنگھریالے سیاہ بالوں والا آدمی ہوٹل میں داخل ہوا اور کونے والی خالی کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ وہ بڑا گرانڈیل قسم کا آدمی تھا رنگ گہرا سانولا تھا اور آنکھیں لال انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا ہوٹل میں کافی گاہک بیٹھے کھانا وغیرہ کھا رہے تھے اور چائے پی رہے تھے۔ سب لوگ اس پراسرار آدمی کی طرف دیکھنے لگے۔ کیونکہ اس کی آنکھیں بڑی سرخ تھیں۔ اب اس آدمی نے کیا کیا کہ بیٹھے بیٹھے ڈکار لینی شروع کر دی۔ ڈکار اتنی زبردست تھی کہ لوگوں کو سخت ناگوار گزری۔ ایک آدمی نے ہمت کر کے اسے کہہ ہی دیا کہ جناب! ہوٹل میں بیٹھنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اس شخص نے گھور کر اعتراض کرنے والے کی طرف دیکھا اور جیسے بڑے جلال میں آکر کہا "اچھا یہ بات ہے تو میں اپنے ڈکار تمہیں دیتا ہوں۔ لو بھائی شیر خان میرے دیکھتے دیکھتے اس اعتراض کرنے والے کو ڈکار شروع ہو گئے اس کے بعد اسے ہچکی لگ گئی اسے بہتیرا پانی وغیرہ پلایا گیا مگر ڈکار اور ہچکی اسی طرح جاری رہے۔ لوگ اسے لے کر کسی ڈاکٹر حکیم کی طرف دوڑ پڑے۔ لوگوں پر اس آدمی کا بڑا رعب پڑ گیا۔ میں بھی بڑا متاثر ہوا میں فوراً اس کے پاس جا کر ادب سے بیٹھ گیا اور بڑے احترام سے اس آدمی کے گھٹنے چھوئے اور کہا حضور! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں بندہ حاضر ہے۔ آپ تو بڑے کرنی والے ہیں میرے حق میں دعا کیجئے وہ آدمی میری اس عاجزی پر

بت خوش ہوا کہنے لگا میرے ساتھ آؤ وہ ہوٹل سے نکل کر مجھے ریلوے لائن کے پاس ایک کوارٹر میں لے آیا وہ یہاں ٹھہرا ہوا تھا وہاں اس کی بڑی زبردست آؤ بھگت ہو رہی تھی وہ کمرے میں دری پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گیا سب کو اس نے باہر نکال دیا پھر مجھ سے پوچھا تمہارے پاس کوئی کاغذ ہے؟ میں نے جیب میں سے پاکٹ بک نکال کر کہا حضور میرے پاس یہ پاکٹ بک ہی ہے اس میں سے جتنے چاہیں کاغذ لے لیجئے اس شخص نے پاکٹ بک میں سے کچھ سفید کاغذ پھاڑے پاکٹ بک مجھے واپس کی اور سفید کاغذوں کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں آہستہ آہستہ ملنے لگا۔ تھوری دیر کے بعد اس نے کاغذ میری طرف اچھال دیے اور جلالی آواز میں بولا۔

"تم نے ہمارا ادب کیا تھا ہم تم سے خوش ہوئے ابھی یہ لے جاؤ باقی پھر کبھی دیکھا جائے گا۔" میں نے گول گچھا بنے سفید کاغذوں کو کھول کر الگ الگ کیا تو یہ دیکھ کر میرے ہوش غائب ہوگئے کہ سفید کاغذ ہزار ہزار روپے کے نوٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے اس زمانے میں ابھی نیا نیا ہزار کا نوٹ چلا تھا یہ کل آٹھ ہزار روپے تھے یعنی ہزار ہزار کے آٹھ نوٹ .... وہ آدمی کہنے لگا یہ جعلی نوٹ نہیں ہیں اصلی ہیں اس وقت پاکستان اسٹیٹ بنک کے خاص کمرے میں جو لکڑی کے بڑے صندوق نوٹوں سے بھرے پڑے ہیں ان میں سے ہزار ہزار کے آٹھ نوٹ اس وقت تمہارے ہاتھ میں آچکے ہیں اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا پھر اس نے گھر والوں کو اندر آنے کی اجازت دے دی باداموں والی سبز چائے کا دور شروع ہو گیا لوگ آکر اپنی غرض بیان کرتے وہ شخص انہیں کچھ نہ کچھ ہدایت کرتا کسی کو جھڑک کر باہر نکال دیتا کہ یہاں کیوں آئے ہو کسی کو آتے ہی گالیاں دینے لگتا' وہ بے چارہ شرمسار ہو کر واپس پلٹ جاتا۔

اس دوران دو عورتیں بھی آئیں جن کو ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ ان کے ہاں کبھی بچہ پیدا نہیں ہو گا۔ اس شخص نے جس کا نام تو مجھے معلوم نہیں تھا مگر جسے سب پیر شاہ پیر شاہ کہہ کر پکارتے تھے' ان عورتوں کی طرف ایک نظر دیکھا اور جلالی آواز میں کہا۔ جاؤ۔ اللہ کے حکم سے اگلے سال تمہارے ہاں ایک ایک لڑکا پیدا ہو گا جو خاندان کا نام روشن کرے گا۔ ایک لڑکا آیا جو گونگا تھا۔ پیر شاہ نے اس کی زبان پر انگلی پھیری اور دوسرے لمحے

وہ گونگا لڑکا باتیں کرنے لگا۔ ایک آدمی آیا اس کے گھٹنے جڑ گئے تھے۔ وہ گھسٹ گھسٹ کر چلتا تھا۔ پیر شاہ نے اس کے گھٹنوں پر باری باری ہاتھ پھیرا اور وہ آدمی میری آنکھوں کے سامنے اٹھ کر چہل قدمی کرنے لگا۔ میں نے تو پیر شاہ کے پاؤں دبانے شروع کر دیے اور اپنے گھر لاہور آنے کی دعوت دی۔ مگر اس نے کہا کہ ہم فقیر لوگوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کل ہم کہاں ہوں گے۔ لیکن تم نے ہمارا ادب کیا ہے ہماری خدمت کی ہے ہم جب بھی پنجاب آئے تمہیں ضرور خبر کردیں گے اور تمہاری ہر خواہش اللہ کے حکم سے پوری کریں گے۔ میں بڑا خوش ہوا۔ رات کو دس بجے پیر شاہ یہ کہہ کر کوارٹر سے باہر نکلے کہ ابھی آتا ہوں ایک جن صاحب آئے ہیں ان سے ملاقات کر لوں۔ وہ کوارٹر سے نکل کر کیکر کے درختوں کی طرف چلے گئے مگر اس کے بعد واپس نہ آئے۔ وہاں گھر والوں نے کہا کہ پیر شاہ جی ایسے ہی غائب ہو جایا کرتے ہیں۔

لو بھائی شیر خان میں دل میں پیر شاہ کی محبت اور عقیدت لئے واپس آگیا۔ ان کے دیئے ہوئے ہزار روپے کے نوٹ بھی تڑوا لئے یہ بڑی کافی رقم تھی مگر میری بدقسمتی کہ میں ساری کی ساری رقم جوئے میں ہار گیا۔

شیر خان بڑے غور اور دلچسپی سے عمردین کی داستان سن رہا تھا اور اس نے پوچھا۔

"کیا ان عورتوں کے ہاں؟ اگلے سال لڑکا پیدا ہوا؟" عمردین بولا۔

"میں نے دوسرے سال اسی جگہ جا کر ان لوگوں سے دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ اللہ تعالٰی نے دونوں عورتوں کو دو چاند سے بیٹے عطا کئے ہیں۔ لیکن پیر شاہ دوبارہ وہاں نہیں آئے تھے۔"

اتنی کہانی سنانے کے بعد عمردین خاموش ہوگیا۔ اس کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بہت بڑی خوش خبری کو چھپا رہا ہے۔ شیر خان نے سادہ دل اور عام مسلمان نوجوان ایسے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

"کیا پیر شاہ سے پھر کبھی ملاقات ہوئی؟" اس پر عمردین نے شیر خان کا بڑے زور سے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور بولا۔

"ہاں شیر خان آج ہی مجھے پیر شاہ کا پیغام ملا ہے کہ مجھے آکر ملو۔" شیر خان نے کہا۔

"بھائی عمردین ان سے میری بھی ملاقات کرا دو۔"

عمردین نے اپنے ماتھے پر ہلکا.... ہاتھ مار کر کہا۔

"میرے بھائی یہ ساری کہانی میں نے کس لئے بیان کی ہے؟" پھر بڑی رازداری سے کہنے لگا۔" میں آج ہی پیر شاہ سے ملنے جا رہا ہوں میں جاتے ہی ان کے پاؤں پڑ جاؤں گا اور گڑگڑا کر تمہارے ہاں لڑکے کی ولادت کے واسطے عرض کروں گا۔ پیر شاہ میری بات کبھی نہیں ٹالتے اور ان کا کہا اکسیر ہوتا ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ پیر شاہ کے وسیلے سے اللہ میاں میری چھوٹی بہن کی جھولی ضرور بھر دے گا اور انشاء اللہ لڑکا ہی ہو گا۔"

شیر خان سیدھا سادا مسلمان نوجوان تھا۔ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا بڑا خوش ہو گیا کہنے لگا۔

"یار جاتے ہی پیر شاہ سے میری بات کرنا اگر انہوں نے بلایا تو ہم دونوں ان کی خدمت میں خود حاضر ہو جائیں گے۔"

عمردین نے شیر خان کے کندھے کو ہاتھ سے دبا کر کہا۔

"یہ میری بہن کی ازدواجی زندگی کا معاملہ ہے اس کی گھریلو خوشیوں کا معاملہ ہے تم فکر نہ کرو۔ میں دوپہر کے بعد جا رہا ہوں۔ ابھی میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ پیر شاہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آدمی کو خاص طور پر یہ کہہ کر بھیجا تھا' کہ ان کے ٹھکانے کا کسی کو علم نہ ہو۔ بڑے جلالی پیر ہیں یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے میرے پاس خود اپنا آدمی بھیج کر بلایا ہے۔"

"ہاں یار۔" شیر خان! اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ رات کو شو ختم ہونے کے بعد شیر خان نے گھر آ کر روبی سے بات کی تو اس نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ روبی بھی ایک عام کم پڑھی لکھی نوجوان لڑکی تھی مگر وہ حقیقت پسند واقع ہوئی تھی کہنے لگی۔

"اولاد تو اللہ تعالیٰ کی جب مرضی ہو گی پیدا ہو جائے گی۔" شیر خان نے روٹی کھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں روبی! مگر اس کے لئے خدا وسیلہ بھی پیدا کر دیتا ہے۔" روٹی کھانے کے بعد اس نے روبی کو بڑے پیار سے کہا۔

"روبی میں بھی چاہتا ہوں کہ ہمارے گھر میں بھی معصوم بچے کی قلقاریوں کی آواز

آئے' جانتی ہو اس عمر میں اولاد ہو گئی تو وہ ہماری جوانی میں ہی ہمارے برابر کی ہو جائے گی اور ہماری دوست بنے گی۔" روبی نے کوئی جواب نہ دیا چارپائی پر منہ دیوار کی طرف کر کے لیٹ گئی۔

دو دن عمردین سنیما ہاؤس نہ آیا۔ اس نے چھٹی لے لی تھی۔ تیسرے دن شو شروع ہونے سے پہلے آگیا۔ شیر خان کے گلے میں بازو ڈال کر اسے کنٹین میں لے آیا۔ وہ بڑا خوش دکھائی دے رہا تھا۔ شیر خان نے پوچھا پیر شاہ سے ملاقات ہوئی؟" عمردین بولا۔

"یار شیرے تم اور ہماری بہن روبی خدا کی قسم دونوں ہی بڑے خوش قسمت ہو۔" شیر خان جلدی سے بولا۔

"یار جلدی بتاؤ۔ کیا بات ہوئی ان سے؟" عمردین نے دو سگریٹ سلگائے ایک اپنے لئے اور ایک شیر خان کے لئے پھر ایک گہرا کش لگایا اور شیر خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

"شیرے! پیر شاہ نے ہماری بہن کو بلایا ہے تمہاری قسمت کھل گئی ہے شیرے بھائی۔" شیر خان نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"یار ساری بات سناؤ۔ وہاں کیا بات ہوئی؟" عمردین بولا۔

"میں پیر شاہ کے حضور میں حاضر ہوتے ہی ان کے قدموں پر گر پڑا۔ جاتے ہی بڑی عاجزی سے تمہاری بات عرض کر دی اور ان کے پاؤں پکڑ کر کہا۔ حضور میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔ یہ میری میرے بھائی اور میری بہن کی زندگی موت کا معاملہ ہے۔ پہلے تو پیر شاہ نے اپنے پاؤں پیچھے کر لئے اور غصے میں بولے۔ آتے ہی دوسروں کی بات شروع کر دی۔ ہم نے تمہیں اس لئے نہیں بلایا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ان کے پاؤں پکڑ لئے اور تمہاری اولاد کے واسطے فریاد کی۔ پیر شاہ چونکہ مجھ سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اس لئے کچھ نرم پڑ گئے۔ ایک دم جلال میں آگئے۔ ایک بازو اوپر اٹھایا اور گونج دار آواز میں کہا ،لڑکا ہو گا۔ لڑکا ہو گا جاؤ اسے میرے سامنے لاؤ۔ یہی اللہ کی مرضی ہے۔ مجھے کچھ پڑھ کر عمل کرنا ہو گا۔ جاؤ دیر نہ کرو۔ وقت نکل جائے گا وقت بڑا تنگ ہے تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ کیا کروں تمہاری بات نہیں ٹال سکتا ...... میں تو اسی وقت وہاں سے اٹھ کر دوڑا۔ دروازے

سے نکل ہی رہا تھا کہ پیر شاہ کی آواز آئی۔ کہاں جا رہے ہو؟ ہمارے پاس آئے ہو تو ہم سے باتیں کرو۔ کچھ اپنے لئے بھی لیتے جاؤ۔ میں وہیں رک گیا پیر شاہ نے کہا کہ عمردین ابھی رک جاؤ ہم نے تمہارے بھائی اور تمہاری بہن کے واسطے کچھ مہلت لے لی ہے۔ ایک دن بعد واپس جانا۔ چنانچہ میں دو دن پیر شاہ کی خدمت میں حاضر رہا۔ اس بار وہ دریا کنارے ایک ٹیلے کے پاس امرود کے اجڑے ہوئے باغ میں ٹھہرے ہوئے ہیں وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ان کا میزبان بھی ان کی اجازت کے بغیر وہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

اس کے بعد عمردین نے واسکٹ کی جیب سے اپنی پاکٹ بک نکال کر کھولی۔ اس میں ہزار روپے کا ایک نوٹ تہہ کر کے رکھا تھا۔ وہ نوٹ شیر خان کو دکھا کر کہنے لگا۔ پیر شاہ نے میرے چلنے سے پہلے اپنے قریب پڑا ہوا ایک ردی کاغذ اٹھا کر ہاتھوں میں مسلا اور اس کا ہزار روپے کا نوٹ بنا کر مجھے دے دیا۔ کہنے لگے یہ تمہارے اور تمہارے بہن کے آنے جانے کے خرچ کے لئے ہے۔ یہ تم رکھ لو شیر خان۔" شیر خان نے ہاتھوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں عمردین۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

عمردین نے زبردستی نوٹ شیر خان کی جیب میں ٹھونس دیا۔

"یار یہ پیر شاہ نے صرف تمہارے لئے بھیجا ہے۔ خدا کے واسطے مجھے گناہ گار نہ کرو۔ یہ تمہاری امانت ہے بس اب تم تیاری پکڑو۔ پیر شاہ کا کوئی پتا نہیں کہ کب چل دیں۔ کہیں یہ سنہری موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے۔" شیر خان نے پوچھا۔

"مجھے بھی ساتھ جانا ہو گا ناں؟"

"کیوں نہیں" عمردین نے بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم بھی ساتھ چلو گے۔ ہو سکتا ہے پیر شاہ تم سے نہ ملیں۔ صرف روبی بہن کو ہی دم کرنے کے واسطے بلائیں۔ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن بہر حال یہاں سے ہم تینوں اکٹھے ہی چلیں گے۔ اب تم جا کر تیاری کرو۔ ہم صبح کی لاری سے روانہ ہو جائیں گے۔" شیر خان نے پوچھا "جانا کہاں ہو گا؟" عمردین بولا "یہاں لاہور کے قریب تیس چالیس میل کے فاصلے پر ایک جگہ جانا ہو گا۔ پیر شاہ

نے مجھے اس جگہ کا نام بتانے سے منع کیا ہے لیکن مجھے وہ جگہ معلوم ہے۔ زیادہ سے زیادہ سہ پہر تک واپس لاہور آجائیں تم ایک دن کی چھٹی لے لینا۔ تمہاری جگہ میں نے دوسرے آدمی کا انتظام سوچ لیا ہے۔ اللہ بخش تمہاری جگہ گیٹ پر ڈیوٹی دے گا۔ منیجر سے بھی بات کر لوں گا۔ میں صبح سات بجے تمہارے پاس آجاؤں گا۔ تم دونوں تیار رہنا۔"

شیر خان حسب معمول رات کے پونے ایک بجے سنیما ہاؤس میں گیٹ کیپری کی ڈیوٹی ختم کر کے گھر پہنچا۔ اس نے روبی کو ساری بات بتائی روبی پہلے تو راضی نہ ہوئی کہنے لگی۔

"ایک تو اصلی پیر ہوتے ہیں جو خلق خدا کی خدمت کرتے ہیں ان کو دنیا کا کوئی لالچ نہیں ہوتا۔ یہ سچے پیر ہوتے ہیں مگر ایک جعلی اور نقلی پیر ہوتے ہیں جو دنیاوی عیش و آرام کو حاصل کرنے کے واسطے پیری فقیری کی دکان سجاتے ہیں۔ وہ کسی کے کام نہیں آسکتے بلکہ الٹا لوگوں کا مال بٹورتے ہیں۔" شیر خان نے کہا۔

پیر شاہ پیر اصلی ہے۔ ان کو کوئی لالچ نہیں ہے دنیا کا۔ اس نے تو ہم سے کچھ بھی طلب نہیں کیا وہ تو کسی سے ملتا بھی نہیں۔ یہ تو عمردین کی وجہ سے تمہارے لئے دعا کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے جانا ہے دوپہر کے بعد واپس آجائیں گے۔ اگر اللہ اس شخص کی دعا کے وسیلے سے تمہاری جھولی بھر دے اور ہمارے گھر میں بھی ننھا سا بچہ کھیلتا نظر آنے لگے تو ہمیں انکار نہیں کرنا چاہئے۔"

روبی کو بھی کبھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے ہاں اولاد نہ ہو اور شیر خان محض اولاد کی وجہ سے دوسری شادی کر لے۔ اسے شیر خان سے محبت تھی۔ اس نے صرف محبت کی خاطر شیر خان سے شادی کی تھی اور اس سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی چنانچہ وہ تیار ہو گئی۔

اگلے دن ٹھیک صبح سات بجے عمر دین آگیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا کہنے لگا۔

"تمہیں کچھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنی بہن کی طرف سے میں نے یہ مٹھائی لے لی ہے۔" اس نے ڈبہ روبی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"بہن! یہ تم پیر شاہ کی خدمت میں پیش کر دینا۔ کہتے ہیں ان لوگوں کے پاس خالی ہاتھ نہیں جانا چاہئے وہ کوئی دعا پڑھ کر تم پر پھونکیں گے بس پھر سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ!"

لاری اڈے پر آکر وہ ایک لاری میں سوار ہو گئے۔ لاری لاہور سے شیخوپورے کی طرف روانہ ہو گئی کوئی ایک گھنٹے بعد لاری کو عمر دین نے ایک کھال کے کنارے رکوایا اور روبی اور شیر خان کو لے کر لاری سے اتر پڑا کہنے لگا۔

"یہاں سے پیر شاہ کا ڈیرہ تھوڑی فاصلے پر ہی ہے۔" اور وہ کھال کے کنارے مغرب کی طرف چل پڑا روبی اور شیر خان بھی اس کے ساتھ تھے۔ عمر دین سارا راستہ پیر شاہ کی جلالی باتیں انہیں سناتا رہا۔ ایک جگہ وہ کھال کی ڈھلان اتر کر باجرے کے کھیت میں داخل ہو گئے۔ کھیت ختم ہوا تو سامنے امرودوں کا ایک کافی بڑا باغ تھا جو ویران تھا۔ ابھی تک انہیں کوئی دیہاتی ادھر ادھر چلتا پھرتا نظر نہیں آیا تھا۔ عمر دین کہنے لگا۔

"باغ کے پیچھے ایک کوٹھری میں پیر شاہ تشریف رکھتے ہیں۔" باغ کے دوسرے کنارے پر وہ رک گیا۔ سامنے ایک جگہ کیکر کے درختوں میں کوٹھری دکھائی دی جس کا آدھا دروازہ کھلا تھا۔ عمر دین نے شیر خان کو وہیں رک جانے کو کہا۔

"پیر شاہ کے جلالی مزاج کو میں خوب جانتا ہوں۔ انہوں نے روبی کو ہی بلایا ہے۔ میں

روبی کے ساتھ جاتا ہوں۔ تم اسی جگہ ٹھہرو۔ اگر پیر شاہ کا حکم ہوا تو میں تمہیں آکر لے جاؤں گا۔"

شیر خان کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ وہیں امرود کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ عمر دین نے روبی کو ساتھ لیا اور کوٹھری کی طرف بڑھا۔ وہاں سے کوٹھری کا فاصلہ کوئی سوڈیڑھ سو فٹ کے قریب ہو گا۔ روبی خاموشی سے عمر دین کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ جب وہ کوٹھری کے قریب پہنچے تو اندر سے ایک آدمی نکلا اس نے ہاتھ میں ڈول پکڑ رکھا تھا۔ عمر دین کو دیکھ کر وہ اس کے پاس آیا اور بولا۔

"بھائی جی! شاہ صاحب تمہارا انتظار کر رہے ہیں جلدی جاؤ۔" عمر دین اور روبی کوٹھری میں داخل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھاری اور رعب والی آواز گونجی۔

"دروازہ بند کر دو عمر دین۔" عمر دین نے جلدی سے کوٹھری کا آدھ کھلا دروازہ بند کر دیا۔

کوٹھری میں مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ روبی کو خیال آیا کہ یہ کیسا شخص ہے دن کے وقت لیمپ جلا کر بیٹھا ہے۔ اس نے دیکھا کہ کوٹھری میں دیوار کے ساتھ دو چار مونڈھے رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے قریب ہی ایک تخت پوش پر دری بچھی ہے۔ ایک بھاری بدن کا گھنگھریالے بالوں اور گہرے سانولے رنگ والا آدمی بیٹھا تسبیح پھیر رہا ہے۔ پشمینے کی سفید چادر اس نے اس طرح کندھوں پر ڈال رکھی ہے کہ اس کے گلے میں لٹکتی منکوں کی مالا صاف نظر آرہی ہے۔ کوٹھری کی فضا اگر بتیوں کی خوشبو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ عمر دین نے جھک کر سلام کیا اور روبی کو بھی اشارہ کیا۔ روبی نے بھی تھوڑا سا جھک کر سلام کیا۔ عمر دین ہاتھ باندھ کر بولا۔

"حضور! یہ وہ لڑکی ہے جس کے بارے میں میں نے آپ سے عرض کی تھی۔" روبی ذرا سی چونکی۔ عمر دین نے پہلی بار اسے لڑکی کہہ کر پکارا تھا۔ ورنہ وہ ابھی تک اسے بہن ہی کہتا آیا تھا۔ پیر شاہ نے اپنی لال انگارہ ایسی آنکھیں اٹھا کر روبی کو گھور کر دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ جھومنے لگا۔ ہاتھ کے اشارے سے روبی کو تخت پوش کے سامنے مونڈھے پر بیٹھنے کو کہا۔ عمر دین نے روبی کو آہستہ سے ٹھوکا دیا۔ وہ مونڈھے پر بیٹھ گئی پیر شاہ نے ایک گول

ڈبی میں سے سفوف کی پڑیا نکالی اور روبی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ایک خوراک ابھی کھانی ہو گی۔" عمردین جھٹ گلاس میں پانی ڈال کر لے آیا۔ روبی نے پڑیا کھول کر دیکھی۔ پھر اسے ذرا سا چکھایا وہ فوراً سمجھ گئی کہ یہ کوکین ہے۔ اس نے پندرہ سال برما سیلون کے جنگلوں میں مقیم خطرناک قسم کے اسمگلروں میں بسر کئے تھے جن کا کام ہی کوکین وغیرہ اسمگل کرنا تھا۔ وہ بھلا کوکین کو کیسے نہ پہچانتی۔ ایک سیکنڈ کے اندر اندر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک پردہ سا ہٹ گیا' مگر وہ ضبط کئے رہی۔ اس نے عمردین سے کہا۔

"میں یہ خوراک نہیں کھاؤں گی۔ شاہ جی سے کہو دم کر دیں مجھ پر تاکہ میں واپس جا سکوں۔"

عمردین کو اتنا علم ہو گیا تھا کہ یہ ہے تو لڑکی مگر اسے جرائم پیشہ زندگی کا بڑا گہرا تجربہ ہو چکا ہے۔ اس رات وہ روبی کو لڑتے اور فائرنگ کرتے دیکھ چکا تھا۔ سمجھ گیا کہ روبی نے کوکین کی شناخت کر لی ہے۔ یہ باتیں اس نے پیر شاہ کو بھی بتا رکھی تھیں۔

پیر شاہ نے جلالی آواز میں کہا۔

"اگر یہ دوائی نہ کھائی تو میں دم نہیں کروں گا اور تم ساری زندگی اولاد سے محروم رہو گی۔" روبی نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

"میں نے آپ کو اپنا فیصلہ بتا دیا ہے شاہ جی۔ میں یہ دوائی نہیں کھاؤں گی۔" پیر شاہ نے عمردین کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

عمردین اس وقت روبی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ صدری کی جیب میں تھا۔ پیر شاہ کا اشارہ پاتے ہی بجلی کی طرح اس کا ہاتھ صدری کی جیب میں سے نکلا اور دوسرے لمحے ایک رسی روبی کی گردن میں پڑی تھی جسے ایک دم سے عمردین نے تین چار بل دے دیئے۔ روبی کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔ پردہ اٹھ چکا تھا اور اصل منظر روبی کے سامنے آ گیا تھا۔ نقلی پیر شاہ بھی اپنے اصلی روپ میں آ گیا۔ وہ تخت پوش پر سے چھلانگ لگا کر روبی پر جھپٹا اور دوسری رسی سے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیئے۔ روبی زخمی شیرنی کی طرح تڑپ کر ان بدمعاشوں کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اتنے میں تیسرا آدمی

بھی کوٹھری میں آ گیا۔ انہوں نے آن کی آن میں روبی کے منہ پر اتنا کس کر کپڑا باندھ دیا کہ وہ بمشکل سانس لے سکتی تھی۔ عمردین نے دبی ہوئی مگر غصیلی آواز میں کہا۔

"تاجے اس کو تخت پوش پر باندھ دے۔" روبی کو تخت پر گرانے کی کوشش کرنے لگے انہوں نے روبی کے پاؤں نہیں باندھے تھے۔

روبی اپنا آخری داؤ استعمال کر سکتی تھی۔ یہ اس کا خاص داؤ تھا اور شاذو نادر ہی ناکام ہوتا تھا۔ اس پکڑ دھکڑ میں روبی نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پوری طاقت سے اپنے سیدھے پاؤں کو نقلی پیر شاہ کی ناف سے ذرا نیچے مارا۔ وہ اگرچہ گرانڈیل تھا مگر ضرب اتنی شدید اور تکلیف دہ تھی کہ اس کا سارا بدن سن ہو گیا اور وہ پیٹ کو پکڑ کر وہیں ڈھیر ہو کر گر پڑا۔ دوسرا وار چشم زدن میں روبی نے اسی آدمی پر کیا جو ڈول ہاتھ میں پکڑے کوٹھری کے باہر ملا تھا مگر یہ وار خالی گیا۔ اتنی دیر میں عمردین اور اس آدمی نے روبی کو قابو کر لیا۔ وہ چیخ مار کر باہر شیر خان کو خبر کرنا چاہتی تھی مگر اس کا منہ بندھا ہوا تھا وہ بول نہیں سکتی تھی اس کے حلق سے صرف غوں غاں کی آوازیں ہی نکل رہی تھیں۔ عمردین نے روبی کے بالوں کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور غصے میں بولا۔

"میں نے اسی دن تم سے بدلا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا جس دن تم نے مجھ پر پستول کا فائر کر کے مجھے زخمی کیا تھا۔ تم مجھے نہیں جانتی ہو۔ میں جس عورت کو چن لوں پھر وہ میرے ہاتھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتی۔"

نقلی پیر کی تکلیف کچھ کم ہو گئی تھی۔ وہ پیٹ کو ہاتھ سے ملتا ہوا اٹھا اور گالی دے کر بولا

"اس کی اکڑ میں نکالتا ہوں۔" عمردین نے روبی کے پاؤں تخت پوش کے پایوں سے باندھتے ہوئے کہا۔" پہلا حق میرا ہے تاجے۔ معلوم ہوا کہ نقلی پیر کا نام تاجا تھا اور وہ چھٹا ہوا بدمعاش عمردین کا ساتھی تھا۔ عمردین ایک سوچی سمجھی اسکیم پر عمل کرتے ہوئے روبی کو وہاں بے آبرو کرنے کے واسطے لایا تھا۔ نقلی پیر نے پستول نکال کر اس کی نالی روبی کے سر کے ساتھ لگا دی اور دبی دبی مکروہ آواز میں بولا۔

"اسے بے آبرو کر کے اسی جگہ دفن کر دیں گے لاش باہر لے جانے کی ضرورت

نہیں۔" دوسرا بدمعاش بولا۔

"اس کا خاوند امرود کے باغ میں بیٹھا ہے میں اسے جا کر وہیں ختم کر دیتا ہوں۔" نقلی پیر نے عمردین کو گالی دی اور کہا۔

"تم اس حرامی کو ساتھ کیوں لائے تھے؟" عمردین نے بھی جواب میں گالی دے کر کہا۔

"اگر اسے نہ لاتا تو یہ عورت بھی یہاں نہیں آسکتی تھی۔ اب بک بک بند کرو۔"

اندر یہ خونی ڈرامہ ہو رہا تھا اور باہر کوٹھری سے ڈیڑھ سو فٹ کے فاصلے پر امرود کے درخت تلے بیٹھا شیر خان بے چین سا ہو کر اٹھا اور کوٹھری کی طرف چل پڑا۔ روبی کو کوٹھری میں گئے کافی دیر ہو گئی تھی شیر خان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے تھے۔ وہ کوٹھری کے قریب آیا تو اس کا دروازہ کھلا شیر خان جلدی سے دیوار کے ساتھ ہو گیا کوٹھری میں سے تیسرا بدمعاش باہر نکلا اس کے ہاتھ میں پستول تھا وہ شیر خان کا کام تمام کرنے امرود کے درخت کی طرف جانے والا تھا۔ پستول کو دیکھتے ہی شیر خان سارا معاملہ سمجھ گیا وہ ان پڑھ ضرور تھا مگر اناڑی نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک جوالا مکھی پھٹ پڑا تھا۔ وہ بپھرے ہوئے چیتے کی طرح تیسرے بدمعاش پر لپکا۔ اس کے ہاتھ پر اپنا طاقتور ہاتھ مارا۔ پستول نیچے گر پڑا۔ تیسرا بدمعاش ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا شیر خان نے جلدی سے پستول اٹھایا وہ اس پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ کوٹھری کے اندر سے روبی کی چیخ کی آواز آئی۔ اس نے شیر خان کو آواز دی تھی۔ شیر خان کوٹھری کی طرف پلٹا۔ تیسرا بدمعاش وہاں سے بھاگ پڑا۔ شیر خان نے اندر جاتے ہی اوپر تلے دو فائر کر دیئے۔ روبی نے چلا کر کہا۔

کسی کو قتل نہ کرنا شیرے۔ میری عزت محفوظ ہے۔" لیمپ کی روشنی کے ساتھ اب باہر سے دن کی روشنی بھی کوٹھری میں آ رہی تھی۔

شیر خان نے پستول کا رخ عمردین اور نقلی پیر شاہ کی طرف کر دیا۔ اس کے چہرے پر انتقام کی آگ کے شعلے لپک رہے تھے۔ روبی تخت پوش پر بندھی پڑی تھی۔ اس پر قابو پانے کی جدوجہد میں روبی کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا ہٹ گیا تھا جس کے ساتھ ہی روبی نے چیخ مار کر شیر خان کو آواز دی تھی۔ نقلی پیر کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ عمردین خالی ہاتھ تھا۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں ہو گیا۔ شیر خان کے پستول سے گولی

دھماکے کے ساتھ فائر ہو کر نقلی پیر کے پستول کو لگی اور وہ ہاتھ پکڑ کر وہیں دہرا ہو گیا۔ شیر خان نے گرج کر کہا۔

"عمرے۔ تو بھی اس بدمعاش کے پاس بیٹھ جا۔" عمردین کو شیر خان کی خونخوار آنکھوں میں اپنی موت نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میرا کوئی قصور نہیں ہے شیرے۔ اس پیر شاہ کی نیت خراب ہو گئی تھی۔" روبی نے کہا۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے۔ ساری اسکیم اسی کی تھی۔ یہ ہمیں دھوکے سے یہاں لایا تھا۔ یہ مجھے بے آبرو کر کے ہم دونوں کو قتل کرنا چاہتے تھے۔" شیر خان کی رگیں پھڑک رہی تھیں۔ اس نے دانت پیس کر کہا۔

"روبی! تو مجھے انہیں قتل کیوں نہیں کرنے دیتی؟" روبی نے کہا:"شیرے! ہم اپنے ملک میں کسی کو قتل نہیں کریں گے اپنے آپ پر قابو پاؤ۔ میری رسیاں کھولو......"

شیر خان کے ایک ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا جس کا رخ دونوں بدمعاشوں کی طرف تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے روبی کے ہاتھوں کو کھول دیا۔ روبی نے اپنے پاؤں خود کھول لئے۔

"عمردین!" شیر خان نے عمردین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:"تو نے یار بن کر یار ماری کی ہے۔ تو نہایت گھٹیا آدمی ہے۔ تو مجھے اور میری بیوی کو نہیں جانتا۔ ہم نے وہ کچھ کیا ہے کہ تیرے باپ دادا نے بھی نہ کیا ہو گا۔ مگر ہم نے کبھی یار ماری نہیں کی۔ کبھی اپنے دوست کے اعتماد کا خون نہیں کیا۔ خدا کی قسم تم دونوں کو قتل کر دینا میرے لئے ایسا ہی ہے جیسے دو چونٹیوں کو مسل دینا۔ مگر روبی نے مجھے منع کر دیا ہے۔ ٹھیک ہے ہم نے پاکستان میں آ کر عہد کیا تھا کہ یہاں امن امان کی زندگی بسر کریں گے یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے یہاں ہم اپنے ہاتھ خون سے نہیں رنگیں گے۔ ہمارے ہاتھوں پر پہلے ہی اتنا خون لگا ہے کہ ساری عمر دھوتے رہیں تو وہ نہیں اترے گا۔ مگر یہ خون بدمعاشوں اور قاتلوں کا خون ہے کسی بے گناہ شریف انسان کا خون نہیں۔" روبی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شیر خان نے ایک بار پھر روبی سے کہا:"میں انہیں زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا روبی۔ یہ انسانیت کے نام پر

دھبا ہیں۔ یہ عزتوں کے قاتل ہیں۔ پاکستان ایسی پاک جگہ پر ان کا وجود باقی نہیں رہنا چاہئے۔" روبی اس وقت عمردین کے ہاتھ رسی سے پیچھے کی طرف باندھ رہی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

"نہیں شیرے نہیں۔ ہم قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لیں گے۔ بہت پرخچے اڑائے ہیں ہم نے قانون کے۔ مگر اب ہم ایسا نہیں کریں گے۔ یہاں ہمیں قانون کا احترام کرنا ہو گا۔ ہم انہیں قانون کے حوالے کریں گے۔"

عمردین اور نقلی پیر شاہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انہیں شیر خان سے ایسے نرم سلوک کی توقع نہیں تھی۔ روبی نے نقلی پیر شاہ کے ہاتھ بھی پیچھے کس کر باندھ دیئے۔ اس کے بعد شیر خان بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ انہوں نے اپنے پرانے تجربوں سے کام لیتے ہوئے دونوں بدمعاشوں کو تخت پوش کے ساتھ چینیوں کے اسٹائل میں اس طرح رسیوں سے جکڑ دیا کہ وہ ذرا سا ہل بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے بعد دونوں باہر آ گئے۔ روبی نے شیر خان سے کہا۔

"تم یہاں رہو یہاں آس پاس کسی گاؤں میں کوئی نہ کوئی پولیس چوکی ضرور ہو گی۔ میں وہاں پولیس کو اطلاع دینے جاتی ہوں۔" شیر خان طویل سانس بھر کر بولا۔

"روبی! میں ان دونوں کو زندہ نہیں دیکھ سکتا۔" روبی نے شیر خان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور بولی۔

"یاد ہے سیلون کے جنگلوں سے نکلتے وقت ہم نے کیا عہد کیا تھا؟ یہی کہ ہم اسلامی ملک اپنے نئے وطن پاکستان جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر ہم جرائم پیشہ زندگی سے توبہ کر کے امن وامان کی زندگی گزارنی شروع کریں گے۔ تم یہاں باہر بیٹھو۔ میں پولیس کو لے کر بہت جلد آ جاؤں گی۔" روبی جانے لگی تو شیر خان نے کہا۔

"تیسرا بدمعاش ادھر کو بھاگا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں راستے میں مل جائے یہ پستول اپنی حفاظت کے لئے پاس رکھو۔ میں اندر سے دوسرا پستول لے لیتا ہوں۔" روبی نے پستول اپنے لباس میں چھپا لیا اور تیز تیز قدموں سے امرود کے باغ میں چل پڑی اس کے جاتے ہی شیر خان کوٹھری میں واپس آیا۔ عمردین اور نقلی شاہ تاجا اسی حالت میں تخت پوش کے ساتھ

جکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ عمردین، شیر خان سے معافی مانگنے لگا۔ نقلی پیر نے جلالی آواز میں کہا۔

"میں تمہیں جلا کر راکھ کر دوں گا۔ تم میری طاقت سے واقف نہیں ہو۔" شیر خان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے نقلی پیر شاہ کا پستول زمین پر سے اٹھایا۔ اس کا میگزین دیکھا اس میں چار گولیاں باقی تھیں۔ میگزین بند کر کے شیر خان نقلی پیر کے پاس آ کر تخت پر بیٹھ گیا۔ پھر اس مکار شخص کو بالوں سے پکڑ کر ایک شدید جھٹکا دیا۔ پستول کی نالی اس کے منہ کے اندر ڈال کر حلق تک لے گیا۔ نقلی پیر شاہ کا سانس رکنے لگا۔ شیر خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے پنجابی میں ایک ایسی گالی دی جو نقلی پیر شاہ نے بدمعاش ہوتے ہوئے بھی زندگی میں پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ شیر خان نے اپنے اندر پھٹتے ہوئے جوالا مکھی کے طوفان کو بمشکل روکتے ہوئے کہا۔

"اس عورت کو دعائیں دو جس کو تم بے آبرو کرنا چاہتے تھے اور جس نے تمہاری بہن کی طرح تمہیں بھائی جان کر تمہاری جان بچائی ہے۔" پھر اس نے پستول کی نالی بدمعاش نقلی پیر کے حلق سے باہر کھینچ لی۔ اس کے بعد عمردین کے نتھنے میں پستول کی نالی ڈال دی اور کہا۔

"تم نے تو خدا کو حاضر ناظر جان کر روبی کو اپنی بہن بنایا تھا کیا تم لوگ اپنی بہنوں سے ایسا سلوک کرتے ہو؟ تم کتنے نیچ ہو۔ تم نے پاکستان کے باعزت غیرت مند لوگوں کو بدنام کر رکھا ہے۔ کاش میں تم دونوں کو قتل کر سکتا۔ جس کو تم نے رسوا کرنے کا ناپاک منصوبہ بنایا اسی نے تیری جان بخشنے کی سفارش کی ہے۔ مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم نہ صرف ایک مکروہ گناہ کر رہے ہو بلکہ ایک آدم خور شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال رہے ہو؟"

عمردین کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ اب اسے اس بات کا ثبوت مل گیا تھا کہ روبی نے ٹیکسی والی رات کی واردات کے بارے میں شیر خان کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ معافی مانگنے لگا۔ شیر خان نے پستول کی نالی اس کے نتھنے سے تیزی سے کھینچی اور اس کی پسلیوں میں زور سے لات مار کر کہا۔

”زبان کو بند رکھ سانپ کی اولاد!“ شیر خان کا خون کھول اٹھا تھا۔ اس پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ روبی نے اس کے ہاتھ باندھ کر رکھ دیئے تھے وہ خود بھی پاکستان میں کسی مسلمان کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کوٹھری سے نکل گیا دروازہ بند کر کے وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

روبی چلتے چلتے کھال کے دوسرے کنارے پہنچ گئی تھی۔ اسے کچھ فاصلے پر درختوں میں گھرا ہوا ایک گاؤں دکھائی دیا۔ ایک کسان ہل کاندھے پر رکھے اس کے قریب سے گزرا تو روبی نے اس سے پوچھا کہ یہاں پولیس چوکی کہاں ہے؟ کسان نے گاؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”گاؤں میں ہے بیٹی۔“ روبی پر رقت سی طاری ہو گئی۔ کسان نے اسے بیٹی کہہ کر پکارا تھا۔ یہ پاکستان کی حقیقی آواز تھی۔ یہ پاکستان کے حقیقی لوگ تھے۔ عمردین اور نقلی پیر شاہ پاکستان کے چہرے نہیں تھے۔ یہ وہ بدکردار مکروہ چہرے تھے جو پاکستان کی بدنامی کا باعث تھے اور جنہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظر آنا چاہئے جیل ہی ان کا اصلی مقام تھا اور ایک نہ ایک دن وہ وہیں پہنچ جاتے ہیں۔

روبی گاؤں میں داخل ہو گئی یہ کافی بڑا گاؤں تھا۔ شاید کوئی قصبہ تھا۔ دور سے چھوٹا سا لگتا تھا۔ پوچھتے پوچھتے وہ پولیس چوکی جا پہنچی۔ ایک کوٹھری میں ٹوٹی پھوٹی کرسیوں پر دو سپاہی اور ایک محرر بیٹھے نمک لگا لگا کر سنترے کھا رہے تھے۔ انہوں نے روبی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ روبی نے مختصر لفظوں میں سارا واقعہ بیان کر دیا اور کہا کہ میری طرف سے رپورٹ درج کریں۔ اور مجرموں کو جا کر گرفتار کر لیں۔ محرر سپاہیوں کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرایا۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر روبی سے مخاطب ہوا۔

”بی بی! کہیں الٹا تم پر کیس نہ بن جائے سوچ لو۔ میرا مطلب ہے اس میں تمہاری بدنامی بھی ہو سکتی ہے۔ تمہارا کیا مشورہ ہے بی بی کو میاں داد؟“ دوسرے سپاہی نے بھی محرر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے روبی سے کہا۔

”بی بی! تم اپنے آدمی کو لے کر شہر جاؤ ہم ملزموں کو جا کر پکڑ لائیں گے۔ اس میں

تمہاری بدنامی کا ڈر ہے۔ ویسے ہم ملزموں کو چھوڑیں گے نہیں۔“ محرر نے جب ایک بار پھر روبی کو واپس شہر چلے جانے کا مشورہ دیا تو روبی کو غصہ آگیا اس نے کہا۔

”آپ قانون کا بھی خیال نہیں کرتے؟ اگر آپ لوگوں نے رپورٹ درج نہ کی تو میں لاہور جا کر ڈی۔ایس۔پی صاحب سے فریاد کروں گی۔“ اس پر دونوں سپاہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ محرر نے سپاہیوں کو ڈانٹ کر کہا۔

”اوئے جاؤ‘ جا کر ان کمینوں کو گرفتار کر کے لاؤ‘ جنہوں نے ایک نیک بی بی کو خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابھی اس نقلی پیر اور اس کے ساتھی کو یہاں پیش کرو۔“ اسی وقت محرر نے روبی کا بیان قلمبند کیا۔ روبی نے جیب سے پستول نکال کر میز پر رکھ دیا‘ محرر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

”یہ پستول کہاں سے آگیا بی بی۔“

”روبی نے کہا۔“ ”ان بدمعاشوں میں سے ایک بدمعاش کا پستول ہے‘ چونکہ ان کا تیسرا ساتھی بھاگ گیا تھا اسی لئے میں نے حفاظت کے لئے یہ پستول ساتھ رکھ لیا۔“

محرر نے پنسل سے کان کھجاتے ہوئے کہا۔ ”اس کا لائسنس کہاں ہے بی بی؟ یہ تو الٹا آپ پر کیس بن سکتا ہے۔“

روبی نے عاجز آتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو بیان دے چکی ہوں کہ یہ میرا پستول نہیں ہے‘ ان بدمعاشوں کا ہے۔ اس کا لائسنس ان سے طلب کریں۔“

محرر چپ ہو گیا۔ پھر سپاہیوں سے مخاطب ہو کر چلایا۔ ”اوئے جاؤ ملزموں کو پکڑ کر لاؤ تم یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو؟“ دونوں سپاہی رائفل اٹھائے روبی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ شیر خان نے روبی کو دور سے دو پولیس کے سپاہیوں کے ہمراہ آتے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا سپاہی کوٹھری میں گئے۔ اندر عمردین اور نقلی پیر شاہ اسی طرح تخت کے ساتھ جکڑے پڑے تھے۔ پولیس کو دیکھتے ہی دونوں فریاد کرنے لگے کہ ان لوگوں نے اپنے آدمیوں سے مل کر ہمیں زدوکوب کیا ہے۔ ہمارے روپے بھی نکال لئے ہیں۔ ان کے ساتھ چار آدمی تھے۔ جو روپیہ لیکر بھاگ گئے ہیں‘ سپاہی میاں داد نے شیر خان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یہ کیا بیان دے رہے ہیں بھائی صاحب؟“

شیر خان بولا۔ "یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

روبی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ساتھ کوئی آدمی نہیں تھے۔ عمردین ہمیں لاہور سے اس جعلی پیر کے پاس لایا تھا جس نے عمردین کے ساتھ مل کر میری عزت پر حملہ کرنا چاہا۔ اگر میرا خاوند وقت پر نہ پہنچ جاتا تو میں لٹ چکی تھی۔"

سپاہی میاں داد نے شیر خان اور روبی کو کوٹھری سے باہر بھیج دیا' تھوڑی دیر بعد وہ عمر دین اور نقلی پیر شاہ کو باہر لے آیا' ان کو ہتھکڑیاں لگی تھیں۔ سپاہی میاں داد نے شیر خان اور روبی سے کہا۔

"تم لوگ شہر جاؤ جی' اب تمہارا یہاں کوئی کام نہیں۔ تمہارا بیان ہو چکا ہے۔ ہم ان کو حوالات میں بند کر دیں گے۔ مقدمہ درج ہو گیا ہے۔ کیس لاہور میں ہی کسی عدالت میں جائے گا۔ تمہیں اطلاع کر دی جائے گی۔ یہ کہہ کر دونوں سپاہی عمردین اور نقلی پیر شاہ کو آگے لگا کر گاؤں کے تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

روبی اور شیر خان ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کیا خیال ہے کہیں پولیس ان دونوں کے ساتھ مل تو نہیں گئی ؟ شیر خان نے اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے روبی سے پوچھا روبی نے کہا۔

"نہیں نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پاکستان کی پولیس برما اور سیلون والی پولیس نہیں ہے۔ یہاں پورا پورا انصاف ہو گا۔ ساری کارروائی قانون کے مطابق ہو گی۔ تم دیکھ لینا ان دونوں بدمعاشوں کو دس دس سال کی سزا ضرور ہو گی۔"

دونوں شہر لاہور واپس آگئے۔ شیر خان کو یقین تھا کہ دو چار دنوں کے اندر گاؤں کے تھانے سے انہیں اطلاع مل جائے گی کہ ان کا کیس لاہور کی فلاں عدالت میں لگ گیا ہے اور وہ فلاں روز عدالت میں حاضر ہوں۔ کیونکہ یہ گاؤں لاہور کے ضلع میں ہی تھا۔ لیکن ایک ہفتہ گزر گیا اور انہیں کوئی اطلاع ملی نہ ہی سمن موصول ہوا۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ عمردین بھی سینما گھر میں اپنی نوکری پر واپس آگیا۔ شیر خان کو دیکھتے ہی وہ کمال عیاری سے کام لیتے ہوئے اس کے پاس آکر عاجزانہ انداز میں بولا۔

"شیر خان! یقین کرو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ پیر شاہ ایک بدمعاش آدمی نکلے گا پھر بھی تم مجھے معاف کر دو۔"

شیر خان اسے اسی لمحے ہلاک کر دینا چاہتا تھا اور اس کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن روبی نے اس سے عہد لے رکھا تھا کہ وہ پاکستان میں ایسا کوئی کام نہیں کرے گا' عزت آبرو سے زندگی گزارے گا۔ وہ دانت پیس کر اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اتنا ضرور کیا کہ عمردین کو اسی جگہ پکڑ کر اتنا مارا کہ وہ خونم خون ہو گیا۔ گھر آکر اس نے روبی کو سارا واقعہ بیان کر دیا۔ روبی ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی کہنے لگی۔

"شیر خان! کیا خیال ہے کسی اور شہر چل کر نئی زندگی شروع کریں۔ یہاں اب میرا جی اچاٹ سا ہو گیا ہے۔ یہاں تو قانون بھی ہمارا ساتھ نہیں دے رہا۔"

شیر خان نے کہا۔"ایسا مت کہو۔ قانون تو ہر آدمی کے ساتھ ہے۔ لیکن پولیس میں کچھ کالی بھیڑیں آگھسی ہیں۔ وہ اس محکمے اور قانون کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ بہرحال میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" روبی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کیوں نہ کراچی چل کر رہیں۔ ہمیں کوئی دولت کا تو لالچ نہیں ہے دو وقت کی حلال کی روٹی کھانی ہے وہ وہاں بھی مل جائے گی۔ پھر بڑا شہر ہے جی بھی لگ جائے گا۔ ہم زیادہ تر بڑے شہروں میں ہی رہے ہیں۔" شیر خان بولا۔

"ٹھیک ہے اگر تمہاری یہی صلاح ہے تو چلے چلتے ہیں کراچی' چار کپڑے ہی تو ہیں' ٹرنک میں رکھ کر اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔ ہاں تنخواہ مل جانے دو' تاکہ کرائے کا انتظام ہو جائے۔" روبی نے پوچھا۔"کراچی میں رہیں گے کہاں؟ میرا مطلب ہے شروع شروع میں تو کوئی ٹھکانہ ہونا چاہئے۔" شیر خان کچھ سوچ کر بولا۔"ہمارے سینما کے جو مالک ہیں ان کا کراچی میں بھی ایک سینما ہاؤس ہے۔ میں مینیجر صاحب سے بات کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے کراچی والے سینما میں ملازمت دلوا دیں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تم کل ہی ان سے بات کرنا۔" روبی نے شیر خان کی تجویز کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن شیر خان نے موقع دیکھ کر مینیجر سے بات کی۔ مینیجر نے سینما کے مالک سے بات کی۔ شیر خان نے وجہ یہ بتائی کہ اسے لاہور کا پانی راس نہیں آیا۔ وہ چونکہ سمندری

شہر میں بڑھا پلا ہے اس لئے کراچی جا کر آباد ہونا چاہتا ہے۔ جہاں سمندر کی ہوا چلتی رہتی ہے۔ سینما کا مالک راضی ہو گیا۔ چنانچہ اسی ہفتے ریل گاڑی میں بیٹھ کر شیر خان اور روبی کراچی چل دیئے۔ کراچی کی روشنیاں سمندر اور اونچی اونچی عمارتیں اور کشادہ سڑکیں دیکھ کر دونوں کو کولمبو' ہانگ کانگ اور برما کے شہر یاد آ گئے۔ روبی نے خوش ہو کر کہا۔

"میرے شیرا! اسی شہر میں رہیں گے۔" شیر خان کو سینما ہاؤس کے احاطے میں ہی ایک چھوٹی سی کوٹھری دے دی گئی۔

اسی دوران اللہ نے انہیں چاند سی لڑکی عطا کر دی۔ روبی اور شیر خان بہت خوش ہوئے۔ اولاد کی نعمت عطا ہو جانے پر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ کراچی میں شیر خان کے دوستوں کے حلقے میں کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ اس کا ماضی کہاں اور کس حالت میں گزرا ہے۔ دونوں میاں بیوی انتہائی سادگی اور شرافت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ شیر خان نے کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ کوئی اگر سختی سے پیش بھی آتا تو شیر خان صبر کر کے خاموش رہتا۔ روبی گھر میں سارا دن اپنی پیاری بچی کے ساتھ مصروف رہتی۔ اسے جی بہلانے کو جیسے ایک زندہ کھلونا مل گیا تھا۔ ابھی خود روبی کی عمر بیس اکیس سال کی تھی۔ شیر خان اس سے ایک سال بڑا ہو گا۔ شیر خان کا یہ معمول تھا کہ وہ دن میں کوئی وقت نکال کر ایک بار ورزش ضرور کرتا اس کا جسم شروع ہی سے ورزش کا عادی تھا۔ قد کاٹھ بھی خوب نکل آیا تھا۔ شانے چوڑے اور بازو بھرے بھرے تھے۔ نیک پاک زندگی بسر کرنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر ایک ترو تازگی اور نور سا جھلکنے لگا تھا۔ نیک اطوار اور اچھے اخلاق کی وجہ سے اس کا حلقہ وسیع ہو گیا تھا۔

شیر خان گیٹ کیپر سے سینما کا ہیڈ بکنگ کلرک بن گیا یہاں بھی شیر خان نے ایمانداری اور دیانت داری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ٹکٹ نہ خود بلیک کرتا نہ کسی کو کرنے دیتا علاقے کے ایک غنڈے سہراب نے اسے جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دی کیونکہ شیر خان نے اسے بلیک کرنے کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ شیر خان نے سہراب کی دھمکی کو نظر انداز کر دیا۔ مگر سہراب علاقے کا بڑا نامی گرامی اور بدنام ترین غنڈہ تھا اور دو قتل کر کے دس برس کی قید بھی کاٹ آیا تھا۔

شیر خان تو سہراب غنڈے کی تہہ سے واقف تھا مگر سہراب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس نے کس شخص کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی ہے' ایک روز آخری شو کے ٹکٹوں کا حساب کتاب منیجر کے حوالے کرنے کے بعد سینما ہاؤس سے اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا کہ کوارٹروں کے قریب ایک نیم روشن گلی کا موڑ گھوما ہی تھا کہ اچانک سامنے سے سہراب نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔ اس کے تین غنڈے ساتھی بھی اس کے دائیں بائیں کھڑے کھا جانے والی نظروں سے شیر خان کو دیکھ رہے تھے۔ شیر خان بالکل نہ گھبرایا' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد شیر خان صرف شریف لوگوں سے ڈرتا تھا۔ بدکردار اور بدمعاش قسم کے لوگوں سے ڈرنا تو وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ ان کے لئے تو وہ ایک خونخوار شیر تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس نے اپنے ماضی کو جان بوجھ کر بھلایا ہوا تھا اور اپنی بیٹی کو اچھی سے اچھی تعلیم دینا چاہتا تھا۔ اب جو سہراب کو سامنے کھلے چاقو کے ساتھ دیکھا تو شیر خان کا سر پھرنے لگا۔ مگر اس نے اپنے حواس کو قابو میں کیے رکھا۔ سہراب کے ساتھی غنڈوں نے بھی چاقو نکال لئے۔

شیر خان نے بڑے تحمل سے پوچھا۔ "تم چاہتے کیا ہو؟" سہراب نے اپنی بھینسے ایسی گردن دائیں بائیں ہلاتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے ہو میں کیا چاہتا ہوں۔"

شیر خان نے جواب دیا: "اگر تم ٹکٹ بلیک کرنا چاہتے ہو تو اس کی میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا۔ کیونکہ یہ خلاف قانون بات ہے۔ اس میں مالک کا بھی نقصان ہے اور ملک کا بھی نقصان ہے اور یہ بات مجھے ہرگز گوارا نہیں ہے۔"

سہراب نے غراہٹ نما آواز میں کہا۔ "ایک بار پھر سوچ لو۔"

شیر خان نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: "سوچنے کی ضرورت ہی نہیں' میں تمہیں کسی حالت میں بھی ٹکٹ بلیک نہیں کرنے دوں گا۔"

شیر خان نے اس دوران ہر قسم کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس کے پاس اب کوئی ہتھیار تک نہیں تھا۔ مگر اس نے ہانگ کانگ کے اسمگلروں میں رہ کر ایک چینی اسمگلر سے کچھ ایسے داؤ پیچ سیکھ لئے تھے جو بڑے کارگر تھے اور اس قسم کے حالات میں شیر خان کے بڑے کام

آتے تھے۔ شیر خان کے آخری انکار پر سہراب کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ تینوں غنڈے چاقو لہراتے ہوئے شیر خان پر حملہ آور ہوئے۔ شیر خان نے دو قدم پیچھے ہٹ کر دو غنڈوں پر بیک وقت چینی اسمگلر کا داؤ استعمال کیا۔ ویسے بھی شیر خان ان سے طاقتور تھا۔ صرف تعداد میں وہ زیادہ تھے۔ دونوں غنڈوں کے ہاتھوں سے چاقو اچھل کر دور جا پڑے اور ان میں سے ایک کی شانے کی ہڈی اور دوسرے کی کلائی کی ہڈی دو ٹکڑے ہو چکی تھی اور دونوں زمین پر گرے کراہ رہے تھے۔ سہراب کی آنکھوں میں پہلے ہی خون اترا ہوا تھا اپنے ساتھیوں کی یہ حالت دیکھی تو غضبناک ہو کر چاقو سے شیر خان کے پیٹ کو ناف کے نیچے سے پھاڑنے کے لئے اس پر حملہ آور ہوا شیر خان تیزی سے ایک طرف ہٹا اور دوسرے لمحے اس نے سہراب کو اوندھے منہ نیچے گرا دیا اور چاقو اچھال کر دور پھینک کر کہا

"سہراب میں تمہیں قتل نہیں کروں گا۔" سہراب کا تیسرا ساتھی یہ معاملہ دیکھ کر اندھیری گلی میں غائب ہو گیا۔ شیر خان نے سہراب کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک بار پھر اسے ہدایت کی کہ وہ اس سے لڑائی جھگڑا کرنے کی کوشش نہ کرے۔

"میں شریف آدمی ہوں اور شریف انسان بن کر اپنے ملک میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

مگر سہراب یہ زبان نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے دل میں انتقام کی ایک ایسی آگ بھڑک اٹھی تھی کہ جس کو بجھانا کراچی کے سمندر کے بھی بس میں نہیں تھا۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے شیر خان کو دیکھا۔ اس کے حلق سے غراہٹ نما آواز نکلی۔

"تمہیں دیکھ لوں گا۔" اور یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

شیر خان نے کوارٹر میں آ کر سب سے پہلے اپنی پیاری ننھی سی بیٹی کو گود میں لے کر پیار کیا' پھر منہ ہاتھ دھو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ روبی نے بچی کو لٹا کر دودھ کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی اور شیر خان کے آگے کھانا رکھا۔ شیر خان نے باتوں ہی باتوں میں سہراب کے ساتھ لڑائی جھگڑے کا ذکر کیا اور کہا

"یہ لوگ مجھے میری گناہ آلود زندگی میں واپس لانا چاہتے ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں کرنا

چاہتا۔"

روبی تھوڑی سی فکر مند ضرور ہوئی وہ جانتی تھی کہ شیر خان کو اتنی آسانی سے بڑے سے بڑا غنڈہ بھی زیر نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود وہ پریشان ہوئی کہ شیر خان نہتا ہوتا ہے۔ وہ اپنے پاس چاقو تک بھی نہیں رکھتا اور اب وہ اس کی بچی کا باپ بھی ہے۔ اس کا زندہ رہنا بڑا ضروری ہے۔ لیکن وہ نہ تو خود جرائم آلود زندگی میں واپس آنا چاہتی تھی اور نہ یہ چاہتی تھی کہ شیر خان ایسی زندگی دوبارہ اختیار کرے کہنے لگی۔

"شیرے! تم پولیس میں رپورٹ درج کرا دو۔ پولیس خود سہراب سے نمٹ لے گی۔"

شیر خان نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔" میرا نہیں خیال کہ پولیس ایسا کرے۔ پولیس سے میں زیادہ پر امید نہیں ہوں۔ بہرحال تم کیوں فکر کرتی ہو شیر خان اپنے دشمنوں سے نمٹنا جانتا ہے۔" روبی نے بات کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"شیرے! ہم نے ابھی تک اپنی بچی کا کوئی نام نہیں رکھا۔ ساتھ کے کوارٹر والی مریم مجھے کہہ رہی تھی کہ بچی کا نام عائشہ رکھ دو۔ بڑا پیارا نام ہے مبارک بھی ہے۔ مگر میں نے تو پہلے ہی ایک نام سوچ رکھا ہے۔"

وہ کیا بتاؤ تو؟" شیر خان نے پانی پی کر گلاس فرش پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

روبی کہنے لگی۔"شیرے! تم جانتے ہو ہم نے کن حالات میں اپنی نوجوانی کا زمانہ گزارا ہے۔ کیسی کیسی مصیبتیں نہیں سہیں' دولت بھی کمائی دولت سے ایک پل میں محروم بھی ہوئے' برستی گولیوں میں بھاگے اور اپنی اسٹین گنوں کی بوچھاروں سے سنگاپور' ہانگ کانگ اور برما کی پولیس کو بھون کر بھی رکھ دیا۔ تم کبھی کبھی پیچھے رہ جایا کرتے تھے۔ لیکن میں ہمیشہ آگے ہی آگے رہی۔ اگر کوشش بھی کروں تو شمار نہیں کر سکتی کہ کتنے اسمگلروں' بدمعاشوں اور وہاں کے پولیس والوں کو ہلاک کر چکی ہوں۔ تم نے میرا نام شیرنی رکھ دیا تھا اور مجھے یہ نام پسند بھی تھا۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ میرے دل میں اپنی اس زندگی سے نفرت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ برائی آخر برائی ہوتی ہے۔ برا آدمی شریف آدمی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جو سکون اور سچی خوشی ایک شریف آدمی کو ہوتی ہے۔ وہ دنیا کے بڑے سے بڑے امیر سے امیر بدمعاش کے نصیب میں نہیں ہے۔ پھر میں نے دل ہی دل میں توبہ کر کے خدا سے

معافی مانگی۔ خدا نے میری توبہ قبول کر لی اور ہم دونوں کو جرائم کی دلدل سے نکال کر ایک ایسے نئے ملک میں پہنچا دیا جہاں ہم بالکل نئی نیک پاک زندگی کا آغاز کر سکتے تھے اور ہم نے ایسا ہی کیا۔ اب خدا نے ہمیں ایک پھول سی بچی بھی دے دی ہے۔ اب ہمارے پاس اللہ کی کونسی نعمت نہیں ہے؟ تم ہو میری بچی ہے۔ ایک ایسا وطن ہے جو اسلام کا قلعہ ہے "پاکستان" شیر خان خدا کی قسم یہ ملک ایک جنت ہے۔ میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے کہہ رہی ہوں یہ دنیا میں جنت ہے مگر اس جنت کو کچھ لوگ دوزخ بنانے کی ناپاک کوشش کر رہے ہیں۔ یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ ملک دشمن لوگ ہیں۔ یہ انسانیت اور پاکستان کی پیشانی کے بدنما داغ ہیں۔ ان جرائم پیشہ وطن دشمن لوگوں کو مٹانا وطن کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اسی طرح ہم اپنے وطن کو خوش حالی اور ترقی کی راہ پر ڈال سکتے ہیں۔" شیر خان کھانا کھا چکا تھا اور اب سگریٹ سلگا کر بڑے مزے سے کش لگاتے ہوئے روبی کو جوش و خروش سے بات کرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ بات کاٹ کر بولا۔

"آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ بات تو بچی کے نام رکھنے کی ہو رہی تھی۔" روبی نے سانس بھر کر کہا۔

"میں بھی وہی بات کر رہی ہوں، شیر خان! میں اپنی بچی کا نام شیرنی رکھوں گی۔"

شیر خان نے مسکرا کر کہا: "یہ تو تمہارا نام ہوا کرتا تھا کبھی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ ہمارے گھر میں پرانی تاریخ دہرائی جائے؟"

روبی نے شیر خان کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور گہری پرعزم آواز میں بولی: "نہیں شیر خان! وہ تاریخ اب کبھی نہیں دہرائی جائے گی۔ وہ کتاب ہم نے بند کر کے وہیں سیلون کے سمندر میں پھینک دی تھی۔ ہم ایک نئی تاریخ شروع کر چکے ہیں۔ ہماری بچی اس تاریخ کا پہلا باب رقم کرے گی۔ یہ حب الوطنی اپنے دین سے محبت خدا اور اس کے رسول سے محبت عزت و آبرو مندی سے محبت اور بلند تر انسانی کردار سے محبت کی تاریخ ہو گی۔ ہم اپنی بچی شیرنی کو بتائیں گے کہ دنیا میں عزت و غیرت سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ ہم اسے بتائیں گے کہ ایک دولت مند اپنی جان بچانے کے لئے دولت قربان کر دیتا ہے۔ لیکن ایک غیرت مند اپنی عزت بچانے کے واسطے اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے۔ ہماری بچی ایک

ایسی شیرنی ہو گی جو پاکستان کے دوست اور دشمن کو پہچانے گی۔ جو پاکستان کے دوست کی مدد کرے گی۔ لیکن پاکستان کے دشمن کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

شیر خان نے فرش پر سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا: "لیکن ہم اپنی بیٹی کا نام عائشہ بھی ضرور رکھیں گے۔" روبی نے اپنی بچی کا ماتھا چوم کر کہا: "یہ بڑا متبرک نام ہے، بچی کا نام عائشہ ہی ہو گا۔ لیکن ہم اسے شیرنی کے نام سے بھی پکارا کریں گے۔"

شیر خان چارپائی پر لیٹتے ہوئے بولا۔

"تم نے آج بڑی اچھی باتیں کی ہیں روبی! واقعی یہ ملک ایک جنت ہے، لوگوں کو ابھی شاید اس کا احساس نہیں ہے۔ جن لوگوں نے قربانیاں دی ہیں ان کو تو احساس ہے مگر ہمارے دشمن بھی تو ہیں جو اس وطن کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھنا چاہتے۔"

روبی نے کہا: "یہ وہی لوگ ہیں شیر خان، جو ہماری عزت کے دشمن ہیں اور میں اپنی بچی کو اپنی شیرنی کو یہی تعلیم دینا چاہتی ہوں۔ یہی سکھانا چاہتی ہوں، یہی کہنا چاہتی ہوں کہ تمہاری عزت کا دشمن تمہارا ہی نہیں اس ملک کا، اس ساری کائنات کا دشمن ہے۔ سب کے ساتھ نرم دلی سے پیش آنا لیکن عزت کے دشمن کو کبھی زندہ نہ چھوڑنا۔ بے شک خود بھی مر جانا لیکن اپنی عزت پر حملہ کرنے والے کا بھی سینہ گولیوں سے چھلنی کر دینا۔" روبی نے ایک بار پھر اپنی بچی کا منہ چوم لیا اور مسکرا کر بولی: "میں اسے خود دشمن پر گولی چلانا سکھاؤں گی۔" پھر وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ چہرے پر ایک عجیب سی آسمانی کیفیت چھا گئی۔ شیر خان کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"شیرے! اگر میں پہلے مر گئی تو وعدہ کرو کہ جیسا میں نے کہا ہے تم ویسے ہی میری عائشہ کی، میری شیرنی کی پرورش کرو گے۔" اس نے لیٹے ہوئے شیر خان کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"وعدہ کرو .... وعدہ کرو، خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرو کہ تم میرے بعد میری بچی کو شیرنی بناؤ گے، ایسی شیرنی جو عزتوں پر ڈاکہ ڈالنے والوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دے گی، وعدہ کرو شیر خان!"

شیر خان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ خود بھی جوش میں آ گیا تھا، باتیں ہی ایسی ہو رہی تھیں اور

یہ سچی باتیں تھیں۔ اس نے روبی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں روبی۔" پھر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر بولا۔" خدا سے زندگی مانگو روبی انشاء اللہ ہم اکٹھے مل کر اپنی بچی کو بہادر اور غیور شیرنی بنائیں گے۔ جو اپنی، ہماری اور اپنے وطن پاکستان کی عزت وقار اور سلامتی کی حفاظت کرے گی۔" دونوں اپنی بچی پر جھک کر اسے دیکھنے لگے جو دودھ پینے کے بعد بڑے سکون کے ساتھ گہری نیند سو رہی تھی، یہ معصوم بچی عائشہ تھی جسے آگے چل کر شیرنی بننا تھا۔

سہراب بدمعاش نے شیر خان کو جو دھمکی دی تھی اس کے بارے میں روبی کسی وقت پریشان سی ہو جاتی۔ ایک بار اس نے اپنی پریشانی کا ذکر شیر خان سے کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

"ارے اس کی تم فکر نہ کرو سہراب کا دماغ ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب وہ ہمارے سینما میں بلیک نہیں کرواتا۔ کبھی ملتا ہے علیک سلیک بھی کر لیتا ہے۔"

روبی نے فکر مند ہو کر کہا "کہیں یہ بھی اس کی کوئی چال نہ ہو، تم ہوشیار رہنا اور ہاں رات کو جلدی گھر آجایا کرو۔"

شیر خان نے کہا "آخر شو کی بکنگ کا حساب کتاب کر کے ہی آنا ہوتا ہے، رات کے گیارہ تو ضرور بج جاتے ہیں۔"

اس گفتگو کے دس پندرہ روز بعد کا ذکر ہے۔ رات کے دس بجے کا وقت ہو گا۔ شیر خان سنیما میں ہی تھا۔ آخری شو شروع کروانے کے بعد وہ بکنگ پر ٹکٹوں کی سیل کا حساب لکھ رہا تھا۔ گھر میں روبی اس کا کھانا الگ رکھ کر اپنی بچی کو دودھ پلا کر سلا رہی تھی۔ جب بچی سو گئی تو اس نے اُسے چارپائی پر ڈال دیا۔ دیوار کے ساتھ لگے شیشے کے ٹکڑے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بالوں میں ذرا سی کنگھی پھیری اور شیر خان کے بستر کو درست کرنے لگی۔ اتنے میں باہر گلی میں کسی گاڑی کے کھڑی ہونے کی آواز آئی، چادر بچھاتے ہوئے ایک پل کے لئے روبی کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ یہ گاڑی کس کی ہے؟ باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ساتھ ہی مردانہ آواز آئی۔

"بہن جی! چاول اندر رکھوا لو شیر خان نے بھیجے ہیں۔"

روبی نے دروازے کا ایک پٹ کھول کر دیکھا کہ کوارٹر کے آگے ایک جیپ گاڑی

کھڑی تھی۔ ایک آدمی نے کمر پر بوری اٹھا رکھی تھی۔ بوجھ کی وجہ سے وہ ہانپ رہا تھا۔

"بہن جی! ساڑھے تین من چاول ہیں، میرا دم نکلا جا رہا ہے۔ آگے سے ہٹ جائیں، بتاؤ اسے کہاں رکھنا ہے۔" روبی ایک طرف ہٹ گئی، وہ آدمی بوری کمر پر اٹھائے کمرے میں داخل ہو گیا۔

روبی نے کہا "کونے میں رکھ دو۔ یہ کہاں سے آئے ہیں چاول؟" آدمی نے بے نیازی سے کہا "کہا نا شیر خان نے سینما سے بھیجے ہیں، پنجاب سے بیس بوریاں چاول کی لایا تھا، ساری بک گئیں، ایک بوری رہ گئی تھی وہ شیر خان نے خرید لی۔ بولا اسے گھر بھی پہنچا دو۔ اپنا شاگرد اس نے ساتھ بھیجا ہے۔"

روبی نے باہر گلی میں کھڑی جیپ پر نظر ڈالی اور پوچھا۔ کہاں ہے شاگرد؟"

وہ آدمی بوری کونے میں ڈال کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور صافے سے منہ پونچھتے ہوئے بولا۔ "یہ کم بخت گاڑی میں ہی بیٹھا ہے۔" پھر اس نے آواز دی۔ "باہر آجا چھوٹے، بی بی جی بلاتی ہیں۔" "ساتھ ہی روبی سے مخاطب ہو کر بڑی لجاجت سے بولا۔" بہن جی! تھوڑا پانی مل جائے گا پینے کو۔"

ہاں ہاں یہ کہہ کر روبی گلاس اٹھا کر مٹکے کی طرف بڑھی، وہ مٹکے سے پانی نکال ہی رہی تھی کہ اس کے سر کے پچھلے حصے پر کسی بھاری شے کی ضرب لگی، روبی گر پڑی، جو شخص چاولوں کی بوری لایا تھا، یہ ضرب اس نے ایک تھیلی مار کر لگائی تھی۔ جس میں سکہ بھرا ہوا تھا۔ جونہی روبی گری اس شخص نے جیب سے کلوروفارم میں بھگویا ہوا گیلا، رومال نکالا اور روبی کے ناک اور منہ کے ساتھ لگا دیا، روبی مکمل طور پر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دو آدمی اندر آگئے جن کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ شیر خان کی بیوی بے ہوش ہو چکی ہے تو انہوں نے چاقو جیب میں ڈالے بے ہوش روبی کو بڑی تیزی کے ساتھ اٹھایا جیپ دروازے کے سامنے ہی کھڑی تھی رات کے وقت گلی بالکل سنسان تھی۔ روبی کو جیپ میں ڈال کر آگے ترپال کا پردہ گرایا۔ ایک آدمی پہلے ہی سے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور تھوڑی دیر بعد یہ جیپ کراچی شہر کی جگمگاتی روشنیوں کو پیچھے چھوڑ کر ویران علاقے کی طرف پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

اس واردات کے کوئی پندرہ منٹ بعد شیر خان سینما میں کام ختم کر کے واپس آگیا کوارٹر کے قریب آتے ہی اسے بچی کے رونے کی آواز سنائی دی' بچی مسلسل روئے جا رہی تھی' شیر خان کے قدم تیز ہو گئے۔ یہ روبی کہاں ہے؟ اسے خیال ہی نہیں کہ بچی بلک رہی ہے۔ شیر خان نے بند دروازے پر زور سے دستک دی کسی نے دروازہ نہیں کھولا' بچی کے رونے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ شیر خان نے زیادہ زور سے دروازہ پر ہاتھ مارا تو اس کا ایک پٹ اپنے آپ کھل گیا۔ شیر خان کا دل کسی خطرے سے دھڑک اٹھا۔ وہ عجلت سے اندر داخل ہو گیا' روبی وہاں نہیں تھی۔ بچی چارپائی پر لیٹی رو رہی تھی۔ ایک ہی کمرے کا مکان تھا۔ روبی کہاں گئی تھی؟ رات کے وقت تو وہ کسی ہمسائے کے گھر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ شیر خان نے جلدی سے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا پانی کے مٹکے کے پاس تانبے کا کٹورہ فرش پر گرا پڑا تھا۔ کمرے کی فضا میں ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی' کونے میں بوری پڑی تھی۔ یہ بوری اس سے پہلے وہاں نہیں تھی۔ شیر خان نے جھک کر بوری کا منہ کھولا۔ یہ چاولوں کی بوری تھی۔ شیر خان کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا کہ وہاں تھوڑی دیر پہلے کچھ ہو چکا ہے۔ بچی باپ کے سینے سے لگتے ہی چپ ہو گئی تھی۔ شیر خان نے جلدی سے اسے چارپائی پر لٹایا' اس کے منہ میں چوسنی دی اور لپک کر سامنے والے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سامنے نور الٰہی گاڑی بان رہتا تھا۔ وہ باہر آ گیا۔

"کیا بات ہے بیٹا تم پریشان لگتے ہو؟" نور الٰہی نے صدری کا بٹن بند کرتے ہوئے پوچھا۔

شیر خان نے پوچھا:"میری بیوی آپ کے ہاں تو نہیں آئی۔"

نور الٰہی نے نفی میں سر ہلا دیا:"نہیں بیٹا! وہ ہمارے ہاں تو نہیں آئی۔ کیوں کیا بات ہے' خیریت تو ہے؟"

شیر خان دوسرے مکان کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ روبی ساتھ والے مکان میں بھی نہیں تھی۔ روبی گلی کے کسی مکان میں بھی نہیں تھی۔ ساتھ والے ہمسائے کی بیوی نے بتایا

"میں نے گلی میں تھوڑی دیر پہلے ایک گاڑی کی آواز سنی تھی۔"

شیر خان نے اس عورت کی طرف چونک کر دیکھا۔ "گاڑی کی آواز؟"

"ہاں۔" عورت بولی۔ "گاڑی کی آواز کچھ دیر کے لئے بند ہو گئی۔ پھر اس کے چلنے کی آواز آئی اور گلی سے دور جا کر غائب ہو گئی۔ میں اس وقت بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔" شیر خان کو چاولوں کی بوری کا خیال آ گیا۔ اسے نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ کوئی آدمی چاول کی بوری گھر پہنچانے کے بہانے آیا اور پھر روبی کو اغوا کر کے لے گیا۔ اس نے روبی کو ضرور بے ہوش کیا ہو گا۔ کمرے میں جو تیز بو پھیلی ہوئی تھی وہ بے ہوش کرنے والی دوائی کی ہی ہو سکتی تھی۔ یہ کام سراب ہی کر سکتا ہے۔ شیر خان کا دماغ تیزی سے واقعات کے تانے بانے جوڑ رہا تھا۔ پھر اس نے ہمسائی مریم سے کہا۔

"بہن! میری بچی کا خیال رکھنا۔ میں تھانے رپورٹ کرنے جا رہا ہوں۔ کسی نے میری بیوی کو اغوا کر لیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دوڑتا ہوا گلی سے نکل کر سڑک پر آیا۔ وہاں ایک خالی رکشے پر بیٹھا اور سیدھا علاقے کے تھانے میں آ گیا۔ اس نے آتے ہی محرر سے کہا۔

"جناب میرا نام شیر خان ہے۔ میری بیوی کو سراب بدمعاش کے آدمیوں نے ابھی اغوا کر لیا ہے۔" پھر اس نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ سپاہی نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ تمہاری بیوی کو سراب غنڈے نے ہی اغوا کیا ہے؟"

شیر خان نے کہا:"جناب کچھ روز پہلے میں نے اسے اپنے سینما گھر میں ٹکٹ بلیک کرنے سے روکا تھا۔ ہمارا جھگڑا بھی ہوا تھا۔ سراب نے مجھ سے بدلہ لینے کی دھمکی دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اسی نے میری بیوی کو اغوا کیا ہے۔ جلدی سے پولیس میرے ساتھ بھیجیں۔ وہ ابھی اپنے ڈیرے پر ہی ہو گا۔"

پولیس عام طور پر اتنی جلدی کارروائی نہیں کرتی مگر اس تھانے کا انچارج ایک فرض

شناس سب انسپکٹر تھا۔ اس نے فوراً جیپ باہر نکالی۔ شیر خان کو اپنے ساتھ بٹھایا چار سپاہی ساتھ لیے اور سہراب غنڈے کے ڈیرے کی طرف جیپ روانہ ہو گئی۔ سہراب کے ڈیرے کا شیر خان کے علاوہ سب انسپکٹر کو بھی علم تھا۔ یہ ڈیرہ ایک غریب واڑے میں تھا۔ ڈیرہ بالکل خالی پڑا تھا۔ صرف ایک بوڑھا آدمی چارپائی پر سو رہا تھا۔ پولیس نے اسے جگا کر سہراب کے بارے میں پوچھا۔ بوڑھا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا پولیس کے سپاہی دیکھے تو ذرا گھبرایا۔ سب انسپکٹر نے پوچھا سہراب کہاں ہے؟ بوڑھے نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"حضور سہراب دن کو آیا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کر کے چلا گیا۔ دوسرے آدمی بھی اس کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔ تب سے اب تک وہ نہیں آیا۔"

سب انسپکٹر پولیس نے بوڑھے سے سہراب کے دوسرے ٹھکانوں کے بارے میں دریافت کیا۔ بوڑھے نے کہا۔

"حضورا میں تو سارا دن اسی ڈیرے پر پڑا رہتا ہوں۔ اس کے اور ٹھکانے بالکل نہیں جانتا۔"

پولیس وہاں سے نکل کر ایک دوسرے ڈیرے پر گئی وہاں سے بھی سہراب کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ سب انسپکٹر نے شیر خان کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

"اگر اسی نے تمہاری بیوی کو اغوا کیا ہے تو پھر اسے کسی ایسے ٹھکانے پر لے گیا ہے جس کی ہمیں بھی خبر نہیں ہے۔ مگر میں پولیس کے ذریعے سارے علاقے کی ناکہ بندی کرائے دیتا ہوں۔ میں یہی کچھ کر سکتا ہوں۔ تم گھبراؤ مت۔ پولیس صبح ہونے سے پہلے تمہاری بیوی کو ضرور ڈھونڈ نکالے گی اور مجرموں کو بھی گرفتار کر لے گی۔"

شیر خان نے سر تھام لیا۔ وہ کیا جواب دے سکتا تھا۔ اسے پیچھے اپنی بچی کا بھی خیال لگا ہوا تھا۔ اس سب انسپکٹر نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور اس کی گلی کے باہر گاڑی روک کر شیر خان کو ایک بار پھر تسلی دی اور کہا کہ "مجرم بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ تمہاری بیوی کو ہم صبح تک برآمد کر لیں گے تم فکر نہ کرو۔"

شیر خان سر جھکائے وہاں سے چل دیا۔ پولیس کی جیپ بھی آگے روانہ ہو گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کی بچی گہری نیند سو رہی تھی۔ ہمسائی مریم اور جمیلہ دونوں چارپائی پر

بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ شیر خان کو دیکھا تو پوچھا

"کچھ پتا چلا بیٹا؟"

شیر خان نے ناامیدی سے سر کو نفی میں ہلایا۔ پھر ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر دونوں عورتیں چلی گئیں۔ شیر خان نے دروازہ بند کر دیا اور اس چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا جہاں اس کی بچی سو رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ چوکی کے پاس انگیٹھی پر سالن کی دیگچی پڑی تھی اس کے اوپر روٹیوں والی چنگیر رکھی ہوئی تھی۔ روبی نے شیر خان کے لئے کھانا روز کی طرح تیار کر رکھا تھا۔ مگر آج شیر خان کو بالکل بھوک نہیں تھی۔ اس کے اندر ایک ہیجان سا بپا تھا۔ وہ چارپائی پر زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا اٹھ کر دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ کھول کر باہر سنسان گلی میں ایک نگاہ ڈالی۔ دروازہ بند کر دیا۔ چاولوں کی بوری کے پاس آیا ہتھیلیوں کو زور زور سے مسلتا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ روبی کو کہاں تلاش کرے سہراب کے سوا دوسرا کوئی آدمی یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ مگر وہ غائب تھا۔ پولیس کیا اسے تلاش کر سکے گی؟ سب انسپکٹر فرض شناس افسر ہے۔ مگر سہراب اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ کیا روبی ان بدکردار غنڈوں سے اپنی عصمت بچا سکے گی؟ انہوں نے تو اسے بے ہوش کر دیا ہے۔ اسے ہوش آئے گا تو اس پر کیا گزرے گی؟ وہ اگر ان غنڈوں کو ہلاک نہ کر سکی تو اپنے آپ کو مار لے گی وہ رسوا ہو کر شیر خان کے پاس کبھی نہیں آئے گی۔ شیر خان کے ذہن میں خیالات کا طوفان مچا تھا۔ چارپائی پر سوئی ہوئی بچی نے اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال رکھی تھی۔ وہ اسے اکیلی چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔

سہراب اور اس کے تین ساتھی غنڈے روبی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ روبی کو انہوں نے چارپائی پر لٹا رکھا تھا۔ سہراب پستول ہاتھ میں لئے اس کے پاس اسٹول پر بیٹھا تھا۔ ایک آدمی روبی کے منہ پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ ایک غنڈہ سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تصویریں اتارنے والا کیمرہ تھا۔ وہ اس کے ساتھ فلیش گن لگا رہا تھا۔ سہراب نے پوچھا۔

"اچھی طرح چیک کر لیا ہے نا؟" غنڈہ نے کہا

"بالکل کر لیا ہے۔" تیسرے غنڈے نے بوتل میں سے شراب گلاسوں میں ڈالی اور

ب کو ایک ایک گلاس دے دیا۔ سہراب نے گھونٹ بھر کر کہا

"ایسی ایسی تصویریں اتاروں گا اس کی کہ شیر خان ساری زندگی یاد رکھے گا۔ اب دیکھوں گا وہ کیسے ہمیں بلیک نہیں کرنے دے گا؟" کیمرے والے غنڈے نے ہنس کر کہا

"دادا! اب تو اس کا باپ بھی انکار نہیں کرے گا۔ بلکہ ہم اس سے ٹیکس بھی لیا کریں گے۔ غنڈہ ٹیکس اور چاروں غنڈے کھل کھلا کر ہنس دیئے کمرے کی فضا شراب اور سگریٹوں کی بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ یہ جگہ کراچی شہر سے دور ساحل سمندر پر ایک ویران مقام پر واقع تھی۔ سہراب نے اپنے خفیہ اڈے کے بارے میں سوائے اپنے تین ساتھیوں کے کسی اور کو نہیں بتایا تھا۔ یہاں وہ خاص واردات کے بعد آکر چھپ جایا کرتا تھا ایک غنڈے نے سہراب سے کہا

"استاد! تصویروں کی فلم تو ہمارے پاس ہی رہے گی نا؟"

اس پر سہراب نے ام الخبائث یعنی شراب کا دوسرا جام چڑھاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا فلم میں اپنے دشمن کو دے دوں گا؟ اس کو تو تصویروں کے پرنٹ ہی دکھاؤں گا۔ بلکہ اس کو دے دوں گا تاکہ وہ سمجھ لے کہ سہراب کے ساتھ دشمنی رکھنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔" دوسرے غنڈے نے اپنا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔

"استاد! میری بھی تصویر بناؤ گے نا؟"

"کیوں نہیں۔" سہراب نے جھوم کر کہا۔ "تم سب کی تصویریں بناؤں گا۔" پھر اس نے کیمرے والے غنڈے کی طرف دیکھا۔ "کیوں بے؟" اس کا فلیش چلتا ہے ناں؟"

"برابر چلتا ہے دادا۔" یہ کہہ کر غنڈے نے بٹن دبایا۔۔۔۔ فلیش گن کی چمک نے ایک پل کے لئے سب کی آنکھیں چندھیا دیں۔ جو غنڈہ روبی کے سرہانے بیٹھا پانی کے چھینٹے مار رہا تھا بولا۔

"دادا! اسے ہوش آرہا ہے۔"

سہراب نے کہا۔"اس کے دونوں پاؤں باندھ دو۔" اسی وقت روبی کے دونوں پاؤں چارپائی کی پائینتی کے ساتھ باندھ دیے گئے۔ کلوروفارم کا اثر ختم ہوگیا تھا۔ روبی نے آنکھیں کھول دیں سب سے پہلے اس کی نظر سہراب پر پڑی جس کے ہاتھ میں پستول اور

دوسرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

سہراب بولا۔"میرا نام سہراب ہے۔ تم نے مجھے پہلے نہیں دیکھا ہے۔ اب اچھی طرح سے دیکھ لو گی۔ تمہارے خاوند نے مجھے چیلنج کیا ہے۔ میں اسے اس کا جواب دے رہا ہوں۔ میں تمہیں قتل بھی کر سکتا تھا۔ مگر قتل نہیں کروں گا۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری کچھ تصاویر اتروا کر تمہارے خاوند کو بھیجوں گا۔ جن کو دیکھ کر وہ اپنے آپ میرے قدموں پر آن گرے گا۔ تمہاری یہ تصویریں میں تمہاری بے ہوشی کی حالت میں بھی اتار سکتا تھا...... لیکن نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ تم ہوش میں آجاؤ تاکہ تمہارا خاوند نقلی شیر خان کو معلوم ہو جائے کہ جب تمہاری تصویریں اتاری گئی تھیں تو تم اپنے ہوش و حواس میں تھیں۔ اور تم نے اپنی مرضی سے یہ تصویریں اتروائی ہیں۔" وہ مکروہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

روبی کا سر کلوروفارم کے اثر سے ابھی تک بوجھل سا تھا۔ اس نے دوسرے غنڈوں کو دیکھا کمرے کا جائزہ لیا۔ اس غنڈے کو بھی دیکھا جس کے ہاتھ میں فلیش گن والا کیمرہ تھا۔ اسے بہت جلد محسوس ہو گیا کہ اس کے دونوں پاؤں پائینتی سے بندھے ہوئے ہیں ساری واردات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ایک آدمی چاولوں کی بوری دینے کے بہانے گھر میں آیا۔ پھر اس نے اس کے سر پر ضرب لگائی اور بعد میں یقیناً اسے کچھ سونگھایا گیا تھا۔ روبی نے بے ہوش ہونے سے پہلے اپنے منہ اور ناک پر گیلے رومال کو محسوس کیا تھا۔ اس کے بازو کھلے تھے ۔ اسے اپنی بچی اور شیر خان کا خیال آنے لگا۔ اس کے بعد بچی گھر میں اکیلی رہ گئی ہو گی۔ شیر خان نے آکر گھر میں بچی کو اکیلے دیکھا ہو گا تو اس پر کیا گزری ہو گی؟ وہ ضرور سمجھ گیا ہو گا کہ سہراب نے اس کی بیوی کو اغوا کیا ہے۔ لیکن کیا وہ اس کی تلاش میں آئے گا؟ مگر خدا جانے یہ کون سا ویران مقام ہے۔

یا اللہ! میری عزت و آبرو کا تو ہی محافظ ہے۔ اس دعا کے ساتھ ہی روبی کو اس حقیقت کا شدت سے احساس بھی ہو گیا تھا کہ اگر اس نے خود اپنی مدد نہ کی تو اس کی مدد کو کوئی نہیں پہنچے گا۔ وہ خطرناک مرحلہ آگیا تھا۔ جس سے روبی ابھی تک اپنے آپ کو بچا رہی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کے چہرے پر ذلت و رسوائی کا ایک ایسا داغ لگایا جانے والا ہے جس کو شیر خان اس کی بیٹی عائشہ اور ان کی آنے والی نسلیں بھی نہ دھو سکیں گی اس کو

صرف بے آبرو ہی نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی عفت کی دھجیاں تار تار کر کے ملک کے کونے کونے میں بکھیر دی جائیں گی۔ یہ وہ موت تھی جس کا سامنا کرتے ہوئے موت بھی شرم سے سر جھکا دے۔ یہ ایک روبی کی نہیں اس کی آنے والی نسلوں کی موت تھی۔ موت اس کے لئے ایک بہت چھوٹا لفظ تھا۔ روبی نے جرائم پیشہ لوگوں کے درمیان زندگی کا بہت بڑا حصہ ضرور گزارا تھا۔ مگر اس نے اپنے دامن عفت پر کبھی کوئی داغ نہیں لگنے دیا تھا۔ یہ صرف روبی اور اس کا خدا جانتا تھا کسی کو شاید ہی یقین آتا کہ دریا میں رہ کر اس نے کئی مگرمچھوں سے دشمنی مول لی تھی اور سینکڑوں مگرمچھوں کے پیٹ چاک کئے تھے۔ صرف پاک دامنی اور عصمت کے تحفظ کا جذبہ ہی تھا جس نے روبی کو گناہ کے ماحول میں بھی زندہ رہنے دلیری سے زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کیا ہوا تھا۔ اس کے پاس سوائے اپنی عزت اور عفت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

شیر خان پہلا نوجوان تھا جس کو یہ انمول موتی سونپ کر روبی نے شیر خان کی عزت کو بھی اس میں شامل کر لیا تھا۔ اب اس کی زندگی سے دو نسلوں کی دو خاندانوں کی عزتیں وابستہ تھیں۔ اسے حشر کے میدان میں اللہ کے حضور اس امانت کو واپس کر کے سرخرو ہونا تھا۔ وقت آگیا تھا کہ وہ اس امانت میں خیانت نہ ہونے دے اور اپنی جان کی قربانی دے کر اسے روز حشر تک کے لئے محفوظ کر لے۔ لیکن اپنی جان قربان کرنے سے پہلے وہ ان جرائم پیشہ درندہ صفت لوگوں سے اپنے پیارے وطن کی دوسری عورتوں کی ناموس کو بھی ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لینا چاہتی تھی۔ ایک نئی بجلی روبی کے سینے میں کوند گئی' ایک نیا قہر اس کے ذہن میں بیدار ہو گیا' اسے وطن پاک کی فضاؤں کو ان درندوں سے پاک کرنا ہے اور گھر گھر امن و آشتی کے چراغ روشن کرنے ہیں۔

یہ سارے خیالات' یہ ساری سوچ بجلی کے کرنٹ کی ایک لہر کی طرح اس کے دل و دماغ سے گزر گئی تھی۔ جس شیرنی کو اس نے پاکستان کی سرزمین میں داخل ہوتے ہی زنجیر ڈال دی تھی۔ اب اس نے اس کی زنجیر کو کھول دیا تھا اور شیرنی کا رخ پاکستان کے امن دشمن تخریب کاروں اور ملک دشمن عادی جرائم پیشہ مجرموں کی طرف پھیر دیا تھا۔ اب اس کی زندگی وطن پاک کو جنت ارضی اور امن کی سرزمین بنانے کے لئے وقف تھی اب اس

کی زندگی ایک مسلسل جنگ تھی۔ ایک مسلسل جہاد تھا۔ شیطانی قوتوں کے خلاف وطن کی ترقی و خوش حالی کی راہ میں حائل تخریبی عناصر کے خلاف اور معصوم بے گناہ عورتوں کی عزتوں سے کھیلنے والے درندہ صفت انسانوں کے خلاف جہاد' مسلسل جنگ مسلسل جہاد روبی کو اپنی رگ رگ میں بجلیاں تڑپتی محسوس ہوئیں۔ اس کی آنکھوں میں وہی قہر اتر آیا جو کبھی برما' سیلون اور سنگاپور کے جنگلوں میں اپنے دشمنوں کو مشین گن کا نشانہ بناتے ہوئے اتر آیا کرتا تھا اور اس کی انگلی ٹریگر پر مسلسل دبی رہتی اور گولیوں کی بوچھار میں خونی قاتلوں کے لاشے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہوتے جاتے تھے۔

اب کی بار روبی نے آنکھیں کھول کر اپنے دائیں بائیں آمنے سامنے چاروں درندوں کو دیکھا تو وہ کسی اور ہی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ یہ اس روبی کی نگاہیں نہیں تھیں جس کو سہراب کے غنڈے ایک امن پسند شریف اور غریب گھر سے اغوا کر کے لے آئے تھے۔ یہ اس شیرنی کی نگاہیں تھیں جس نے سرسبز شاداب جنگل کا امن برباد کرنے والے حقیقی دشمن کو پہچان لیا تھا۔ شخصیت کو یکسر بدل دینے والی سوچ کا یہ دھارا ایک سیکنڈ میں روبی کے ذہن سے گزر گیا تھا۔

روبی نے سب سے پہلے اس بات کا جائزہ لیا کہ پستول کس کس کے پاس ہے۔ پستول صرف سہراب کے پاس تھا اور اسے بھی اس نے قریب ہی اسٹول پر رکھا ہوا تھا جہاں اس کا گلاس پڑا تھا۔ ایک غنڈہ روبی کے پاؤں چارپائی کی پائینتی سے باندھ کر ابھی ابھی فارغ ہوا تھا۔ سامنے والا غنڈہ اپنے کیمرے کی شست درست کر رہا تھا۔ تیسرا غنڈہ اس کے بائیں جانب بیٹھا ہوا تھا اور اس نے روبی کے بالوں کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا تھا۔ سہراب جھومتا ہوا اسٹول پر سے اٹھا اور گالی دے کر بولا۔

"کون سی ماں کا انتظار کر رہے ہو؟ پہلی تصویر کے لئے جہاں کیمرہ رکھنا ہے رکھ کر بیٹھ جاؤ۔" کیمرے والا غنڈہ شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ تیزی سے روبی کے پہلو میں آگیا اور کیمرے کے ساتھ ایک آنکھ لگا کر بولا۔

"چلو استاد میں تیار ہوں۔"

سہراب نے اس غنڈے کو پیچھے جھٹک دیا جس نے روبی کے بال پکڑ رکھے تھے پھر خود

ہی روبی کے بال پکڑ لئے تھے۔ پھر روبی کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

"میری جان تم اس بنک کلرک کے پاس کیوں اپنی جوانی برباد کر رہی ہو ہمارے پاس آجاؤ۔ ہم تمہیں عیش کرائیں گے۔" اس کا ہاتھ روبی کے بالوں سے پھسلتا ہوا اس کی گردن پر آیا تو روبی نے ذرا سا مسکرا کر کہا۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری مرضی کے مطابق تصویریں بنواؤں تو میرے پاؤں کھول دو میں کہیں بھاگ کر تو جا نہیں سکتی۔" سہراب کو چڑھی ہوئی تھی۔ وہ روبی کو رضا مند دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس نے حکم دیا۔

"اس کے پاؤں کھول دو۔" روبی کے پاؤں کھول دیئے گئے وہ اب آزاد تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ پستول ابھی تک اسٹول پر ہی پڑا ہے۔ وہ چارپائی سے اٹھنے لگی تو سہراب نے اسے بازو سے پکڑ کر دوبارہ لٹا دیا۔

"اونہوں، ابھی اٹھنا نہیں میری جان، تیری میری پہلی تصویر ایسے ہی بنے گی۔" پھر اس نے کیمرے والے غنڈے کو چلا کر حکم دیا کہ فوکس کرو۔ سہراب نے دست درازی شروع کر دی۔ روبی کا کاؤنٹ ڈاؤن ختم ہو چکا تھا۔ ایک کے بعد صفر کا ہندسہ آگیا تھا۔

روبی کے جسم میں بجلی چمکی۔ اس نے اپنا بایاں بازو سہراب کی ٹھوڑی کے نیچے نرخرے پر مارا ضرب اتنی اچانک اور اتنی شدید تھی کہ سہراب ایک بار تو پیچھے گر پڑا مگر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے غنڈے بھی روبی کو قابو کرنے کے لئے اس کی طرف لپکے مگر اتنی دیر میں پستول روبی کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ اب اس نے کچھ نہیں دیکھا کہ اس کے سامنے کون ہے۔ پستول کی نالی سے شعلے لپک رہے تھے۔ فائر ہو رہے تھے دھماکے ہو رہے تھے۔ ایک گولی سہراب کی گردن میں لگی ایک اس غنڈے کے پیٹ میں سے نکل گئی جس کے ہاتھ میں انسانیت سوز تصویریں اتارنے والا کیمرہ تھا۔ تیسری گولی پائینتی کی طرف سے روبی پر جھکے ہوئے غنڈے کی آنکھ میں لگی اور کھوپڑی کو چیرتی ہوئی پیچھے سے نکل گئی۔ چوتھے غنڈے نے پستول نکالنے کے لئے گھبرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ روبی کے پستول کی نالی نے ایک اور شعلہ اگلا اور یہ غنڈہ بھی دہرا ہو کر وہیں گر پڑا۔ جس کے پیٹ میں گولی لگی تھی وہ اٹھا لڑکھڑایا اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ روبی نے فائر کیا مگر پستول کی گولیاں

ختم ہو چکی تھیں۔ غنڈے نے چاقو کا وار کیا لیکن روبی کے پاس چینی استادوں کے سیکھے ہوئے ابھی بہت سے داؤ خالی تھے اور پھر یہ کیمرے والا غنڈہ شدید زخمی بھی تھا۔ اس کے پیٹ سے خون ابل رہا تھا، روبی ایک طرف ہٹ گئی۔ غنڈہ اپنے ہی بوجھ سے آگے گرا، سہراب شدید زخمی تھا اور گردن سے خون کا پرنالہ بہہ رہا تھا۔ روبی نے لپک کر چارپائی کے پائینتی کے پاس ڈھیر غنڈے کی جیب سے دوسرا پستول نکال لیا یہ ریوالور تھا۔ اس نے ان زخمی غنڈوں کا بڑے اطمینان سے جائزہ لیا صرف وہ غنڈہ جہنم رسید ہو چکا تھا جس کی آنکھ میں گولی لگی تھی۔ باقی ابھی زندہ تھے۔ روبی سب سے پہلے سہراب کے پاس آئی اس نے کھڑے کھڑے سہراب کے سر میں گولی مار دی۔ پھر وہ باری باری دونوں زخمی غنڈوں کے پاس گئی اور ایک ایک گولی ان کی کھوپڑیوں میں بھی اتار دی جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ چاروں کے چاروں سانپ، انسانیت کے دشمن اور قدم قدم پر قانون شکنی کرنے والے عادی مجرم مر چکے ہیں تو اس نے فرش پر گرا ہوا کیمرا اٹھا کر کھولا اس قسم کے بلکہ اس سے اعلیٰ قسم کے کیمرے وہ ہانگ کانگ، برما اور سیلون میں دیکھ چکی تھی اور استعمال بھی کر چکی تھی۔

روبی نے کیمرے سے فلم نکال کر چارپائی کے اوپر رکھ دی۔ چاروں غنڈوں کی لاشوں کو بھی گھسیٹ گھسیٹ کر چارپائی کے آس پاس ڈال دیا۔ مٹی کے تیل کا لیمپ روشن تھا۔ اس کا تیل لاشوں اور چارپائی پر انڈیلا لالٹین چارپائی پر پھینک دی مٹی کے تیل نے ایک دم آگ پکڑ لی روبی دروازہ کھول کر کوٹھری سے باہر آگئی باہر آکر اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ وہ تھوڑی دور کھڑی ہو کر کوٹھری کے واحد روشندان کو تکنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد روشندان میں سے دھواں نکلنے لگا۔ روبی نے ریوالور کو کھول کر میگزین دیکھا۔ ریوالور میں ابھی گولیاں تھیں۔ اس نے ریوالور قمیص کے اندر چھپا دیا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔

کراچی کے خاموش پرسکون آسمان پر بے شمار ستارے جھلملا رہے تھے۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ روبی کو خیال آیا کہ ان غنڈوں کی کوئی نہ کوئی گاڑی یہاں ضرور ہو گی۔ کوٹھری کے آگے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ عقب میں گئی تو وہاں ایک جیب کھڑی تھی۔

جس کے چاروں طرف موم جامے کی ترپال پڑی تھی۔ روبی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر
سیلف دبایا تو انجن اسٹارٹ ہو گیا وہ جیپ کو کوٹھری کے دروازے کی طرف لے آئی۔ اس
کی نگاہیں اپنے آپ روشندان کی طرف اٹھ گئیں۔ روشندان میں سے گاڑھا دھواں نکل رہا
تھا۔ ابھی تک کوئی شعلہ بلند نہیں ہوا تھا۔ روبی یہ سوچ کر وہاں سے چل دی کہ جہاں
دھواں اٹھ رہا ہے وہاں آگ کے شعلے بھی ضرور بلند ہوں گے۔

ستاروں کی دھندلی دھندلی روشنی میں وہ جیپ کو لے کر ایک چھوٹی سی کچی سڑک پر
آگئی یہ سڑک آگے جا کر کراچی شہر جانے والی سڑک کے ساتھ مل گئی تھی۔ اس نے جیپ
اس سڑک پر ڈال دی۔ وہ جتنی جلدی ہو سکے شیر خان اور اپنی بچی کے پاس پہنچنا چاہتی
تھی۔ دور سے کراچی شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ روبی کو اپنے گھر کا راستہ معلوم نہیں
تھا۔ علاقے کا نام اسے ضرور یاد تھا۔ ایک چوراہے پر پہنچ کر اس نے گاڑی ایک طرف
کھڑی کی اور اس ٹرک کے پاس آئی جو سڑک کے کنارے کھڑا تھا اور جس کا ڈرائیور اس کا
ٹائر بدل رہا تھا۔ روبی نے اس سے اپنے علاقے کا راستہ پوچھا۔ ٹرک ڈرائیور نے روبی کو
بڑے غور سے دیکھا۔ پھر اس علاقے کا راستہ بتا دیا۔ روبی جیپ پر بیٹھی اور اسے تیزی سے
سڑک پر ڈال دیا۔ اپنے علاقے میں جو سینما گھر تھا اسے روبی نے پہچان لیا۔ اب وہ بڑی
آسانی سے گھر پہنچ سکتی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ اس نے گاڑی اپنی گلی کے باہر ہی روک
دی جیپ سے اتر کر تیز تیز قدموں سے مکان کے دروازے پر آکر آہستہ سے دستک دی۔
اندر سے شیر خان کی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

روبی نے کہا: "میں ہوں دروازہ کھولو۔" فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔

شیر خان نے روبی کو دیکھا تو اسے بے اختیار اپنے ساتھ لگا لیا۔ روبی اس کی بانہوں
سے نکل کر چارپائی کی طرف بڑھی۔ "میری بچی کیسی ہے؟" بچی سو رہی تھی' اس نے
عائشہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

شیر خان نے پوچھا: "تم کہاں تھیں؟"

روبی نے پوچھا: "میری بچی نے دودھ پیا تھا؟"

شیر خان بولا: "ہاں وہ بہت رو رہی تھی میں نے بوتل میں دودھ بنا کر اسے پلا دیا تھا۔ مگر

تم کہاں تھیں؟ کیا سہراب کے آدمیوں نے تمہیں اغوا کیا تھا؟ یہ چاولوں کی بوری کون لایا
تھا؟ روبی نے مٹکے میں سے پانی نکال کر پیا۔ پھر بچی کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی اور شیر خان کو
ساری داستان بیان کر دی۔

شیر خان بڑے غور سے سب کچھ سنتا رہا۔ جب روبی نے سب کچھ بتا دیا تو شیر خان بولا۔

"میں جانتا تھا وہ ذلیل آدمی ایسی ہی حرکت کرے گا۔"

ایک لمحے کے لئے کچھ سوچنے لگا پھر کہنے لگا

"تم نے اپنی جان اور عزت بچانے کے لئے انہیں ہلاک کیا ہے۔ قانون تمہارے
ساتھ ہو گا' ڈی ایس پی بڑا دیانت دار شخص ہے۔"

روبی نے کہا: "میں صبح ہوتے ہی تھانے میں پیش ہو جاؤں گی۔ میں نے یہی فیصلہ کیا
ہے۔ یہ ریوالور اور جیپ میں پولیس کے حوالے کر دوں گی۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے چار
انسانوں کو نہیں بلکہ چار شیطان صفت درندوں کو ہلاک کیا ہے۔ جو نجانے اب تک کتنی
عصمتیں برباد کر چکے ہیں کتنے گھروں کو اجاڑ چکے ہیں۔"

باتوں ہی باتوں میں دن نکل آیا گلی میں سب کو پتا چل گیا کہ روبی واپس گھر آگئی ہے۔
عورتیں اس سے ملنے آگئیں' روبی نے ان سے اصلی بات کو چھپا لیا اور ٹال دیا' ہمسائی مریم
ایک مدبر عورت تھی اور روبی سے اس کے تعلقات بڑے اچھے تھے۔ روبی نے ایک طرف
بٹھا کر مریم کو ساری روداد سنا دی اور کہا۔

"میں اور شیر خان تھانے جا رہے ہیں' تم میری بچی عائشہ کو اپنے پاس رکھنا کوئی پتا
نہیں پولیس مجھے واپس آنے دے یا نہ آنے دے۔ اگر میں دو چار دن واپس نہ آئی تو تم
میری بیٹی کو وقت پر دودھ پلا دیا کرنا۔ میں تمہیں کچھ روپے دے جاتی ہوں۔" مریم نے
روبی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

"تم میری چھوٹی بہن ہو۔ میں اتنی گئی گزری بھی نہیں ہوں کہ تم سے بچی کے دودھ
کے پیسے لوں۔ تم فکر نہ کرو' تم نے بڑا ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ قانون کی نظروں میں تم بے گناہ
ہو تم جلدی واپس آجاؤ گی۔"

شیر خان نے روبی کو جیپ میں اپنے ساتھ بٹھایا اور سیدھا تھانے آگیا۔ روبی نے اسی

وقت اپنا اقبالی بیان درج کرا دیا۔ ڈی ایس پی ملک صاحب کو فون پر اطلاع دی گئی وہ فوراً تھانے پہنچ گئے روبی کو ایک طرف لے جا کر اس سے سارا واقعہ سنا اور پھر ریوالور اور جیپ کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد روبی سے کہا۔

معاملہ سنگین ہے بی بی، تمہیں ابھی پولیس کی تحویل میں ہی رہنا ہو گا۔"

روبی کو پولیس کی تحویل میں دینے کے بعد ڈی ایس پی پولیس پارٹی کو ساتھ لے کر سہراب کے شہر سے باہر والے اڈے کی طرف روانہ ہوئے وہاں جا کر دیکھا کہ کوٹھری کا آدھا دروازہ جل چکا تھا۔ اندر سہراب اور اس کے تین ساتھی غنڈوں کی ادھ جلی لاشیں پڑی تھیں۔ لاشوں کو اسی وقت پوسٹ مارٹم کے لئے سول اسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی یہی معلوم ہوا کہ چاروں غنڈوں کو پہلے پستول کی گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا پھر ان کے جسموں کو آگ لگا دی گئی۔ پولیس نے روبی کو عدالت میں پیش کر دیا۔ عدالت میں جج کے روبرو بھی روبی نے یہی بیان دیا تھا۔

"سہراب اور اس کے ساتھی مجھے بے ہوش کر کے ڈیرے پر لے گئے وہاں مجھ کو بے آبرو کر کے تصویریں اتارنا چاہتے تھے مگر میں نے موقع پا کر پستول قابو کیا اور باری باری چاروں کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔"

عدالت نے ریمارکس دیئے کہ یہ سیلف ڈیفنس اور تحفظ ناموس کا کیس ہے، انہی لائنوں پر اس کا مقدمہ درج ہونا چاہئے۔

مگر سہراب غنڈے کا ایک بھائی تھا جو منشیات کا ناجائز دھندا کرتا تھا اور اس کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کی قاتلہ کو پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لئے اپنی ناجائز کمائی کی دولت کا منہ کھول دیا اور بھاری رشوتیں دے کر کچھ بے ضمیروں کو خرید لیا اور ان کی مدد سے نہ صرف دیانتدار پولیس افسر کی بدکرداری بلکہ مقدمہ بھی دوسری عدالت میں منتقل کروا لیا۔ کیس کا نقشہ بدلنا شروع ہو گیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ روبی کو پھانسی ہو جائے گی۔ ابھی تک وہ جوڈیشنل حوالات میں ہی بند تھی۔ شیر خان اسے ملنے اور بچی عائشہ کو ملانے روزانہ آتا تھا۔ مگر حالات رخ بدلنے لگے۔ یہ خبر گرم تھی کہ روبی کو حوالات سے نکال کر پھانسی کی کوٹھری میں منتقل کر دیا جائے گا۔ ایک روز شیر خان ملاقات

کرنے آیا تو روبی نے اپنی بیٹی عائشہ کو سینے سے لگا کر پیار کیا اور شیر خان سے کہا۔

"لگتا ہے وہ ایک روز میں مجھے پھانسی کی کوٹھری میں ڈال دیں گے۔ پھر تم اور عائشہ مجھ سے دور ہو جاؤ گے۔"

شیر خان کو بھی اندازہ ہو چلا تھا کہ سہراب کے بھائی ہاشم کی ناجائز دولت اپنا کام کر رہی ہے اور روبی کا کیس بگڑ کر کچھ کا کچھ شکل اختیار کر رہا ہے۔ شیر خان کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ کسی اعلیٰ وکیل کی خدمات حاصل کی جا سکتیں۔ ایماندار عدل پسند اور فرض شناس اہلکاروں کی کچھ پیش نہ چل رہی تھی۔ شیر خان بے بسی سے حالات کو خطرناک صورت اختیار کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے روبی کی زبان سے یہ بات سنی تو یونہی اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"فکر مند نہ ہو روبی، تمہیں پھانسی نہیں ہو سکتی۔ تم نے اپنی عزت اپنی جان بچانے کے لئے ان درندہ صفت غنڈوں کو قتل کیا تھا۔ بہت ہوا تو چھ سات سال کی سزا ہو جائے گی۔ مجھے اس کی بھی توقع نہیں قانون اندھا نہیں ہے۔" روبی نے بچی کا ماتھا چوم کر کہا۔

"قانون اندھا نہیں ہے شیر خان مگر کچھ لوگ اندھے ضرور ہو گئے ہیں۔ وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ انہوں نے اپنا ضمیر دولت کے عوض فروخت کر دیا ہے۔"

شیر خان سانس بھر کر رہ گیا۔ اس نے روبی کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اسکے چہرے سے شیر خان کو کس قدر پیار تھا۔ کتنا اچھا لگتا تھا۔ اسے کھلتے ہوئے رنگ، سیاہ چمکیلی آنکھوں اور ستواں ناک والا یہ چہرہ اس چہرے نے شیر خان کو برما، سیلون کے جنگلوں میں موت کے روبرو بھی طاقت بخشی تھی۔ یہ چہرہ شیر خان کی محبت کا پہلا اور آخری چہرہ تھا۔ اسے اپنی بچی عائشہ سے اس لئے بھی زیادہ پیار تھا کہ وہ ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی۔ شیر خان نے بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی روبی کے چہرے کو ایک پل کے لئے پریشان نہ دیکھا تھا۔ یہ چہرہ اس وقت بھی پریشان نہیں تھا۔ بلکہ روبی کی آنکھوں میں شیر خان نے ایک ایسی چمک دیکھی جس سے وہ خوب شناسا تھا۔ یہ چمک عام طور پر روبی کے چہرے پر کوئی بڑا فیصلہ کر لینے کے بعد پیدا ہوا کرتی تھی۔

شیر خان اور روبی دونوں ابھی جوان تھے۔ پوری زندگی اور زندگی کے امڈتے ہوئے

جذبات ان کی خوشیاں ان کے نشیب و فراز سب کچھ ان کے سامنے تھا۔ ابھی انہوں نے زندگی کی ہائی وے پر ایک تہائی میل ہی سفر طے کیا تھا۔ ابھی پورا سفر باقی تھا۔ ننھی سی عائشہ روبی کی گود میں اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ماں کے بالوں کی ایک لٹ کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ روبی نے ماتا کی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بچی کا منہ چوم لیا اور شیر خان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"میری بچی کو شیرنی بنانا ہے۔ بکری نہ بنانا جس کی ٹانگیں بھیڑیے کو اپنے سامنے دیکھ کر کانپنے لگتی ہیں...... نہیں...... نہیں اسے شیرنی بنانا جو بھیڑیے کو پھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔"

شیر خان نے کہا۔"ہم اسے ایسی ہی بنائیں گے۔" روبی نے بچی کو شیر خان کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔

"اب اسے گھر لے جاؤ ملاقات کا وقت پورا ہو گیا ہے۔ وہ دیکھو جمعدار ہماری طرف آرہا ہے۔" شیر خان نے روبی کے چہرے پر کچھ دیکھ لیا تھا۔ اس نے دبی زبان میں کہا۔

"تم کیا سوچ رہی ہو روبی؟" روبی مسکرا دی۔ اسی مسکراہٹ میں شیر خان کی زندگی کی ساری خوشیاں ساری مسرتیں ساری محبتیں پوشیدہ تھیں۔ ایک بار اس کا دل چاہا کہ قریب آتے جمعدار کی رائفل چھین ڈالے سب کو ہلاک کرتا روبی کو نکال کرلے جائے۔ دوسرے لمحے جمعدار نے اس کے بازو کو پیچھے کھینچتے ہوئے کہا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اسی لمحے جیل کی دو اہلکار عورتیں وہاں آگئیں۔ انہوں نے روبی کو اپنے حصار میں لے لیا اور سلاخوں والے برآمدے میں ساتھ لے کر زنانہ بیرک کی طرف چل دیں۔ روبی کو اس زنانہ جوڈیشل جیل میں تیسرا مہینہ جا رہا تھا۔ اس کا مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا اور اب جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں کسی بھی دن اسے یہاں سے بڑی جیل پھانسی کی کوٹھری میں منتقل کیا جانے والا تھا۔

زنانہ بیرک میں بہت سی عورتیں تھیں جن کے کیس عدالت میں تھے ان میں ملنگی نام کی ایک معمر عورت بھی تھی۔ جس پر منشیات کی اسمگلنگ کا مقدمہ چل رہا تھا۔ یہ عورت روبی کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتی وہ اسے اکثر کہا کرتی ۔

"تم بڑی بہادر لڑکی ہو۔ سب لڑکیوں کو ایسا ہی بہادر ہونا چاہئے تاکہ کسی کو جرات نہ

ہو کہ وہ کسی لڑکی کی عزت پر حملہ کر سکیں شاباش تمہاری جگہ میں ہوتی تو میں بھی ایسا ہی کرتی۔ تم نے چار غنڈوں کو قتل کیا ہے۔ میں ہوتی تو ان کی کھال کھینچ کر ان میں ریت بھرتی اور پھر انہیں کماڑی پر الٹا لٹکا دیتی۔" اس کے بعد ملنگی زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگتی۔

روبی کو بھی اس عورت سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ اس عورت میں اسے بے ساختگی، سچائی اور دلیری کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ روبی نے ملنگی کو اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ کسی کے آگے ماضی کا باب کھولنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

ہفتے میں دو تین دن ملنگی کا بیٹا اس سے ملاقات کرنے آیا کرتا تھا۔ وہ بھی ملنگی کی طرح ہی شانے ہلا ہلا کر باتیں کرتا۔ وہ تیس بتیس برس کا خوش شکل جوان تھا جب بھی ملاقات کرنے آتا بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر آتا تھا۔ اس کا نام دارا تھا۔ ظاہر ہے وہ بھی غنڈہ ٹائپ آدمی ہی تھا اور وہ بھی منشیات کا ناجائز کاروبار ہی کرتا تھا۔ ملنگی بتایا کرتی تھی۔

"میرا بیٹا دارا بڑا بہادر لڑکا ہے۔ چھ آدمیوں سے اکیلا کشتی لڑتا ہے۔" پھر آنکھ مار کر روبی کے کان میں یہ کہہ کر زور سے قہقہہ مارتی کہ میرا بیٹا دو قتل بھی کر چکا ہے۔ مگر دونوں ڈاکو تھے اور پولیس کو مطلوب تھے۔"

روبی نے دارا میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ روبی ایک وفا شعار بیوی تھی اور اس کی زندگی کا ایک ہی مرکز تھا جس کا نام شیر خان تھا۔ وہی اس کی زندگی کا طلوع و غروب تھا۔ وہی اس کی زندگی کا شمال، جنوب، مشرق و مغرب تھا۔ اسی سچے جذبے نے روبی کو سوائے اللہ اور اس کے رسول کے ہر کسی کے آگے بے خوف بنا دیا تھا۔

جس روز شیر خان اس سے ملاقات کر کے گیا اور اس نے روبی کے چہرے پر ایک عجیب سی فیصلہ کن چمک دیکھی تھی اس روز شام سے ذرا پہلے روبی جیل کی بیرک میں ملنگی کے پاس آئی۔ وہ بیرک کے احاطے میں برآمدے کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں پر بیٹھی کسی دوسری عورت سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے روبی کو دیکھا تو اس عورت کے کاندھے پر زور سے ہاتھ مار کر بولی۔

"چل ری اب جا کر اپنا کام کر میری بیٹی آگئی ہے۔ اب میں اس سے باتیں کروں

گی۔"

روبی نے سلام کیا اور ملنگی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ بیرک کے احاطے میں دھوپ سامنے والی دیوار کے اوپر تک چلی گئی تھی۔ یہ دیوار کم از کم چار مرد اونچی تھی اس کے اوپر خاردار نہیں لگی تھی۔ ملنگی نے کہا۔

"تمہاری آج ملاقات تھی۔ تمہارا آدمی آیا تھا؟ تم اپنی بچی کو یہاں ساتھ کیوں نہیں رکھتیں؟ تمہیں تو آسانی سے اس کی اجازت مل جائے گی بیٹی' تمہاری بچی تو ابھی تمہارا دودھ پیتی ہے۔"

روبی نے آنکھیں سکیڑ کر احاطے کی دیوار کی طرف دیکھا اور بولی۔"نہیں خالہ میں اسے اس ماحول میں نہیں لانا چاہتی۔ وہ اپنے باپ کے پاس ہی ٹھیک ہے۔ محلے کی عورت مریم اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔"

ملنگی نے روبی کے شانے کو دباتے ہوئے اپنے ٹوٹے ہوئے دانت کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ "ارے ابھی تو تم دونوں کے عیش کرنے کے دن تھے۔ چلو کوئی بات نہیں۔ تم بہت جلدی بری ہو جاؤ گی۔" پھر فکر مند سی ہو کر روبی کی طرف جھک کر بولی۔ "مگر بیٹی میں نے سنا ہے تمہارے وکیل نے کیس خراب کر دیا ہے اور تمہیں یہاں سے نکال کر پھانسی کی کوٹھری میں لے جایا جائے گا۔"

روبی نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"ہاں خالہ! سنا تو میں نے بھی ہے۔"

ملنگی نے روبی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔"خدا پر بھروسہ رکھو بیٹی' اس کے ہاں دیر ضرور ہے اندھیر نہیں ہے۔"

مگر روبی کا ملنگی کی باتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں تھا۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ بلکہ جو کچھ سوچ چکی تھی اس کے بارے میں بات کرنے کے لئے جملہ تلاش کر رہی تھی۔ ملنگی نے صدری کی جیب سے مڑے تڑے دو سگریٹ نکالے ایک سگریٹ روبی کو دے کر کہا۔

"لو پیو' میرا بیٹا دے گیا تھا' یہ دو ہی بچے ہیں باقی۔"

وہ جانتی تھی کہ روبی کبھی کبھی سگریٹ پی لیا کرتی ہے۔ اس وقت روبی کو سگریٹ کی طلب بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کڑوے سگریٹ کا ایک کش لگایا اور دو تین سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد دائیں بائیں ایک نگاہ ڈالی عورتیں اس سے دور دور تھیں روبی نے ملنگی کی کلائی پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"خالہ! میں جیل سے فرار ہونا چاہتی ہوں۔"

ملنگی کی نگاہیں روبی کے چہرے پر ٹھٹک سی گئیں۔ "کیا تم سچ کہہ رہی ہو بیٹی؟" ملنگی نے دبی آواز میں پوچھا' روبی نے اپنے ہاتھ کی گرفت خالہ ملنگی کی کلائی پر مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں خالہ! میں نے یہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے' تمہیں اس لئے بتا رہی ہوں کہ مجھے فرار ہونے کا کوئی راستہ بتاؤ۔" خالہ ملنگی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

چند مہینوں میں اس کو روبی کی طبیعت کا پتا چل گیا تھا۔ وہ خود بھی تجربہ کار عورت تھی۔ اس کا کئی جرائم پیشہ عورتوں اور مردوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ روبی کے بارے میں اس نے جو نظریہ قائم کیا ہوا تھا وہ یہ تھا کہ یہ لڑکی دل کا بھید نہیں بتاتی۔ وہ عادی مجرمہ نہیں ہے لیکن اس نے عادی مجرموں کو لگتا ہے بڑے قریب سے دیکھا ہے ملنگی کو یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ روبی کے کردار میں ذرا سی بھی لچک نہیں ہے۔ وہ فیصلہ کن انداز میں بات کرتی ہے وارڈ کی دوسری عورتوں کے ساتھ روبی نے کبھی زیادہ بات چیت نہیں کی تھی۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے خالہ ملنگی روبی کو پیار کرتی تھی۔ اب جب اس نے فرار ہونے کی خواہش ظاہر کی تو ملنگی کو یقین ہو گیا کہ یہ لڑکی اب جیل کی چاردیواری میں نہیں رہ سکے گی۔ اس نے روبی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ روبی نے عمداً کسی کو قتل نہیں کیا۔ اس نے اپنی عزت اور جان بچانے کے لئے غنڈوں کو ہلاک کیا تھا۔ لیکن اس کا بچاؤ کرنے والا پیروی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے خاوند شیر خان کی اتنی استطاعت نہیں تھی اور دوسری طرف مقتول غنڈے سہراب کا بھائی ہاشم ایک بدنام غنڈہ اور اسمگلر تھا اور اس نے اپنی دولت سے چند بے ضمیر لوگوں کو خرید لیا تھا اور یوں روبی پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ خالہ ملنگی نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ان کے

قریب دوسری کوئی عورت نہیں تھی۔ وہ روبی سے کہنے لگی۔

"یہ کام مشکل ہے۔ اگرچہ یہ بڑی جیل نہیں ہے۔ پھر بھی یہاں چوکی پہرے کا بڑا سخت انتظام ہے۔ اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں اپنے بیٹے دارا سے بات کروں گی وہ باہر سے تمہاری مدد کر سکے۔" روبی نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دو روز بعد ملنگی کا بیٹا دارا ملاقات کرنے کے لئے آیا جب وہ چلا گیا تو ملنگی روبی کو بیرک کے احاطے میں ایک طرف لے گئی۔ وہ اینٹوں کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔

روبی نے پوچھا: "کوئی بات ہوئی خالہ؟"

ملنگی نے آہستہ سے کہا: "ہاں دارا تمہاری مدد کرنے کو تیار ہے۔ پہلے وہ راضی نہیں ہوتا تھا مگر میں نے ساری بات بیان کی اور کہا کہ روبی کو ناحق مارا جا رہا ہے۔ پھر وہ راضی ہو گیا۔ اس نے مجھے ترکیب بھی بتا دی ہے۔" اتنا کہہ کر ملنگی چپ ہو گئی۔

جیل کی حوالدارنی چھڑی ہاتھ میں لئے ادھر آ رہی تھی۔ ملنگی نے اسے سلام کر کے خیریت پوچھی۔ حوالدارنی نے سلام کا کوئی جواب نہ دیا اور دونوں کو گھورتی ہوئی آگے نکل گئی۔ ملنگی کہنے لگی۔

"اس حوالدارنی سے سنبھل کر رہنا۔ یہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل کا بھید معلوم کر لیتی ہے۔" روبی کو حوالدارنی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ملنگی سے پوچھا۔

"تمہارے بیٹے نے کیا ترکیب بتائی ہے؟" ملنگی نے روبی کو ساری ترکیب بتا دی اور کہا۔

"اگلی ملاقات پر دارا مجھے بتا دے گا کہ وہ رات کے کتنے بجے جیل کی جنوبی دیوار کے پیچھے موجود ہو گا۔" پھر اس نے پلٹ کر روبی سے سوال کیا۔

"تم رسی کی مدد سے دیوار پر چڑھ جاؤ گی؟" روبی کے ہاں میں جواب دینے پر ملنگی بولی۔

"بس اب تم اگلی ملاقات تک مجھ سے یہاں زیادہ بات چیت نہ کرنا بلکہ مجھ سے الگ الگ ہی رہنا۔"

اسی روز شیر خان کی ملاقات تھی۔ روبی نے اسے اپنے فرار کے منصوبے کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ اگر روبی کی معصوم بیٹی کی پرورش کا بوجھ شیر خان کے کاندھوں پر نہ ہوتا تو وہ شیر خان ہی کی مدد سے جیل سے فرار ہونے کی کوشش کرتی، لیکن اب معاملہ برعکس تھا

معصوم بچی کو ساتھ رکھ کر روبی اپنے آئندہ کے پروگرام پر عمل نہیں کر سکتی تھی۔ بچی کو اسی کے باپ کے پاس حالت امن میں ہی ہونا چاہئے تھا تاکہ وہ اس کی پرورش کر سکے۔ شیر خان روبی کو اپنے وکیل اور مقدمے کے بارے میں ضروری باتیں بتاتا رہا اور روبی ان باتوں سے بے نیاز اپنی بچی عائشہ کو گود میں لئے پیار کرتی رہی۔ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شیر خان بچی کو لے کر اگلی ملاقات پر آنے کا وعدہ کر کے غمگین چہرہ لئے چلا گیا۔

پروگرام کے مطابق روبی خالہ ملنگی سے الگ الگ رہنے لگی۔ دو روز بعد روبی کو پتا چلا کہ ملنگی کی ملاقات آ گئی ہے اور وہ اپنے بیٹے سے ملاقات کر رہی ہے، روبی سمجھ گئی کہ فرار کا وقت قریب ہے۔ ملاقات کے بعد بھی ملنگی نے روبی سے کوئی بات نہ کی۔ وہ اس کے نزدیک بھی نہ آئی۔ روبی مطمئن رہی۔ شام کے وقت جب اندھیرا چھانے لگا تھا تو ملنگی نے روبی کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ چھوٹی بیرک کی دیوار کے عقب میں چلی گئی۔ روبی نے تھوڑا وقفہ دیا اور وہ بھی چھوٹی بیرک کی دیوار کے پیچھے آ گئی وہاں خالہ ملنگی شام کے اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ روبی کو دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"تمہیں جہاں کہا ہے وہاں آج رات پہنچ جانا۔ میرا بیٹا تمہیں لینے کے لئے آیا ہو گا۔ بس اب جاؤ۔ میرے پاس تمہارا زیادہ دیر رہنا اس وقت مناسب نہیں وقت یاد ہے ناں؟"

روبی نے آہستہ سے کہا: "ہاں خالہ یاد ہے۔" پھر خالہ ملنگی نے کوئی بات نہ کی اور تیز تیز قدموں سے دیوار کے ساتھ ساتھ چل دی۔

روبی بھی اپنی بیرک میں واپس آ گئی۔ اب وہ رات کے بارہ بجنے کا شدت سے انتظار کرنے لگی۔ روبی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ چونکہ یہاں زیر سماعت مقدموں میں ملوث عورتیں رکھی گئی تھیں اس لئے جیل میں وہ سختی نہیں تھی جو باقاعدہ جیلوں میں ہوتی ہے۔ اس کے احاطے کی پکی دیوار کی بلندی بھی پندرہ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر یہ زنانہ جیل تھی۔ یہاں سے کبھی کسی عورت نے آج تک فرار کی کوشش نہیں کی تھی۔ فرار کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ ان عورتوں کے مقدمات ابھی زیر سماعت تھے۔ بعض کی ضمانت بھی ہو جاتی تھی۔ بعض بری ہو جاتی تھیں۔ لیکن اگر یہاں سخت ترین حفاظتی انتظامات بھی

ہوتے جب بھی روبی وہاں سے فرار ہونے کی بھرپور کوشش کرتی۔ کیونکہ ناحق پھانسی کے تختے پر چڑھنے یا عمر قید کی سزا بھگتنے سے زیادہ بہتر اور تعمیری پروگرام اس کے سامنے تھا۔ خالہ ملنگی کی بتائی ہوئی ترکیب کی ایک ایک تفصیل اس کے ذہن میں تھی۔ جیل کے گھنٹے نے رات کے بارہ بجائے تو روبی آہستہ سے اٹھی اور بیرک سے نکل کر برآمدے میں آگئی پچاس قدموں کے فاصلے پر احاطے کے کونے میں بیت الخلا میں روشنی ہو رہی تھی۔ کچھ عورتیں برآمدے میں لیٹی سو رہی تھیں۔ روبی جان بوجھ کر سست قدم اٹھاتی بیت الخلا کی طرف چلنے لگی۔ قریب پہنچ کر وہ اندر جانے کی بجائے عقب کی طرف گھوم گئی۔ یہاں آتے ہی وہ جیل کی دیوار کی طرف لپکی۔ یہاں جیل کی دیوار اور بیت الخلا کی دیوار کے درمیان چھوٹی سی راہ داری رکھی گئی تھی۔ روبی نے ہاتھوں سے دیوار کو ٹٹولا اس کے ہاتھ میں نائیلون کی رسی آگئی یہ رسی ملنگی کے بیٹے دارا نے دیوار پر پھینک رکھی تھی۔ روبی رسی کو پکڑ کر دیوار پر چڑھنے لگی۔ اس کام کا اسے کافی تجربہ تھا۔ دیوار کے اوپر آتے ہی وہ پیٹ کے بل لیٹ گئی۔ اس نے دوسری طرف نگاہ ڈالی۔ دوسری جانب ایک خندق سی تھی جس میں جھاڑ جھنکار اور کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا روبی کو بتایا گیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اس نے خندق میں چھلانگ لگا دی۔ وہ جھاڑیوں اور جھاڑ جھنکار پر گری۔ اس کی گردن اور بازوؤں پر خراشیں آگئیں مگر اسے اس کا زیادہ احساس نہ ہوا وہ گرتے ہی اٹھی اور جھاڑیوں کو پیچھے ہٹاتی خندق کے دوسرے کنارے پر نکل آئی۔ دوسری طرف ڈھلان تھی' ڈھلان اس نے دوڑ کر پار کر لی۔ آگے کچا میدان سا تھا اس نے دیکھ لیا کہ میدان کے کونے میں ایک ٹرک کھڑا ہے۔ وہ ٹرک کی طرف بھاگی ایک آدمی ٹرک کا بونٹ اٹھائے جیسے انجن ٹھیک کر رہا تھا۔ مگر اس آدمی نے روبی کو آتے دیکھ لیا تھا۔ جونہی روبی قریب پہنچی اس نے بونٹ گرایا۔ روبی سے کہا

"ترپال اٹھا کر پیچھے چھپ جاؤ۔" روبی نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ ملنگی کا بیٹا دارا تھا۔ وہ ٹرک کے پیچھے آئی' ترپال کا پردہ ہٹایا اور خود کو ٹرک کے اندر گرا دیا اس کے ساتھ ہی ٹرک ایک طرف روانہ ہو گیا۔

ٹرک کے اندر اندھیرا تھا۔ روبی پرانے ٹائروں کے اوپر گری تھی۔ ٹرک کے چلتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ مرحلہ اتنی جلدی طے ہو جائے گا روبی کو اس کا یقین نہیں تھا۔ وہ جیل کی چاردیواری سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ ٹرک بڑی تیزی سے ایک طرف جا رہا تھا۔ روبی صبح ہونے سے پہلے پہلے شیر خان اور اپنی بچی سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے فرار کا پتا چلتے ہی پولیس اس کے مکان کی نگرانی شروع کر دے گی اور ایسی حالت میں وہ شیر خان اور اپنی بچی عائشہ سے ملنے مکان پر گئی تو ضرور پکڑی جائے گی ٹرک خدا جانے کس منزل کی طرف جا رہا تھا۔ جب ٹرک نے کافی راستہ طے کر لیا اور وہ جیل سے کافی دور ہو گیا تو روبی نے آگے جا کر ٹرک کی دیوار کو زور سے بجانا شروع کر دیا۔ دارا نے ٹرک کو ایک طرف کر کے انجن بند کیا اور پیچھے ترپال کو اٹھا کر کرخت آواز میں کہا۔

"کیا بات ہے۔ اس طرح کرنا تھا تو میری ماں کو فرار ہونے کے لئے کیوں کہا تھا؟"

روبی ٹرک سے نیچے اتر آئی اس نے جلدی جلدی ساری بات دارا کو سمجھائی اور کہا۔

"اگر میں اس وقت اپنے خاوند اور بچی سے نہ ملی تو پھر شاید ہی ان سے مل سکوں۔ میں شیر خان سے بچی کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" دارا اپنے ہاتھ کی مٹھی آہستہ سے اپنے ماتھے پر مارنے لگا۔

"تم کہیں مجھے بھی اندر نہ کروا دینا۔ میں نے ماں سے کہا تھا عورت ذات کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اب تم نے مجھ پر مصیبت ڈال ہی دی ہے تو بتاؤ تمہارا گھر کہاں ہے؟" روبی نے اسے پتا بتایا۔ دارا نے روبی کو ٹرک کے اندر جانے کا اشارہ کیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی طرف جاتے ہوئے بولا۔"وہاں زیادہ دیر نہ لگانا۔ ہو سکتا ہے پیچھے انہیں تمہارے فرار کا پتا

چل جائے۔ پولیس سیدھی تمہارے مکان پر ہی آئے گی۔" روبی نے ٹرک میں گھستے ہوئے کہا۔

"صرف دو باتیں کروں گی۔" دارا جھنجھلاہٹ کے ساتھ سر کو جھٹکتا ہوا ٹرک میں بیٹھا اور ٹرک وہاں سے گھوم کر دوسری سڑک پر آ گیا۔

یہ کراچی کا غیر آباد علاقہ تھا۔ دارا خاصی رفتار سے ٹرک چلا رہا تھا۔ آخر وہ اس علاقے میں آ گیا جہاں روبی کا گھر تھا۔ اس نے ٹرک روک کر روبی کو اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا لیا اور کہا کہ راستہ بتاتی جاؤ۔ روبی نے اپنی گلی سے کچھ فاصلے پر ٹرک رکوا لیا اور دارا سے کہا۔

"میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔" دارا نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر آگے پیچھے دیکھا اور کہا۔

"کہیں یہاں پولیس تو نہیں پہنچ گئی؟" روبی نے بھی گلی کے کونے پر جلتے بلب کی کمزور روشنی میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

"نہیں دارا بھائی! پولیس کو میرے فرار کی خبر نہیں ہوئی۔" دارا نے سٹ پٹا کر کہا

"نہیں ہوئی تو کچھ دیر میں ہو جائے گی۔ خدا کے واسطے اپنے آدمی سے جلدی مل کر واپس آؤ۔ میں پانچ منٹ سے زیادہ یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔"

روبی ٹرک سے اتر کر تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے مکان پر آ گئی۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے آہستہ سے دستک دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ دارا ٹرک میں بیٹھا بے چینی کے عالم میں روبی کو دیکھ رہا تھا۔ تیسری بار ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے شیر خان کی نیند بھری آواز آئی۔

"کون ہے؟" روبی نے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر کہا۔

"میں ہوں شیرے۔" دروازہ کھل گیا۔ روبی دھڑاک سے اندر داخل ہو گئی۔ شیر خان دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

"تم ......" وہ ششدر سا ہو کر رہ گیا تھا۔ "تم کیسے آ گئیں روبی؟" روبی نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔

"خاموش رہ کر میری بات سنو۔ میں جیل سے فرار ہو کر آئی ہوں میں تمہارے ساتھ

نہیں رہ سکتی۔ تم بچی کو لے کر میرے ساتھ بھی دربدری نہیں کر سکتے۔ میں کہاں جا رہی ہوں؟ یہ تمہیں بعد میں مل کر بتاؤں گی۔"

شیر خان نے کہا۔

"لیکن روبی تم اکیلی کہاں ماری ماری پھرو گی؟ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" روبی نے سختی سے کہا۔

"کہہ دیا ہے ناں کہ تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ تم میری بچی کے ساتھ یہیں رہو گے۔ میری بچی کی اسی طرح پرورش کرو گے۔ جس طرح میں نے تمہیں کہا تھا۔ میں بڑی محفوظ جگہ پر ہوں گی۔ تمہیں کبھی کبھار ملنے اور اپنی بچی کو دیکھنے آ جایا کروں گی۔" روبی نے سوئی ہوئی عائشہ کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور اسے پیار کرنے لگی۔ شاید زندگی میں پہلی بار روبی کو اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی مگر اس نے آنسوؤں کو باہر نہ گرنے دیا اسے اندر ہی اندر پی گئی۔ شیر خان جھنجھلایا ہوا تھا کہنے لگا

"تم کب تک روپوش رہو گی؟" ایک نہ ایک دن پولیس تمہیں پکڑ لے گی۔ ایسا کرتے ہیں اس ملک سے ہی فرار ہو جاتے ہیں یہاں سے راتوں رات کسی لاری میں بیٹھ کر میرپور کی طرف نکل جاتے ہیں۔ وہاں اس ہندو سے ملتے ہیں جس کے پاس بھوپت ڈاکو نے ہمیں بھیجا تھا۔ وہ ہمیں بارڈر کراس کروا کر انڈیا پہنچا دے گا۔" روبی نے شیرنی کی طرح غضبناک ہو کر کہا۔

"میں پاکستان سے فرار ہونے کے لئے پاکستان میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ میں نے عہد کیا تھا۔ یہ اب میرا وطن ہے اور میں یہیں جیوں گی اور یہیں مروں گی۔ پھر کبھی انڈیا کا میرے آگے نام نہ لینا۔" شیر خان نے بھی جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا۔

"آخر تم کیا چاہتی ہو؟" روبی نے اپنی بچی کا منہ چوم لیا اور شیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں اپنی بچی کو پاکستان کی ہر بچی کو اس ملک کے جرائم پیشہ مجرموں کی درندگی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں پاکستان میں عورتوں کی عصمتوں سے کھیلنے والا ایک بھی مجرم باقی نہ رہے۔ اس کے بعد میں جو کچھ چاہتی ہوں تمہیں اس کا اپنے

آپ پتا چلتا رہے گا۔ اس وقت میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے میرا ایک بھائی ٹرک میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے۔ صبح پولیس تمہارے پاس آئے گی اور اس سے کہہ دینا کہ تمہیں کچھ پتا نہیں میں کہاں ہوں۔ پولیس مجھے تم سے برآمد نہیں کر سکے گی۔ میری بچی کا خیال رکھنا۔" شیر خان نے تڑپ کر کہا۔ "روبی تم مجھ سے اس طرح سے جدا ہو کر نہ جاؤ یہاں کے قانون بڑے سخت ہیں تم کو کوئی گزند پہنچی تو میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔"

روبی نے شیر خان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ہلکا سا دھکا دیا اور بولی۔

"مرد بنو۔ شیر ہو تمہیں میری بچی کو بھی شیرنی بنانا ہے جو میں کرنا چاہتی ہوں مجھے کرنے دو۔ جیل میں رہ کر میں وہ کام نہیں کر سکتی جس کام کو تکمیل تک پہنچانے کا جذبہ ایک شعلہ بن کر میرے سینے میں بھڑک رہا ہے۔ اگر قانون کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں تو وطن کی سلامتی کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ تم قانون کے تقاضے پورے کرنا میں وطن کی سلامتی کے تقاضے پورے کروں گی۔ اگرچہ ہمارے راستے الگ الگ ہوں گے مگر ہماری منزل ایک ہی ہو گی۔ ہم ایک ہی منزل پر آکر دونوں مل جائیں گے اور یہ منزل ہو گی قانون کی فتح کی منزل وطن کی سلامتی کی منزل! اب میں جاتی ہوں۔" اس نے آخری بار اپنی سوئی ہوئی بچی عائشہ کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچا۔ اس کا ماتھا چوما اور اسے شیر خان کے حوالے کرتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لائے بغیر بولی۔

"یہ میری شیرنی ہے۔ شیر خان اس کا خیال رکھنا۔" یہ کہا اور روبی تیزی کے ساتھ کوٹھری سے باہر نکل گئی شیر خان بھی گلی میں آگیا اس کی بچی عائشہ اس کی گود میں تھی۔ اسے دور کھلی جگہ پر ایک ٹرک کھڑا نظر آیا۔

روبی تقریباً دوڑتی ہوئی اس ٹرک کی طرف جا رہی تھی۔ شیر خان اس کے پیچھے چلنے لگا۔ ایسی صورت حال اس کی زندگی میں پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ روبی کو روک لینا چاہتا تھا۔ مگر وہ ٹرک میں بیٹھ چکی تھی اور ٹرک جو اسے آتے دیکھ کر ہی اسٹارٹ ہو گیا تھا اب بڑی تیزی سے کھلی جگہ میں سے نکل سڑک پر جا پہنچا تھا۔ بچی اچانک رونے لگی۔ شیر خان بچی کو گود میں لئے بہلانے لگا پھر اس نے آنکھ اٹھا کر سڑک کی طرف دیکھا ٹرک روبی کو لے کر نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ شیر خان بچی کو گود میں لئے پاگلوں کی طرح گلی میں کھڑا

ویران ویران نظروں سے خالی سڑک کے اندھیروں کو تکتا رہا پھر اسے نازک صورت حال کا احساس ہوا کہ کوئی ہمسایہ اسے دیکھ نہ لے وہ بچی کو سینے سے لگائے اسے بہلاتا کوٹھری میں آیا اور بے دم سا ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

دارا ٹرک کی رفتار بڑھاتا جا رہا تھا۔ روبی ابھی تک اس کے ساتھ والی سیٹ پر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔

"تم نے اتنی دیر کر دی میں تو واپس جانے لگا تھا۔"

روبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب ٹرک روشنیوں والی سڑک پر چڑھنے لگا تو دارا نے اسے روک دیا اور روبی سے کہا

"اب پیچھے چلی جاؤ اور وہیں بیٹھی رہنا۔ کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے میری ماں نے مجھے میرا بھی دماغ خراب ہو گیا تھا۔"

روبی اس کے بڑبڑانے کے دوران ٹرک کے اندر پرانے ٹائروں میں بیٹھ چکی تھی۔ ٹرک بڑی سڑک پر شہر کی مشرقی سمت کو چل پڑا۔ ظاہر ہے دارا اسے اپنے کسی خفیہ ٹھکانے پر لے جا رہا تھا۔ دارا ایک بدنام پیشہ شخص ہونے کے ناتے کیسا آدمی تھا۔ یہ روبی ابھی نہیں جانتی تھی اس نے اگر۔۔۔ جیل سے فرار کرانے میں روبی کی مدد کی تھی تو اس میں اس کا کوئی ذاتی لالچ بھی ہو سکتا تھا۔ صرف ماں کے حکم کی تعمیل میں اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا بلکہ وہ ماں کو سمجھا سکتا تھا کہ تم مجھے ایسا کام کرنے کے لئے کیوں کہہ رہی ہو۔ یہ تو پولیس کا جنجال خواہ مخواہ اپنے اوپر ڈالنے والی بات تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دارا نے محض ایڈونچر کے لئے یا ماں کا دل رکھنے کے لئے ایسا کیا ہو۔ بہر حال ابھی تک تو وہ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ دارا کا خفیہ ٹھکانہ کب آئے گا اس نے ذرا سی ترپال اٹھا کر پیچھے دیکھا کراچی شہر کی روشنیاں غائب ہو چکی تھیں۔ سڑک عقب میں دور تک اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں چھوٹے بڑے ٹیلے رات کے اندھیرے میں یوں نظر آرہے تھے جیسے ریگستان میں بہت سے اونٹ بیٹھے ہوئے ہوں۔ پھر ٹرک ایک طرف گھوما یہ ایک کچی سڑک تھی جس کے دونوں جانب کہیں کہیں درخت تھے۔

روبی کو خیال آیا کہ کہیں دارا کی نیت تو خراب نہیں ہو گئی اس نے دو تین بار اسے

دارا بھائی کہہ کر مخاطب کیا تھا مگر دارا نے اسے ایک بار بھی بہن نہیں کہا تھا۔ روبی نے سوچا اگر اس کی نیت خراب ہو گئی ہے تو میں بھی موت کے پنجے میں پنجہ ڈال کر زندگی کے انوکھے سفر پر نکل پڑی ہوں میرا خیال ہے بہت جلد دارا کو معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں۔؟

ٹرک رات کی تاریکی میں غیر ہموار راستوں پر سے گزرتا چلا جا رہا تھا روبی نے ترپال اٹھا کر دو ایک بار دیکھا اسے سوائے اونچے نیچے سیاہ ٹیلوں اور نیلے آسمان کے اور کچھ نظر نہ آیا آخر ایک جگہ ٹرک نے چھوٹا سا چکر لگایا اور رک گیا۔

یہاں چھدرے چھدرے درختوں کے نیچے ستاروں کی دھیمی روشنی میں ایک کچا سا کوٹھا نظر آیا جس کی ایک جانب دو تین بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک عورت کوٹھے کے دروازے کے آگے چارپائی ڈالے سو رہی تھی جو ٹرک کی آواز سن کر جاگ پڑی تھی۔ اس نے دارا کو دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے پہلے سے خبر تھی کہ دارا ایک عورت کو ساتھ لا رہا ہے۔ کوٹھری میں پیاز کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ شاید کونے میں پیاز کی کچھ بوریاں پڑی تھیں۔ عورت نے لالٹین روشن کر دی اس کی روشنی میں روبی نے دیکھا کہ وہ ایک بوسیدہ سی کوٹھری تھی وہاں ایک چارپائی تھی کونے میں کچھ بوریاں تھیں چارپائی پر چادر بچھی تھی۔ ایک سرہانہ بھی رکھا ہوا تھا۔

روبی نے عورت کی طرف دیکھا بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا عورت بوڑھی تھی۔ سر میں کافی سفید بال تھے۔ وہ دارا کی ماں خالہ ملنگی سے بڑی تھی۔ دارا اندر آگیا اس نے عورت سے کہا۔

"ماسی! بی بی کے لئے دودھ گرم کر کے لاؤ۔" عورت باہر نکل گئی۔ دارا نے روبی کو چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود سامنے پیاز کی ایک بوری پر بیٹھ گیا۔ اس کی انگلیوں میں پہلے ہی سگریٹ سلگ رہا تھا۔

روبی پر ابھی تک واضح نہیں ہو سکا تھا کہ دارا اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنے والا ہے۔ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور خاص طور پر جب عورت جوان ہو۔ مرد بھی جوان ہو۔ دونوں کسی ویران مقام پر رات کے وقت اکیلے ہوں تو بڑے کردار والا

انسان ہی اپنے جذبات پر قابو رکھ سکتا ہے۔

دارا نے سگریٹ پاؤں تلے مسلتے ہوئے روبی کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"بی بی! میں شرابی کبابی بدمعاش ٹائپ آدمی ہوں میں کوئی نیک آدمی نہیں ہوں مگر دو باتوں کا میں نے ہمیشہ خیال رکھا ہے میرے باپ نے مرنے سے کچھ دیر پہلے مجھ سے دو باتوں کا وعدہ لیا تھا۔ اس نے کہا تھا دارا مجھ سے وعدہ کرو کہ اپنی ماں کا ہمیشہ حکم مانو گے اور کبھی کسی کی ماں بہن بیٹی کو بری نظر سے نہیں دیکھو گے۔ میرے باپ کو مرے کتنے ہی سال ہو گئے ہیں میں نے دنیا کا ہر گناہ کیا ہے مگر تب سے لے کر آج تک کبھی کسی کی ماں بہن بیٹی کو بری نگاہ سے نہیں دیکھا ناچنے گانے والی پیشہ ور طوائفوں سے میں ضرور دوستی رکھتا ہوں مگر کسی شریف عورت کو کبھی ایسی ویسی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ بلکہ اگر کبھی وقت آگیا تو اس کی عزت کی حفاظت ہی کی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اپنی ماں کی بھی کبھی حکم عدولی نہیں کی۔ تم خود دیکھ چکی ہو کہ میرا تمہارا کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے مگر صرف اپنی ماں کے حکم پر میں تمہیں جیل سے نکال لایا ہوں۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اپنی ماں کا حکم مان کر اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ یہاں پر میرا کام ختم ہو گیا ہے اب تمہاری مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے اس لئے تم مجھے بتا دو کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو۔ میں تمہیں وہیں پہنچا دوں گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنے خاوند اور اپنی بچی کے پاس چلی جاؤ ٹھیک ہے وہاں پولیس تمہیں پکڑ لے گی لیکن تمہارے بعد بھی پولیس تمہارے خاوند کو بڑا پریشان کرے گی۔ وہ ٹھیک طرح سے تمہاری بچی کی دیکھ بھال بھی نہ کر سکے گا۔"

بوڑھی عورت پیالے میں دودھ لے کر آگئی۔ دارا نے دودھ کا پیالا روبی کی طرف بڑھاتے ہوئے عورت کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ روبی بڑے غور سے دارا کی باتیں سنتی رہی تھی۔ اسے دارا کی باتوں سے سچائی اور خلوص کی جھلک مل رہی تھی۔ وہ دودھ پینے لگی۔ گرم گرم میٹھے دودھ نے روبی کے تھکے ہوئے اعصاب کو بڑا سکون دیا۔ دارا نے دوسرا سگریٹ سلگا کر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

"رات کے دو بجنے والے ہیں۔ ابھی تم آرام کرو۔ یہاں بے فکر ہو کر سونا ماسی باہر ہو گی۔ غسل خانہ کوٹھے کے پیچھے ہے۔ وہاں پانی کا مٹکا بھی رکھا ہوا ہے۔ میں کل کسی وقت

آؤں گا۔ تم جس جیل سے فرار ہوئی ہو اسی جیل میں میری ماں بھی قید ہے اس لئے ہو سکتا ہے پولیس میرے شہر والے ٹھکانے پر بھی مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آئے۔ مجھے وہاں موجود ہونا چاہیے۔" یہ کہہ کر دارا وہاں سے چل دیا۔

روبی نے اندر سے کنڈی لگا لی اور چارپائی پر لیٹ گئی۔ دارا کے ٹرک کی آواز دور ہوتے ہوتے رات کے سناٹے میں تحلیل ہو گئی۔ دارا کی گفتگو نے روبی کو ایک لمحے کے لئے بھی پریشان نہیں کیا تھا جو اس نے کہا تھا۔

روبی دارا کے کردار سے بڑی متاثر ہوئی تھی۔ وہ ایک سیدھا سادا آدمی تھا۔ روبی کو اکیلا چھوڑ کر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سچ تھا۔ روبی کو اپنے مشن کے لئے ایک انتہائی شریف النفس بدمعاش آدمی کی ضرورت تھی۔ یعنی ایک ایسا آدمی جو شریف النفس ہونے کے ساتھ ساتھ جرائم پیشہ عادی مجرموں' بدمعاشوں اور عورتوں کی عزتوں سے کھیلنے والے درندہ صفت انسانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور وقت پڑنے پر ان کے پیٹ پھاڑنا اور انہیں گولیوں سے بے دریغ بھون ڈالنا بھی جانتا ہو۔ دارا میں یہ صفت کچھ کچھ موجود تھی۔ باقی وہ منشیات کا ناجائز دھندا کر کے ایک بہت بڑے سوشل گناہ کا ارتکاب کر رہا تھا۔ لیکن روبی اسے اس کام سے روک سکتی تھی۔ روبی نے محسوس کیا تھا کہ دارا میں وہ بنیادی خوبی موجود ہے جس پر روبی اپنے مشن کی عمارت تعمیر کر سکتی تھی۔ روبی کی مشکل اور سب سے بڑی پرابلم یہ تھی کہ اسے شریف النفس لوگ تو بہت مل سکتے تھے مگر جو بھرے بازار میں کوئی درندہ صفت آدمی کسی عورت کے کپڑے پھاڑ ڈالتا اور اسے سڑک پر گھسیٹتا ہے تو یہ شریف النفس لوگ اکثر وہاں سے بھاگ جاتے ہیں اگر اس مظلوم عورت کی مدد کو کوئی آتا ہے تو وہی آدمی آتا ہے جس کو عرف عام میں برے کردار کا آدمی یا بدمعاش کہا جاتا ہے۔ اس لئے روبی کو ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو اس قسم کا بدمعاش ہوتے ہوئے شریف النفس بھی ہو۔ اگر روبی کے ہاں بچی پیدا نہ ہوتی تو شیر خان اس کے لئے ایک مثالی شخص تھا مگر وہ شیر خان کو اپنی بچی کی وجہ سے اپنے مشن میں ساتھ نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شیر خان ایک روایتی نیک اور رزق حلال کمانے والے آدمی کی طرح اس کی بچی کی پرورش کرے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے فرار ہونے کے بعد پولیس

اسے تھوڑا بہت تنگ کرے گی۔ اس کی نگرانی بھی ہو گی لیکن جب روبی اس کے پاس جائے گی ہی نہیں تو پولیس کی توجہ ہٹ جائے گی۔ اور شیر خان کو سکون کے ساتھ بچی کو پروان چڑھانے کا موقع میسر آ جائے گا۔

دارا کے بارے میں روبی کی سوچ یک طرفہ تھی۔ ابھی اسے معلوم نہیں تھا کہ روبی کے مشن کا سن کر دارا پر اس کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔ ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے روبی سو گئی۔

دوپہر کو اس کی آنکھ کھلی تو دارا وہاں پر آ چکا تھا۔ بوڑھی عورت نے کھانا بھی پکایا ہوا تھا۔ دارا اور روبی نے کوٹھری کے باہر صف پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ دارا نے اسے بتایا کہ پولیس اس کے ڈیرے پر ابھی تک نہیں آئی مگر اس کے فرار کے سلسلے میں اس کے گھر شیر خان کے پاس ضرور گئی ہو گی۔ روبی اپنے محبوب خاوند شیر خان اور نازک پھول ایسی بچی عائشہ کا خیال کر کے اداس سی ہو گئی۔ مگر جلدی ہی اس نے اداسی کو جھٹک دیا۔ اور کھانا کھانے لگی۔ دارا موٹر سائیکل پر وہاں آیا تھا۔ موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی تھی۔

کھانے کے بعد عورت برتن اٹھا کر لے گئی تو دارا نے سگریٹ جلا دیا۔ روبی نے کہا۔ "ایک سگریٹ مجھے بھی دے دو۔" دارا نے قدرے تعجب سے اس کی طرف دیکھا پھر سگریٹ دے کر سلگایا۔ دارا کو روبی کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ سہراب نامی غنڈہ اغوا کر کے لے گیا تھا۔ جہاں اس نے اسے بے آبرو کرنا چاہا اور اس لڑکی نے بہادری سے کام لیتے ہوئے ان چاروں بدمعاشوں کو ہلاک کر ڈالا اس قسم کی جرات کوئی بھی ایسی عورت کر سکتی تھی جو نیک پاک ہونے کے ساتھ ساتھ دلیر بھی ہو۔ وہ روبی کے ماضی سے بالکل ناواقف تھا۔

روبی کے سگریٹ پینے کے بارے میں دارا نے یہی سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ اسے گھر میں اپنی ماں یا باپ سے سگریٹ' حقہ پینے کی عادت پڑ گئی ہو۔ دارا میں ایک صفت یہ بھی بڑے کمال کی تھی کہ وہ کسی پر بہت ہی کم اعتماد کرتا تھا۔ تب دادا نے روبی سے پوچھا۔

"اب اس کا کیا ارادہ ہے؟" اگر تم پنجاب میں اپنے کسی رشتے دار کے ہاں جانا چاہتی ہو تو میں وہاں تمہیں اپنی نگرانی میں پہنچا دوں گا۔ مگر میں اب بھی تمہیں یہی کہوں گا کہ تم

اپنے خاوند اور بچی کو ساتھ لے کر جاؤ۔" روبی کے چہرے پر گہری متانت چھائی ہوئی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"پنجاب میں ہمارا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔" دارا بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے تمہارے ماں باپ ضرور ہوں گے۔ بہن بھائی ہوں گے۔ آخر وہ لوگ کہاں ہیں؟" روبی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میرا اور میرے خاوند شیر خان کا پاکستان میں کوئی رشتے دار نہیں ہے کوئی بہن بھائی نہیں ہے۔ ہمارے ماں باپ بھی مر چکے ہیں۔" دارا حیرانی سے روبی کا منہ تکنے لگا۔

"کمال ہے۔ تو پھر تم کیا سوچ کر جیل سے بھاگی ہو؟"

اس سے تو بہتر تھا کہ تم جیل ہی میں رہتیں۔ ضروری نہیں کہ تمہیں موت کی سزا سنائی جاتی۔ تمہیں عمر قید بھی ہو سکتی تھی اور اچھے چال چلن کی وجہ سے تم دس بارہ سال میں رہا بھی ہو جاتیں۔" روبی نے سامنے درختوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرے ایسی عورت جیل میں دس بارہ سال نہیں گزار سکتی۔ میری زندگی کا ایک مقصد ہے۔ میرے سامنے ایک مشن ہے۔"

"دارا نے سگریٹ کا کش لگایا روبی کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"اگر تم چاہو تو شیر خان اور اپنی بچی کو لے کر پاکستان سے فرار بھی ہو سکتی ہو۔ تم دوبئی چلی جاؤ میں اس کا بھی انتظام کر سکتا ہوں۔ کراچی کے ساحل سے اسمگلروں کی لانچیں چلتی رہتی ہیں۔" روبی نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا۔

"میں پاکستان سے بھاگ کر جانے کے لئے پاکستان نہیں آئی ہوں۔" دارا نے فوراً کہا۔

"تو پھر تم کیا کرو گی بی بی؟ تم ایک گھریلو قسم کی عورت ہو۔ ٹھیک ہے تم نے اپنی عزت بچانے کے واسطے وقتی طور پر بہادری سے کام لے کر چار بدمعاشوں کا خون کیا ہے اور اب جیل سے فرار بھی ہو گئی ہو مگر اصل میں تم ایک کمزور اور شریف بی بی ہو۔ دنیا بڑی خراب ہے۔ یہاں تمہیں میرے ایسے آدمی بہت کم ملیں گے جو دوسروں کی ماں بہن کی عزت اپنی ماں بہن کی عزت کی طرح سمجھتے ہوں میں بھی تمہیں اپنے پاس زیادہ دیر نہیں

ٹھہرا سکتا۔ میرا جیسا بھی کاروبار ہے بہر حال مجھے اس کاروبار کو چلانا ہے۔ تم میرے پاس چھپی رہیں تو میرے لئے دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ پولیس کو سراغ مل سکتا ہے اور پھر میں بھی اندر ہو سکتا ہوں نا بی بی ناں۔ یہ سودا میں نہیں کر سکتا۔ میری ماں نے مجھے حکم دیا تھا کہ تمہیں جیل سے بھگا دوں۔ میں تمہیں جیل سے نکال لایا ہوں اب تم سوچ کر آج کل میں فیصلہ کر لو تمہیں کہاں جانا ہے۔ میں وہاں تمہیں پہنچا دوں گا۔ اب میں جاتا ہوں۔ رات کو تھوڑی دیر کے لئے آؤں گا۔ بہتر ہے کہ تم مجھے آج رات کو ہی بتا دو کہ تم نے کہاں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

دارا موٹر سائیکل پر بیٹھ کر چلا گیا۔

یہاں آتے ہوئے دارا بڑی احتیاط سے کام لیتا تھا۔ آدھے راستے میں اس نے اپنی موٹر سائیکل ایک دوست کے گیراج میں تیل وغیرہ چیک کروانے کے بہانے چھوڑ دی اور وہاں سے بس میں بیٹھ کر اپنے ڈیرے پر آ گیا۔ پولیس ابھی تک اس کے ڈیرے پر نہیں آئی تھی۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے پولیس کو اس طرف کا خیال ہی نہ آیا ہو اسی روز تیسرے پہر اس کی جیل میں اپنی ماں سے ملاقات تھی۔ وہ ماں کے لئے بازار سے پراٹھے کباب بندھوا کر ساتھ لیتا گیا اس کی ماں کو پراٹھے کباب بڑے پسند تھے۔ وہاں اور لوگ بھی ملاقات کو آئے ہوئے تھے۔ دارا کی ماں نے اس سے روبی کے بارے میں پوچھا کہ اسے کہاں رکھا ہوا ہے دارا نے بتا دیا کہ شہر کے باہر والے خفیہ ٹھکانے پر رکھا ہوا ہے۔ ماں نے پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"اسے ابھی تک اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے تم نے تمہاری وہ کیا لگتی ہے؟ اسے اس کے آدمی کے پاس کیوں نہیں بھیجتے؟" دارا نے کھجاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا اور بولا۔

"ماں میں کیا کروں وہ اپنے آدمی کے پاس جانا نہیں چاہتی۔" ملنگی کو غصہ آ گیا۔

"تو پھر جہنم میں جائے تم نے اس مصیبت کو اپنے پاس کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ میں نے اس پر ترس کھا کر اسے یہاں سے بھگایا تھا کہ بے گناہ عورت ہے۔ بچے والی ہے یہاں سے بھاگنا چاہتی ہے۔ بھاگ جانے دو۔ مگر وہ تیرے سر پر کیوں سوار ہو گئی ہے۔ جا کر اس کے خاوند سے ملو اور اس کے حوالے کر دو۔" پھر کچھ سوچنے کے بعد ملنگی نے کہا: "نہیں نہیں

تم اس کے خاوند کے گھر مت جانا پولیس نگرانی کر رہی ہو گی۔" دارا آہستہ سے بولا۔

"ماں یہاں پولیس نے تم سے کوئی پوچھ گچھ تو نہیں کی؟ میرا خیال تھا کہ شاید پولیس تم سے بھی کچھ پوچھے اور ہو سکتا ہے کہ میرے ڈیرے پر بھی اسی حوالے سے چھاپے مارے مگر میرے ڈیرے پر تو پولیس ابھی تک نہیں آئی۔" ملنگی بڑے مزے لے لے کر پراٹھا کباب کھا رہی تھی۔ دارا اس کے لئے سامنے والے نلکے سے گلاس میں پانی بھر لایا۔ ملنگی نے پانی پیا۔ اور کہنے لگی۔

"دارا اس مصیبت کو اپنے ڈیرے سے بھگا دو۔ پنجاب کی ہے وہاں اس کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار تو ہو گا۔"

جب دارا نے بتایا کہ وہ کہتی ہے ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں۔ ماں باپ بہن بھائی بھی نہیں تو ملنگی نے بیٹے کے منہ پر ہلکا سا طمانچہ مارا اور ڈانٹ کر بولی۔

"تم الو ہو۔ بالکل بدھو ہو۔" پھر غور سے دارا کو دیکھا اور بولی۔

"کہیں تمہاری نیت تو خراب نہیں ہو گئی اس پر؟ دارا نے گردن اوپر اٹھا کر کہا۔"ماں تم مجھے ایسا سمجھتی ہو؟ یاد نہیں میں نے اپنے باپ سے کیا وعدہ کیا تھا ماں؟"

تمہارا بیٹا ایسا گھٹیا آدمی نہیں ہے ٹھیک ہے میں غلط کام ضرور کرتا ہوں مگر دوسروں کی ماں بہن کی عزت کو اپنی ماں بہن کی عزت سمجھتا ہوں۔" ملنگی نے دارا کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"ٹھیک ہے جیتے رہو بیٹا۔ مجھے تم سے یہی امید تھی مگر اس عورت کا زیادہ دن تمہارے پاس رہنا ٹھیک نہیں۔ تم ناحق مارے جاؤ گے۔ یہاں چار حوالدارنیوں کو لائن حاضر کر دیا گیا ہے ان کی پیٹیاں بھی اتار دی گئی ہیں۔ مجھ سے ابھی تک کسی نے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی مگر مجھے شک ہے کہ پولیس تمہاری ضرور نگرانی کر رہی ہے۔ تم کب اپنے خفیہ ڈیرے پر جاتے ہو؟" دارا نے کہا۔"رات میں ایک بار جاتا ہوں مگر بڑی احتیاط کے ساتھ۔" ملنگی کو ایک بار پھر غصہ آ گیا۔ اس نے دارا کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تمہارا باپ بھی بالکل ایسا ہی بیوقوف تھا۔ الو کے پٹھے! اس عورت کو کسی طرح اس کے آدمی کے پاس پہنچا دو۔ یہ بلا جس کی ہے اس کے حوالے کرو۔" دارا نے بڑے ادب

سے کہا۔ٹھیک ہے ماں جو تمہارا حکم۔" جب ملاقات کا وقت ختم ہوا اور دارا جانے لگا تو ملنگی نے اسے قریب بلا کر کہا۔

"ایک بات یاد رکھنا جب تک یہ مظلوم عورت تمہارے ڈیرے پر ہے اس کی حفاظت کرنا اسے پولیس کے ہتھے نہ چڑھنے دینا۔ یہ میرا حکم اور تمہارا فرض ہے۔"

"اچھا ماں۔" دارا چلا گیا۔

دارا نے بھی اپنے شہر والے ڈیرے کی نگرانی کے لئے اپنے خاص آدمی چھوڑ رکھے تھی۔ جو سفید کپڑوں والے پولیس کے آدمیوں کو پہچان لیتے تھے۔ ویسے بھی دارا نے پولیس کے فرض ناشناس رشوت خور آدمیوں کے وظیفے لگا رکھے تھے جو دارا کے مفادات کی حفاظت کرتے تھے۔ اس کے باوجود روبی کے فرار اور اسے اپنے خفیہ اڈے پر چھپانے کے بعد دارا زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ ماں سے ملاقات کرنے کے بعد وہ سیدھا اپنے شہر والے ڈیرے پر آیا۔ یہاں اس نے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے اسکریپ کا معمولی سطح پر کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ اصل میں وہ کویت اور دوبئی سے ناجائز طور پر اسمگل کیا ہوا مال اونے پونے خرید کر آگے سپلائی کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی کوکین بھی ملک سے باہر اسمگل کرا دیتا تھا۔ ڈیرے پر آتے ہی اس نے اپنے ایک خاص آدمی بخشو کو بلوایا اسے دکان کے اندر لے گیا۔ اس کے ڈیرے میں صرف بخشو کو معلوم تھا کہ دارا نے ایک مظلوم عورت کو جیل سے فرار کروایا ہے۔ بخشو دارا کا خاص رازدار ساتھی تھا۔ پچاس سال کی عمر ہو گی مگر بدن مضبوط تھا۔ دارا نے اسے یہ کہہ کر روبی کے خاوند شیر خان کے محلے میں بھیجا کہ وہ جا کر معلوم کرے وہاں کی صورتحال کیا ہے۔

"مگر خیال رکھنا تمہیں خفیہ پولیس کے آدمی نہ دیکھ لیں۔" بخشو مسکرانے لگا۔

"دارا! اگر پولیس نے دیکھ لیا تو پھر زندگی کس کام کی؟" تھوڑی دیر بعد بخشو ایک فقیر کے بھیس میں کشکول گلے میں ڈالے ڈیرے کے عقبی دروازے سے نکلا اور شیر خان کے محلے کی طرف چل پڑا۔ کوئی پون گھنٹے بعد بخشو واپس آ گیا اس نے دارا کو بتایا۔

"دارا شیر خان کو پولیس لے گئی ہے اس کی بچی محلے کی ایک مریم نامی عورت کے پاس ہے۔ خفیہ پولیس کے چار آدمی وہاں برابر ناکہ بندی کیے ہوئے ہیں۔" دارا کے لئے یہ بڑی

تشویش ناک خبر تھی۔ ظاہر ہے پولیس شیر خان سے پوچھ گچھ کر رہی ہو گی۔ اس پر تشدد بھی کیا جا رہا ہو گا۔ ان حالات میں اگر وہ روبی کو اس کے گھر بھیجے گا تو پولیس فوراً اسے گرفتار کرے گی۔ دارا شش و پنج میں پڑ گیا۔ پولیس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ شیر خان کو کب واپس بھیجتی ہے۔ شیر خان کا آگے پیچھے کوئی والی وارث بھی نہیں۔ پولیس تو مار مار کر اس کا برا حال کر دے گی۔ کہ بتاؤ تمہاری عورت کہاں ہے؟ اسے کہاں چھپا رکھا ہے؟ کس نے باہر سے رسہ پھینک کر اسے جیل سے فرار کروایا تھا؟

جب رات ہو گئی تو دارا اندھیرے میں ڈیرے سے نکل کر ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ وہ چکر کاٹ کر روبی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ تاکہ اگر خفیہ پولیس کا کوئی آدمی اس کے پیچھے لگا ہو تو اسے یہی معلوم ہو کہ دارا دوسرے شہر جا رہا ہے اس کے باوجود دارا بے حد محتاط تھا۔ اسٹیشن پر جا کر وہ ایک ہوٹل میں دیر تک بیٹھا رہا یہیں اس نے کھانا کھایا پھر چائے کا ایک کپ منگوا کر پیتا رہا۔ جب اسے کچھ یقین سا ہو گیا۔ کہ خفیہ پولیس کا کوئی آدمی اس کا پیچھا نہیں کر رہا ہے تو اگلے اسٹیشن پر اترنے کے بعد اس نے ایک بس پکڑی۔ اور اپنے دوست کے گیراج میں پہنچ گیا۔ وہاں سے اپنی موٹر سائیکل نکال کر اس پر سوار ہوا اور اپنے خفیہ ٹھکانے کی طرف چل دیا۔ یہ ایک ایسا ٹھکانہ تھا جہاں دارا سال میں کبھی ایک مرتبہ ہی آتا تھا۔ اور وہ بھی آدھی رات کے وقت جب کسی خاص اسمگلنگ پارٹی سے ملاقات کرنی ہوتی تھی۔ ایک بوڑھی عورت کو اس نے وہاں دیکھ بھال کرنے کے لئے رکھ چھوڑا تھا جو وہاں رہتی تھی۔ اس بار دارا نے اپنے خفیہ ٹھکانے سے کافی پیچھے ہی کیکر کے درختوں کے نیچے اپنی موٹر سائیکل کھڑی کر دی۔ اور پیدل چل پڑا روبی جاگ رہی تھی۔ وہ کافی بے چین نظر آ رہی تھی۔ وہ دارا کا آخری فیصلہ سننا چاہتی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ دارا کو اپنا سارا منصوبہ بتا کر اسے اپنے ساتھ شامل ہونے کو کہے گی۔ لالٹین کچی کوٹھری کے اندر جل رہی تھی بوڑھی عورت بکریوں کے پاس چارپائی ڈال کر سو رہی تھی۔

روبی نے روٹی وغیرہ کھا لی تھی۔ وہ کوٹھری کے باہر ہی اندھیرے میں ٹہل رہی تھی۔ اسے بار بار اپنی بچی عائشہ کا خیال آ رہا تھا۔ اسے کسی نے دودھ پلایا ہو گا یا نہیں۔ پھر وہ

سوچتی کہ شیر خان تو اس کا بڑا خیال رکھ رہا ہو گا۔ ساتھ والی مریم بھی تو ہے۔ اس نے بچی کو سنبھال لیا ہو گا۔ اتنے میں اسے زور سے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی اس نے درختوں کی طرف دیکھا تھوڑی دیر بعد ایک انسانی سایہ درختوں کی طرف سے کوٹھری کی طرف آتا دکھائی دیا روبی سمجھ گئی کہ یہ دارا کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ کوٹھری کی دیوار کے ساتھ ہو گئی جہاں اندھیرا تھا دارا قریب آ گیا۔ اس نے بھی روبی کو دیکھ لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم نے روٹی کھائی ہے بی بی؟"

روبی نے آہستہ سے "ہاں" کہا اور کوٹھری میں دارا کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ چارپائی پر بیٹھتے ہی دارا نے کہا۔

"پولیس تمہارے آدمی شیر خان کو کل سے لے گئی ہے۔" روبی نے جلدی سے پوچھا۔

"میری بچی کہاں ہے؟" دارا نے کہا۔

"وہ محلے کی مریم نامی عورت کے پاس ہے۔" روبی نے اطمینان کا سانس لیا۔ مریم پر روبی کو بڑا بھروسہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مریم اس کی بچی کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کر رہی ہو گی۔

جہاں تک شیر خان کا تعلق تھا یہ اسے بھی معلوم تھا کہ پولیس پوچھ گچھ کے لئے اسے ضرور لے جائے گی۔ اگر اسے کوئی تشویش تھی تو صرف یہ کہ پولیس شیر خان پر زیادہ تشدد نہ کرے اس نے فوراً دارا کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور خشک سی آواز میں بولی۔

"پولیس اس پر زیادہ تشدد تو نہیں کرے گی؟" دارا نے کہا۔

"کیوں نہیں کرے گی؟ شیر خان پولیس کا رشتے دار تو نہیں ہے۔ ایک مفرور عورت کا خاوند ہے اس پر تو خوب تشدد ہو گا۔ تاکہ وہ بتائے کہ مفرور ملزم کہاں ہے۔" روبی نے کہا۔

"مگر شیر خان کو تو میرے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں۔" دارا جھنجلا سا گیا کہنے لگا۔" بی بی ان باتوں کو چھوڑو مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہاں سے کب جانے کا فیصلہ کیا ہے اب میں اس سے زیادہ دن تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ تم نے جو کچھ سوچ رکھا ہے اسے اپنے پاس ہی رکھو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے میں نے تمہارے لئے جو کرنا تھا کر دیا۔ اب یہاں سے بوریا بستر گول کرو۔ میں تمہارے ساتھ اندھے کنوئیں میں نہیں

گر سکتا میری ماں کا بھی یہی حکم ہے۔" روبی نے جلدی سے پوچھا۔"خالہ سے ملے تھے تم؟ میرا پوچھا تھا خالہ نے؟" دارا نے بے نیازی سے جواب دیا۔"ہاں پوچھا تھا بلکہ اس نے میرے ہاتھ بھی یہی پیغام بجھوایا ہے کہ اب تمہیں اپنے خاوند کے پاس یا کسی رشتے دار کے پاس چلے جانا چاہیے۔" روبی کہنے لگی۔"لیکن دارا بھائی! میرا کوئی رشتہ دار نہیں جس کے پاس جاؤں۔ شیر خان اگر تھانے سے گھر آبھی گیا تو میں اس کے پاس نہیں جانا چاہتی۔" دارا کو غصہ آگیا۔"کمال کرتی ہو؟ تم کوئی عورت ہو یا کوئی ڈکیت ہو۔؟ جیل سے فرار بھی ہو گئی ہو اور اپنے خاوند کے پاس بھی جانا نہیں چاہتی ہو۔" پھر اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔"بی بی! میری بات سن لو آخری بار کہہ رہا ہوں کل تمہیں یہاں سے چلے جانا ہو گا۔ مجھے نہیں معلوم کہاں جاؤں گی۔ بس یہاں سے چلی جانا میں جتنی تمہاری خدمت کر سکتا تھا کر چکا یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ تمہارے پاس آج کی رات اور کل کا دن ہے اس دوران سوچ لو کہ تمہیں کہاں جانا ہے کل رات میں آؤں گا اور تم جہاں جانا چاہتی ہوگی تمہیں اس طرف روانہ کر دوں گا۔ کچھ پیسے بھی تمہیں دے دوں گا۔ اس کے بعد تم جانو اور تمہارا کام۔ بس صرف ایک گزارش کروں گا کہ اگر پکڑی جاؤ تو پولیس کو میرا نام نہ بتانا آخر ہم برے لوگوں کی بھی کچھ عزت ہوتی ہے۔ کچھ رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں بس یہی کہنے آیا تھا۔"

دارا کے چلے جانے کے بعد روبی سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے دارا کو اپنے ساتھ ملانے کا خیال دل سے نکال دیا۔ روبی کو جیسے کردار کے آدمی کی ضرورت تھی۔ اس کے ننانوے فی صد خوبیاں اس شخص میں موجود تھیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ دارا کی شخصیت پر اپنی ماں کا بہت زیادہ اثر تھا۔ اگرچہ روبی کی جیل سے رہائی اس اثر کا نتیجہ تھی لیکن اب یہی اثر اس کے آئندہ کے مشن کی راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ روبی کے اب واپس اپنے گھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ جیل توڑ کر بھاگی تھی۔ اس پر ایک دوسرا کیس بھی چل پڑا تھا۔ شیر خان پولیس کی تحویل میں تھا۔ اگر وہ گھر پر بھی ہوتا تو جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے روبی اپنی بچی عائشہ کو ساتھ لے کر ایک مفرور قاتلہ کی حیثیت سے دربدر پھرتے ہوئے اس کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی بچی کو ایک بہادر شیرنی بنانا چاہتی تھی۔ مگر

شریف اور باحیا لڑکی بن کر اپنی طرح کی قانون شکن بہادری ورثے میں نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کی اپنی زندگی تو جیسے بنی تھی بن گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے ماں باپ کی صحیح پرورش نصیب نہ ہو سکی تھی بچپن ہی میں اس کے ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور وہ غلط ماحول میں پڑ گئی تھی لیکن وہ اس تمثیل کو اس کھیل کو دہرانا نہیں چاہتی تھی۔

شیر خان پر اسے پورا اعتماد تھا کہ وہ نہ صرف اپنی بچی سے پیار کرتا ہے بلکہ وہ اس کی پرورش انہی خطوط پر کرے گا جس کی روبی نے اسے تاکید کی تھی۔ پولیس کب تک اسے اپنے پاس رکھے گی۔ وہ بہت جلد گھر آجائے گا اور پھر بڑے سکون کے اور اطمینان کے ساتھ بچی کو دین و دنیا کی بہترین تعلیم دلا سکے گا۔ شیر خان میں ایسی تمام خوبیاں موجود تھیں اس کے سامنے دوسرا راستہ یہ تھا کہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دے مگر سہراب کے بھائی ہاشم کی کوکین کی کمائی ہوئی بے پناہ دولت نے روبی کا کیس خراب کر دیا تھا اور اسے پھانسی کا پھندا صاف نظر آنے لگا تھا۔ اگر اسے پھانسی نہیں بھی ہوتی تو عمر قید کی صورت میں بھی اب جیل سے بھاگنے کے جرم کی سزا کا بھی اس میں اضافہ ہو جائے گا اور روبی کی ساری عمر جیل کی چاردیواری میں ایک ایسے جرم کی سزا کاٹتے گل سڑ جائے گی جو جرم نہیں تھا بلکہ اپنی جان اور عزت کا تحفظ تھا۔ جس کی اجازت اسے دنیا کا ہر قانون دیتا ہے مگر یہاں معاملہ اس کے برخلاف ہو گیا تھا۔

روبی سوچنے لگی کہ اسے کس سمت نکلنا چاہئے دارا نے بھی اسے مزید پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے روبی نے سوچا کہ اگر وہ اپنی بچی کے مستقبل کی خاطر اگر دارا کی اس تجویز پر عمل کر لیتی ہے اور شیر خان کو ساتھ لے کر ملک سے باہر کویت یا دوبئی میں اسمگل ہو جاتی ہے تو ایک مفرور قاتلہ کی حیثیت سے وہ زیادہ دن تک وہاں آزادی سے نہ رہ سکے گی اور بہت جلد گرفتار ہو جائے گی۔ اور یا اسے وہاں سے بھی کسی دوسرے ملک میں بھاگنا پڑے گا۔ نہیں نہیں۔

روبی اپنے سر کو جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اس کی مٹھیاں اپنے آپ بھنچ گئیں۔ اس نے دونوں بند مٹھیاں زور سے دیوار پر دے ماریں اور اپنے آپ سے کہا۔ تیری زندگی اب ان مظلوم بے بس بے زبان عورتوں کی عزتیں بچانے کے لئے وقف ہو گئی ہے جو اپنی

عزت آپ نہیں بچا سکتیں۔ تجھے اس ملک کو جو اسلام کے نام پر بنا ہے اپنی زندگی کی قربانی دے کر جنت کی مثال بنانا ہے ان بے ضمیر لوگوں کے ہاتھ توڑ دینے ہیں جو رشوت لے کر قانون کا چہرہ مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پاکباز عورتوں کی عزتوں کو سربازار اچھالنے میں انسان دشمن غنڈہ عناصر کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ روبی تجھے اس وطن پاک کو اللہ کی اس بہت بڑی عبادت گاہ کو ان مشرکوں اور تخریب کاروں سے پاک کرنا ہے۔ جو مومنوں کی صفوں میں گھس آئے ہیں اور انہیں درہم برہم کرتے ہوئے سلامتی کی سرزمین کے امن و امان کو تہہ و بالا کر رہے ہیں۔ روبی باہر کھلی فضا میں آگئی۔ آسمان پر ستارے زر و جواہر کی طرح چمک رہے تھے۔ ٹھنڈی شفاف اور پاکیزہ ہوا چل رہی تھی۔ روبی کے اوپر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور سجدے میں گر پڑی۔ یہ خدائے ذوالجلال کی عظمت کے اعتراف کا سجدہ تھا۔ یہ اس عزم کے بے ساختہ اظہار اور اقرار کا سجدہ تھا کہ اللہ نے انسان کو جو طاقت عطا کی ہے اسے اللہ ہی کی راہ میں استعمال کرنا چاہئے روبی نے بدی کے خلاف تن تنہا جہاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رات گزر گئی، دارا اپنی جگہ پر مطمئن ہو گیا تھا کہ روبی آج رات جدھر سینگ سمائیں گے چلی جائے گی اس نے سوچ رکھا تھا کہ اس نے اگر پنجاب کی طرف نکل جانے کی خواہش کی تو وہ اسے کم از کم بہاولپور تک چھوڑنے اس کے ساتھ ضرور جائے گا۔ دارا کو یقین تھا کہ روبی پنجاب ہی کا رخ کرے گی۔ آخر کوئی نہ کوئی تو وہاں پر اس کا رشتہ دار ہو گا اور اگر اس نے دوبئی کویت جانے کے لئے کہا تو وہ اسے اسمگلر دوست کی لانچ میں بٹھا دے گا۔ آگے وہ جانے اور اس کا کام.........

دوسرے دن دارا کو اپنے آپ ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا تھا۔ دارا دوپہر کو کراچی سے پندرہ بیس میل دور سمندر کے کنارے مچھیروں کی بستی میں چلا گیا۔ یہاں وہ سہ پہر تک رہا۔ اگلی رات اسے منشیات کے پندرہ پیکٹ اسمگلروں کے حوالے کرنے تھے۔ جو وہیں رقم ادا کر کے انہیں جنوبی امریکہ کے ایک ملک میں لے جانے والے تھے۔ اس نے پیکٹوں کا معائنہ کیا۔ اس کے چار مسلح آدمی وہاں پر موجود تھے پیکٹ پلاسٹک کے تھیلے میں رکھے ہوئے تھے۔ شام تک وہ وہیں رہا۔ اس نے رات کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ پھر اپنے ڈیرے کی طرف چل پڑا وہ اپنی جیپ میں سوار تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا ورنہ عام طور پر دو ایک باڈی گارڈ ساتھ ضرور ہوتے تھے۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ وہ گیارہ بجے رات تک اپنے ڈیرے میں ہی رہے گا اور اس کے بعد جب رات گہری ہو جائے گی تو روبی کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ اس نے بخشو کو کہہ رکھا تھا کہ اگر روبی نے لاہور جانے کے لئے کہا تو وہ اسے بہاولپور تک چھوڑ آئے گا اپنی جیپ میں ہی جائے گا اور دن کے وقت واپس آئے گا۔ اور اگر اس نے دوبئی جانے کے لئے کہا تو وہ اسے رات خفیہ اڈے پر ہی رکھے گا اور دوسری رات جب وہ منشیات کے پیکٹ اسمگلروں کے حوالے کرے گا تو روبی کو بھی ان کے ساتھ ہی لانچ میں بٹھا دے گا۔ دارا بڑی تیز رفتاری سے جیپ لے جا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ گاڑی تیز چلاتا تھا۔ لائسنس یافتہ بھرا ہوا پستول اس کی صدری کی جیب میں تھا۔ وہ جب بھی باہر نکلتا تھا۔ اپنے پاس لائسنس یافتہ پستول ہی رکھتا تھا۔ حالانکہ اس کے پاس ناجائز اسلحہ بھی کافی تعداد میں تھا جسے اس نے اپنے آدمیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اسے کسی جگہ ذخیرہ کر کے نہیں رکھا تھا۔ کیونکہ اس طرح چھاپہ پڑنے پر وہ

پولیس کے قبضے میں آسکتا تھا۔

کراچی کی رات کی بڑی خوشگوار مرطوب ہوا چل رہی تھی۔ یہ پاکستان کے شروع شروع کے دن تھے۔ ابھی کراچی کی سڑکوں پر اتنا رش نہیں ہوا تھا جو آج دیکھنے میں آرہا ہے۔ لوگوں کے پاس گاڑیاں بھی محدود تعداد میں تھیں مگر یہ اس وقت بھی ایک بڑا شہر تھا۔ اور راتوں کو اس کی روشنیاں جگ مگ جگ مگ کرتی تھیں۔ ساحل سمندر پر پکنک منانے والوں کی ٹولیاں جمع رہتی تھیں۔ اور شہر کی دکانیں ہر قسم کی چیزوں سے بھری رہتی تھیں۔

دارا کی جیپ اب کراچی شہر کی بارونق سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ اس نے رفتار ہلکی کر رکھی تھی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر کھولا تو وہ خالی تھا۔ اس نے ایک بارونق روشن چوک کے کونے میں سگریٹوں کی ایک دکان دیکھ کر فٹ پاتھ کے ساتھ گاڑی کھڑی کی اور اتر کر سگریٹ کا پیکٹ لیا۔ دکاندار کو پیسے دیئے اور واپس جیپ میں سوار ہونے ہی لگا تھا کہ اس کی نگاہ سامنے جنرل اسٹور کی ایک کشادہ اور جگمگاتی ہوئی دکان پر پڑی۔ اسے خیال آیا کہ یہاں سے روبی کے واسطے کوئی تحفہ خریدنا چاہیئے۔ ظاہر ہے آج رات کو اسے کسی نہ کسی طرف نکل جانا ہے وہ اسے کوئی چیز تحفے کے طور پر بھی دینا چاہتا تھا۔ یہ حاجی صاحب کا اسٹور تھا جو اسے جانتے تھے۔ اس اسٹور میں دنیا جہان کی چیزیں ملتی تھیں۔

دارا نے اپنی جیپ وہیں سڑک کے کنارے کھڑی رہنے دی اور اسٹور میں داخل ہو گیا۔ اسٹور میں کافی رش تھا۔ عورتیں مرد سبھی شاپنگ کر رہے تھے۔ فضا بجلی کی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ اسٹور کے مالک حاجی صاحب نے دارا کو دیکھا تو اس کی خیریت معلوم کی۔ دارا نے کاؤنٹر پر جا کر کہا کہ میں اپنی ایک عزیزہ کے لئے سوٹ کا کپڑا خریدنا چاہتا ہوں۔ میری مدد کیجئے۔ حاجی صاحب اس وقت ایک نوجوان خاتون کو بچوں کے کھلونے دکھا رہے تھے۔ حاجی صاحب اس کو لے کر ریشمی کپڑوں والے اسٹال کی طرف جانے لگے تو دارا بولا۔

"نہیں نہیں حاجی صاحب پہلے آپ اس بی بی کو فارغ کر دیجئے میں بعد میں کپڑا دیکھ لوں گا۔"

حاجی صاحب اس خاتون کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس خاتون نے پلاسٹک کا ایک ہوائی

جہاز پسند کیا اور اپنے پرس میں سے پیسے نکال رہی تھی کہ اسٹور میں تین مشتبہ قسم کے آدمی داخل ہوئے انہوں نے اسٹور میں آتے ہی گاہکوں پر یوں نگاہ ڈالی جیسے یہ سارے لوگ ان کے نوکر چاکر ہوں۔ پھر ان میں سے ایک کی نگاہ کاسمیٹکس کے اسٹال پر سامان خریدتی ایک جوان عورت پر رک گئی۔ وہ اس عورت کی طرف بڑھے۔ دارا حاجی صاحب والے اسٹال سے ٹیک لگائے خاموش نظروں سے ان مشتبہ قسم کے آدمیوں کو دیکھنے لگا۔ ان کے چہروں پر ایک اوباش قسم کی مسکراہٹ تھی۔ تینوں اسٹال پر سامان خریدتی جوان اور خوش پوش عورت کے دائیں بائیں آکر کاؤنٹر پر جھک کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ ایک نے عورت کے کٹے ہوئے بالوں کی لٹ کو اپنی انگلی سے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"میری جان! تم کتنی خوبصورت ہو!"

عورت گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی اور اس نے وہی جملہ کہا جو ایسے موقعوں پر شریف عورت کہا کرتی ہیں۔ یعنی "تمہیں شرم نہیں آتی۔ تمہارے گھر میں ماں بہن نہیں ہے۔" اس پر وہ تینوں غنڈے قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔ دارا کی بھویں سکڑ کر رہ گئیں۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر کسی شریف عورت کو یوں سر عام بے عزت ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اچانک ایک غنڈے نے عورت کا دوپٹہ کھینچ کر پرے پھینک دیا۔ دوسرے نے عورت کی قمیض کا گریبان پکڑ کر ایک جھٹکے سے پھاڑ ڈالا۔ عورت نے چیخ مار کر اپنے دونوں بازو سینے پر کر لئے دہشت سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ایک غنڈے نے پستول نکال کر ہوائی فائر کر دیا۔ دوسرے نے نوجوان شریف عورت کو بازو سے پکڑا اور کھینچ کر اسٹور کے دروازے کی طرف لے جانے لگا۔ دوسرے غنڈے نے بھی پستول نکال لیا اور اوپر تلے تین بار ہوائی فائر کر دیئے تھے۔ عورت مدد کے لئے چیخ چیخ کر پکار رہی تھی۔ اسٹور میں بھگدڑ مچ گئی۔ سارے کے سارے آدمی اسٹور سے بھاگ گئے۔ دوسری طرف ایک یہ بدمعاش آدمی دارا ہی باقی رہ گیا جو کاؤنٹر سے ٹیک لگائے ابھی تک اس طرح کھڑا تھا۔

حاجی صاحب کاؤنٹر کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ کھلونے خریدنے والی عورت بھی خوفزدہ ہو کر بھاگ گئی تھی۔ جب غنڈے مظلوم عورت کو گھسیٹتے ہوئے دارا کے قریب سے گزرے تو دارا نے بڑی پرسکون مگر گہری آواز میں کہا۔

"اسے چھوڑ دو۔" ایک غنڈے نے تحقیر کے انداز میں قہقہہ لگا کر پوچھا "تمہاری ماں لگتی ہے یہ؟" دارا نے کہا "یہ میری چھوٹی بہن ہے۔" اس پر وہ غنڈہ جو مظلوم عورت کو گھسیٹ رہا تھا چلایا۔

"اسے یہیں ختم کر دو اوئے۔"

فوراً ایک نے دارا پر پستول کا فائر کر دیا۔ یہ دارا کی خوش قسمتی تھی کہ گولی اسے نہیں لگی اور اس کے کان کے قریب سے ہو کر پیچھے شیشے کے شوکیس کو جا لگی۔ شوکیس کا شیشہ چھناکے سے چکنا چور ہو گیا۔ اس دوران دارا اپنی صدری کی جیب سے بھرا ہوا پستول نکال چکا تھا۔ دوسرے غنڈے نے فائر کیا تو دارا اس سے ایک سیکنڈ پہلے اچھل کر پرے ہٹ چکا تھا۔ تیسرا غنڈہ دارا پر گولی چلانے ہی والا تھا کہ دارا کے پستول نے شعلہ اگلا اور گولی تیسرے غنڈے کے دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے گرتے ہی مظلوم عورت اپنا پھٹا ہوا لباس نیم عریاں جسم سنبھالتی ہوئی اٹھی اور اسٹور کے دروازے کی طرف بھاگی۔

اب اسٹور میں گولیاں چل رہی تھیں۔ دارا نے پستول کی ساری گولیاں دونوں غنڈوں پر ختم کر دیں۔ ان کے جسم چھلنی ہو گئے اور وہ خون میں لت پت اسٹور کے فرش پر تڑپ رہے تھے۔ دارا نے ماحول کا جائزہ لیا سارا اسٹور خالی تھا۔ حاجی صاحب کاؤنٹر کے پیچھے کانوں پر ہاتھ رکھے دہشت زدہ بیٹھے تھے اسٹور کے باہر بازار فائرنگ کی آوازوں کی وجہ سے خالی ہو گیا تھا۔

دارا نے دوسری جیب میں سے گولیاں نکال کر جلدی جلدی پستول میں بھریں اور پستول ہاتھ میں لئے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسٹور سے نکل کر بازار میں آ گیا لوگ دور دور کھڑے تھے یہ سب شریف لوگ تھے۔ یہ سب تماشا دیکھنے والے لوگ تھے۔ ان میں سے کسی کو نہ تو یہ جرات ہوئی تھی کہ ایک شریف عورت کو غنڈوں کے ہاتھوں بے عزت ہونے سے بچاتے اور نہ اب اتنا حوصلہ تھا کہ بڑھ کر دارا کو پکڑ لیں۔ دارا ان لوگوں کی نفسیات سے خوب واقف تھا۔ اسے صرف پولیس کی طرف سے خطرہ تھا۔ مگر وہاں پولیس کا ایک بھی سپاہی نہیں تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنی جیپ کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر پستول کو ڈیش بورڈ کے اوپر رکھا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے

اسے گھما کر خالی سڑک پر ڈال دیا تھوڑی دیر میں وہ جائے واردات سے کافی دور نکل آیا تھا۔

دارا کراچی کی روشن روشن سڑکوں پر طوفانی رفتار سے گاڑی چلاتا اپنے ڈیرے کی طرف آ گیا اس نے جیپ ایک طرف کھڑی کی۔ اس کے آدمی اسکریپ کو سمیٹ رہے تھے۔ کیونکہ یہ دکان بند کرنے کا وقت تھا۔ دارا کا خاص ساتھی بخشو جیپ کو دیکھ کر بڑھا۔ دارا نے جیپ کا دروازہ زور سے بند کیا اور بخشو کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ دکان کے پیچھے بنے ہوئے چھوٹے سے کمرے میں آ گیا۔ دارا کے چہرے سے بخشو نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہو گئی ہے کمرے میں آ کر اس نے دارا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"خیر ہے ناں۔" دارا نے جیب سے سگریٹوں کا پیکٹ نکالتے ہوئے ایک طرف اس طرح تھوکا جیسے اس کا حلق کڑوا ہو گیا ہے بخشو نے دوبارہ پوچھا "کیا بات ہے بیٹا تم بتاتے کیوں نہیں۔ کیا لانچ راستے میں پکڑی گئی ہے۔" دارا نے جواب دینے کی بجائے بخشو کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ بخشو کو جیپ میں بٹھا کر ڈیرے سے نکل گیا۔ رات کی روشنی اور تاریکی میں جیپ شہر سے دور نکل گئی تھی اور اب سمندر کا ویران سنسان کنارا شروع ہو گیا تھا۔ دارا نے جیپ کو ریت کے ایک ٹیلے کے پیچھے کھڑا کیا۔ انجن کو بند کر دیا اور جیپ سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر سگریٹ سلگایا اور پھر سارا واقعہ بخشو کو سنا دیا۔ بخشو کہنے لگا

"پھر کیا ہوا ہم سنبھال لیں گے۔" دارا بولا۔

"ایک حاجی صاحب عینی شاہد نہیں ہیں وہاں ہر آدمی نے مجھے دیکھا ہے پولیس تو اب تک ڈیرے پر پہنچ چکی ہو گی۔" بخشو بولا۔

"پولیس کیا کرے گی۔؟ ہم پیسہ چڑھا دیں گے۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔ پہلے تم نے جو خون کیے تھے وہاں پولیس نے کیا کر لیا تھا؟" دارا نے سگریٹ کا کش لگایا اور بولا۔

"بخشو دادا' یہ پہلے والی بات نہیں ہے۔ اکٹھے تین خون ہو گئے ہیں اور ایک نہیں کئی لوگوں نے مجھے خون کرتے دیکھا ہے خواہ میں نے غنڈوں کو ہی قتل کیا ہے مگر لگتا ہے کہ

اس بار میں سزا سے نہیں بچ سکوں گا۔" بخشو کہنے لگا

"تو پھر تم یہاں سے نکل جاؤ دوبئی کویت کی طرف چلے جاؤ کل رات اپنی لانچ مال لے کر تو آہی رہی ہے۔ وہ تمہیں آسانی سے کویت لے جائے گی۔" دارا نے کہا۔"بخشو! جب تک میری ماں زندہ ہے میں یہاں سے باہر نہیں جا سکتا۔ ماں خواہ جیل میں ہی ہے مگر وہ ابھی زندہ ہے۔ میں اسے دنیا والوں کے رحم و کرم پر اکیلی چھوڑ کر یہاں سے کسی دوسرے ملک نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ ایک بار یہاں سے نکل گیا تو پھر واپسی مشکل ہو جائے گی۔ یہاں رہوں گا تو کبھی کبھی ماں کو دیکھ لیا کروں گا۔ اس کی خیریت کی اطلاع ہی ملتی رہے گی۔ اس کی خدمت کر سکوں گا۔" بخشو نے صافے سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

دارا نے سگریٹ ایک طرف ریت پر پھینکا اور بولا۔"تم یہاں سے واپس ڈیرے پر جاؤ' میں روبی کی طرف جارہا ہوں۔ پولیس آئے تو کہہ دینا کہ دارا یہاں نہیں آیا۔" دونوں جیپ میں سوار ہو کر واپس چل پڑے سڑک پر آکر دارا نے بخشو کو جیپ سے اتارتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے ٹیکسی لے لینا۔ کل دوبئی سے لانچ مال لے کر آرہی ہے مال لے کر انہیں پاؤڈر (کوکین) بھی دینا ہے میں کل رات کے دو بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ تم میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا اور چاروں طرف سے چوکس رہنا۔ میرے وہاں آنے کی پولیس کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے۔" دارا نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر بخشو کو دیئے۔ اور جیپ کو سڑک پر آگے بڑھا دیا۔

ابھی شروع رات ہی کا وقت تھا۔ روبی جاگ رہی تھی۔ ویسے بھی آج رات اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ آج اسے اس پناہ گاہ سے نکل جانا تھا۔ ایک بہت بڑے چیلنج کی طرح ملک کی وسیع و عریض زمین اس کے سامنے تھی۔ وہ اس چیلنج سے خوف زدہ نہیں تھی لیکن فکر مند ضرور تھی۔ اسے نئے سرے سے ایک ایسی زندگی شروع کرنی تھی جس میں قدم قدم پر خطرہ منہ پھاڑے موجود تھا۔ یہ موت کا خطرہ نہیں تھا۔ موت سے روبی کبھی نہیں ڈری تھی۔ یہ خطرہ تھا پولیس کے ہاتھوں پکڑے جانے کا اور پھر باقی کی عمر جیل کی چار

دیواری میں سڑتے رہنے کا یہ روبی کو گوارا نہیں تھا۔ وہ مرنے سے پہلے پہلے زندہ رہنا چاہتی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو مرنے سے پہلے ہی مرجاتے ہیں کم از کم سو میں سے ننانوے فی صد ضرور مرجاتے ہیں۔ موت کو بھی انہیں مارتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ موت کو تو اپنا فرض پورا کرنے کے لئے زندگی چاہئے۔ روبی بھرپور اور توانا زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک پل بھی اپنے فرض سے غافل رہ کر گزارنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی جنگ بدی کی طاقتوں کے خلاف جنگ تھی۔ اس جنگ میں معرکہ آرائی کے لئے روبی کو اپنے جیسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ اور ساتھی اس کے قریب آکر اس سے جدا ہو رہا تھا۔ یہ دارا تھا۔ روبی نے سوچا دارا بھی سچا ہے۔ آخر وہ کیوں اپنی ایک خاص ڈھرے پر چلتی ہوئی زندگی چھوڑ کر اس کے ساتھ ایک مفرور مجرم کی زندگی اختیار کرے؟

روبی کو جیپ کی آواز سنائی دی۔ دارا نے آدھی رات کو آنے کا کہا تھا۔ وہ جلدی آگیا تھا۔ روبی کوٹھری سے نکل کر باہر آگئی بوڑھی ملازمہ عورت دیوار کے ساتھ بنے ہوئے چولہے پر کیتلی میں روبی کے لئے چائے تیار کر رہی تھی۔ جیپ احاطے کے درختوں میں آکر رک گئی۔ دارا باہر نکلا وہ ہاتھ سے سر کے بالوں کو جھاڑتا ہوا روبی کی طرف بڑھا۔

"میں جلدی آگیا ہوں۔" اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔

روبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ دارا نے بوڑھی عورت سے کہا۔

"ماسی چائے میں بھی پیئوں گا۔" روبی نے پوچھا۔"تم نے کھانا کھا لیا بھائی؟" دارا کی کوئی بہن نہیں تھی۔ جب بھی روبی اسے بھائی کہہ کر مخاطب کرتی دارا کو بڑا اچھا لگتا تھا۔ حالانکہ اس نے روبی کو کبھی بہن کہہ کر نہیں بلایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دارا ان آدمیوں میں سے تھا جو کسی عورت کو بہن نہ کہہ کر بھی اپنی بہن سمجھ سکتے تھے۔ دارا نے کوٹھری میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔" دارا کے چہرے مہرے اور باتوں سے بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ تین آدمیوں کا خون کر چکا ہے۔ اس کا ضمیر مطمئن تھا اس نے بھی روبی کی طرح اپنی جان اور ایک شریف بی بی کو سربازار بے آبرو ہونے سے بچاتے ہوئے تین درندوں کا خون کیا تھا۔ کسی کو شوقیہ یا بے گناہ قتل نہیں کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی دارا

کچھ خون کر چکا تھا۔ مگر وہ قتل کچھ اور طرح کے تھے۔ ان میں اسے سزا ملنی چاہئے تھی لیکن وہ بچ گیا تھا۔ اس لیئے کہ کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔ اب تو ایک دنیا نے دارا کو خون کرتے دیکھا تھا اور ان میں سے کئی لوگ اسے پہچانتے تھے۔ پولیس نے ان کے بیانات لے لیے ہوں گے اور اب تک اس کے ڈیرے پر پولیس چھاپہ مار چکی ہو گی۔ دارا نے جیب سے سگریٹوں کا پیکٹ نکال کر روبی کی طرف بڑھا دیا۔ روبی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ دارا نے خود ہی ایک سگریٹ سلگا لیا اور اس کا کش لگا کر بولا: "پھر تم نے کس طرف جانے کا فیصلہ کیا ہے بی بی؟" روبی نے طویل سانس بھر کر کہا۔

"میں ابھی پنجاب کی طرف ہی جاؤں گی۔ وہاں جا کر فیصلہ کروں گی کہ مجھے آگے کیا کرنا ہے۔"

دارا نے آہستہ سے کہا: "مگر تم تو کہتی تھیں کہ تم نے ایک منصوبہ بنایا ہوا ہے تم ایک مشن شروع کرنے والی ہو۔ پاکستان میں عزتوں کی حفاظت اور پیشہ ور مجرموں کو ختم کر دینے کا مشن۔ تمہیں کوئی دوسرا فیصلہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" روبی کھلے دروازے میں سے باہر دیوار کے ساتھ بنے ہوئے چولہے کو دیکھنے لگی جس میں آگ جل رہی تھی اور جہاں بوڑھی ملازمہ گلاسوں میں چائے انڈیل رہی تھی۔ کہنے لگی: "بہرحال اب تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے کہ میں آئندہ کہاں جاؤں گی اور کیا کروں گی۔" دارا نے ہلکا سا کش لگایا اور بولا: "مجھے اس بات سے پوری دلچسپی ہے کہ تم کہاں جاؤ گی اور آگے کیا کرو گی۔" روبی نے دارا کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔

"وہ کیوں؟" روبی کے ہونٹوں سے جیسے اپنے آپ یہ الفاظ نکل گئے تھے دارا نے کہا۔

"اس لئے کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔" روبی ایک دم چونک پڑی۔ بوڑھی نوکرانی چائے کے گلاس لے کر آ گئی۔ جب وہ چلی گئی تو روبی نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا

"تم میرے ساتھ ہو' کیا مطلب ہے تمہارا؟"

دارا نے گرم گرم چائے کا گھونٹ بھرا اور گلاس زمین پر رکھ دیا روبی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"تم نے کتنے خون کیے تھے؟"

روبی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دارا یہ کس قسم کے سوال پوچھ رہا ہے۔ اس نے کہا۔

"چار مگر تم کس لئے پوچھ رہے ہو؟"

دارا نے سگریٹ کی راکھ انگلی سے جھاڑتے ہوئے کہا

"اس لئے کہ میں تم سے ایک خون پیچھے ہوں۔ میں صرف تین غنڈوں کو ہی قتل کر سکا ہوں۔ وہ تھے ہی تین زیادہ ہوتے تو میرے پستول سے نکلی ہوئی گولیاں انہیں بھی بھون کر رکھ دیتیں۔" روبی تو جیسے ساکت سی ہو کر رہ گئی۔ دارا کہہ رہا تھا۔

"تم نے اپنی عزت بچانے کی خاطر چار غنڈوں کو جہنم میں پہنچایا تھا میں نے کچھ اپنی جان اور زیادہ ایک شریف بی بی کو بیچ بازار میں بے عزت ہونے سے بچاتے ہوئے تین آدمیوں کو بھون ڈالا۔" پھر دارا نے شروع سے لے کر آخر تک سارا واقعہ بیان کر دیا۔ روبی حیرت زدہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ دارا نے جب سارا واقعہ سنا دیا تو سگریٹ کو پاؤں تلے مسلتے اور گلاس میں سے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد بولا۔

"میں حیران ہوں کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ایسے موقعوں پر سب بھاگ جاتے ہیں کوئی کسی عورت کی عزت بچانے کے واسطے جرات کر کے آگے نہیں بڑھتا حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہئے جو لوگ عورتوں کی عزتوں پر ہاتھ ڈالتے ہیں وہ بڑے گھٹیا اور بزدل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شریف آدمی ان کے سامنے ڈٹ جائے تو یقین کرو وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے مگر جانے کیوں سارے لوگ بھاگ جاتے ہیں اور مظلوم کو ظالم کے حوالے کر دیتے ہیں۔" تب روبی نے کہا۔

"اسی لئے مجھے میدان میں آنا پڑ رہا ہے جو کام شریف لوگ نہیں کر سکتے وہ مجھے کرنا ہو گا۔ کیونکہ اگر نہ شریف لوگوں نے جرات کی اور نہ میں آگے بڑھی تو پھر تو بدی کی طاقتوں کو اس ملک میں کھل کر کھیلنے کی کھلی چھٹی مل جائے گی اور جو ملک شہیدوں کی قربانیوں کے خون سے تعمیر ہوا ہے اس کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہو گا ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔"

دارا نے روبی کو ٹوک کر کہا۔

"میں نہ کہو ...... ہم ...... کہو ...... کیونکہ اس جنگ میں میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔

اب میری زندگی کا بھی یہی مقصد ہو گا۔ میں نے اگر کوئی گناہ کیا ہے تو صرف منشیات کی اسمگلنگ کی ہے۔ اور صرف ایک آدمی کو ناحق مارا ہے وہ بھی لڑائی میں میرے سامنے آگیا تھا۔ بدمعاشی میں رہ کر میں نے دوسرا کوئی بڑا گناہ نہیں کیا۔ میں نے آج تک کبھی کسی کی ماں بہن یا بیٹی کو بری نگاہ سے نہیں دیکھا۔ باقی جو گناہ مجھ سے ہوئے ہیں میں ان کے لئے خدا سے معافی مانگتا ہوں اور اس ملک سے جرائم کو ختم کرنے کی جنگ شروع کر کے ان گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔" روبی نے فوراً کہا۔

"اس کے لئے تمہیں منشات کی اسمگلنگ سے بھی ہمیشہ کے لئے توبہ کرنی ہو گی۔"

دارا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر فوراً ہی سر کو جھٹک کر بولا۔

"ٹھیک ہے آج سے اس برائی کے خلاف بھی جنگ ہو گی۔" دارا نے روبی کو ساتھ لیا اور وہ رات کے دھندلے اندھیرے میں کیکر کے درختوں کے نیچے ٹہلنے لگے۔ دارا کہنے لگا۔

"میری بہن! تمہیں بہن سمجھا ہے اب بہن کہا بھی ہے مرتے دم تک تم میری بہن ہی رہو گی۔ ایک بھائی کی طرح میں تیری حفاظت کروں گا اور اگر وقت آیا تو محبت کرنے والے بھائی کی طرح تم پر اپنی جان نثار کر دوں گا۔" روبی بڑی متاثر ہوئی۔ اس نے بھی کہا۔" وہ اس کی محبت کرنے والی حقیقی بہن بن کر دکھائے گی۔ اسے کبھی یہ کمی محسوس نہیں ہونے دے گی کہ اس کی کوئی بہن نہیں ہے۔" وہ جیپ کے پاس آگئے۔ دارا نے چاروں طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"اب ہمیں یہاں نہیں رہنا ہو گا۔ کل رات کے وقت یہاں سے ایک اور ٹھکانے پر چلے چلیں گے۔ کیونکہ اب پولیس کو دو مفرور قاتلوں کی تلاش ہو گی۔"

"تم نے کوئی دوسرا ٹھکانہ سوچا ہے؟" روبی نے پوچھا۔

دارا نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

"اس قسم کے حالات کے لیے میں نے ایک ٹھکانہ پہلے سے بنایا ہوا ہے۔"

کل رات کو کسی وقت وہاں چلے جائیں گے۔ پھر اس نے کلائی اوپر کر کے گھڑی کی

چمکیلی سوئیوں کو غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔

"میرے وہاں جانے تک وقت ہو جائے گا۔"

"کہاں جاؤ گے اس وقت؟"

روبی نے پوچھا۔ دارا نے صرف اتنا کہا۔

"یہ میں تمہیں وہاں سے واپس آکر بتا دوں گا۔ تم اسی جگہ رہنا۔ میں صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں پہنچ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر دارا جیپ میں بیٹھ گیا روبی نے کہا۔

"اپنا خیال رکھنا بھائی ...."

دارا نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا روبی کے سر پر آہستہ سے پیار کیا مسکرایا۔ سیلف دبا کر انجن اسٹارٹ کیا اور تھوڑی دیر بعد جیپ تاریکی میں روبی کی نظروں سے غائب ہو گئی۔ کوٹھری میں آکر روبی سجدے میں گر گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کرنے لگی۔

"میرے مالک! میں اپنے آپ کو اپنی زندگی کو اپنی زندگی کے ہر عمل کو ایک ایک پل کو تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ اب جو عمل ہو گا تیری راہ میں ہو گا۔ جو قدم اٹھے گا تیری طرف ہی اٹھے گا مجھے طاقت دینا میرے محبوب خاوند اور میری پیاری بچی عائشہ کی حفاظت کرنا انہیں اپنی امان میں اپنی پناہ میں رکھنا۔ میں تیرا شکر ادا کرتی ہوں کہ تو نے مجھے ایک ایسا بھائی دیا جو صرف شریف ہی نہیں بلکہ بہادر بھی ہے۔ جو پیارے وطن پاکستان کی سلامتی کے واسطے شروع کی گئی بدی کے خلاف اس جنگ میں میرے ساتھ ہو گا مجھے ایک ایسے ہی بھائی کی ضرورت تھی۔ میں گناہ گار ہوں۔ میں تو اس لائق بھی نہیں کہ تیرے حضور جھولی ہی پھیلا سکوں میری زندگی کو اپنے لئے استعمال کرنا۔ مجھے اپنی راہ میں موت دینا اس سے بڑی میرے لئے اور کوئی خوش نصیبی نہیں ہو گی۔"

شہر سے دور ساحل سمندر کے مچھیروں کی بستی سے بھی ایک کوس کے فاصلے پر رات کی تاریکی میں ایک جھونپڑی میں لالٹین روشن تھی۔ بخشو اور دارا کے چار مسلح باڈی گارڈ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ چھوٹا سا کریٹ بھی ان کے قریب ہی رکھا ہوا تھا جس میں منشیات کے پندرہ پلاسٹک کے تھیلے تھے اور جنہیں دبئ سے آنے والی لانچ میں سوار

اسمگلروں کے حوالے کر کے ان سے ایک کروڑ کے قریب رقم وصول کرنی تھی۔ بخشو بار بار شہر کی جانب نگاہ دوڑاتا۔

"دارا بیٹا! ابھی تک نہیں آیا۔ خدا خیر کرے کہیں پولیس کے قابو میں نہ آگیا ہو۔" ایک باڈی گارڈ نے کہا۔

"بخشو! تم اپنے دارا کو اناڑی سمجھتے ہو کیا؟ پولیس ہمارے ڈیرے پر ہی چھاپہ مار سکتی تھی۔ دارا کا سراغ کبھی نہیں لگا سکتی۔ وہ آنے ہی والا ہو گا۔"

مغرب کی جانب دور تک سمندر کی تاریک چادر پھیلی ہوئی تھی۔ ستاروں کی روشنی میں سمندر کی ہلکی ہلکی لہریں چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ مرطوب ہوا چل رہی تھی۔ بخشو نے کہا۔

"آج سمندر بھی چپ چاپ ہے۔ لانچ میرا خیال ہے ایک گھنٹے تک یہاں پہنچ جائے گی۔"

وہ پانچوں جھونپڑے کے باہر ریت پر بیٹھ گئے اور سگریٹ پینے لگے۔ ان میں سے ایک نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"استاد کو اب آجانا چاہئے۔ لانچ کے آنے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔" اس کے بعد وہ سب ان غیر ہموار ٹیلوں کی طرف دیکھنے لگے جدھر سے شہر کو سڑک جاتی تھی۔ کوئی پانچ منٹ بعد ٹیلوں میں جیپ کی ہیڈ لائٹس دو بار روشن ہو کر بجھ گئیں۔ بخشو نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"دارا آگیا ہے۔ لالٹین اندر سے لاؤ۔" اسی وقت ایک باڈی گارڈ نے جلتی ہوئی لالٹین ہاتھ میں پکڑ کر چار بار لہرائی۔ پھر جیپ کی آواز قریب آنے لگی۔ دارا نے آتے ہی جیپ جھونپڑی کے پیچھے کھڑی کر دی۔ بخشو نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے نا؟ مجھے تو فکر ہونے لگی تھی۔" دارا جیپ سے اتر کر جھونپڑی میں آگیا۔ آتے ہی اس نے پوچھا۔

"پولیس کیا کر رہی ہے؟" بخشو نے بتایا۔

"پوری گارڈ نے چھاپا مارا تھا مگر انہیں مایوسی ہوئی۔ ڈیرے کے باہر خفیہ والے نگرانی

پہ لگا دیئے گئے ہیں۔ ہم نے کہا کہ دارا ادھر آتا تو یہیں پر ہوتا۔ وہ تو آیا ہی نہیں۔ خدا جانے کدھر نکل گیا ہے۔ غوث بخش اور کرم داد کو پولیس پوچھ گچھ کے لئے لے گئی ہے۔ کل شام تک ہم انہیں واپس لے آئیں گے۔" دارا نے لالٹین کی روشنی میں لکڑی کے کریٹ کو ٹھوکر ماری اور پوچھا۔

"مال اس میں ہے کیا؟" بخشو بولا۔

"ہاں دارا اسی میں ہے اور کہاں جائے گا مال۔ بس اب لانچ کا انتظار ہے۔ وہ بھی آنے ہی والی ہو گی۔ ٹائم ہو گیا ہے۔" دارے نے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کریٹ کو کھولو ذرا۔" اسی وقت کریٹ کا اوپر والا تختہ ہٹا دیا گیا۔ اندر گھاس پھونس بھرا تھا۔ دارا نے ہاتھ ڈال کر باری باری پندرہ منشیات کی تھیلیاں اس میں سے نکال کر اپنے قریب ہی زمین پر رکھ دیں۔ پھر ایک تھیلی کو کھولنے لگا۔ بخشو نے کہا۔

"کیا دیکھنے لگے ہو۔ اصلی مال ہے۔ وہی ہے جو تمہارے سامنے بھرا گیا تھا۔ کیا تمہیں ہم پر بھروسا نہیں ہے دارا؟"

دارا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کھلی ہوئی تھیلی اپنے پاس ہی رکھی۔ باقی تھیلیاں اپنے ایک باڈی گارڈ سے اٹھوائیں اور ستاروں کی روشنی میں سمندر کے کنارے جا کر اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سمندری لہریں اس کے پاؤں کو چھوتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ بخشو اور دارا کے چاروں باڈی گارڈ حیران تھے کہ وہ یہاں انہیں کس لئے لایا ہے۔ اتنے میں دارا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیلی الٹ دی۔ تھیلی میں موجود پاؤڈر سمندر کے پانی میں گر گیا۔ بخشو نے چلا کر کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہو بیٹا" دارا نے ترش رو ہو کر کہا۔

"چپ رہو بخشو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک کر رہا ہوں۔"

دارا نے باری باری ساری کی ساری تھیلیوں کو سمندر میں خالی کر دیں پھر پانی میں سے نکل آیا اور اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور پرعزم لہجے میں بولا۔

"آج کے بعد سے اس زہر کا کاروبار نہیں ہو گا۔ دارا کے ڈیرے پر نہ جوا ہو گا۔ نہ کوکین، چرس اور گانجا فروخت ہو گا۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو بخشو تم گواہ رہنا۔ میں جہاں بھی

ہوں گا اپنے ڈیرے پر آکر اس آدمی کو اپنے ہاتھوں سے گولی سے اڑادوں گا۔"

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ سب دارا کی طبیعت سے واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ دل کا سچا اور بات کا کھرا آدمی ہے۔ جب کوئی فیصلہ کرلیتا ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اسے اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹا سکتی۔ دارا جھونپڑی کے باہر چارپائی نکلوا کر بیٹھ گیا۔ بخشو اس کے سامنے ریت پر بیٹھا تھا۔ چاروں باڈی گارڈ رائفلیں لئے اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ دارا نے بخشو سے مخاطب ہو کر کہا

"سنو بخشو چاچا! کل سے میرے ڈیرے پر صرف اسکریپ کا کام ہو گا۔ تم اس کام کے اس دکان کے مالک ہوگے تم ایمانداری سے کام کرو گے۔ جتنی آمدنی ہو اس کے مطابق اپنے پاس ملازم رکھو گے۔ میری ماں کے مقدمے کی پیروی کرو گے۔ اس کے لئے میں تمہیں الگ رقم دے دوں گا۔ ہر روز تم جیل میں میری ماں کو کھانا پہنچاؤ گے اور اس کی خیر خیریت معلوم کرو گے۔ اسے میری طرف سے کہنا کہ اس کے بیٹے نے اپنے باپ سے کیے ہوئے عہد کو نبھایا ہے اور بھرے بازار میں ایک مظلوم عورت کو بے آبرو ہوتے دیکھ کر بھاگا نہیں بلکہ اسے بے آبرو ہونے سے بچالیا ہے اور اسے بے عزت کرنے کی کوشش کرنے والوں کو خون میں نہلا کر ٹھنڈا کر دیا ہے۔ میری ماں سے کہنا کہ میں نے اس کے دودھ کی لاج رکھ لی ہے۔ اسے کہنا کہ میں مفرور ضرور ہوا ہوں مگر اس ملک سے بھاگا نہیں ہوں۔ میرا جینا مرنا اسی ملک میں ہو گا۔ اسے کہنا اماں جی تمہارے بیٹے نے گناہوں کی زندگی سے توبہ کرلی ہے۔ منشیات کے تھیلوں کو ہمیشہ کے لئے سمندر کی لہروں میں غرق کر دیا ہے۔ وہ تین شیطانوں کا خون کرنے کے بعد سرخ رو ہو گیا ہے اور اب وہ اپنے پاک وطن کو جرائم پیشہ مجرموں' اجرتی قاتلوں اور مجبور و بے کس عورتوں کی عزتوں کو بھرے بازار میں گھسیٹنے والوں کے وجود سے پاک کرنے کے واسطے میدان جنگ میں کود چکا ہے۔ کہنا اماں جی! تمہارا بیٹا کہتا تھا اگر میں بدی کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا تو میری قبر پر آکر فاتحہ ضرور پڑھ جانا پھر میری روح کو سکون مل جائے گا۔"

بخشو اور چاروں باڈی گارڈوں پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ دارا خاموش ہو گیا پھر اس نے اپنے اردگرد کھڑے باڈی گارڈوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم آج سے میری طرف سے آزاد ہو۔ یہ اسلحہ میرے سامنے زمین پر رکھ دو۔"

باڈی گارڈ نے فوراً اپنی اپنی رائفلیں دارا کے سامنے رکھ دیں۔ دارا نے بخشو سے کہا۔

"بخشو چاچا! ان رائفلوں کو میری جیپ میں لے جاکر رکھ دو۔ کل تک یہ قانون کے خلاف فائر کرتی رہی ہیں۔ آج سے یہ قانون کی حفاظت وطن کی سلامتی اور مظلوموں کی عزتوں کو بچانے کے لئے شعلے اگلیں گی۔"

بخشو نے چاروں رائفلیں اٹھائیں اور کچھ فاصلے پر کھڑی دارا کی جیپ میں لے جاکر رکھ دیں۔ جب وہ واپس آیا تو دارا سمندر کے کنارے خاموش بالکل سیدھا کھڑا دور سمندر کی لہروں کو دیکھ رہا تھا جہاں ایک سیکنڈ پہلے اسے روشنی جلتی بجھتی نظر آئی تھی۔ اس نے بخشو سے کہا۔

"لانچ آرہی ہے۔ اسے لائن کلیئر کا سگنل دو۔" بخشو بھاگ کر جھونپڑی سے لالٹین اٹھا لایا۔ اور لالٹین کو ہاتھ میں لے کر سمندر کی طرف منہ کر کے اسے جھلانے لگا۔ دور سمندر میں وہی روشنی ایک بار پھر جل کر بجھ گئی۔ دارا نے بخشو سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے جھونپڑے میں رکھ آؤ۔" تھوڑی دیر میں ایک کشتی سمندر کی لہروں پر اندھیرے میں ہچکولے کھاتی کنارے پر آکر گھٹنے گھٹنے پانی میں رک گئی۔ ان میں تین آدمی سوار تھے۔ دو آدمی کشتی میں ہی بیٹھے رہے۔ ایک آدمی کاندھے سے رائفل لٹکائے پانی میں سے گزر کر دارا کے پاس آگیا۔ اس نے آتے ہی دارا کو پہچاننے کے بعد ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور بولا۔

"دارا مال آرہا ہے۔ ہمارا مال تیار ہے کیا؟"

اسمگل کر کے لائے گئے مال سے بھری ہوئی لانچ پیچھے کھلے سمندر میں کھڑی تھی۔ یہ لوگ آگے لائن کلیئر لینے اور دارا سے مال کی وصولی کے بارے میں بات کرنے آئے تھے۔ دارا اس اسمگلر کو ایک طرف لے گیا۔ دونوں میں پانچ چھ منٹ تک کچھ بات چیت ہوتی رہی۔ اس دوران دونوں کے برہم ہو کر اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز بھی آئی۔ پھر خاموشی چھاگئی۔ بخشو اور دارا کے چاروں نہتے باڈی گارڈ جھونپڑی کے قریب ایک طرف کھڑے یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے۔ پھر دارا واپس مڑا۔ اسمگلر بھی اپنی کشتی کی طرف چلنے

رُکا۔ بخشو نے دو چار قدم آگے جا کر دارا سے پوچھا۔

"کیا فیصلہ ہوا؟" دارا نے کہا۔

"میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ پیکٹ یہاں تک لانے میں بڑی دشواریاں ہیں پولیس نے راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ اگلے پھیرے میں بات کروں گا۔ مال واپس لے جاؤ نہیں تو تمہاری لانچ بھی پکڑی جائے گی۔"

دارا نے چاروں باڈی گارڈ جوانوں کو جو اس کے جانثار اور قابل اعتبار بدمعاش ٹائپ تھے وہیں جھونپڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا اور خود بخشو چاچا کو لے کر جیپ کی طرف قدم قدم چلنے لگا۔ بخشو کہنے لگا۔

"بیٹا! تم نے کام تو بڑا نیکی کا کیا ہے۔ مگر ان تمام اسمگلر لوگوں کو تم نے اپنا دشمن بنا لیا ہے۔" دارا نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"بخشو چاچا زندگی موت اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ تم مجھے بچپن سے جانتے ہو۔ میں سوائے اللہ رسول ﷺ کے اور کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں تمہیں اس لئے ساتھ لایا ہوں کہ میری بات غور سے سنو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اور ہو سکتا ہے اس کے بعد ملاقات دیر بعد ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو کچھ میں نے تمہیں کہا ہے وہ سب کچھ میری ماں سے ملاقات کر کے اسے بتا دینا۔ اس پر جو مقدمہ بنا ہوا ہے اس کا فیصلہ جلد ہو جائے گا۔ اگر میری ماں بری ہو گئی تو تم اسے دکان والے مکان میں ہی رکھنا۔ ایک ملازمہ اس کے لئے رکھوا دینا۔ خبردار دکان میں کوئی ناجائز کاروبار نہ ہو۔" بخشو بولا "بیٹے تم نے کہہ دیا تو سمجھ لو کہ معاملہ ختم ہو گیا۔ اب دکان پر اسکریپ کا ہی کاروبار ہو گا خواہ چھوٹے پیمانے پر ہی ہو۔" دارا نے کہا۔

"کیماڑی میں اپنا جو پرانا گیراج ہے اس کی پچھلی کوٹھری کے کونے کو جا کر کھودنا۔ وہاں میں نے چمڑے کا ایک تھیلا دبا رکھا ہے۔ اس میں پانچ لاکھ کے قریب نوٹ پڑے ہیں۔ یہ میں نے اپنا جینا مرنا رکھ چھوڑا تھا۔ اس میں سے بیس بیس ہزار روپے میرے ان چاروں محافظوں کو دے دینا اور کہنا کہ یہ جا کر کوئی شریفانہ دھندا شروع کریں۔ ایک لاکھ روپیہ تم میرے خفیہ ڈیرے پر لا کر مجھے دے دینا۔ باقی رقم میں سے تم میری ماں کے

مقدمے کی پیروی کرنا اور جب وہ بری ہو کر گھر آئے تو جو رقم بچے اس کے حوالے کر دینا۔ میری دکان کے اب تم مالک ہو میں اب جاتا ہوں۔ کل رات کو تم رقم لے کر میرے خفیہ ڈیرے پر پہنچ جانا۔ اب تم جاؤ۔"

دارا جیپ میں سوار ہو گیا۔ بخشو واپس جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ جیپ کو ٹیلوں کی تاریکی میں سے نکال کر دارا اسے ایک سڑک پر لے آیا جہاں کہیں کہیں بجلی کے کھمبوں پر بتیاں روشن تھیں۔ ابھی رات ڈھلنا شروع نہیں ہوئی تھی کہ دارا خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ روبی کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کر کے سو رہی تھی۔ دارا نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ بوڑھی نوکرانی بھی بکریوں کے پاس چارپائی پر سو رہی تھی۔ دارا جیپ میں سو گیا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو کافی دن نکل آیا تھا اور روبی اسے جگا رہی تھی۔ دارا منہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا جیپ سے باہر آ گیا۔ انہوں نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ دارا نے روبی کو بتایا کہ اس نے ساری منشیات سمندر میں پھینک دی اور اپنے ڈیرے پر تمام ناجائز کاروبار بند کروا دیا ہے روبی کو اس خوشگوار انقلاب پر خوشی ہوئی۔ دارا جیپ میں سے چاروں رائفلیں اٹھا کر کوٹھری میں لے آیا تھا اس نے روبی کو یہ بھی بتایا۔

"بخشو رات کو ایک لاکھ روپیہ لے کر آ رہا ہے۔ ہمیں روپوں کی ضرورت ہو گی۔ اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ابھی ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔"

کچھ لمحے خاموشی سے چائے پینے کے بعد دارا بولا۔ "میرا خیال ہے ہمیں ابھی اس علاقے سے نکل جانا چاہئے کیونکہ یہاں ہمارے لئے خطرہ زیادہ ہے۔ وہ جو میں نے تمہیں اسی صوبے میں اپنے ایک بہت ہی الگ تھلگ خفیہ ٹھکانے کے بارے میں کہا تھا ابھی وہاں جانے کا ارادہ بھی ملتوی کرتے ہیں۔"

روبی خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دارا خود ہی کہنے لگا۔

"میرا ارادہ ہے کہ ہم پنجاب کی طرف نکل جاتے ہیں۔ وہاں راوی پار میرے ایک پرانے دوست کی کچھ زمین ہے جہاں اس نے چھوٹا سا فارم بنایا ہوا ہے۔ کبھی ہم دونوں مل کر اسمگلنگ کیا کرتے تھے پھر اس نے اس کام سے توبہ کر لی اور راوی پار اپنے گاؤں کے پاس ہی دو مربع اراضی خرید کر فارم بنا لیا۔ میں اس پر بھروسہ کر سکتا ہوں اس کا نام میاں

خان ہے کچھ عرصے وہاں چل کر رہتے ہیں۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے اور کہاں جانا ہے۔" روبی نے کہا۔

"لیکن جانے سے پہلے میں شیر خان کی خیریت دریافت کرنا چاہتی ہوں اور اپنی بچی کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔" دارا کہنے لگا۔

"شیر خان ابھی تک پولیس کی تحویل میں ہی ہے۔ میں نے بخشو سے پتا کروایا تھا۔ باقی تمہاری بچی تمہاری ہمسائی مریم کے پاس ہی ہو گی۔ دیکھ لو تمہارے گھر کی پولیس برابر نگرانی کر رہی ہے۔ اس میں تمہارے پکڑے جانے کا سو فیصد خطرہ ہے۔ باقی تم جیسے کہو گی میں ویسے ہی کروں گا۔"

روبی کے دل میں ممتا کے جذبات اُمڈ رہے تھے مگر اسے یہ بھی خیال تھا کہ اگر وہ گرفتار ہو گئی تو پھر ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزر جائے گی۔ اور یہ زندگی موت سے بدتر ہو گی۔ اس نے ممتا کے اُمڈتے ہوئے جذبوں پر پتھر کی سل رکھ دی اور کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی اپنی بچی کو ملنے نہیں جاؤں گی۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد دارا نے روبی سے کہا کہ تم کوٹھری میں جا کر آرام کرو اور خود رائفل لے کر کچھ فاصلے پر ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دن گزر گیا۔ شام بھی غروب ہو گئی۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف چھا گیا۔ رات کے دس بجے کا عمل ہو گا روبی اور دارا نے ابھی ابھی کھانا کھایا تھا کہ بخشو آ گیا۔ وہ شہر کی طرف سے نہیں بلکہ سمندری کھاڑی والے راستے کی جانب سے آ رہا تھا۔ اس نے دارا کو بتایا کہ سڑک کی طرف سے آنے میں خطرہ تھا کہ پولیس اس کی نگرانی کرتی یہاں تک پہنچ جائے گی۔ چنانچہ وہ پہلے مچھیروں کی بستی گیا۔ وہاں سے کشتی میں بیٹھ کر آگے کھاڑی میں جا اترا وہ چمڑے کے تھیلے میں ایک لاکھ روپیہ بھی لایا تھا۔ یہ سو سو روپے کے نوٹوں کی شکل میں تھے۔ کچھ پچاس پچاس کے نوٹ بھی تھے۔ ——————— بخشو ایک ایسا آدمی تھا جس کو دارا اپنا تقریباً ہر راز بتا دیا کرتا تھا۔ اس نے بخشو کو بتا دیا کہ وہ پنجاب جا رہا ہے جہاں کچھ دن اپنے پرانے دوست میاں خان کے پاس روپوش رہے گا۔ دارا نے بخشو سے مل کر سارے نوٹوں کو کپڑے کے ایک چوڑے کمربند کے اندر چھوٹی گڈیوں کی شکل میں ڈال کر اسے اپنی کمر کے گرد قمیص بنیان کے نیچے باندھ لیا۔ سو سو کے پانچ نوٹ روبی کو ضرورت کے وقت کام آنے کے لئے دے دیئے اور سو سو کے پچاس نوٹ اپنی جیبوں میں رکھ لئے۔ اس نے بخشو سے کہا۔

"اب پیچھے تم ہی نے سارا خیال رکھنا ہے۔ میری ماں کے پاس ملاقات کو ضرور جایا کرنا۔ اسے کہنا مجھے معاف کر دے۔ میں خون کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اب میں پولیس کے تشدد سے اذیت کی موت نہیں مرنا چاہتا۔"

بخشو خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا چائے پیتا اور اپنا سر اثبات میں آہستہ آہستہ ہلاتا رہا۔
دارا اس وقت اپنے ریوالور کو صاف کر رہا تھا۔ اس نے بخشو سے یہ بھی کہا کہ ڈیرے سے چاروں رائفلیں بھی کسی روز ضائع کر دے۔

"ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے اور روبی کے پاس ایک ایک ریوالور اور ایک ایک چاقو موجود ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو جہاں ہوں گے وہاں اسلحہ پیدا کر لیں گے۔"
بخشو کچھ فکر مند تھا کہنے لگا۔

"تم میاں خان کے پاس پنجاب جا رہے ہو۔ کیا تمہیں اس پر بھروسہ ہے؟" دارا مسکرایا اور ریوالور کی نال کی آنکھ سے جھانکتے ہوئے بولا۔

"چاچا! وہ ایک ہی تو میرا بھروسے کا یار ہے۔ تم میاں خان کو نہیں جانتے۔ اگر اس نے بدمعاشی نہ چھوڑ دی ہوتی تو آج اس کے مقابلے کا یہاں کوئی آدمی نہ ہوتا۔" بخشو خاموش رہا۔ وہاں روبی نہیں تھی۔ اس لئے بخشو نے کھل کر بات کی۔ کہنے لگا۔

"دارا! یہ عورت کہیں تمہارے واسطے کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دے۔ میری مانو اسے اب بھی میرے ساتھ بھیج دو۔ میں اسے اس کے گھر پہنچا دوں گا۔ یا پھر میں اسے یہیں چھپائے رکھوں گا اس کا خاوند شیر خان واپس آئے گا تو میں اس کی امانت اس کے حوالے کر دوں گا۔" دارا ریوالور میں گولیاں بھر رہا تھا۔ کہنے لگا

"نہیں چاچا! یہ بی بی ابھی میرے ساتھ ہی روپوش رہے گی۔" دارا نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کچھ فاصلے پر کھڑی جیپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "ہمیں اسٹیشن پر چھوڑ کر تم جیپ واپس لے جانا۔ ہم کراچی کینٹ سے چار اسٹیشن چھوڑ کر کسی اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوں گے۔ ٹکٹ تم جا کر کینٹ اسٹیشن سے لاؤ گے۔" اور اسی پروگرام پر عمل کیا گیا۔ دارا نے رات کی ٹرین سے لاہور جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ شام کو بخشو جیپ لے کر چلا گیا اور لاہور تک کے لئے ائیر کنڈیشنڈ ڈبے کے دو ٹکٹ لے آیا۔ ائیر کنڈیشنڈ ڈبے میں دارا اس لئے سفر کرنا چاہتا تھا کہ وہاں رات کو چیکنگ کے لئے کوئی نہیں آتا۔ روبی بھی تیار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بدن کو سرمئی رنگ کی چادر سے ڈھانپ لیا تھا۔ دارا نے بھی شلوار کی بجائے پتلون اور جیکٹ پہن لی تھی۔ دونوں نے بھرے ہوئے ریوالور اپنے

لباس کے اندر چھپا رکھے تھے۔ وہ جیپ میں بیٹھ کر کچھ وقت پہلے ہی اس خفیہ ڈیرے سے نکل گئے۔ کراچی شہر سے کوئی پچاس ساٹھ میل دور وہ ایک مضافاتی ریلوے اسٹیشن کے باہر جیپ سے اترے۔ بخشو نے دارا کو گلے لگا کر دعا دی اور جیپ لے کر واپس چل دیا۔ دارا اور روبی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ گئے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ٹرین آ گئی۔ وہ اس کے ائیر کنڈیشنڈ ڈبے میں خاموشی سے جا کر بیٹھ گئے۔ اس ڈبے میں پہلے سے ایک عمر رسیدہ جوڑا موجود تھا۔ دارا نے روبی کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی برتھ پر لیٹ گئی۔ دارا بھی نیچے والی برتھ پر لیٹ گیا اور یوں ظاہر کیا جیسے اسے نیند آ رہی ہے اور سو جانا چاہتا ہے۔ وہ دوسرے مسافر سے بات چیت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ٹرین تھوڑی دیر رکنے کے بعد لاہور کی طرف روانہ ہو گئی۔

روبی اور دارا کو الگ الگ قسم کے خیالات نے گھیر رکھا تھا۔ پھر بھی ٹرین کے ہچکولوں کی وجہ سے انہیں نیند نے آ لیا۔ صبح آنکھ کھلی تو ٹرین پنجاب میں داخل ہو چکی تھی۔ دونوں نے ڈبے میں ہی ناشتا کیا دن کے گیارہ بجے کے قریب ٹرین لاہور پہنچ گئی۔ ٹرین سے نکل کر پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے دارا نے آہستہ سے روبی کو کہا۔

"یہاں پولیس موجود ہے۔ مگر گھبرانا بالکل نہیں۔ مجھے ریوالور نکالتے دیر نہیں لگے گی۔" روبی نے جواب میں کہا۔

"تم بھول رہے ہو کہ ہمیں کسی بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنے۔ اگر پولیس نے ہمیں پکڑنا چاہا تو یاد رکھنا۔ ہم ہوائی فائرنگ کر کے بھاگنے کی کوشش کریں گے۔" دارا نے سر ہلا دیا۔

وہ گیٹ سے نکل گئے۔ باہر کچھ ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ دارا نے نظر سے ماحول کا جائزہ لیا اور ایک ٹیکسی لے لی ٹیکسی کو شیخوپورہ کی طرف چلنے کو کہا۔ شیخوپورہ سے انہوں نے ایک تانگہ لے لیا۔ تانگے میں بیٹھ کر نو کوس مغرب کی طرف نہر کے پل تک سفر کیا۔ یہاں تانگہ بھی چھوڑ دیا۔ اب نہر کے پار ایک چھوٹی کچی سڑک پر چلنے لگا۔ روبی نے پوچھا۔

"ابھی کتنی دور اور چلنا ہو گا۔" دارا نے کچھ دور درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا "بس وہاں میاں خان کا فارم ہے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔"

سامان ان کے پاس سوائے ایک چمڑے کے تھیلے کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ تھیلا دارا نے اٹھا رکھا تھا۔ وہ کیکر اور ٹاہلی کی چھاؤں میں سفر کرتے میاں خان کے فارم پر پہنچ گئے۔ دارا نے روبی کو فارم کے ایک جانب درخت کے نیچے ٹھہرنے کو کہا اور خود دوسری طرف سے فارم میں داخل ہو گیا۔ املتاس آم اور شیشم کے بڑے گھنے درختوں نے اس مختصر سے دیہاتی فارم کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ کونے میں مالٹے کے پیڑوں کے درمیان ایک پکی اینٹوں کا چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا۔ جس کے باہر کافی جھاڑ جھنکاڑ پڑا تھا۔ دارا چاہتا تھا کہ وہ سیدھا اپنے دوست میاں خان ہی سے ملے ابھی وہ کمرے تک نہیں پہنچا تھا کہ ایک طرف سے ایک آدمی نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔

"کس سے ملنا ہے بابو صاحب؟" دارا نے پتلون اور ٹھنڈی جیکٹ پہن رکھی تھی اس وجہ سے اس کسان نے اسے کوئی بابو سمجھا تھا۔

دارا نے میاں خان کا پوچھا۔ کسان نے کہا۔

"آپ خان صاحب کے دوست ہیں کیا؟" دارا نے کہا۔

"ہاں میں اس کا دوست ہوں۔ دوسرے شہر سے آیا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟" کسان بولا۔

"وہ ذرا گاؤں گئے ہیں۔ آپ اندر چل کر بیٹھیں۔ میں آپ کے لئے لسی لاتا ہوں۔"

دارا سوچنے لگا کہ روبی کو وہاں لے آئے کہ میاں خان وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دارا کو دیکھا تو وہیں سے بانہیں کھول دیں۔

"او میرا یار آیا ہے۔ میرا یار آیا ہے۔"

دونوں دوست ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ کسان مسکرانے لگا۔ میاں خان نے اسے لسی لانے کو کہا اور دارا کو کمرے کی طرف لے کر چلا۔ دارا کے کاندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"تم ادھر کا کیسے راستہ بھول گئے؟ یار بڑے عرصے بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔ روح خوش ہو گئی ہے۔" پھر آنکھ مار کر کہنے لگا "اکیلے ہی ہو ناں۔ کوئی طمنچہ جان تو ساتھ نہیں ہے؟ اگر ہے تو بتا دو۔ فکر نہ کرو۔ یہاں میاں خان کا راج ہے۔" طمنچہ جان سے میاں خان کی مراد کراچی کی وہ طوائف تھی جس کے ہاں اسی زمانے میں اکثر مجرا سننے جایا کرتا تھا۔ دارا نے کہا۔

"نہیں میاں خان! وہ کام میں نے چھوڑ دیا ہے۔" میاں خان نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے کی آواز روبی نے بھی سنی جو فارم کی باڑھ کے پیچھے بیٹھی تھی۔

"دارا! خدا کی قسم یقین نہیں آتا۔" پھر خود ہی بولا۔ "ویسے یار آدمی کی کایا پلٹ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اب مجھے ہی دیکھو کبھی کیا کچھ نہیں کیا کرتا تھا۔ دنیا کا کونسا قانون ہے جو میں نے نہیں توڑا۔ مگر اب تمہاری دعا سے حق حلال کی روزی کما رہا ہوں۔"

میاں خان نے دروازہ کھول دیا اور اندر سے دو مونڈھے نکال کر باہر ڈال دیئے۔

"بیٹھو یار۔ باتیں کرتے ہیں۔ سناؤ اور کیا حال چال ہے؟" صاف ظاہر تھا کہ میاں خان کو ابھی تک یہ خبر نہیں ہوئی تھی کہ دارا نے کراچی میں تین خون کیے ہیں۔ اس نے میاں خان سے کہا۔

"میرے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔" میاں خان معنی خیز انداز میں مسکرایا اور اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"یہ بات ہوئی ناں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ میرا یار کسی عورت کے بغیر یہاں اکیلا کیسے آ گیا۔ فکر نہیں۔ وہ کہاں ہے؟" دارا نے کہا۔

"وہ ایسی ویسی عورت نہیں ہے میاں خان! یوں سمجھ لو کہ وہ میری چھوٹی بہن کی جگہ ہے۔ میں اسے اپنی بہن ہی سمجھتا ہوں۔" میاں خان نے کچھ تعجب کیا۔ پھر دونوں ہاتھ تھوڑے سے اوپر اٹھائے اور بولا۔

"اگر وہ تمہاری بہن ہے تو میری بھی بہن ہے دارا! اسے کہاں چھوڑ آئے ہو؟ ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

دارا مونڈھے پر سے اٹھ کر باڑھ کی طرف گیا اور روبی کو ساتھ لے کر آ گیا میاں خان تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا صرف ایک نظر روبی کو دیکھا پھر نگاہیں نیچی کر لیں اور بولا۔

"بہن یہ تمہارے بھائی کا ڈیرا ہے بس اور کیا کہہ سکتا ہوں۔" دارا نے روبی کو کمرے کے اندر جانے کے لئے کہا۔ وہ کمرے میں چلی گئی۔

میاں خان مونڈھے پر بیٹھ گیا وہ کچھ الجھن سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک زمانہ اس نے جرائم پیشہ لوگوں میں گزارا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے لوگ یونہی کسی عورت کو بہن نہیں

کہا کرتے اور جب کسی کو اپنی زبان سے بہن کہہ دیتے ہیں تو اس کی عزت پر اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں میاں، خان کا ملازم لسی لے کر آگیا۔ میاں خان اپنا گلاس روبی کو اندر بھجوانے لگا تو دارا نے اسے آنکھ کا اشارہ کیا۔ میاں خان ملازم کو کچھ کہتے کہتے وہیں رک گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی بات ضرور ہے اس نے ملازم کو واپس بھجوا دیا دارا لسی کا گلاس خود کمرے میں لے گیا۔ روبی کو لسی پلائی تسلی دی کہ سب ٹھیک ہے باہر آگیا۔ میاں خان نے ڈول میں سے دارا کے خالی گلاس میں لسی ڈالی۔ دونوں دوست بیٹھ کر لسی پینے لگے۔ میاں خان نے ذرا جھک کر آہستہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے دارا؟ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو کیوں؟"

دارا جانتا تھا کہ میاں خان اس کا جگری یار ہے وہ سوچ کر آیا تھا کہ اسے سب کچھ بتا دے گا۔ چنانچہ لسی کا گلاس خالی کر کے دارا نے زمین پر رکھا اور سگریٹ سلگانے کے بعد ایک کش کھینچا اور میاں خان کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔

"میں کراچی میں تین خون کر کے آرہا ہوں۔"

میاں خان مسکرایا۔

"بس! میں سمجھا پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ فکر نہیں' چاہے چھ خون کر کے آجاؤ یہاں تمہاری ہوا کی طرف بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ میرا فارم معمولی سا ہے مکان یہاں سے کچھ دور گاؤں میں ہے۔ بیوی بچے وہیں پر ہوتے ہیں۔ یہاں پر جو ملازم ہیں وہ میرے خاص بھروسے کے آدمی ہیں تم چاہے ساری عمر یہاں رہو۔ پولیس کو خبر نہیں ہو گی۔" دارا نے کہا۔

"نہیں میاں خان میں زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ کچھ روز رہ کر آگے نکل جاؤں گا۔"

میاں خان بولا۔

"یہ تمہاری مرضی ہے ویسے میرے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے ہیں۔" یہاں کھانا وغیرہ ہر شے تمہیں پہنچ جایا کرے گی۔ میں خود بھی یہیں رہوں گا میں کہیں نہیں جاتا۔ تم لوگ بے شک یہاں آزادی سے چلو پھرو' ہاں ایک بات ہے۔" دارا کا سگریٹ والا ہاتھ ہونٹوں تک پہنچ کر رک گیا۔

"وہ کیا؟" اس نے پوچھا میاں خان نے بے نیازی کے انداز میں بازو جھٹک کر کہا۔

"کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ یہاں سے مشرق کی طرف ڈھاڑی والے کھوہ پر نادر کا ڈیرہ ہے تم اسے نہیں جانتے۔ نئی نئی بدمعاشی شروع کی ہے اس نے شراب کی دو بھٹیاں لگائی ہوئی ہیں اس میں نہ جانے کیا کیا زہر ملا کر شیخوپورہ لاہور سپلائی کرتا ہے۔ چرس کوکین بھی بیچتا ہے۔ سب کے مہینے لگا رکھے ہیں کوئی ایماندار ایس ایچ او آکر چھاپہ مارتا ہے تو سب مال وہ ادھر ادھر کر دیتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ جس کی عزت پر چاہے ہاتھ ڈال دیتا ہے دو خون بھی کر چکا ہے مگر صاف بچ کر آگیا۔ اس نے مجھے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔" میاں خان نے سگریٹ کا کش لگایا اور دارا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یار! ہم نے تو کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ دوسرے کی ماں بہن کی عزت کو اپنی عزت سمجھا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر مال اسمگل کیا جیل بھی کاٹی مگر اس نئے بدمعاش نادر نے تو بدمعاشی کو بھی بدنام کر کے رکھ دیا ہے ایک سال سے اس نے ایک نیا دھندا شروع کر رکھا ہے۔ شہر سے مال دار لوگوں کی اولاد اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ان سے بھاری رقم وصول کر کے چھوڑ دیتا ہے۔" دارا نے کہا۔

"پولیس کیا کرتی ہے؟" میاں خان ہنس پڑا۔

"تم پوچھتے ہو کہ پولیس کیا کرتی ہے؟ جہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو وہاں کوئی فرض شناس پولیس افسر بھی آجائے تو کیا کرے گا۔ کتنی دیر تک چلے گا؟ رشوت خوروں کو بھاری رقم گھر پر پہنچ جاتی ہے اور نادر من مانی کر رہا ہے۔" دارا نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں اس طرف نہیں جاؤں گا۔" میاں خان بولا۔" میں یہ تمہیں نادر سے ڈر کر نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اس لئے خبردار کر رہا ہوں کہ اس کے ڈیرے پر رشوت خور خفیہ پولیس والوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ تمہاری خبر پنجاب پولیس کو مل گئی ہو گی۔ کسی نے تمہیں پہچان لیا تو خوامخواہ پکڑے جاؤ گے۔ نادر کے اپنے آدمی ادھر ادھر بو سونگھتے پھرتے ہیں اور آج کل تو اس کے کچھ آدمی مستقل ڈیرے کے آس پاس چوکی پہرے پر ہوتے ہیں۔"

"کیوں آج کل ایسی کون سی خاص بات ہے؟" دارا نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"آج کل اس خبیث نے لاہور شہر کے ایک کروڑ پتی کی اکلوتی بیٹی کو اغوا کر کے ڈیرے میں بند کر رکھا ہے۔ سنا ہے اس کے باپ سے ایک کروڑ روپے کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ آج صبح ہی مجھے پتا چلا ہے۔ یار! بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ماں بہن تو سب کی سانجھی ہوتی ہے خواہ وہ کروڑ پتی ہو چاہے غریب ہو۔ مگر یہ نادر پورا شیطان ہے کسی کی عزت کو عزت نہیں سمجھتا سچ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ جا کر اسے گولی سے اڑا دوں۔ مگر یار اب میں اس بک بک میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"اچھا تم اب یہاں آرام کرو۔ میں تمہارے لئے کھانا لے کر آتا ہوں۔" دارا نے کہا۔

"گھر میں جو پکا ہے لے آنا کوئی خاص تکلف نہ کرنا۔" میاں خان نے گردن ٹیڑھی کر کے مسکراتے ہوئے دارا کو دیکھا۔

"میرا جو آدمی لسی لایا تھا۔ وہ تین مرغیاں فارم سے لے کر اسی وقت چلا گیا تھا اور شام کو شیخوپورے سے راوی کے کھگے بھی آجائیں گے۔" دارا نے مونڈھے سے اٹھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں یار، تم یہ تکلف نہ کرو۔" میاں خان نے کہا۔

"فکر نہیں کرو۔" وہ یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ دوپہر ہو گئی تھی۔ آسمان صاف تھا۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ سامنے چھوٹے سے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ دارا اندر چلا آیا۔

روبی چارپائی پر آرام کر رہی تھی۔ دارا کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دارا اس کے سامنے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ روبی کہنے لگی۔

"تمہارے دوست نے نادر کے بارے میں جو باتیں بتائی ہیں وہ ساری میں نے سن لی ہیں۔ جس مقصد کو لے کر ہم کراچی سے نکلے ہیں اس کے پہلے معرکے کا وقت آگیا ہے۔ ہمیں اس مظلوم لڑکی کو اس خبیث شیطان کے پنجے سے آزاد کرانا ہو گا۔ جسے اس نے لاہور سے اغوا کر کے اپنے ڈیرے میں بند کر رکھا ہے۔" دارا کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ وہ

کھلے دروازے میں سے باہر درختوں کو دیکھ رہا تھا، بولا۔

"یہ فیصلہ میں تم سے پہلے کر چکا ہوں۔" روبی نے کہا۔

مگر اس کی خبر میاں خان کو بالکل نہیں ہونی چاہئے۔" دارا نے روبی سے مشورہ لینے کے انداز میں پوچھا۔

"تو کیا ہم لڑکی کو نکال کر پہلے یہاں نہیں لائیں گے؟ میرا تو خیال ہے کہ ہم پہلے یہاں لے آئیں اور پھر یہاں سے اس کے ماں باپ کے پاس لاہور پہنچا دیں، کیا خیال ہے تمہارا؟" روبی نے تھوڑا سا غور کیا پھر کہنے لگی۔

"کچھ پتا نہیں نادر کے ڈیرے پر لڑکی نکالتے وقت کس قسم کے حالات بن جائیں کیونکہ ہم تو جان کی بازی لگا کر وہاں جائیں گے۔ میں سوچتی ہوں کہیں تمہارے مخلص دوست کے لئے کوئی نئی مشکل نہ کھڑی ہو جائے۔" دارا نے روبی کی طرف دیکھا۔

"تو پھر لڑکی کو وہاں سے لے کر کدھر کا رخ کریں گے۔ کیونکہ یہ بات تو پتھر کی لکیر ہے کہ اگر لڑکی نادر کے ڈیرے پر ہے تو پھر ہم اسے وہاں سے نکال لائیں گے چاہے ڈیرے کے سارے شیطانوں کا خون کیوں نہ کرنا پڑے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد لڑکی کو کہاں لے جائیں گے؟ ظاہر ہے لڑکی گھبرائی ہوئی ہو گی۔ ہم میں سے کوئی اکیلا اسے ساتھ لے کر لاہور گیا تو خود ہمارے پکڑے جانے کا اندیشہ ہے۔"

روبی چپ رہی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ دارا کہنے لگا۔

"تم فکر نہ کرو، میاں خان بڑا دلیر آدمی ہے۔ وہ لڑکی اس کے ماں باپ تک پہنچانے میں ہماری مدد کرے گا لیکن یہ ٹھیک ہے کہ ہم ابھی اسے کچھ نہیں بتائیں گے۔ میں آج میاں خان سے خبیث نادر کے ڈیرے کے بارے میں کچھ ضروری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ ہمارا تیر ٹھیک نشانے پر لگے۔"

میاں خان کا ملازم کھانا لے کر آگیا میاں خان بھی ساتھ تھا۔ اس نے بڑا تکلف کیا ہوا تھا۔ بھنی ہوئی مرغی تھی۔ دو مرغیوں کا سالن تھا۔ ساتھ زردہ اور فرنی بھی بنوائی ہوئی تھی۔ وہی مکھن اور لسی تو بہرحال ساتھ ہوتی ہی تھی۔ بڑا مرغن کھانا تھا۔ روبی، دارا اور میاں خان نے تخت پوش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد روبی کمرے میں جا کر آرام کرنے

لگی۔ ملازم برتن اٹھا کر لے گیا۔ دونوں دوست باہر تخت پوش پر بیٹھ کر سگریٹ پینے اور باتیں کرنے لگے۔ دارا نے دو چار ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر نادر کا ذکر چھیڑ دیا۔ کچھ دیر اس کے شیطانی کردار پر نفرین کرتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"یار میاں خان! یہ نادر ایسا کہاں کا بہرام ڈاکو ہے کہ بندہ اس کے ڈیرے سے فرار ہی نہ ہو سکے۔ آخر وہ انہیں اغوا کرنے کے بعد کون سے غار میں لے جا کر بند کر دیتا ہے؟" میاں خان نے کہا۔

"رکھتا تو وہ انہیں اپنے ڈیرے کے اندر خفیہ جگہ پر ہے مگر وہاں اس کے آدمی چاروں طرف رائفلیں لئے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایک لڑکے نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اسے نادر کے آدمیوں نے وہیں بھون کر رکھ دیا تھا۔" دارا نے سر کھجاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جب نادر کو پوچھنے والا ہی کوئی نہ ہو تو پھر بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔"

دارا نے بھی وہیں پر بات ختم کر دی۔

وہ میاں خان کے فارم کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے میاں خان سے یہ بھی بڑے طریقے سے معلوم کر لیا تھا کہ نادر بدمعاش کا ڈیرہ وہاں سے کس طرف ہے اور کتنی دور ہے۔ اس سے زیادہ معلومات کی دارا کو ضرورت نہیں تھی۔ شام کو دارا نے روبی سے ساری معلومات بیان کر دیں۔ روبی بولی۔

"ہمیں یہ کام آج رات ہی کر دینا ہو گا۔" دارا نے ماچس کی تیلی چباتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اور باہر نکل گیا۔

میاں خان نے فارم کے کمرے کے باہر بھی ایک لالٹین جلوا دی تھی۔ دارا کا بستر ساتھ والی کوٹھری میں الگ لگوا دیا تھا۔ باہر ہی بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا پھر اس وقت تک باتیں کرتے رہے جب تک کہ دارا نے جان بوجھ کر جمائیاں نہ لینی شروع کر دیں۔ میاں خان بولا۔

"اچھا یار تم اب آرام کرو، میں صبح آؤں گا۔" میاں خان چلا گیا۔

دارا کچھ دیر تک اپنی چھوٹی کوٹھری میں جا کر بستر پر لیٹا سگریٹ پیتا رہا پھر اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے سوا گیارہ بجنے والے تھے۔ وہ آہستہ سے بستر سے الگ ہوا اور روبی کی کوٹھری میں آ گیا۔ روبی بھی جاگ رہی تھی۔ اس کی کوٹھری کی لالٹین بجھی ہوئی تھی۔ دارا نے آہستہ سے کہا۔

"روبی بہن! ہم ابھی چلیں گے تو بارہ بجے تک نادر کے ڈیرے پر پہنچ سکیں گے۔"

روبی تو پہلے سے تیار تھی۔ وہ باہر نکل آئی کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا باہر دیوار کے ساتھ جلتی لالٹین کی روشنی میں انہوں نے اپنے اپنے ریوالور نکال کر میگزین چیک کیا کمانی دار چاقو کھول کر دیکھے اور کوٹھری کے پیچھے سے چار فٹ اونچی دیوار پار کی اور ستاروں کی روشنی میں نادر کے ڈیرے کی طرف چل پڑے۔

وہاں تک کوئی باقاعدہ کچا پکا راستہ نہیں جاتا تھا۔ وہ کھیتوں میں سے ہو کر چلے جا رہے تھے۔ دارا نے نادر بدمعاش کے ڈیرے کی ساری نشانیاں میاں خان سے معلوم کر لی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ دیہاتی علاقہ دارا کے لئے نیا اور اجنبی نہیں تھا۔ وہ جب کبھی میاں خان سے ملنے آتا تو گھوڑوں پر سوار ہو کر اس علاقے کی سیر کرتا تھا۔

وہ آگے آگے چل رہا تھا۔ روبی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ کبھی کوئی کھڑی فصل آ جاتی کبھی کٹے ہوئے کھیت شروع ہو جاتے۔ دارا نے مشرق کی طرف ایک خاص ستارے کو سامنے رکھ لیا تھا اور اس کی رہنمائی میں چل رہا تھا۔ کوئی آدھ پون گھنٹہ چلنے کے بعد کچھ فاصلے پر دور درختوں کے سیاہ خاکوں میں روشنی سی ٹمٹماتی دکھائی دی۔ دارا نے روبی کو وہ روشنی دکھا کر کہا۔

"یہ ڈھاڑی گاؤں کے باہر ٹیوب ویل کی روشنی ہے۔ اس کی دائیں جانب نادر کا ڈیرہ ہے۔"

یہاں سے دارا ذرا دائیں جانب ہٹ کر چلنے لگا۔ رات کے اندھیرے میں ان کی آنکھیں عادی ہو گئی تھیں۔ اور اب وہ تیز تیز قدموں سے کھیتوں کی منڈیر سے ہو کر گزر رہے تھے۔ تھوڑی دور تک چلتے رہنے کے بعد ایک کچا راستہ آ گیا۔ انہیں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی دونوں جلدی سے ایک طرف درختوں کے پیچھے ہو گئے۔ سامنے

سے ایک گھڑ سوار کا سایہ نظر آیا۔ وہ تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے قریب سے گزر گیا۔ دارا نے روبی سے سرگوشی کی۔

"یہ گھڑ سوار نادر کے ڈیرے سے ہی آیا ہو گا۔"

وہ اٹھے اور درختوں کے نیچے سے ہو کر آگے چل پڑے اب ٹیوب ویل کی روشنی ان کے بائیں جانب رہ گئی تھی۔ دائیں جانب درختوں کا ایک کالا جھنڈ ستاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں غبار کی طرح نظر آ رہا تھا۔ دارا نے کہا۔

"یہی نادر کا ڈیرہ ہو گا۔ اب محتاط رہنا۔ اس کے آدمی آس پاس پہرے چوکی پر ہوں گے۔ تم اس طرف سے آؤ میں ادھر جاتا ہوں ہم درختوں کے پاس آ کر ملیں گے۔" دارا تیزی سے ایک طرف ہو کر آگے بڑھا۔ روبی دوسری طرف چل رہی تھی ابھی وہ دس بارہ قدم ہی گئی ہو گی کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

"کون ہے بھئی؟" روبی وہیں دبک گئی۔ مردانہ آواز پھر بلند ہوئی۔ "بولتے کیوں نہیں ہو۔ کون ہو تم میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔" اس کے ساتھ ہی ایک آدمی دوڑ کر روبی کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔

روبی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس آدمی نے جب دیکھا کہ سامنے عورت ہے تو رائفل کاندھے سے لٹکالی اور روبی کے گلے میں بازو ڈال کر بولا

"سوہنیو' آدھی رات کو کسے ڈھونڈ رہے ہو۔ ہمارے ساتھ چلو۔" اور اس نے ایک ہلکا سا شیطانی قہقہہ لگایا۔ اور روبی کو دونوں ہاتھوں سے اپنی طرف کھینچنے لگا۔

روبی کا ہاتھ اتنی دیر میں قمیص سے چاقو نکال چکا تھا۔ نادر بدمعاش کے پہریدار بدمعاش نے روبی کے گریبان پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ اس کا ہاتھ وہیں ڈھلک گیا۔ اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ روبی کا چاقو اس کے پیٹ کے اندر قمیص کو چاک کر کے دستے تک چلا گیا تھا۔ روبی نے بدمعاش کے پیٹ میں چاقو پوری قوت سے گھونپا تھا اور پھر تین جھٹکے دے کر چاقو کو اوپر تک لے آئی۔ پھر جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ وہ بدمعاش سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیٹ سے باہر نکلی ہوئی انتڑیوں کے جال کو سنبھال رہے تھے۔ جو کٹ چکی تھیں۔ وہ منہ کے بل دھڑام سے گر پڑا۔ دارا بھاگ کر اس کے پاس آیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے آتے ہی روبی سے پوچھا اور اندھیرے میں منہ کے بل گرے ہوئے آدمی کو دیکھا اس نے روبی کو للکارتے ہوئے اس کی آواز سن لی تھی۔ مگر اسے بالکل یقین نہیں تھا کہ روبی اس کے وہاں تک پہنچتے پہنچتے نادر بدمعاش کے پہرے دار غنڈہ کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہو گی۔ روبی نے چاقو پر لگے خون کو ذرا ذرا تڑپتی لاش کی صدری سے صاف کیا اور بولی۔

"آگے چلو دارا! شاید ایسے پہرے دار آگے بھی ہوں گے۔"

دارا ابھی تک اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس لڑکی میں پیشہ ور قاتلوں ایسی مہارت کہاں سے آ گئی؟ اس نے مردہ آدمی کی پڑی ہوئی رائفل اٹھائی اور اندھیرے میں آگے بڑھا۔ روبی اس کے پیچھے تھی۔ اس نے چاقو بند کر کے قمیص کے اندر رکھ لیا تھا۔ اور اب بھرا ہوا ریوالور ہاتھ میں تھا۔ ڈیرے کی کچی دیوار کے سامنے پہنچ کر دارا نے بھی رائفل کاندھے سے لٹکالی اور جیب سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ وہ دیوار کے ساتھ اندھیرے میں آگے بڑھے۔ اچانک دارا نے روبی کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ روبی وہیں رک گئی۔ چند قدم آگے اندھیرے میں اسے ایک سایہ ہلتا ہوا دکھائی دیا۔ نادر بدمعاش کا ایک ساتھی دیوار کے پاس ٹہل کر پہرہ دے رہا تھا۔ دارا دو قدم پیچھے ہٹ کر روبی کے قریب آیا اس کے کان میں کچھ سرگوشی کی اور اس کے ساتھ ہی دونوں زمین پر اوندھے لیٹ کر آہستہ آہستہ آگے کھسکنے لگے۔ غنڈہ بندوق کاندھے سے لٹکائے دیوار سے ہٹ کر کھڑا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سگریٹ نکال کر سلگانے والا تھا جونہی اس نے ہتھیلی کی آڑ میں ماچس جلائی دارا نے اچھل کر اس کی گردن کو اپنے طاقتور بازو کے شکنجے میں کس لیا روبی نے لپک کر ریوالور کی نال غنڈے کی پیشانی سے لگا دی اور وہ اسے گھسیٹتے ہوئے دیوار سے دور اندھیرے میں لے گئے۔ دارا کے ریوالور کی نالی غنڈے کے سینے پر اس کے دل کے عین اوپر لگی ہوئی تھی۔ دارا نے اسے ایک ہلکا سا جھٹکا دیا غنڈے کی آنکھیں باہر ابل آئیں اس کی ابھی تک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ غنڈے کا سانس بند ہو رہا تھا۔ روبی نے ریوالور جیب میں ڈال کر چاقو نکال لیا اور اس کی نوک غنڈے کی شہ رگ سے لگا کر چاقو کو ذرا دبایا۔

"بولو' نہیں تو تمہاری لاش یہاں تڑپ رہی ہو گی شہر سے جو لڑکی نادر نے اغوا کی ہے وہ کہاں ہے؟" غنڈے نے ہاتھ اوپر اٹھا کر اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو بتاتا ہوں۔

دارا نے بازو کا شکنجہ تھوڑا ڈھیلا کیا اور اسے ہلکا سا جھٹکا دے کر ایک بار پھر پوچھا کہ بتا نادر نے اغوا کی ہوئی لڑکی کو کہاں رکھا ہے۔ غنڈے نے تھرتھراتی آواز میں کہا۔

"وہ ڈھاڑی والے مندر میں لے گیا ہے ابھی...... ابھی۔"

دارا نے اپنا ریوالور نیچے پھینک دیا۔ روبی کے ہاتھ سے چاقو اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے غنڈے کی گردن میں گھونپ کر ایک جھٹکے سے اس کی شہ رگ کاٹی اور خون ابلتے جسم کو پرے دھکیل دیا۔ غنڈے کی کٹی ہوئی شہ رگ میں سے خون کا فوارہ اچھل رہا تھا اور وہ تڑپنے لگا تھا۔ دارا نے چاقو صاف کر کے روبی کو دیا۔ زمین پر سے ریوالور اٹھایا اور روبی سے سرگوشی کی۔

"ڈھاڑی والا مندر ٹیوب ویل کے پاس ہی ہے' میں جانتا ہوں میرے ساتھ آؤ۔"

اندھیرے میں غنڈے کی تڑپتی لاش کو وہیں چھوڑ کر وہ نادر کے ڈیرے کی کچی دیوار کے قریب سے ہو کر ٹیوب ویل کی طرف آئے ٹیوب ویل کے باہر کھمبے پر ہلکی سی روشنی والا ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی دائیں جانب ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ جو ہندوؤں کے چلے جانے سے کھنڈر بن چکا تھا۔ جن دنوں دارا کا دوست میاں خان باقاعدہ اسمگلنگ کا دھندہ کرتا تھا تو وہ دونوں دوست کبھی کبھی یہاں آ کر مال چیک کیا کرتے تھے۔

مندر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دارا کو معلوم تھا کہ مندر کی ڈیوڑھی کے آگے ایک دالان ہے جہاں دیوار میں ہنومان کا بت بنا ہوا تھا جسے توڑ دیا گیا تھا۔ مگر اس کا کچھ حصہ ابھی تک دیوار میں باقی تھا۔ اس دالان کی دونوں جانب دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں۔ دارا نے روبی کو دھیمی آواز میں مندر کا سارا حدود اربعہ بتایا اور کہا کہ نادر اگر لڑکی کے ساتھ یہاں ہے تو ان دو کوٹھریوں میں سے کسی ایک کوٹھری میں ہی ہو گا۔ یہ چھوٹا سا تکونے میناروں والا مندر ایک احاطے میں بڑے سے چبوترے پر بنا ہوا تھا۔ احاطے کا ایک دروازہ بھی ہوا کرتا تھا۔ جسے لوگ اکھاڑ کر لے گئے تھے۔

روبی اور دارا پھونک پھونک قدم رکھتے احاطے میں داخل ہوئے اس وقت دارا نے

بھی چاقو نکال لیا تھا اسے اطمینان تھا کہ پیچھے نادر کے ڈیرے سے کوئی نہیں آئے گا۔ اس نے اس لئے دونوں غنڈوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ مندر کے کھنڈر پر سناٹا اور تاریکی تھی۔ احاطہ بھی خالی پڑا تھا۔ شاید نادر بدمعاش نے یہاں کوئی محافظ مقرر کرنا ضرور نہیں سمجھا تھا۔ کیونکہ ایک طرح سے یہ اس کے ڈیرے کی انیکسی تھی۔ انہوں نے دوڑ کر احاطے کو پار کیا اور پہلے بائیں جانب والی کوٹھری کے پاس آئے۔ یہاں پہلی بار انہیں ایک کمرے سے انسانی قہقہے کی آواز سنائی دی دونوں جلدی سے بیٹھ گئے۔ یہ آواز دوسری کوٹھری کی طرف سے آئی تھی۔ دارا چبوترے کی دیوار کے ساتھ ساتھ لگ کر چلتا ہوا دوسری کوٹھری کے پاس آ کر رک گیا۔ روبی اس کے پیچھے تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی کھلا چاقو تھا۔ کوٹھری کا دروازہ بند تھا اور اس کی درازوں میں سے مدھم مدھم روشنی باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دارا نے روبی کو دروازے کے پہلو میں دیوار کے ساتھ اندھیرے میں کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور خود کوٹھری کی درز میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر کا منظر بڑا گھناؤنا تھا۔ گورے رنگ کی ایک دبلی پتلی سنہرے بالوں والی لڑکی کو جس کے بدن پر صرف ایک قمیص ہی تھی دو غنڈے چارپائی پر زبردستی لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی میں سکت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ بے بسی کے عالم میں اپنا سر دائیں بائیں مار رہی تھی۔ اس کے گلے سے بہت ہی نحیف سی آواز نکل رہی تھی دارا کو ایسے سنائی دیا جیسے وہ ابو جان ابو جان کہہ رہی تھی۔ اس کا خون کھولنے لگا۔ قریب ہی ایک بھاری بدن کا ہٹا کٹا آدمی جس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اسٹول پر صرف تہمد بنیان پہنے بیٹھا آہستہ آہستہ ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"تیرے باپ سے مال بھی لیں گے اور......" دارا نے اپنا چہرہ دروازے کی درز سے پیچھے ہٹایا اور بند دروازے پر دستک دینے کے انداز میں دوبار ہاتھ مار کر جلدی سے اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ دوسری جانب روبی بھی اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز پر اندر سے کسی نے گالی دے کر پوچھا۔

"کون ہے اوئے......" جب باہر سے کوئی جواب نہیں آیا تو نادر نے اپنے آدمی سے

کہا۔

"دیکھ اوئے کوئی ڈیرے سے نہ آیا ہو۔" دارا نے اپنا سانس روک لیا۔ اس کی گرفت سیدھے ہاتھ میں پکڑے خنجر پر مزید مضبوط ہو گئی اندر سے کسی نے کنڈی اتاری پھر دروازے کا ایک پٹ کھلا اندر کوٹھری میں جو لیمپ روشن تھا اس کی دھندلی سی روشنی باہر آئی۔ ایک غنڈے نے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہے بھئی؟" کوئی جواب نہ پا کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اندر سے نادر بدمعاش نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"اوئے کون آیا ہے ڈیرے سے؟" جو غنڈہ باہر آیا تھا۔ بولا۔

"کوئی نہیں نادر بادشاہ! لگتا ہے کسی بلی نے دروازے پر پنجہ مارا ہو گا۔" اندر سے نادر بدمعاش نے گرج کر کہا۔

تو پھر اندر مرو باہر کیا کر رہے ہو۔"

غنڈے نے ایک بار پھر گردن اٹھا کر مندر کے احاطے میں پھیلے اندھیرے پر نگاہ ڈالی اور کوٹھری کی طرف مڑا۔ دارا اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ جونہی یہ غنڈہ دروازے کے سامنے آیا۔ دارا نے پیچھے سے اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اسے اپنے شکنجے میں لیا اور ایک زور دار جھٹکے کے ساتھ اندھیرے میں کھینچ لیا چاقو سے اس کی گردن کاٹنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ دارا نے گردن کو اتنی زور سے جھٹکا اور ایک طرف کو مروڑا تھا کہ غنڈے کی گردن ٹوٹ گئی اور دارا کے بازو میں ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ روبی دوسری طرف دیوار کے ساتھ اندھیرے میں کھڑی آنکھیں سکیڑے گھور کر یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ کوٹھری کا دروازہ ابھی تک تھوڑا سا کھلا تھا۔

اندر سے نادر بدمعاش نے ایک بار پھر بڑی غلیظ گالی دے کر غنڈے کو آواز دی جب باہر سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ بڑبڑاتا گالیاں بکتا ہوا خود ہی دروازے کی طرف آیا دارا اور روبی دونوں جان گئے تھے کہ نادر بدمعاش خود باہر آ رہا ہے۔ دارا کو معلوم تھا کہ نادر کے ہاتھ میں پستول ہے اس نے جلدی سے چاقو صدری میں ڈال کر بھرا ہوا ریوالور ہاتھ میں پکڑ لیا۔ غنڈے کی لاش اس کے قریب ہی چبوترے پر پڑی تھی۔ نادر بدمعاش ادھ کھلے پٹ کو

پاؤں کی ٹھوکر سے کھولتا ہوا کوٹھری سے باہر آ گیا۔ کوٹھری سے آنے والی لیمپ کی ہلکی روشنی میں دارا اور روبی دونوں نے اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ لیا تھا نادر بدمعاش نے باہر آتے ہی زہر بھرے لہجے میں اپنے ساتھی غنڈے کو دو بار گالیاں دے کر آواز دی۔ دارا خوب جانتا تھا کہ نادر ایک پرانا بدمعاش ہے اور اس پر ایسی حالت میں قابو پانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے جب کہ پستول اس کے ہاتھ میں بھی ہو۔ وہ اسے سنبھلنے کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ نہ کوئی چانس لینا یا خطرہ مول لینا چاہتا تھا۔ پلک جھپکنے کی غفلت دارا کی موت کا سبب بن سکتی تھی۔ دارا نے ریوالور کی نالی کا رخ نادر بدمعاش کی طرف کیا اور وہ فائر کرنے ہی لگا تھا کہ اندھیرے میں ایک بجلی سی چمکی اور دوسرے ہی لمحے روبی نادر بدمعاش کے بالکل سامنے آ کر اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں اپنا چاقو گھونپ چکی تھی۔ اور ایک انتہائی تجربہ کار چاقو باز کی طرح چاقو کو نادر کے پیٹ میں جھٹکے دیتی ناف سے اوپر تک لے گئی۔ اور پھر جس طرح اس کے سامنے آئی تھی۔ اسی طرح لپک کر ایک طرف ہٹ گئی۔ نادر بدمعاش کے حلق سے اونٹ کی بلبلاہٹ کی طرح کی آواز نکلی پستول اس کے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سی پیٹ پکڑا ہوا تھا۔ پیٹ کے اندر سے خون اور انتڑیاں باہر گر رہی تھیں۔ روبی نے پیچھے آ کر چاقو کا دوسرا وار نادر بدمعاش کی گردن پر کر دیا وہ پہلے لڑکھڑا گیا تھا۔ اس وار سے وہ آگے منہ کے بل گر پڑا۔ دارا نے روبی کو آواز دی۔

"اندر ایک آدمی ہے۔" اور پھر دوڑ کر کوٹھری میں گھس گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جو غنڈہ اندر ہے وہ ضرور فائرنگ شروع کر دے گا۔ ایسی حالت میں گھبرا کر مغویہ لڑکی کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے مگر اس غنڈے پر ایک دہشت سی چھا گئی تھی اس نے کوٹھری کے کھلے دروازے کے آگے نادر کے پیٹ پر اور گردن پر چاقو کا حملہ ہوتے دیکھ لیا تھا۔ ابھی وہ اپنے حواس کو سمیٹ ہی رہا تھا کہ ریوالور لئے دارا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اغوا کی ہوئی لڑکی کے صرف پاؤں ہی بندھے ہوئے تھے ہاتھ نہیں بندھے تھے۔ وہ چارپائی پر سیدھی ہو کر بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ جہاں اس نے نادر بدمعاش کو گرنے اور اس کے حلق سے بلبلاہٹ کی آواز نکلتے سنی تھی۔ اب ایک اجنبی کو ریوالور کے ساتھ اندر گھستے دیکھا تو اور زیادہ خوف زدہ ہو گئی۔ اور اس کی گھگھی سی بندھ گئی۔ دارا نے لڑکی کی طرف

کوئی توجہ نہ دی اور پلک جھپکنے میں تیسرے غنڈے کو گردن سے دبوچ لیا یہ غنڈہ نہتا تھا۔ چاقو اس کی دھوتی کی ڈھب میں تھا۔ مگر اسے چاقو نکالنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ اتنے میں روبی بھی اندر آگئی۔ اپنے سامنے ایک عورت کو دیکھ کر مغویہ لڑکی روتے روتے ایک دم چپ ہو گئی اور ہاتھ جوڑ کر روبی سے التجا کرنے لگی۔

"مجھے میرے ابو کے پاس لے جاؤ۔ میرے ابو کے پا......"

روبی نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ قریب پڑی ایک چادر اٹھا کر لڑکی کی بندھی ہوئی ٹانگوں پر ڈال دی اور اس کے پاؤں کی رسیاں کھولنے لگی۔ تیسرا غنڈہ ابھی تک دارا کے بازو کے مضبوط شکنجے میں تھا۔ دارا نے اسے جھٹکا دے کر پوچھا۔

"ڈیرے پر کتنے بدمعاش ہیں اس وقت؟ کتنا اسلحہ ہے؟" یہ غنڈہ ان لوگوں کو نادر بدمعاش کا خون کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس نے بتایا۔

"ڈیرے میں اس وقت کل چار آدمی ہیں اور چار پستول اور دو رائفلیں ڈیرے کی کوٹھری میں چار پائی کے نیچے موجود ہیں۔" دارا نے نادر کے ساتھی غنڈے کی گردن کو ایک طرف گھما کر زور سے جھٹکا دیا اور اس کی گردن توڑ ڈالی یہ شیطان صفت درندہ بھی جہنم رسید ہو گیا۔ اس کی لاش کو وہیں پھینکنے کے بعد دارا نے دیکھا کہ مغویہ لڑکی کپڑے پہن چکی تھی۔

روبی نے اسے ایک چادر بھی اوڑھا دی تھی۔ اس نے لاہور میں اپنے باپ کا ایڈریس بتاتے ہوئے التجا کی کہ اسے اس کے ابو جان کے پاس پہنچا دو۔ روبی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو ہم یہاں اسی لئے آئے تھے کہ تمہیں ان درندوں سے چھڑا کر تمہارے گھر پہنچا دیا جائے لیکن ابھی صرف ایک منٹ یہاں بیٹھو ہم نادر بدمعاش کے ڈیرے سے ہو کر آتے ہیں۔ خبردار یہاں سے باہر مت نکلنا باہر نادر کے غنڈے ابھی موجود ہیں۔"

لڑکی کو وہیں کوٹھری میں بند کر کے روبی اور دارا نادر بدمعاش کے ڈیرے پر آگئے۔ ڈیرے پر اسی طرح اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کسی کو یہاں کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی کہ باہر کیا وارداتیں ہو چکی ہیں۔ روبی اور دارا کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ ڈیرے کے چھوٹے سے

احاطے میں دو آدمی لکڑی کے ایک تخت پر گہری نیند سو رہے تھے۔ زمین پر دو خالی بوتلیں پڑی تھیں۔ دارا نے کوٹھری میں جھانک کر دیکھا اور ایک بڑی چارپائی پر بھی دو آدمی الٹے سیدھے پڑے سو رہے تھے۔ روبی نے دارا کے کان میں سرگوشی کی۔

"ان سانپوں کو بھی اسی جگہ ختم کر دینا ہو گا۔ یہ خاندانوں کی عصمتوں کو ڈستے ہیں۔"

دارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ فوراً دونوں نے ریوالور کی جگہ اپنے چاقو نکال لئے اور پہلے کوٹھری میں پڑے دو غنڈوں کی گردنیں کاٹیں اس کے بعد باہر جو غنڈے سو رہے تھے ان کی شہ رگیں کھول دیں۔ یہ غنڈے مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ روبی نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ وہ درندے ہیں جو بہو بیٹیوں کی عزتوں سے کھیلتے ہی نہیں بلکہ ان کا سودا کرتے تھے۔ خاندانوں کو تباہ کر دیتے تھے۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح دنیا کے بنائے ہوئے قانون سے بچ نکلتے تھے۔ مگر آج وہ خاک و خون میں پڑے تڑپ رہے تھے۔ کم از کم یہ درندے اب کسی کی بہن اور بیٹی کی عزت سے نہ کھیل سکیں گے۔

دارا نے چارپائی کے نیچے سے رائفلیں اور پستول نکال لئے۔ اس نے ریوالوروں کی گولیاں نکال کر جیب میں ڈال لیں۔ خالی رائفلیں اور ریوالور وہیں رہنے دیئے اور روبی سے کہا۔

"ہم اس لڑکی کو کیسے لاہور لے جائیں گے؟ ہمارے پاس یہاں کوئی جیپ وغیرہ نہیں ہے۔"

روبی نے کہا۔

"ڈیرے کے احاطے میں میں نے درخت کے نیچے دو گھوڑے بندھے دیکھے ہیں شہر کو جانے والی سڑک تک ہم ان گھوڑوں کو استعمال کریں گے۔ آگے کوئی بس وغیرہ پکڑ لیں گے۔ لڑکی کو اکیلے بھیجنا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔"

وہ درختوں کی طرف بڑھے احاطے کے کونے میں ان درختوں تلے دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ایک کتا زور زور سے بھونکنے لگا اس نے دارا پر حملہ کر دیا۔ دارا نے فائر کر کے اس کو وہیں ڈھیر کر دیا۔

فائرنگ کی آواز وہاں سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر پولیس کی ایک چھاپہ مار پارٹی نے سنی تو تھانیدار نے ڈرائیور سے کہا۔ "جیپ کو تیز کرو یہ فائرنگ نادر کے ڈیرے پر ہوئی

ہے۔" ایک تھانیدار اور چھ سپاہیوں پر مشتمل یہ پولیس پارٹی نادر بدمعاش کے ڈیرے پر منشیات کے ناجائز کاروبار کے سلسلے میں چھاپہ مارنے آئی تھی۔ کیونکہ اوپر سے دفتری روٹین میں آرڈر آیا تھا کہ بدمعاشوں کے ٹھکانوں پر ایک ایک چھاپہ مار کر دو چار لوگوں کو گرفتار کرو۔ تاکہ اخبار میں ہماری کارکردگی کی خبریں چھپیں اور کچھ روز آرام سے گزریں۔ ایسا اکثر ہوا کرتا تھا۔ عام طور پر رشوت خور بد عنوان پولیس افسر بدمعاشوں کو پہلے خبر کر دیتے تھے کہ وہ خود روپوش ہو جائیں اور گرفتاری کے واسطے دو چار بے خبر آدمیوں کو وہاں رہنے دیں۔ مگر نادر کے ڈیرے پر جو تھانیدار چھاپہ مارنے آیا تھا اس کی نئی نئی یہاں تبدیلی ہوئی تھی اور وہ بڑا دیانت دار اور بہادر اور فرض شناس افسر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نادر بدمعاش کے ڈیرے پر اس چھاپے کی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔

روبی اور دارا اس چھاپے سے بے خبر تھے۔ وہ گھوڑے لے کر ڈھاڑی والے مندر میں گئے لڑکی کو باہر نکالا۔ روبی نے اسے اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھا لیا۔ دارا دوسرے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اور انہوں نے گھوڑوں کی باگیں ان کھیتوں کی طرف موڑ دیں جو شیخوپورہ سے لاہور جانے والی سڑک کی طرف پھیلتے چلے گئے تھے۔ دوسری طرف سے پولیس پارٹی بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ تھانیدار کی جونہی ستاروں کی دھندلی روشنی میں کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے گھوڑوں پر نظر پڑی۔ اس نے للکارا۔" ٹھہر جاؤ۔ ورنہ گولی مار دیں گے۔" دارا اور روبی نے پلٹ کر دیکھا۔

کھیت کے کنارے کنارے ان سے کوئی سو فٹ کے فاصلے پر پولیس کی جیپ ان کے برابر چلی جا رہی تھی جیپ میں سپاہی بیٹھے تھے۔ دارا اور روبی نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی جونہی ان کے گھوڑوں کی رفتار تیز ہوئی پولیس نے فائر کھول دیا۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی تھری ناٹ تھری کے لرزا دینے والے دھماکوں نے گھوڑوں کو بھی بدکا دیا گولیاں روبی اور دارا کے دائیں بائیں ہو کر نکل رہی تھیں۔ وہ گھوڑوں کے اوپر جیسے لیٹ سے گئے تھے۔ گھوڑے کھیتوں میں سرپٹ بھاگے جا رہے تھے۔ ان کھیتوں میں کیچڑ تھا۔ پولیس کی جیپ اندر نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھیتوں کے باہر ہی باہر کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگتی رہی تھی۔ روبی اور دارا اپنے گھوڑوں کو دائیں بائیں لہراتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ سامنے نہر کا پل آ گیا۔

یہاں پہنچتے ہی ایک گولی پل سے ٹکرا گئی۔ دارا کا گھوڑا بدکا اور گھبرا کر وہ بائیں طرف کو گھوم گیا اور برق رفتاری سے مغرب کی طرف کھیتوں میں دوڑنے لگا۔ روبی کا گھوڑا اندھیرے میں مشرق کی طرف ہو گیا تھا۔ پولیس کی جیپ نے دارا کی گھوڑی یا گھوڑے کو مغرب کی طرف مڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پولیس نے اس کے پیچھے جیپ لگا دی۔ تھانیدار کا خیال تھا کہ دوسرا گھڑ سوار بھی اسی طرف گیا ہے۔

روبی گھوڑے کو سرپٹ بھگائے لیے جا رہی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ گھوڑا رائفل کی فائرنگ کے دھماکوں سے بدک کر خود بخود سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ جدھر کو اس کا رخ ہو گیا تھا وہ اسی سمت بھاگا جا رہا تھا۔ یہ وہ کھیت تھے جو شیخوپورہ لاہور روڈ کے ساتھ جا کر ملتے تھے۔ چاروں طرف رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کھیتوں میں دوڑنے کی وجہ سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ مغویہ لڑکی روبی کے پیچھے اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ روبی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ گھوڑے کا رخ شیخوپورہ کی جانب ہی ہے چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد اسے دور درختوں میں کہیں کہیں بجلی کی ٹمٹماتی روشنیاں دکھائی دینے لگیں یہ لاہور شیخوپورہ روڈ کی بتیاں تھیں۔ روبی نے باگیں کنٹرول کر کے گھوڑے کی رفتار ہلکی کر دی۔ لڑکی کا برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی دوڑتے گھوڑے کی سواری نہیں کی تھی۔ مگر اس خیال سے اسے تکلیف کا زیادہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ درندوں کی قید سے چھوٹ کر اپنے ابو امی کے پاس جا رہی ہے۔ روبی نے یہاں پہلی بار اس سے پوچھا۔

"تم ٹھیک ہو ناں۔؟" لڑکی نے آہستہ سے ہاں کہا۔ روبی کہنے لگی۔" پولیس پارٹی تھی اس نے چھاپہ مارا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اگر نادر بدمعاش زندہ ہوتا تو پولیس پارٹی کو دیکھ کر تمہیں وہاں سے کہیں اور پہنچا دیتا۔" لڑکی خاموش رہی کمزوری اور خوف سے اس کا دماغ ماؤف سا ہو چکا تھا۔ وہ دل میں صرف ایک ہی جملہ دہرا رہی تھی۔" یا اللہ تیرا شکر ہے یا اللہ تیرا شکر ہے۔" کیونکہ اللہ کی رحمت سے وہ ان درندہ صفت بدمعاشوں کے ڈیرے سے اپنی عزت بچا کر لے آئی تھی۔

گھوڑا ایک کھیت سے نکل کر لاہور شیخوپورہ روڈ پر آ گیا اس زمانے میں..... ان سڑکوں پر ٹرکوں ویگنوں کا ابھی اتنا ٹریفک شروع نہیں ہوا تھا۔ جتنا آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔

سڑک رات کے سناٹے میں دور تک سنسان پڑی تھی۔ لڑکی نے کہا۔

"میں تھک گئی ہوں پلیز مجھے نیچے اتار دو۔"

روبی نے اسے نیچے اتارا پھر خود بھی گھوڑے سے نیچے اتر آئی اب وہ پکی سڑک سے اتر کر کچے میں شیشم کے درختوں تلے اندھیرے میں لاہور کی طرف چل رہی تھیں۔ یہاں پہلی بار روبی نے لڑکی سے اس کا نام پوچھا۔ لڑکی نے بتایا کہ اس کا نام شبانہ ہے وہ لاہور کے ایک کالج میں فورتھ ائیر کی اسٹوڈنٹ ہے اور اس کے باپ کا بہت بڑا کاروبار ہے اور شہر کے باہر ان کا بنگلہ ہے۔ شبانہ نے روبی سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور رحمت کا فرشتہ بن کر کیسے اس کی مدد کو پہنچی؟ روبی نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں یہ سب کچھ جاننے کی ضرورت نہیں۔" وہ اندھیرے میں کبھی کبھی پیچھے مڑ کر سڑک پر دیکھ لیتی تھی کہ کہیں پولیس کی گاڑی یا گھڑ سوار تو اس کے پیچھے نہیں آرہے ہیں روبی نے سوچا کہ گھوڑے کو چھوڑ دینا چاہئے۔ کیونکہ شہر قریب آرہا ہے وہ شہر میں گھوڑے پر سوار ہو کر گئیں اور کسی نے دیکھ لیا تو پولیس کو خبر ہو جائے گی دو گھڑ سوار عورتیں اس طرف سے گزری تھیں۔ روبی نے گھوڑے کا منہ پیچھے کی طرف موڑ کر اسے بھگا دیا شیخوپورہ شہر کی سول لائنز کی روشنیاں قریب آگئی تھیں۔ روبی اور شبانہ سڑک پر آگئی تھیں۔ انہیں بالکل خبر نہیں تھی کہ وہ شیخوپورہ سول لائنز کی پولیس چوکی سے صرف ساٹھ قدم کے فاصلے پر ہیں اور پھر ایک طرف سے پولیس کا سنتری اچانک سڑک پر نکل آیا اور اس نے دونوں عورتوں کو رکنے کا اشارہ کر کے پوچھا۔

"کون ہو تم بی بی اتنی رات گئے کہاں سے آرہی ہو؟"

سہمی ہوئی لڑکی روبی کے پیچھے ہو گئی۔ روبی پولیس کے سپاہی کو گھور کر دیکھنے لگی۔



جنگل جوگی اور لاش

کمانڈو کی بیٹی

اے حمید

روبی کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر سپاہی نے کہا۔

"بی بی میری طرف پٹر پٹر کیا دیکھ رہی ہو۔ مجھے بتاؤ تم دونوں اتنی رات گئے کہاں سے آرہی ہو؟" روبی نے اتنی دیر میں سوچ لیا تھا کہ اسے اب کیا کہنا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ پولیس کسی واردات کی تفتیش کرے یا نہ کرے مگر خود کسی واردات میں ملوث ہونے سے بڑی گھبراتی ہے۔ چنانچہ اس نے آواز میں گھبراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"میں لاہور کے ایک کالج کی پروفیسر ہوں۔ یہ میری سہیلی ہے۔ میں اسے ملنے لاہور سے آئی تھی۔ اس کا خاوند نشہ کرتا ہے۔ اس نے میری سہیلی کو مارا پیٹا ہے۔ وہ اسے جان سے مار دینا چاہتا ہے۔ میں اسے بڑی مشکل سے نکال کر بھاگی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس کا خاوند ہاکی لے کر اسے ہلاک کرنے ...... پیچھے ...... پیچھے آرہا ہو۔ آپ پلیز ہمیں یا تو پولیس چوکی میں پناہ دے دیں یا ہمیں لاہور جانے والی بس میں بٹھا دیں۔"

پولیس کانسٹیبل پر وہی اثر ہوا جس کا روبی کو یقین تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

"بی بی! پولیس کو کیوں پیچ میں پھنساتی ہو۔ لڑائی جھگڑا اچھی بات نہیں ہے۔ تھانے میں کوئی واردات ہو گئی تو ہمیں پسوڑی پڑ جائے گی۔ اس بی بی کو لے کر لاہور کی طرف چلی جاؤ۔ آگے اڈہ ہے۔ کوئی بس آئی تو اس میں بیٹھ جانا۔ اس کا خاوند آیا تو میں اسے سنبھال لوں گا۔ جاؤ شاباش۔"

روبی نے شبانہ کو ساتھ لیا اور سڑک پر آگے چل پڑی۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد مغویہ لڑکی شبانہ کہنے لگی۔

"تم نے خوب ڈراما کیا۔ لیکن تم پولیس کو بتا دیتیں کہ تم مجھے ڈاکوؤں کے چنگل سے

چھڑا کر لائی ہو۔" روبی نے آہستہ سے کہا۔

"وہاں نادر بدمعاش کے ڈیرے پر جو اتنی لاشیں پڑی ہیں ان کا حساب بھی تو دینا پڑتا۔"

شبانہ خاموش رہی۔ آگے چوک آگیا۔ بائیں جانب لاری اڈہ بالکل سنسان پڑا تھا۔

"یہاں تو کوئی لاری نہیں ہے۔" شبانہ نے فکر مند ہو کر کہا۔ روبی نے کہا۔

"اسٹیشن پر چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی لاہور جانے والی گاڑی مل جائے۔" ابھی وہ اسٹیشن کی طرف جانے کا پروگرام ہی بنا رہی تھیں کہ سڑک پر لاری کی بتیاں نظر آئیں۔ پھر ہارن کی آواز آئی۔ ایک لاری اڈے پر آکر رک گئی۔ اس میں بیٹھے اکثر مسافر سو رہے تھے۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر روبی اور شبانہ سے کہا۔

"بی بی لاہور جانا ہے تو بیٹھ جاؤ۔ سنتری نے بتایا ہے کہ تم لاہور جا رہی ہو۔"

روبی اور شبانہ جلدی سے لاری کی ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ لاری چل پڑی۔ روبی نے اطمینان کا سانس لیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد لاری لاہور شہر کے شمالی مضافات میں سے گزر رہی تھی۔ بادامی باغ میں ان لاریوں کے واسطے نیا نیا اڈہ تعمیر ہوا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ مسافر اترنے لگے۔ روبی اور شبانہ بھی گاڑی سے اتر آئیں۔ ابھی رکشے نئے نئے چلے تھے۔ مگر انہیں ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ شبانہ نے ڈرائیور کو ماڈل ٹاؤن کی طرف چلنے کو کہا۔ ٹیکسی لاہور شہر کی خالی خالی روشن سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ رات کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ روبی کی آنکھیں جل رہی تھیں مگر نیند کوسوں دور تھی۔ اسے بار بار دارا کا خیال آتا کہ نہ جانے وہ کس طرف نکل گیا ہو گا۔ لیکن وہ جہاں بھی گیا ہو گا میاں خان کے فارم میں ضرور واپس آجائے گا۔ روبی بھی چاہتی تھی کہ دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے کسی طرح میاں خان کے فارم میں پہنچ جائے۔ روبی مغویہ لڑکی شبانہ کو اس کے ماں باپ کی کوٹھی کے دروازے پر چھوڑ کر واپس جانے لگی تو شبانہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"نہیں میری بہن! میں اکیلی گھر میں داخل نہیں ہوں گی۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔ پلیز!"

روبی اس کے ساتھ ہولی۔ کوٹھی بڑی عالی شان تھی۔ آگے پیچھے کشادہ باغ تھا۔ پورچ

میں تین گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ ایک لائیٹ جل رہی تھی۔ شبانہ نے برآمدے میں آکر محرابی دروازے کے باہر لگی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ تیسری بار گھنٹی دینے سے اندر کسی کی نیند بھری آواز آئی۔

"کون ہے؟" یہ کوئی نوکر تھا۔ شبانہ نے رقت بھری آواز میں کہا۔

"میں ہوں رحمت بابا شبانہ۔" اندر جو کوریڈور تھا اس کی بتی ایک دم روشن ہو گئی۔ دروازہ کھل گیا۔

ایک عمر رسیدہ نوکر نے آگے بڑھ کر شبانہ کے ماتھے کو چوم لیا اور یا اللہ تیرا شکر ہے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے پکارتا ہوا گھر میں سوئے ہوئے لوگوں کو آوازیں دینے لگا۔

دو منٹ بعد شبانہ ایک سجے سجائے ڈرائینگ روم میں اپنی بھاری بدن والی والدہ کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھ کر اس کی بلائیں لے رہی تھی۔ ادھیڑ عمر باپ خوش بھی تھا اور کچھ پریشان بھی تھا۔ وہ ٹیلی فون کا کوئی نمبر گھما رہا تھا۔ روبی نے انہیں صرف یہی بتایا تھا کہ میں شبانہ کو بدمعاشوں کے ڈیرے سے نکال لائی ہوں میں نے اسے بے آبرو ہونے سے بچا لیا ہے اور غنڈے اب ان کا نہ تو پیچھا کریں گے اور نہ شبانہ کو دوبارہ اغوا کرنے کی دھمکی دیں گے۔ مگر شبانہ کے باپ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے خاندان کی عزت غنڈوں بدمعاشوں کے ہتھکنڈوں سے محفوظ ہو گئی ہے۔ اس نے روبی کی باتوں پر زیادہ یقین نہیں کیا تھا۔ وہ ڈی۔ ایس۔ پی کو فون کر رہا تھا اور روبی کے دیکھتے دیکھتے اس نے ڈی۔ ایس۔ پی سے بات شروع کر دی۔ جب روبی نے ڈی۔ ایس۔ پی کا سنا تو یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں نے اپنا فرض ادا کر دیا اب مجھے اجازت دیں۔"

مگر شبانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی عاجزی سے بولی۔

"بہن! پلیز ابھی مت جاؤ۔ ابھی میرے کمرے میں میرے پاس بیٹھو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے تم میرے پاس رہو گی تو مجھے حوصلہ رہے گا۔" روبی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم جوان لڑکی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری عزت بچا لی ہے۔ تمہیں بھی اب بہادری سے کام لینا چاہئے۔ اپنے اندر اعتماد پیدا کرنا چاہئے۔ تم کالج میں پڑھتی ہو۔ اس تعلیم کا کیا

فائدہ جو تمہارے اندر اعتماد اور دلیری پیدا نہ کر سکے۔ اب مجھے اجازت دو۔" شبانہ کی امی اور ڈیڈی نے بھی روبی کو باقی رات وہیں آرام کرنے کو کہا مگر روبی نے واپس جانے پر اصرار کیا۔ اتنے میں باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ روبی کے کان کھڑے ہو گئے۔ شبانہ کے باپ نے کہا۔

"میں نے ڈی۔ایس۔پی صاحب کو شبانہ کی واپسی کی خبر کر دی تھی۔ انہوں نے ایس ایچ او کو جگا کر شبانہ کا بیان لینے کے لئے بھیجا ہے۔" اتنے میں گھنٹی بجی شبانہ کا باپ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ روبی نے اسے روک دیا اور کہا۔

"میں کسی وجہ سے نہیں چاہتی کہ پولیس کو پتا چلے کہ میں شبانہ کو نکال کر لائی ہوں۔ اس میں آپ کی بیٹی کی بھی بھلائی ہے۔ اگر پولیس کو میرا پتا چل گیا تو آپ کی بیٹی پر پھر کوئی مصیبت آ سکتی ہے۔"

شبانہ کے باپ نے کہا۔

"تم جیسے کہتی ہو ویسے ہی ہو گا بیٹی خدا کا شکر ہے میں نے ڈی ایس پی کو فون پر یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے ایک عورت نکال کر لائی ہے۔ تم ایسا کرو ساتھ والے کمرے میں چلی جاؤ۔"

روبی جلدی سے ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائینگ روم میں تھانیدار دو سپاہیوں کے ساتھ داخل ہوا۔ اس نے شبانہ کے والد کو سلام کیا پھر شبانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے بچی گھر واپس آ گئی بیٹی تمہیں کون لایا ہے یہاں؟" شبانہ کی بجائے اس کے باپ نے جلدی سے کہا۔

"اکیلی ہی بدمعاشوں کے چنگل سے نکل کر بھاگی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بچی گھر آ گئی۔" تھانیدار نے بڑے ادب سے تھوڑا مسکراتے ہوئے شبانہ کے باپ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"جناب والا! میں نے بچی سے پوچھا ہے۔ اسے جواب دینے کا موقع دیں۔" شبانہ کے والد بولے۔

"وہ بے چاری سخت پریشان ہے۔ وہ بھی یہی جواب دے گی۔" تھانیدار نے شبانہ کی طرف دیکھ کر اپنا سوال دہرایا۔

شبانہ اب پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھی۔ وہ روبی کو اپنی سب سے بڑی محسنہ سمجھتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ روبی کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ ان دونوں نے اسے نادر بدمعاش اور اس کے غنڈوں کے چنگل سے نکالا تھا اور ان سب کو ہلاک کر دیا تھا۔ وہ بھلا کس طرح روبی کا نام لے سکتی تھی۔ اپنے گھر کی فضا نے شبانہ میں مزید خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے کہا۔

"تھانیدار صاحب میں پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ ٹھیک ہے غنڈوں نے مجھے کالج کے گیٹ سے قابو کر کے اغوا ضرور کر لیا تھا مگر میں موقع کی تلاش میں تھی۔ آج رات مجھے موقع مل گیا اور میں کھڑکی کا شیشہ توڑ کر وہاں سے نکل بھاگی اب آپ کا فرض ہے کہ ان بدمعاشوں کو گرفتار کریں جو عزت دار لوگوں کی عزتوں سے کھیلتے ہیں۔ میں آپ کو نادر بدمعاش کے اڈے کا پورا پتہ بتائے دیتی ہوں۔" تھانیدار کا چہرہ ایسا تھا جیسے اسے شبانہ کی ایک بات کا بھی یقین نہیں آیا۔ کہنے لگا۔

"بیٹی! تو اس وقت تھکی ہوئی ہے اور بڑے خطرناک قاتلوں کے پنجے سے نکل کر آئی ہے۔ تو آرام کر میری بچی۔" تھانیدار اٹھا اور شبانہ کے والد سے کہنے لگا۔

"سر جی! میں کل کسی وقت حاضر ہوں گا۔ ویسے ہماری ایک چھاپہ مار پارٹی دو گھنٹے ہوئے ان بدمعاشوں کے اڈے کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے بچی کے وہاں سے بھاگ نکلنے کے بعد پولیس پارٹی وہاں پہنچی ہو۔ اچھا جی میں چلتا ہوں آپ آرام کیجئے۔" تھانیدار اپنے سپاہیوں کو لے کر ڈرائینگ روم سے نکل گیا۔

روبی نے بند دروازے کے ساتھ کان لگائے یہ ساری باتیں سن لی تھیں۔ جب پولیس والے چلے گئے تو روبی دروازہ کھول کر ڈرائینگ روم میں آ گئی۔ شبانہ کی والدہ اور والد اسے تحسین اور احسان بھری نظروں سے دیکھنے لگے شبانہ کے والد نے اس سے کہا۔

"بیٹی! تم نے اپنے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتایا کہ تم کون ہو اور ہماری بچی کے پاس کیسے پہنچ گئیں۔" روبی کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا۔

"آپ لوگ ایسی باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں جن کا آپ کے ساتھ کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں جو بھی کوئی ہوں میں نے آپ کی بچی کو عزت و آبرو سمیت آپ کے پاس پہنچا دیا ہے اور یہ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اب میں سو جانا چاہتی ہوں۔ اور آپ سے صرف اتنا چاہوں گی کہ میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔"

شبانہ کا باپ اور والدہ روبی سے معذرت کا اظہار کرنے لگے۔ شبانہ کے باپ نے شبانہ سے کہا۔

"بیٹی! اپنی بہن کو اپنے کمرے میں لے جاؤ اور تم بھی آرام کرو۔" پھر اس نے روبی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بیٹی! تم بے فکر رہو تمہارے بارے میں یہاں کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔"

شبانہ روبی کو اپنے کمرے میں لے آئی روبی نے قمیص کے اندر سے چاقو اور ریوالور نکال کر سرہانے کے نیچے رکھ دیا۔ وہ بڑے آرام وہ بستر پر لیٹ گئی شبانہ بولی۔

"تم آرام کرو روبی! تم نے جیسا کہا ہے ویسا ہی ہو گا۔ میں ساتھ والے کمرے میں سونے جا رہی ہوں۔"

روبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ شبانہ کے جانے کے بعد روبی نے اٹھ کر دروازے کی چٹخنی لگا دی بند کھڑکی کے آگے پردہ کھینچا اور بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو سارے کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ روبی نے اٹھ کر غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر دیکھا کوٹھی کا عقبی لان اور اس کے پیڑ پودے دھوپ میں روشن روشن تھے۔ ایک مالی کونے کی جانب مشین چلا کر گھاس کاٹ رہا تھا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی روبی نے دروازہ کھول دیا۔ شبانہ شگفتہ چہرے اور صاف ستھرے لباس کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ وہ روبی کے لئے ناشتہ لائی تھی۔ روبی بستر پر بیٹھ گئی۔ سرہانے کے نیچے سے ریوالور نکال کر کھولا اور اس کی گولیاں گننے لگی۔ صرف پانچ گولیاں ریوالور میں باقی تھیں۔ روبی

نے ریوالور دوبارہ سرہانے کے نیچے رکھ دیا۔ ناشتہ کرتے ہوئے شبانہ کہنے لگی۔

"روبی بہن! تم نے مجھ پر میرے خاندان پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ہم ساری زندگی اس کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔"

روبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ شبانہ نے پوچھا۔" روبی بہن! اب تمہارا کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ تم نے اپنے بارے میں تو مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔" روبی چائے پی رہی تھی۔ پیالی ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے بولی۔

"آخر تم لوگوں کو میرے بارے میں اتنی کرید کیوں ہے؟ میں نے تو تمہارے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔" شبانہ نے فوراً معذرت پیش کی اور بولی۔

"معاف کرنا روبی میں نے ویسے ہی پوچھا تھا اصل میں مجھے تمہاری سلامتی کی فکر ہے۔" روبی نے بے نیازی سے کہا۔

"تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔"

دونوں خاموشی سے ناشتہ کرنے لگیں۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ روبی نے وہاں سے کیسے نکلنا تھا اور نکل کر کہاں جانا تھا؟ یہ سب کچھ اس نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ اس نے شبانہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمہیں میرے ایک دو کام کرنے ہوں گے۔" روبی نے چائے کی پیالی طشت میں رکھنے کے بعد شبانہ سے کہا۔

"مجھے میرے سائز کا ملیشیا کا ایک مردانہ سوٹ یعنی شلوار قمیص، قمیص کے اندر پہننے کے لئے لٹھے کی ایک مضبوط صدری اور ربر کے جوتے لا دو۔" شبانہ سمجھ گئی کہ روبی اس کی عزت بچانے کے واسطے تین چار غنڈوں کا خون کر چکی ہے اور اب وہ مردانہ حلیے میں لاہور سے کسی دوسرے شہر کی طرف فرار ہو جانا چاہتی ہے اس نے کہا۔

"میں یہ ساری چیزیں تمہیں لا دوں گی۔" پھر شبانہ اٹھ کر الماری کے پاس گئی وہاں سے سو سو کے پچاس ساٹھ نوٹ نکال لائی۔" اور روبی کے قریب پلنگ پر رکھ کر بولی۔" یہ قبول کر لو۔ تمہیں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" روبی نے ہاتھ سے نوٹوں کو پرے کر دیا۔

"شکریہ! میرے پاس سب کچھ ہے۔" اسی وقت شبانہ نے روبی کا ناپ لیا اور گاڑی

نکال کر شہر کی مارکیٹ میں آ گئی۔ وہاں سے مطلوبہ چیزیں خریدیں اور واپس اپنی کوٹھی میں آ کر روبی کے حوالے کر دیں۔ روبی نے کپڑے پہن کر دیکھے وہ اس کے جسم پر پورے تھے۔ روبی نے کچھ کرنسی نوٹ ابھی تک اپنی کمر کے ساتھ تھیلیوں میں ڈال کر باندھ رکھے تھے۔ یہ نوٹ اس نے صدری کی جیب میں رکھ لئے جو قمیص کے نیچے پہنی ہوئی تھی۔ اسی صدری کی ایک جیب میں ریوالور اور چاقو بھی سنبھال کر رکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے شبانہ سے کہا۔

"قینچی لا کر میرے سر کے بال بالکل چھوٹے چھوٹے کر دو۔ جیسے لڑکوں کے ہوتے ہیں۔" روبی کے بال پہلے ہی گردن تک کٹے ہوئے تھے۔ شبانہ نے انہیں کاٹ کر مزید چھوٹا کر دیا۔

روبی کا جسم پہلے ہی دبلا پتلا تھا چنانچہ اس کے نسوانی خطوط ملیشیا کے کھلے مردانہ کرتے میں بڑی آسانی سے چھپ گئے تھے۔ عورت ہونا روبی کے چٹان جیسے عزائم کی راہ میں رکاوٹ ضرور تھا لیکن روبی نے اپنی بے پناہ قوت ارادی اور جرائم کے خلاف جنگ کے جذبے سے اس کمزوری پر بہت حد تک قابو پا لیا تھا۔ اس میں روبی کی اس ٹریننگ کا بھی حصہ تھا جو اس نے دشمن پر بغیر کسی ہتھیار کے غالب آنے کے واسطے ہانگ کانگ میں حاصل کی تھی۔ بدی کی طاقتوں اور جرائم پیشہ مجرموں نے اسے جس بے دردی سے گھر سے بے گھر، اپنی پیاری بچی عائشہ اور محبوب ترین خاوند شیر خان سے الگ کر دیا تھا، روبی کو اس کا بھی شدت سے احساس تھا۔ وہ کسی دوسرے ملک میں تیسرے درجے کا شہری بننے کی بجائے اپنے وطن میں اپنے خاوند کے ساتھ عزت آبرو کی غریبانہ زندگی بسر کرنا چاہتی تھی لیکن جرائم پیشہ لوگوں نے ہر قدم پر اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں اور اس کی عزت کا سودا کرنا چاہا۔ روبی نے نہ اپنی عزت کا سودا کیا نہ کسی دوسری پاک باز عورت کی عزت کا سودا کرنے کی اجازت دی اور پھر وہ ایک قہر بن کر بجلی کا کوندا بن کر اٹھی اور اب ہر اس عادی مجرم پر بجلی بن کر گر رہی تھی جو خاندانوں کی عزتوں اور ماتا کے جگر کے ٹکڑوں کا سودا کرنا چاہتے تھے اور تاوان کی رقم نہ ملنے پر مظلوم لڑکیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر انہیں ہلاک کر دیتے یا آگے فروخت کر دیتے تھے۔ شبانہ نے ڈرتے ڈرتے روبی سے پوچھا۔

"کیا تم مجھے بھی نہیں بتاؤ گی کہ یہاں سے کہاں جاؤ گی؟"

روبی اس وقت مردانہ لباس میں تھی۔ سر کے چھوٹے چھوٹے بالوں کی وجہ سے بھی وہ بالکل نوجوان لڑکا لگ رہی تھی۔ اس نے ذرا سے تبسم کے ساتھ شبانہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"نہیں بتا سکتی۔"

روبی وہاں سے سیدھی دارا کے دوست میاں خان کے فارم کی طرف نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دارا وہاں ضرور پہنچ گیا ہو گا۔ اگرچہ میاں خان کا فارم نو غنڈوں کی قتل گاہ یعنی نادر بدمعاش کے ڈیرے کے قریب تھا۔ لیکن روبی کا وہاں پہنچنا بھی ضروری تھا۔ اسے ہر حال میں دارا سے ملنا تھا اور اس کے بعد کوئی اگلا پروگرام بنانا تھا۔ شام ہونے تک وہ شبانہ کے کمرے میں ہی رہی۔ اسی دوران پولیس آ کر شبانہ کا بیان لے گئی تھی جس میں اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ ڈیرے سے اکیلی بھاگی تھی اور وہاں جو قتل ہوئے ہیں ان کے بارے میں اسے کچھ علم نہیں ہے۔

جب شروع رات کا اندھیرا شہر کے گلی کوچوں میں اتر آیا تو روبی نے شبانہ سے کہا۔

"اب میں جاتی ہوں۔" شبانہ بولی۔

"تمہیں جہاں تک جانا ہے میں اپنی گاڑی میں چھوڑ آتی ہوں۔" روبی نے ملیشیا کی پتلی سی چادر اپنے کاندھوں پر ڈال رکھی تھی۔ اس نے شبانہ کے کاندھے کو تھپتھپا کر کہا۔

"ایک بات یاد رکھو۔ یہاں پولیس تمہاری نگرانی کر رہی ہے۔ اس کو تمہارے بیان پر یقین نہیں آیا ہو گا۔ وہ جانتی ہے کہ تم نادر بدمعاش کے ڈیرے پر ہونے والے قتل کی عینی گواہ ہو اور قاتل کو پہچان سکتی ہو اور جان بوجھ کر اس کا نام چھپا رہی ہو۔ تمہیں کچھ روز اسی طرح اپنے بیان پر ڈٹے رہنے کی ضرورت ہے۔ پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تمہاری جگہ اگر کوئی غریب مزدور کی لڑکی ہوتی تو پولیس اسے تھانے لے جا کر اب تک سب کچھ اگلوا چکی ہوتی۔ مگر تم ایک امیر اور با اثر آدمی کی بیٹی ہو پولیس تم پر ہاتھ نہیں ڈالے گی۔ میں اکیلی ہی یہاں سے نکلوں گی مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہاری کوٹھی کے پچھواڑے جو سڑک ہے وہاں سے راوی کے پل کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے۔"

روبی جب رخصت ہونے لگی تو شبانہ کی آنکھیں فرط عقیدت سے بھر آئیں۔ روبی نے اچانک شبانہ کو گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑا اور سخت لہجے میں کہا۔

"خبردار! آنسو مت بہانا۔ میں کسی بھی عورت کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی۔"

روبی نے شبانہ کا گریبان چھوڑ کر اسے تھوڑا سا پیچھے دھکیل دیا۔ شبانہ پلنگ پر گرتے گرتے بچی۔ اتنی دیر میں روبی کمرے کی کھڑکی سے اتر کر عقبی لان کی جھاڑیوں میں پہنچ چکی تھی۔ وہاں سے وہ جھکے جھکے چلتی عقبی باغیچے کی دیوار میں بنے ہوئے چھوٹے سے دروازے کی طرف بڑھی کوٹھیوں کے پچھواڑے کی چھوٹی سی سڑک پر کہیں کہیں کوئی بتی جل رہی تھی۔ روبی مردانہ لباس میں تھی۔ ایک پتلی چادر اس نے اپنے ملیشئے کے مردانہ شلوار قمیص والے سوٹ کے اوپر لے رکھی تھی۔ سر کے بال چھوٹے چھوٹے مردانہ طرز کے تھے۔ اسے کوئی بمشکل ہی پہچان سکتا تھا کہ یہ ایک عورت ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے کوٹھیوں کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی نسبتاً کھلی سڑک پر آگئی۔ یہاں اس کو ایک خالی ٹیکسی مل گئی اس نے ڈرائیور کو شاہدرہ چوک کی طرف چلنے کو کہا کیونکہ وہیں سے ایک سڑک شیخوپورہ کی طرف جاتی تھی۔

ٹیکسی لاہور کی روشنی اور بارونق سڑکوں پر سے گزرتی پندرہ بیس منٹ میں شاہدرہ چوک پہنچ گئی۔ یہاں سے روبی ایک بس میں سوار ہوئی اور شیخوپورہ شہر سے ذرا آگے جا کر اتر گئی۔ وہ اس جگہ کو پہچانتی تھی رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت کوئی سواری میاں خان کے گاؤں کی طرف جانے والی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے ایک تانگے والے کو زیادہ رقم دے کر اور یہ کہہ کر جانے پر راضی کیا کہ میری ماں گاؤں میں بڑی بیمار ہے میں اس کی عیادت کو جا رہا ہوں۔ تانگہ کھیتوں میں سے گزر کر کچی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ یہاں چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی ہی تھی۔ روبی کے پاس روپے بھی تھے۔ چاقو اور ریوالور بھی تھا جس میں صرف چند ایک گولیاں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ سیم نالے یعنی کھال کے پل پر روبی نے تانگے والے کو واپس کر دیا۔

رات کی تاریکی اور ستاروں کی دھندلی روشنی میں کھیتوں میں میاں خان کے فارم کی طرف روانہ ہو گئی۔ آدھے گھنٹے بعد اسے میاں خان کے فارم کے اکلوتے بلب کی روشنی

دور درختوں میں نظر آئی۔ روبی نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ اس کا خیال تھا کہ دارا وہیں پر ہو گا۔ وہ فارم کی عقبی جھاڑیوں والی دیوار سے ہو کر فارم کے احاطے میں آئی تو دونوں کوٹھریوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تخت پوش پر کوئی کھیس اوپر کیے سو رہا تھا روبی نے سوئے ہوئے آدمی کے منہ پر سے کھیس ہٹا دیا۔ یہ میاں خان کا بوڑھا ملازم تھا وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ روبی نے کہا۔

"میاں خان کہاں ہے؟ کیا میرا بھائی یہاں آیا تھا؟" ملازم نے روبی کو پہچان لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"خان جی تو گھر چلے گئے ہیں۔ تمہارا ساتھی تمہارے بعد نہیں آیا۔ میں خان جی کو بلاتا ہوں۔" ملازم میاں خان کو بلانے چل دیا۔

روبی وہیں تخت پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ دارا ادھر کیوں نہیں آیا؟ اسے یہاں آجانا چاہئے تھا۔ وہ تو جانتا تھا کہ میں واپس فارم پر ہی آؤں گی۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گیا۔ روبی انہی خیالوں میں الجھی ہوئی تھی کہ میاں خان آگیا۔ اس نے ملازم کو دودھ گرم کرنے کو کہا۔

روبی بولی۔

"میں شہر سے کھانا کھا کر آرہی ہوں۔ دودھ کی ضرورت نہیں خان بھائی۔ یہ بتاؤ کہ دارا کہاں ہے؟" میاں خان تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ اس کے گلے میں پستول لٹک رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"پہلے یہ بتاؤ تمہیں یہاں آتے کسی نے دیکھا تو نہیں؟" روبی نے کہا۔

"میرا خیال ہے کوئی میرا پیچھا نہیں کر رہا ویسے بھی میں نے مردانہ حلیہ بنا رکھا ہے۔"

میاں خان بولا۔

"اچھا کیا۔ کیونکہ نادر بدمعاش اور اس کے سارے غنڈوں کے قتل کے بعد یہ سارا علاقہ خفیہ پولیس کی نگرانی میں ہے۔ تم لوگوں نے وہ کام کر دکھایا جو پولیس کئی سالوں سے نہیں کر سکی۔ علاقے کے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا ہے۔ ان بدکردار جرائم پیشہ لوگوں نے شریفوں کی زندگیاں عذاب میں ڈال رکھی تھیں۔ کسی کی عزت انکے ہاتھوں محفوظ نہیں

تھی۔ اب عورتیں رات کو بھی گھروں سے نکل کر اپنے کھیتوں میں چلی جاتی ہیں۔"

روبی نے اپنے اصل موضوع پر آتے ہوئے اپنا سوال دہرایا ۔ "دارا فارم پر کیوں نہیں آیا۔" پھر اس نے میاں خان کو سارا واقعہ سنا دیا کہ کس طرح وہ غنڈوں کو جہنم رسید کرنے کے بعد مغویہ لڑکی کو لے کر ڈیرے سے نکلے۔ کیسے اسی وقت پولیس کی چھاپہ مار پارٹی بھی آ گئی۔ فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ لڑکی کو گھوڑے پر بٹھا کر بھاگے۔ پھر دارا کا گھوڑا فائرنگ کے دھماکوں سے بے قابو ہو کر کھیتوں میں ان سے بچھڑ گیا۔ میاں خان نے ساری کہانی سنی اور کہنے لگا۔

"دارا بڑا سیانا آدمی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اتنے آدمیوں کے قتل کے بعد یہ سارا علاقہ پولیس کے گھیرے میں آجائے گا اور اس فارم میں اس کے گرفتار ہونے کا پورا امکان ہے۔ اسی خیال سے وہ ادھر نہیں آیا۔" میاں خان نے اندھیرے میں ڈوبے آس پاس کے درختوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مجھے شک ہے کہ تمہارے پیچھے بھی خفیہ پولیس کا کوئی نہ کوئی آدمی گاؤں کے باہر سے لگ گیا ہو گا۔" روبی کہنے لگی۔

"اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو میں ابھی یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ہماری وجہ سے تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ۔" میاں خان نے اٹھ کر کوٹھری کا تالہ کھول دیا اور روبی سے کہا۔

"تم یہاں آرام کرو۔ صبح بات کریں گے۔ میرا ملازم فارم کے احاطے میں پہرہ دے گا۔ تم اطمینان سے سو جاؤ۔"

میاں خان خاموشی سے جدھر سے آیا تھا ادھر چل دیا۔ روبی کو میاں خان کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے بارے میں اس کا رویہ بہت محتاط ہو گیا ہے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ میاں خان بدمعاشی اور اسمگلنگ چھوڑ کر اب ایک شریفانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا نام پولیس کے رجسٹروں میں دوبارہ چڑھے۔ روبی نے میاں خان کے اس رویے کو دل میں سراہا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کی شریفانہ زندگی میں کسی قسم کا خلل نہیں ڈالے گی۔ ویسے بھی چونکہ دارا وہاں نہیں تھا اس لئے روبی کے وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ اگلے روز وہاں سے جانے والی تھی لیکن میاں خان کے محتاط

رویے کو دیکھتے ہوئے روبی نے اسی وقت وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے پاس کافی پیسے تھے۔ جو نوٹوں کی شکل میں اس کی قمیص کے اندر صدری میں موجود تھے اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر بوڑھا ملازم تخت پوش پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ روبی اس کے پاس آئی۔ ملازم اٹھ کھڑا ہوا۔

"کچھ چاہئے بی بی۔" بوڑھے تجربہ کار ملازم نے رات کو ہی روبی کو مردانہ لباس میں پہچان لیا تھا۔ روبی نے کہا۔

"میں شہر جا رہی ہوں۔ خان جی کا میری طرف سے شکریہ ادا کرنا۔" ملازم نے کہا۔

"بی بی اس وقت تمہیں شہر جانے والی سواری کہیں نہیں ملے گی۔ ایسا کرو گھوڑی سے جاؤ۔ اسے شیخوپورہ والی سڑک پر پہنچ کر چھوڑ دینا۔ یہ اپنے آپ فارم میں پہنچ جائے گی۔"

روبی کو یہ ترکیب پسند آئی۔ اس کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑی پر بیٹھی اندھیرے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔

روبی کو شیخوپورہ والی سڑک پر پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس جانب پولیس کا کوئی آدمی اسے نہیں ملا۔ اس نے گھوڑی کا رخ پیچھے کی طرف کر کے اسے بھگا دیا۔ اب وہ لاہور والی سڑک پر تھی۔ آگے بائیں جانب شیخوپورہ شہر کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ وہ پولیس چوکی کے سامنے سے گزرنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سڑک سے اتر کر کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی اور ایک چکر کاٹ کر پولیس چوکی سے کوئی دو فرلانگ آگے سڑک پر چڑھ آئی۔ اس وقت رات کا دس ساڑھے دس کا وقت ہو گا اسے لاہور جانے والی لاری مل گئی۔ یہ لاری پنڈی سے آ رہی تھی۔ روبی کراچی جانے کا سوچ کر میاں خان کے فارم سے نکلی تھی۔ اسے شیر خان اور اپنی بیٹی عائشہ کی یاد بہت ستانے لگی تھی۔ وہ کسی دوسری طرف نکل جانے سے پہلے اپنے محبوب خاوند اور جگر کے ٹکڑے اپنی پیاری بچی سے ایک بار ضرور ملنا چاہتی تھی۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ شاید کراچی میں شیر خان سے دارا کا کچھ پتہ چل جائے۔ وہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب لاری سے اتر گئی۔ مردانہ لباس میں ہونے کی وجہ سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ روبی نے لاہور سے کراچی تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر آ کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ وہ عام

قسم کا محنت کش لڑکا لگ رہی تھی۔ جو پوٹھوہار کے علاقے سے محنت مزدوری کے واسطے لاہور آجاتے ہیں۔ رات کے بارہ بجے اسے کراچی کی گاڑی ملی۔ تھرڈ کلاس میں اس زمانے میں ابھی زیادہ رش نہیں ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ بڑے آرام کے ساتھ برتھ پر چڑھ کر لیٹ گئی۔ یہ پسنجر ٹرین تھی اور اسے اگلے روز رات کو کراچی پہنچنا تھا۔

روبی کو اس ٹرین میں چھوڑ کر ہم دارا کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ کیا گزری۔ جس وقت پولیس کی فائرنگ سے بدک کر دارا کا گھوڑا بے قابو ہو کر کھیتوں میں دوڑ پڑا اس وقت پولیس بھی اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔ پولیس کی جیپ کچھ دور تک دارا کے پیچھے گئی مگر اونچی فصل کی وجہ سے وہ آگے نہ جا سکی۔ دارا ان کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کو قابو میں کر لیا تھا اور اب اپنی مرضی سے اسے کھیتوں میں بھگائے لئے جا رہا تھا۔ کھیتوں سے نکل کر اس نے گھوڑے کو ایک کچے راستے پر ڈال دیا۔ وہ ابھی تک گھوڑے کو بھگائے لئے جا رہا تھا۔ یہ علاقہ اسمگلنگ کے سلسلے میں میاں خان کی سانجھ میں اس کی آماجگاہ رہ چکا تھا اور وہ یہاں سے واقف تھا۔ روبی کے بارے میں وہ مطمئن تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مغویہ لڑکی کو لے کر لاہور پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ میاں خان کے فارم پر دارا اس لئے نہیں جانا چاہتا تھا کہ وہ علاقہ پولیس کی نگرانی میں آ چکا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ روبی کو بھی لاہور سے واپس میاں خان کے فارم میں نہیں آنا چاہئے۔ وہاں کسی بھی وقت وہ پکڑی جا سکتی تھی۔ دارا ایک بڑی نہر کے کنارے نکل آیا۔ یہ نہر آگے جا کر ساہیوال کی جانب نکل گئی تھی۔ دارا نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ نہروں نہر ساہیوال پہنچنے کی کوشش کرے اور پھر وہاں سے کوئی بھی ٹرین پکڑ کر سندھ کے علاقے میں داخل ہو جائے۔ چنانچہ اس نے نہر کنارے گھوڑے کو دلکی چال پر ڈال دیا۔ جب پو پھٹنے لگی تو دارا واردات والے علاقے سے بہت دور نکل آیا تھا مگر ساہیوال کا علاقہ ابھی کافی دور تھا۔ تھوڑی دیر میں دن نکلنے والا تھا اس علاقے میں دارا کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ پولیس نے بھی اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ پنجاب پولیس کے لئے وہ اجنبی تھا۔

جب دن کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تو دارا ریلوے لائن کا چھوٹا سا پل عبور کر کے ایک قصبے میں داخل ہو گیا۔ یہاں گاؤں کے باہر ایک تکیہ تھا جہاں اکھاڑے میں گاؤں

کے کچھ جوان کشتی لڑ رہے تھے۔ یہاں ایک کنواں بھی تھا۔ دارا نے گھوڑے کو ایک طرف باندھا۔ اسے دانہ پانی کھلایا۔ کنوئیں پر نہایا۔ تازہ دم ہوا اور قصبے کی ایک دوکان میں بیٹھ کر اس نے بند مکھن کھایا۔ چائے کا گلاس پیا۔ اسے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کسی جگہ تھوڑی دیر سو جانا چاہتا تھا مگر اس میں خطرہ بھی تھا۔ شیخوپورہ پولیس نے ٹیلی فون پر ساہیوال ضلع کی پولیس کو بھی قتل کی وارداتوں اور دارا کے فرار ہو جانے کی اطلاع کر دی ہو گی۔ وہاں اس کی شکل سے کوئی بھی واقف نہ تھا پھر بھی اسے اجنبی کی حیثیت سے پولیس پوچھ گچھ کے لئے کہیں بھی روک سکتی تھی۔ مگر اسے بڑی نیند آ رہی تھی۔ وہ گھوڑے کے پاس ہی درخت سے ٹیک لگا کر سو گیا۔ وہ دو گھنٹے تک سویا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو اکھاڑے میں کشتی لڑنے والے جوان جا چکے تھے اور کنوئیں کے پاس ایک فقیر بیٹھا چلم کے واسطے آگ جلا رہا تھا۔ دو گھنٹے کی نیند سے دارا کی تھکاوٹ کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ اس نے فقیر سے کوئی بات نہ کی اور گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

دوپہر کے وقت وہ ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچا پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ کراچی جانے والی گاڑی ایک گھنٹے بعد آئے گی اور یہاں یہ گاڑی تھوڑی دیر کے لئے رکتی ہے۔ دارا نے وہیں اسٹیشن سے باہر ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ گھوڑے کو اس نے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ یہاں اسے گھوڑے سے الگ ہو جانا تھا۔ اب اسے گھوڑے کی ضرورت نہیں تھی۔ کراچی کا ٹکٹ خرید کر وہ پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گیا اور گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ٹرین آ گئی جس میں بڑا رش تھا۔ دارا ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ یوں ٹرین میں سفر کرتا وہ اگلے روز منہ اندھیرے کراچی پہنچ گیا۔ یہ اس کا اپنا شہر تھا مگر یہاں کی پولیس بھی۔ اس کی کھوج میں تھی۔ ابھی پوری طرح سے دن کی روشنی نہیں ہوئی تھی۔ دارا نے موقع غنیمت جانا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے ڈیرے سے تھوڑی دور ٹیکسی سے اتر گیا۔ یہاں ایک گلی میں اس کے دوست کا گھر تھا۔ وہ وہاں آ گیا۔ دوست اسے دیکھ کر گھبرایا۔ دارا نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔ تم صرف اتنا کرو کہ میرے گھر جا کر بخشو سے کہو کہ مجھے تھوڑی دیر کے لئے آ کر مل جائے۔“

دوست اسی وقت دارا کے گیراج والے پرانے گھر کی طرف چل دیا۔ دس منٹ بعد بخشو چاچا دارا کے پاس بیٹھا اسے تمام احوال بتا رہا تھا۔ دارا نے بخشو سے روبی کے بارے میں پوچھا کہ وہ تو ادھر نہیں آئی اور شیر خان کا کیا حال ہے بخشو کہنے لگا۔

"روبی کو ادھر پھر نہیں دیکھا۔ شیر خان ابھی تک اسی مکان میں رہ رہا ہے مگر سنا ہے کہ سہراب کا بڑا بھائی ہاشم اس سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کی فکر میں ہے۔"

دارا کا چہرہ متفکر ہو گیا کیونکہ شیر خان اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ اس کی اور روبی کی معصوم بیٹی عائشہ بھی تھی۔ جو شیر خان کی زندگی خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ بخشو کہنے لگا۔

"مگر چونکہ ابھی پولیس روبی کی گرفتاری کے سلسلے میں اس کے خاوند شیر خان کے گھر کی نگرانی کر رہی ہے اس لئے ہاشم بدمعاش کے آدمی شیر خان پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کر رہے ہیں۔ جونہی پولیس والے وہاں سے ہٹے ہاشم شیر خان اور اس کی بچی دونوں کو قتل کر دے گا۔"

دارا چپ رہا۔ پھر اس نے اپنی ماں کے بارے میں پوچھا۔ بخشو نے کوئی جواب نہ دیا۔

دارا نے آنکھیں سکیڑ کر بخشو کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم خاموش کیوں ہو چاچا۔ کیا بات ہے؟"

تب بخشو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے بتایا کہ دارا کی والدہ کو فوت ہوئے کئی دن ہو گئے ہیں۔ دارا نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور بچوں کی طرح سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ بخشو کہہ رہا تھا۔

"اماں جیل میں ہی بیمار ہو گئی تھی۔ اسے اسپتال بھی لے جایا گیا مگر اللہ کو یہی منظور تھا۔" دارا نے پوچھا۔

"ماں کو کہاں دفن کیا ہے؟ بخشو نے کہا۔

"پرانے پل والے قبرستان میں چل کر فاتحہ پڑھ لو۔ وہ مرتے وقت تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔"

دارا کو اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے پورا دن کسی محفوظ جگہ پر گزارنا تھا۔ وہ اپنے جس شریف دوست کے گھر پر اس وقت موجود تھا وہ ڈر رہا تھا کہ کسی نے دارا کو وہاں

دیکھ لیا تو پولیس اسے بھی تھانے لے جائے گی۔ دارا کو اس حقیقت کا احساس تھا اور وہ کسی شریف آدمی کے لئے مصیبت نہیں بننا چاہتا تھا...... بخشو نے کہا۔

"بیٹا تم اکیلے کہاں جاؤ گے اب؟" دارا نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "کہیں دن گزار لوں گا۔ یہاں میرا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

بخشو چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد دارا نے بھی اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا۔ وہاں سے چادر کی بکل مار کر نکلا تو رکشے میں سوار ہو کر سیدھا کراچی سٹی ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ یہاں اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر ایک ہوٹل میں اس نے ناشتہ کیا۔ تھوڑا وقت وہاں گزارا اور اسی معمولی سے ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور سارا دن کمرے میں پڑا رہا۔ جب شام ہو گئی تو ہوٹل سے نکلا۔ رکشا لیا اور سیدھا پرانے قبرستان میں آ گیا۔ بخشو چاچا وہاں پہلے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دارا کو اس کی ماں کی قبر پر لے گیا۔ ماں کی قبر کو دیکھ کر دارا ہچکیاں لے لے کر رونے لگا اور ماں کی قبر سے لپٹ گیا۔ "جب ذرا طبیعت بحال ہوئی تو فاتحہ پڑھ کر ماں کی روح کو ثواب پہنچایا اور بخشو سے کہنے لگا۔

"چاچا! میں ایک مفرور قاتل ہوں۔ چاہے میں نے اپنے وطن کی بہنوں کی عزت بچاتے ہوئے بدمعاشوں کا خون کیا ہے مگر بہرحال میں قاتل ہوں اور قانون کو میری تلاش ہے۔ میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا" بخشو نے پوچھا۔

"پھر تم کہاں جاؤ گے بیٹا؟"

دارا کچھ سوچتا رہا۔ وہ قبرستان سے باہر آ گئے۔ شام کا اندھیرا رات کی تاریکی میں گھل مل گیا تھا۔ دور شہر کراچی کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہ دونوں قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی دیوار کے پاس ایک شکستہ چبوترے پر بیٹھ گئے۔ دارا کہنے لگا۔

"شاید مجھے میری ماں کی قبر کھینچ کر یہاں لے آئی تھی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ علاقہ غیر کی طرف نکل جاؤں لیکن جانے سے پہلے میں اپنی بہن روبی کی بیٹی عائشہ اور شیر خان کی خیریت ضرور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس جو رقم ہے میں یہ رقم شیر خان کو دے دینا چاہتا ہوں تاکہ وہ اپنی بچی کی اچھی طرح پرورش کر سکے۔" بخشو نے کہا۔

"مگر شیر خان کے گھر کے آس پاس بھی سی آئی ڈی والے موجود رہتے ہیں۔ روبی بھی

تو قتل کر کے بھاگی ہوئی ہے۔ اس نے تو جیل بھی توڑی تھی۔ پولیس نے تمہیں وہاں دیکھ لیا تو معاملہ الٹ جائے گا۔" دارا نے انگلی سے بھر بھری زمین پر رات کے اندھیرے میں لکیریں بناتے ہوئے کہا۔

"یہ خطرہ تو مجھے مول لینا ہی ہو گا۔ شیر خان سے ملنا اس کی بچی کی خیریت معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔"

بخشو آگے سے کچھ کہنے لگا تو دارا نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چاچا تم اس میں دخل نہ دو یہ میرا اور ایک ایسی لڑکی کی اولاد اور اس کے خاوند کا معاملہ ہے جس کو میں نے بہن کہا ہے اور جو مجھے اب اپنی سگی بہن ہی کی طرح عزیز ہے تم اب جاؤ۔ آگے میں جانوں اور میرا کام۔"

بخشو، دارا کو وہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر دارا نے اسے وہاں سے واپس بھیج دیا۔ بخشو کے جانے کے بعد دارا قبرستان سے نکلا۔ ویران اندھیری سڑک پر آیا اور شہر کی طرف چلنا شروع کر دیا وہ اپنے ہوٹل سے شیر خان کے مکان پر جانا چاہتا تھا۔ اسے ایک خالی رکشہ مل گیا جس میں بیٹھ کر وہ اپنے ہوٹل میں آگیا۔ وہ غافل نہیں تھا۔ اس کی تجربہ کار ہوشیار آنکھیں اپنے ارد گرد کا باقاعدہ جائزہ لے رہی تھیں کہ کہیں کوئی خفیہ پولیس کا آدمی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ ایسے آدمیوں کو پہچاننے میں دارا نے کبھی غلطی نہیں کی تھی۔ ابھی تک کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں ہی اس نے رات کا کھانا کھایا۔ پھر جب رات گہری ہو گئی تو کمرے کو تالا لگایا۔ چادر کی بکل ماری۔ خاموشی سے اجنبی مسافروں کی طرح ہوٹل کے سامنے سے ایک رکشہ پکڑا اور اسے ایک خاص علاقے کی طرف چلنے کو کہا۔ شیر خان کے محلے تک دارا نے تین سواریاں بدلیں۔ اب وہ پیدل تھا اور ایک جگہ پرانی بلڈنگ کی اوٹ میں ہو کر شیر خان کی گلی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

جب اس نے پوری تسلی کر لی کہ کم از کم اس وقت وہاں پولیس کا کوئی آدمی موجود نہیں ہے تو اللہ کا نام لے کر بلڈنگوں کے ساتھ ساتھ چلتا شیر خان کے مکان پر آگیا۔ دو تین بار دروازہ کھٹکھٹانے پر شیر خان نے دروازہ کھول دیا۔ دارا جلدی سے اندر گھس گیا۔ شیر خان نے بھی اسے پہچان لیا تھا دروازے کو کنڈی لگاتے ہوئے شیر خان نے پوچھا۔

"تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"کیا کہہ سکتا ہوں شیر خان۔" دارا نے کندھے سکیڑتے ہوئے کہا "میرا تو یہی خیال

ہے کہ کسی نے نہیں دیکھا ہو گا۔"

شیر خان نے دارا کو کرسی پیش کی اور کھانے کا پوچھا۔ دارا نے کہا۔

"میں کھا آیا ہوں۔"

شیر خان چارپائی پر بیٹھ گیا اور روبی کے بارے میں پوچھنے لگا کہ وہ کہاں ہے۔ کس حال میں ہے وہ کہاں ماری ماری پھر رہی ہے۔ مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں میں بھی اس کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں۔ شیر خان کو روبی کے عزائم اور دیگر سب حالات کا علم تھا۔ اس نے یہاں جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"شیر بھائی! میری بہن اس وقت میرے ایک جگری دوست کے مکان پر ہے۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔ اور تم سے ملنے کے بعد روبی کے پاس ہی جاؤں گا۔ بچی کہاں ہے۔"

شیر خان نے سانس بھر کر کہا۔

"ہماری ہمسائی مریم کے پاس ہے میں بچی کی کیسے دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ پولیس مسلسل میرے پیچھے لگی ہے۔ اس کا خیال ہے روبی مجھ سے ملنے اپنی بچی کو دیکھنے یہاں آتی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ روبی نے تو پھر خبر ہی نہیں لی۔" دارا نے فورا کہا: "شیر بھائی! ایسا نہ کہو۔ روبی تمہیں اور اپنی بچی کو ہر وقت یاد کرتی ہے۔" شیر خان نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

"تو پھر ہمیں یہاں اکیلا کیوں چھوڑ گئی ہے۔"

شیر خان دارا کا ہاتھ پکڑ کر بولا: "مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو میں ابھی بچی کو ساتھ والے مکان سے لے آتا ہوں۔ اب ہم اکٹھے رہیں گے۔ اکٹھے جیئیں گے۔ اکٹھے مریں گے۔ میں آخر مرد ہوں۔ کوئی بکری نہیں ہوں۔"

شیر خان سخت جذباتی ہو رہا تھا دارا نے اس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور کہا:

"شیر خان! یہ جذبات کا معاملہ نہیں ہے۔ تمہارے بہادر مرد ہونے میں کسی کو شک نہیں لیکن حالات وہ نہیں ہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ اگر بچی نہ ہوتی تو پھر تمہارے یہاں پڑے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تم بچی کو ساتھ لے کر بھی روبی کے پاس جا سکتے

ہو۔ لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ روبی اپنی بیٹی کو جرائم کی دنیا سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کی پرورش قتل و غارت گری کے ماحول سے دور رہ کر کی جائے۔ اور تم ایک باپ کی حیثیت سے روبی کی یہ خواہش بڑی خوش اسلوبی سے پوری کر سکتے ہو۔ باقی جہاں تک روبی کا تعلق ہے وہ میرے پاس ہے میری حفاظت میں ہے۔ اپنے بھائی کی حفاظت میں ہے۔ ذرا سوچو اگر وہ یہاں آگئی یا تم اس کے پاس چلے آئے اور پولیس نے اسے پکڑ لیا تو پولیس تمہیں بھی نہیں چھوڑے گی۔ تم بھی گرفتار کر لئے جاؤ گے۔ تو پھر تمہاری بچی کا کیا بنے گا؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری اور روبی کی بیٹی جیل کی چار دیواری میں اپنی زندگی کا آغاز کرے؟ نہیں۔ یقیناً تم ایسا نہیں چاہو گے۔ تو بس اس کے لئے تمہیں سینے پر پتھر رکھنا ہو گا اور شریفانہ ماحول میں رہ کر اپنی بیٹی عائشہ کی پرورش کرنی ہو گی۔ یہی روبی کی بھی خواہش ہے۔" شیر خان نے تلخ لہجے میں کہا۔

"لیکن یہ ڈراما کب تک چل سکے گا؟ مجھے کب تک روبی سے جدا رہنا ہو گا۔ کیا میری بچی اپنی ماں کی شفقت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے گی جب کہ اس کی ماں مری نہیں ہے زندہ ہے۔"

شیر خان سچا تھا۔ دارا کو اس کے جذبات کی قدر تھی مگر صورتحال کچھ ایسی پیچیدہ ہو گئی تھی کہ وہ بچی کو ساتھ لے کر یا اسے کسی ہمسائی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود اپنی بیوی کے پاس نہیں رہ سکتا تھا جب کہ روبی اپنی بیٹی کی پرورش کے بارے میں بے حد سنجیدہ اور محتاط تھی۔ اس کا احساس دارا کو بھی اس دوران ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی مشکل سے شیر خان کو سمجھایا اسے صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کیا اور یہ جھوٹ بھی بول دیا کہ روبی کا ارادہ ہے کہ ہم کسی مناسب موقع پر بچی کو ساتھ لے کر ملک سے باہر نکل جائیں۔ شیر خان نے مایوسی سے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"وہ سب کچھ کرے گی مگر پاکستان نہیں چھوڑے گی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اور دارا بھائی! پاکستان میں بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ یہی ہمارا سب کچھ ہے۔ اب ہمیں یہیں جینا مرنا ہے۔"

اچانک باہر کچھ کھٹکا ہوا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ دارا نے جلدی سے صدری کی جیب میں سے پستول نکال لیا اور نیچی آواز میں شیر خان سے کہا۔

"کوئی باہر کھڑا ہے۔" یہ کہہ کر دروازے کی جانب دیوار سے لگ گیا۔ شیر خان نے آہستہ سے دروازے کا پٹ کھول کر گلی میں جھانک کر دیکھا۔ ایک بلی اس کے دروازے کے آگے سے دوسری طرف بھاگ گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور دارا کو آہستہ آواز میں بتایا۔

"بلی تھی۔ آجاؤ۔" دارا نے پستول جیب میں رکھ لیا اور واپس آکر چارپائی پر بیٹھ گیا پھر اس نے صدری کی دوسری بڑی جیب میں سے سو سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور اسے شیر خان کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "شیر بھائی! اسے اپنے پاس رکھ لو۔ تمہیں ان روپوں کی ضرورت ہو گی۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ جب کبھی تمہارے پاس ہوں تو واپس کر دینا۔" شیر خان نے کمرے کے کمزور بلب کی روشنی میں نوٹوں کی گڈی پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر دارا کے ہاتھ کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا شکریہ۔ مگر مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

دارا شیر خان کے مزاج کو جانتا تھا اس نے واجبی سا اصرار کیا مگر شیر خان نے روپے لینے سے صاف انکار کر دیا اور طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔

"شاید تم نہیں جانتے کہ اتنے پیسے کبھی میرے نوکر اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ مگر مجھے جب بھی دولت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ تمہاری ہمدردی کا شکریہ لیکن آئندہ مجھ سے اس قسم کی ہمدردی کا اظہار مت کرنا۔"

شیر خان بے زار سا ہو کر چارپائی سے اٹھا اور اس نے سگریٹ سلگا لیا اور چارپائی پر سر نیچا کر کے سگریٹ پینے لگا پھر خود بخود ہی بولا۔

"جیسے بھی حالات ہیں یہ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ میری طرف سے روبی کو کہہ دینا کہ مجھے یہ گوارا نہیں ہے میں عائشہ کو لے کر اس کے پاس پہنچنے والا ہوں۔" یہ سوچ کر کہ روبی کا تو کوئی مستقل ٹھکانہ ہی نہیں دارا نے کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے شیر بھائی۔ میں تمہارا پیغام روبی بہن کو پہنچا دوں گا۔" پھر اس نے موضوع کو بدلتے ہوئے شیر خان سے سہراب کے بھائی اور شہر کے مشہور غنڈے ہاشم کے بارے میں پوچھا کہ وہ اسے پریشان تو نہیں کر رہا؟ شیر خان کا حلق جیسے کڑوا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے جیسے اسے کسی پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ کہنے لگا۔

"وہ گیدڑ مجھے کیا پریشان کرے گا۔ بس اس بے زبان عائشہ نے شیر خان کے ہاتھ باندھ دیئے ہیں۔"

باہر گلی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ جیسے کوئی تیزی سے گزر گیا ہو۔ دارا جلدی سے اٹھا۔ پستول اس نے ایک بار پھر نکال لیا اور بولا۔

"بتی بجھا دو۔ کیا پیچھے سے کوئی راستہ باہر جاتا ہے؟" شیر خان نے بتی گل کر دی اور کہا۔

"پیچھے کوئی راستہ نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں۔ یہ کہہ کر دارا نے دروازے کا پٹ کھول کر گلی میں دیکھا۔ گلی رات کے سناٹے میں دور تک خالی تھی۔ وہ تیزی سے نکل گیا۔ شیر خان نے دروازہ بند کر لیا۔ دارا گلی میں سے نکل کر اس جگہ آ گیا جہاں سے بڑی سڑک گزرتی تھی اور کچھ فاصلے پر سینما کی بلڈنگ تھی۔ اس کو شبہ تھا کہ پولیس کے آدمی نے اسے دیکھ لیا ہے اور ہو سکتا ہے کسی طرف سے اچانک پولیس پارٹی نکل کر اس پر ہلہ بول دے۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ بڑی سڑک پر آیا تو دیکھا کہ ایک طرف بند جیپ کھڑی ہے۔

دارا وہیں ٹھٹک گیا ضرور یہ پولیس کی جیپ ہے وہ پیچھے مڑنے ہی لگا تھا کہ اسے کسی عورت کی چیخ نما دہائی سنائی دی۔ وہ مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ دارا کے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا یہاں اسٹریٹ لائٹ نہیں تھی۔ کچھ فاصلے پر کسی بلڈنگ کے کونے پر ایک بلب جل رہا تھا۔ جس کی بہت کم روشنی جیپ تک پہنچ رہی تھی۔ دارا نے دیکھا کہ جیپ میں سے ایک آدمی نکلا اور سامنے والی گلی کی طرف دوڑا گلی میں اسی عورت کی آواز پھر سنائی دی وہ روتے ہوئے بچاؤ بچاؤ پکار رہی تھی۔ بلڈنگ کی دوسری منزل پر دو

تین کھڑکیاں کھلیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے جھانک کر گلی میں دیکھا گلی میں فائر کی آواز گونجی اور ساری کھڑکیاں یکے بعد دیگرے بند ہو گئیں۔ اتنے میں دارا کیا دیکھتا ہے کہ تین غنڈہ نما آدمی ایک شلوار قمیص والی عورت کو گلی میں سے گھسیٹتے ہوئے باہر جیپ کی طرف لا رہے ہیں۔ جو آدمی جیپ میں سے نکل کر گیا تھا پستول کا ہوائی فائر اس نے کیا تھا تاکہ محلے کے کسی شریف آدمی کو مداخلت کرنے کی جرات نہ پڑے۔ پستول تو دارا کے ہاتھ میں بھی تھا۔

عورت تڑپ رہی تھی۔ اور غنڈوں کے ہاتھوں سے نکل جانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ رو رو کر دہائی دے رہی تھی۔ ان سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اپنی عزت کا واسطہ دے رہی تھی۔ مگر چاروں بدمعاشوں میں سے کسی ایک پر بھی اس کی گریہ زاری کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اسے کھینچتے ہوئے جیپ کے پاس لے آئے۔ عورت کا دوپٹہ سڑک پر گر گیا تھا ایک غنڈے نے عورت کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا۔ اسے گالی دی۔ عورت سسکیاں لینے لگی۔ دوسرے غنڈے نے عورت کو کاندھے پر ڈال لیا۔ جیپ کا دروازہ کھلا تھا وہ جیپ کی طرف آ رہے تھے دارا جیپ کی آڑ میں بالکل تیار کھڑا تھا جب چاروں کے چاروں غنڈے بے بس عورت کو اٹھائے جیپ کے پاس آئے تو دارا اوٹ میں سے نکل کر ان کے سامنے آگیا پستول والا ہاتھ اس نے اپنی چادر کے اندر چھپا رکھا تھا۔ ایک اجنبی شخص کو اچانک سامنے دیکھ کر غنڈوں پر کوئی زیادہ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے عورت کو جیپ میں ڈالا۔ جس کے پاس پستول تھا اور جس نے گلی میں فائر کیا تھا وہ دارا کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"کون ہو تم؟ بھاگو یہاں سے ....؟" دارا نے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔

"اس عورت کو چھوڑ دو۔" ایک بدمعاش چاقو نکال کر دارا کی طرف بڑھا۔

"تم باپ لگتے ہو اس کے ....؟"

جونہی اس نے دارا پر چاقو کا وار کیا دارا نے پستول والا ہاتھ چادر سے باہر نکالا اور بڑے اطمینان سے اس بدمعاش کے سینے میں اوپر تلے دو گولیاں اتار دیں۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔

دوسرے بدمعاش دارا پر جھپٹے دارا کے پستول سے نکلی ہوئی دو گولیوں نے ان دونوں کو بھی وہیں ڈھیر کر دیا۔ جس بدمعاش کے پاس پستول تھا اس نے دارا پر فائر کیا دارا اس سے پہلے ہی باخبر تھا وہ بھاگ کر جیپ کے سامنے کی طرف آگیا۔ جونہی آخری غنڈے نے پستول والا ہاتھ دارا کی طرف اٹھایا دارا کے قیمتی پستول میں سے آخری گولی دھماکے سے نکلی اور آخری بدمعاش کی کھوپڑی کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔

عورت جیپ کے اندر سہمی بیٹھی یہ سارا خونیں ڈراما دیکھ رہی تھی۔ دارا نے سڑک پر پڑا پستول اٹھا لیا یہ غنڈے کی لاش کے پاس پڑا ہوا تھا اس پستول میں ابھی کچھ گولیاں باقی تھیں۔ دارا کے پستول کا میگزین ختم ہو چکا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنا پستول جیب میں رکھ لیا بھرا ہوا پستول اپنے ہاتھ میں ہی رکھا اور جیپ کے کھلے دروازے میں آکر عورت سے کہا

"بی بی! آپ اپنے گھر چلی جائیں۔ اب کوئی آپ کی عزت پر حملہ نہیں کرے گا۔"

جیپ میں جو عورت بیٹھی تھی اب وہ اپنے حواس میں تھی۔ اس نے احسان مند نظروں سے دارا کو دیکھا اور ہاتھ باندھ کر کہا۔

"خدا کے لئے مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ یہاں میرا گھر نہیں ہے۔ یہ لوگ مجھے اغوا کر کے یہاں لائے تھے۔"

دارا نے چوک میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ چاروں لاشیں سڑک پر خون میں لت پت پڑی تھیں۔ شریف لوگوں نے ڈر کے مارے مکانوں کی کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں مگر درزوں میں سے رات کے نیم اندھیرے میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

"تمہارا گھر کہاں ہے بی بی؟ مجھے بتاؤ۔ میں تمہیں وہیں لیے چلتا ہوں" عورت نے کہا۔

"مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں تمہیں بتا دوں گی۔" دارا جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ جیپ اسٹارٹ کی اور اسے سڑک پر ڈال دیا۔ آگے دوسرا چوک آیا تو اس نے عورت سے پوچھا اب کس طرف چلنا ہے۔ عورت نے ہاتھ سے ایک طرف مڑنے کا اشارہ

کیا۔ جیپ پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ جب کراچی شہر کی روشنیاں کافی پیچھے رہ گئیں تو دارا نے سڑک کی ایک طرف گاڑی کھڑی کر دی اور عورت سے پوچھا۔

"تم کہاں جانا چاہتی ہو۔" عورت نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ عاجزانہ لہجے میں بولی۔

"خدا کے لئے مجھے یہاں راستے میں مت چھوڑنا۔ ان لوگوں کے آدمی مجھے یہاں سے بھی اٹھا کر لے جائیں گے۔" دارا نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"مگر بی بی تمہیں جانا کہاں ہے۔ ہم تو شہر سے کافی باہر نکل آئے ہیں۔ یہاں تو آگے کوئی آبادی نہیں ہے۔"

تب اس عورت نے ایک شہر کا نام لے کر دارا کو بتایا کہ وہ وہاں کی رہنے والی ہے اور یہ بدمعاش اسے وہیں سے اغوا کر کے کراچی لائے تھے اور اب اسے لانچ میں ڈال کر کویت لے جانے والے تھے شہر کا نام سن کر دارا سوچ میں پڑ گیا۔ (چونکہ ان واقعات کا تعلق حقیقت سے ہے اس لئے ہم اس شہر کا یہاں نام نہیں لکھیں گے) یہ شہر کراچی اور بہاولپور کے درمیان واقع ہے۔ دارا شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ اس مظلوم خاتون کو ویران علاقے میں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اب ہر حالت میں اسے اس مظلوم عورت کو اس کے گھر پہنچانا تھا۔ عورت نے آنسو بہاتے ہوئے ایک بار پھر دارا کی منت کی اگر اس نے اس کو بدمعاشوں سے نجات دلائی ہے تو اسے اس کی ماں کے پاس بھی پہنچا دے۔ اس کا بھی رو رو کر برا حال ہو رہا ہو گا۔ دارا نے کوئی جواب نہ دیا۔ سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں تھی۔ یہ مقتول غنڈوں کی جیپ تھی۔ دارا نے اتر کر پٹرول چیک کیا۔ ٹینکی قریباً بھری ہوئی تھی۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے اپنے اندازے سے ایک علاقے سے گزر کر ہائی وے پر لے آیا۔ ہائی وے پر رات کے وقت ٹرکوں اور ٹریلروں کی ٹریفک جاری تھی۔ دارا بھی جیپ کو خاصی رفتار سے لئے جا رہا تھا۔ جس شہر کا مظلوم عورت نے نام لیا تھا وہاں جیپ کو دن نکلنے سے پہلے پہنچنا تھا۔ دارا کو ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں راستے میں وہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ کیونکہ پیچھے وہ مزید چار غنڈوں کو قتل کر آیا تھا جس کی خبر پولیس کو ہو چکی ہو گی اور پولیس نے ہائی وے اسکواڈ کو وائرلیس کے ذریعے خبردار کر دیا ہو گا۔ مگر دارا کا یہ

خدشہ درست نہیں تھا کیونکہ پولیس ابھی جائے واردات پر بھی نہیں پہنچی تھی۔ وہ جیپ کو اڑائے لئے جا رہا تھا۔ وہ مظلوم عورت کو اس کے گھر پہنچانا اپنا انسانی فرض سمجھتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ مظلوم عورت جیپ کی سیٹ پر سمٹی شاید سو رہی تھی دارا نے خدا کا شکر ادا کیا کہ خدا نے اسے اتنی توفیق دی کہ وہ ایک مظلوم عورت کی عزت بے رحم درندہ صفت غنڈوں سے بچانے میں کامیاب ہوا۔

دارا کو نیند آنے لگی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ایک دو بار وہ اونگھ گیا تھا اور اسٹیرنگ اس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ اس نے ایک جگہ اندھیرے میں درختوں کو دیکھ کر جیپ سڑک سے اتاری اور درختوں کے نیچے کھڑی کر دی۔ عورت کی آنکھ کھل گئی اس نے اپنے شہر کا نام لے کر پوچھا کیا اس کا شہر آگیا؟ دارا نے کہا۔

"نہیں بی بی! یہاں میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تم سو جاؤ۔"

دارا جیپ سے اتر کر ایک جگہ زمین پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک پہلو بدلتا رہا۔ نیند بالکل غائب ہو گئی تھی۔ آخر وہ اٹھا اور جیپ میں آ کر بیٹھ گیا۔ عورت جاگ رہی تھی۔ دارا نے کہا۔

"تمہارا شہر یہاں سے ابھی کافی دور ہے۔ فکر نہ کرو۔ تمہیں تمہارے گھر پہنچا کر ہی آؤں گا۔"

عورت نے دارا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی بہادری کی تعریف کی۔ جیپ ایک بار پھر کراچی سے لاہور جاتی سڑک پر بھاگنے لگی۔ انہیں راستے میں ہی صبح ہو گئی۔ جب دن کی روشنی پھیلنے لگی تو دارا نے سوچا کہ کسی طرح سے اب اس جیپ سے نجات حاصل کرنی ہو گی۔ کیونکہ یہ ان غنڈوں کی جیپ تھی جن کو وہ قتل کر کے آ رہا تھا اگر موقع واردات پر کسی نے جیپ کا نمبر دیکھ لیا ہو گا تو پولیس ہائی وے پر اسے پکڑ لے گی کیونکہ اب تک پولیس نے ہائی وے پر گشت کرنے والی پولیس پارٹی کو خبر کر دی ہو گی۔ یہ جیپ گویا قاتل کا سراغ تھا جو دارا کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ جیپ کو ہائی وے سے اتار کر ایک طرف لے آیا۔ یہاں سنگلاخ ریتلے اونچے نیچے بے شمار ٹیلے تھے۔ اس نے جیپ ایک ٹیلے کی

اوٹ میں کھڑی کر دی۔ عورت سیٹ پر سو رہی تھی۔ دارا کچھ حیران ضرور ہوا کہ یہ عورت اتنے اطمینان سے کیسے سو رہی ہے۔ اس نے عورت کو جگا کر ساری بات سمجھائی۔ وہ جیپ سے اتر پڑی۔ دارا نے جیپ کی تلاشی لی اسے ڈیش بورڈ میں سوائے سگریٹ کے ایک بند پیکٹ کے اور کوئی چیز نہ ملی۔ اب سورج طلوع ہونے والا تھا اور آسمان گلابی روشنی میں منور ہو گیا تھا۔ دارا نے جیپ کی ٹینکی کا ڈھکن اتارا اور اس کے اندر چیتھڑا اس طرح ڈال دیا کہ اس کا آدھا حصہ پٹرول کی ٹینکی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ کچھ پٹرول اس نے اسی چیتھڑے کی مدد سے جیپ کے انجن اور سیٹوں پر بھی نچوڑ دیا۔ پھر جیپ کو آگ لگائی اور عورت کو ساتھ لے کر وہاں سے دوڑ کر ٹیلے کی دوسری طرف آگیا۔ جیپ نے آگ پکڑ لی تھی۔ مگر ابھی تک دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہائی وے پر آگئے جہاں اب تھوڑی تھوڑی دیر بعد دونوں جانب سے سامان کے لدے ہوئے ٹرک آتے جاتے نظر آنے لگے تھے۔

دارا کی نگاہیں ٹیلے کی طرف لگی تھیں جہاں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ پھر ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا۔ اور جیپ کی ٹینکی پھٹ گئی تھی اور جیپ دھڑا دھڑ جلنے لگی تھی۔ یہاں سے انہوں نے ایک بس کے ذریعے اپنی منزل تک سفر کیا۔ وہ عورت جس نے دارا کو اپنا نام دلشاد بتایا تھا شہر آنے سے پہلے تھوڑا پیچھے بس سے اتر گئی۔ دارا یہی سمجھا کہ اس کا گھر شہر کی کسی مضافاتی بستی میں ہو گا۔ وہ دارا کو ساتھ لئے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔ یہ چھوٹا شہر تھا۔ زمین زیادہ تر ریتلی تھی۔ کھیتوں میں فصل اگی ہوئی تھی۔ اور ریلوے اسٹیشن پر کھڑی گاڑی کے انجن میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ابھی کوئلے کے انجن والی گاڑیاں چلا کرتی تھیں۔ سامنے شہر کی ٹوٹی ہوئی دیوار آگئی جہاں سے ایک چڑھائی چڑھ کر وہ شہر کی ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ دارا اس شہر میں کئی بار آچکا تھا۔ جب گلی گھوم کر ایک ذرا کشادہ بازار آیا تو دارا کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ اس شہر کا بدنام علاقہ تھا۔ یعنی جہاں راتیں جاگتی تھیں اور دن سوتے تھے۔ جہاں رات گئے تک مجرا ہوتا تھا۔ یہ طوائفوں کا بازار تھا۔ دلشاد ایک گلی میں مڑ گئی۔ سامنے ایک دو منزلہ مکان تھا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہونے کے

بعد دلشاد نے دارا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کون ہوں۔ مگر میں تمہیں اپنی ماں سے ملائے بغیر یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔"

دارا اب اچھی طرح سے سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت دلشاد ایک طوائف ہے جسے بدمعاش اغوا کر کے لے گئے تھے۔ اتنے میں وہاں شور مچ گیا کہ شاداں آگئی شاداں آگئی۔ دارا کے لئے بیٹھک کھول دی گئی جہاں ایک پلنگ اور ایک میلا سا صوفہ پڑا تھا۔ شاداں کی ماں بھی آگئی۔ اس نے دارا کی بلائیں لے کر اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"بیٹا تم نے میری بیٹی کو غنڈوں سے بچا کر مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ جسے میں ساری عمر نہیں بھلا سکوں گی۔" دارا نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے واپس بھی جانا ہے دلشاد کی ماں نے دارا کو بازو سے پکڑ کر صوفے پر زبردستی بٹھا دیا اور کہنے لگی۔ "مجھے اپنے پیر مرشد کی قسم ہے میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گی۔ تم آج رات ہمارے پاس ہی رہو گے۔ کل بے شک چلے جانا۔ میں تمہارے لئے ناشتا بھجواتی ہوں تم منہ ہاتھ دھو لو۔ یہ ساتھ ہی غسل خانہ ہے۔" یہ کہہ کر دلشاد کی ماں چلی گئی۔

دارا سوچنے لگا کہ دن کی روشنی میں اس کا وہاں سے نکلنا ویسے بھی مناسب نہیں رہے گا۔ بہتر ہے کہ وہ دن اسی مکان میں گزار دے اور جب رات گہری ہو جائے تو وہاں سے کسی طرف کو نکل جائے۔ کراچی جانے میں خطرہ تھا وہ پہلے ہی وہاں تین خون کر چکا تھا۔ اب مزید چار خون ہو گئے تھے۔ اس نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ وہ واپس پنجاب میاں خان کے پاس ہی جا کر کچھ وقت گزارے۔ ممکن ہے وہاں بہن روپی بھی آجائے۔ اس کے بعد اور کوئی پروگرام بنائیں گے۔

دارا نے منہ ہاتھ دھویا۔ اس کی جیب میں دو پستول تھے۔ ایک پستول میں صرف چار گولیاں باقی تھیں۔ دارا نے دونوں پستول اپنی صدری کی جیبوں میں ہی رہنے دیے۔ وہ صوفے پر سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ قدرت نے اس کے ساتھ کیسا دلچسپ

مذاق کیا ہے۔ جس عورت کو وہ ایک گھریلو عزت دار عورت سمجھ رہا تھا اور اس کی عزت بچانے کی خاطر اس نے چار آدمیوں کو قتل کر دیا وہ ایک طوائف نکلی۔ یعنی اس کی کوئی عزت ہی نہیں تھی۔ پھر دارا نے سوچا کہ چلو وہ ایک مظلوم عورت تو تھی۔ خدا جانے بدمعاش اسے کس ملک میں لے جا کر بیچ دیتے اور آگے اس کے ساتھ کیسا کیسا ظلم ہوتا۔ کم از کم اس نے ایک عورت کی زندگی برباد ہونے سے تو بچالی۔

اتنے میں دلشاد ناشتہ ٹرے میں لے کر آ گئی۔ دلشاد نے بھی منہ ہاتھ دھو کر نئے ریشمی کپڑے پہن لئے تھے اور وہ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ جب وہ ناشتہ رکھنے کے لئے میز پر جھکی تو دارا کو اس کے کپڑوں سے بڑی اعلیٰ قسم کے عطر کی خوشبو آئی۔ اس نے دلشاد سے پوچھا۔ "تم کون سا عطر لگاتی ہو؟" دلشاد نے ایک خاص ادا سے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں پسند ہے؟ تم لے لو۔ ابھی لاتی ہوں" دارا نے اسے وہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"نہیں نہیں! میں نے تو یونہی خوشبو کی تعریف کی تھی۔ میں عطر نہیں لگایا کرتا۔"

دلشاد اس کے لئے چائے بنانے لگی۔ "ناشتہ کر کے تم ساتھ والے کمرے میں جا کر سو جانا۔ تم ساری رات نہیں سوئے۔"

دارا نے کوئی جواب نہ دیا۔ دلشاد نے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔

"تمہیں یہاں آ کر حیرانی تو بہت ہوئی ہو گی۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے تھے۔ میں ایک طوائف کی بیٹی ہوں۔ میری ماں اور اس کی ماں بھی اسی شہر کی طوائف تھی۔ ہم مجرا کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔ یہ ایک برا پیشہ ہے۔ مگر میں نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ بچپن میں ہی میرے کان میں طبلے سارنگی کی آواز پڑی اور میں نے اپنی ماں کو مجرا کرتے دیکھا۔ پھر میں بھی بڑی ہو کر مجرا کرنے لگی۔"

دارا خاموشی سے چائے پیتے ہوئے دلشاد کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اس ماحول کے تمام نشیب و فراز کو جانتا تھا۔ دلشاد کہہ رہی تھی۔

"تم مجھے بری عورت مت سمجھنا۔ ہم اپنی مرضی سے چاہے جو کچھ کریں۔ مگر کوئی ہمارے ساتھ زبردستی کرے تو یہ ہمیں بھی گوارا نہیں۔ آخر ہماری بھی ایک اپنی عزت ہوتی ہے۔" دارا نے دلشاد کی بات کو کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں سے پولیس تھانہ کتنی دور ہے؟" دلشاد نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور اپنے ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ کو جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

"میں جانتی ہوں تم نے چار خون کیے ہیں۔ مگر یہ خون تم نے میرے واسطے کیے ہیں میں نے ماں کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بات آگے نہیں جائے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ ہمارے ہاں بڑی رازداریوں سے کام لیا جاتا ہے اور تم تو ہمارے محسن ہو ۔ جب تک تمہارا جی چاہے یہاں رہو۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ بھی اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گا۔ یہاں پولیس کبھی نہیں آتی۔ ہم ان کا ٹیکس ان کے پاس باقاعدگی سے پہنچا دیتے ہیں۔" اور پھر چوک میں ہمیں کسی نے دیکھا بھی تو نہیں تھا۔ رات کا وقت تھا۔"

دارا نے سگریٹ بجھا کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ دلشاد اٹھتے ہوئے بولی۔ "ساتھ والے کمرے میں تمہارے لئے کرتا تہمد میں نے رکھ دیا ہے۔ تم یہ کپڑے اتار کر دے دو۔ اور آرام کرو۔"

دارا اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گیا جہاں مسہری لگی تھی۔ بڑا آرام دہ بستر بچھا تھا۔ دیواروں پر فلم ایکٹریسوں کی بڑی تصویریں لگی تھیں۔ دارا نے تہمد باندھ کر اپنے کپڑے دروازے کے باہر پھینک دیئے۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ ساری رات نہیں سویا تھا۔ آرام دہ ریشمی بستر پر گرتے ہی سو گیا۔ جب وہ سو کر اٹھا تو خود کو بے حد تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے سرہانے کے نیچے ہاتھ لے جا کر ٹٹولا۔ اس کے دونوں پستول سرہانے کے نیچے موجود تھے اور وہ رومال بھی وہیں تھا جس میں .... ہزاروں روپے کے نوٹ بند تھے۔ کمرے کے چھوٹے سے روشندان میں سے دن کی پھیکی پھیکی روشنی آ رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ دارا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"آ جاؤ بھئی"۔ کمرے میں دلشاد داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دارا کے استری کیے ہوئے کپڑے تھے۔ کہنے لگی ۔

"میں نے اپنے ہاتھ سے استری کیے ہیں۔ تم انہیں پہن لو۔ میں تمہارے لئے کھانا لاتی ہوں۔ میں نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔"

"وہ کیوں؟" دارا نے تعجب سے کہا۔ دلشاد مسکرائی۔ دارا کو پہلی بار اس کی مسکراہٹ بڑی اچھی لگی۔

"تم نے جو نہیں کھایا تھا۔"

دارا ہنسنے لگا۔ وہ ان طوائفوں کی اس قسم کی ناز برداریوں کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ دلشاد چلی گئی۔ دارا نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے۔ قمیص کے اندر صدری کی جیبوں میں نوٹوں والا رومال اور دونوں پستول سنبھال کر رکھ لئے اور پلنگ کے سامنے جو صوفہ پڑا تھا وہاں بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اس کمرے میں کوئی گھڑی نہیں تھی۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ دن کے تین بج رہے تھے۔ اب دلشاد کی ماں بھی دلشاد کے ساتھ ہی آئی۔ ایک بار پھر وہ دارا کی بلائیں لینے لگی۔ ایک ناٹے قد کا پہلوان ٹائپ آدمی کھانے کا طشت لے کر آگیا۔ دارا نے اسے غور سے دیکھا۔ جب وہ کھانا لگا کر چلا گیا تو دارا نے اس کے بارے میں دلشاد کی ماں سے پوچھا۔

"اسے میرے بارے میں کچھ پتا تو نہیں؟" دلشاد کی ماں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"پترا تم فکر کیوں کرتے ہو۔ یہاں سوائے میرے اور دلشاد کے اصل معاملے کی کسی کو کوئی خبر نہیں ہے۔ ہم نے تو دلشاد کے اغوا کی رپٹ بھی نہیں درج کروائی تھی۔ میں نے تو سب کو یہ بتایا تھا کہ دلشاد اپنی خالہ کے پاس سرگودھا گئی ہوئی ہے۔"

دلشاد کی ماں نے اس طبقے کی روایتی تجربہ کار عورتوں کی طرح کہا تھا۔ اس نے ابھی تک کسی کو خبر نہیں ہونے دی تھی کہ اس کی بیٹی کو کچھ لوگ اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ اس گھر کے سوائے اس ناٹے قد کے نوکر اور دلشاد کی ماں کے اس اغوا کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ مگر پولیس کو سراغ مل چکا تھا۔

یوں ہوا کہ جن چار بدمعاشوں کو دارا اپنی طرف سے ہلاک کر کے وہاں سے دلشاد کو

لے کر نکل گیا تھا۔ ان میں سے ایک بدمعاش کا سانس ابھی چل رہا تھا۔ پولیس اسے اٹھا کر اسپتال لے گئی۔ اسپتال میں وہ ساری رات اور اس کے اگلے روز دوپہر تک بے ہوش رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو کراچی کے وقوعہ والے علاقے کے سب انسپکٹر مراد نے اس سے پوچھا کہ قاتل کون تھا اور وہ لوگ کہاں سے آئے تھے۔ اور علاقے میں کیا واردات کرنے والے تھے؟ بدمعاش پر نزع کا عالم طاری تھا۔ اکھڑے اکھڑے سانسوں میں پولیس کو صرف اتنا ہی بتا سکا کہ وہ لوگ فلاں شہر سے ایک طوائف شادو کو اٹھا کر لائے تھے۔ اب اسے وہاں سے لے جا رہے تھے کہ شادو کا حمایتی کہیں سے نکل آیا اور پھر اس نے ہمیں بھون ڈالا۔ یہ بات بھی قریب المرگ بدمعاش نے رک رک کر کوئی دس بارہ منٹ لگا کر بتائی۔ سب انسپکٹر نے اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر پوچھا۔

"وہ آدمی کون تھا؟ کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟" اس کے جواب میں بدمعاش نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ اس کی روح اس کے جسم سے پرواز کر گئی۔ لیکن پولیس کو طوائف کا نام اور اس کے شہر کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ اسی وقت سب انسپکٹر مراد نے ایک پولیس پارٹی ترتیب دی اور ٹرین میں بیٹھ کر دلشاد کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

چونکہ یہ کہانی جو میں آپ کو سنا رہا ہوں ایک سچی داستان ہے اور اس کے بعض کردار زندہ ہیں اور پاکستان میں ایک ذمے دار شریف شہری کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے میں ان سب کے فرضی نام لکھ رہا ہوں اور جہاں کہانی کے واقعات کسی قصبے یا چھوٹے شہر میں داخل ہوتے ہیں تو میں ان چھوٹے شہروں کا نام بھی نہیں لکھتا۔ آپ ضرور دل میں سوچیں گے کہ میں نے پہلے بھی "جبرو" کے نام سے ایک سچی کہانی بیان کی تھی اور اب "شیرنی" کے عنوان سے بھی ایک سچی داستان آپ کو سنا رہا ہوں تو میں یہ سچی کہانیاں کہاں سے نکال لاتا ہوں۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ میرے پڑھنے والوں میں سے بہت ہی کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہے کہ میں خود اس ماحول میں زندگی کا بیشتر حصہ گزار چکا ہوں جس ماحول کے بارے میں یہ کہانیاں میں لکھ رہا ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص کرم تھا کہ

میں سیرو سیاحت کے لئے نکل کھڑا ہوا اور میں نے بعد میں افسانے ناول اور سفرنامے لکھنے شروع کر دیئے۔ اگر مالک ارض و سما کی نگاہ کرم مجھ پر نہ ہوتی تو یقین کریں آج میں بھی کوئی جرو یا دارا ہوتا اور کسی جیل میں عمر قید کاٹ رہا ہوتا اور یا کسی دشمن غنڈے کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہوتا۔ یہ قیام پاکستان سے پہلے کی باتیں ہیں۔ پاکستان میں آتے ہی میں نے پہلا افسانہ منزل منزل لکھا اور اسی افسانے سے اپنا ایک الگ مقام بنا لیا اور برے ماحول کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ مگر اس وقت تک میں بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ میں نے نام نہاد شریف لوگوں کو عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دیتے بھی دیکھا تھا اور جن کو معاشرہ بدمعاش کہتا ہے انہیں دوسروں کی جان بچاتے ہوئے اپنی جان دیتے بھی دیکھا تھا۔ مجھے امرتسر میں اپنے محلے کے چوئی بدمعاش کی بات آج بھی یاد ہے۔ وہ ان پڑھ تھا' جواری تھا' شرابی تھا مگر محلے میں سے کوئی عورت گزرتی تو وہ اپنا منہ دوسری طرف کر لیتا تھا۔ اس نے ایک بار مجھے کہا تھا۔

"لوگ کہتے ہیں گام بڑا شریف بدمعاش ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ شریف' شریف ہی ہوتا ہے بدمعاش' بدمعاش ہی ہوتا ہے۔ اگر بدمعاش کو شریف ہی ہونا ہے تو پھر وہ بدمعاش کیوں ہے؟ اب میری طرف دیکھ لو۔ میں شریفوں کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ مگر جوا کھیلتا ہوں' شراب پیتا ہوں ہر عیب کرتا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں شریف آدمی ہوتا۔ جب میں کسی کو یہ کہتے سنتا ہوں کہ فلاں بڑا شریف بدمعاش ہے تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ فلاں بڑا اچھا گناہگار ہے۔ نہیں باؤ .... یہ اچھا ماحول نہیں ہے تم یہاں مت آیا کرو۔ میں تو اب گردن تک پھنس گیا ہوں۔ تم اپنے آپ کو جس طرح بچا سکتے ہو بچا لو۔ تم شریفوں کی اولاد ہو۔"

چوئی بدمعاش اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مگر اس کی یہ بات اس وقت تک میری راہنمائی کرتی رہے گی جب تک میں اس دنیا میں ہوں۔ دانائی کی یہ باتیں اس نے سقراط یا سپینوزا کی کسی کتاب میں نہیں پڑھی تھیں بلکہ یہ باتیں اسے اس میدان کار زار نے سکھائی تھیں جہاں نیکی اور بدی کی قوتوں کے درمیان جنگ ہو رہی تھی اور جہاں چوئی بدمعاش کی

حیثیت نیکی کی قوتوں کے ایک کمزور سے سپاہی کی تھی۔ چوئی بدمعاش برائی کی طاقتوں پر فتح تو حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ جب وہ میدان کار زار میں گرا تو اس کے ہاتھ میں نیکی کا پرچم تھا۔

معذرت چاہوں گا۔ داستان بیان کرتے کرتے کہیں کا کہیں نکل گیا۔ جذباتی آدمی ہوں۔ میرے ساتھ اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے اب میں واپس داستان پر آتا ہوں۔

روبی کو ہم نے لاہور سے کراچی جانے والی ٹرین میں چھوڑا تھا اور میں دارا کے ساتھ گزرے واقعات بیان کرنے میں لگ گیا۔ بہرحال ابھی میں چاہوں گا کہ ابھی کچھ واقعات دارا کے بیان کروں۔ روبی کراچی پہنچ کر کہاں گئی اور اس کے ساتھ کیا بیتی؟ یہ میں اس کے بعد بیان کروں گا۔

دارا پنجاب کے ایک چھوٹے شہر کے بدنام محلے میں دلشاد طوائف کے مکان میں چھپا ہوا تھا اور دم توڑتے مقتول کی مخبری پر ایک پولیس پارٹی سب انسپکٹر مراد کی قیادت میں دارا کو گرفتار کرنے کراچی سے اس چھوٹے شہر کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ بیچ میں صرف ایک رات تھی۔ پولیس پارٹی کو اس رات کا زیادہ حصہ ٹرین میں بسر کرنا تھا اور دارا دلشاد طوائف کے مکان پر یہ رات بسر کرنے کے بعد پنجاب کی طرف فرار ہو جانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد دارا اسی بیڈ روم میں لیٹ گیا۔ ابھی طوائفوں کے گانے بجانے پر حکومت کی طرف سے پابندیاں نہیں لگی تھیں۔ اوپر والی بیٹھک میں مجرا شروع ہو گیا۔ گھنگھرو کی آواز اور طبلے کی تھاپ کے ساتھ دارا کو دلشاد کے گانے کی ہلکی ہلکی آواز بھی آ رہی تھی۔ ایسی آوازیں اسے پریشان نہیں کرتی تھیں۔ وہ ان آوازوں میں بھی سو جانے کا عادی تھا۔ وہ سگریٹ پیتا اور سوچتا رہا کہ منہ اندھیرے وہ وہاں سے نکل جائے گا اور لاہور جانے والی کوئی بھی بس پکڑ کر اپنے دوست میاں خان کے فارم پر پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ پھر اس نے سگریٹ بجھا دیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بتی اس نے پہلے ہی بجھا دی تھی۔ رقص کرتے ہوئے دلشاد کے پاؤں کی تھاپ سے دھم دھم کی آواز پیدا ہو رہی تھی مگر دارا اس کے باوجود سو گیا۔ پھر اسے یوں لگا جیسے کوئی اسے ہلا رہا ہے۔

اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر تکیے کے نیچے چلا گیا جہاں بھرا ہوا پستول پڑا تھا۔

کمرے میں بتی روشن تھی۔ اس روشنی میں اس نے دلشاد کا چہرہ دیکھا جو اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کو کہہ رہی تھی۔ دارا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دلشاد طوائفوں والے میک اپ میں تھی اور اس کے لباس سے عطر کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ اس کے پاس ہی پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ دارا نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

"خیر ہے پولیس کا چھاپہ تو نہیں پڑ گیا؟" دلشاد مسکرائی۔ اس دفعہ بھی دارا کو اس کی مسکراہٹ بڑی بھلی لگی۔ خدا جانے کیوں اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ دلشاد اس کے سامنے بیٹھی اسی طرح مسکراتی رہے۔ دلشاد نے دوپٹہ اپنے سر پر کیا تو اس کی چوڑیاں کھنک اٹھیں۔

"پولیس یہاں نہیں آتی۔"

"کیا ٹائم ہوا ہے؟" دارا نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا دلشاد نے کہا۔

"رات کے دو بجے ہیں۔"

"تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟" دارا کے اس سوال پر دلشاد بولی۔

"طوائف کا تو کام ہی راتوں کو جاگنا ہے۔" دارا نے پوچھا۔

"مگر تم اس وقت یہاں کیوں آئی ہو۔" دلشاد نے ہلکا سا سانس بھرا اور بولی۔

"تماش بین جا چکے ہیں۔ گھر کے سب لوگ سو رہے ہیں اور میں تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ مجھے یہاں سے نکال کر لے جاؤ۔"

دارا اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹوں کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگا لیا۔ دلشاد اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ بلب کی روشنی میں اس کی نتھنی کا نگینہ کسی وقت چمک اٹھتا تھا۔ دارا نے پوچھا۔

"یہ خیال تمہیں پہلے کیوں نہیں آیا؟" دلشاد نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"پہلے کوئی مرد کا بچہ نہیں ملا تھا۔ اب تم مل گئے ہو تو تمہیں دل کا حال بیان کر دیا

ہے۔"

دارا نے بھی زندگی میں پہلی بار اس عورت کی شکل میں محبت کے ان دبے ہوئے جذبوں کو سر اٹھاتے دیکھا تھا جن کا کوئی نام دارا کے پاس نہیں تھا۔ اس کو یہ عورت شروع ہی سے اچھی لگی تھی۔ اگر دلشاد کا تعلق کسی شریف گھرانے سے ہوتا تو وہ اسی رات اسے اس کے گھر پہنچا کر بھول جاتا۔ مگر اتفاق سے دلشاد کا تعلق ایک طوائف گھرانے سے نکل آیا اور دارا کو دلشاد کے قریب ہونے کا موقع مل گیا۔ اس کے دل میں اول تو کسی عورت کو اپنی بیوی بنانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اگر کبھی خیال آیا بھی تو وہ یہ سوچ کر اس خیال کو دل سے نکال دیتا کہ وہ بدمعاش ٹائپ آدمی ہے۔ وہ کسی شریف عورت کے لائق نہیں۔ ویسے بھی کوئی شریف آدمی اسے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کو تیار نہیں ہو گا۔ جب دلشاد نے اسے پہلی بار بتایا کہ وہ ایک طوائف کی بیٹی ہے تو اسی لمحے اس کے دل میں امید کی کرن پھوٹی تھی مگر اس نے دلشاد پر اپنے دل کے حال کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اور کچھ دارا ابھی اس معاملے میں اتنا سنجیدہ نہیں تھا۔ لیکن اب جب دلشاد رات کے دو بجے اس کے پاس یہ کہنے آئی کہ مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو تو اس کو یقین ہو گیا کہ یہی عورت اب اس کی بیوی بنے گی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے جذبات قابو میں رکھے۔ وہ دلشاد کے دل کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے سوال کیا۔

"میرے ساتھ بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟ میں تو ایک مفرور قاتل ہوں۔ کسی وقت بھی پکڑا جا سکتا ہوں۔" دلشاد نے جواب دیا۔

"مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہو گا کہ تم قاتل ہو۔ اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہوں کیونکہ تم مرد ہو۔ تماش بین نہیں ہو۔ تمہارے دل میں عورت کی عزت ہے اور طوائف کتنی بری سے بری طوائف کیوں نہ ہو اس کی بھی ایک اپنی عزت ہوتی ہے۔ میں اس عزت کا مقابلہ کسی پاکباز شریف عورت کی عزت سے نہیں کر سکتی۔ میں اس قابل نہیں رہی ہوں۔ میری عزت کے سونے میں اتنا کھوٹ شامل ہو گیا ہے کہ اصل غائب ہو گیا ہے۔ میں تو کسی شریف عورت کی خدمت

کرنے کے بھی لائق نہیں ہوں پھر بھی جب تک ایک عورت کا عورت پن قائم ہے جب تک اس کے دل میں گناہ کا احساس زندہ ہے اس کی تھوڑی بہت عزت اپنی آنکھوں میں ضرور باقی رہتی ہے۔ میرے پاس صرف یہی ایک احساس گناہ اور اچھی زندگی گزارنے کی ایک خواہش ہے جس کو لے کر میں تیرے پاس آگئی ہوں۔ اب فیصلہ تجھے کرنا ہے۔ اگر میں نے تیرے اندر مردانگی کا جوہر نہ دیکھا ہوتا تو یقین کرنا میں اس وقت مجرا ختم کرنے کے بعد گہری نیند سو رہی ہوتی۔ اب تو مجھے بتا' کیا مجھے اس دلدل سے نکال کر لے جائے گا؟"

دارا نے تکیے کے نیچے سے اپنی رسٹ واچ نکالی اور اسے دیکھ کر بولا۔

"یہاں سے لاہور کی طرف ریل گاڑی کس وقت چلتی ہے؟" دلشاد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا تو میرے بغیر چلا جائے گا؟" دارا نے دلشاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا۔

"تو میرے ساتھ جائے گی۔"

دلشاد کا دل چاہا کہ وہ دارا سے لپٹ جائے مگر وہ اس کے اکھڑپن سے بہت حد تک واقف ہو چکی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اسے جھٹک دے گا۔ مگر وہ اپنی خوشی کو چھپا نہ سکی۔ اس نے دارا کا ہاتھ چوم لیا۔

"تو مرد ہے دارا۔ مجھے تیری ہی تلاش تھی۔"

دلشاد نے اسے بتایا کہ اس وقت نہ کوئی ریل گاڑی جاتی ہے اور نہ لاری اڈے پر کوئی لاری ہی ملے گی۔ ٹرین صبح چار بجے کراچی سے یہاں پہنچتی ہے اور پہلی لاری بھی اسی ٹائم یہاں سے ملتان کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ دارا کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے ہم چار بجے یہاں سے نکلیں گے۔ ہم لاری میں بیٹھ کر ملتان جائیں گے۔ وہاں سے لاہور والی بس پکڑ لیں گے۔ ٹرین میں جانا ٹھیک نہیں۔ تمہارے یہ گھر والے کس وقت اٹھتے ہیں؟" دلشاد نے مسکرا کر کہا۔

"یہاں دن کے گیارہ بجے سے پہلے کسی کی آنکھ نہیں کھلتی۔ اب تم آرام کرو۔ میں

ٹھیک پونے چار بجے تمہارے پاس آجاؤں گی۔" پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "اس وقت نکل جانے میں کیا حرج ہے۔" دارا نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہم دونوں کا لاری اڈے پر بیٹھ کر لاری کا انتظار کرنا ٹھیک نہیں۔ اس طرح ہمیں دیکھا جا سکتا ہے اور کیا خبر کوئی پولیس والا ہی ادھر آنکلے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پونے چار بجے آجاؤں گی۔ میں اپنا کوئی زیور ساتھ نہیں لاؤں گی۔ یہ حرام کی کمائی کا بنا ہوا ہے۔ میں حرام کی کمائی کی کوئی شے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی۔" دلشاد کی اس بات کے جواب میں دارا نے کہا۔

"بے شک یہ کپڑے بھی یہیں اتار کر پھینک دینا میں تمہیں نئے کپڑے بنوا دوں گا۔" دلشاد نے کہا۔

"جب تم مجھے اپنی کمائی سے کپڑے بنوا دو گے تو میں ان کپڑوں کو آگ لگا دوں گی۔" دلشاد اتنا کہہ کر کمرے سے چلی گئی۔ جاتے ہوئے وہ بتی بجھا گئی تھی۔

دارا پلنگ پر نیم دراز تھا۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ دارا ایک سیدھا سادا بے باک جذبوں والا ان پڑھ آدمی تھا۔ وہ شعور' لاشعور اور تحت الشعور کی بھول بھلیوں سے ناواقف تھا۔ اسے دلشاد پسند آئی تھی۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ دلشاد کا تعلق کسی شریف گھرانے سے نہیں ہے۔ وہ دلشاد کو وہاں سے نکال کر اپنی بیوی بنانے لے جا رہا تھا۔ بس اس کے واسطے اتنا ہی کافی تھا۔ دارا نے پلنگ سے اٹھ کر وہ شلوار قمیص پہن لی جو دلشاد اس کے لئے استری کر کے لائی تھی۔ صدری کی جیبوں میں نوٹوں کی گڈی اور پستول بھی رکھ لئے۔ وہ خالی پستول سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ راستے میں کسی جگہ خالی پستول پھینک دے گا۔ اور بھرا ہوا پستول اپنے پاس رکھے گا۔ ابھی چار بجنے میں سوا گھنٹہ باقی تھا۔ دارا پلنگ پر نیم دراز ہو گیا اور سگریٹ پینے لگا۔

دوسری طرف کراچی کی پولیس پارٹی سب انسپکٹر مراد علی کی قیادت میں اسی شہر کے اسٹیشن پر پہنچ گئی تھی۔ یہ لوگ سیدھا متعلقہ علاقے کے تھانے میں آئے۔ وہاں کے ایس ایچ او کو ساری بات بتائی۔ اسے بھی ساتھ لیا اور شہر کے بازار حسن کی طرف چل پڑے۔ ایس ایچ او نے سب انسپکٹر مراد علی کو بتایا کہ دلشاد کو اغوا یا بھاگ جانے کی تھانے میں کوئی رپٹ درج نہیں ہوئی ہے۔ سب انسپکٹر بولا۔

"ہو سکتا ہے اس کی ماں نے اس خبر کو خفیہ رکھنا چاہا ہو۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ لڑکی اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔"

پولیس کی جیپ دلشاد طوائف کے مکان کے سامنے آکر رکی اس وقت مکان میں صرف دلشاد اور دارا ہی جاگ رہے تھے۔ دارا نچلے کمرے میں تھا اور دلشاد دوسری منزل میں مجرا کرنے والی بیٹھک میں تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھی دن کے پونے چار بجنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک دروازہ زور زور سے بجا۔ دلشاد گھبرا کر کھڑکی کی طرف آئی۔ اس نے چق ذرا سی اٹھا کر گلی میں جھانکا۔ بجلی کے کھمبے کی روشنی میں اسے پولیس کے سپاہی جیپ سے نکلتے نظر آئے تو وہ گھبرا کر نیچے کو بھاگی۔ دارا بستر پر بیٹھا تھا۔ دلشاد نے اندر آتے ہی کہا۔

"باہر پولیس آگئی ہے۔ جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔" ان لوگوں نے اس قسم کے ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لئے گھروں میں خفیہ ٹھکانے ضرور بنائے ہوتے ہیں۔ دلشاد کے مکان میں بھی ایک چھوٹا سا تہہ خانہ تھا جہاں ٹوٹی پھوٹی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ یہ تہہ خانہ دیوان خانے کے پیچھے ایک کوٹھڑی کے نیچے تھا۔ دلشاد نے دارا کو تہہ خانے میں چھپا دیا اور تاکید کی کہ وہ کوئی آواز نہ نکالے۔ تہہ خانے کا چھوٹا دروازہ بند کر کے اس کے آگے تانبے

کی پرانی مٹکی رکھ دی اور خود تیزی سے اوپر والی منزل میں چلی آئی۔ اس دوران گھر کے سب لوگ جاگ پڑے تھے۔ نوکر چاکر اور دلشاد کی ماں بھی جاگ چکی تھی۔ اس نے بڑے ٹھنڈے دل اور خندہ پیشانی سے پولیس پارٹی کا خیر مقدم کیا تھا اور ان سب کو دیوان خانے میں بٹھا کر چائے پانی کا پوچھ رہی تھی۔ ایس ایچ او کا وہاں ماہانہ لگا ہوا تھا۔ اس نے سرسری طور پر دلشاد کا پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ دلشاد کی تجربہ کار ماں نے کہا۔

"اوپر سو رہی ہے کیوں کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے میاں جی؟"

تب کراچی والے سب انسپکٹر نے صاف سوال کر دیا۔

"تمہاری بیٹی دلشاد کو کراچی سے کون لایا ہے؟" دلشاد کی ماں کو سب معلوم تھا کہ پولیس کیوں آئی ہے اور اسے کیا جواب دینا ہے۔ اس نے چہرے پر حیرانی اور تعجب کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی! میری بیٹی کراچی کب گئی تھی کہ اسے کوئی وہاں سے لاتا۔ وہ تو تین دن سے بیمار گھر پر پڑی رہی۔ آج خیر سے آرام آیا تو تھوڑا سا مجرا کیا اور اب سو رہی ہے۔" ایس ایچ او نے سب انسپکٹر سے کہا۔

"میں تو پہلے ہی آپ سے کہہ رہا تھا کہ لڑکی اسی شہر میں تھی۔" سب انسپکٹر نے ایس ایچ او کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دلشاد کی حمایت کس لئے کر رہا ہے۔ اس نے دلشاد کی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا۔

"بی بی! تمہاری بیٹی کو چار آدمی یہاں سے اغوا کر کے کراچی لے گئے تھے۔ وہاں ان چاروں کا خون ہو گیا ہے اور تمہاری بیٹی بھاگ کر واپس آگئی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ قاتل کون ہے۔ اپنی لڑکی کو بلاؤ۔" دلشاد کی ماں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر انتہائی حیرانی کا اظہار کیا۔

"ہائے میں مر گئی؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شاہ جی! وہ میری بیٹی نہیں کوئی دوسری لڑکی ہوگی۔ یا کسی نے دشمنی میں میری بیٹی کا نام لیا ہوگا۔ میری بیٹی تو خیر سے اپنے گھر میں ہی تھی۔" پھر اس نے نوکر سے کہا کہ جا کر دلشاد کو بلا لا۔ دلشاد نے یہ ساری گفتگو دروازے کے پیچھے سن لی تھی۔ وہ بھاگ کر اوپر چلی گئی۔ اپنے بالوں کو ذرا الجھایا اور ایسا حلیہ بنا کر نیچے آئی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ سب انسپکٹر نے اسے غور سے گھورا۔ دلشاد نے

ادب سے سلام کیا اور بیٹھ گئی۔ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"تمہارا ہی نام دلشاد ہے؟" دلشاد نے کہا۔

"جی ہاں جناب۔ میں ہی دلشاد ہوں۔ حکم کریں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"دیکھو دلشاد! جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ الٹا کیس خراب ہو جائے گا۔ تم ہمیں صرف یہ بتا دو کہ کراچی میں جس آدمی نے چاروں بدمعاشوں کو گولیاں مار کر ہلاک کیا تھا وہ کون ہے؟ اگر تم نے انہیں قتل کیا ہے تب بھی صاف صاف بتا دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں صاف بری کرا لوں گا۔" دلشاد بھی اپنی ماں کی تربیت یافتہ تھی۔ وہ صاف مکر گئی اور قسم کھا کر کہنے لگی۔

"شاہ جی! میں تو بیمار ہو کر گھر پڑی تھی۔ مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا اور نہ میں کراچی گئی ہوں۔ پتا نہیں کسی دشمن نے میرا نام آپ کے آگے لے دیا ہے۔ اگر کراچی میں ہوتی یا مجھے کوئی اٹھا کر لے گیا ہوتا تو یہاں تو کسی نہ کسی کو ضرور خبر ہوتی اور میری ماں تو اسی وقت تھانے میں رپٹ درج کراتی۔"

سب انسپکٹر مراد کی نگاہیں دلشاد کے چہرے کو تک رہی تھیں۔ وہ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب دلشاد نے اپنا بیان ختم کر دیا تو انسپکٹر نے بڑے آرام سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بی بی! تمہیں میرے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے تھانے چلنا ہو گا۔"

اس پر دلشاد کی ماں نے زبردست احتجاج کیا کہ میری بچی کو ناحق تھانے کیوں بلایا جا رہا ہے۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا یہ سراسر ظلم ہے۔ سب انسپکٹر مراد نے دلشاد کی ماں کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تمہاری بیٹی پر چار آدمیوں کے قتل کا الزام ہے۔ اب تم سمجھیں کہ تمہاری بیٹی کو تھانے کیوں بلایا جا رہا ہے؟"

دلشاد کی ماں وہیں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے علاقہ کے ایس ایچ او کی طرف دیکھا جو اس سے باقاعدہ ماہانہ وصول کرتا تھا۔ اس نے آہستہ سے آنکھ کا اشارہ کیا۔ کہ تم گھبراؤ نہیں لڑکی کو لے جانے دو۔ میں جو وہاں موجود ہوں۔

دلشاد کو پولیس اپنے ساتھ تھانے لے گئی۔ جانے سے پہلے دلشاد نے اپنی ماں کو ایک طرف جا کر بتا دیا کہ دارا مکان کے تہہ خانے میں ہے۔ دلشاد کے جاتے ہی دلشاد کی ماں مکان کے تہہ خانے میں گئی اور دارا کو سارا واقعہ بیان کیا۔ دارا تو ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ کہ پولیس کو کیسے پتا چلا؟ وہ کہنے لگا۔

"وہاں تو کوئی بھی ایسا آدمی نہیں تھا جس کے مخبری کرنے کا امکان ہو۔ چاروں بدمعاشوں کی لاشیں ہی تھیں۔" پھر خود ہی کچھ سوچ کر بولا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی بدمعاش میں ابھی جان باقی ہو اور اس نے دلشاد کا نام بتا دیا ہو؟ پولیس نے یہ نہیں بتایا کہ مخبری کس نے کی ہے۔" دلشاد کی ماں غم سے نڈھال آواز میں بولی۔

"نہیں بیٹا۔ پولیس کو یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تو تم ہی کچھ کرو۔ مگر تم کیا کر سکتے ہو۔ تم تھانے گئے تو پولیس اسی وقت تمہیں پکڑ لے گی ہو سکتا ہے پولیس کو پتا چل گیا ہو کہ قتل تم نے کئے ہیں اور وہ دلشاد کے ذریعے تمہارا سراغ لگانا چاہتی ہو۔"

"وہ بدمعاش جو دلشاد کو یہاں سے اغوا کر کے لے گئے تھے وہ دلشاد کو جانتے تھے کیا؟" دارا نے پوچھا۔ دلشاد کی ماں نے اثبات میں سرہلا کر جواب دیا۔

"ہاں بیٹا! وہ ساتھ والے گاؤں کے بدمعاش تھے یہاں مجرے پر ایک بار ان کا ہم سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔"

دارا اس معاملے میں جذباتی طور پر الجھ گیا تھا۔ اب یہ حقیقت اس پر کھل کر سامنے آگئی تھی کہ دلشاد اس کی زندگی سے بچھڑا ہوا ایک ٹکڑا ہے اور اس کے بغیر اس کی زندگی نامکمل ہے۔ لیکن دلشاد کو تھانے سے نکالنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سوائے انتظار کے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے دلشاد کی ماں سے کہا۔

"پولیس کے پاس دلشاد کی گرفتاری کا کوئی وارنٹ نہیں ہے۔ آپ لوگ تھانے جائیں اور ایس ایچ او سے بات کریں۔ وہ دلشاد کو زیادہ دیر وہاں نہیں رکھ سکیں گے۔"

دلشاد کی ماں جانتی تھی کہ ایس۔ ایچ۔ او اگرچہ اس سے پیسے لیتا ہے مگر جب باہر سے کوئی افسر آتا ہے تو وہ ہتھیار ڈال دیتا ہے اور طوطا چشم بن جاتا ہے۔ پھر بھی وہ اپنی برادری کے چار آدمیوں کو ساتھ لے کر تھانے جا کر بیٹھ گئی۔ کراچی والے سب انسپکٹر کے پاس بھی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

دلشاد کیخلاف کوئی حتمی ثبوت نہیں تھا کہ چاروں قتل اسی نے کیے ہیں۔ وہ یہ بھی ثابت نہیں کر سکتا تھا دلشاد اغوا کر کے کراچی..... لے جائی گئی تھی۔ کیونکہ جو اس واقعے کا عینی گواہ تھا وہ بھی مرچکا تھا۔ تھانے لے جا کر انسپکٹر نے دلشاد کو کافی ڈرایا دھمکایا مگر دلشاد کوئی بچی نہیں تھی اور تھانہ اس کے لئے واقعی خالہ جی کا گھر ہی تھا وہ اپنے بیان پر ڈٹی رہی۔ سب انسپکٹر نے جب دیکھا کہ اس کے لواحقین باہر آئے ہوئے ہیں اور ہنگامہ کھڑا ہونے کا ڈر ہے تو اس نے دلشاد کو اس کی ماں کے ساتھ کر دیا۔ مگر علاقے کے تھانے دار سے رازداری کے ساتھ کہا کہ۔

"مجھے یقین ہے کہ جس بدمعاش نے چار آدمیوں کو قتل کیا ہے وہی دلشاد کو ساتھ لے کر یہاں آیا ہے اور وہ ضرور اسی شہر میں کسی جگہ روپوش ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اپنا آدمی دلشاد کے گھر کی نگرانی پر لگا دو۔ اور ذرا کوئی سراغ ملے تو مجھے فوراً کراچی اطلاع کرو۔"

دلشاد گھر واپس آ گئی۔ اس کی ماں نے آتے ہی اسے ہدایت کی کہ جتنی جلدی ہو سکے اس آدمی کو گھر سے روانہ کر دو۔ کہیں یہ ہم پر کوئی آفت نہ لے آئے۔ آخر وہ چار آدمیوں کو قتل کر کے آیا ہے۔ دلشاد اپنی ماں کی خود غرضیوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ مگر وہ بھی اس کی بیٹی تھی۔ وہ جو فیصلہ کر چکی تھی اس کی ماں کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ دلشاد نے کہا۔

"اچھا ماں۔ کسی بہانے اسے رخصت کرتی ہوں۔"

دلشاد ناشتہ لے کر دارا کے پاس آئی۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔ آج نہ جانے کتنی مدت بعد دلشاد صبح کے نو بجے ناشتا کر رہی تھی۔ ورنہ رات کو مجرا کر کے وہ سو جاتی تو دن کے گیارہ بارہ بجے ہی اٹھتی تھی۔ جلدی ناشتا کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دلشاد نے اسی وقت دارا کے ساتھ وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ محلے کے لوگ ابھی تک سو رہے تھے اور دلشاد کی ماں بھی تھانے سے واپس آنے کے بعد دودھ کا گلاس پی کر فوراً سو گئی تھی۔ نوکر بھی جو رات بھر کے جاگے تھے ادھر ادھر پڑ گئے تھے۔ دلشاد نے ساری بات دارا کو بیان کر دی۔ دارا کہنے لگا۔

"مگر شادو پولیس نے اپنا کوئی آدمی سادہ کپڑوں میں تمہارے گھر کے باہر ضرور بٹھا دیا ہو گا۔ ہمیں اس سے بھی بچنا ہے۔" دلشا بولی۔

تم جلدی جلدی ناشتہ کرو میں کچھ سوچتی ہوں۔" دارا کے دل میں یونہی ایک خیال سا آگیا اس نے دلشاد سے پوچھا۔

"تمہارے یوں بھاگ جانے سے تمہاری ماں کو تو بڑا صدمہ ہو گا۔" دلشاد نے کندھوں کو جھٹک کر کہا۔

"وہ مجھ سے کافی فائدہ اٹھا چکی ہے۔ اور پھر اس نے اتنا پیسہ جمع کر لیا ہے کہ سو سال تک آرام سے بیٹھ کر کھا پی سکے گی۔" دارا کہنے لگا۔

"کیا خیال ہے میں تمہاری ماں سے بات نہ کروں کہ میں تمہاری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ مان جائے گی۔" دلشاد ہنس پڑی۔

تم بڑے سیدھے مرد ہو۔ کسی نائیکہ سے اس کی ایسی بیٹی کا رشتہ مانگ رہے ہو جو اسے ہر رات مجرا کر کے ہزار بارہ سو روپیہ کما کر دیتی ہو یہ تو ایسا ہی ہے جیسے الہ دین کو یہ کہنا کہ بھائی اپنا جادوئی چراغ مجھے دے دو۔ اگر تم نے میری ماں سے میرے رشتے کی بات کی تو یاد رکھو دوسرے لمحے پولیس کو خبر کر کے تمہیں گرفتار کرا دے گی۔ میں اپنی ماں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ مگر ہمارا تو کاروبار ہی ایسا ہے۔ اس کی جگہ اگر میں ہوتی تو میں بھی ایسا ہی کرتی۔"

دلشاد نے ڈیوڑھی میں جا کر تھوڑا سا پٹ کھول کر گلی میں دیکھا۔ گلی میں دو بچے کھیل رہے تھے۔ اسے خفیہ پولیس کا کوئی آدمی وہاں بظاہر نظر نہ آیا۔ دارا کے پاس واپس آکر کہنے لگی۔

"یہاں کے کچھ خفیہ پولیس والوں کو میں شکل سے پہچانتی ہوں۔ ابھی تک تو ان میں سے کوئی باہر نہیں ہے۔" دارا نے کہا۔

"ہمیں مکان کے ڈیوڑھی والے دروازے سے نہیں نکلنا چاہیے۔ کیا کوئی دوسرا راستہ ہے یہاں؟" دلشاد نے نفی میں سر ہلایا۔ کہنے لگی۔

"ہمیں اسی دروازے سے نکلنا ہو گا۔ میں اپنی اماں کا سفید برقع پہن لوں گی۔ تم پہلے

"بس کر لاری اڈے پر پہنچ جانا لاری اڈہ دیکھا ہے تم نے؟" دارا نے کہا۔

"ہاں۔ میں نے دیکھا ہے۔ تم دیر نہ کرنا۔ میں لاری اڈے پر ہی کسی جگہ چھپ کر تمہارا انتظار کروں گی۔ تم مجھے تلاش نہ کرنا۔ میں تمہیں دیکھ کر خود تمہارے پاس آجاؤں گی۔" اس کے ساتھ ہی دارا بیڈ روم سے نکل کر ڈیوڑھی میں آیا اور پھر دروازہ کھولا اور گلی میں پرانے نالے والی ڈھلان کی طرف چل دیا۔ وہ اسی طرف سے اس گلی میں داخل ہوا تھا۔ وہ شہر کی بارونق سڑکوں کی طرف سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔

لاہور جانے والی سڑک پر بھاری ٹریفک رواں تھا لاری اڈے پر چند ایک مسافر ہی تھے۔ ایک لاری مسافروں سے بھری جا چکی تھی۔ دارا کے سامنے وہ لاہور کی طرف روانہ ہو گئی۔ ابھی اس شہر میں ٹیکسی رکشا نہیں چلا تھا۔ ورنہ دارا ٹیکسی کر لیتا۔ اسے لا محالہ لاری میں ہی سفر کرنا تھا۔ وہ اڈے کے بکنگ آفس کے پیچھے برگد کے درخت کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں شہر سے آتی سڑک پر لگی تھیں۔ کچھ دیر بعد اسے سڑک پر شہر کی جانب سے ایک عورت آتی دکھائی دی جس نے معمر عورتوں والا سفید برقع پہن رکھا تھا یہ دلشاد تھی۔ وہ ذرا سڑک کے پار چلا آیا۔ اس نے دلشاد کو وہیں سے اپنے ساتھ لیا اور اڈے کے پیچھے برگد کے درخت تلے بیٹھ گیا۔

"تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟" دارا نے دلشاد سے پوچھا۔ دلشاد نے نقاب ذرا سا ہٹا کر دارا کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا۔

"دیکھ بھی لیا ہو گا تو پھر کیا ہوا۔ اب واپس نہیں جاؤں گی۔ اپنے مرد کے واسطے ساری دنیا چھوڑ دی ہے۔"

دارا کو دلشاد کی اس قسم کی ٹھیٹھ اور دلیرانہ باتیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے بھی دلشاد کا ہاتھ برقعے کے اندر تھام کر کہا۔

"ہم بھی یاری نبھائیں گے شادو۔" قصہ مختصر دارا اپنی محبوبہ دلشاد کو لے کر کسی نہ کسی طرح اپنے پرانے دوست میاں خان کے فارم میں پہنچ گیا۔ میاں خان نے اس بار دارا کے ساتھ ایک نئی عورت کو دیکھا تو اسے ایک طرف لے جا کر پوچھا۔

"یہ کون ہے دارا؟" اس نے سارا واقعہ بیان کر دیا اور کہا میں دلشاد سے شادی کرنا

چاہتا ہوں۔ میاں خان سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"شادی کے لئے ایک مولوی صاحب اور دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ یہ نیک کام ہے۔ میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔"

دارا نے روبی کے بارے میں پوچھا تو میاں خان بولا۔

"وہ آئی تھی مگر تمہیں یہاں نہ پا کر کسی طرف نکل گئی' شاید وہ کراچی چلی گئی ہے۔ وہ اپنی بچی سے ملنا چاہتی تھی۔"

دارا خاموش رہا۔ اگلے روز میاں خان ایک مولوی صاحب۔ اور دو گواہوں کو ساتھ لے آیا۔ فارم میں ہی دارا کا نکاح دلشاد کے ساتھ پڑھا دیا گیا۔

میاں خان نے دارا کو حالات کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے بتایا کہ نادر اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے بعد یہ علاقہ پولیس کی مسلسل نگرانی میں ہے۔

دارا بولا۔" مجھے معلوم ہے میاں خان۔ مگر میں کچھ وقت یہاں گزارنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے روبی یہاں واپس آجائے۔" میاں خان کہنے لگا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ تم یہاں سے میرے پرانے ڈیرے پر چلے جاؤ۔ وہاں تم محفوظ ہو گے۔ کیونکہ اب ادھر کوئی نہیں جاتا۔ کبھی میں وہاں اسمگلنگ کا مال چھپایا کرتا تھا۔ اب وہ ڈیرہ مدت سے خالی پڑا ہے اور پولیس بھی ادھر کا رخ نہیں کرتی۔ تمہیں راشن پانی وہاں پہنچتا رہے گا۔"

میاں خان کا یہ ویران ڈیرہ اس کے فارم کے جنوب میں ایک چھوٹے سے ٹیلے کے دامن میں تھا۔ یہ شور زدہ زمین تھی۔ آس پاس کوئی دیہات بھی نہیں تھا۔ میاں خان کا فارم وہاں سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ دلشاد اور دارا یہاں آگئے۔ میاں خان نے وہاں دو چارپائیاں اور بستر اور کچھ ضروری برتن بھجوا دیئے۔ کھانا وغیرہ دن میں دو بار اعتباری نوکر لے کر آجاتا تھا دارا نے میاں خان سے پستول کی گولیاں کافی تعداد میں لے کر اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ ابھی دستی بموں اور کلاشنکوفوں کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ پستولوں کی فائرنگ بھی کہیں کہیں ہوتی تھی اور اس کی بڑی دہشت تھی۔ دارا نے دلشاد کو روبی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ میری یہ بہن بڑی دلیر اور جانباز ہے۔

اگر وہ یہاں آگئی تم اس سے مل کر بڑی خوش ہوگی۔ دلشاد نے دارا سے کہا۔

"یہاں ہم کچھ دن ہی ٹھہر سکتے ہیں۔ ہمیں کہیں اپنا مستقل گھر بنانا چاہئے۔ جہاں میں تمہارے ساتھ سکون و اطمینان سے باقی زندگی بسر کر سکوں۔" دارا بولا۔

"یہ بھی ہو جائے گا میری جان! آخر ہمیں اپنا گھر بنانا ہی ہے۔ مگر میں اپنی بہن روبی کو بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کا سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے۔ شیر خان اس کا خاوند ضرور ہے مگر وہ خود مشکل میں پھنسا ہوا ہے۔ اپنی معصوم بچی کی وجہ سے وہ اپنی بیوی روبی کے ساتھ بھی نہیں جا سکتا اور اسے اپنے گھر میں بھی نہیں رکھ سکتا۔ میری طرح روبی نے بھی بڑے خون کیے ہیں اور پولیس اس کے پیچھے لگی ہے۔" دلشاد نے کہا۔

"دارا وعدہ کرو کہ روبی سے ملنے کے بعد تم میرے ساتھ شریفانہ زندگی بسر کرو گے۔ یہ پستولوں اور بدمعاشوں کی دنیا سے نکل آؤ گے۔" دارا مسکرایا۔

"دلشادا میری جان! اگر ایسی بات نہ ہوتی تو میں تم سے کبھی شادی نہ کرتا۔ میں نے تو تم سے شادی ہی اس لئے کی ہے کہ ایک نئی زندگی شروع کر سکوں۔"

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟" دلشاد نے فکر مندی سے پوچھا۔ دارا کہنے لگا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ ہم یہاں سے کسی طرح کویت یا دوبئی چلے جائیں گے۔ وہاں ہم اپنی ایک نئی صاف ستھری زندگی شروع کریں گے۔ ہمارے پاس کافی روپے ہیں۔ ہم لانچ میں بیٹھ کر جائیں گے۔ وہ لوگ میرے جاننے والے ہیں۔ میں ایک پوری لانچ لے لوں گا۔ تم بالکل مطمئن رہو۔" دلشاد خوش ہو گئی۔

میاں خان کے ڈیرے میں دارا اور دلشاد چار پانچ دن رہے اور اس دوران روبی نہ آئی تو دارا نے کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں سے اپنی بیوی دلشاد کو ساتھ لے کر کویت کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ اسمگلر جو غیر قانونی طور پر لوگوں کو لانچوں کے ذریعے خلیج کے ملکوں میں پہنچاتے تھے دارا کے واقف بلکہ دوست تھے۔ وہ خود ایک مدت تک انکے ساتھ مل کر اسمگلنگ کا دھندا کرتا رہا تھا۔ دارا کے پاس اچھی خاصی رقم تھی۔ وہ پوری کی پوری لانچ خرید کر بھی جا سکتا تھا۔ ایک روز شروع رات میں دارا نے میاں خان کو گلے لگا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور دلشاد کو لے کر لائل پور کی جانب چل پڑا۔ وہاں سے وہ کراچی کی گاڑی

میں سوار ہو گئے اور کراچی جا پہنچے۔ کراچی پہنچنے کے بعد دارا دلشاد کو لے کر شہر سے دور سمندر کے کنارے اسمگلروں کے اڈے پر آگیا۔ یہاں حاتم نامی اسمگلر اس کا بڑا گہرا اور راز دار دوست تھا۔ اسے دارا نے ساری بات بتا دی اور کافی رقم دے کر کہا کہ ہمارے لئے ایک پوری لانچ کا بندوبست کر دو۔ حاتم بولا۔

"دارا! پوری لانچ لے کر کیا کرو گے؟ کچھ روز ٹھہرو۔ قطر سے ہمارا مال آ رہا ہے وہ لانچ بالکل نئی ہے۔ ابھی میں یہاں سے مال بھر کر واپس جائے گا۔ تم اس میں سوار ہو کر بحرین اتر جانا۔"

دارا چونکہ وہاں کافی حد تک محفوظ تھا اس لئے راضی ہو گیا دلشاد کو اس نے سمندر کے کنارے والی جھونپڑی میں چھوڑا اور خود شہر آ کر اپنے پرانے نوکر بخشو سے ملا اور اسے کہا کہ میں سمندر والے پرانے اڈے پر ہوں۔ اگر روبی کا ادھر آنا ہو تو اسے لے کر وہاں پہنچ جانا۔ میں یہ ملک چھوڑنے سے پہلے اپنی بہن کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ بخشو بولا۔

"تم کب تک وہاں ہو بیٹا؟" دارا نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ ہفتہ دس دن لگ جائیں گے۔ اب میں وہاں سے شہر تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔ روبی بہن آئے تو تم خود اسے لے کر میرے پاس آ جانا۔" بخشو کو یہ پیغام دے کر دارا واپس چلا گیا۔

اب ہم روبی کی طرف آتے ہیں۔ اس دوران روبی کراچی پہنچ چکی تھی اور ایک ہفتے سے اپنے گھر میں شیر خان اور اپنی پیاری بچی عائشہ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب وہ لاہور سے چلی تھی تو مردانہ لباس میں تھی۔ یعنی اس نے ملیشئے کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر کے بال لڑکوں کی طرح چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے تھے۔ جسم کے گرد موٹی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ چاقو اور پستول قمیص کے اندر چھپا رکھا تھا۔ اس حلئے میں اسے اتنی جلدی کوئی نہ تو پہچان سکتا تھا اور نہ کسی کی مشتبہ نگاہ ہی اس پر پڑ سکتی تھی۔ پھر بھی روبی اپنی طرف سے بڑی احتیاط سے کام لے رہی تھی۔ کراچی ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہ تھرڈ کلاس کے کھلے ویٹنگ روم میں جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گئی اور رات کا اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ شام کو پہنچی تھی۔ جب رات کچھ گہری ہو گئی تو اس نے رکشہ لیا اور اپنے محلے سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رکشا چھوڑ دیا۔ یہ بات اسے

معلوم تھی کہ پولیس وہاں نگرانی کر رہی ہو گی۔ لیکن اتنے دن گزر جانے پر پولیس کی طرف سے کچھ سستی آسکتی تھی چنانچہ وہ مکانوں کے ساتھ ساتھ اندھیرے میں چلتی اپنی گلی میں آگئی۔ مکان کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ اس وقت شیر خان باہر چھوٹے سے صحن میں نلکے کے پاس بیٹھا چاول دھو رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا کہ ایک لڑکا سامنے کھڑا ہے۔ پہلی نظر میں وہ روبی کو نہ پہچان سکا۔ جب روبی قریب آئی تو وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنی بچھڑی ہوئی محبوبہ اور بیوی کو گلے سے لگا لیا اور اندر کوٹھری میں لے گیا۔ شیر خان کے ہونٹ جذبات کی شدت سے کپکپا رہے تھے۔ اس نے روبی کو بازو سے پکڑ لیا اور بولا۔

"اب میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ جئیں گے اکٹھے۔ مریں گے تو اکٹھے مریں گے۔ بچی کو دیکھا جائے گا۔" روبی نے عائشہ کا پوچھا۔ شیر خان بولا۔" وہ مریم کے پاس ہے وہی اس کی دیکھ بھال کرتی ہے تم بیٹھو۔ میں اسے لاتا ہوں۔"

"کیا کہہ کر بچی کو لاؤ گے؟" روبی نے تشویش کے ساتھ کہا۔"کہیں اسے شک نہ پڑ جائے۔ میرے یہاں آنے کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہئے۔" شیر خان نے جھنجھلا کر کہا۔

"پتا لگتا ہے تو لگ جائے۔ اب میں کسی سے نہیں ڈرتا ہم دونوں اپنی بچی کے ساتھ مل کر رہیں گے۔" روبی نے جلدی سے اٹھ کر شیر خان کا بازو تھام لیا اور بولی۔

"شیر خان! ہوش سے کام لو۔ میں جیل سے بھاگی ہوئی مفرور قاتلہ ہوں۔ یہاں اگر کسی کے کان میں میرے آنے کی بھنک بھی پڑ گئی تو صبح ہونے سے پہلے پہلے میں گرفتار کر لی جاؤں گی اور پھر عمر قید یا پھانسی کا پھندا میرا مقدر ہو گا۔"

شیر خان نے روبی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"مگر یہ بھی کوئی زندگی نہیں ہے روبی تم کہیں دربدر پھر رہی ہو۔ میں یہاں اکیلا سہما بیٹھا ہوں۔ ہماری بچی کہاں پرورش پا رہی ہے۔ ایسی زندگی سے تو بہتر ہے کہ ہم ایک بار مل کر رہ لیں۔ اس کے بعد چاہے مجھے موت آجائے۔" روبی نے شیر خان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں شیر خان ایسی بات زبان سے مت نکالو۔

تمہیں زندہ رہنا ہے۔ بہت دیر تک زندہ رہنا ہے۔ میری بیٹی کو شیرنی بنانا ہے۔ اس کی اسی طرح پرورش کرنی ہے جس طرح میں تمہیں کہہ چکی ہوں۔ جیسے میں کہتی ہوں ویسے ہی کرو۔ ابھی میں تمہارے پاس ہی ہوں۔ اپنی بچی کے پاس ہی ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جتنی دیر یہاں رہ سکی رہوں گی۔ تم میری بچی کو جا کر لے آؤ۔ مریم کو کہنا کہ تم بچی کے بغیر اداس ہو گئے ہو اور آج رات وہ تمہارے پاس رہے گی۔ جاؤ۔ خبردار! تمہاری زبان سے کوئی غیر ذمے داری کی بات نہ نکلے۔" شیر خان سر جھکائے کوٹھری سے نکل گیا۔

روبی نے دروازہ بند کر دیا اور اپنے اس گھر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی جہاں اس نے اپنی زندگی کے بڑے یادگار دن گزارے تھے۔ تھوڑی دیر بعد شیر خان واپس آگیا۔ ننھی سی عائشہ اس کی گود میں سو رہی تھی۔ روبی نے اپنی بچی کو لے کر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں میں ممتا کے آنسو آ گئے۔ مگر اس نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور شیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شیرنی کبھی نہیں روتی۔ میری بچی کو بھی بڑے ہو کر کبھی مت رونے دینا۔ اسے کہنا کہ اس ملک کی عورتوں نے بہت آنسو بہا لیے ہیں۔ آنسو بہانے کا زمانہ گزر گیا ہے اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا حق منوانے کا زمانہ ہے۔"

"روبی نے اپنی بچی کا ماتھا چوم لیا۔ بچی جاگ پڑی اور نیند بھری آنکھیں کھول کر اپنی ماں کو تکنے لگی۔ اس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے ماں کی ناک پکڑ لی۔ روبی ہنس کر بولی۔

"دیکھو شیرے؟ اس نے مجھے مردانہ حلیئے میں بھی پہچان لیا ہے یہ میری بیٹی ہے۔ شیرنی کی بیٹی ہے۔ یہ بھی بڑی ہو کر شیرنی بنے گی۔"

روبی اپنی بچی کو ساتھ لا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ شیر خان بولا۔"میں چاول پکانے لگا تھا۔" روبی نے کہا۔

"میں اسٹیشن سے جو کھانا تھا کھا آئی ہوں صرف اپنے لئے بنانا۔" شیر خان ذرا سا مسکرا کر کہنے لگا۔

کیا تم مجھے چاول نہیں بنا دو گی" روبی نے کہا۔

"کیوں؟ کیا تم نہیں پکا سکتے۔؟ اب تک تمہیں کھانا پکانا آ جانا چاہئے تھا۔ عورتیں

صرف کمانا پکانے کے لئے نہیں ہوتیں۔ جو مرد ایسا سمجھتے ہیں میں ان کی جانی دشمن ہوں۔" شیر خان مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ تو میں جانتا ہوں۔" روبی نے شیر خان کے ساتھ ہی کوٹھری میں رہنا شروع کر دیا۔ وہ سارا دن کوٹھری میں رہتی۔ ایک پل کے لئے بھی باہر نہ نکلتی تھی۔ شیر خان کام پر جاتا تو مکان کو باہر سے تالا لگا جاتا۔ روبی کوٹھری سے نکل کر صحن میں بھی بڑی احتیاط سے آتی۔ اس کی بچی سارا دن اور رات کو ہمسائی مریم کے پاس ہی رہتی تھی۔ صرف شام کے وقت معمول کے مطابق شیر خان بچی کو اپنے گھر لے آتا تھا۔ وہ پہلے بھی ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ دونوں میاں بیوی بچی سے کھیلتے۔ روبی جی بھر کر اسے پیار کرتی اور عشاء کی اذان کے بعد شیر خان بچی کو واپس مریم کے پاس چھوڑ آتا۔ کبھی مریم خود بچی کو لینے آجاتی اس وقت روبی مکان میں کسی جگہ چھپ جاتی۔ روبی کے پاس جو رقم تھی وہ اس نے شیر خان کے حوالے کر دی تھی۔ اس نے اپنی ساری کہانی اسے سنا دی تھی اور کہا۔

"دارا نے اس کا بڑا ساتھ دیا ہے۔ وہ تو حقیقی بھائیوں سے بھی بڑھ کر نکلا۔" شیر خان کہتا۔

"وہ مرد کی اولاد ہے اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔"

شیر خان نے بھی روبی کو بتایا کہ سہراب کے قتل کے بعد اس کا غنڈہ بھائی ہاشم اسے طرح طرح سے پریشان کرتا رہتا ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ عائشہ کی وجہ سے میرے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی ہے۔ ورنہ اب تک ہاشم کی لاش بھی غائب کر چکا ہوتا۔ روبی غور سے سنتی رہی۔ پھر اس نے باتوں ہی باتوں میں شیر خان سے ہاشم بدمعاش کے ٹھکانے کا پتا معلوم کر لیا اور خاموش رہی۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ روبی کو اپنے گھر میں چھپے ہوئے ہفتے سے زیادہ دن ہو گئے تھے مگر ابھی تک محلے میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں بڑی احتیاط اور رازداری سے کام لے رہے تھے۔ لیکن دل میں روبی کو احساس تھا کہ وہ زیادہ دن اپنے خاوند اور اپنی پیاری بچی کے پاس نہیں رہ سکے گی۔ کیونکہ اس نے اپنی موجودگی سے ان دونوں کی زندگیوں کو مسلسل خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ کسی

روز بھی مخبری ہو گئی تو پولیس وہاں چھاپہ مارے گی اور دونوں طرف سے گولیاں چلنی شروع ہو جائیں گی اور پھر کچھ پتا نہیں کہ کون زندہ رہتا ہے۔ یہ وہ دن تھے جب دارا بھی اپنی نو بیاہتا دلہن دلشاد کو لے کر کراچی پہنچ چکا تھا اور ساحل سمندر والی اسمگلروں کی بستی میں اپنے اسمگلر دوست حاتم کی جھونپڑی میں مقیم تھا اور قطر دوبئی سے لانچ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب تین چار روز گزر گئے اور دوبئی قطر سے وہ اسمگلنگ کا مال لے کر لانچ نہ آئی تو دارا بے چین ہو گیا۔ دلشاد بھی بے چین تھی وہاں اس کا دل ذرا نہ لگتا تھا۔ دارا نے ایک شام حاتم سے کہا۔ "حاتم میرے پاس کافی رقم ہے۔ تم مجھے پوری لانچ دلوا دو۔ میں سمندری راستے سے واقف ہوں۔ دلشاد کو لے کر نکل جاؤں گا۔ مگر حاتم نہیں چاہتا تھا کہ وہ اتنے خطر ناک سمندر میں اکیلا سفر کرے۔ یہ تجربہ کار اسٹیمر چلانے والوں کا ہی کام تھا جو سمندر کے مزاج سے واقف تھے۔ اس نے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ دو دن مزید دیکھ لے۔

دارا اور دلشاد ساحل سمندر سے ذرا ہٹ کر ایک جھونپڑا نما کیبن میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہاں ان دونوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ صرف لانچ کے انتظار کی کوفت اٹھانی پڑ رہی تھی۔ یہ تھی تو ملاحوں کی بستی مگر وہاں، اسمگلروں نے بھی اپنے خفیہ اڈے قائم کر رکھے تھے۔ پولیس کے چھاپے بھی پڑتے رہتے تھے۔ اسمگلنگ کا ناپاک کام بھی ہو رہا تھا۔ مال سے لدی ہوئی لانچیں پکڑی بھی جاتی تھیں۔ جرائم پیشہ اسمگلر گرفتار بھی ہوتے لیکن جلد ہی ان کی جگہ دوسرے اسمگلر لے لیتے۔ بہرحال پولیس اور کوسٹل سیکورٹی گارڈز ان لوگوں سے غافل نہیں تھے۔ پولیس نے تو خاص طور پر یہاں اپنے مخبر چھوڑ رکھے تھے جن میں سے کچھ اسمگلروں سے بھی ملے ہوئے تھے اور پولیس کا نام رکھنے کے لئے کبھی کبھی معمولی سامان سے بھری ہوئی لانچ پکڑوا بھی دیتے تھے جن پر کوئی اسمگلر سوار نہیں ہوتا تھا۔ لیکن کچھ دیانت دار بھی تھے اور وہ پولیس کو رتی رتی کی خبر پہنچا دیتے تھے۔ ان میں سے ایک مخبر ایسا بھی تھا جو دارا کو جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ دارا ایک مفرور قاتل ہے اور پولیس کو اس کی تلاش ہے۔ جب دارا اور دلشاد وہاں آکر ٹھہرے تو یہ مخبر چھٹی لے کر اپنی بیمار ماں کے پاس گاؤں گیا ہوا تھا۔ تین چار دن بعد واپس آیا تو حاتم کے ساتھ دارا کو باتیں کرتا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے دارا کو پہچان لیا تھا۔ دارا ایک عرصے تک

اسی جگہ اسمگلنگ کا کام چلاتا رہا تھا۔ مخبر نے بہت جلد پتا چلا لیا کہ دارا دلشاد نامی ایک عورت کے ساتھ وہاں ٹھہرا ہوا ہے اور دبئی سے آنے والی اسمگلنگ لانچ کا انتظار کر رہا ہے۔

مخبر نے جب پوری معلومات حاصل کر لیں تو پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس کو قاتل دارا کی پہلے ہی سے تلاش تھی۔ انسپکٹر شہباز نے پولیس کمانڈوز کی ایک پارٹی ساتھ لی اور حاتم کے ساحل سمندر والے ٹھکانے کی طرف تیزی سے روانہ ہوا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر سنہری روشنی کا غبار پھیلا ہوا تھا جو سر شام کراچی کی خاص روشنی ہوتی ہے اور جسے انگریزی میں ٹوئی لائٹ کہتے ہیں اور یہ روشنی ساحلی علاقوں میں بڑی دیر تک قائم رہتی ہے۔ پولیس پارٹی مچھیروں اور اسمگلروں کی بستی سے تھوڑی دور پیچھے ہی رک گئی۔ مخبر وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے انسپکٹر شہباز کو بتایا کہ مفرور قاتل دارا اس وقت اپنی عورت کے ساتھ تلائی والے جھونپڑے میں موجود ہے۔ پولیس کمانڈوز نے خاموشی سے شام کے جھٹپٹے میں جھونپڑے کا محاصرہ کر لیا۔ دارا جھونپڑے کے شکستہ کیبن میں دلشاد کے پاس بیٹھا اس سے کہہ رہا تھا کہ اگر کل تک لانچ نہ آئی تو ہم اپنی لانچ لے کر وہاں سے نکل جائیں گے۔

اچانک دارا کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا کہ کوئی خطرہ ہے۔ اس نے گردن گھما کر جھونپڑے کے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے میری جان؟" دلشاد نے دارا کو اچانک چوکس ہوتے دیکھ کر پوچھا۔ دارا نے فوراً لالٹین بجھا دی اور جیب سے پستول نکال کر کہا۔

"شادو! سمندری چٹانوں کی طرف بھاگ جاؤ۔"

مگر اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ پولیس نے انہیں گھیر لیا تھا۔ ایک دم سے جھونپڑے کی خستہ لکڑی کی دیواروں پر تھری ناٹ تھری رائفلوں کی گولیاں برسنے لگیں۔ دلشاد اور دارا فرش پر لیٹ گئے۔ دارا نے بھی پستول سے فائرنگ شروع کر دی اور دلشاد کو لے کر اندھیرے میں باہر کی طرف کھسکنے لگا۔ ادھ کھلے دروازے پر گولیاں برس رہی تھیں۔ پھر فائرنگ رک گئی اور انسپکٹر شہباز نے بلند آواز سے دارا کو حکم دیا۔

"ہتھیار پھینک کر باہر نکل آؤ۔ مقابلہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم اپنی عورت کے ساتھ مارے جاؤ گے۔" اس دوران دلشاد رینگ کر جھونپڑے سے باہر نکل چکی تھی۔ دارا جانتا تھا کہ اس کے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے اس نے چیخ کر کہا۔

"شادو! کہاں جا رہی ہو؟" مگر شادو شام کے سرمئی دھندلکے میں اس کی نظروں سے غائب ہو چکی تھی۔ انسپکٹر شہباز نے ایک بار پھر پکار کر دارا کو ہاتھ کھڑے کر کے باہر نکل آنے کا حکم دیا۔ دارا نے پستول میں نیا میگزین بھرا اور کہنیوں کے بل رینگتا جھونپڑے کے دروازے تک آ گیا۔ اس نے ذرا سی گردن باہر نکال کر دیکھا۔ اسے اردگرد پھیلی چھوٹی چھوٹی سمندری چٹانوں کے اوپر کچھ دکھائی نہ دیا۔ پولیس ان چٹانوں کے پیچھے تھی اس نے چلا کر شادو کو آواز دی۔ جب شادو کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ اٹھ کر چٹانوں کی طرف دوڑا۔ دائیں اور بائیں پہلو سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ پڑی دو گولیاں دارا کی ٹانگ میں سے گزر گئیں۔ وہ گر پڑا مگر خون کی گرمی سے اٹھا اور دلشاد کو آواز دی۔ وہ اس وقت پولیس کو بھول چکا تھا۔ اور صرف اسے دلشاد اپنی پہلی اور آخری محبت ہی یاد تھی۔ دلشاد اس وقت ریت پر رینگتی ہوئی اندھیرے میں ایک کانسٹیبل کے پیچھے آ گئی تھی۔ پھر وہ اچھل کر اس پر گری اور جذبات کی گرمی اور جوش میں اس نے سپاہی سے رائفل چھین کر اس پر فائر کر دیا۔ سپاہی گولی کھا کر پیچھے گرا۔ عین اس وقت دارا نے اسے پکارا۔ دلشاد نے چلا کر جواب دیا۔

"ڈٹے رہو میری جان! زندہ رہے تو مل جائیں گے۔ نہیں تو اگلے جہان میں اب ملیں گے۔"

دلشاد کی آواز نے دارا کے خون میں جیسے شعلے بھر دیے۔ اس کے حلق سے ایک بھیانک آواز بلند ہوئی اور وہ کھڑے ہو کر دائیں بائیں آگے پیچھے پستول سے فائر کرنے لگا۔ اس کی ٹانگ سے خون کا پرنالہ بہہ رہا تھا۔ تھری ناٹ تھری کی گولیوں نے ٹانگ کا ایک جگہ سے گوشت اور ہڈی اڑا دی تھی۔ انسپکٹر شہباز اور اس کے سپاہیوں نے دارا کو دیکھ لیا تھا۔ اس کی فائرنگ سے دو سپاہی جو آڑے نکل کر دوسری طرف گئے تھے گولی کھا کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ایک گولی انسپکٹر کے چہرے کے قریب سے ہو کر نکل گئی۔ وہ ہر حالت میں دارا کو زندہ

گرفتار کرنا چاہتا تھا مگر وہاں افراتفری میں فائر ہو رہے تھے۔ ایک گولی دارا کی گردن میں لگی۔ خون کا فوارا سا اڑا اور دارا لڑکھڑا کر گر گیا۔ انسپکٹر نے چیخ کر کہا۔

"فائر بند کر دو۔" فائرنگ بند ہو گئی۔ انسپکٹر شہباز دوڑ کر دارا کے قریب گیا۔ اس کی آدھی گردن تھری ناٹ تھری کی گولی لگنے سے اڑ چکی تھی اور خون نکل نکل کر ساحل کی ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کا پستول اس کی بے جان انگلیوں میں ڈھلک گیا تھا۔ دارا مر چکا تھا۔

انسپکٹر شہباز نے اس کا پستول قبضے میں لے لیا اور سپاہیوں کی لاشوں کو بھی ایک جگہ رکھ دیا۔ تین سپاہی مر گئے تھے۔ چار زخمی ہوئے تھے۔ زخمیوں کو اسی وقت جیپ میں ڈال کر ہسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ انسپکٹر نے کہا۔

"وہ عورت کہاں ہے۔ اسے تلاش کرو۔"

وہ عورت یعنی دارا کی نوبیاہتا بیوی اور گھر سے بھاگی ہوئی طوائف دلشاد بھی پولیس کو مل گئی۔ لیکن اس حالت میں کہ گولیوں نے اس کے سینے میں دو شگاف ڈالے ہوئے تھے۔ وہ خون میں لت پت سمندری سنگ ریزوں پر پڑی تھی اور اس کی روح اس کے جسم سے پرواز کر چکی تھی۔ جس طوائف کو ہم ہرجائی کہتے آئے ہیں اور نہ جانے کب تک کہتے چلے جائیں گے اسی نے اپنی جان دے کر وفا کی لاج رکھ لی تھی۔ مچھیروں کی اس گمنام بستی میں رہنے والوں کا کہنا ہے کہ آج بھی پورے چاند کی رات کو سمندری چٹانوں میں کسی عورت کی آواز سنائی دیتی ہے جو بڑے حسرت بھرے انداز میں کسی کو اپنی طرف بلاتی ہے اور پھر کھلے سمندر کی طرف غائب ہو جاتی ہے۔ عورت کبھی طوائف نہیں ہوتی۔ مرد اسے طوائف بناتے ہیں۔ ایک مرد نے جس کا نام دارا تھا اور جسے بدمعاش کہہ کر ہمارے معاشرے نے ٹھکرا دیا تھا ایک ٹھکرائی ہوئی طوائف کو اپنی بیوی بنا کر بھرے معاشرے میں باعزت مقام دینا چاہا لیکن سماج نے دارا کو معاف نہ کیا اور پولیس کی گولیوں نے ان دونوں کے سینے چھلنی کر دیے اور دونوں دھتکارے ہوئے انسان ایک چھوٹے سے گھر میں ہنستے کھیلتے بچوں کا خواب اپنے ساتھ ہی لے کر قبروں میں اتر گئے۔

روبی کو دارا کی پولیس مقابلے میں موت کی خبر شیر خان نے سنائی۔ روبی کو اس کی

موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ اس سے ملنے کی آس اب ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی تھی۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے خاوند اور بچی عائشہ سے الگ نہیں ہو گی چاہے اسے اپنی جان کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ شیر خان اس کے اس فیصلے سے بڑا خوش ہوا۔ وہ تو شروع ہی سے روبی کے پولیس سے چھپ کر مارے مارے پھرنے کے خلاف تھا۔ خطرہ صرف یہ تھا کہ اگر پولیس نے ان کے ہاں اچانک چھاپہ مارا تو روبی کے ساتھ شیر خان بھی پکڑ لیا جائے گا۔ اس پر ایک مفرور قاتلہ کو اپنے ہاں چھپائے رکھنے کے جرم میں مقدمہ چل سکتا تھا۔ اسی روز رات کو روبی نے اپنی پیاری بچی عائشہ کو تھپک تھپک کر سلانے کے بعد شیر خان سے کہا۔

"آج رات بچی ہم نے اپنے پاس ہی رکھی ہے۔ مریم کو کہیں شک تو نہیں پڑے گا؟"

شیر خان بولا۔

"نہیں اس لئے کہ ایک دو بار پہلے بھی میں بچی کو رات کے وقت اپنے پاس لے آیا تھا۔"

روبی ابھی تک مردانہ شلوار قمیص میں ہی تھی۔ اس کے سر کے بال بڑھ رہے تھے۔ اس نے ایک نظر سوئی ہوئی معصوم بچی پر ڈالی اور شیر خان سے کہا

"شیرے! میرا خیال ہے ہم یہاں سے نکل کر کسی دور دراز پہاڑی علاقے میں جا کر آباد ہو جاتے ہیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں پولیس ہمارا تعاقب نہ کر سکے۔" شیر خان خوش ہو کر بولا۔

"یہ بات تو میں پہلے بھی تمہیں کئی بار کہہ چکا ہوں۔ پاکستان بہت بڑا ملک ہے۔ ہم ہنزہ کاغان کی وادیوں میں کسی جگہ چلے جائیں گے۔ وہاں کوئی بھی ہمیں نہیں پہچانے گا۔ مجھے کوئی نہ کوئی محنت مزدوری کا کام مل جائے گا۔"

روبی اپنی بچی کو اپنے ساتھ رکھنے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنے کی خاطر یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ اس کے سینے میں ممتا کے جذبات پوری شدت سے بیدار ہو گئے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ ہم وہاں جا کر کچھ وقت سکون سے گزار سکتے ہیں۔ اس

کے بعد دیکھا جائے گا۔ کم از کم ہم تینوں ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے تو رہیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" شیر خان خوش ہو کر بولا۔

"ہم کل ہی کراچی سے کاغان کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ مگر لاہور تک ہمیں الگ الگ سفر کرنا ہو گا۔ بچی کو میں اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ تم اسی ٹرین کے زنانہ ڈبے میں سفر کرو گی۔ میں صبح ہی معلوم کرتا ہوں کہ رات کے وقت کراچی سے کونسی گاڑی پنجاب کو جاتی ہے۔"

اس زمانے میں ایک ریل گاڑی کراچی سے لاہور رات کے پچھلے پہر چلا کرتی تھی۔ یہی گاڑی ان کے لئے مناسب تھی۔ روبی اور شیر خان نے اگلے روز سارا پروگرام طے کر لیا۔ شیر خان اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ جاتے ہوئے بچی کو وہ حسب معمول ہمسائی مریم کے حوالے کر گیا اور یہ بھی کہہ گیا کہ رات کو بچی میرے پاس بڑے سکون کے ساتھ سوئی تھی۔ اس لئے آج کی رات بھی میں اپنی بچی کو اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ مریم کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ شیر خان مکان کو تالا لگا گیا تھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ حالانکہ گھر میں روبی موجود تھی۔

دوسری طرف بدمعاش ہاشم شیر خان سے اپنے بھائی سہراب کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ اس سے کچھ اس طریقے سے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا کہ شیر خان اور اس کی مفرور بیوی کی آنے والی نسلیں بھی اسے یاد کر کے آنسو بہاتی رہیں۔ ورنہ اگر شیر خان کو قتل کرنا ہوتا تو یہ کام ہاشم جیسا بدمعاش اب تک سرانجام دے چکا ہوتا۔ اسے یہی خبر تھی کہ شیر خان کی بیوی روبی مفرور ہے اور شیر خان اپنی بچی کے ساتھ گھر میں اکیلا ہی رہتا ہے اور بچی کی دیکھ بھال ہمسائے میں مریم نام کی ایک عورت کر رہی ہے۔ ہاشم بدمعاش نے شیر خان سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کا باقاعدہ ایک منصوبہ تیار کیا اور جس روز روبی اور شیر خان اپنی بچی کو لے کر کراچی سے کاغان کی طرف فرار ہونے والے تھے اسی روز ہاشم نے بھی اپنے انتقامی منصوبے پر عمل درآمد کا پروگرام طے کر رکھا تھا۔ ہاشم نے اپنے آدمیوں کی مدد سے یہ پتا کروا لیا تھا کہ شیر خان کی بچی صبح

سے شام تک ہمسائی مریم کے پاس رہتی ہے۔ شیر خان رات کو سینما سے واپس آتا ہے تو بچی کو تھوڑی دیر کے لئے گھر لے آتا ہے اور دوبارہ مریم کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ اسی روز شام ہوتے ہی ہاشم نے اپنے آدمیوں کو تیار کر کے جیپ میں شیر خان کے محلے کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ کل چار آدمی تھے۔ انہوں نے گاڑی محلے کے باہر ایک طرف ویران جگہ پر کھڑی کر دی۔ دو آدمی گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ دو غنڈے مریم کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک غنڈہ گلی کے نکڑ پر ہی پستول لے کر نیم تاریکی میں کھڑا ہو گیا۔ دوسرا غنڈہ گلی میں آ گیا گلی اس وقت خالی تھی۔ شیر خان کی ہمسائی مریم کے مکان کی نشان دہی ہو چکی تھی۔ غنڈے کا ایک ہاتھ جیکٹ کی جیب میں تھا۔ اسی جیب میں پلاسٹک کی ایک تھیلی تھی۔ تھیلی کے اندر کلوروفارم سے بھیگا ہوا تربتر رومال بند تھا۔ جب یہ غنڈہ مریم کے مکان کے سامنے آیا تو اس نے جیب کے اندر ہی پلاسٹک کی تھیلی میں ہاتھ ڈال کر کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال مٹھی میں لے لیا۔

مریم کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازے کو دھکیلا۔ وہ کھل گیا۔ کوارٹر کا چھوٹا سا صحن خالی تھا۔ غنڈہ لپک کر کوٹھری والے دروازے پر آ گیا۔ یہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے مریم نے پوچھا۔

"کون ہے۔" غنڈے نے بڑی نرم آواز بنا کر کہا۔

"بہن جی! میں ہوں حکیم دین۔ شیر خان کے ساتھ سینما میں کام کرتا ہوں۔ شیر خان نے اپنی بچی کے واسطے یہ کھلونا بھیجا ہے۔ لے لیں۔" مریم نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔

جونہی اس نے دروازہ کھولا غنڈے نے جھپٹا مار کر مریم کو گردن سے دبوچا اور نیچے گرا لیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ میں کلوروفارم والا رومال ٹھونس دیا۔ مریم کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ اسنے دو چار لمبے لمبے سانس لیے اور بے ہوش ہو گئی۔ غنڈے کو جب اطمینان ہو گیا کہ مریم بالکل بے ہوش ہو چکی ہے تو وہ شیر خان کی بچی کی طرف متوجہ ہوا جو چھوٹی سی پلنگڑی پر بڑے معصوم انداز میں اپنے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ غنڈے نے اسے اٹھا کر چادر میں لپیٹا اور بڑے اطمینان سے گلی سے گزرتا جیپ کی طرف آ گیا۔ اس کا ساتھی

غنڈہ جو گلی کی نکڑ پر پہرہ دے رہا تھا اب اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ بچی کو جیپ میں ڈالتے ہی جیپ وہاں سے تیزی سے نکلی اور بڑی سڑک پر آتے ہی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

شیر خان کے گھر میں اس وقت روبی موجود تھی اور پلنگ پر لیٹی سوچ رہی تھی کہ وہ رات کے بارہ بجے گھر سے نکل کر ریلوے اسٹیشن پہنچ جائے گی۔ شیر خان کو رات تین بجے نکلنا ہو گا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ سر پر صافہ باندھ لے گی۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ مریم کے ہاں سے ہاشم کے آدمی اس کی بچی کو اغوا کر کے لے جا چکے ہیں مریم کوٹھری کے فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ ہاشم بدمعاش کے آدمی کوئی ڈاکٹر تو تھے نہیں۔ انہیں کیا پتا تھا کہ مریم کو کتنا کلوروفارم سنگھانا ہے انہوں نے رومال تر کر کے دیر تک اس کی ناک اور منہ پر دبائے رکھا تھا جس کی وجہ سے مریم ضرورت سے زیادہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہ نیم مردہ حالت میں تھی۔ گلی میں باہر خاموشی تھی۔ شیر خان سینما ہاؤس میں نو بجے والا شو چلا کر پیٹ میں درد کا بہانہ بنا کر گھر واپس آ گیا۔ روبی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ شیر خان بازار سے نان کباب لیتا آیا تھا۔ کیونکہ چولہا جلانے کے لئے روبی مکان کے صحن میں نہیں جاتی تھی۔ روبی نے شیر خان کے آتے ہی کہا۔

"تم مریم کے ہاں جا کر میری عائشہ کو لے آؤ۔"

پروگرام یہی تھا کہ روبی اپنی بچی کو لے کر پہلے نکل جائے گی اور اسٹیشن کے تھرڈ کلاس والے کھلے ویٹنگ روم میں شیر خان کا انتظار کرے گی۔ شیر خان کو رات بارہ بجے کے بعد گھر سے نکلنا تھا۔ انہوں نے سارا انتظام کر لیا تھا۔ صرف روبی کے پاس پستول اور گولیاں تھیں۔ شیر خان کے پاس پستول وغیرہ نہیں تھا۔ وہ اپنے پاس کوئی اسلحہ رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا شیر خان نے کہا۔

"پہلے نان کباب کھاتے ہیں۔ پھر میں مریم کے ہاں جا کر بچی کو لے آؤں گا۔ ساتھ ہی تو اس کا گھر ہے۔"

دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ اس وقت رات کے سوا دس بج رہے تھے۔

شیر خان مریم کے گھر کی طرف گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دے کر مریم بہن کہہ

کر آواز دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ شیر خان نے دروازے کو ذرا سا ٹھوکا دیا تو وہ کھل گیا۔ دروازہ اندر سے بند کیوں نہیں؟ شیر خان نے ایک بار پھر مریم کو آواز دی۔ جب تین چار مرتبہ بلانے پر بھی اندر سے کسی نے جواب نہ دیا تو شیر خان صحن میں آ گیا۔ کوٹھری کا دروازہ بھی تھوڑا سا کھلا تھا اور اندھیرا چھایا تھا۔ مریم نے بتی بھی نہیں جلائی تھی۔ شیر خان کے دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ وہ کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ تاریک فضا میں اسے کلوروفارم کی ہلکی ہلکی ناگوار سی بو محسوس ہوئی۔ شیر خان حیران ہوا کہ یہ کس قسم کی بو ہے اور مریم کہاں ہے؟ اس کی بچی کہاں ہے؟ اس نے دیوار کو ٹٹول کر بتی جلائی تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ فرش پر مریم بے ہوش پڑی تھی اور بچی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ شیر خان نے جلدی سے مریم کو ہوش میں لانے کے واسطے گھڑے میں سے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ مریم کو کچھ ہوش آ گیا۔ شیر خان نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا ہوا مریم؟ بچی کہاں ہے" مریم سر پکڑ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے سہمی ہوئی خشک آواز میں شیر خان کو بتایا۔

"ایک آدمی اس کی کوٹھری میں آیا۔ اس نے اسے کچھ سنگھایا اور بچی کو اٹھا کر لے گیا۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔" مریم روتے ہوئے شیر خان سے معافی مانگنے لگی کہ وہ اس کی بچی کی حفاظت نہیں کر سکی۔

شیر خان تو جیسے سکتے میں آ گیا۔ اس کی بچی کو کون اغوا کر سکتا ہے؟ ہاشم ...... ہاں ہاشم ہی اس کا دشمن ہے۔ یہ کام سوائے اس کے دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ شیر خان کی وہاں سوائے ہاشم بدمعاش کے اور کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ اس نے مریم سے آدمی کا حلیہ پوچھا۔ مریم نے کہا۔

"اس کی مونچھیں تھیں۔ اس نے منڈا سا باندھ رکھا تھا۔" یہ کہہ کر مریم نے نقاہت سے اپنا بوجھل سر چارپائی کی پٹی سے لگا دیا۔

شیر خان نے مریم کو سہارا دے کر چارپائی پر لٹایا اور کہا۔

"مریم بہن؟ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں میری بچی کو کون لے گئے

ہیں۔ تم اپنی زبان بند رکھنا۔" یہ کہہ کر شیر خان اپنے مکان میں آ گیا۔ روبی نے شیرے کو خالی ہاتھ آتے دیکھا تو پوچھا۔

"کیا بات ہے عائشہ کو کیوں نہیں لائے؟" شیر خان کا چہرہ پتھر کی طرح ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہماری بچی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔" روبی کو یوں لگا جیسے اس کے جسم کے اندر ایک دھماکہ سا ہوا ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے کی رگیں تن گئیں۔

"کیا کیا کہہ رہے ہو؟" شیر خان نے دونوں ہاتھوں سے روبی کے کندھوں کو تھام لیا اور اسے چارپائی پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

روبی! تم بیٹھو۔ بیٹھ جاؤ۔ یہ کام ..... یہ کام ہاشم کا ہے۔ اسی کے آدمی مریم کو بے ہوش کر کے ہماری بچی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ بس ..... سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" شیر خان پھنکار رہا تھا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔

روبی ایک دم سے خاموش ہو گئی تھی۔ شیر خان پنجرے میں بند شیر کی طرح کوٹھری میں چکر لگا رہا تھا۔ روبی نے صدری میں ہاتھ ڈال کر پستول کو اپنی مضبوط گرفت میں لیا چارپائی سے بظاہر بڑے اطمینان سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ شیر خان نے تڑپ کر پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" روبی نے ہاتھ سے دھکا دے کر شیر خان کو چارپائی پر گرا دیا اور غراہٹ نما آواز میں بولی۔

"میرے پیچھے مت آنا شیرے۔ اب میرا اور ہاشم کا مقابلہ ہے۔ گیدڑ شیرنی کے بچے کو اٹھا لے جائے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر روبی چھلانگ لگا کر کوٹھری سے صحن میں آئی اور پھر صحن کا دروازہ کھول کر گلی کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

شیر خان روبی کے پیچھے دوڑا مگر گلی رات کے وقت دور تک خالی تھی وہ اسے آواز بھی نہیں دے سکتا تھا وہ دوڑتا ہوا اس جگہ آیا جہاں بڑی سڑک گزرتی تھی روبی وہاں بھی نہیں تھی۔ شیر خان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اسے اتنا احساس تھا کہ روبی ہاشم کے ڈیرے پر ہی گئی ہے۔ یہ شہر کے سب سے بدنام ترین اور خطرناک غنڈوں کا ڈیرا تھا روبی کا اکیلے وہاں جانا کسی حالت میں بھی ٹھیک نہیں تھا۔ شیر خان کو ہاشم بدمعاش کے ڈیرے کا پتا نہیں تھا سینما میں ایک گیٹ کیپر تھا جسے ہاشم کے ڈیرے کا علم تھا وہ وہاں کبھی کبھی جاتا رہتا تھا شیر خان نے مکان کو تالا لگایا اور سینما کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اسے وہاں کوئی رکشا ٹیکسی نظر نہ آئی۔ وہ پیدل ہی چل پڑا۔

اس وقت روبی مردانہ حلیئے میں ایک رکشے میں سوار تھی اور رکشا دارا کے گیراج والے مکان کی طرف جا رہا تھا روبی بخشو چاچا سے ہاشم کے ڈیرے کا پتا معلوم کرنا چاہتی تھی۔ روبی نے رکشے والے کو دارا کے گیراج کے قریب ہی ایک طرف کھڑا رہنے کو کہا اور خود گیراج کے چھوٹے سے احاطے میں آ گئی۔ سامنے ایک بیٹھک تھی جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ روبی نے دروازے پر جا کر بخشو کو آواز دی۔ بخشو نے ابھی ابھی چائے بنائی تھی اور چارپائی پر بیٹھا مزے سے پی رہا تھا۔ آواز سن کر باہر آ گیا کمرے سے آتی روشنی میں اس نے مردانہ حلیئے میں بھی روبی کو پہچان لیا۔

"بیٹی تم! اندر آ جاؤ۔" روبی نے کہا۔

"اندر بیٹھنے کا میرے پاس وقت نہیں ہے مجھے ہاشم بدمعاش کے ڈیرے کا پتا بتا دو بس میں صرف اسی کام کے لئے تمہارے پاس آئی ہوں۔" بخشو سمجھ گیا کہ روبی آگ میں

چھلانگ لگانے کا فیصلہ کر کے نکلی ہے اس نے پوری طرح روبی کو ہاشم کے ڈیرے کا پتا سمجھا دیا جب روبی جانے لگی تو بخشو نے کہا۔

"بیٹی! ایک بار پھر سوچ لو تم اکیلی ہو۔"

روبی نے گردن موڑ کر بخشو کو دیکھا اور کہا۔

"شیرنی اکیلی ہی ہوتی ہے۔"

ہاشم بدمعاش کا ڈیرا کراچی شہر کے مشرق میں ایک غیر آباد علاقے میں واقع تھا۔ کراچی ابھی اپنی حدود سے باہر نہیں نکلا تھا ایک دو اضافی بستیاں زیر تعمیر تھیں۔ ہاشم کا ڈیرا ایک چھوٹے سے احاطے میں تھا جس کے پیچھے دو تین چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ روبی نے کچی سڑک پر رکشا چھوڑ دیا خود اتر کر دور ہی سے ہاشم کے ڈیرے پر ایک نظر ڈالی۔ احاطے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اندر سامنے کی جانب دو تین کمرے تھے جن میں سے ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ باہر بھی ایک جانب بجلی کا بلب دیوار کے ساتھ جل رہا تھا جس کے نیچے تخت پر کچھ لوگ بیٹھے شاید شغل مے نوشی کر رہے تھے کیونکہ ان کے بے ہنگم قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

روبی نے پستول کو چیک کیا پستول میں پورا میگزین تھا۔ اس نے پستول واپس صدری کی جیب میں رکھ لیا اور ڈیرے کے احاطے کی طرف بڑھی۔ ایک نوجوان سا لڑکا احاطے سے باہر نکل رہا تھا۔ روبی نے اسے بلا کر کہا۔

"بھائی! میرا نام صمد خان ہے میں مردان سے آیا ہوں۔ مجھے بخت خان نے بھیجا ہے۔ مجھے ہاشم سے ملنا ہے۔ وہ کہاں ملے گا۔ بخت خان نے سودے کے بارے میں ایک ضروری پیغام دیا ہے جو صرف ہاشم کو ہی دینا ہے۔"

اس دبلے پتلے نوجوان نے روبی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا وہاں زیادہ روشنی نہیں تھی روبی نے وہی ملیشئے کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ شانوں پر چادر لپیٹی ہوئی تھی۔ روبی نے کہا۔"بھائی! مجھ پر شک کرنے کی ضرورت نہیں میں بخت خان کا بیٹا ہوں اور اب کراچی میں ہی مال سپلائی کرتا ہوں۔" شمال سے ہاشم کے ڈیرے پر مال آیا ہی کرتا تھا۔ نوجوان نشے میں نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"ہاشم تو اس وقت ڈیرے میں نہیں ہے۔"

روبی نے پوچھا۔"تو بھائی مجھے بتا دو وہ کہاں ہے۔ اس وقت اس کا ملنا بہت ضروری ہے میں صبح پہلی گاڑی میں واپس مردان جا رہا ہوں۔"

نوجوان بولا۔"ہاشم تمہیں اس وقت مال گودام والے ڈیرے پر ہی ملے گا۔ وہ دوپہر کو ہی وہاں چلا گیا تھا۔"

روبی نے مال گودام والے ڈیرے کا پتا اچھی طرح سے پوچھا اور پھر سلام کر کے واپس مڑ گئی۔

ریلوے مال گودام وہاں سے قریب ہی لاہور جانے والی ریلوے لائن کے پار ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے عقب میں تھا۔ نوجوان کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق روبی نے پیدل ہی ایک سنگلاخ سا میدان عبور کیا اور ریلوے لائن کے پار پہنچ گئی۔ چھوٹے سے اسٹیشن کے سگنل کی لال بتی روشن تھی۔ لڑکے نے بتایا تھا کہ ریلوے اسٹیشن کے مال گودام کی بائیں جانب ڈھلانی کچا راستہ ہے۔ یہاں سے اتر کر ریلوے کے تین چار کوارٹروں کی ایک قطار ملے گی جو خالی پڑے ہیں ان میں سے کونے والے کوارٹر میں ہاشم ملے گا۔ ہاشم بدمعاش کا یہ کوئی خفیہ ٹھکانہ نہیں تھا ابھی پاکستان کو قائم ہوئے چند سال ہی گزرے تھے اور حکومت مہاجرین کی آبادکاری اور نئی مملکت کے دیگر مسائل میں مصروف تھی ان جرائم پیشہ لوگوں کی طرف پوری توجہ نہیں دی تھی۔ ہاشم نے ان کوارٹروں میں چرس اور شراب کا اسٹاک رکھا ہوا تھا۔ روبی کو یقین تھا کہ ہاشم نے اس کی بچی کو بھی اسی جگہ کسی کوارٹر میں رکھا ہو گا۔ کوارٹروں کے باہر ایک جیپ کھڑی تھی اور یہاں اندھیرا تھا کونے والے کوارٹر کی دیوار پر جو کمزور سا بلب جل رہا تھا اس کی روشنی بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچ رہی تھی۔

روبی بڑی احتیاط سے چلتی کوارٹروں سے چند قدموں کے فاصلے پر آ کر ایک طرف مٹی کے تودے کی آڑ لے کر بیٹھ گئی وہ بڑے غور سے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ ریلوے کے پرانے کوارٹر تھے جن کا صرف ایک چھوٹا سا آنگن اور ایک ہی کمرہ ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ بنے ہوئے تین کوارٹر تھے سامنے کی جانب کوئی روشندان نہیں تھا جس سے یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کس کوارٹر کے اندر روشنی ہو رہی ہے اور ہاشم موجود ہے۔

روبی پیچھے سے چکر کاٹ کر کوارٹروں کے پیچھے آگئی۔ جیپ کی موجودگی سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی کوارٹر میں آدمی موجود ہیں۔ پیچھے کوارٹروں کی دیوار ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھی۔ درمیان والے کوارٹر کے روشندان میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہاں ہر کوارٹر کی ایک ایک کھڑکی بھی تھی سبھی کھڑکیاں بند تھیں۔ روبی اس کوارٹر کی بند کھڑکی کے پاس آگئی جس کے روشندان میں سے ہلکی ہلکی روشنی باہر آرہی تھی اس نے بند کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر کچھ آدمی باتیں کر رہے تھے روبی نے بڑی کوشش کی مگر ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ پھر اچانک ایک آدمی نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

"ہاشم سیٹھ فکر ہی نہ کرو لڑکی میرے شہر والے مکان میں بالکل محفوظ ہے میں صبح ہوتے ہی اسے لے جا کر شمی نائیکہ کے حوالے کر دوں گا۔" اب ہاشم کی بھاری آواز سنائی دی اس نے پوچھا۔"وہ لڑکی کو سنبھال لے گی؟"

پہلے والے آدمی نے کہا۔"ہاشم سیٹھ وہ نائیکہ ہے لڑکیوں کو غائب کر کے انہیں طوائف کی ٹریننگ دینا ہی اس کا کام ہے وہ تو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دے گی۔ بس تم سمجھ لو کہ دس پندرہ سال بعد تمہارے بھائی کے قاتل کی بیٹی کوٹھے پر مجرا کر رہی ہو گی۔"

روبی کے کان سرخ ہو گئے۔ یہ لوگ اس کی بیٹی کو طوائف بنانے والے تھے۔ ہاشم بدمعاش روبی سے اس سے زیادہ بھیانک انتقام نہیں لے سکتا تھا۔ ہاشم کی بلند آواز گونجی۔

"بس میں یہ چاہتا ہوں۔ جس نے میرے بھائی کا خون کیا ہے میں اس کی نسل کو داغ دار کر دوں گا۔"

"اچھا ہاشم سیٹھ اب میں چلتا ہوں۔"

پہلے والے آدمی کی آواز بلند ہوئی۔

روبی کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی اس آدمی کے پاس ہے اور یہ صبح اسے کراچی کی کسی بدکار عورت کے حوالے کرنے والا ہے۔ روبی تیزی سے دوڑ کر کوارٹروں کے سامنے کی طرف آگئی جیپ اوپر سے بند تھی پیچھے بھی ترپال گری ہوئی تھی۔ وہ ترپال اٹھا کر جیپ کے اندر چلی گئی۔ جیپ میں کچھ چھوٹے کریٹ پڑے تھے اس نے دیوار کی جانب سے ترپال کو ذرا سا کھسکا کر دیکھا۔ ایک آدمی کوارٹر کے صحن والے دروازے سے نکل کر سگریٹ کا

دھواں اڑاتا جیپ کی طرف آرہا تھا۔ روبی نے ایک بہت بڑا خطرہ مول لے لیا تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ ایک کی بجائے اندر سے تین چار غنڈے باہر نکلتے ان میں سے دو غنڈے جیپ کے اندر ضرور سوار ہو جاتے۔ مگر روبی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ آدمی اکیلا ہی باہر نکلا۔

اسٹیئرنگ پر بیٹھتے ہی اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ ہیڈ لائیٹیں آن کیں اور جیپ غیر ہموار زمین پر ہچکولے کھاتی شہر کراچی کی طرف جانے والی سڑک کی طرف چل پڑی۔ روبی جیپ کے اندر دبک کر بیٹھی تھی۔ وہ سب سے پہلے اپنی بچی کو حاصل کرنا چاہتی تھی ہاشم بدمعاش کو ختم کرنا اس کے فرائض کا دوسرا مرحلہ تھا۔ جیپ پکی سڑک پر آتے ہی تیزی سے بھاگنے لگی۔ اس وقت آدھی رات ہونے والی تھی۔ سڑک سنسان تھی ویسے بھی کراچی شہر کی ٹریفک ابھی اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ روبی جیپ کے اندر کریٹوں کے پاس سیٹ پر اس طرح بیٹھی تھی کہ پستول اس کے ہاتھ میں تھا ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے جو کھڑکی تھی اس پر بھی ترپال گری ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ غنڈہ جو جیپ چلا رہا تھا روبی کو دیکھ نہیں سکتا تھا روبی ترپال ذرا سی اٹھا کر کسی وقت باہر سڑک پر نگاہ ڈال لیتی تھی۔

جیپ خالی سڑک پر اڑی چلی جا رہی تھی۔ شہر کی روشنیاں قریب آتی جا رہی تھیں جیپ سڑک پر دو تین جگہوں سے مڑی اب وہ ایک ویران سی سڑک پر جا رہی تھی روبی نے ترپال ہٹا کر باہر دیکھا دور سامنے دو چار روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ جیپ ان کی طرف ہی جا رہی تھی۔ جیپ نے اندھیرے میں ایک نصف دائرے کا چکر کاٹا اور ایک پرانے ایک منزلہ مکان کی دیوار کے پاس جا کر رک گئی روبی نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اسے غنڈے کے اترنے اور پھر مکان کے صحن کا دروازہ کھول کر اندر جانے کی آواز سنائی دی۔

روبی پیچھے کی طرف سے جیپ سے اتر آئی۔ مکان کے صحن میں اندھیرا تھا۔ وہ غنڈہ ایک کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ روبی صحن میں دبے پاؤں چلتی کوٹھری کے دروازے کے ایک جانب لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کان اندر کی آوازوں پر لگے تھے۔ وہ غنڈہ کوٹھری میں کسی عورت سے باتیں کر رہا تھا پھر اسے کسی بچی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ روبی کا دل زور سے دھڑک اٹھا اس کی ممتا بے قرار ہو گئی یہ اس کی بچی عائشہ کی آواز تھی وہ اپنی بچی کے رونے کی آواز کو پہچانتی تھی اس نے پستول والا ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا اور اپنے دل

سے کہا۔

"نہیں نہیں۔ بے تاب نہیں ہونا۔ محبت میں کمزوری نہیں دکھانی۔ اب ممتا کو شیرنی کی طرح دھاڑنا ہو گا۔ ماں کی ممتا بڑے دکھ سہہ چکی ہے۔ اب سینے کے اندر دل کو فولاد کا ٹکڑا بنانا ہے۔ اب ان ہاتھوں کو کاٹ کر پھینک دینا ہے جو ممتا کے گلشن میں آگ لگاتے چلے آئے ہیں۔"

کوٹھری کے اندر وہی غنڈہ اپنی بلند آواز میں کسی عورت سے کہہ رہا تھا۔

"یہ روتی کیوں ہے۔ نامراد؟ اسے دودھ نہیں پلایا؟" عورت کی آواز آئی۔ "پلایا تھا۔ مگر ماں کے بغیر تو بچہ روتا ہی ہے۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔" غنڈے نے اسے جھڑک کر کہا

"بس بس بک بک بند کرو۔ تھوڑی دیر آنکھ لگا لوں۔ صبح ہونے سے پہلے مجھے اسے یہاں سے لے جانا ہے۔" عورت نے کہا۔

"کیوں کسی کی بچی پر ظلم کر رہے ہو۔" اس کے ساتھ ہی طمانچے کی تیز آواز آئی۔ غنڈے نے عورت کو گالی دے کر کہا۔

"تم چاچی لگتی ہو میری جو مجھے نصیحتیں کرنے لگی ہو؟ حرامزادی کہیں کی۔ سلاؤ اس نامراد کو نہیں تو میں تم دونوں کا خون کر دوں گا۔"

اس کے بعد کوٹھری میں خاموشی چھا گئی۔

روبی نے سوچا کہ عورت نے عائشہ کے منہ میں ضرور چوسنی دے دی ہو گی وہ دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے لگی کہ وہ عین وقت پر پہنچ گئی اگر وہ گھر سے نہ نکلتی تو اس کی بیٹی اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہوتی۔ روبی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کوٹھری میں اس غنڈے کے سوا دوسرا کوئی غنڈہ نہیں ہے۔ اب ایکشن کا وقت آگیا تھا۔ روبی نے پستول کو ہونٹوں سے لگا کر چوما اور دروازے پر دستک دی اندر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پھر اسی غنڈے نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

روبی نے جواب دینے کی بجائے ایک بار پھر دروازے پر دستک دی۔ کسی نے اندر

سے کنڈی اتار کر غصے کے ساتھ دروازہ کھولا۔ سامنے وہی غنڈہ کھڑا تھا۔ جس کی جیپ میں بیٹھ کر روبی یہاں تک آئی تھی۔

روبی نے بازو بالکل سیدھا کر کے اوپر تلے تین فائر کیے تینوں گولیاں غنڈے کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ منہ کے بل گرا روبی جلدی سے ایک طرف ہو گئی۔ پھر لپک کر کمرے میں آ گئی۔ اندر ایک درمیانی عمر کی خوش شکل عورت دہشت زدہ ہو کر چارپائی پر بیٹھی روبی کو تک رہی تھی۔ اس چارپائی پر روبی کی بیٹی عائشہ چوسنی منہ میں لئے پڑی تھی گولیوں کے دھماکوں سے وہ ڈر کر رونے لگی تھی۔ روبی نے اپنی بچی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بولی۔

"تمہیں گولیوں کی آواز سے ڈرنا نہیں ہے میری شیرنی۔"

پھر سہمی ہوئی عورت سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"میں اس بچی کی ماں ہوں۔ مردانہ حلیہ میں نے یہاں تک پہنچنے کے لئے بنایا تھا۔ تم مت گھبراؤ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔" وہ عورت ہاتھ جوڑ کر بولی۔

تم نے ایک موذی سانپ کو مارا ہے خدا تمہارا بھلا کرے تم نے میری باقی ماندہ زندگی کو تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔"

اور وہ عورت چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔ روبی نے اسے حوصلہ دیا اور کہا۔

"تم جہاں جانا چاہو۔ میں باہر کھڑی جیپ میں تمہیں پہنچا دوں گی۔ مجھے گاڑی چلانی آتی ہے۔"

وہ عورت جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

خدا کے لئے مجھے تم صرف ریلوے اسٹیشن تک پہنچا دو۔ وہاں سے میں اپنے شہر چلی جاؤں گی۔ بچی ماں کے سینے کے ساتھ لگتے ہی چپ ہو گئی تھی۔ اس نے ماں کی گرمی کو محسوس کر لیا تھا۔ روبی نے اسے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ دروازے کے باہر غنڈے کی لاش اوندھی پڑی تھی۔ دونوں جیپ میں بیٹھ گئیں۔ روبی نے عائشہ کو اس عورت کی گود میں دے دیا اور جیپ اسٹارٹ کرنے سے پہلے پوچھا۔

"کیا ہاشم غنڈہ بھی یہاں آتا ہے؟"

itsurdu.blogspot.com

عورت نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ یہاں صرف ایک بار آیا تھا۔ اس کے بعد نہیں آیا۔ جس آدمی کو تم نے قتل کیا یہ نہ جانے کتنی عورتوں کی زندگی برباد کر چکا ہے اور کر رہا تھا۔ مجھے یہ رحیم یار خان سے اغوا کر کے لایا تھا۔"

روبی نے جیپ اسٹارٹ کی اور کراچی ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔

جب روبی اپنی بیٹی کے اغوا کا سن کر ہاشم بدمعاش کی تلاش میں گھر سے نکل کر سڑک کے اندھیروں میں نظروں سے اوجھل ہو گئی تو شیر خان نے اسے بہت تلاش کیا پھر سینما ہاؤس آکر خاص گیٹ کیپر سے ہاشم بدمعاش کے ڈیرے کا پتہ پوچھا اور ایک رکشا کر کے اس کے ڈیرے پہنچ گیا۔ اس وقت روبی وہاں سے جا چکی تھی۔ اور ڈیرے کے احاطے میں تخت پر جو غنڈے بیٹھے تھے مے نوشی کر رہے تھے۔ ان میں سے بھی دو تین جا چکے تھے اور صرف ایک آدمی بیٹھا جھوم رہا تھا شیر خان نے رکشا ذرا دور کھڑا کیا تھا۔ اتفاق سے شیر خان کو بھی وہی نوجوان لڑکا مل گیا جس نے روبی کو ہاشم کے بارے میں بتایا تھا۔ جب شیر خان نے بھی ہاشم کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کہاں ملے گا تو لڑکا محتاط ہو گیا۔ اس نے کہہ دیا کہ ہاشم سیٹھ تو حیدر آباد گیا ہوا ہے۔ پرسوں آئے گا۔ شیر خان نے اسے سچ سمجھا۔ لڑکے نے بھی بڑے یقین کے ساتھ کہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"یہاں کوئی ملیشیا کے سوٹ والا نوجوان تو نہیں آیا تھا۔ اس نے سلیٹی رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ لڑکا آخر بدمعاش کے ڈیرے کا تھا۔ سمجھ گیا کہ کوئی چکر ہے۔ کہنے لگا۔

"نہیں بھائی یہاں کوئی ملیشیا کا سوٹ والا لڑکا نہیں آیا تم اتنی رات گئے کہاں سے آ گئے ہو۔ جاؤ ہمیں آرام کرنے دو۔"

یہ کہہ کر وہ لڑکا کمرے کی طرف چل دیا اور تخت پر ادھر ادھر پڑے گلاس اور خالی بوتلیں اٹھانے لگا۔ شاید وہ اسی کام پر مامور تھا۔

شیر خان سوچ میں پڑ گیا کہ اگر روبی یہاں نہیں آئی تو کہاں گئی ہو گی۔ اس خیال سے وہ واپس گھر کی طرف روانہ ہوا کہ شاید روبی واپس آ گئی ہو اسے اپنی بچی کی بھی پریشانی تھی۔ مگر ہاشم حیدر آباد چلا گیا تھا یقیناً بچی کو کسی خفیہ جگہ چھپا گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے ساتھ ہی

لے گیا ہو وہ پہلے گھر جا کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ روبی واپس آئی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد وہ پولیس اسٹیشن جا کر بچی کے اغوا کی رپورٹ درج کرانا چاہتا تھا۔ اور پھر اپنے طور پر ہاشم کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ وہ سخت پریشان تھا۔ وہ دروازہ کھول رہا تھا کہ مریم نے اپنے مکان کے دروازے میں سے اسے آہستہ سے آواز دے کر بلایا۔ شیر خان بھاگ کر اس کے پاس گیا۔ مریم اسے اندر لے گئی۔ اور کہا۔

"تمہاری بچی مل گئی ہے۔"

کوٹھری کی چارپائی پر شیر خان کی بچی چوسنی منہ میں لئے گہری نیند سو رہی تھی۔ شیر خان نے لپک کر بچی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

"یہ کیسے آ گئی مریم بہن؟ اسے کون لایا؟"

شیر خان کے سوال پر مریم نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

"روبی بہن دے گئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے آئی تھی۔" شیر خان حیرانی سے مریم کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ خود کہاں گئی؟" مریم نے کہا۔

"کچھ بتا کر نہیں گئی۔ کہہ گئی تھی شیرے سے کہنا گھر سے کہیں نہ جائے میں جلدی واپس آ جاؤں گی۔" شیر خان نے بچی کو بستر پر لٹا دیا اور مریم سے کہا۔

"بہن اب تو بھی آرام کر ہمارے لئے تم نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں خدا تمہیں جزا دے گا۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

شیر خان بوجھل قدموں سے اپنے مکان میں واپس آ گیا۔ دروازہ بند کیا اور بستر پر اپنے آپ کو گرا دیا وہ بچی کے مل جانے پر خوش بھی تھا مگر روبی کے بارے میں اسے سخت پریشانی بھی تھی کہ وہ نہ جانے کہاں ہو گی کس حال میں ہو گی۔ مجھے اس کے ساتھ ہونا چاہئے تھا مگر سوائے صبر کر کے بیٹھ رہنے کے وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔

اس وقت رات کے پورے دو بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے، روبی کی جیپ بڑی تیز رفتاری سے سنسان سڑک پر دوڑتی ہوئی شہر سے باہر مضافاتی اسٹیشن کے کوارٹروں کی طرف

جا رہی تھی۔ روبی اپنے اس فرض کو پورا کرنے جا رہی تھی جواب اس کی زندگی کا واحد مقصد بن چکا تھا یہ مقصد پاکستان کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کی پاک فضا کو ان جرائم پیشہ تخریب پسند عناصر سے پاک کرنا تھا جو اسے اپنی انسان دشمن اور ملک دشمن گھناؤنی سرگرمیوں سے آلودہ کر رہے تھے۔ اس کا نشانہ ہاشم تھا ہاشم بدمعاش .... جو شہر کے جرائم پیشہ غنڈوں کا سربراہ تھا جو قانون کے ناموس کی دھجیاں اڑا رہا تھا جو انسانی تنظیم اور خاندانوں کی عزتوں کا ڈاکو تھا جس کی انسان دشمن سرگرمیوں کی وجہ سے اب تک نہ جانے کتنے گھروں کا سکون برباد ہو چکا تھا۔ روبی اس واسطے اسے ختم کرنے نہیں جا رہی تھی کہ ہاشم سے اسے شیر خان کی جان کا یا اپنی جان کو خطرہ تھا جان ہی ایک ایسی چیز تھی جس کی شیر خان اور روبی نے کبھی پروا نہیں کی تھی اور جب ملکی سالمیت پاکستان کے وقار اور قانون کے تحفظ کا مسئلہ درپیش ہو تو روبی اور شیر خان اپنی جان موت کے پاس گروی رکھ کر گھر سے نکلتے تھے۔

ہاشم بدمعاش ریلوے کوارٹروں سے کہیں نکل نہ گیا ہو۔ روبی جیپ میں بیٹھی یہی سوچ رہی تھی۔ جیپ اس نے ریلوے کراسنگ پار کر کے کچھ فاصلے پر ہی کھڑی کر دی۔ تھوڑے فاصلے پر ریلوے کوارٹر تھے جہاں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تیسرے کوارٹر کی دیوار کے کونے پر بجلی کا کمزور بلب روشن تھا۔ روبی نے پستول کھول کر میگزین پر ایک نگاہ ڈالی۔ میگزین میں ابھی کچھ گولیاں باقی تھیں۔ روبی نے برما اور ہانگ کانگ میں بڑے بڑے قاتل قسم کے اسمگلروں سے مقابلہ کیا تھا جو بات بعد میں کرتے اور پہلے گولی مارتے تھے۔ اس وقت تو روبی کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد نہیں تھا لیکن اب وہ ایک تعمیری مقصد لے کر یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ جب انسان کسی اعلیٰ اخلاقی سماجی یا دینی مقصد کے لئے سر پر کفن باندھ کر میدان کار زار میں نکلتا ہے تو اسے دشمن کی تعداد یا اس کا گولہ بارود اپنے سامنے ہیچ نظر آتا ہے۔

اصل شے مقصد کی عظمت ہے۔ اگر مقصد بلند اور عظیم ہے اور ذاتی مفاد سے بالا تر ہے تو پھر انسان کے سامنے پہاڑ بھی مٹی کی ڈھیری بن جاتے ہیں اور اگر مقصد دنیا اور دولت کا حصول ہے تو پھر دشمن کی مٹی کی ڈھیری بھی پہاڑ بن جاتی ہے۔ روبی جانتی تھی کہ وہ کوئی قوم کی اصلاح کرنے والی لیڈر یا کوئی مثالی کردار کی عورت نہیں ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسی گناہگار عورت کی ہے جس نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی تھی جو پاکستان کو اپنا گھر سمجھتی تھی اور جس نے اس گھر کی فضا کو اپنی جان کی قربانی دے کر بھی آلودگیوں سے پاک کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ پاکستان میں ایسی کئی لیڈر قسم کی عورتیں بھی تھیں جو نیک نیتی اور بڑی جانفشانی سے پاکستانی معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھیں۔ روبی نے بھی اسی نیک کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مگر روبی کو ایک یہ فائدہ حاصل تھا کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی نفسیات ان کے ہتھکنڈوں اور جوڑ توڑ سے واقف تھی اور اسٹیج پر تقریریں کرنے کی بجائے وہ بدمعاشوں کے ڈیروں پر جا کر بڑے سے بڑے سماج دشمن بدمعاش کو للکار سکتی تھی۔ خود بھی قتل ہو سکتی تھی اور دشمن کا سینہ بھی گولیوں سے چھلنی کر سکتی تھی۔

روبی اندھیرے میں بڑی احتیاط سے چلتی اس کوارٹر کے پیچھے آ گئی جہاں اس نے ہاشم کو باتیں کرتے سنا تھا۔ کوارٹر کی کھڑکی بند تھی۔ روشندان میں بھی اندھیرا تھا۔ یا تو اندر ہاشم سو گیا تھا یا وہاں کوئی نہیں تھا۔ روبی نے سوچا کہ کوارٹر کے دروازے کی طرف چل کر دیکھنا چاہیے۔ کہ وہاں تالا تو نہیں لگا ہوا۔ وہ واپس مڑنے ہی لگی تھی کہ کسی نے پیچھے سے پستول کی نالی اس کے سر کے ساتھ لگا دی اور گرج دار آواز میں پوچھا "کون ہو تم؟"

اس وقت روبی کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ آدمی یہ پستول نہ دیکھ سکا تھا۔ روبی نے پستول صدری کی جیب میں ڈالنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو آدمی نے تحکمانہ انداز میں کہا "خبردار جو حرکت کی۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ اور ہاتھ اوپر اٹھا لو۔"

روبی نے کہا "میں مردان سے ہاشم سیٹھ کے لئے بخت خان کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ میں اس کی تلاش میں تھا۔" آدمی بولا

"بکواس بند کرو۔ مردان میں کوئی بخت خان نام کا ہمارا آدمی نہیں ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھاؤ نہیں تو میں گولی چلا دوں گا۔" اس کے پستول کی نالی روبی کی کھوپڑی کے پیچھے بالکل ساتھ لگی تھی۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ اس آدمی نے جلدی سے روبی کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور حکم دیا کہ اٹھ کر آگے آگے چلو۔

وہ روبی کو پستول کی نوک پر چلاتا کوارٹر کے دروازے کی طرف لے آیا۔ یہاں دیوار پر لگے بلب کی روشنی میں اس نے غور سے روبی کو دیکھا اور پھر اس کے سینے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"حرامی عورت ہو اور مردانہ کپڑے پہن کر جاسوسی کرنے آئی ہو؟"

روبی نے اس کا ہاتھ پیچھے جھٹک دیا۔ اب وہ آدمی ہوسناک نظروں سے روبی کا جائزہ لے رہا تھا۔

"اگر تم مجھے صاف صاف بتا دو کہ تم کون ہو اور یہاں تمہیں کس نے بھیجا ہے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

روبی بڑی گہری نظروں سے اس آدمی کو دیکھ رہی تھی جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ جسم مضبوط تھا اور عمر تیس پینتیس کے قریب تھی۔ روبی مسکرائی اور غنڈے کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پنجابی زبان میں کہنے لگی۔

"میں تو صرف تمہارے درشن کرنے آئی تھی میری جان!" مونچھوں والا غنڈہ مکار ہنسی ہنسا اور روبی کو گندی گالی دے کر بولا۔

"تمہیں تو میں ایسے درشن کراؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گی۔"

اس غنڈے پر جب یہ بھید کھلا کہ اس کے سامنے ایک دبلی پتلی عورت ہے تو وہ اس کی طرف سے قدرے بے احتیاط ہو گیا اور اس نے پستول بھی اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ جس دبلی پتلی عورت کے سامنے کھڑا ہے وہ ہانگ کانگ کے سب سے بڑے جوڈو کراٹے کے ماہر چینی استاد سے تربیت لے چکی ہے اور اب تک کتنے ہی جرائم پیشہ پاکستان دشمن تخریب کاروں کو ٹھکانے لگا چکی ہے۔ روبی نے بھی جب دیکھا کہ غنڈے نے اسے محض کمزور عورت جان کر پستول جیب میں رکھ لیا ہے تو وہ دل میں ہنس دی کہ یہ کس قدر نادان ہے۔ اسے خبر ہی نہیں کہ عورت اب کمزور نہیں رہی۔ اس نے اپنے اندر کی بلاخیز قوت کو پھر سے بیدار کر لیا ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی چٹان کو اپنے عزم اور ارادے کی طاقت سے ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔ غنڈے پر اب ہوس کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ روبی کو ایسے درندہ صفت انسانوں سے بھی نفرت تھی جو عورت کو محض ہوس کاری کا

ذریعہ جانتے تھے۔ عورت .... جس کے قدموں میں خدا نے جنت رکھ دی تھی۔ جس کی گود میں شرم و حیا اور بلند ترین انسانی اخلاق کی قدریں پرورش پاتی تھیں۔ روبی کا حلق یوں کڑوا ہو گیا جیسے کسی نے اس کو زبردستی زہر پلا دیا ہو۔

غنڈے نے روبی کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا مگر اصل میں اس نے اپنی موت کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ روبی کا سیدھا ہاتھ آزاد تھا۔ غنڈے کی طرف کھینچتے ہی روبی نے کہنی سے کلائی تک کا اپنا بازو غنڈے کی ٹھوڑی کے نیچے حلق کے باہر کو نکلی ہوئی ہڈی پر اتنی تیزی سے مارا کہ غنڈے کا سانس رک گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن پکڑ کر لڑکھڑایا۔ اتنی دیر میں روبی نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ اس نے غنڈے کو سنبھلنے کی مہلت نہ دی اور ایک زبردست فلائینگ کک اس کے حلق پر ماری۔ غنڈہ دھڑام سے پیچھے گر پڑا۔ روبی نے پستول اس کی کنپٹی پر رکھ دیا اور پوچھا

"ہاشم سیٹھ کہاں ہے؟ میں تمہیں صرف تین سیکنڈ کی مہلت دیتی ہوں۔ ایک دو....."

اس سے پہلے کہ روبی تین کہے غنڈے نے خر خر کرتی آواز میں کہا۔

"بتاتا ہوں.......بتاتا ہوں۔"

پھر اس نے روبی کو بتایا کہ ہاشم سیٹھ ریلوے لائن کے پار وہاں سے ڈیڑھ فرلانگ دور ٹیلوں کو جاتی کچی سڑک پر ٹرکوں سے مال اتروانے گیا ہے۔ روبی نے غنڈے کو حکم دیا کہ اٹھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔ جب غنڈہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا تو روبی نے پستول کی نالی اس کی کھوپڑی کے بالکل قریب لا کر فائر کر دیا۔ ایک دھماکہ ہوا اور گولی غنڈے کو منہ کے بل گراتی ہوئی اس کی کھوپڑی سے پار نکل گئی۔ روبی نے اس کی جیب سے پستول نکال کر دیکھا۔ وہ ریوالور گولیوں سے پورا بھرا ہوا تھا۔ روبی نے اسے اپنے قبضے میں کیا اور جیپ کی طرف چل دی جسے وہ ریلوے لائن کے پاس نیچے ڈھلان میں کھڑی کر آئی تھی۔ اس غنڈے سے روبی نے ہاشم کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لی تھیں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ وہ جیپ اسٹارٹ کر کے رات کے اندھیرے میں ایک طرف روانہ ہو گئی۔

آسمان پر پچھلے پہر کی ہلکی نیلی روشنی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ روبی دن کی روشنی

نکلنے سے پہلے ہاشم غنڈے جیسے ناسور کو بھی کاٹ کر پھینک دینا چاہتی تھی کیونکہ یہی وہ گنجان درخت تھا جس کے سائے میں قسم قسم کے جرائم اور قانون شکن سرگرمیاں پرورش پا رہی تھیں۔ کوئی ڈیڑھ فرلانگ کے بعد بائیں جانب چھوٹی چھوٹی سیاہ رنگ کی خشک پہاڑیوں کے خاکے نظر آئے۔ روبی نے جیپ کی رفتار بہت ہلکی کر دی تا کہ اس کے انجن کی آواز کم سنائی دے۔ اچانک اسے کسی ٹرک کے انجن کی گڑگڑ سنائی دی۔ ٹرک اسٹارٹ کیا جا رہا تھا۔ روبی نے جلدی سے بریک لگائی۔ پھر تھوڑا سا گھما کر جیپ ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑی کر کے چھلانگ لگا کر اتری' دوڑ کر ٹیلے کے کونے تک گئی اور دوسری طرف دیکھا۔ صبح کاذب کی ہلکی نیلی روشنی میں اسے تھوڑے فاصلے پر ایک ٹرک اور ایک جیپ کھڑی دکھائی دی۔ دو تین انسانی سائے بھی حرکت کر رہے تھے۔ ٹرک کا انجن بند ہو گیا۔ کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"سردارے! یہ اب اسٹارٹ نہیں ہو گا۔ اسے یہیں کھڑا رہنے دے اور میرے ساتھ ڈیرے چل کر آرام کر۔ صبح دیکھی جائے گی۔"

یہ ہاشم سیٹھ کی آواز تھی۔ روبی اس آواز کو اچھی طرح سے پہچانتی تھی۔ دوسری آواز بلند ہوئی۔

"ہاشم سیٹھ تو مال ایک بار پھر چیک کر لے۔ میں اسے ابھی ٹھیک کیے دیتا ہوں۔ مجھے آج ہی کراچی سے نکل جانا ہے۔"

روبی کھسکتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ ریوالور اس کے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک جگہ خشک اونچی گھاس کی آڑ لے کر بیٹھ گئی اور غور سے جائزہ لینے لگی۔ اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے ٹرک کا بونٹ اٹھائے ایک آدمی اس پر جھکا مرمت کر رہا تھا۔ دو آدمی جیپ پر رکھے ہوئے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کریٹ گن رہے تھے۔ ایک دراز قد بھاری بدن والا آدمی ان کے پاس کھڑا انہیں کہہ رہا تھا۔

"دھیان سے چیک کرو مال' کوئی بے اعتباری نہیں ہے۔ پھر بھی مال پورا ہونا چاہیے۔"

ان کریٹوں میں چرس بھری ہوئی تھی۔ کیونکہ ابھی تک ہیروئن کی وبا نہیں پھیلی تھی

اور صرف افیون چرس اور کوکین کی اسمگلنگ ہوتی تھی اور پاکستان کے شہروں اور دیہات میں بھی انسان دشمن عناصر یہی منشیات خفیہ طور پر نوجوانوں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ یہ کل چار آدمی تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا سورج سے پہلے کی پھیکی پھیکی سفید روشنی پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا روبی کو یہ فائدہ ہوا تھا کہ وہ اپنے نشانے کو ٹھیک طور پر دیکھ سکتی تھی۔ اتنے میں ٹرک اسٹارٹ ہو گیا۔ جو آدمی اس کے انجن پر جھکا ہوا تھا اس نے بونٹ گراتے ہوئے کہا۔

"ہاشم سیٹھ انجن تو چل پڑا۔ اب ہم بھی چلتے ہیں۔" پھر اسی آدمی نے کسی کو آواز دی۔ جو دو آدمی جیپ پر لدا ہوا مال چیک کر رہے تھے ان میں سے ایک آدمی ٹرک کی طرف آ گیا۔ ہاشم نے ہنس کر کہا۔

"اچھا یارا۔ بابو کو میرا سلام کہنا۔ رقم سنبھال کر رکھ لی ہے ناں؟" ڈرائیور ٹرک میں بیٹھ گیا تھا۔ وہیں سے اونچی آواز میں بولا۔

"فکر نہ کرو ہاشم سیٹھ۔ روز کا کام ہے۔" ٹرک وہاں سے چل دیا۔

اب وہاں ہاشم بدمعاش اور اس کا ساتھی رہ گیا تھا۔ ہاشم کے گلے میں پستول کی پٹی اب روبی کو صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے آدمی کو گالی دے کر کہا۔

"اب بس کر جانی۔ چل بیٹھ گاڑی میں دن نکل رہا ہے۔"

روبی کو جو کچھ بھی کرنا تھا اسی وقت کرنا تھا ورنہ شکار اس کے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ جانی غنڈہ جیپ پر ترپال ڈال کر اس کے چھلے ہکوں میں پھنسانے لگا۔ روبی زمین پر پیٹ کے بل رینگتی جیپ کی طرف سرکنے لگی۔ وہ ان دونوں بدمعاشوں میں سے کسی ایک کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایک دم حملہ کرنے والی تھی۔ دن کی روشنی اتنی ضرور ہو گئی تھی کہ روبی کو زمین پر رینگتے دیکھا جا سکتا تھا۔ زمین کی اونچی نیچی سطح زرد خشک گھاس کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں روبی کو چھپنے میں مدد دے رہی تھیں۔ وہ جیپ کے عقب میں آ کر رک گئی۔ جانی غنڈہ ترپال کو ٹھیک طرح سے جماتے جونہی جیپ کے پیچھے آیا روبی نے خونخوار شیرنی کی طرح پیچھے سے اچھل کر غنڈے کو اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ ہاشم دوسری طرف کھڑا جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اسے کچھ آواز

سنائی دی اس نے جانی کو آواز دی۔

"اوئے ادھر کیا کر رہا ہے تو حرامی؟"

مگر اتنی دیر میں روبی غنڈے کی گردن کا منکا توڑ چکی تھی اور جب ہاشم لپک کر جیپ کے پیچھے آیا تو روبی ریوالور تانے سامنے کھڑی تھی۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا کہ جیسے کوئی انجانا مسافر جنگل میں چل رہا ہو اور ایک درخت کے پیچھے سے نکل کر آگے آئے تو سامنے شیرنی کھڑی اسے خونخوار آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔ ہاشم نے مردانہ میں بھی شیر خان کی بیوی روبی کو پہچان لیا تھا۔ اس کا عیار دماغ تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ موت سامنے تھی۔ پیٹی میں سے پستول نکالنے کی مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ یہاں مکاری سے کام نکالنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہاشم بھی روبی کے دہشتناک ماضی اور اس کی خوفناک بیک گراؤنڈ سے واقف نہیں تھا۔ وہ اسے ایک نازک اندام عورت ہی سمجھ رہا تھا جو مردانہ لباس پہن کر اپنی بچی کی تلاش میں وہاں آگئی تھی۔ لیکن ایک خیال ہاشم کو ضرور پریشان کرنے لگا تھا کہ جیپ کے پاس جانی کی لاش پڑی تھی جب کہ وہاں پستول چلنے کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔ ہاشم نے اپنی طرف سے بڑی شفقت کے ساتھ کہا۔

"بی بی! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میرے آدمی سے غلطی ہو گئی ہے۔ تمہاری بچی تمہاری امانت ہے ابھی چل کر لے لو۔"

روبی نے اپنے خاص انداز میں بازو بالکل سیدھا کیا ہوا تھا اور ریوالور کا رخ ہاشم کے سینے کی طرف تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں ہاشم بدمعاش کی آنکھوں میں ڈال رکھی تھیں۔ صبح ہو گئی تھی چاروں طرف سنہری روشنی پھیل رہی تھی۔ ہاشم کا شیطانی چہرہ روبی کو صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

"میری بچی میرے پاس ہے۔"

ہاشم اندر سے حیران رہ گیا کہ یہ عورت بچی کیسے واپس لے گئی۔ اوپر سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"تو پھر اب جھگڑا کس بات کا ہے؟" روبی ایک پل کے لئے بھی ہاشم کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا رہی تھی۔ اس نے زہر بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"جھگڑا ہی ختم کرنے تو آئی ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی اس کے ریوالور نے یکے بعد دیگرے دو شعلے اگلے دو دھماکے ہوئے۔ ایک گولی ہاشم کے سینے میں دل کے پاس لگی اور دوسری گولی اس کے گرتے ہوئے سینے سے ذرا اوپر حلق کے پاس لگی وہ گرا۔ گرتے ہوئے بھی اس نے اپنی پیٹی میں لگا پستول نکالنے کی کوشش کی مگر روبی کی تیسری گولی نے اس کا کام تمام کر دیا۔ تیسری گولی روبی نے اس بدمعاشوں کے سرغنہ کے سر پر بڑے قریب سے فائر کی تھی جس نے اس کا وہ مغز کھوپڑی توڑ کر باہر پھینک دیا تھا جہاں جرائم کے گھناؤنے منصوبے پرورش پایا کرتے تھے اور جن منصوبوں کی وجہ سے نہ جانے کیسے کیسے گھروں کے روشن چراغ بجھ چکے تھے۔

روبی نے جلدی سے جیپ کا بونٹ کھول کر اندر شیشے کی گول نلکی کو توڑ ڈالا جس کا پٹرول انجن پر پھیل گیا۔ روبی نے ہاشم کی لاش کی جیب سے لائٹر نکال کر کپڑے کے ٹکڑے کو آگ لگائی اور انجن میں پھینک دیا۔ پٹرول نے آگ پکڑ لی۔ روبی کو لاشیں چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے کسی جرائم پیشہ بدمعاش اور تخریب کار کی لاش کو نہیں چھپایا تھا۔ ہاں اتنا ضرور کیا کہ ہاشم کی لاش کو بھی کھینچ کر جیپ کے پہیے کے قریب ڈال دیا۔ انجن نے آگ پکڑ لی تھی اور اس کا ایک شعلہ جیپ کی ترپال کو جلانے لگا تھا۔ روبی اپنا کام کر چکی تھی۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ٹیلے کی اوٹ میں آگئی۔ یہاں اس کی جیپ کھڑی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ جیپ پر سوار کراچی سٹی کے ریلوے اسٹیشن کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔ وہ دن ریلوے اسٹیشن کے ماحول میں گزارنا چاہتی تھی اور رات کا اندھیرا چھا جانے پر شیر خان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اپنی پیاری بیٹی کی طرف سے اسے اب کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ شیر خان کے پاس محفوظ تھی اور اس کو اغوا کرنے والے اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے تھے۔ اسٹیشن کو روبی نے اس لئے منتخب کیا تھا کہ وہاں ہروقت مسافروں کا ہجوم رہتا ہے اور کوئی کسی کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتا۔ روبی کے پاس ایک پستول تھا جس میں صرف دو گولیاں تھیں۔ جب کہ دوسرے ریوالور میں کافی گولیاں تھیں۔ اس نے پستول کو چلتی جیپ میں سے ایک نالے میں پھینک دیا اور ریوالور اپنے پاس ہی رکھا اسٹیشن تک آتے آتے کافی دن نکل آیا تھا اور کراچی کے بازاروں کی رونق اور چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ روبی نے اسٹیشن سے دور ایک ویران مقام پر جیپ کو ایک ڈھلان میں اتار کر وہیں پڑی رہنے دیا اور خود بڑے اطمینان سے چلتی اسٹیشن کی عمارت میں آگئی۔ اپنے لباس سے روبی ہری پور ہزارے کا کوئی نوجوان لڑکا لگتی تھی جو نوکری کی تلاش میں کراچی آگیا ہو۔ اس نے اسٹیشن پر ہی ناشتہ کیا اور چادر کو جسم کے گرد لپیٹ کر تھرڈ کلاس کے مردانہ ویٹنگ روم میں ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ یہ اونچی چھت والا کھلا کھلا ویٹنگ روم تھا اور بھانت بھانت کے لوگ وہاں اپنا اپنا سامان اور بچے لیے پڑے تھے۔ اسٹیشن کے اندر سے چھک چھک کرتے انجنوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ ابھی پاکستان میں بہت کم ڈیزل انجن چلتے تھے۔ زیادہ تر انجن کوئلے کے چلتے تھے اور ان کا خوب دھواں اٹھتا تھا۔ روبی کو سارا دن وہاں گزارنا تھا۔

یہ کافی صبر طلب کام تھا۔ وہ دن بھر صرف ایک بنچ پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ چنانچہ کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے بعد وہ اٹھی اور پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر اسٹیشن کے اندر چلی آئی۔ یہاں دو چار پلیٹ فارم تھے ان میں جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں وہاں مسافروں کا رش تھا۔ باقی خالی پڑے تھے۔ ریلوے پولیس کے سپاہی بھی کہیں کہیں کاہلی سے منڈلاتے یا کسی جگہ بیٹھے چائے سگریٹ سے شغل کرتے روبی کو نظر آئے تھے۔ اس نے ان کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیا تھا۔ کیونکہ وہ جس بھیس میں تھی اسے قریب سے بھی کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ ایک جگہ چائے کی کینٹین کے پہلو میں بنچ خالی پڑا تھا۔ روبی چائے کی پیالی لے کر وہاں بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

وہ سوچنے لگی کہ چونکہ انہوں نے اپنی بچی عائشہ کے اغوا کی رپورٹ تھانے میں نہیں لکھوائی تھی اس لئے ہاشم اور اس کے غنڈوں کے قتل کے بعد پولیس شیر خان کے گھر پوچھ گچھ کے لئے نہیں آئے گی۔ یہ سب کچھ اتفاق سے ہی ہو گیا تھا ورنہ پہلے شیر خان کا خیال تھا کہ عائشہ کے اغوا کی رپٹ درج کرائے مگر روبی نے اسے منع کر دیا تھا اور یہ کہہ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی کہ وہ اپنی بچی کو غنڈوں سے خود برآمد کرے گی۔ اب صرف ایک ہی مرحلہ اس کے سامنے تھا۔ اس نے اپنے خاوند شیر خان اور بچی عائشہ کو لے کر کراچی سے نکلنا تھا اور کاغان کی پہاڑیوں میں پہنچنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پہاڑی وادیاں پاکستان کے دور دراز علاقے میں ہیں اور وہاں شیر خان اور اس کی بچی عائشہ سکون کے ماحول میں زندگی بسر کر سکیں گے۔ اپنے بارے میں روبی جانتی تھی کہ وہ موت کے سفر پر ہے۔ وہ کئی خون کر چکی ہے۔ اگرچہ اس نے ان بدمعاشوں کو قتل کیا تھا جو خود قاتل تھے اور اگر پکڑے جاتے تو قانون انہیں پھانسی ہی کی سزا دیتا مگر روبی نے قانون اپنے ہاتھوں میں لے کر قانون شکنی کی تھی اور وہ بہرحال قاتلہ تھی۔ وہ جیل بھی توڑ کر بھاگی تھی۔ پھانسی کا پھندا اس کا مقدر ہو چکا تھا مگر وہ پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے پاکستان کے جسم میں جرائم کا زہر گھولنے والے جتنے جرائم پیشہ درندوں کو ختم کر سکتی تھی ختم کر دینا چاہتی تھی۔

دوسری طرف جب دن نکلا تو کراچی پولیس کو اکٹھے تین آدمیوں کے قتل کی خبر ملی۔ ان میں بدنام زمانہ ہاشم بدمعاش بھی تھا۔ باقی دونوں غنڈے بھی اس کے ساتھ تھے۔ پولیس

کا خیال فوراً شیر خان کی طرف گیا۔ اس کی بیوی روبی نے ہی ہاشم کے چھوٹے بھائی سہراب کو قتل کیا تھا اور یہ بات بھی پولیس کے علم میں تھی کہ ہاشم اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ شیر خان سے لینا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں شیر خان کو دھمکیاں بھی مل چکی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ شیر خان کی بیوی مفرور قاتلہ روبی نے اپنے خاوند کو ہاشم کے انتقام سے بچانے کے لئے ہاشم کو قتل کر دیا ہو۔ یہ بات پولیس کے علم میں ہی نہیں تھی کہ شیر خان کی بچی بھی اغوا ہو گئی تھی۔ بہر حال انسپکٹر پرویز نے سارے کیس کا جائزہ لیا اور وہ کیس کی تفصیلات سے پہلے بھی آگاہ تھا اور مفرور قاتلہ روبی کو گرفتار کرنے کے لئے اسی نے شیر خان کے گھر کے آس پاس خفیہ پولیس کا آدمی لگایا تھا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔

انسپکٹر پرویز نے شیر خان کو تھانے بلوا کر مقتول ہاشم بدمعاش کی طرف سے دی گئی دھمکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ شیر خان نے کہا کہ کافی دیر ہوئی ہاشم کی طرف سے اسے اس قسم کی دھمکی ملی تھی مگر پھر بات آئی گئی ہو گئی تھی اور اب ہاشم کا کوئی آدمی اس کے پاس کبھی نہیں آیا تھا۔ انسپکٹر پرویز نے شیر خان سے اس کی بچی کے بارے میں پوچھا کہ وہ ماں کے بغیر ضرور اداس ہو گی اور یہ کہ وہ اکیلا اس کی پرورش کس طرح کرتا ہے۔ شیر خان نے بتایا کہ وہ سینما کی ڈیوٹی پر آنے سے پہلے بچی کو اپنی نیک دل ہمسائی مریم کے پاس چھوڑ آتا ہے اور جب رات کو گھر واپس جاتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے بچی کی خیریت معلوم کرتا ہے اور رات کو بچی مریم کے پاس ہی رہتی ہے۔ انسپکٹر پرویز نے ایک دم سوال کر دیا۔

"تمہاری بیوی اپنی بچی سے ملنے کس دن آئی تھی؟" شیر خان بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا تھا اس نے غمگین لہجے میں کہا۔

"وہ کیوں آئے گی اب' اس کی وجہ سے تو میرا گھر برباد ہو گیا۔ بچی ویران ہو گئی۔ مدت گزر گئی کبھی اس کی شکل دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔"

انسپکٹر پرویز اس دوران بڑی گہری نظر سے شیر خان کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ جب شیر خان چلا گیا تو اس نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل احمد دین سے کہا۔

"اس کی ہمسائی مریم کو میرے پاس لاؤ مگر شیر خان کو پتہ نہیں چلنا چاہئے۔"

کانسٹیبل احمد دین دوپہر کے بعد مریم کے گھر پہنچ گیا۔ وہ سفید کپڑوں میں تھا۔ شیر خان

اس وقت سینما گیا ہوا تھا اور بچی مریم ہی کے پاس تھی۔ مریم بچی کو چارپائی پر لٹا کر خود کھرے میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ بچی عائشہ بستر پر لیٹی ٹانگیں چلا رہی تھیں۔ کانسٹیبل نے مکان کے صحن میں آتے ہی مریم سے کہا۔

"میری بہن گھبراؤ بالکل نہیں میرا نام احمد دین ہیڈ کانسٹیبل ہے۔ تمہیں انسپکٹر صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے تھانے بلایا ہے۔ بچی کو بھی ساتھ لے چلو میں تمہیں خود واپس چھوڑ جاؤں گا۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ انسپکٹر صاحب نے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" پہلے تو مریم راضی نہیں ہوئی اور تھانے جانے سے صاف انکار کر دیا مگر جب ہیڈ کانسٹیبل نے کہا کہ وہ اسے اٹھا کر بھی لے جا سکتا ہے تو مریم بادل نخواستہ ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ بچی عائشہ کو اس نے گودی میں اٹھا لیا۔ تھانے میں انسپکٹر پرویز نے مریم کو بڑی عزت سے بٹھایا اور بہن کہہ کر مخاطب کیا اور کہا۔

"تم سے صرف دو ایک باتیں پوچھنی ہیں مجھے یقین ہے کہ تم غلط بات نہیں کرو گی۔ اس کے بعد میرا آدمی تمہیں گھر چھوڑ آئے گا۔" مریم نے کہا۔

"آپ کو جو پوچھنا ہے پوچھیں اگر کسی بات کا مجھے علم ہوا تو میں ضرور بتا دوں گی۔" وہ بوتل سے عائشہ کو دودھ بھی پلا رہی تھی۔ انسپکٹر نے کہا۔

"شیر خان کی بیوی اپنی بچی سے ملنے کب آئی ہے؟" مریم نے کہا۔" وہ تو جب سے جیل سے بھاگی ہے کبھی گھر نہیں آئی۔ میں خود ہی بچی کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔" انسپکٹر مریم کے چہرے کو گھور کر تک رہا تھا کہنے لگا۔

"مریم بی بی! اگر تم ہمیں سچ سچ سب کچھ بتا دو گی تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

مریم نے اس کے بعد بھی یہی کہا کہ اسے معلوم نہیں کہ روبی کہاں ہے۔ وہ کبھی نہیں آئی تب انسپکٹر پرویز نے غصے سے میز پر مکا مارا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اچانک ساتھ والے کمرے سے کسی عورت کی دردناک چیخ بلند ہوئی وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"خدا کے لئے مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ خدا کے غضب سے ڈرو مجھے چھوڑ دو' مجھے چھوڑ دو۔"

انسپکٹر پرویز نے ایک لیڈی کانسٹیبل کو پہلے ہی ساتھ والے کمرے میں بٹھا دیا تھا اور اسے کہا تھا کہ جب میز پر مکا مارنے کی آواز آئے تو وہ چیخ مار کر مندرجہ بالا ڈائیلاگ بڑے درد بھرے انداز میں بولے۔ یہ ایک ڈرامہ تھا جو مریم پر دہشت طاری کرنے اور اس سے سچ اگلوانے کے لئے پہلے سے تیار کیا گیا تھا۔ مریم سیدھی سادی عورت تھی ساتھ والے کمرے سے کسی عورت کی چیخ و پکار سن کر سہم گئی۔ انسپکٹر پرویز نے کہا۔ "اگر تم نے میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب نہ دیا تو تمہارا بھی یہی حشر ہو گا جو ساتھ والے کمرے میں ایک عورت کے ساتھ ہو رہا ہے۔" تب مریم نے خوفزدہ ہو کر سب کچھ بتا دیا۔

انسپکٹر پرویز کے لئے یہ ایک حیران کن انکشاف تھا کہ شیر خان کی بچی اغوا ہو گئی تھی اور پھر آدھی رات کو روبی مردانہ لباس میں مریم کے گھر اتر کر بچی اس کے حوالے کر گئی تھی۔ مریم نے اپنے بیان میں یہ بھی بتایا کہ اسے ایک مونچھوں والا آدمی بے ہوشی کی دوا سنگھا کر بچی کو لے گیا تھا۔ انسپکٹر پرویز نے پوچھا۔

"یہ کل رات کی بات ہے؟"

"جی ہاں۔" مریم نے کہا۔ "کل رات ہی شیر خان کی بیوی واپس آکر مجھے بچی دے گئی تھی اور کہہ گئی تھی کہ شیر خان سے کہنا میرے پیچھے نہ آئے۔"

انسپکٹر نے اس سے یہی نتیجہ نکالا کہ یہ تینوں قتل مفرور قاتلہ شیر خان کی بیوی روبی نے ہی کیے ہیں اور اس کی بچی کو ہاشم بدمعاش نے ہی اغوا کیا تھا کیونکہ وہ شیر خان سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ روبی مفرور تھی وہ تو اس کے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ چنانچہ اس نے اس کی بچی کو ہی اغوا کر لیا۔ انسپکٹر مریم کو اعتماد میں لے چکا تھا وہ خوف کے مارے پولیس سے مکمل تعاون کے لئے بھی تیار ہو چکی تھی۔ انسپکٹر پرویز نے اسے مزید اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

"بی بی! اب تم گھر جاؤ۔ شیر خان کو بلکہ کسی کو کچھ نہ بتانا۔ یہ راز اپنے تک ہی رکھنا اور اگر شیر خان کی بیوی گھر آئے یا شیر خان اس سے ملنے کسی جگہ جائے تو فوراً تھانے آکر اطلاع کر دینا۔ اس بات سے بے فکر ہو جاؤ تمہارا کسی جگہ بھی نام نہیں آئے گا۔ ٹھیک ہے؟" مریم نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "جی ٹھیک ہے۔" انسپکٹر پرویز نے

ہیڈ کانسٹیبل کی بجائے ایک لیڈی کانسٹیبل کو مریم کے ساتھ رکشے میں بٹھا کر بھیج دیا جو سفید کپڑوں میں تھی اس کے جانے کے بعد انسپکٹر نے احمد دین سے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ مفرور روبی اس وقت کراچی شہر میں ہی کسی جگہ روپوش ہے دوسری بات یہ ہے کہ وہ مردانہ کپڑوں میں یعنی ملیشیے کی شلوار قمیص میں ہے۔ فوراً پولیس کے آدمی سفید کپڑوں میں شیر خان کے محلے میں تعینات کر دو۔ جو چوبیس گھنٹے نگرانی کریں گے۔ تم خود کوئی بھیس بدل کر شیر خان کی نگرانی کرو گے۔ مجھے یقین ہے کہ شیر خان کی بیوی ایک بار اپنے گھر ضرور آئے گی اس کے علاوہ ریلوے اسٹیشن پر بھی خفیہ کے کچھ آدمی بھیج دو۔ روبی کی تصویر تھانے میں موجود ہے۔ انہیں اچھی طرح چہرہ کرا دو۔" اسی وقت خفیہ پولیس کے دو آدمی بھی اسٹیشن کی طرف چل دیے۔

مریم نے گھر واپس آکر بچی کو چارپائی پر لٹا دیا۔ وہ دل میں پریشان تھی کہ خوامخواہ اس نئی مصیبت میں پھنس گئی اس نے تو روبی اور شیر خان کی بھلائی کے لئے بچی کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے لی تھی اور مشکل میں پھنس گئی۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ رات کو شیر خان بچی کو دیکھنے آئے گا تو وہ اسے صاف صاف کہہ دے گی کہ اب میں اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔ اسے لے جاؤ جہاں جی چاہے اس کو رکھو مگر پولیس کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتائے گی۔ کیونکہ تھانےمیں زیر تشدد عورت کی چیخ ابھی تک مریم کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

اس وقت روبی کراچی سٹی کے ریلوے اسٹیشن پر نہیں تھی۔ بلکہ وہ ویٹنگ روم سے نکل کر وہاں سے کچھ دور ایک بہت بڑے گندے نالے کے کنارے پر بنی ہوئی جھگیوں کی بستی میں ایک چھوٹے سے تنور پر روٹی کھانے کے بعد صف پر بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ سگریٹ کی عادت تقریباً اس سے چھوٹ چکی تھی۔ مگر وہاں اپنے آپ کو مرد ظاہر کرنے کے لئے بھی سگریٹ پینا ضروری تھا۔ ایک بوڑھا سندھی مزدور اس کے قریب ہی بیٹھا پرچ میں چائے ڈال کر پی رہا تھا اور روبی سے باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ روبی نے اسے اپنا نام جمال بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں ہری پور سے کام کی تلاش میں کراچی آیا ہوں۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔

"بیٹا کام تو تمہیں جونا مارکیٹ میں یا کیماڑی کی گودی کے آس پاس ہی ملے گا۔ وہاں

محنت مزدوری کے پیسے بھی اچھے مل جاتے ہیں۔"

روبی کی تیز نگاہیں ارد گرد کے ماحول کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ وہاں اسے کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ جس پر سی۔ آئی۔ ڈی کا شبہ کیا جا سکے۔ وہ اتنی ماہر ہو گئی تھی کہ خفیہ پولیس والے کو اس کی چال اور حرکات و سکنات سے ہی پہچان لیتی تھی اس نے قمیص کے اندر جو صدری پہن رکھی تھی اس میں کافی رقم نوٹوں کی شکل میں موجود تھی ایک بھرا ہوا ریوالور بھی تھا۔ اسے کسی نہ کسی طرح دن گزارنا تھا۔ یہ علاقہ غیر اہم تھا یہاں وہ دیر تک بیٹھنا چاہتی تھی۔ تاکہ دن کا زیادہ سے زیادہ حصہ گزر جائے۔ لیکن ایک جگہ زیادہ دیر تک بیٹھے رہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ اب تک نصف درجن سے بھی زیادہ خون کر چکی تھی اور ذرا سی غفلت اسے پھانسی کے تختے پر لے جا سکتی تھی۔ بچی عائشہ کی طرف سے اس کا دل مطمئن تھا کہ وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ چکی ہے۔ اب وہ یہ چاہتی تھی کہ شیر خان اور اپنی بچی کو اس شہر سے نکال کر کسی دور دراز پہاڑی علاقے میں جا کر آباد ہو جائے اور اس کے بعد اپنی آئندہ زندگی کا کوئی پروگرام بنائے کہ قانون کے ہاتھوں سے محفوظ رہ کر وہ کسی مقام پر اپنے مشن کو آگے چلا سکتی ہے اس کا مشن عورتوں پر ظلم کرنے والے بدمعاشوں کو فوری طور پر موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ وہ مرنے سے ایک منٹ پہلے کسی درندہ صفت غنڈے کو قتل کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دور دراز کے پہاڑی علاقے میں بھی وہ شیر خان اور اپنی بچی کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکے گی لیکن وہ اتنا ضرور چاہتی تھی کہ شیر خان شہروں کی گناہ آلود جرائم پیشہ فضا سے دور رہ کر اس کی بچی کی پرورش کرے اور اس کو ایک ایسی عورت بنائے جو صرف اپنے حق کی حفاظت کرنا ہی نہ جانتی ہو بلکہ دوسری عورتوں کو بھی ان کا حق دلانا جانتی ہو جو بندی عورتوں کی طرح بزدل نیک عورت نہ ہو بلکہ شروع اسلام کی مثالی خواتین کی طرح ایک بہادر نیک عورت ہو جو ظالم کے سامنے بکری نہ بن جائے' بلکہ شیرنی بن کر ظالم کے ہاتھ کو چبا ڈالے اور یوں وطن پاک کی فضا کو خواتین کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ساز گار بنائے۔

روبی اس حقیقت سے باخبر تھی کہ وہ زیادہ دیر تک اپنی بچی کے ساتھ نہ رہ سکے گی اور یہ کام اس کے بعد شیر خان کو کرنا ہو گا۔ یہ فرض اسے نبھانا ہو گا۔ اور اسے شیر خان سے

پوری امید تھی کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ روبی یہی کچھ سوچتی وہاں سے اٹھی اور نالے کے کنارے شہر کی مخالف سمت چلنے لگی۔ یہ علاقے روبی کے لئے اجنبی تھے مگر پیچھے وہ بڑی سڑک تھی جو ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتی تھی وہاں سے وہ اپنے گھر پہنچ سکتی تھی۔ اب اسے صرف رات ہونے کا انتظار تھا۔ وہ ساری رات کی جاگی ہوئی تھی۔ اسے نیند بھی آ رہی تھی۔ وہ بے خبر ہو کر سونا نہیں چاہتی تھی لیکن کچھ دیر آرام بھی کر لینا چاہتی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک ویران مقام پر آ گئی۔ یہاں آس پاس دور دور تک کوئی جھونپڑی وغیرہ نہیں تھی۔ ایک کھلی جگہ پر خانہ بدوشوں نے گیلے چیتھڑے سکھانے کے لئے ڈال رکھے تھے۔ ایک جانب پھلاہی اور کیکر کے چھدرے درختوں کا جھنڈ تھا روبی اس کی چھاؤں میں بیٹھ گئی۔

اسے نہ جانے کیوں ہانگ کانگ اور برما میں گزارے ہوئے ہنگامہ خیز عیش و آرام کے دنوں کا خیال آ گیا۔ وہ ان خیالوں میں جیسے کھو گئی۔ اور اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس نے سوچا وہاں کوئی نہیں ہے اسے کچھ دیر کے لئے آرام کر لینا چاہئے چنانچہ اس نے چادر کو گول کر کے سر کے نیچے رکھ لیا اور خدا کو یاد کر کے آنکھیں بند کر لیں رات بھر کی جاگی تھی۔ آنکھیں بند کرنے کی دیر تھی کہ نیند کی پریاں اسے اٹھا کر خواب کی دنیا میں لے گئیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ جب تک سوتی رہی وہاں کوئی بندہ نہ آیا جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے کچھ نظر نہ آیا وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی اس کے چاروں طرف تاریکی چھائی تھی۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے اس نے بڑے غور سے اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا وہ حیران رہ گئی۔ گھڑی کی سوئیاں رات کے دس بجا رہی تھیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی دیر تک سوتی رہی ہے لیکن وہ تازہ دم تھی اس نے صدری میں ہاتھ ڈال کر دیکھا اس کا ریوالور اور نوٹ اپنی جگہ پر تھے۔ وہ اٹھی اور اپنے گھر کا رخ کیا۔

شیر خان حسب معمول سینما کا آخری شو شروع کرانے کے بعد منیجر سے اجازت لے کر قریباً سوا نو بجے گھر واپس آ گیا تھا اور اپنی بچی کو دیکھنے سیدھا مریم کے مکان میں گیا۔ مریم کا رویہ کچھ بدلا بدلا تھا۔ شیر خان بچی گود میں لے کر اسے پیار کر رہا تھا۔ اس نے مریم سے پوچھا۔

"خیر تو ہے مریم بہن! تم کچھ چپ چپ ہو۔" مریم نے منہ پھلا کر کہا۔

"بھائی شیر خان اب مجھ سے تمہاری بچی کی دیکھ بھال نہیں ہوتی۔ تم کوئی دوسری عورت تلاش کر لو۔ میں تھک گئی ہوں۔"

شیر خان کہنے لگا۔

"مریم بہن! تمہارے جیسی بہن مجھے اور کہاں ملے گی اور اب تو عائشہ بھی تمہارے ساتھ بڑی گھل مل گئی ہے مجھے تو بڑا اطمینان ہوتا تھا کہ بچی تمہارے پاس ہے۔"

"کوئی بات نہیں ہوئی بھائی۔ بس میں تھک گئی ہوں۔ اب تمہاری بچی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔ صاف بات ہے۔ تم اپنی بیٹی کو لے جاؤ۔ تمہاری مہربانی ہو گی۔" مریم نے صاف انکار کر دیا تھا۔ شیر خان منت سماجت کرنے والا آدمی ہی نہیں تھا۔ اس نے مریم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا

"بہن تم نے اب تک جس پیار اور مامتا سے میری بچی کی دیکھ بھال کی ہے اس کے واسطے میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ چھوٹا سا شکرانہ قبول کرو یہ تمہاری مہینے کی تنخواہ سے الگ ہے۔" اور شیر خان نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مریم کے پاس چارپائی پر رکھا اور سلام کر کے عائشہ کو گود میں اٹھائے وہاں سے نکل کر اپنے مکان میں آگیا۔

خفیہ پولیس کے دو آدمی اس وقت سفید کپڑوں میں گلی کی نکڑ پر آمنے سامنے چھپ کر کھڑے تھے۔ انہوں نے شیر خان کو مریم کے گھر میں جاتے اور پھر وہاں سے بچی کو گود میں اٹھائے نکلتے اور اپنے گھر میں واپس جاتے دیکھ لیا تھا دونوں سپاہی وہاں سے ہٹ گئے۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر ایک پرانی عمارت کے سائے میں ایک اور سپاہی فقیر کے حلیئے میں دیوار سے ٹیک لگائے یوں بیٹھا تھا جیسے سو رہا ہو۔ یہ ہیڈ کانسٹیبل احمد دین تھا۔ انہوں نے احمد دین کو ساری رپورٹ دی اور واپس اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا کر چھپ گئے۔ جال بچھ چکا تھا اور اس جال میں پھنسنے کے لئے روبی ایک رکشے میں بیٹھی چلی آ رہی تھی۔ اتنا اسے ضرور احساس تھا کہ اس کے گھر کی نگرانی ہوتی ہے مگر اب پولیس غافل ہو گئی ہے مگر ہاشم کے قتل کے بعد روبی قدرے چوکس ہو گئی تھی۔ چنانچہ احتیاط کے طور پر اس نے رکشہ اپنے محلے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا اور چادر کی بکل مار کر پیدل ہی گھر کی طرف چل

پڑی۔

محلے کے قریب آ کر وہ محتاط ہو گئی اور دائیں بائیں اندھیرے میں دیکھتی ہوئی پھونک پھونک کر قدم اٹھانے لگی۔ اس جگہ جو دو چار دکانیں تھیں وہ بند تھیں۔ غریبانہ قسم کے مکانات تھے جن کے مکین بتیاں بجھا کر گہری نیند سو رہے تھے۔ آگے چند قدموں پر وہ جگہ تھی جہاں روبی کا مکان تھا۔ اس گلی کے کونے پر ایک بلب لگا تھا جس کی روشنی بڑی مشکل سے نیچے فرش تک پہنچتی تھی۔ روبی مکانوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کے قدم رک گئے اور وہ جلدی سے ایک مکان کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس نے گلی کے نکڑ پر کسی آدمی کے سائے کو حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اندھیرے میں دیوار سے لگ کر کھڑی ٹکٹکی باندھے گلی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ریوالور اس نے نکال کر مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ سامنے والی پرانی بلڈنگ کی جانب سے ایک اونچا لمبا آدمی جھوم جھوم کر چلتا آ رہا تھا۔ وہ کھمبے کی روشنی میں آیا تو روبی نے غور سے دیکھا۔ وہ کوئی فقیر ملنگ لگ رہا تھا۔ یہ ہیڈ کانسٹیبل احمد دین تھا جو فقیر کے حلیئے میں وہاں پڑا تھا۔ روبی نے سوچا کہ رات کے گیارہ بجے کسی فقیر کا یہاں کیا کام...... یہ خفیہ پولیس کے آدمی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کسی ایسے آدمی کو گولی کا نشانہ بنانا جو اپنی ڈیوٹی ادا کر رہا ہو اور اس کا کسی گھناؤنے مجرمانہ فعل سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ روبی کا مسلک نہیں تھا۔ اتنا اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ ہاشم اور اس کے دو غنڈوں کے قتل کے بعد شیر خان کے گھر کی نگرانی پولیس نے سخت کر دی ہے اور وہ ہر حالت میں روبی کو گرفتار کرنے پر تل گئی ہے۔ فقیر ملنگ آدمی گلی میں جا کر تھوڑی دیر بعد باہر آگیا اور واپس پرانی بلڈنگ کی طرف چل دیا جہاں پہلے سے ایک انسانی سایہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ روبی وہیں سے دبے پاؤں واپس ہو گئی۔ وہ اپنی بچی اور شیر خان کے پاس بھی ضرور جانا چاہتی تھی۔ وہ ان دونوں کو اب اس قسم کے اذیت بخش ماحول میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ پچھلی طرف ٹیوب ویل کے قریب سے نکل کر اپنی گلی کے عقب میں آ گئی۔ یہاں سے اس کی گلی کو جانے والا کوئی باقاعدہ راستہ تو نہیں تھا مگر ایک احاطہ تھا جہاں کچھ مزدوروں نے جھونپڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ اس احاطے کا ایک درخت سامنے والے مکان کی عقبی دیوار سے جڑا ہوا تھا۔ اس جگہ کو روبی نے شروع

ون ہی سے ذہن میں رکھا ہوا تھا۔ یہاں سے ایک منزلہ مکانوں کی چھتوں سے ہوتی ہوئی وہ اپنے مکان کی چھت پر پہنچ سکتی تھی۔

احاطے میں خاموشی اور تاریکی تھی۔ مزدور مرد اور عورتیں تختوں اور چارپائیوں پر یہاں وہاں سو رہے تھے۔ روبی دبے پاؤں ان کے درمیان سے گزر کر سامنے والے درخت کے پاس آئی درخت کے تنے سے کوئی پانچ فٹ اوپر جا کر اس کی شاخیں شروع ہوتی تھیں۔ روبی کا لڑکپن اور جوانی کا ابتدائی حصہ برما کے جنگلوں میں ہی گزرا تھا۔ اس کے لئے یہ ایک آسان درخت تھا۔ اس درخت پر تو برما ہانگ کانگ کے درختوں کی طرح زہریلے سبز سانپوں کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ پاکستان کے درخت تو روبی کو بڑے شریف' نیک اور بے ضرر لگے تھے۔ یہ بھی درخت ایسا ہی تھا۔ اس نے اچھل کر درخت کی ایک شاخ کو تھاما اور پھر جھول کر اس پر چڑھ گئی۔ درخت کی ایک موٹی شاخ مکان کی چھت کے قریب سے ہو کر اوپر نکلتی تھی۔ روبی بڑے آرام سے چھت پر اتر گئی۔ یہاں بھی اسے کچھ لوگ چارپائیوں پر سوتے نظر آئے۔ وہ تیزی سے مگر دبے پاؤں ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی دوسری چھت پر آ گئی۔ یہ چھت خالی تھی اس سے اگلی چھت روبی کے مکان کی تھی۔ وہ یہاں آ کر بیٹھ گئی اور غور سے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ جب اسے وہاں کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا تو وہ گھٹنوں کے بل چلتی رات کی خاموشی اور اندھیرے میں اپنے مکان کی چھت پر آ گئی۔ نیچے چھوٹے سے صحن میں ایک زینہ اترتا تھا۔ روبی صحن میں آ گئی۔ اسے اپنی بچی عائشہ کے رونے کی آواز آئی۔ وہ بے چین ہو کر دروازے کی طرف گئی اور آہستہ سے دستک دی۔ اندر شیر خان جاگ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو روبی تیزی سے اندر گھس گئی۔ شیر خان نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اور بولا۔

"تم کس طرف سے آئی ہو؟ تمہیں کسی نہ کسی نے ضرور دیکھ لیا ہو گا۔ باہر تو چار آدمی ہر وقت منڈلاتے رہتے ہیں۔" روبی نے روتی ہوئی عائشہ کو چارپائی سے اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا اور اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔

"میں چھت پر سے آئی ہوں۔ کیا بات ہے۔ عائشہ آج مریم کے پاس نہیں رہی؟ اسے بھوک لگی ہے۔ دودھ ہے گھر میں؟"

شیر خان نے نعمت خانے میں سے دودھ کی پتیلی نکال کر بوتل میں دودھ ڈالا اور روبی عائشہ کو چارپائی پر لٹا کر دودھ پلانے لگی۔ اس نے شیر خان کی طرف چہرہ اٹھا کر ایک بار پھر پوچھا کہ عائشہ تو رات کو مریم کے ہاں ہوتی ہے اسے کیوں لے آئے تھے؟ میں جب آتی تو وہاں سے منگوا لیتے۔ شیر خان نے سامنے والی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مریم نے بچی کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیا ہے۔"

روبی شیر خان کا منہ تکنے لگی۔

"وہ کیوں؟" شیر خان نے اپنے سیاہ گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کندھے اچکا کر کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بس اس نے کہہ دیا ہے کہ اب وہ بچی کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتی۔" پھر پلٹ کر بولا۔ "ضرور کوئی بات ہوئی ہے روبی .... میرا دل کہتا ہے کہ مریم کو پولیس نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ آج میں سینما سے گھر آیا تو میں نے تین چار اجنبی آدمیوں کو یہاں محلے میں منڈلاتے دیکھا۔ ایک فقیر تو پرانی بلڈنگ کے باہر آ کر بیٹھ گیا ہے۔"

"یہ سب سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی ہیں۔"

روبی نے عائشہ کے بالوں کو اس کے ماتھے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بھی اسی لئے آئی ہوں کہ یہاں سے نکل چلیں۔" شیر خان نے پوچھا۔

"تم نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا کہ عائشہ تمہیں کہاں سے ملی؟ کیا ہاشم کو تم نے ہی قتل کیا ہے؟" روبی نے شعلہ برساتی آنکھوں سے شیر خان کی طرف دیکھا اور بولی۔

"تو اور کیا تمہارے باپ نے اسے قتل کیا ہے؟ میں نے اسے مارا ہے۔ اس کے دو غنڈوں کا خون بھی میں نے ہی کیا ہے۔ میں ایسے ایک ہزار غنڈوں کا خون کر سکتی ہوں۔ وہ میرے جگر کے ٹکڑے' میری بیٹی کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ میں کیسے چپ بیٹھ سکتی تھی؟ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں چپ کر کے بیٹھ جانے والی عورت نہیں ہوں؟" شیر خان نے ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے کہا

"خدا کے لئے اس وقت تو چپ ہو جاؤ۔ آہستہ بولو۔ ہو سکتا ہے باہر دروازے پر کسی نے کان لگا رکھے ہوں۔"

روبی بڑبڑاتی ہوئی خاموش ہو گئی اور اپنی بچی عائشہ کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ بچی آنکھیں بند کر کے دودھ پی رہی تھی۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ روبی نے کہا۔

"میں نے بھی گلی کی نکڑ پر دو تین مشتبہ آدمی دیکھے ہیں اسی وجہ سے میں احاطے کی طرف سے چھتوں پر سے ہوتی یہاں آئی ہوں۔ چلو اٹھو۔ اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ہم کوئی سامان اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ عائشہ کو اٹھا لو۔"

روبی نے صدری میں سے سو سو کے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر شیر خان کو دیں اور کہا۔

"یہ تم اپنے پاس رکھو۔ راستے میں حالات کچھ بھی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ میں تمہیں اور اپنی بیٹی کو ان غیر یقینی خوف زدہ حالات میں چھوڑ کر اکیلی کہیں نہیں جا سکتی۔ کم از کم تم دونوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کے بعد کہیں جاؤں گی۔" شیر خان نے کہا۔

"نہیں روبی ہم جہاں بھی رہیں گے اکٹھے رہیں گے۔" روبی نے کہا۔

"تم ابھی تو یہاں سے نکلو۔ ہم مکان کی چھت سے ہو کر جائیں گے۔"

شیر خان نے نوٹ ایک کپڑے میں لپیٹ کر اپنی قمیص کے اندر کمر کے ساتھ باندھ لیے۔ سوئی ہوئی عائشہ کو اٹھا کر کاندھے سے لگایا اور روبی کے اشارے پر اس کے پیچھے کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ دونوں جھک کر زینہ چڑھ کر چھت پر آ گئے۔ دونوں بیٹھ کر آگے بڑھ رہے تھے اسی طرح وہ دوسرے مکان کی چھت پر سے بھی گزر گئے اور اب سامنے درخت کی موٹی شاخ تھی۔ سب سے پہلے شیر خان شاخ پر چڑھا۔ روبی نے سوئی ہوئی بچی کو چھت پر سے اسے پکڑا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ درخت سے نیچے اترنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی روبی بھی درخت سے اتر گئی۔ احاطے میں ابھی تک ویسے ہی سناٹا طاری تھا۔ کسی طرف سے کوئی بچہ رویا۔ اس کی ماں نے اسے نیند بھری آواز میں پچکارا اور اس کے بعد پھر خاموش ہو گئی۔ روبی اور شیر خان ان سوئے ہوئے لوگوں کے بیچ سے ہو کر احاطے سے باہر نکل آئے۔ اسی جگہ سے انہوں نے اپنا رخ سینما ہاؤس والی سڑک کی طرف کر لیا اور جتنی تیز چل سکتے تھے چلتے ہوئے ریلوے پل کی طرف جاتی سڑک پر آ کر لکڑی کے ایک بند

کھوکھے کے پیچھے بیٹھ گئے۔ روبی نے سنسان سڑک کی طرف دیکھا اور کہا۔

"شیرے! یہاں ہمیں کوئی رکشہ ٹیکسی نہیں ملے گی۔ چلو پیدل ہی چلتے ہیں۔" شیر خان نے بچی کو کاندھے سے لگا رکھا تھا۔ اسے آہستہ آہستہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"اسٹیشن یہاں سے بہت دور ہے ابھی کوئی خالی سواری آ جائے گی۔" جب پانچ دس منٹ گزر گئے تو روبی بے چین ہو گئی۔

"یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ آگے چلو پل کے پاس کسی جگہ شاید سواری مل جائے۔"

وہ سڑک کے کنارے کنارے چلتے پل پر چڑھ گئے۔ یہ کافی بڑا پل تھا۔ دوسری طرف یہ ایک بڑی سڑک کے ساتھ جا کر مل جاتا تھا۔ یہاں انہیں ایک خالی رکشہ مل گیا۔ وہ اس میں بیٹھ کر سٹی اسٹیشن کی بجائے کافی فاصلہ طے کر کے کراچی صدر کے ریلوے اسٹیشن پر آ گئے۔ جب تک گاڑی نہ آئی دونوں اپنی بچی کو لیے پلیٹ فارم کے ایک کونے میں پڑے رہے۔ گاڑی کراچی سٹی سے تیار ہو کر آتی تھی۔ جب گاڑی آئی تو دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ روبی چونکہ ابھی تک مردانہ حلیئے میں تھی اس لئے شیر خان نے اسے اپنے ساتھ مردانہ ڈبے میں بٹھایا۔ احتیاطاً اس نے بچی اپنی گودی میں لے لی تھی کہ کہیں روبی زیادہ مامتا کا اظہار نہ کر دے اور بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اب روبی کے مردانہ حلیئے کو برقرار رکھنے کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ کسی ایسی جگہ اپنا لباس تبدیل کرنا چاہتی تھی جہاں اسے زنانہ کپڑے مل سکتے ہوں۔ ٹرین کی منزل پشاور تھی۔ سفر میں کوئی تشویش ناک صورت حال پیش نہ آئی لاہور شہر سے بھی ٹرین نکل گئی۔ راولپنڈی پہنچی تو وہ دونوں اتر گئے۔ یہاں سے انہیں آگے ہزارہ کی سرسبز پہاڑی وادیوں میں جانا تھا مگر سب سے پہلے روبی کو زنانہ کپڑے پہنانا ضروری تھا۔ شیر خان اسے لے کر راجہ بازار کے ایک ہوٹل میں آ گیا۔ یہاں اس نے روبی کو اپنا چھوٹا بھائی ظاہر کر کے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ انہوں نے کھانا کھایا۔ بچی کو نہلا دھلا کر تازہ دودھ پلایا پھر دونوں بازار کی طرف نکل گئے۔ ایک دکان پر سے شیر خان نے روبی کے لئے کچھ زنانہ کپڑے خریدے اور واپس ہوٹل میں آ کر روبی نے کپڑوں کو تھیلے میں سنبھال کر رکھ لیا۔ وہ ہوٹل میں اپنا حلیہ نہیں بدلنا چاہتی تھی۔ ایک رات انہوں

نے راجہ بازار کے ہوٹل میں گزاری۔ اس دوران شیر خان نے مری اور ایبٹ آباد کے درمیان کی وادی کی گلیوں اور دیہات کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اگلے روز وہ ایک بس میں سوار ہوئے جو کوہ مری جا رہی تھی۔

یہ ستمبر کا مہینہ تھا۔ پہاڑی علاقے میں سردی شروع ہو گئی تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ جوں جوں بس چڑھائی چڑھ رہی تھی خنکی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بس میں زیادہ رش نہیں تھا۔ کوہ مری کے علاقے کے لوگ ہی سوار تھے۔ پہاڑ پر سیاحت کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ شیر خان نے اس سارے علاقے کا نقشہ پنڈی سے ہی ذہن نشین کر لیا تھا۔ اس نے بعض جگہوں کے نام بھی یاد کر لیے تھے۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ کوہ مری زیادہ بلندی پر واقع ہے جس کی وجہ سے وہاں ستمبر میں ہی سرد ہوائیں چلنے لگتی ہیں مگر نیچے وادی میں اتنی ٹھنڈ نہیں ہوتی۔ ابھی اسلام آباد تعمیر نہیں ہوا تھا۔ کوہ مری کی آبادی میں بھی اتنا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ بس سنی بینک رکی تو پروگرام کے مطابق شیر خان اور روبی بچی کو لیے وہیں اتر گئے۔ شیر خان کلڈنہ روڈ کی طرف چلنے لگا۔ اب روبی نے عائشہ کو کاندھے سے لگا رکھا تھا۔ روبی نے شیر خان سے پوچھا کہ آگے کدھر جانے کا ارادہ ہے؟ شیر خان بولا۔

"پہلے تو تمہیں دوبارہ عورت بنانا بڑا ضروری ہے۔ وہ جگہ ٹھیک رہے گی۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ستمبر کے مہینے میں کوہ مری باہر سے آنے والوں سے تقریباً خالی ہو جاتا ہے۔ کم از کم اس زمانے میں خالی ہو جایا کرتا تھا اور لوگ میدانوں میں اتر جاتے تھے۔ کلڈنہ روڈ چھوٹی سی بڑی خاموش سڑک ہوا کرتی تھی۔ چیڑھ کے درختوں میں گھری ہوئی۔ ایک طرف پہاڑیوں کی چڑھائی اور دوسری طرف نیچے گہری سبز کشادہ وادیاں جن کے ٹیلوں پر جو اور مکئی کے کھیت سیڑھیوں کی شکل میں دور سے نظر آتے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کے پتے جھڑنے لگے تھے۔ خزاں کا' سردیوں کا موسم شروع ہو رہا تھا۔ شیر خان سڑک سے ہٹ کر چڑھائی پر جھاڑیوں کی طرف آ گیا۔ وہ بچی کو لے کر وہاں بیٹھ گیا اور روبی تھیلا لیے دوسری جھاڑیوں اور چیڑھ کے درختوں کے پیچھے کپڑے بدلنے چلی گئی۔ تھوڑی

دیر بعد وہ درختوں سے نکلی تو پوٹھوہار کی دیہاتی عورتوں کے لباس میں تھی۔ اگرچہ اس کے سر کے بال لمبے نہیں تھے۔ مگر اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر کوئی عورت پوچھے گی تو وہ یہی بتائے گی کہ بیماری کی وجہ سے اس کے بال گرنے لگے ہیں۔ کلڈنہ روڈ کے لوئر ٹوپے والے موڑ پر وہ نیچے ایک کچی پگ ڈنڈی پر ہو گئے جو نیچے وادی کے چھوٹے چھوٹے دیہات میں چلی گئی تھی۔ شیر خان نے بھی سویٹر پہن لیا تھا۔ روبی نے بچی کو بھی لال رنگ کا سویٹر پہنا کر سر پر گرم اونی ٹوپی بھی اوڑھا دی تھی۔

وادی بڑی خوبصورت اور پرسکون تھی۔ ٹیلوں پر اونچے نیچے دیہاتی مکان بکھرے ہوئے تھے۔ ہر مکان کے آگے کھیت اور پھل دار باغ تھے۔ درمیان میں پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ وہاں وہ رک گئے اور سامنے والے دیہات کی طرف دیکھا۔ روبی نے ایک گاؤں کی طرف اشارہ کیا جس میں چار پانچ ہی دیہاتی مکان تھے۔ کہنے لگی۔

"یہ گاؤں ٹھیک رہے گا۔ کلڈنہ روڈ سے زیادہ دور بھی نہیں ہے اور شہر سے اس کا کوئی بظاہر تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔"

وہ پہلے مکان کے سامنے جوار کے چھوٹے سے کھیت کے آگے پہنچ کر رک گئے۔ سامنے کچا مکان تھا جس کی چھت ڈھلوان تھی پیچھے ایک چھوٹی سی کوٹھری بھی تھی جس کے باہر خشک لکڑیوں اور سرکنڈوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا کلہاڑی کو پتھر پر رگڑ رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کونے میں چیڑھ کے درخت کے نیچے بندھی بھینس دھو رہی تھی۔ شیر خان اور روبی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر دیہاتی آدمی اٹھ کھڑا ہوا اور خالص پوٹھواری لہجے میں بولا۔

"آپ لوگوں کو کہاں جانا ہے؟"

روبی اور شیر خان نے سلام کیا اور اسے مختصر لفظوں میں ایک پہلے سے بنی بنائی کہانی سنا دی کہ ہماری ضلع گجرات میں تھوڑی سی زمین تھی ماں باپ فوت ہو چکے تھے کوئی بہن بھائی نہ تھا کلکتے میں کچھ رشتے دار تھے۔ وہاں جا کر محنت مزدوری کرنے لگا اور وہیں اپنی پسند کی ایک لڑکی سے شادی کر لی جو اب میری بیوی ہے۔ واپس اپنے گاؤں آیا تو رشتے داروں نے جینا حرام کر دیا کیونکہ وہ اپنی برادری میں میری شادی کرنا چاہتے تھے یہاں آ کر

میری بیٹی بھی دنیا میں آ گئی۔ جب گاؤں میں زندگی گزارنی مشکل ہو گئی تو اپنی تھوڑی سی زمین اونے پونے بیچ باچ کر اپنی گھر والی اور بچی کے ساتھ ان پہاڑیوں میں نکل آیا ہوں۔ اس خیال سے کہ یہاں رہ کر محنت مزدوری کروں گا اور رشتے داروں کے جھگڑوں سے دور سکون کی زندگی گزار دوں گا۔ اس دیہاتی کی بیوی بھی ان کے قریب آ گئی تھی اور شیر خان کی باتیں سننے لگی تھی۔ دیہاتی نے پوچھا۔

"مگر تم دونوں نے یہ علاقہ ہی کیوں چن لیا یہاں تو کوئی محنت مزدوری بھی نہیں ہے۔" شیر خان نے روبی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اصل میں میری بیوی سلطانہ پیچھے پہاڑی علاقے کی رہنے والی ہے اس کی خواہش تھی کہ ہم کسی خوبصورت پہاڑی علاقے میں جا کر رہیں گے۔ بس اسی خیال سے یہاں آ گیا ہوں۔ میرے پاس کچھ رقم ہے۔ آپ وہ لے لیں اور مجھے یہاں چھوٹا سا کچا کوٹھا بنانے میں میری مدد کریں۔ میں اور میری بیوی کھیتی باڑی بھی کر لیں گے۔"

شیر خان نے صدری کی جیب سے دس ہزار روپے کے نوٹ نکال کر دیہاتی کے سامنے رکھے تو اس کے ذہن میں شیر خان اور اس کی بیوی کے بارے میں جو وسوسے پیدا ہو رہے تھے وہ ایک دم غائب ہو گئے۔ دس ہزار روپے کی رقم اس زمانے میں بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ دیہاتی اور اس کی بیوی کا لہجہ بدل گیا۔ وہ کہنے لگا۔

"میرا نام کرم دین ہے اور میری بیوی کا نام داراں ہے۔ تمہیں نیا کوٹھا ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم ہمارا مکان ہی خرید لو۔ ہماری کوئی اولاد نہیں ہے۔ کوئی قریبی رشتے دار بھی یہاں نہیں ہم بوڑھے ہو رہے ہیں۔ تم ہماری اولاد کی طرح ہو۔ یہ مکان آج سے تمہارا ہے۔ ایک بھینس ہے۔ یہ دو کھیت ہیں۔ آگے جیسے تمہاری مرضی میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا۔" اتنا کہہ کر کرم دین نے دس ہزار کے نوٹ شیر خان کو واپس کر دیے۔ شیر خان نے جلدی سے نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی کرم دین! ہم نے تمہارا مکان خرید لیا یہ اس کا معاوضہ سمجھ لو۔ تم میرے بڑے بھائی ہو آج سے اور یہ تمہاری بھابی ہے ہم دونوں کھیتی باڑی کے کام میں تمہارا ہاتھ بٹائیں گے۔ کرم دین نے روپے اپنے پاس رکھ لئے اتنے روپے اکٹھے اس کے پاس زندگی میں

بھی نہیں آئے تھے وہ اور اس کی بیوی بڑے خوش تھے۔

شیر خان کرم دین کے ساتھ کھیتوں کی دیکھ بھال کرتا۔ بھینس کے لئے چارہ بھی کاٹ کر لے آتا۔ روبی بھی گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں کرم دین کی ادھیڑ عمر بیوی داراں کا اس کے منع کرنے کے باوجود ہاتھ بٹاتی۔ مگر اس کی ساری توجہ اپنی بیٹی عائشہ کی پرورش کی طرف تھی۔ کوہ مری جا کر شیر خان بچی کے لئے بہت اعلیٰ کوالٹی کے دودھ کے ڈبے فراک، سویٹر، گرم ٹوپی، جرابیں اور دنیا جہان کی چیزیں لے آیا تھا۔ کرم دین اور داراں کے واسطے بھی وہ گرم چادریں الگ لایا تھا۔ اس دور افتادہ پہاڑی علاقے میں انہوں نے گویا ایک طرح سے نئی زندگی کا آغاز کیا تھا دو مہینے بعد انہوں نے عائشہ کو بھینس کے دودھ میں ذرا پانی ڈال کر پلانا شروع کر دیا۔ شیر خان نے کرم دین کو کچھ نئی بکریاں بھی خریدوا دیں۔ جن سے اس کا مقصد گوشت حاصل کرنا تھا۔ سردیوں کا موسم آ گیا۔ یہاں سخت سردی پڑتی تھی۔ دسمبر میں برف بھی گرنے لگی۔ وادی کی نچان میں ہونے کے باعث وہاں تک آتے آتے برف ہلکی پڑ جاتی تھی۔ سردیوں کا موسم بھی گزر گیا۔

شیر خان روبی اور عائشہ کی صحت بڑی اچھی ہو گئی تھی۔ عائشہ اب غوں غاں کرنے لگی تھی اور مکان کے صحن میں لڑھکتی پھرتی تھی۔ ایک سال اس پہاڑی گاؤں کے مکان میں گزر گیا۔ چھ سات مکان ہی تھے وہاں لوگ بڑے سادہ اور شریف۔ تھے وہ بھی شیر خان کو اپنا بھائی سمجھنے لگے تھے۔ شیر خان ضرورت کے وقت ان کی دل کھول کر مدد کر دیا کرتا تھا۔ ان کے پاس ابھی کافی روپے تھے۔ وہاں روپے خرچ ہی کہاں ہوتے تھے۔ ہر ماہ شیر خان کرم دین کو ایک لگی بندھی رقم الگ دے دیا کرتا تھا۔ پہلے تو روبی کا خیال تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک پولیس کی نظروں سے دور نہیں رہ سکے گی۔ لیکن جب ایک سال گزر گیا اور کوئی واقعہ نہ ہوا۔ کوئی پولیس والا اس کی تلاش میں وہاں نہ آیا تو اسے بھی کچھ کچھ یقین ہونے لگا کہ وہ قانون کی پہنچ سے باہر ہو گئی ہے اور اگر ساری زندگی نہیں تو کم از کم چھ سات سال اپنی بچی اور خاوند کے ساتھ وہاں ضرور گزار سکے گی۔ لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ پنجاب پولیس کی نظروں سے جرم کرنے کے بعد بچ نکلنا کچھ انہونی سی بات ہے کہتے ہیں انگریزوں کے دور میں انگلستان کے اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں سے اگر قتل کا کوئی معمہ حل نہیں ہوتا تو وہ پنجاب پولیس کے کسی افسر کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے۔ پنجاب پولیس جان بوجھ کر چشم پوشی سے کام نہ لے تو کوئی مجرم ان کی زد سے باہر نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ کراچی کی پولیس کے ساتھ پنجاب کی پولیس بھی روبی اور شیر خان کی تلاش میں تھی مشکل صرف اتنی تھی کہ پولیس کا دور افتادہ پہاڑی دیہات کی طرف خیال نہیں گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں میاں بیوی اپنی بچی کے ساتھ کسی بڑے شہر میں چھپے ہوئے ہوں گے یا پھر قبائلی علاقے کی طرف نکل گئے ہوں گے۔ چنانچہ پولیس کی ایک پارٹی ملزمہ کی تلاش میں بنوں کی طرف بھی

جا چکی تھی۔ مگر ایک سال گزر جانے کے بعد بھی پولیس کو روبی اور شیر خان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ آخر پنجاب پولیس ان دونوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی۔

آباد ہونے کو تو شیر خان اور روبی پہاڑی گاؤں میں آباد ہو گئے تھے مگر یہاں کا رہن سہن ان کے لئے نیا تھا۔ وہ جنوبی مشرقی ایشیا کے بہت حد تک جدید شہروں میں رہتے آئے تھے چنانچہ انہیں بعض شہری چیزوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اس کے لئے شیر خان کوہ مری کا مہینے میں ایک خفیہ چکر لگایا کرتا تھا خفیہ ان معنوں میں کہ وہ شام کا اندھیرا ہو جانے کے بعد کلڈنہ جانے والی سڑک سے ہوتا ہوا سٹی بینک کے عقبی پہاڑی راستے سے گزر کر مال پر ڈاک خانے کے پچھواڑ نکل آتا اور یہاں سے لوئر بازار میں داخل ہو کر جو چیزیں لینی ہوتیں وہ خرید کر تھیلے میں ڈالتا اور گرم کمبل میں منہ سر چھپائے اسی راستے سے واپس چل دیتا۔ سیزن کے دنوں میں یہاں کافی رش ہوتا ہے۔ میدانی علاقوں سے لوگوں کے ہجوم یہاں آئے ہوتے ہیں۔ ان دنوں کسی کا شیر خان کی طرف دھیان نہ جاتا تھا۔ مگر سیزن ختم ہونے کے بعد جب برفباری شروع ہو گئی تو شیر خان کو بہت محتاط رہنا پڑتا تھا کیونکہ مال پر اکا دکا مقامی لوگ ہی دکھائی دیتے تھے۔ برفباری کا پہلا سیزن گزر گیا۔ موسم بہار بھی نکل گیا۔

دوسرے سیزن میں برفباری شروع ہوئی تو ایک روز شیر خان ضروری چیزیں خریدنے کے لئے گاؤں کی چڑھائی چڑھ کر کلڈنہ روڈ پر آگیا۔ یہ پہلی برفباری تھی اور بڑی ہلکی برف گر رہی تھی دو روز پہلے بجری بھی گری تھی۔ سخت ٹھنڈ تھی۔ کوہ مری کا علاقہ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں سے بالکل خالی ہو چکا تھا۔ صرف مقامی لوگ ہی وہاں موجود تھے اور ان ہی کے واسطے لوئر بازار کھلا رہتا تھا۔ اب شیر خان شام کو نہیں بلکہ دن میں گھر سے نکل پڑتا تھا اس نے چھوٹی سی چادر اوڑھ رکھی تھی تاکہ کوئی آسانی سے اسے پہچان نہ سکے۔ یہ ساری احتیاطیں وہ اپنے لئے نہیں کرتا تھا۔ اس نے خود کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ پولیس کو اس کی تلاش بھی نہیں تھی۔ یہ سب کچھ وہ اپنی بیوی اور محبوبہ روبی کی خاطر کرتا تھا کیونکہ روبی اس کے ساتھ رہتی تھی اور نہ جانے کتنے خون کر چکی تھی اور جیل توڑ کر بھی بھاگی ہوئی تھی اور پولیس کو اس کی تلاش تھی وہ چاہتا تھا کہ روبی اب ہمیشہ کے لئے اس کے پاس اس کی پیاری بیٹی عائشہ کے پاس رہے چنانچہ وہ چاروں طرف سے چوکس ہو کر کوہ مری کے لوئر

بازار کی طرف جاتا تھا۔

اس روز ہلکی برفباری میں شیر خان حسب عادت سنی بینک سے ہی بائیں جانب ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا یہ راستہ جو اوپر مال روڈ کے ڈاک خانے کے پچھواڑے نکلتا تھا بڑا دشوار گزار تھا باقاعدہ راستہ نہیں تھا دیہاتی لوگوں نے چل چل کر بنا دیا تھا اب سنا ہے کہ وہاں باقاعدہ چھوٹی پکی سڑک بنا دی گئی ہے مگر جس زمانے کی ہم کہانی بیان کر رہے ہیں اس زمانے میں ادھر سے صرف دیہاتی لوگ ہی گزرتے تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں کہیں کہیں چڑھائی اتنی مشکل تھی کہ پتھروں اور جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر اوپر چڑھنا پڑتا تھا۔ اور آدمی جب ڈاک خانے والی سڑک پر پہنچتا تو اس کا سانس دھونکنی کی مانند تیز تیز چل رہا ہوتا تھا۔ شیر خان ابھی جوان تھا سخت جان تھا اور اسے اس راستے سے جانے کی عادت بھی ہو گئی تھی۔ برف باریک باریک سفید پتیوں کی شکل میں گر رہی تھی۔

مال پر آنے کے بعد شیر خان جونہی ڈاک خانے کے چوک سے ہو کر لوئر بازار میں اترا تو کونے والے ایک چھوٹے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ یہ کراچی پولیس کا مخبر تھا اور شیر خان کی شکل سے اچھی طرح واقف تھا اس وجہ سے پنجاب پولیس نے اسے کراچی سے منگوایا ہوا تھا وہ شیر خان کو دور ہی سے پہچان سکتا تھا شیر خان پولیس کو اس لئے مطلوب تھا کہ پولیس کو یقین تھا کہ اب اصل مجرمہ روبی بھی شیر خان کے ساتھ ہی رہ رہی ہے۔ مخبر نے کمبل کی بکل اور چھوٹی داڑی میں بھی شیر خان کو پہچان لیا تھا۔ یہ مخبر اصل میں شیر خان اور اس کی مفرور بیوی ہی کی تلاش میں پنڈی سے پشاور کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں وہ پنڈی رک گیا اور پھر یہاں اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے کی غرض سے کوہ مری آگیا تھا آج وہ واپس پنڈی جا رہا تھا کہ برفباری شروع ہو گئی اور وہ چائے پینے کے لئے وہاں رک گیا۔ شیر خان کو پہچانتے ہی مخبر ہوشیار ہو گیا۔ چائے اسے بھول گئی۔ اس نے چائے کے پیسے وہیں میز پر رکھے اور لوئر بازار میں شیر خان کے پیچھے اتر گیا۔ شیر خان اپنے خیال میں ایک دکان کے باہر کھڑا ولایتی صابن اور بے بی پاؤڈر اور خوشبو دار تیل کی شیشی خریدنے میں مصروف تھا۔ اسے کوئی خبر نہیں تھی کہ پولیس کا ایک آدمی اس کے پیچھے لگ گیا ہے اور آگے اس کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب آنے

والا ہے۔

اس نے ضرورت کی چیزیں خرید کر تھیلے میں رکھیں اور واپس چل پڑا۔ مخبر بھی اس کی طرف پیٹھ کئے ایک دکان کے باہر کھڑا یونہی دکان پر رکھی ہوئی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ شیر خان اس کے عقب سے گزر گیا جب وہ دس بارہ قدم کے فاصلے پر پہنچا تو مخبر نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ شیر خان نے لوئر بازار کے باہر سیروز سینما کے باہر ایک ادھ کھلی دکان سے کچھ خشک میوے خرید کر تھیلے میں رکھ لئے وہ بڑی بے فکری سے واپس جا رہا تھا۔ ڈاک خانے کی عقبی سڑک پر ایک جگہ سے وہ ڈھلان اتر گیا مخبر بڑا تجربہ کار تھا وہ جانتا تھا کہ پہاڑی راستہ دور تک خالی ہے اور جب تک شیر خان کوئی موڑ نہیں گھومتا وہ اسے کسی بھی وقت سر گھما کر دیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ مخبر نے درمیان میں کافی فاصلہ ڈال دیا۔ برف اس طرح ہلکی ہلکی گر رہی تھی شیر خان اپنے خیال میں چلتا گیا۔ مخبر بھی اس کے پیچھے لگا رہا اسے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی اسے قطعی یقین تھا کہ اس کی بیوی مفرور قاتلہ روبی بھی اس کے پاس ہی رہ رہی ہو گی۔

شیر خان اپنے گاؤں والے مکان میں داخل ہوا تو مخبر وہاں سے تھوڑی دور ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا تھا اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان عورت نے اس کے لئے دروازہ کھولا تھا یہ روبی تھی مخبر نے اسے بھی پہچان لیا تھا وہ وہیں سے واپس ہوا اور سیدھا سنی بینک آکر راولپنڈی جانے والی ایک بس میں سوار ہو گیا۔ بس تقریباً خالی تھی راولپنڈی پہنچتے ہی اس نے لاہور انسپکٹر شہباز کو جو اس کیس کی تفتیش کر رہا تھا یہ خوشخبری سنائی کہ مفرور قاتل عورت روبی کا سراغ مل گیا ہے۔ انسپکٹر شہباز کے لئے یہ بڑی قیمتی خبر تھی وہ اسی وقت پولیس پارٹی لے کر روانہ ہوا اور رات کے ایک بجے راولپنڈی میں پہنچ گیا۔ پنڈی میں یہ پولیس پارٹی صرف پانچ منٹ کے لئے رکی اور مخبر کو ساتھ لے کر کوہ مری کی طرف چل پڑی۔ انسپکٹر شہباز رات کے اندھیرے میں چھاپہ مار کر مفرور قاتلہ کو گرفتار کر لینا چاہتا تھا دن کے وقت اس کے ادھر ادھر نکل جانے کا ڈر تھا۔ پولیس پارٹی دو بند جیپوں میں سوار تھی۔ پنڈی سے سوا ایک بجے رات یہ جیپیں بارہ کھوہ سے نکل کر مری کی طرف رواں تھیں۔ ابھی اسلام آباد نہیں بنا تھا اور بری شاہ امام سے سیدھی سڑک کوہ مری کی پہاڑیوں

کی طرف جاتی تھی۔ ابھی راول ڈیم بھی نہیں بنا تھا۔

دوسرے طرف شیر خان روبی اپنے مکان کی کوٹھری میں خوب گرم ہو کر گہری نیند سو رہے تھے بیٹی عائشہ کو روبی نے اپنے ساتھ سلایا ہوا تھا شیر خان ساتھ والی چارپائی پر لحاف اوڑھے سویا ہوا تھا۔ طاق میں مٹی کا دیا روشن تھا جس کی بتی نیچی کر دی گئی تھی اور کوٹھری میں بے معلوم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اچانک بچی رونے لگی۔ روبی کی آنکھ کھل گئی اس نے بچی کو بہلانے کی کوشش کی مگر وہ روتی رہی۔ روبی سمجھ گئی کہ عائشہ کو بھوک لگی ہے۔ وہ اس کے منہ میں چوسنی دے کر نعمت خانے کے پاس گئی جہاں جالی کے اندر دودھ رکھا ہوا تھا پانی سے بوتل دھو کر اس نے کوٹھری کے باہر جا کر چولہے میں آگ جلا کر دودھ نیم گرم کیا اسے بوتل میں ڈال کر ہلا رہی تھی کہ اس کے کانوں نے ایک آواز سنی یہ آواز کسی جیپ کے رکنے کی تھی اور اوپر کلڈنہ روڈ کی طرف سے آئی تھی۔ روبی کا ہاتھ بوتل ہلاتے ہلاتے وہیں رک گیا اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ ٹیلوں کی اونچی اونچی ڈھلانوں پر سفید برف کی بہت ہلکی سی تہہ چادر کی طرح بچھی تھی ستاروں کی چمک میں روبی نے اپنی نگاہیں اوپر کلڈنا روڈ کے چیڑھ کے درختوں پر جما دیں جو اندھیرے میں خاموش کھڑے تھے اتنے میں ایک دوسری جیپ کے کھڑے ہونے کی آواز آئی۔

روبی کے بدن میں خون کی گردش تیز ہو گئی وہ تیزی سے کوٹھری میں گئی بچی کے منہ سے چوسنی نکل گئی تھی اور وہ بھوک کی وجہ سے رو رہی تھی شیر خان لحاف میں لیٹے ہی لیٹے روبی کو آوازیں دے رہا تھا روبی نے دودھ کی بوتل بیٹی کے منہ میں لگا دی اور شیر خان کا لحاف پیچھے ہٹا کر کہا۔

"اٹھو میرا ریوالور اور گولیاں کہاں رکھی ہیں؟"

"کیا ہوا؟" شیر خان جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ روبی نے آہستہ سے کہا۔

"اونچی آواز نہ نکالو۔ ساتھ والی کوٹھری میں داراں اور اس کا خاوند سو رہے ہیں۔"

شیر خان نے پوچھا۔

"آخر ہوا کیا ہے۔ ریوالور کیوں مانگ رہی ہو؟" روبی نے بڑے جذباتی انداز میں کہا بلکہ اس کے منہ سے جیسے اپنے آپ یہ الفاظ نکل گئے۔

"شیر خان! شاید جدائی کا وقت آگیا ہے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتی کیا بات ہے؟" شیر خان نے روبی کو پیار سے جھڑک کر کہا روبی لپک کر دروازے کے پاس گئی اس کا ایک پٹ کھول کر باہر اندھیرے میں دیکھا اور پھر جلدی سے واپس آکر بولی۔

لگتا ہے کسی نے مخبری کر دی ہے۔ پولیس یہاں چھاپہ مارنے والی ہے میں نے اوپر کلڈنہ روڈ پر دو جیپوں کے کھڑے ہونے کی آواز سنی ہے۔" شیر خان نے کہا۔

"تمہیں کیسے پتا کہ وہ پولیس کی جیپیں ہیں ملٹری کی گاڑیاں بھی ہو سکتی ہیں۔" روبی نے کہا۔

"ملٹری کی گاڑیاں یہاں رات کے وقت کھڑی نہیں ہوا کرتیں۔ گزر جایا کرتی ہیں یہ پولیس پارٹی ہے میں جاتی ہوں تم عائشہ کا خیال رکھنا۔ اگر میں زندہ واپس نہ آئی تو اس کی پرورش اسی طرح کرنا جس طرح میں نے تمہیں ہدایت کی ہے۔" شیر خان نے روبی کو بڑے پیار سے اپنے پاس بٹھا کر تسلی دینے کی کوشش کی اور کہا۔

تم یہاں بیٹھو میں جا کر دیکھتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔ روبی رسی پر لٹکتی ہوئی شیر خان کی گرم جیکٹ اتار کر جلدی جلدی پہننے لگی۔

"جو میں کہتی ہوں وہ کرو۔ ریوالور کہاں ہے؟"

"کونے والے ٹرنک میں ہے" یہ کہہ کر شیر خان کوٹھری سے باہر نکل گیا باہر رات بڑی سرد تھی اس نے اوپر کلڈنہ روڈ کی طرف گھور کر دیکھا وہاں سوائے چیڑھ کے اونچے اونچے سیاہ درختوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ پلٹ کر کوٹھی میں آیا تو روبی بچی کو گود میں لئے اسے دودھ پلا رہی تھی اور دیے کی ہلکی روشنی میں اسے ممتا بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ریوالور اور گولیوں کی بیلٹ اس کے قریب ہی چارپائی پر پڑی تھی روبی نے عائشہ کا ماتھا چوما اسے بستر میں لٹا کر لحاف اوپر کیا اور بیلٹ میں سے جلدی جلدی گولیاں نکال کر جیکٹ کی جیب میں ڈالنے لگی۔ شیر خان نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

"کیا کر رہی ہو، پاگل ہو گئی ہو؟ اس وقت کہاں جاؤ گی؟ ریوالور مجھے دو پولیس کو میری لاش پر سے گزر کر تم تک پہنچنا ہو گا۔" روبی کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔

اس نے شیر خان کو گریبان سے پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا اور اپنی آواز کو دباتے ہوئے بولی۔

"جب تک میری بچی زندہ ہے تمہیں نہیں مرنا۔ سنا تم نے؟ اسے اپنے دل پر لکھ رکھو۔ اگر تم میری بچی کو شیرنی بنائے بغیر مر گئے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

شیر خان روبی کی خصلت سے واقف تھا اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا۔

"مگر باہر تو کوئی نہیں ہے۔ یہاں پولیس نہیں آسکتی تمہیں خواہ مخواہ شک ہو گیا ہے۔" روبی نے ساری گولیاں جیکٹ کی جیب میں ڈال لی تھیں اتنے میں باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی پتھر اونچائی سے گرا ہو۔ روبی نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا اور تڑپ کر دروازے کی طرف لپکی ذرا سا پٹ کھول کر باہر دیکھا پھر پلٹ کر کہنے لگی۔

"جو کچھ میں نے کہا ہے اسے یاد رکھنا شیر خان اس پر عمل کرنا عائشہ کو شیرنی بنانا اسے کہنا کہ پاکستان کو امن سلامتی کا ملک بنانا ہے۔ یہاں سے جرائم اور تخریب کاری کا خاتمہ کرنا ہے باقی مجھے الفاظ نہیں مل رہے ہے تم جانتے ہو پاکستان کو اسلام کا قلعہ کس طرح بنانا ہو گا۔" پھر نہ جانے روبی کے اندر کس جذبے نے جوش مارا یا اسے آنے والے حالات کا علم ہو گیا تھا وہ دوڑ کر شیر خان کی طرف آئی بے اختیار اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر اس کا ماتھا چوما اور عجیب سی ملکوتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میرے شیر! میں نے تمہاری قدر نہیں پہچانی مجھے معاف کر دینا اس لئے کہ سوائے تمہارے میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔"

اس سے پہلے کہ شیر خان اس سے وفا شعار بیویوں والی محبت کا کوئی جواب دیتا روبی دروازہ کھول کر کوٹھری سے باہر نکل گئی۔ شیر خان اس کے پیچھے آیا اس نے آخری بار اپنی دلیر اور وفا شعار بیوی کو احاطے کی دیوار کی دوسری طرف سے نیچے ڈھلان اترتے دیکھا یہ روبی کی آخری جھلک تھی جو شیر خان نے دیکھی۔ اسے اپنے مکان کے پیچھے بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔ شیر خان نے اندر آکر کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا اس کے کان باہر کی آوازوں پر لگے تھے سرد ویران پہاڑی رات کے سناٹے میں کچھ آدمیوں کے جلدی جلدی احاطے میں سے گزرنے کی آواز آئی اور دوسرے لمحے کسی نے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹایا ساتھ ہی اونچی آواز میں کہا۔

"شیر خان! اپنی بیوی کو لے کر باہر آجاؤ۔ تم لوگ اب بھاگ نہیں سکتے۔" شیر خان نے دروازہ کھول دیا۔ باہر انسپکٹر شہباز چار سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں پستول تھا شیر خان نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میری بیوی یہاں ہے؟ وہ تو مجھے اور اپنی دودھ پیتی بچی کو چھوڑ کر کب کی خدا جانے کہاں جا چکی ہے۔"

پولیس کوٹھری میں گھس آئی۔ ٹارچ کی روشنی میں ہماری کوٹھری کی تلاشی لی ٹرنک کھول دیکھے ان میں زنانہ کپڑوں کو نکالتے ہوئے انسپکٹر شہباز نے گرج دار آواز میں پوچھا۔

"اگر تمہاری بیوی یہاں نہیں ہے تو پھر یہ زنانہ کپڑے کس کے ہیں؟"

انسپکٹر نے شیر خان کی طرف پستول کا رخ کیا اور بولا۔

"شیر خان تمہاری چالاکی یہاں تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گی۔ ہمیں پورا علم ہو چکا ہے کہ تمہاری بیوی اور مفرور قاتلہ روبی اسی گھر میں تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔ سیدھی طرح ہمیں بتا دو کہ وہ کہاں چھپی ہوئی ہے نہیں تو تمہارا وہ حشر ہو گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

شیر خان کوئی روایتی انداز کا شریف آدمی تو تھا نہیں کہ مصلحت اندیش اور رواداری سے کام لیتا اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور کہا۔

"انسپکٹر صاحب! میں مجرم نہیں ہوں اس سے پہلے بھی پولیس مجھے کافی تنگ کر چکی ہے اور اسے کچھ حاصل نہیں ہوا اس لئے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میری بیوی اپنی جان بچائے کہاں ماری ماری پھر رہی ہے۔ اگر تم نے میرے ساتھ اب کوئی زیادتی کی تو میں نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں اور میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں اپنی عزت کی حفاظت کرنی جانتا ہوں۔"

شیر خان کے بارے میں انسپکٹر شہباز کو پوری معلومات تھیں یہ بات اس کے علم میں تھی کہ شیر خان قیام پاکستان سے پہلے برما سنگاپور ہانگ کانگ میں بڑا نامی گرامی اور قاتل قسم کا اسمگلر رہ چکا تھا مگر پاکستان آکر شریفانہ زندگی بسر کر رہا تھا اور اس نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا تھا سوائے اس جرم کے کہ اس نے پولیس کو مطلوب ایک مفرور قاتلہ کو اپنے پاس پناہ

دی تھی جو اتفاق سے اس کی بیوی بھی تھی۔ انسپکٹر شہباز کچھ سنبھل گیا اس نے پولیس کو حکم دیا کہ چاروں طرف پھیل جاؤ اور مجرمہ کو تلاش کرو وہ یہیں کہیں چھپی ہو گی پھر شیر خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ "وہ ہم سے بچ کر کہیں نہیں جا سکے گی لیکن تمہیں اسی گھر میں رہنا ہو گا جب تک کہ تمہاری بیوی کو ہم پکڑ کر قانون کے حوالے نہیں کرتے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر شہباز بھی کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

عائشہ رونے لگی تھی شیر خان نے دودھ کی بوتل کو دیکھا وہ خالی ہو چکی تھی۔ گلاس میں باقی دودھ اسی طرح پڑا تھا اس نے بوتل میں باقی کا دودھ بھی ڈال دیا بوتل کو بچی کے منہ کے ساتھ لگایا اور سوچنے لگا کہ روبی کا اندازہ کس قدر صحیح تھا اگر وہ ذرا دیر کر دیتی تو اس وقت پولیس اسے ہتھکڑی لگا کر اپنے ساتھ لے جا رہی ہوتی۔ یہ سوچ کر شیر خان کا دل بوجھل ہو گیا کہ خدا جانے روبی اتنی سرد رات میں کس طرف نکل گئی ہو گی۔

پولیس والوں کے شور سے کرم دین اور اس کی بیوی واراں کی بھی آنکھ کھل گئی تھی مگر وہ دونوں اپنی کوٹھری سے باہر نہیں نکلے تھے۔ جب پولیس چلی گئی تو وہ شیر خان کے پاس آئے اور کرم دین نے پوچھا۔

"شیرو بیٹا! کیا بات تھی؟ یہ پولیس کس کی تلاش میں آئی تھی؟" شیر خان بولا۔

"کیا بتاؤں بھائی کرم دین! رشتے داروں نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔ حالانکہ میں اپنے حصے کی زمین بھی ان میں بانٹ آیا تھا۔ مگر پھر بھی انہوں نے مجھ پر جھوٹا مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ پولیس اسی سلسلے میں مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آئی تھی۔" کرم دین اور واراں نے روبی کی چارپائی خالی دیکھی تو اس کے بارے میں پوچھا۔

"روبی کہاں ہے؟" شیر خان کو کچھ نہ کچھ جواب ضرور دینا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہی سب سے بڑی مصیبت ہوئی ہے کہ میرے رشتے داروں نے روبی کے خلاف بھی مقدمہ درج کرا دیا ہے کہ وہ ان کا روپیہ لے کر بھاگ گئی ہے۔ پولیس میری بیوی کی تلاش میں ہی آئی تھی۔" کرم دین نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

"یہ تو بڑی بری بات ہوئی ہے۔ بچی کہاں ہے؟" شیر خان بولا۔ "وہ پولیس کو دیکھ کر کہیں باہر جا کر چھپ گئی ہے۔" واراں کہنے لگی۔

"ہائے میں مر گئی۔ بے چاری اتنی سردی میں کہاں چھپی ہو گی۔ میں باہر جا کر دیکھتی ہوں۔" شیر خان نے اسے روک دیا اور کہا۔

"نہیں نہیں بھابی! ابھی نہیں۔ پولیس چلی جائے گی تو وہ خود بخود واپس آ جائے گی۔"

کرم دین اور واراں جانے لگے تو شیر خان نے ان کے شکوک کو دور کرنے کی کوشش میں کہا۔

"بھلا روبی کو چوری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارے پاس تو اپنے پیسے کافی تھے۔"

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔" واراں نے شیر خان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا اور پھر عائشہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ سو گئی ہے۔ شیر خان نے کہا۔

"ہاں! دودھ پی کر سو گئی ہے۔" کرم دین اور اس کی بیوی چلے گئے۔

شیر خان باہر نکل کر روبی کو تلاش کرتا۔ اسے معلوم تھا کہ روبی پولیس سے بچنے کے لئے اب تک نہ جانے کہاں نکل چکی ہو گی۔ وہ سوچنے لگا کہ ان کی مخبری کس نے کی ہو گی؟ بہر حال مخبری بڑی صحیح ہوئی تھی اور اب یہ گاؤں بھی یہ علاقہ بھی پولیس کی مسلسل نگرانی میں آ گیا تھا اور اس حقیقت کے پیش نظر روبی کوئی خاص موقع دیکھ کر ہی واپس آئے گی۔ شیر خان کا چہرہ اس خیال سے اداس ہو گیا کہ نہ جانے ملاپ اور فرار کا یہ دردناک کھیل کس مقام پر جا کر ختم ہو گا۔ وہ لحاف اوپر کر کے چارپائی پر لیٹ گیا۔ عائشہ اپنی پلنگڑی پر چھوٹے سے لحاف کے اندر گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس سے بے پناہ پیار کرنے والی اور موت کی گہری خندقوں کو پار کر کے بار بار اس کے پاس آنے والی اس کی ماں برفباریوں کی شدید سردی اور یخ بستہ سرد رات میں نہ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہو گی۔ شیر خان کا ذہن سخت پریشان تھا۔ باقی رات اس نے جاگ کر گزار دی۔

جب دن نکلا اور سورج نے اپنی سنہری روشنی پہاڑی ڈھلانوں پر بچھی ہوئی برف کی سفید چادر پر پھیلائی تو پہاڑی کوؤں کے بولنے کی آواز سے روبی کی آنکھ کھل گئی۔ جس خستہ حال کوٹھری میں اس نے باقی رات گزاری تھی وہ وادی کے ایک ویران مقام پر چیڑھ کے اونچے درختوں کے درمیان واقع تھی۔ اس کوٹھری کا دروازہ غائب تھا اور ڈھلواں چھت ایک طرف سے بیٹھ گئی تھی۔ کوٹھری میں کلہاڑی سے کاٹی ہوئی درختوں کی شاخیں

بھری ہوئی تھیں۔ روبی اپنی گرم جیکٹ میں سمٹ سمٹا کر یہاں ایک طرف پڑی تھی۔ دروازے میں سے دن کی روشنی دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنی جیکٹ کی تلاشی لی۔ بھرے ہوئے ریوالور اور خالی گولیوں کے علاوہ ایک جیب میں سے ایک سو باسٹھ روپے ملے۔ اسے اپنے گاؤں والے مکان سے اتنی عجلت میں بھاگنا پڑا تھا کہ وہ زیادہ رقم نہ رکھ سکی تھی۔ ایک چادر وہ اپنے ساتھ گھر سے اٹھا لائی تھی جو اس نے جیکٹ کے اوپر اوڑھ رکھی تھی۔ اسی چادر کے پلو سے اس نے اپنا سر بھی ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے بال لمبے ہو گئے تھے۔ وہ عورت کے حقیقی روپ میں تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ پولیس اسے گرفتار کرنے کے لئے اسی علاقے میں چاروں طرف موجود ہو گی۔ ایسی صورت حال میں اسے کس طرف کو نکل جانا چاہیے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ چکی ہے۔ یہ سارا علاقہ اب اس کے لئے غیر محفوظ تھا۔ وہ کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر اپنی آئندہ زندگی کا کوئی منصوبہ بنانا چاہتی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ ایسی جگہ کونسی ہو سکتی ہے۔ اس کے ذہن میں دارا کے جگری دوست میاں خان کا خیال آگیا۔ میاں خان ایک دلیر اور قابل اعتبار آدمی تھا۔ اس کے فارم میں کچھ روز کے واسطے پناہ مل سکتی تھی۔ اس کے بعد جو ہونا ہو گا ہوتا رہے گا۔ یہ فیصلہ کر کے روبی خستہ حال دیہاتی کوٹھری سے باہر نکل آئی۔ وادی میں دن کا سنہری اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ یہاں برف تو نہیں تھی مگر سردی بہت تھی۔ ڈھلان کے زینہ نما کھیتوں میں کہیں کہیں پانی سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

روبی نے اپنے آپ کو چادر میں اچھی طرح سے لپیٹا۔ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں دیے اور ایک پگڈنڈی پر چلنے لگی۔ اس کا رخ راولپنڈی کی طرف تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پر آگئی جہاں اسے دور پتلی سی سڑک نظر پڑی جو پہاڑی کے ساتھ ساتھ سانپ کی طرح بل کھاتی نیچے میدانی علاقے کی طرف چلی جاتی تھی۔ ایک ٹرک رینگتا ہوا چل رہا تھا جو کھلونا لگ رہا تھا۔ درمیان میں گہری کھائی تھی۔ روبی اندازے سے ایک طرف چل پڑی۔ جوں جوں وہ نیچے اتر رہی تھی سردی کم ہو رہی تھی۔ اسے پسینہ آگیا۔ ایک جگہ سے پانی کا جھرنا بہہ رہا تھا۔ اس کے پاس بیٹھ کر روبی نے پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ تھوڑا

آرام کیا اور اس کے بعد پھر چل پڑی۔ سورج سر پر آ چکا تھا کہ روبی پنڈی کو جاتی سڑک کے قریب پہنچ گئی۔ سیزن ختم ہو چکا تھا۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کافی وقفے کے بعد کوہ مری کی طرف سے آنے والی کوئی لاری یا ٹرک سڑک پر سے گزر جاتا تھا۔ روبی بہت دور سے پہاڑی رستوں پر چل کر آئی تھی۔ وہ تھک گئی تھی اور اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ مگر سڑک پر آ کر کسی لاری یا ٹرک کو ہاتھ دے کر روکنا اس کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ سڑک کے نیچے ڈھلان میں آگے کو چلنے لگی۔ ایک جگہ سے وہ چڑھائی چڑھ کر سڑک پر نکل آئی۔ یہاں موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سردی کی شدت ختم ہو گئی تھی اور پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے پل کے پاس ایک لڑکا بیٹھا چھلیاں یعنی مکئی کے بھٹے بھون رہا تھا۔ روبی نے اس سے دو تین بھٹے لیے اور وہیں سڑک کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ کر کھانے لگی۔ وہ بالکل دیہاتی لباس میں تھی۔ صرف جیکٹ شہریوں والی تھی جو چادر کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ شلوار موٹے کپڑے کی تھی۔ سر چادر کے پلو سے ڈھکا ہوا تھا۔ روبی نے لڑکے سے پوچھا کہ پنڈی وہاں سے کتنی دور ہے؟ لڑکے نے بتایا کہ چھتر وہاں سے ایک فرلانگ پر ہے جہاں سے پنڈی کے میدان شروع ہو جاتے ہیں۔ لڑکے نے کہا۔

"تم یہاں سے کسی لاری پر بیٹھ جاؤ۔ وہ تمہیں پنڈی پہنچا دے گی۔"

روبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایک لاری کو مری کی طرف سے آتے دیکھ لیا تھا اس میں بیٹھنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر جونہی لاری قریب پہنچی لڑکے نے اٹھ کر اسے ہاتھ کا اشارہ کر دیا۔ لاری رک گئی۔ لڑکے نے روبی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بی بی! اس میں بیٹھ جاؤ۔ یہ پنڈی جا رہی ہے۔"

روبی نے گردن موڑ کر لاری کی طرف دیکھا لاری تقریباً خالی تھی۔ دو چار دیہاتی آدمی بیٹھے تھے۔ روبی نے سوچا کہ اب جو ہو سو ہو۔ پنڈی تک وہ پیدل نہیں جا سکتی اور وہ لاری میں سوار ہو گئی۔ کنڈیکٹر نے اس سے کرایہ لے کر ٹکٹ دے دیا اور لاری پنڈی کی طرف چل دی۔ روبی پچھلی سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی اور چادر سے آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ لاری پنڈی کے مضافات میں سے گزر کر پنڈی شہر میں داخل ہو گئی۔

روبی نے ایک جگہ لاری کو رکوایا اور نیچے اتر گئی۔ ابھی اسلام آباد قائم نہیں ہوا تھا اور شہر میں ٹریفک کا زیادہ رش نہیں تھا۔ رکشہ وغیرہ بھی ابھی چلنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ روبی ریلوے اسٹیشن پر جانا چاہتی تھی تاکہ وہاں سے لاہور جانے والی کوئی گاڑی پکڑ کر شاہدرہ تک جائے اور وہاں سے شیخوپورہ کا راستہ اختیار کر کے میاں خان کے فارم پر پہنچ جائے۔ وہ ایک سواریوں والے تانگے میں بیٹھ گئی جس میں عورتیں بھی بیٹھی تھیں اور وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ پنڈی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئی۔ یہاں ریلوے پولیس کے کچھ سپاہی بھی اسے نظر آئے تھے۔ وہ تھرڈ کلاس کے کھلے ویٹنگ روم میں آ کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ کچھ دوسری عورتیں بھی بال بچوں کے ساتھ وہاں بیٹھی تھیں روبی نے معلوم کیا کہ لاہور جانے والی گاڑی دوپہر کے بعد ساڑھے تین بجے چلے گی۔ روبی کو وہاں دو اڑھائی گھنٹے گزارنے تھے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر خوامخواہ لوگوں کی نگاہوں میں نہیں آنا چاہتی تھی لہٰذا وہیں دیہاتی عورتوں کی طرح چادر سے منہ سر ڈھانپے بیٹھی رہی۔ جو مسافر عورت اس کے قریب بیٹھی تھی اس نے روبی سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کیا وہ اکیلی ہے؟ روبی نے ادھر ادھر کی من گھڑت باتوں سے اس کی تسلی کر دی۔ پھر اسی کے ذریعے لاہور کی ایک ٹکٹ بھی منگوا لی اور وہیں بیٹھ کر روٹی بھی کھائی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ترچھی نظروں سے آس پاس کا جائزہ لے لیتی تھی کہ کہیں کوئی پولیس کا سپاہی یا خفیہ پولیس کا آدمی تو وہاں نہیں ہے۔

ابھی تک اس قسم کا کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ دو بجے دوپہر روبی اسی دیہاتی مسافر عورت کے ساتھ پلیٹ فارم پر آ گئی اور ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس عورت کے ساتھ دو بچے اور کچھ سامان بھی تھا۔ جب تین بج گئے تو انہیں یہ خبر ملی کہ جس گاڑی نے تین بجے لاہور جانے کے لئے پشاور سے آنا تھا وہ کسی وجہ سے منسوخ ہو گئی ہے اور اب لاہور جانے والے مسافروں کو رات کے دو بجے والی گاڑی ہی مل سکتی ہے۔

مسافروں میں بے چینی سی دوڑ گئی۔ کچھ مسافر وہاں سے لاری اڈے کی طرف چل دیئے مگر روبی مسافر عورت کے ساتھ وہیں پلیٹ فارم پر ہی بیٹھی رہی۔ اس وقت تک ادھر کوئی پولیس والا نہیں آیا تھا۔ وہاں کچھ دوسری عورتیں اور مرد بھی اپنا اپنا سامان رکھے بیٹھے

رہے تھے۔ رات ہو گئی پلیٹ فارم پر روبی نے مسافر عورت کے ساتھ ہی روٹیاں اور آلو شوربہ منگوا کر کھا لیا۔ وہ اس خیال سے مطمئن تھی کہ سفر رات کو کٹے گا اور وہ صبح صبح لاہور پہنچے گی۔ خدا خدا کر کے رات کے دو بجے اور پشاور سے گاڑی وہاں پہنچ گئی۔ دوسری عورتوں کے ساتھ روبی بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گئی۔ رات کا سفر شروع ہو گیا۔ پنڈی سے نکلتے ہی عورتیں جہاں بیٹھی تھیں، وہیں سو گئیں۔ روبی کی بھی آنکھ لگ گئی۔ بیچ بیچ میں آنکھ کھلتی تو ٹرین شور مچاتی جا رہی تھی۔ پہاڑیوں میں ہی پو پھٹ گئی تھی اور دن کا اجالا طلوع ہونے لگا تھا۔ ٹرین جہلم رکی تو ایک درمیانی عمر کی صحت مند عورت دیہاتی لباس میں ڈبے میں داخل ہوئی۔ روبی سامنے والی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ اس عورت نے روبی پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور بالمقابل سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ روبی کو محسوس ہوا کہ عورت کو اس نے پیچھے کسی اسٹیشن پر دیکھا تھا اور یہ ڈبے میں جھانکتی ہوئی گزر گئی تھی لیکن اس نے کوئی خیال نہ کیا۔ کیونکہ ہو سکتا تھا اس عورت کو کسی دوسرے ڈبے میں مناسب سیٹ نہ ملی ہو۔ اس نے روبی سے باتیں شروع کر دیں اور باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔

"بہن! تم کہاں جا رہی ہو؟" روبی نے رازداری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"کراچی جا رہی ہوں۔" اتنی سردی نہیں رہی تھی جس کے باعث روبی نے چادر اتار کر پاس رکھ لی تھی اور اس کی مردانہ جیکٹ نظر آ رہی تھی۔ عورت نے جیکٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ جیکٹ تو گرم ہے۔ لگتا ہے تم کوہ مری سے آ رہی ہو؟" روبی کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ کہیں یہ عورت خفیہ پولیس والی نہ ہو۔ یہ سوچ کر روبی نے بے نیازی سے کہہ دیا۔

"یہ جیکٹ تو میں نے راولپنڈی سے خریدی تھی۔ دراصل مجھے سردی بڑی جلدی لگ جاتی ہے اس لئے پہن لی ہے۔"

روبی کھڑکی سے سر باہر نکال کر پلیٹ فارم کی دوسری طرف تکنے لگی۔ اس کے بعد روبی نے عورت کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اگر وہ کوئی سوال کرتی تو اس کا ہوں ہاں میں

جواب دے کر خاموش ہو جاتی مگر اس کے دل میں شک پڑ گیا تھا کہ یہ عورت پولیس سے تعلق رکھتی ہے۔ لالہ موسیٰ آیا تو وہ عورت ڈبے سے اتر گئی۔ روبی کھڑکی میں سے اسے پلیٹ فارم پر جاتے دیکھتی رہی۔ وہ عورت گیٹ میں سے گزر گئی۔ ٹکٹ دکھانے کی بجائے اس نے گیٹ پر کھڑے ٹکٹ چیکر سے زبانی کوئی بات کی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ عورت لالہ موسیٰ نہیں جا رہی تھی بلکہ کسی خاص منصوبے کے تحت وہاں اتری ہے۔ روبی اپنے ڈبے میں ہی بیٹھی رہی۔ اس کی جیب میں بھرا ہوا ریوالور اور گولیاں موجود تھیں اور ہر صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھی۔

ٹرین تھوڑی دیر کو لالہ موسیٰ کے اسٹیشن پر رک کر لاہور کی طرف چل پڑی۔ روبی سوچنے لگی کہ اگر یہ خفیہ پولیس والی ہے تو سیدھی پولیس اسٹیشن گئی ہو گی جہاں سے وزیر آباد پولیس کو اس کی اطلاع کر دی جائے گی اور بہت ممکن ہے کہ وزیر آباد اسٹیشن پر پولیس روبی کو گرفتار کرنے کے لئے گھات لگائے بیٹھی ہو۔ اس خیال سے روبی کچھ پریشان ضرور ہو گئی۔ کیونکہ وہ پولیس مقابلہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ابھی تک کسی بے گناہ کا خون نہیں کیا تھا اور خاص طور پر قانون کا تحفظ کرنے والوں پر تو اس کا پستول کبھی نہیں اٹھا تھا۔ اس نے آج تک جتنے قتل کیے تھے وہ سب جرائم پیشہ اور بڑے خطرناک قسم کے خونی اور عصمتوں کے ڈاکو تھے۔ مگر وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ابھی اس نے معاشرے کے جسم کے بہت سے ناسوروں کو ہمیشہ کے لئے کاٹ کر پھینکنا تھا۔ اب اس کی زندگی کا واحد مقصد ہی یہی تھا اور اسی مقصد کے لئے وہ زندہ تھی۔ مرنے سے پہلے وہ جتنے زہریلے سانپ مار سکتی تھی مار دینا چاہتی تھی۔ پاک وطن کی فضا کو گھناؤنے بدکار لوگوں سے جتنا پاک کر سکتی تھی پاک کر دینا چاہتی تھی۔

اب ایک ایسا اتفاق ہوا کہ وزیر آباد ریلوے اسٹیشن سے تھوڑی دور پہلے ریلوے لائن پر اچانک ایک بھینس انجن سے ٹکرا گئی۔ گاڑی روک دی گئی۔ روبی کے لئے قدرت نے جیسے خود ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔ وزیر آباد اسٹیشن کے شہر کی مضافاتی آبادی شروع ہو چکی تھی۔ روبی فوراً وہاں ٹرین سے اتر گئی۔ اس کے ساتھ سفر کرنے والی دیہاتی عورت اس سے پوچھتی ہی رہ گئی کہ کہاں جا رہی ہو۔ ٹرین چل پڑے گی۔ مگر روبی نے کوئی جواب نہ

دیا۔ وہ ٹرین کی الٹی سمت چلنے لگی۔ اور پھر ٹرین کی دوسری طرف آ کر ڈھلان اتر کر ایک کھیت میں داخل ہو گئی جہاں جوار کی اونچی فصل کھڑی تھی۔ فصل نے اسے اپنے اندر چھپا لیا۔ وہ تیز تیز چلتی گئی۔ ایک کھیت سے نکل کر دوسرے اور دوسرے سے نکل کر تیسرے کھیت میں سے ہوتی ہوئی ایک کھلی جگہ پر آ گئی جہاں پیپل کے گنجان درخت کے قریب ایک ویران کنواں تھا۔ روبی نے جیکٹ میں سے ریوالور گولیاں اور پیسے نکال کر اپنی قمیص کے اندر چھپائے اور جیکٹ کنوئیں میں پھینک دی۔ اس جیکٹ سے وہ دور ہی سے پہچانی جا سکتی تھی۔

دوسری طرف جب ٹرین وزیر آباد اسٹیشن پر پہنچی تو وہاں پولیس پہلے سے موجود تھی۔ اس نے خفیہ پولیس والی عورت کے بتائے ہوئے نمبر والے زنانہ ڈبے پر اچانک چھاپہ مار کر روبی کی تلاش شروع کر دی۔ مگر وہاں جیکٹ والی کوئی عورت نہیں تھی۔ دوسری عورتوں سے پوچھ گچھ کرنے پر پولیس کو پتا چلا کہ جیکٹ والی عورت پیچھے جہاں ٹرین تھوڑی دیر کو رکی تھی اتر گئی تھی۔ پولیس پیچھے دوڑ پڑی۔ مگر اس وقت تک روبی ان کی پہنچ سے نکل چکی تھی۔ وہ کھیتوں کے پار ایک میدان عبور کر کے ایک لاری میں بیٹھ کر لاہور کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اس زمانے میں پولیس کے پاس وائرلیس سیٹ نہیں ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ جب پولیس پارٹی مفرور قاتلہ روبی کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی تو وہ وہیں سے جیپ میں گوجرانوالہ کی طرف روانہ ہو گئی تا کہ وہاں سے آگے اسٹیشن اور جی ٹی روڈ کی ناکہ بندی کی جا سکے۔ مگر اسی اثنا میں روبی کی لاری گوجرانوالہ سے آگے نکل گئی تھی۔ پولیس نے گوجرانوالہ پہنچ کر سڑک کی ناکہ بندی کر دی اور لاریوں کی پڑتال ہونے لگی۔ وہاں سے ٹیلی فون پر شاہدرہ کو خبر کر کے شاہدرہ چوک پر بھی پولیس متعین کروا دی گئی۔

جس لاری میں روبی سوار تھی جب وہ شاہدرہ چوک پہنچی تو روبی نے دیکھا کہ وہاں سڑک کی ایک جانب چھ سات لاریاں کھڑی تھیں اور پولیس ہر لاری میں سواریوں کی پڑتال کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے چادر لپیٹ کر اٹھی اور لاری کے پچھلے دروازے سے اتر گئی۔ یہ بات اب ثابت ہو گئی تھی کہ جہلم اسٹیشن پر جو عورت اس کے ڈبے میں داخل ہوئی تھی وہ خفیہ پولیس کی سپاہن تھی اور اسی نے پولیس کو اس کے پیچھے لگا دیا ہے۔ آگے دریائے

راوی تھا جس پر ابھی دوسرا پل نہیں بنا تھا مگر روبی کو شیخوپورہ کی طرف جانا تھا۔ شیخوپورہ کو ایک پکی سڑک شاہدرہ چوک ہی سے پھوٹتی تھی۔ روبی اندازے سے شیخوپورے والی سڑک کی طرف چلنے لگی۔ اسے کچھ فاصلے پر ٹاہلی کے درختوں کے درمیان شیخوپورہ والی سڑک نظر آ گئی مگر وہاں پولیس کی ایک جیپ کھڑی دیکھ کر روبی الٹے قدم واپس مڑ گئی۔ گویا یہ سارا علاقہ پولیس نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اس نے اپنا رخ دریائے راوی کے پل کی طرف کر دیا۔ لیکن پل پر بھی پولیس سے آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔ وہ شاہدرہ چوک کے قریب اسی مقام پر تھی جہاں کبھی کھجوروں کے جھنڈ ہوا کرتے تھے اور ملکہ نور جہاں کا مقبرہ ان کی بائیں جانب تھا۔ یہاں کچے پر ایک منزلہ مکانوں کی چھوٹی سی بستی تھی۔ وہ کچھ وقت کسی مکان کی چار دیواری میں گزارنا چاہتی تھی تاکہ خطرہ ٹل جائے اور وہ رات کے وقت شیخوپورہ کی طرف روانہ ہو۔ وہ سمجھ دار عورت تھی۔ زندگی کا اسے بڑا تجربہ تھا اور ہر صورت حال کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہتی تھی وہ کچی بستی میں داخل ہو گئی۔

یہاں آمنے سامنے بنے ہوئے کچے مکان تھے جن کے درمیان کچی گلی تھی جہاں ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک عورت دروازے کے باہر بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ یہ غریب محنت کش مزدوروں کی کوئی کچی آبادی تھی۔ روبی نے اس عورت کو جا کر سلام کیا جو کچے مکان کے باہر بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ مکان کے دروازے پر ٹاٹ پڑا تھا۔ عورت ادھیڑ عمر تھی۔ اس نے وعلیکم السلام کہہ کر روبی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کس سے ملنا ہے بی بی؟" روبی نے سب کچھ پہلے ہی سے سوچ لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"میں راولپنڈی سے یہاں اپنی ماسی سے ملنے آئی تھی۔ پتا چلا کہ انہوں نے گھر بدل لیا ہے۔ یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں۔ میرے پاس کچھ پیسے تھے وہ لاری میں کسی نے نکال لیے ہیں۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" برتن دھونے والی عورت دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی اٹھی اور بولی

"کوئی بات نہیں بہن! یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے۔ چلو اندر چل کر کچھ کھا پی لو۔" اس نے اپنی دونوں بیٹیوں کو باری باری آواز دی

"صغراں ...... نی ...... خورشید کہاں مر گئی ہو۔ روٹی والی چنگیر اور ساگ ہانڈی میں سے

ڈال کر لے آؤ۔" پیچھے ایک کچی کوٹھری تھی۔ باہر کونے میں مٹی کے دو گھڑے گڑونچیوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ایک بکری کونے میں بندھی تھی۔ عورت نے روبی کو چارپائی پر بٹھایا کوٹھری میں سے دو نوجوان لڑکیاں باہر نکلیں جن کی عمریں سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ ہوں گی۔ انہوں نے روبی کو غور سے دیکھا۔ ان کی ماں نے ساری بات بتا دی۔ ایک لڑکی کے ہاتھ میں روٹیوں والی چنگیر تھی جس میں ساگ والا پیالہ بھی رکھا تھا۔ دوسری لڑکی جلدی سے پانی کا گلاس لے آئی۔ عورت بولی۔

"یہ میری بیٹیاں ہیں صغراں چھوٹی ہے خورشید اس سے ڈیڑھ سال بڑی ہے۔ بس یہی دو بچیاں ہیں۔"

روبی خاموشی سے روٹی کھانے لگی۔ دونوں لڑکیاں اس کے سامنے پیڑھی پر بیٹھ گئیں اور اس کی طرف بڑے شوق سے تکنے لگیں۔ ان کی ماں نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں بیٹھی گھور گھور کر کیا دیکھ رہی ہو جاؤ اندر جا کر صفائی کرو۔ پھر کپڑے لا کر دھو۔" دونوں لڑکیاں آپس میں کھسر پھسر کرتی اور ہنستی ہوئی اندر چلی گئیں۔ روبی نے پوچھا۔

"تمہارا خاوند کیا کام کرتا ہے؟" عورت بولی۔

"وہ لاری اڈے پر محنت مزدوری کرتا ہے اور ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ غریب ہیں اس کچی آبادی میں اپنی عزتوں کو سنبھال کر بیٹھے ہوئے ہیں مگر بی بی زمانہ بڑا خراب آ گیا ہے یہاں کچھ بدمعاش ہیں جن کے ڈر سے میں صغراں اور خورشید کو گھر سے باہر نہیں جانے دیتی۔" روبی نے کہا۔

"تم ان دونوں کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں۔" عورت نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"کیا کروں بہن ...... اتنے پیسے ہی نہیں۔ بستی کے سبھی لڑکے نشہ کرتے ہیں رشتہ داروں میں کوئی لڑکا نہیں ہے بس خدا پر ڈوری چھوڑ رکھی ہے۔"

روبی بڑے مزے سے ساگ کے ساتھ روٹی کھا رہی تھی۔ روبی اس غریب مگر انتہائی مہمان نواز شریف خاتون کی کچی کوٹھری کے آگے چارپائی پر بیٹھی ساگ روٹی کھا رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ یہ اس کی زندگی کا آخری کھانا ہے۔ ٹھیک اسی وقت کچی آبادی کی اسی بینگی ٹیڑھی گلی کی نکڑ والی ایک کوٹھری میں تین جرائم پیشہ آدمی بیٹھے ٹین کے ڈبوں

میں دیسی شراب پی رہے تھے۔ یہ وہ بدمعاش تھے جنہوں نے کچی آبادی اور آس پاس کی بستیوں کے شریف لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ جس کی چاہے کھڑے کھڑے بے عزتی کر دیتے تھے اور عورتوں کو اغوا کر لیتے تھے۔ کچھ بااثر افراد ان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ اور ان میں سے ہر آدمی پیسے لے کر ایک ایک بے گناہ کو قتل بھی کر چکے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام ماکھا دوسرے کا نام شیفا اور تیسرے کا نام بھانا تھا۔ تینوں ہٹے کٹے تھے اور شراب چڑھاتے ہوئے ایک دوسرے سے فحش مذاق بھی کر رہے تھے شفیع نے آنکھ مار کر کہا۔

"نہر والا ڈیرہ کب سے خالی پڑا ہے۔ کچھ کام دکھا دینا چاہیے۔" بھانا اور ماکھا اس کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ ماکھا نے کہا۔

"تو پھر چلو مختاراں۔ کے گھر۔ وہاں سے مال لے کر سیدھا ڈیرے پہنچ جاتے ہیں۔" بھانا کہنے لگا۔

"اٹھو یار۔ اسی عورت نے ہمارے خلاف علاقے کے کونسلر کے آگے...... شکایت بھی کی تھی۔ آج اسے مزا چکھا ہی دینا چاہیے۔" تینوں بدمعاش کوٹھری سے باہر نکل کر اس عورت کے گھر کی طرف چلے۔

روبی روٹی کھانے کے بعد چارپائی پر بیٹھی خورشید اور صغراں کی ماں مختاراں سے یونہی ادھر ادھر کی باتیں کر کے کچھ وقت گزار رہی تھی۔ اس کا پروگرام یہ تھا۔ کہ ذرا شام کا اندھیرا ہو جائے تو وہ وہاں سے نکل کر شیخوپورہ والی بس پکڑ لے اور میاں خان کے فارم میں رات ہونے سے پہلے پہنچ جائے ابھی تک اسے اس امر کا اطمینان تھا کہ پولیس اس کا پیچھا کرتی کچی آبادی میں نہیں پہنچی تھی۔

اسی لمحے ایک دم دروازے کا ٹاٹ ہٹا اور تینوں بدمست بدمعاش ہاتھوں میں پستول لئے اندر گھس آئے۔ مختاراں کی چیخ نکل گئی۔ خورشید اور صغراں بھی چیخیں مارتی ہوئی کوٹھری میں گھس گئیں ماکھے نے بڑک مار کر کہا۔

"بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔ چل اوئے شفیع نکال ان دونوں کو باہر۔" شفیع نے ایک بڑک مار کر پستول کے دو ہوائی فائر کر دیے اور کوٹھری کی طرف لپکا روبی بھی جلدی سے اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ بھانے نے اپنی سرخ آنکھوں سے روبی کی طرف گھور کر

دیکھا اور اوپر والے ہونٹ پر اپنی زبان پھیر کر بولا۔

"اوئے ماکھے۔ یہ تو کوئی نئی بادشاہ زادی ہے۔"

ماکھے نے جھومتے ہوئے کہا۔

"چلو اس بادشاہ زادی کو بھی لے چلو۔ فائرنگ کے دھماکوں کی آواز سن کر کچی آبادی کے لوگوں نے اپنی اپنی کوٹھریوں کے دروازے بند کر لیے تھے اتنے میں شیفا کوٹھری سے چیختی چلاتی دونوں کنواری اور شریف لڑکیوں کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ اس کی ماں دوپٹہ پھیلا کر بدمعاش سے رحم کی بھیک مانگنے لگی۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"خدا کے لئے میری بچیوں کو چھوڑ دو مجھ پر رحم کرو۔"

بھانے نے عورت کے منہ پر اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔ ماکھے نے خورشیداں کو اور شیفے نے صغراں کو دبوچ لیا۔ بھانے نے پستول کی نالی کو چوما اور روبی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"میری جان تم بھی چلو۔ تمہیں اپنے ڈیرے کی سیر کراتے ہیں۔"

روبی کا ہاتھ اس دوران قمیص کے اندر جا چکا تھا۔ جونہی بدمعاش نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ روبی نے بدمعاش کے سینے کا نشانہ لیا۔ بڑے اطمینان سے اوپر تلے دو فائر کر دیے۔ بھانے کے سینے سے خون کے فوارے ابل پڑے۔ دوسرے بدمعاش ایک سیکنڈ کے لئے ساکت ہو کر رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ یہ دیہاتی عورت اچانک ریوالور نکال کر اس کے ساتھی کا خون کر دے گی۔

یہ صورتحال دیکھ کر شیفا صغراں کو گردن سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کوٹھری سے باہر نکل گیا۔ ماکھے نے پستول سے روبی پر فائر کیا مگر اس کا نشانہ چوک گیا۔ دوسرا دھماکہ روبی کے ریوالور کا تھا۔ روبی کا نشانہ کبھی دور سے بھی نہیں چوکا تھا اور یہ درندہ صفت آدمی تو اس سے بھی چار قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ روبی کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی نے ماکھے کی کھوپڑی اڑا دی۔ اس کا بھیجہ بکھر گیا۔ مختاراں دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ روبی اس کی بیٹی صغراں کو بچانے کے لئے باہر کو دوڑ پڑی۔

شیفا بدمعاش اس وقت صغراں کو کھینچتا ہوا۔ ریلوے لائن کی طرف لیے جا رہا تھا۔

صغراں چیخ رہی تھی مگر جیسے کہ اکثر ہوتا ہے کوئی شریف آدمی اس کی مدد کو نہیں آرہا تھا۔ بلکہ لوگ وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ تھوڑی دور پولیس کے دو سپاہی بھی کھوکے کے باہر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انہوں نے فائرنگ کی آواز سن لی تھی اور جب علاقے کے بدمعاش شیفے کو ایک لڑکی اغوا کر کے لے جاتے دیکھا تو جان بوجھ کر انجانے بن گئے۔ روبی شیفے کے پیچھے دوڑی۔ شیفے بدمعاش نے صغراں کو اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ روبی اس پر فائر نہیں کر سکتی تھی۔ صغراں اس کے چنگل میں کبھی دائیں آجاتی تھی اور کبھی بائیں۔ شیفے نے اپنے پیچھے روبی کو دیکھا تو رک کر دو فائر جھونک دیے۔ ایک گولی روبی کے قریب سے گزر گئی دوسری گولی اس کے بائیں بازو کو چیر گئی۔ روبی کا بازو ایسے گرم ہو گیا جیسے کسی نے انگاروں میں ڈال دیا ہو مگر وہ رکی نہیں۔ اس نے بدمعاش کی ٹانگ پر فائر کیے مگر اسے گولی نہ لگ سکی۔ ریلوے لائن کے قریب پہنچ کر شیفے نے محسوس کیا کہ اس کا مقابلہ کسی تجربے کار عورت سے ہے۔ چنانچہ اس نے اچانک پستول کی نالی چیختی چلاتی خدا کے واسطے دیتی صغراں کی کنپٹی سے لگا دی۔ اور روبی کی طرف للکار کر کہا۔

"اگر تم واپس نہ گئیں تو میں صغراں کا خون کر دوں گا۔"

روبی وہیں رک گئی۔ اس کے زخمی بازو سے خون ابل ابل کر اس کے پاؤں تک بہہ رہا تھا۔ بدمعاش نے ایک بار پھر بڑک ماری اور للکار کر روبی سے کہا۔

"پیچھے چلی جا۔ چلی جا یہاں سے نہیں تو میں اسے گولی مارنے لگا ہوں۔" اب کچھ لوگ تماشا دیکھنے کے واسطے ادھر ادھر محفوظ جگہوں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ مکانوں کی چھتوں پر بھی کچھ عورتیں اور مرد دکھائی دے رہے تھے۔ روبی نے سوچا کہ اگر وہ وہاں سے ہٹ گئی تو پھر ایک شریف لڑکی کی عزت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لٹ جائے گی۔ اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اسے معاشرے میں کوئی قبول نہیں کرے گا۔ اس نے پیچھے ہٹنے کی بجائے شیفے بدمعاش کے سر کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ یہ روبی کی بد قسمتی تھی کہ اب اس کا نشانہ چوک گیا دوسرے لمحے شیفے بدمعاش کے پستول نے شعلے اگلے اور دو گولیاں روبی کے سینے میں آکر پیوست ہو گئیں روبی کو یوں لگا جیسے اس کے جسم میں آگ لگ گئی ہو گرتے گرتے اس نے ایک فائر کر دیا۔ یہ گولی شیفے بدمعاش کی گردن کے ایک حصے کے لوتھڑے اڑاتی نکل

گئی۔ ادھر روبی گری ادھر شیفا بدمعاش گرا۔

صغراں اس کی گرفت سے نکل کر دہشت زدہ حالت میں اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ روبی کا سانس رکنے لگا تھا اس کی آنکھوں میں شیر خان اور اپنی بیٹی عائشہ کی شکلیں گھومنے لگیں۔ دونوں گولیوں نے اس کے پھیپھڑے اڑا دیئے تھے۔ وہ خون میں لت پت ریلوے لائن کے قریب زمین پر پڑی تھی اور اس کا خون مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ اب لوگ دوڑ کر اس کے قریب آگئے تھے اور روبی کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے خون میں ڈوبا دیکھ رہے تھے۔ روبی میں ابھی کچھ جان باقی تھی اس نے ایک مرتبہ ہاتھ اوپر اٹھایا۔ اس کے ہونٹ ذرا سا ہلے شاید وہ کچھ بتانا چاہتی تھی۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ میرے محبوب خاوند شیر خان کو جا کر بتا دو کہ اس کی روبی نے اپنے آپ کو ایک شریف لڑکی کی ناموس پر قربان کر دیا ہے۔ اسے جا کر بتا دو کہ اس کی پیاری روبی اب اس دنیا سے جا رہی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ اسے کہو کہ میں اپنی بیٹی کو اپنی عائشہ کو اپنی شیرنی کو اس کے پاس چھوڑے جا رہی ہوں۔ اسے کہو کہ وہ عائشہ کو ایسی شیرنی بنائے جو پاکستان کے تخریب کاروں اور جرائم پیشہ بدمعاشوں کے لئے آدم خور بن جائے اور بے سہارا عورتوں کی حفاظت کرتے ہوئے اگر اسے جان بھی قربان کر دینی پڑے تو اپنی جان بھی قربان کر دے۔ اس کے ساتھ ہی روبی نے آخری سانس لیا اور اپنی جان اللہ کے سپرد کر دی۔

ریلوے لائن کے پاس لاہور کے مضافات کی ایک کچی آبادی کے باہر روبی کی لاش پڑی تھی۔ لوگ لاش کے قریب نہیں آرہے تھے۔ ان کے سامنے اس جانباز عورت روبی نے ایک غریب بیوہ عورت مختاراں کی دو جوان بیٹیوں کی عزت بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی تھی۔ اس نے علاقے کے تین بدکردار غنڈوں کو سب کے سامنے قتل کر کے غریب بیوہ کی عزت کو تار تار ہونے سے بچا لیا تھا مگر خود بھی قتل ہو گئی تھی۔ عورتیں کچے مکانوں کی چھتوں پر کھڑی روبی کی لاش کو عقیدت و احترام کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں مرد مکان کے دروازوں پر بیٹھے آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اس اجنبی عورت کی بہادری اور دلیری کی تعریف کر رہے تھے۔ ایک آوارہ کتا ریلوے لائن سے اتر کر روبی کی لاش کے قریب آیا مگر ڈر کر جدھر سے آیا تھا ادھر کو بھاگ گیا۔ ہاں ...... مرے ہوئے شیر کی بھی ایک دہشت ہوتی ہے۔ اتنے میں پولیس بھی وہاں پہنچ گئی۔ انسپکٹر نے روبی کو پہچان لیا اور حوالدار جبار علی سے کہا۔

"یہ تو وہی مفرور قاتلہ ہے جس کی ایک عرصے سے پولیس کو تلاش تھی اور جو اشتہاری قرار دے دی گئی تھی۔"

پوسٹ مارٹم کے بعد روبی کی لاش کو پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ ضروری کارروائی کے بعد روبی کا کیس داخل دفتر کر دیا گیا اور راولپنڈی کے تھانہ بارہ کھوہ کو روبی کی لاش کی فوٹو بھیج کر ہدایت کی گئی کہ وہ اس کے خاوند شیر خان کو اطلاع کر دے۔ بارہ کھوہ پولیس کو علم تھا کہ شیر خان قریبی پہاڑی علاقے کی ایک وادی کے گاؤں میں رہتا ہے۔ روبی کو پکڑنے کے لئے پولیس نے وہاں سی۔ آئی۔ ڈی بھی لگا رکھی تھی۔ شیر خان کو جب روبی

کی لاش کی تصویر ملی تو وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ اس کی بچی عائشہ دالان میں گھٹنوں کے بل چل کر ربڑ کی گیند سے کھیل رہی تھی۔ روبی کی لاش کی تصویر شیر خان کے ہاتھ میں تھی اور تصویر پر' روبی کی لاش پر شیر خان کے آنسو گر رہے تھے۔ اسے اپنی محبت کا وہ زمانہ یاد آرہا تھا جب اس نے روبی کو پہلی بار برما کے سرحدی جنگل میں اسمگلروں کے ڈیرے پر دیکھا تھا اور پہلی نظر میں ہی وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔

شیر خان کی نگاہوں میں محبت کے پہلے زمانے کی حسین تصویریں گھومنے لگیں۔ اسے روبی کی آواز اس کے قہقہے اس کی شرمیلی مسکراہٹیں اس کی دلیرانہ باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ روبی کا ایک نہ ایک روز یہی انجام ہونے والا تھا مگر وہ اپنی محبت کا یہ انجام نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ روبی کا ماضی جیسا بھی تھا مگر اس نے پاکستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور اب پاکستان کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنانا چاہتی تھی۔ وہ پاکستان کی فضاؤں کو جرائم کی آلودگی سے پاک کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس نے کنارے پر کھڑے ہو کر طوفانوں کا تماشہ نہیں دیکھا تھا بلکہ طوفانوں میں کود کر بلا خیز موجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ حالات نے اسے گناہ اور جرائم کی دلدل میں پھینک دیا تھا مگر روبی نے اس دلدل میں رہ کر بھی جرائم کا مقابلہ کیا اور گناہ کے عفریت کو اسی کی تلوار سے ہلاک کرتی رہی۔ اس نے پاکستان میں آکر قانون کے کسی محافظ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس کے پستول کی گولیاں غریبوں کے حقوق کی حفاظت میں اور بے کس و مجبور عورتوں کی عزتوں پر ڈاکہ ڈالنے والوں پر چلیں اور آخر کار اسی خیر و شر کے میدان جنگ میں لڑتے ہوئے اس نے اپنی جان دے دی۔

یہ ساری باتیں شیر خان کے ذہن میں گونج رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو روبی کی لاش کی تصویر پر گر رہے تھے۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ شیر خان بھی ایک دلیر اور بہادر جوان تھا۔ برما اور لنکا کے جنگلوں میں اس نے قانون شکنیاں ضرور کی تھیں مگر پاکستان پہنچنے کے ساتھ ہی اس نے بھی اس پاک زمین کی مٹی کو چوم کر آنکھوں سے لگایا تھا اور جرائم سے توبہ کر لی تھی لیکن روبی نیکی اور بدی' جرم اور قانون کی جنگ

میں لڑتے لڑتے اتنی دور نکل گئی تھی کہ اب اس کی لاش ہی واپس آسکتی تھی اور ایسا ہی ہوا۔ روبی کی لاش لاہور کے پولیس اسپتال کے مردہ خانے میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔

شیر خان کی سسکیوں کی آواز سن کر اس کی نو عمر بچی عائشہ گیند کی طرف لڑھکتے ہوئے رک گئی۔ اس نے معصوم چہرہ اٹھا کر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ عائشہ اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ باپ اس کی ماں کی لاش کی تصویر ہاتھ میں لئے آنسو بہا رہا ہے۔ شیر خان نے بڑھ کر بچی کو اٹھا لیا۔ اسے سینے سے لگاتے ہی اس کی ہچکی بندھ گئی۔ ساتھ والے گھر میں کرم دین اور اس کی بیوی نے شیر خان کے رونے کی آواز سنی تو دوڑ کر اس کے پاس آگئے۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار شیر خان کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ کرم دین کی بیوی بچی کو اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ کرم دین نے شیر خان کے کندھے پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"شیر خان! اللہ خیر کرے۔ کیا ہوا؟"

شیر خان نے قمیص کے دامن سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے روبی کی لاش کی تصویر کرم دین کی طرف بڑھا دی۔

اگلے روز شیر خان نے بچی کو کرم دین اور اس کی بیوی کے حوالے کیا اور خود بس میں بیٹھ کر پنڈی کی طرف روانہ ہو گیا۔ راولپنڈی سے اس نے دوسری بس پکڑی اور لاہور پہنچ گیا۔ وہ رات گئے لاہور پہنچا تھا۔ رات اس نے لاری اڈے کے پاس ہی ایک ہوٹل میں سوتے جاگتے کسی نہ کسی طرح گزار دی۔ دوسرے دن وہ متعلقہ پولیس اسٹیشن آگیا۔ ایس ایچ او اس کی شکل سے واقف تھا۔ سارا دن ضروری کارروائیوں میں گزر گیا۔ شام کے قریب مردہ خانے لے جا کر روبی کی لاش اس کے حوالے کر دی گئی۔ روبی کی لاش ٹھنڈے فرش پر ایک طرف پڑی تھی۔ چہرے پر موت کی زردی چھائی تھی۔ آنکھیں ذرا ذرا کھلی تھیں۔ جیسے شیر خان کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ رہی ہو۔ شیر خان بے اختیار لاش سے لپٹ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی چیخ کی آواز سنی۔ یہ چیخ زخمی شیر کی دھاڑ کی طرح اس کے سینے سے نکل کر مردہ خانے کی سرد فضا کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ مگر بہت جلد شیر خان نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔ وہ جانتا تھا اسے روتا دیکھ کر روبی کی روح کو تکلیف پہنچے

گی۔ وہ شیر خان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے روبی کی لاش کو یوں اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا جس طرح میدان جنگ میں ایک بہادر سپاہی دوسرے بہادر سپاہی کی لاش کو اٹھاتا ہے۔

شیر خان کے پاس کافی پیسے تھے۔ اس نے ایک پوری ویگن کروا کر روبی کی لاش کو اس میں رکھا اور اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز دوپہر کے وقت وہ گاؤں پہنچ گیا۔ یہاں کرم دین کی بیوی دا راں نے روبی کی میت کو غسل دیا اور اسے کفنا کر چارپائی پر ڈال دیا۔ شیر خان میت کے پاس بیٹھ کر کلمہ شریف کا ورد کرنے لگا۔ اسے کلمہ ہی آتا تھا۔ عائشہ کو ماں کی میت سے قصداً دور رکھا گیا۔ گاؤں کی دوسری عورتیں بھی وہاں آگئیں اور سیپارے کھول کر پڑھنے لگیں۔ شیر خان ان خواتین کے احترام میں میت کے پاس سے اٹھا اور باہر آکر بیٹھ گیا جہاں کرم دین نے تین چارپائیاں بچھا دی تھیں اور اس پہاڑی گاؤں کے جو چند ایک گھر تھے ان کے مرد تعزیت کے واسطے وہاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ گاؤں کے جنوب میں ذرا نیچے خوبانی کے ایک کافی پھیلے ہوئے درخت کے پاس ایک پہاڑی چشمہ بہتا تھا۔ وہیں شیر خان نے اپنی دوست اپنی بیوی روبی کی آخری آرام گاہ تیار کروائی۔ شام ہونے سے پہلے روبی کو اس قبر میں دفنا دیا گیا۔

شیر خان نے خود میت کو لحد میں اتارا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ روبی کو آخری بار اپنے سے جدا کر رہا ہے۔ وہ غم سے نڈھال تھا۔ لحد میں میت کو اتارنے کے بعد شیر خان نے آخری بار اپنی پیاری بیوی کا دیدار کیا۔ روبی کا چہرہ زرد تھا۔ آنکھیں ذرا ذرا کھلی تھیں۔ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کی چیخ نکل گئی۔ کرم دین نے دوسرے لوگوں کی مدد سے شیر خان کو قبر سے باہر نکالا۔ شیر خان ایک طرف بیٹھ کر آنسو بہانے لگا۔ قبر تیار ہو گئی۔ شیر خان پھٹی پھٹی آنکھوں سے روبی کی قبر کو تک رہا تھا۔ اسے وہ دن یاد آگیا جب وہ پہلی بار برما کے جنگل میں روبی سے ملا تھا۔ وہ سنہری بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹک کر اسمگلروں کے اسٹیمر سے نیچے اتر رہی تھی۔ شیر خان نے قبر پر کپکپاتے ہاتھوں سے گلاب کے سرخ پھول ڈالے۔ کرم دین اسے صبر کی تلقین کر رہا تھا۔

روبی کی جواں مرگی نے شیر خان کو جیسے نیم دیوانہ بنا دیا تھا۔ وہ سارا سارا دن اس کی قبر

پر بیٹھا اسے یاد کرتا اور آنسو بہاتا رہتا۔ کرم دین کی بیوی عائشہ کی دیکھ بھال کرتی۔ شیر خان کو کھانے پینے کا ہوش نہیں تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ روبی اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی ہے۔ کرم دین اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔ اسے سمجھاتا۔ صبر کرنے کے لئے کہتا مگر شیر خان کو صبر نہیں آتا تھا۔ اسے روبی اپنی آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی باتیں کرتی ہنستی بولتی نظر آتی۔ اس کی داڑھی بڑھ آئی تھی۔ اسے کپڑے بدلنے کا بھی کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ آدھی آدھی رات کو اٹھ کر بے اختیار روبی کی قبر پر پہنچ جاتا اور اس سے دیوانوں کی طرح باتیں کرتا۔ اسے آوازیں دیتا۔ اسے کہتا کہ تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں! کیا تم اب کبھی مجھ سے بات نہیں کرو گی؟

ایک رات کو ایسا ہوا کہ شیر خان سخت سردی میں روبی کی قبر سے لپٹ کر رو رہا تھا کہ اچانک اسے بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ وہ تڑپ کر پرے جا گرا اور سراسیمگی کے عالم میں قبر کی طرف دیکھنے لگا جو رات کے اندھیرے میں دھندلی دھندلی دکھائی دیتی تھی۔ ابھی وہ سنبھل نہیں پایا تھا کہ اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا ہو۔ ساتھ ہی اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔

"یہاں کیا لینے آجاتے ہو؟ جاؤ جا کر میری بچی کی اسی طرح پرورش کرو جس طرح میں تمہیں کہا کرتی تھی۔ وہ شیرنی کی بیٹی ہے' اسے شیرنی بناؤ۔ اسے اس لائق بناؤ کہ وہ اپنے ناموس کے تحفظ کے ساتھ ساتھ پاکستان کی بے کس و لاچار عورتوں کے ناموس کی بھی حفاظت کر سکے۔ جاؤ .... اپنا فرض اور میری وصیت پوری کرو۔ یہاں کیا لینے آجاتے ہو۔"

شیر خان کے جسم کو ایک اور جھٹکا لگا اور وہ وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وادی میں چاروں طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ خوبانی کے درخت پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ روبی کی قبر پر گلاب کے سرخ پھول ابھی تک ترو تازہ تھے۔ اسے رات کے واقعے کا خیال آرہا تھا۔ وہ آواز اگرچہ روبی کی آواز سے مختلف تھی مگر جو کچھ اس آواز نے شیر خان کو کہا وہ روبی ہی کہہ سکتی تھی۔ شیر خان کلمہ شریف کا ورد کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر سورج کی سنہری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ اسے اپنے اندر ایک نئی

طاقت ایک نئی توانائی کا احساس ہوا۔ اس نے روبی کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر اس کی روح کو ثواب پہنچایا اور دل میں ایک نیا عزم ایک نیا عہد لے کر اپنے مکان کی طرف چل پڑا۔ پتھر کی دیواروں والے چھوٹے سے مکان کے دالان میں کرم دین کی بیوی شیر خان کی بیٹی عائشہ کو دھوپ میں اپنے سامنے بٹھائے اسے دلیا کھلا رہی تھی۔ عائشہ نے اپنا معصوم چہرہ اٹھا کر باپ کو دیکھا۔ شیر خان کو یوں لگا جیسے روبی بچی کی صورت میں اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ عائشہ کی شکل اپنی ماں سے ہو بہو ملنے لگی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر عائشہ کو گود میں اٹھا لیا اور اسے پیار کرتے ہوئے کرم دین کی بیوی سے بولا۔

"داراں بہن! تم جا کر آرام کرو میں دلیا کھلاؤں گا اپنی بیٹی کو۔" داراں اپنے گھر چلی گئی اور شیر خان عائشہ کو دلیا کھلاتے ہوئے اس سے باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے اٹھ کر شیو کی۔ کپڑے بدلے اور بچی کو داراں کے حوالے کر کے کرم دین کو لے کر مکان سے باہر آگیا۔

"کرم دین! میں چاہتا ہوں کہ میرے پاس جو جمع پونجی بچ رہی ہے اسی سے راولپنڈی جا کر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کروں۔ میں اس مقصد کے لئے پنڈی کا ایک چکر لگانے جا رہا ہوں۔ تم عائشہ کا خیال رکھنا میں چند روز تک واپس آجاؤں گا۔" کرم دین نے پوچھا۔

"تم کس قسم کا کاروبار کرنا چاہتے ہو۔"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو پنڈی جا کر ہی معلوم کروں گا۔ ویسے مجھے قیمتی پتھروں کی بڑی پہچان ہے۔ راولپنڈی میں کچھ صراف پتھروں کا کاروبار کرتے ہیں۔ میں ان سے جا کر ملوں گا۔ تب ہی کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

شیر خان نے صدری کی جیب سے کچھ روپے نکال کر کرم دین کو دیے اور اس پہاڑی سڑک کی طرف چل پڑا جہاں سے اسے راولپنڈی کی بس پکڑنی تھی۔ راولپنڈی آکر شیر خان نے راجہ بازار کے ایک درمیانے سے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔ دوپہر ہو گئی تھی اس نے منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھایا اور صرافہ بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں اس کا کوئی واقف نہیں تھا مگر اسے یقین تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو گا۔ اس نے کھدر کی شلوار قمیص کے اوپر چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر گرم اونی ٹوپی تھی۔ راولپنڈی

میں سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ صرافہ بازار میں کافی رونق تھی۔ یہاں زیادہ تر سونے کے زیورات کی دکانیں تھیں۔ ایک جگہ سڑک کے فٹ پاتھ پر اسے ایک آدمی قیمتی پتھروں کو اپنے سامنے سجائے بیٹھا نظر آیا۔ شیر خان وہاں رک کر پتھروں کو تکنے لگا۔ وہ برما اور لنکا میں جن اسمگلروں کے ساتھ رہا تھا وہ زیادہ تر قیمتی ہیرے جواہرات کی ہی اسمگلنگ کرتے تھے اور شیر خان کو بچپن ہی سے ان پتھروں کی بڑی پہچان ہو گئی تھی۔ وہ بیٹھ گیا۔ وہاں فٹ پاتھ پر بچھائے ہوئے اخبار پر مرجان، پکھراج، عقیق اور سفید موتیوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگی تھیں۔ شیر خان ایک مرجان کو اٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ دکاندار نے شیر خان سے پیچھا چھڑانے کے انداز میں کہا۔

"بھائی کیا دیکھ رہے ہو۔ اصلی ہیں۔ تم اسے نہیں خرید سکتے۔ جاؤ اپنا راستہ لو۔" شیر خان نے مرجان اپنی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب! یہ مرجان اصلی نہیں ہے۔ آپ یہاں بیٹھے قیمتی پتھر بیچتے ہیں اور آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ یہ نقلی مرجان؟ دکاندار نے ایک ثانیئے کے لئے غور سے شیر خان کو دیکھا۔ پھر مرجان اس کی ہتھیلی سے اٹھا کر ڈھیری میں رکھ دیا۔

"اچھا بھائی یہ نقلی ہے تو تم کسی اور جگہ سے اصلی خرید لو۔"

شیر خان نے ایک ہی نگاہ میں وہاں پڑے ہوئے تمام پتھروں کا جائزہ لے لیا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا

"بھائی! یہ سارے پتھر جو تم نے یہاں رکھے ہوئے ہیں ان میں سے ایک بھی اصلی نہیں ہے۔" دکاندار نے شیر خان کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھا اور ذرا سا آگے جھک کر پوچھا۔

"بھاپے! تم کام کیا کرتے ہو؟" شیر خان کہنے لگا۔

"بھائی کسی کام ہی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔" فٹ پاتھ پر بیٹھے اس چھوٹے دکاندار نے شیر خان کے لئے چائے منگوائی اور اس سے قیمتی پتھروں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ بہت جلد اس پر یہ ثابت ہو گیا کہ شیر خان کو پتھروں کی زبردست پہچان ہے اور وہ ایک ماہر جوہری ہے۔ اس نے شیر خان سے کہا۔

"کیا تم میرے ساتھ کاروبار کرو گے؟" شیر خان بولا۔ "مگر بھائی میں نقلی پتھروں کا کام

نہیں کر سکتا۔ ادھر لنکا میں میں اصلی جواہرات کا کاروبار کرتا تھا۔ وہاں انقلاب آگیا۔ جنگ شروع ہو گئی اور میرا سارا کاروبار وہیں ختم ہو گیا۔ اب پاکستان آگیا ہوں۔ چاہتا ہوں پھر سے پتھروں کا کاروبار شروع کر دوں۔" فٹ پاتھیئے دکاندار نے وہاں ایک آدمی بٹھایا اور شیر خان کو ایک جوہری کے پاس لے گیا۔ یہ بڑا دیانت دار جوہری تھا وہ بھی شیر خان کی مہارت سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے شیر خان کو پندرہ بیس نقلی پتھروں میں ایک اصلی پتھر ملا کر کہا۔

"تمہارے خیال میں یہ اصلی ہیں یا نقلی؟" شیر خان کی آنکھ کیسے دھوکا کھا سکتی تھی۔ اس نے نقلی پتھروں میں سے اصلی اٹھا کر جوہری کی طرف بڑھا دیا۔

"بس اس میں یہی ایک اصلی ہے۔"

جوہری نے شیر خان کو اپنے ہاں ملازم رکھنے کی پیش کش کر دی۔ شیر خان نوکری کی بجائے اپنا کاروبار کرنا چاہتا تھا مگر اس نے دیکھ لیا کہ شروع شروع میں اسے کچھ روز ملازمت ہی کرنی پڑے گی۔ اس نے حامی بھر لی اور دو روز بعد آنے کا کہہ کر واپس اپنے گاؤں آگیا۔ اس نے کرم دین کو اپنی ملازمت کے بارے میں بتایا اور کہا کہ عائشہ کی دیکھ بھال کرے۔

"میں ہفتے میں صرف ایک بار ہی اپنی بچی کو دیکھنے آسکوں گا۔" کرم دین کی بیوی داراں بھی وہیں موجود تھی۔ اس نے کہا۔

"بیٹا! تم بالکل بے فکر ہو کر ملازمت کرو۔ میں عائشہ کا پورا خیال رکھوں گی۔ ویسے بھی وہ اب مجھ سے بڑی مانوس ہو گئی ہے۔"

شیر خان نے راولپنڈی کے جوہری کے ہاں ملازمت کر لی۔ صرف اتوار کو وہ اپنے گاؤں بچی کے پاس آجاتا اور دوسرے دن واپس پنڈی چلا جاتا۔ یہ پاکستان کی پہلی دہائی کا زمانہ تھا اور ابھی بازار اتوار کو ہی بند ہوا کرتے تھے۔ شیر خان قیمتی پتھروں کی زبردست پہچان رکھتا تھا۔ ابھی راولپنڈی میں اس سے زیادہ کام میں مہارت رکھنے والے نہیں پہنچے تھے۔ چنانچہ وہ ترقی کرتا چلا گیا۔ بازار میں اس کی بڑی ساکھ بیٹھ گئی۔ ملازمت کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے طور پر زمردوں کی خرید و فروخت کا کام شروع کر دیا۔ سوات میں وہ زمرد کی کانوں کا بھی چکر لگا آیا۔ دیانت داری اور عہد کی پابندی کو اس نے اپنا شعار بنا رکھا

تھا۔ دو سال کے اندر اندر اس کے پاس روپے پیسے کی ریل پیل شروع ہو گئی۔ کرم دین والے پہاڑی گاؤں کے قریب ہی اس نے چھ کنال کی زمین کا ٹکڑا خرید کر وہاں چار پکے کمرے ڈال لیے اور کرم دین اور اس کی بیوی داراں کو بھی وہیں اپنے ساتھ لے آیا۔ ان کی وجہ سے شیر خان کو عائشہ کی طرف سے بے فکری ہوتی تھی۔ داراں کی بھی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ عائشہ کو اپنی بیٹی کی طرح پال رہی تھی۔ شیر خان نے انہیں روپے پیسے کی طرف سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔ کرم دین کی تھوڑی سی زمین گروی پڑی تھی۔ شیر خان نے وہ بھی چھڑوا کر اس کے حوالے کر دی۔ کرم دین بڑا خوش تھا۔ جوں جوں شیر خان کے کاروبار میں ترقی ہو رہی تھی اس کے گھر میں خوش حالی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شیر خان نے ملازمت چھوڑ دی اور ساری توجہ اپنے کاروبار کی طرف لگا دی۔ اب وہ ہفتے میں دو تین بار اپنے گاؤں آتا۔ روبی کی قبر پر ہر جمعرات کو دیا جلاتا۔ قبر پر پھولوں کے تازہ ہار ڈالتا اور فاتحہ پڑھ کر اس کی روح کو ثواب پہنچاتا۔ عائشہ بڑی ہو رہی تھی جب وہ چار سال کی ہوئی تو شیر خان نے گاؤں کی ایک عورت کو معقول ماہانہ پر رکھ لیا۔ یہ عورت روزانہ آکر عائشہ کو قرآن پاک کا پہلا سیپارہ پڑھاتی۔ شیر خان کو اللہ نے اتنی ترقی دی کہ اس نے زمرد کی ایک کان میں شراکت داری کر لی۔ اس کا کاروبار سارے پاکستان میں پھیلتا چلا گیا۔ اس کا چھ کنال والا مکان ابھی تک چار کمروں پر ہی مشتمل تھا۔ اس کے گرد شیر خان نے دو مرد اونچی پتھر کی دیوار بنا دی تھی اور صنوبر کے درخت لگا دیے تھے۔ مکان کے باہر اس نے روبی ہاؤس کے نام کی سلور کی تختی بھی لگا دی تھی۔ وہ ہفتے میں جب بھی اپنے مکان پر آتا تو عائشہ کو گودی میں اٹھا کر سب سے پہلے روبی کی قبر پر جاتا۔ قبر کو اس نے پختہ کروا کر سنگ مرمر کا چبوترہ بنوا دیا تھا۔ سنگ مرمر کی قبر پر روبی کے نام کا کتبہ بھی لگوا دیا تھا۔ وہاں جا کر وہ خود بھی فاتحہ پڑھتا اور عائشہ کے معصوم ہاتھ اٹھوا کر کہتا۔

"بیٹی اپنی ماں کی روح کو ثواب پہنچاؤ۔"

کمرے کو اس نے جدید آسائش کے سارے سامان سے سجا دیا تھا۔ ساتھ والے چھوٹے کمرے میں اس نے عائشہ کے واسطے سب چیزیں لا کر رکھ دی تھیں۔ داراں کا پلنگ بھی اسی کمرے میں تھا اور رات کو عائشہ کے ساتھ سوتی تھی۔ کوہ مری کو جانے والی

سڑک روبی ہاؤس کے قریب ہی سے گزرتی تھی۔ شیر خان نے کافی رقم خرچ کر کے وہاں لگے ہوئے بجلی کے کھمبے سے محکمے کی اجازت کے ساتھ بجلی کے تار اپنے مکان تک کھینچ لیے تھے اور میٹر لگوا لیا تھا جس کے بعد روبی ہاؤس میں بجلی کے بلب بھی روشن ہوتے اور دو ریفریجریٹر بھی چلتے تھے۔ شیر خان کوئی مرد خانساماں یا ملازم رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے گھر میں داراں اور اس کے خاوند کرم دین کا ہاتھ بٹانے کے لئے ایک عورت کو وہیں رکھوا دیا تھا۔ کرم دین نے جگہ جگہ پھولوں کے پودے اور بیلیں لگا دی تھیں۔ ایک طرف باڑے میں چار بھینسیں بھی آ گئی تھیں جن کی دیکھ بھال بھی کرم دین ہی کے سپرد تھی۔ شیر خان کا کاروبار اتنا بڑھا کہ اس نے زمرد اور دوسرے قیمتی پتھر ملک سے باہر بھی برآمد کرنے شروع کر دیے۔ اپنا ایک دفتر اس نے راولپنڈی صدر میں قائم کر رکھا تھا۔ اب ایک دوسرا دفتر کراچی میں بھی کھول دیا۔ اس زمانے میں ہر ماہ کی آمدنی ہزاروں سے نکل کر لاکھوں تک پہنچ گئی۔ شیر خان نے ایک گاڑی بھی خرید لی تھی۔ اب وہ اسی پر سفر کرتا تھا۔

عائشہ پانچ برس کی ہوئی تو شیر خان نے اسے کوہ مری کے ایک اعلیٰ سکول میں داخل کروا دیا جہاں لڑکیوں کے لئے بورڈنگ ہاؤس کا انتظام بھی تھا اور جہاں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہفتے کو شیر خان خود گاڑی لے کر عائشہ کو بورڈنگ ہاؤس سے گھر یعنی روبی ہاؤس لے آتا۔ عائشہ نے اس دوران قرآن پاک پورا پڑھ لیا تھا۔ شیر خان نے اپنے اور عائشہ کے کمرے میں روبی کی ایک ایک تصویر فریم میں جڑوا کر لگا رکھی تھی۔ وہ دیر تک عائشہ بیٹی کے ساتھ اس کی ماں کی باتیں کرتا رہتا اور تھوڑا تھوڑا اسے بتاتا رہتا کہ اس کی ماں کتنی دلیر اور خوددار عورت تھی۔ وہ عائشہ کو کیا بتانا چاہتی تھی۔ عائشہ اپنی ماں کے بارے میں ساری باتیں بڑے غور سے سنتی' اسے اپنی ماں سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ ماں کی قبر پر جاتی تو خود بھی فاتحہ پڑھتی۔ وہ دس گیارہ سال کی ہو گئی تھی۔ شیر خان اگرچہ کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا مگر وہ ایک سچا' بہادر اور غیرت مند شخص تھا۔ اسے اپنے مذہب' اپنے وطن اور اپنے وطن کے لوگوں سے محبت تھی۔ کاروبار میں اس نے ہمیشہ دیانتداری اور شخصی وقار کو اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ وہ روبی کی وصیت اور خواہش کے مطابق ان ہی نقوش اور انہی خطوط پر اپنی بیٹی عائشہ

کی پرورش اور تربیت کر رہا تھا۔ وہ اسے کوئی ڈاکو کی لڑکی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی۔ وہ جرائم کی دنیا سے نکل آیا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اس گناہ آلود دنیا کی کبھی ہوا بھی اس کی بیٹی کو لگے۔

شیر خان کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد باقی رہ گیا تھا وہ یہ کہ اپنی بیٹی کو ایک ایسی بلند کردار عورت بنائے جو اپنے اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت کرنا جانتی ہو۔

جو ظلم کے آگے چھوئی موئی بن کر اپنا سر نہ جھکا دے بلکہ ظلم کے سامنے چٹان بن جائے۔ اس کا مقابلہ کرے اور اگر حق و باطل کی جنگ میں اس کی جان بھی چلی جائے تو پروانہ کرے۔

جو اپنی عزت کرنا جانتی ہو۔

جس کی نظروں میں خود اپنا بڑا احترام ہو۔ جو بزدل نہ ہو۔

جو برائی کے ساتھ کسی حالت میں بھی سمجھوتہ نہ کرے بلکہ جب اس کی عزت خطرے میں پڑے تو شیرنی بن کر یا دشمن کو چیر پھاڑ کر رکھ دے اور یا خود ہلاک ہو جائے۔

یہی شیر خان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا اور یہی اس کی مرحومہ محبوبہ بیوی روبی کی آخری وصیت تھی۔ بیٹی عائشہ کو اس نے مارشل آرٹ کی بھی ہلکی پھلکی تربیت دینی شروع کر دی تھی تاکہ وقت پڑنے پر وہ اپنا دفاع کر سکے۔ شیر خان کو دولت کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ دولت کمانے کے لئے اس نے ضرورت سے زیادہ کبھی کوشش بھی نہیں کی تھی لیکن دیانت محنت اور سچائی کے اصولوں پر سختی سے عمل کرنے اور کچھ جواہرات اور پتھروں کی پہچان کی وجہ سے اس کے ہاں دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی اور دولت چلی آ رہی تھی۔ اب اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ اپنی بیٹی عائشہ کو مناسب حد تک تعلیم دلوانے اور بہتر سے بہتر تربیت دینے کے بعد کسی نیک اور شریف لڑکے سے اس کی شادی کر دے اور سب کچھ ان دونوں کے حوالے کر کے خود دنیا کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو جائے۔

جیسے جیسے عائشہ جوان ہوتی گئی شیر خان اپنی کتاب ماضی کے اوراق اس کے سامنے پلٹتا چلا گیا۔ وہ اپنی بیٹی سے اپنی اور اس کی والدہ کے ماضی کی زندگی کا کوئی بھی گوشہ نہیں چھپانا

چاہتا تھا۔ عائشہ کو اپنے باپ سے بھی بڑا پیار تھا وہ اس کا بے حد ادب کرتی تھی۔ مگر اسے اپنی مری ہوئی ماں سے والہانہ محبت ہو گئی تھی۔ باپ نے بیٹی کو اس کی بہادر ماں کے ایک ایک کارنامے اور اس کے کردار کی عظمت سے روشناس کرا دیا تھا۔ عائشہ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کی ماں اسے ظلم کے مقابلے اور مظلوموں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک بے خوف شیرنی دیکھنا چاہتی تھی۔

عائشہ نے بھی اپنے باپ کے روبرو' اپنی والدہ کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر عہد کیا تھا کہ وہ اپنی ماں کی وصیت کے مطابق' پاکیزگی' حیاداری' عزت نفس' غیرت اور شجاعت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنے کردار کو بلند سے بلند تر بنائے گی اور اپنے دین اسلام' اپنے وطن پاکستان اور اپنی عزت کے تحفظ کی خاطر اگر اسے جان بھی قربان کر دینی پڑی تو خوشی خوشی موت کو گلے لگا لے گی۔ شیر خان نے کرم دین اور اس کی بیوی داراں کے لئے کچھ زمین اور اس پر بنا ہوا مکان ان کے نام کر دیا ہوا تھا۔ اب اس نے باقی کی اپنی ساری منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد اپنی بیٹی عائشہ کے نام کر کے اپنی وصیت بھی لکھوا کر بینک کے لاکر میں جمع کروا دی تھی لیکن اس کے بارے میں اس نے عائشہ کو نہیں بتایا تھا۔ صرف اس کے خاص اور رازدار وکیل کو اس کا علم تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ عائشہ جوان ہوتی گئی۔ شیر خان اسے گھر میں شیرنی بیٹی کہہ کر ہی بلاتا تھا۔ عائشہ ہو بہو اپنی ماں کی تصویر نکلی۔ وہی قد کاٹھ ویسا ہی گورا چٹا رنگ سنہری بال اور گول معصوم چہرہ لیکن آنکھوں میں خونخوار شیرنیوں والی چمک ...... چال میں شاہ زادیوں والا وقار۔ چہرے پر حیاداری کا جلال۔ آواز میں متانت اور طور طریقوں میں ایک خاص قسم کا سلیقہ اور شائستگی ...... اس نے کوہ مری انگلش میڈیم اسکول اور پھر اسی کالج سے بی اے کر لیا۔ انگریزی زبان پر اسے پورا عبور تھا۔ اب وہ فرانسیسی زبان سیکھ رہی تھی اس کے لئے وہ اپنی گاڑی میں روبی ہاؤس سے دوپہر کے بعد ایک گھنٹے کے لئے کالج جاتی۔ ایک فرنچ ٹیچر اسے فرانسیسی زبان سکھا رہی تھی جسے عائشہ کے باپ شیر خان کی طرف سے ڈبل فیس ادا کی جاتی تھی عائشہ کو فرانسیسی زبان بہت پسند تھی اور وہ فرانس کے لٹریچر کو اوریجنل حالت میں

پڑھنا چاہتی تھی۔ باپ نے روبی کی وصیت کے مطابق عائشہ کی جن خطوط پر تربیت کی تھی اس نے عائشہ کو سوائے اللہ کے خوف کے باقی ہر خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ اب بھی روزانہ صبح اٹھ کر کلام پاک کی تلاوت کرتی نماز پڑھتی اور پھر اپنی کشادہ اور عالی شان پہاڑی کوٹھی کے عقبی لان میں اپنے باپ شیر خان سے مارشل آرٹ اور کمانڈو کورس کی ٹریننگ حاصل کرتی۔ اس کے بعد خوبانی کے پیڑ تلے جا کر اپنی والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھتی۔ قبر پر باسی پھولوں کی جگہ تازہ پھولوں کے ہار ڈالتی۔ دوپہر کا کھانا وہ اپنے باپ کے ساتھ کھاتی۔ بچی کے جوان ہو جانے کے بعد شیر خان نے اپنی کاروباری مصروفیات بہت کم کر دی تھیں اور وہ صرف ہفتے میں ایک بار راولپنڈی اپنے ہیڈ آفس میں جاتا تھا۔ وہ بھی صبح کو جاتا اور دوپہر تک واپس آجاتا۔ کوٹھی میں چند ایک نوکر تھے۔ دو نوکرانیاں تھیں۔ ایک خانساماں تھا جن کا سارا انتظام اور خبرگیری کرم دین کے ذمے تھی۔ شام کو کبھی کبھی عائشہ کی کالج کی سیلیاں آجاتیں۔ رات کا کھانا وہ اکٹھے کھاتیں۔ پھر شیر خان کے خاص محافظ ان سب لڑکیوں کو ان کے گھروں تک چھوڑ کر آتے۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو وہیں آس پاس ہی تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر ہی اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھیں۔ شیر خان کے پاس کچھ لائسنس یافتہ اسلحہ بھی تھا۔ ان میں دو بندوقیں، دو پستول اور ایک شاٹ گن تھی۔ شیر خان نے عائشہ کو نہ صرف یہ اسلحہ چلانا سکھا دیا تھا بلکہ اسے ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانے میں بھی ماہر کر دیا تھا۔ اب شیر خان اس تلاش میں تھا کہ کوئی پڑھا لکھا شریف لڑکا اسے مل جائے جس کے ساتھ عائشہ کا بیاہ کر کے وہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائے۔

اب ہم تھوڑی دیر کے لئے آپ کو واپس اس مقام پر لے جانا چاہتے ہیں جہاں سے شیر خان اور روبی کی کہانی شروع ہوئی تھی۔ یہ کہانی سری لنکا کے شمال مشرقی گھنے جنگلوں سے شروع ہوئی تھی جہاں وہ اسمگلروں کے ایک بہت بڑے بین الاقوامی گروپ سے وابستہ تھے۔ دونوں لڑکپن سے نکل کر نوجوانی کی رنگین وادیوں میں ابھی داخل ہی ہوئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ برستی گولیوں میں وہ کوکین اور دیگر منشیات کا اسٹاک اسمگل کرتے۔ ان کے گروہ میں فلپائنی، برمی، سنہالی اور جاوا سماٹرا کے اسمگلر بھی تھے۔ شہاب اور فیروز کا تعلق پنجاب کے شہر فیروز پور سے تھا۔ یہ دونوں ایک طرح سے

روبی اور شیر خان کے باس تھے۔ کیونکہ شمالی علاقوں کے جزیروں کی طرف اسمگلنگ کا سارا مال ان ہی کی نگرانی میں اسمگل ہوتا تھا۔ اس وقت بھی دونوں ایک جنگل میں کوئی دو کروڑ روپے کی کوکین کے تھیلے لیے درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں چھپے اس ایجنٹ کے اسٹیمر کا انتظار کر رہے تھے جس نے دو کروڑ کی رقم ادا کر کے ان سے کوکین اپنے ساتھ لے جانی تھی۔ روبی نے شیر خان سے کہا تھا۔

"شیر خان! بس ابھی، اسی وقت سے ہم اس گھناؤنے کاروبار سے توبہ کرتے ہیں۔"

شیر خان کا ضمیر پہلے ہی اسے کچوکے لگاتا رہتا تھا اس نے فوراً کہا

"ٹھیک ہے۔ چلو کوکین کے اس منحوس اسٹاک کو اسی جگہ ضائع کر کے ہم انڈیا کی طرف نکل جاتے ہیں۔ لنکا اور انڈیا کے درمیان جو سمندر ہے وہاں اسٹیمر آتے جاتے رہتے ہیں۔"

پھر انہوں نے اسی وقت اپنے فیصلے پر عمل کر دیا کوکین کے تھیلوں کو ایک گڑھے میں ڈال کر آگ لگا دی اور جنگل میں شمال کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ پیچھے ایسا ہوا کہ جب طے شدہ وقت پر اسمگلروں کی لانچ مال لینے آئی تو شہاب اور فیروز بھی موقع پر آ گئے۔ لیکن شیر خان اور روبی کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ پھر اچانک وہاں چھاپہ پڑ گیا۔ گولیاں چلنے لگیں اسمگلروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ شیر خان اور روبی اس وقت کافی دور نکل چکے تھے۔ بعد میں جب شہاب اور فیروز کو پتا چلا کہ شیر خان اور روبی دونوں فرار ہو گئے ہیں اور متعلقہ اسمگلروں کو کوکین بھی نہیں پہنچائی گئی اور موقع پر کوکین کے تھیلے بھی موجود نہیں ہیں تو لا محالہ وہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ شیر خان اور روبی دو کروڑ روپے مالیت کی کوکین ساتھ لے کر فرار ہو گئے ہیں۔ شہاب اور فیروز دونوں نے شیر خان اور روبی کو جنگل میں بہت تلاش کروایا۔ وہ خود ان کے کھوج میں انڈیا کے شہر مدراس تک ہو آئے مگر شیر خان اور روبی ان کی پہنچ سے بہت دور نکل چکے تھے ان دونوں کا ارادہ شیر خان اور روبی کی تلاش میں پنجاب جانے کا تھا کہ یہ دونوں سمگلنگ کے جرم میں - - - - - - - - - - - ... پولیس کے ہاتھ بھی آ گئے۔

مقدمہ چلا پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا لیکن دونوں کو ...... عمر قید ہو گئی۔ جس

وقت روبی اور شیر خان پاکستان میں شادی شدہ زندگی بسر کر رہے تھے اور روبی کے ہاں بیٹی عائشہ جنم لے چکی تھی اس وقت شہاب اور فیروز لنکا میں عمر قید کاٹ رہے تھے۔ انہوں نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ وہ جیل سے رہا ہونے کے بعد شیر خان کو ضرور تلاش کریں گے اور اس سے دو کروڑ روپے کی کوکین کا پورا پورا حساب لیں گے۔

چنانچہ جب شیر خان کی بیٹی عائشہ اٹھارہ برس کی ہوئی تو شہاب اور فیروز کی عمر قید بھی ختم ہو گئی۔ دونوں جیل سے باہر نکلے تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ پرانے ساتھیوں میں سے کچھ مرکھپ گئے تھے اور کچھ جرائم کی دنیا سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ مگر شہاب اور فیروز کا جس گروہ سے تعلق تھا اس کی ایک بین الاقوامی حیثیت بھی تھی۔ اس کا مرکزی مقام اٹلی کا ایک شہر تھا۔ شہاب اور فیروز کی عمریں چالیس پینتالیس کو پہنچ رہی تھیں۔ مگر جیل میں رہ کر بھی ان کی صحت بڑی ٹھیک ٹھاک تھی اور جسم مضبوط تھے۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی داڑھیاں رکھ لی تھیں۔ فیروز نے شہاب سے کہا۔

"اور کوئی نہ آتا مگر سیٹھ کے کسی آدمی کو ضرور آنا چاہئے تھا ہمیں لینے۔" شہاب بولا

"ہو سکتا ہے سیٹھ بھی لنکا میں نہ ہو۔ چل کر اس کی کوٹھی میں پتا کرتے ہیں۔ اب جانا تو اسی کے پاس ہے۔"

"مگر شہاب...... بھولنا نہیں۔ شیر خان اور اس کی روبی سے دو کروڑ روپے کی کوکین کا پورا پورا حساب لینا ہے۔" فیروز چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"شیر خان کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں ہم پھوجے۔ پائی پائی کا حساب لیں گے اس سے پہلے چل کر سیٹھ سے اپنی روزی روزگار کا معاملہ سیٹ کرا لیں پھر پہلا کام پنجاب میں شیر خان کے گاؤں جا کر اس کا سراغ لگانا ہو گا۔"

وہ لنکا کے شمالی شہر کے فٹ پاتھ پر ناریل کے درختوں کے نیچے چلے جا رہے تھے ایک جگہ سے انہوں نے بس پکڑی اور ریلوے اسٹیشن آ گئے۔ یہاں سے ایک ٹرین میں سوار ہو کر کولمبو شہر پہنچ گئے۔ یہاں شہر کے جس بنگلے میں کبھی اسمگلروں کا ہیڈ کوارٹر ہوا کرتا تھا وہاں پر اب ایک سرکاری بینک کھل گیا تھا۔ شہاب اور فیروز اسمگلروں کے دوسرے ٹھکانوں

پر گئے یہاں سے بھی لوگ ادھر ادھر چلے گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ حکومت کی شدید کارروائی اور منشیات کی اسمگلنگ کے خلاف مسلسل مہم کے نتیجے میں ان کے تقریباً سبھی ساتھی جنوب مشرقی ایشیا اور اٹلی کی طرف چلے گئے ہیں۔ کچھ ہندوستان کی طرف فرار ہو گئے ہیں۔

بلیو اسٹار کلب میں فیروز اور شہاب کی ملاقات اپنے پرانے اسمگلر ساتھی سنگھا سے ہو گئی اس نے بتایا کہ منشیات کا سارا دھندا تقریباً ختم ہو چکا ہے کوکین کی اسمگلنگ کا مرکز اب ہانگ کانگ ہے۔ شہاب اور فیروز سنگھا کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ چودہ برس میں ساری فضا بدل چکی تھی۔ وہ بکھری ہوئی کڑیوں کو آپس میں ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ فیروز نے سنگھا سے ٹونی کے بارے میں پوچھا۔

"ہمارا ایک ساتھی ٹونی ہوا کرتا تھا وہ کہاں ہے؟" سنگھا نے مشروب کا گلاس ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ارے وہ تو اب کروڑوں میں کھیل رہا ہے۔ ہانگ کانگ میں کوکین کی ساری اسمگلنگ اسی کے ذریعے ہوتی ہے۔ وہ تو کوکین کا بے تاج بادشاہ ہے۔"

ٹونی سے شہاب اور فیروز کی بڑی دوستی ہوا کرتی تھی جب انہیں پتا چلا کہ ٹونی کے پاس بڑی دولت آ گئی ہے اور علاقے کا پورا مافیا اس کے کنٹرول میں ہے تو انہوں نے ہانگ کانگ جا کر ٹونی سے ملنے کا پروگرام بنا لیا۔ شہاب اور فیروز کا اصل نشانہ شیر خان اور روبی تھے۔ ان کی اصل دولت شیر خان اور روبی کے پاس ہی تھی جن سے وہ اپنا حصہ وصول کرنا چاہتے تھے مگر ابتدائی ضروریات کے لئے انہیں کافی روپوں کی ضرورت تھی جو انہیں ٹونی سے ہی مل سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کولمبو میں ہی اپنے غیر قانونی اور اثر و رسوخ سے پاسپورٹ بنوائے اور ہانگ کانگ کی طرف پرواز کر گئے۔

ٹونی نے شہر کے ایک ماڈرن کاروباری علاقے میں اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھول رکھا تھا بظاہر وہ کمپیوٹرز اور الیکٹرک ٹائپ رائٹرز کی ایکسپورٹ کا کاروبار کرتا تھا مگر درپردہ اس کا اصل دھندا کوکین اور جواہرات کی اسمگلنگ کا تھا۔ سنگھا نے شہاب اور فیروز کو ٹونی کے دفتر کا پورا پتہ بتا دیا تھا ہانگ کانگ پہنچ کر شہاب اور فیروز کو ٹونی تک پہنچنے میں کوئی خاص

دشواری پیش نہ آئی۔ ٹونی کی چینی سیکرٹری لڑکی نے شہاب اور فیروز سے ان کا وزیٹنگ کارڈ مانگا تو شہاب نے کہا۔

"اپنے باس سے کہو کہ کولمبو سے شہاب اور فیروز ملنے آئے ہیں۔"

سیکریٹری نے انٹرکام پر ٹونی کو اطلاع کی تو وہ کمرے سے باہر آگیا۔ وہ بہترین سمر سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہو گئی تھی۔ اس نے شہاب اور فیروز کو فوراً پہچان لیا اور گرمجوشی سے ان کے گلے ملا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس شام ہانگ کانگ کے ایک اعلیٰ درجے کے کلب میں ٹونی نے دونوں دوستوں کی دعوت کی۔ دعوت کے بعد ٹونی کہنے لگا۔

"اب تم دونوں میرے ساتھ ہی کام کرو۔ تم جتنی تنخواہ کہو گے میں تمہیں دے دیا کروں گا۔ بے شک اپنا کمیشن بھی مقرر کر لینا۔"

مگر شہاب اور فیروز کی نظریں ان کروڑوں روپے پر تھیں جو ان کے خیال کے مطابق شیر خان اور روبی کولمبو سے فرار ہوتے وقت اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ شہاب نے ٹونی کو شیر خان اور روبی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"ٹونی! ہم ایک بار پنجاب اپنے گاؤں جانا چاہتے ہیں وہاں ہماری کچھ آبائی زمین ساہوکار کے پاس رہن ہے۔ ہم اسے چھڑا کر اپنی دو بہنوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں اس کام سے فارغ ہو کر ہم تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ لیکن اس وقت ہمیں کچھ رقم کی ضرورت ہے۔"

ٹونی نے ہوانا کا قیمتی سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"کتنی رقم چاہئے تمہیں؟" شہاب نے سارا حساب پہلے ہی لگا رکھا تھا کہنے لگا۔

"پچاس ہزار روپے پاکستانی کرنسی کی شکل میں مناسب رہیں گے۔"

بس؟ ٹھیک ہے۔ پاکستانی کرنسی یہاں میرے پاس تو اس وقت نہیں ہے میں تمہیں چیک لکھے دیتا ہوں اسے تم کولمبو کے سٹی بینک میں کیش کروا کر وہیں سے پاکستانی کرنسی میں تبدیل کروا لینا۔ مگر میرے پاس واپس ضرور آجانا۔ مجھے تم دونوں پرانے دوستوں کو اپنے کاروبار میں شامل کر کے بڑی خوشی ہو گی۔"

شہاب اور فیروز نے وعدہ کیا کہ وہ واپسی پر اسی کے پاس آئیں گے۔ دو دن بعد یہ دونوں ہانگ کانگ سے کولمبو روانہ ہو گئے۔ یہاں انہوں نے ٹونی کا چیک کیش کروا کر رقم کو پاکستانی کرنسی میں تبدیل کروایا اور کراچی جانے والے ایک بحری جہاز میں سوار ہو گئے۔

شیر خان کبھی کبھی شہاب کو اپنے پنجاب کے گاؤں کے بارے میں بتایا کرتا تھا اور شہاب کو اس کے گاؤں کا ضلع اور نام بھی یاد تھا۔ چنانچہ دونوں ساتھی شیر خان کے گاؤں پہنچ گئے وہاں شیر خان کے اکثر رشتے دار مرکھپ گئے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی زندہ تھا جس نے بتایا کہ شیر خان اپنی جوان بیوی کو لے کر ایک بار گاؤں آیا تھا مگر کچھ عرصے بعد یہاں سے چلا گیا۔ فیروز نے پوچھا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ اب وہ کہاں ہے ہم اس کے پرانے دوست ہیں اور ہمارا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔" ادھیڑ عمر کسان نے کچھ سوچ کر بتایا۔

"اس بات کو کافی سال گزر گئے ہیں۔ شیر خان ادھر تو پھر کبھی نہیں آیا۔ ہاں ایک بار کسی نے بتایا تھا کہ اس کے پاس بڑی دولت آگئی ہے اور اس نے کوہ مری کے پاس اپنا شاندار بنگلہ بنا لیا ہے۔ سنا ہے ہیرے جواہرات کی تجارت کرتا ہے۔"

شہاب اور فیروز کے لئے اتنی معلومات ہی بہت تھیں۔ وہ سیدھا راولپنڈی پہنچے یہاں صرافہ بازار میں انہوں نے ایک جوہری سے شیر خان کے بارے میں بات کی تو جوہری بولا۔

"جناب خان صاحب تو بڑے آدمی ہیں ہم ان کا مقابلہ کہاں کر سکتے ہیں۔"

جوہری کی زبانی شہاب اور فیروز کو پتا چلا کہ شیر خان ارب پتی بن چکا ہے۔ اس کی بیوی روبی کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی ایک بیٹی بھی ہے جس کا نام عائشہ ہے جو کوہ مری میں ہی کسی کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کا عالی شان بنگلہ کوہ مری کے نزدیک سڑک سے ذرا ہٹ کر واقع ہے اور اس کا نام روبی ہاؤس ہے۔ شہاب نے جوہری کی دکان سے باہر نکلتے ہوئے دانت پیس کر فیروز سے کہا۔

"پھوجے! یہ سب اسی کوکین کی رقم کا کرشمہ ہے جو شیر خان لے کر بھاگ گیا تھا۔ ساری جاگ اسی کی لگی ہوئی ہے۔ ہم اسے معاف نہیں کریں گے۔" فیروز کہنے لگا۔

"ہم اس سے اپنا حصہ طلب کریں گے۔"

شہاب نے شیر خان کو گالی دیتے ہوئے کہا۔

"اس کے پاس جتنی دولت ہے اس کا آدھا حصہ ہمارے حوالے کرنا ہو گا۔" فیروز نے شہاب کا بازو دباتے ہوئے کہا۔

"ہمیں جلد بازی یا غصے سے کام نہیں لینا چاہئے شہاب! سیدھی انگلی سے گھی نکالنے کی کوشش کریں گے۔"

"لیکن اگر شیر خان نے انکار کر دیا؟" شہاب نے ایک بار پھر شیر خان کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ فیروز بولا۔

"تو پھر سوچ لیں گے۔ غور کر لیں گے مگر بھائی میرے ابھی خاموش رہو۔ شانت رہو۔ چل کر اس سے بات تو کریں۔"

دونوں سب سے پہلے شیر خان کے راولپنڈی والے آفس میں گئے پتا چلا کہ شیر خان ہفتے میں صرف دو ایک دن ہی دفتر آتا ہے باقی وقت وہ اپنے بنگلے پر ہی گزارتا ہے۔ انہوں نے ٹیکسی پکڑی اور کوہ مری کی طرف چل پڑے۔ اس وقت دن کے دس بج چکے تھے۔ پہاڑ کا سیزن ختم ہو چکا تھا۔ اترائی شروع ہو گئی تھی۔ ٹیکسی میدانی علاقے سے نکل کر پہاڑی علاقے میں داخل ہوئی تو موسم خنک ہو گیا۔ ٹیکسی والا شیر خان سیٹھ کے روبی ہاؤس کو جانتا تھا کوہ مری سے کچھ پہلے ٹیکسی سڑک کے کنارے چیڑھ کے درختوں میں رک گئی۔ ڈرائیور نے دائیں جانب درختوں میں سے نظر آتے ایک گیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ روبی ہاؤس ہے جناب۔"

شہاب اور فیروز ٹیکسی سے اتر آئے۔ انہوں نے ڈرائیور کو ایک طرف انتظار کرنے کے لئے کہا اور خود اس راستے پر چل پڑے جو شیر خان کے بنگلے روبی ہاؤس کی طرف جاتا تھا۔ اس کی دونوں جانب چیڑھ کے اونچے اونچے درخت تھے۔ گیٹ لوہے کا تھا جس کی ایک جانب سلور کی تختی پر روبی ہاؤس لکھا تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر کا چوکیدار آگ

جلائے اسٹول پر بیٹھا ہاتھ تاپ رہا تھا شہاب اور فیروز کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سلام کر کے پوچھا کہ صاحب آپ کو کس سے ملنا ہے؟ شہاب نے کہا۔

"بھائی ہمیں سیٹھ شیر خان سے ملنا ہے۔ انہیں جا کر کہو کہ ان کے دو بڑے پرانے دوست کولمبو شہر سے انہیں ملنے آئے ہیں۔"

چوکیدار نے وہیں دیوار میں لگے ٹیلی فون پر اندر بوڑھے خانساماں کو اطلاع کر دی۔ ایک منٹ بعد شیر خان نے چوکیدار کو کہا کہ انہیں فوراً اندر بھیج دو۔ شہاب اور فیروز بنگلے کی شان و شوکت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ تین گاڑیاں ایک طرف کھڑی تھیں۔ شیر خان خود ان سے ملنے کے لئے برآمدے میں موجود تھا۔ اس نے شہاب اور فیروز کی طرف غور سے دیکھا پھر لپک کر ان سے بغل گیر ہو گیا۔

"شہاب فیروز ...... آپ لوگ کیسے آ گئے؟ اتنی مدت گزر گئی۔ آؤ آؤ اندر آ جاؤ۔" شہاب نے کہا۔

"شیر خان! تم بھی کافی بدل گئے ہو۔" ڈرائنگ روم کی سجاوٹ اور قیمتی سازو سامان نے بھی شہاب اور فیروز کو بڑا متاثر کیا۔ کارنس کے اوپر روبی کی آئل کلر تصویر لگی تھی فیروز کہنے لگا۔

"روبی بہن کی وفات کی خبر ہمیں پنڈی تمہارے دفتر ہی سے مل گئی تھی۔ بڑا افسوس ہوا۔"

"ہاں شیر خان۔" شہاب نے جھوٹی تعزیت کرتے ہوئے کہا۔ "روبی بھابی کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ یہاں آ کر تم دونوں نے شادی کر لی تھی؟"

"ہاں شہاب بھائی۔" شیر خان نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ "ہم نے پاکستان آنے کے فوراً بعد شادی کر لی تھی۔ اللہ نے ایک بیٹی بھی دی مگر روبی مجھے اکیلا چھوڑ کر چل بسی۔"

"صبر کرو میرے بھائی۔" فیروز نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "موت کا تو ایک دن مقرر ہوتا ہے۔" شہاب نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"تمہاری بیٹی کہاں ہے شیر خان؟ اس سے ملواؤ وہ تو ہماری بھی بیٹی ہے۔" شیر خان بولا

"کالج گئی ہوئی ہے آئے گی تو ضرور ملواؤں گا۔ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ عائشہ نام

رکھا ہے اس کا۔ اب تو اس نے ایم اے بھی کر لیا ہے۔"

"ماشاء اللہ! ماشاء اللہ!"

شہاب اور فیروز بے اختیار پکار اٹھے۔ نوکر چائے لے آیا۔ بڑی پر تکلف چائے تھی۔ ساتھ کھانے کے لئے دنیا کی ہر نعمت موجود تھی۔ کمرے کے آتشدان میں ہلکی ہلکی آگ جل رہی تھی جس نے کمرے کی فضا کی سردی کو ختم کر دیا تھا۔ تینوں اپنے پرانے دنوں کی باتیں کرنے لگے۔ شہاب کہنے لگا۔

"تم تو روبی کو لے کر وہاں سے چلے آئے۔ پیچھے چھاپہ پڑا گرفتاریاں ہوئیں ہم بھی پکڑے گئے ہم دونوں پر قتل کے الزام لگے مقدمہ چلا پھانسی سے تو بچ گئے مگر عمر قید ہو گئی۔"

"اوہو۔ بڑا افسوس ہے مجھے۔" شیر خان افسوس کرنے لگا۔ شہاب نے ہاتھ کو ذرا سا جھٹک کر کہا۔

"چھوڑو یار۔ یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔ ہمیں عمر قید ہو گئی تو کیا ہوا ہمیں تو اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارا یار شیر خان کروڑ پتی بن گیا ہے۔" شیر خان نے اپنے کان کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"یہ سب میرے مولا کا کرم ہے ورنہ میں کس قابل ہوں۔ فیروز بھائی یہ کیک بھی لو۔" شہاب نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے خوشگوار طنز کے ساتھ کہا۔

"مولا کا کرم بھی تم پر ہی ہوا ہے شیر خان ہم نے تو جیل میں چودہ برس چکی ہی پیسی ہے۔" شیر خان نے کہا۔

"اس کا مجھے افسوس ہے میں اگر وہاں سے چلا نہ آتا تو مجھے بھی جیل ہو جاتی۔" فیروز نے فوراً کہا۔

"بڑی عقل مندی کی تم نے کہ سارا روپیہ بھی ساتھ ہی لے آئے۔" شیر خان ذرا سا چونکا۔

"کونسا روپیہ لالے؟" شہاب نے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالنے کے بعد کہا۔

"وہی یار جو تم نے کوکین کے تھیلے دے کر وصول کیا تھا اور کون سا روپیہ۔ بھئی ہم

تمہاری ہمت کی داد دیتے ہیں کہ تم سارا روپیہ پاکستان لانے میں کامیاب ہو گئے۔" شیر خان ابھی تک شہاب کا منہ تک رہا تھا کہ فیروز بولا۔

"وہاں سے تو تمہیں ڈالر ملے تھے۔ انڈیا میں کرنسی بدلوائی ہو گی تم نے۔" شیر خان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اس نے اپنے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے کسی سے کوئی رقم وصول نہیں کی تھی۔ اسٹیمر کے آنے سے پہلے ہی میں نے اور روبی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہم منشیات کا یہ گھناؤنا کام نہیں کریں گے ہم نے کوکین کے تھیلوں کو وہیں آگ لگا دی تھی جب اسٹیمر آیا تو ساتھ ہی چھاپہ بھی پڑ گیا۔ بس ہم خالی ہاتھ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کیا بتاؤں کس طرح مصیبتیں اٹھاتے ہم پاکستان پہنچے۔ یہاں رشتے داروں نے میرے حصے کی زمین بھی ہضم کر لی۔ جواہرات کی پہچان تھی پنڈی کے صرافے میں ایک جوہری کے پاس نوکر ہو گیا۔ دیانت داری اور محنت سے کام شروع کیا تھا اللہ نے بڑی برکت ڈالی۔" شہاب اور فیروز کو شیر خان کی کسی ایک بات کا بھی یقین نہیں آیا تھا۔ شہاب نے ہنس کر کہا۔

"شیر خان یار! ہمارے سامنے کوئی ایکٹنگ نہ کرو ہم سے تمہاری کونسی بات چھپی ہوئی ہے۔ ایمانداری سے کام کر کے بھلا کوئی کروڑوں روپے کا مالک بنا ہے کبھی؟"

شیر خان فوراً بولا۔

"میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ پنڈی شہر کے صرافہ بازار میں جا کر کسی سے پوچھ لو کہ شیر خان نے یہ دولت کیسے کمائی ہے وہ سب لوگ میری دن رات کی محنت اور دیانت داری کے گواہ ہیں۔" شہاب نے شیر خان کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"انہیں کیا معلوم کہ اصلی بات کیا ہے۔" فیروز بولا۔

"یہ جو تم نے کوکین کو آگ لگا کر بھاگ جانے والا ڈراما سنایا ہے اس پر تو کوئی بے وقوف ہی اعتبار کرے گا۔"

شیر خان کو ابھی تک اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں کی نیت کیا ہے اور وہ کیا ارادہ لے کر اس کے پاس آئے ہیں وہ اس طرح نفی میں سر ہلا کر کہنے لگا۔

"مگر میں سچ کہہ رہا ہوں فیروز بھائی میں نے اور روبی نے اپنے ہاتھوں کوکین کے

تھیلوں کو آگ لگائی تھی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ساری کوکین جل کر راکھ ہو گئی تھی ہم جب لنکا سے ہندوستان کے سامنے والے شم ساحل پر پہنچے تھے تو ہمارے پاس اسٹیمر کا کرایہ تک نہیں تھا۔"

اب شہاب کو غصہ آ گیا۔ اس نے شیر خان کا ہاتھ پکڑ کر ذرا دبا کر چھوڑ دیا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔

"شیر خان! تم ہمیں الو نہیں بنا سکتے کوکین کم از کم پونے دو کروڑ ڈالر کی تھی اور تم ساری کی ساری رقم لے کر وہاں سے فرار ہوئے تھے۔ یہ ہم جانتے ہیں۔"

شیر خان کا خون بھی گرم ہو گیا۔ وہ کوئی روایتی قسم کا شریف آدمی نہیں تھا۔ وہ بھی شہاب اور فیروز کی طرح اپنی جرائم پیشہ زندگی میں کئی آدمیوں کا خون کر چکا تھا۔ پھر بھی وہ لوگ اس کے مہمان تھے۔ شیر خان نے اپنے ابلتے ہوئے جذبات کو بڑی مشکل سے دباتے ہوئے پوچھا۔

"تم لوگ کس نیت سے آئے ہو؟"

شہاب نے کرخت لہجے میں کہا۔"ہم تم سے صرف پونے دو کروڑ ڈالر میں سے اپنا حصہ طلب کرنے آئے ہیں۔ آدھی رقم ہمارے حوالے کر دو جو ہمارا حق ہے اور ہم واپس چلے جائیں گے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم چودہ برس جیل میں مشقت کاٹتے رہے ہوں اور تم یہاں ہماری رقم سے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرو۔"

شیر خان کا سر پھر گیا تھا۔ مگر اس نے کمال تحمل سے کام لیا۔ جیسے وہ کھولتے ہوئے آتش فشاں کو اپنے سینے میں دبائے ہوئے تھا۔ پھر بھی وہ جوش میں آ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شہاب اور فیروز بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیر خان نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس وقت تم دونوں میرے مہمان ہو میں تمہیں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔" تب فیروز نے آگے بڑھ کر شیر خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑے متحمل اور نرم لہجے میں بولا۔

"شیر خان! ہم تمہارے گھر میں محبت کے ساتھ آئے ہیں اسی محبت کے ساتھ واپس جائیں گے کہ دولت آنی جانی ہوتی ہے۔ ہماری دوستی قائم رہنی چاہئے۔" شہاب کچھ کہنے ہی

والا تھا کہ فیروز نے گردن پھیر کر اس کی طرف دیکھا آہستہ سے آنکھ کا اشارہ کیا اور بولا۔

"شہاب! تم چاہے اعتبار کرو یا نہ کرو لیکن میرے بھائی اب میرا دل کہہ رہا ہے کہ شیر خان سچا ہے۔ یہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ اس نے جو کچھ کمایا ہے اپنی محنت اور ایمانداری سے کمایا ہے۔" شہاب کے ہونٹ کچھ کہنے کو ہلے ہی تھے کہ فیروز نے جیسے اسے ڈانٹ کر کہا: "بس اب آگے کچھ نہ کہنا۔ ہم نے عمر قید کاٹی یہ ہماری قسمت تھی۔ شیر خان کو اللہ نے دولت دی یہ اس کی قسمت تھی۔ بس اب اسے گلے لگا لو ہماری دوستی میں فرق نہیں آنا چاہئے۔"

فیروز پہلے ہی شہاب کو آنکھ مار چکا تھا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی دوسرا منصوبہ تیار ہو چکا ہے۔ شیر خان اپنے دل میں اس خیال سے مطمئن ہو گیا تھا کہ اس کی پرسکون وضع دار زندگی میں ایک طوفان آتے آتے ٹل گیا ہے۔ چنانچہ شہاب اور فیروز نے جب اسے گلے لگایا تو شیر خان نے بھی بڑی گرم جوشی سے اس کا جواب دیا۔ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھتے ہوئے شہاب اور فیروز ایسی اداکاری کرنے لگے جیسے وہ اس بات پر بڑے نادم ہیں کہ انہوں نے شیر خان سے اپنا حصہ کیوں مانگا۔ شیر خان اپنی جگہ پر صحیح ندامت محسوس کر رہا تھا کہنے لگا۔

"مجھے بڑا افسوس ہے کہ میرے منہ سے ایسا جملہ نکل گیا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔"

فیروز نے چہرے پر بڑی مخلصانہ سی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں شیرے یار۔ بات ہم نے بھی غلط کر دی تھی۔ لیکن ہمیں بھی تو اصلیت کا علم نہیں تھا۔ اب تم نے ساری بات کھول کر بتائی تو معاملہ صاف ہو گیا۔ مٹی ڈالو یار سب باتوں پر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ چائے اور منگواؤ۔"

شیر خان نے صوفے کے ساتھ لگا ہوا بٹن دبا کر نوکر کو بلایا شہاب نے بھی اب اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور وہ فیروز کی منصوبہ بندی کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ اگرچہ اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ فیروز کے ذہن میں اچانک کیا اسکیم آ گئی ہے۔ شیر خان بولا۔

"اب آپ لوگ میرے ہاں ہی رہیں گے۔ اوپر والا مہمان خانہ ابھی کھلوا دیتا ہوں۔"

فیروز کے ذہن میں جو اسکیم تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ شیر خان سے رخصت لے کر چلے

جائیں چنانچہ وہ بولا۔

"نہیں یار شیر خان! ہم نے پنڈی میں ایک آدمی کو ٹائم دے رکھا ہے۔ وہاں سے ہمیں کل کراچی بھی جانا ہے۔ کراچی میں دو چار دن لگ جائیں گے۔ وہاں سے کولمبو واپس جانے سے پہلے تمہارے پاس آ کر ایک دو روز ضرور قیام کریں گے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں اب۔" شیر خان مسکراتے ہوئے بولا۔ اتنے میں باہر گاڑی کے ہارن کی آواز بلند ہوئی۔ شیر خان نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری بیٹی عائشہ کالج سے آ گئی ہے۔"

فیروز نے ایک سیکنڈ کے لئے آنکھیں گھما کر شہاب کو دیکھا۔ پھر جلدی سے نگاہیں شیر خان کی طرف کر لیں اور بڑا خوش ہو کر بولا۔

"اچھا ہوا بیٹی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" باوردی نوکر اندر آ گیا تھا شیر خان نے اسے کہا۔

کھانا ہم سب اکٹھے کھائیں گے اور عائشہ بیٹی کو یہیں بھیج دو۔" نوکر ادب سے سر کو ذرا سا جھکا کر باہر نکل گیا۔ شیر خان کہنے لگا۔

"تم بیٹی کو دیکھو گے تو کہو گے یہ تو روبی ہے۔ بالکل اپنی ماں کی شکل ہے۔"

عائشہ جب نشست گاہ میں داخل ہوئی تو ایک بار شہاب اور فیروز بھی ٹھٹک سے گئے۔ انہیں یکبارگی یوں لگا جیسے ان کے سامنے سری لنکا کے جنگلوں والی نوجوان لڑکی روبی کھڑی ہے۔ اگر کوئی فرق تھا تو صرف اتنا کہ عائشہ کے چہرے پر وہ چنچلتا اور جذبات کی بے باکی نہیں تھی جو روبی کے چہرے پر بڑی نمایاں ہوا کرتی تھی۔ یہ لڑکی جو شیر خان اور روبی کی بیٹی تھی اس کے چہرے پر نوجوانی میں ہی ایک متین پختگی اور پختہ عزم کے آثار بڑے واضح تھے۔ آنکھوں میں مقناطیسی چمک اور نگاہ میں ایسا تسلسل تھا جیسے ایک کرن کسی جگہ مسلسل پڑ رہی ہو اور اس جگہ کو کرن نے اپنے اثر میں اپنے سحر میں لے رکھا ہو۔ روبی کی بیٹی کو پہلی بار دیکھنے پر شہاب اور فیروز دونوں کے ذہنوں پر ایک ہی قسم کا رد عمل ہوا تھا۔

"آؤ میری بیٹی! اپنے انکل سے ملو۔ یہ دونوں تمہارے انکل ہیں۔"

عائشہ نے گرم شلوار قمیص کے اوپر گہرے براؤن رنگ کی اونی جیکٹ پہن رکھی تھی

اور گردن کے گرد شیر کی کھال کی طرح کا گرم مفلر لپٹا ہوا تھا۔ اس مفلر کی وجہ سے عائشہ کا چہرہ بالکل شیرنی کی طرح لگ رہا تھا عائشہ نے شباب اور فیروز کو ادب سے سلام کیا۔ دونوں نے آگے بڑھ کر عائشہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر جیب سے کچھ روپے نکال کر دینے لگے تو عائشہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"شکریہ انکل میں ان رسموں کی قائل نہیں ہوں یہ روپے میری طرف سے کسی ضرورت مند کو دے دیجئے گا۔"

شباب اور فیروز نے آگے سے کچھ نہ کہا اور روپے جیب میں واپس رکھ لیے شیر خان بڑے فخر سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"میں اپنی بچی کو ایک مثالی پاکستانی لڑکی دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ سوائے اپنے حق کے کسی سے کچھ نہیں لے گی۔"

شباب چپ رہا فیروز نے شیر خان کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی شیر خان! تمہاری بچی نے مجھے بڑا متاثر کیا ہے۔ یہ اپنی ماں کی طرح بہادر اور دلیر نکلے گی۔" عائشہ نے اپنے والد سے پوچھا۔ "ابا جان! میرے لائق خدمت ہو تو بتایئے۔" شیر خان نے اپنی بچی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جا کر آرام کرو۔"

عائشہ اسی طرح بڑے ادب سے سلام کر کے چلی گئی۔ وہاں کافی کا دور چلنے لگا اتنی دیر میں ساتھ والے کمرے میں سے کسی لڑکی کے قرات کے ساتھ قرآن شریف پڑھنے کی آواز سنائی دی۔ شباب اور فیروز نے کس قدر تعجب سے شیر خان کی طرف دیکھا شیر خان نے آہستہ سے کہا۔ "عائشہ کالج سے واپس آکر روزانہ قرآن پاک پڑھتی ہے۔ اگلے رمضان تک انشاء اللہ وہ قرآن پاک حفظ کر لے گی۔" اس کا شباب اور فیروز پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کی ساری زندگی دین مذہب سے دور ایک اجنبی اور بت پرست ملک میں گزری تھی۔ اپنے مذہب کے ساتھ ان کا واسطہ صرف اتنا ہی تھا کہ کبھی کبھی وہ کوئی نیا کام شروع کرنے سے پہلے خدا کو یاد کر لیا کرتے تھے۔

دوپہر کا کھانا شباب اور فیروز دونوں نے شیر خان کے ساتھ کھایا اس دوران دونوں میں

سے کسی نے کوئی ایسی بات نہ کی کہ جس سے وہاں بدمزگی پیدا ہوتی۔ بلکہ جب دونوں وہاں سے رخصت ہونے لگے تو فیروز نے ایک بار پھر شیر خان سے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"شیرے! بھائی ہم نے جس بات کا ذکر شروع میں کیا تھا اسے بھول جانا۔ کیونکہ ہم بھی اسے بھول گئے ہیں۔ ہم کچھ روز بعد واپس سری لنکا چلے جائیں گے کیونکہ اب ہمارا مرنا جینا وہیں پر ہے۔ تمہارا خلوص اور تمہاری محبت ہمیں یاد رہے گی۔"

شیر خان کہنے لگا۔ "مگر تم لوگوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ کراچی سے واپس آکر دو ایک دن میرے ہاں ٹھہرو گے۔"

شباب بولا۔ "شیر خان بھائی! کچھ کہہ نہیں سکتے واپس جا کر بھی بڑے کام کرنے ہیں جو کچھ ہماری قید کے دوران بکھر چکا ہے اسے پھر سے جمع کرنا ہے۔" شیر خان نے کہا۔

"اگر تمہیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بے شک بطور قرض لے لو۔ جب ہوں گے واپس کر دینا۔"

شباب نے دل میں نفرت سے کہا "ہمارے پیسوں پر عیش کر رہا ہے اور ہمیں بھکاری سمجھ کر قرض بھی دے رہا ہے۔" اس نے دل میں شیر خان کو بڑی موٹی سی گالی دے ڈالی۔ فیروز نے شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"نہیں شیرے یار! خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس سنگاپور ہانگ کانگ کے دو چار پھیرے لگانے پڑیں گے۔ ویسے ہم کوشش کریں گے کہ کراچی میں فارغ ہونے کے بعد تمہارے لئے دو ایک دن نکالیں۔ مگر وعدہ نہیں کرتے۔ کولمبو پہنچ کر تمہیں خط ضرور لکھیں گے۔"

شیر خان کے اصرار پر ٹیکسی کو انہوں نے فارغ کر دیا تھا۔ شیر خان نے بہت کہا کہ رات اس کے ہاں گزار کر صبح پنڈی چلے جائیں مگر وہ نہ مانے شیر خان نے اپنی خاص گاڑی اور ڈرائیور ان کے ساتھ کر دیا۔ دونوں ایک بار پھر شیر خان سے بغل گیر ہو کر ملے اور گاڑی انہیں لے کر راولپنڈی کی طرف چل دی۔

شباب کے دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ فیروز سے یہ معلوم کرنے کو بے تاب تھا

کہ اس نے کیا سوچ کر شیر خان کے ساتھ اپنے حصے کی کروڑوں روپے کی رقم لینے کی بات ختم کر دی تھی۔ مگر شیر خان کے ڈرائیور کی موجودگی میں وہ اس سے کچھ نہ پوچھ سکتا تھا دن راستے میں ہی ڈھلنے لگا تھا۔ جب شہاب کا پیمانہ صبر بالکل ہی لبریز ہو گیا تو اس نے گاڑی ایک جگہ رکوائی اور فیروز کو ساتھ لے کر درختوں کے پیچھے آ گیا یہاں آتے ہی اس نے فیروز کو بازو سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"آخر کیا سمجھ کر تم نے شیر خان کو کہہ دیا تھا کہ شیرے اب ہم تم سے اپنے حصے کی رقم طلب نہیں کریں گے؟ وہ تمہارا ماما لگتا ہے؟ میں ساری رقم اب تم سے وصول کروں گا۔" فیروز نے شہاب کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اپنے بازو کو سہلایا اور شہاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"تم مجھے بدھو سمجھتے ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں شیر خان کو اپنے حصے کی دولت سے عیش و عشرت سے رہتے دیکھ کر خاموش بیٹھا رہوں گا؟ کیا میں اپنی جوانی کے وہ چودہ سال بھلا سکتا ہوں جو میں نے جیل میں سلاخوں کے پیچھے بانس کاٹتے' پتھر توڑتے گزارے ہیں؟ نہیں شہاب میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا یہ شخص ہماری دولت سے عیش کر رہا ہے ہم نے اس کے کیے ہوئے جرم میں سزا کاٹی ہے اور یہ ہماری کمائی ہوئی دولت سے گلچھرے اڑا رہا ہے۔" شہاب نے منہ پھاڑ کر کہا۔

"تو پھر سوچا کیا ہے تم نے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔" فیروز نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر کے نفی میں سر ہلایا۔

"ابھی نہیں شہابو۔ ابھی نہیں۔ ابھی میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ پنڈی پہنچ لینے دو۔"

یہ کہہ کر فیروز گاڑی کی طرف چلا جس کا باوردی ڈرائیور بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ شیر خان کی سیاہ رنگ کی ائر کنڈیشنڈ نئے ماڈل کی بیوک شہاب اور فیروز کو لے کر پنڈی کی طرف ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ابھی سورج پوری طرح سے غروب نہیں ہوا تھا کہ وہ پنڈی صدر میں اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ ہوٹل میں آ کر فیروز نے شہاب کو اس خطرناک منصوبے سے آگاہ کر دیا جو اس کے جرائم پیشہ ذہن نے تیار کر رکھا تھا۔ شہاب کی

آنکھوں میں ایک نئی چمک آ گئی اس طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"فیروز! تم نے بڑے کمال کی اسکیم سوچی ہے۔ اگر ہماری اسکیم کامیاب ہو گئی تو اپنا حصہ کیا ہم تو شیر خان سے اس کی اپنے حصے کی دولت بھی اپنے قبضے میں کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" فیروز خان اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔" جب شیر خان نے ہمارے حصے کی رقم دینے سے انکار کر دیا تھا تو میں اسی وقت اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ یہ شیر خان کا اپنا ملک ہے۔ یہاں اس کے اپنے لوگ ہیں اس کے پاس پیسہ ہے وہ اگر نہ چاہے تو ہم اس سے ایک کوڑی بھی وصول نہیں کر سکتے اس لئے ہمیں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا کہ جس پر عمل کرنے سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ پہلے میں نے ایک اور ترکیب سوچی تھی لیکن جب میں نے شیر خان کی بیٹی کو دیکھا تو پہلی اسکیم ترک کر دی اور نئی اسکیم سوچ لی۔ یہ ایسا تیر ہے جو ٹھیک نشانے پر بیٹھے گا۔" شہاب کا چہرہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کہنے لگا۔

"مگر یہ کام کون کرے گا؟ ہمیں تو اس سارے ڈرامے سے باہر رہنا پڑے گا۔" فیروز نے کہا۔

"یار شہابو تم فکر کیوں کرتے ہو۔ اس وقت پیسہ ہمارے پاس بھی ہے ہمیں دو ایسے آدمی مل جائیں گے جو پندرہ بیس ہزار روپے میں یہ کام بڑے خوش ہو کر دیں گے۔ پندرہ بیس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہے اور پھر انہیں کسی کا خون تو کرنا نہیں۔"

"مگر ہم یہاں اجنبی ہیں۔ ہمیں ایسے آدمی یہاں کہاں سے ملیں گے؟" شہاب کے اس سوال پر فیروز نے سگریٹ کی راکھ جھٹک کر کہا۔

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ ہمیں معلوم ہو ہی چکا ہے کہ شیر خان کی بیٹی دن کے بارہ بجے کے قریب کالج سے واپس آتی ہے۔ بس یہی کافی ہے اب تم ہوٹل میں آرام کرو۔ میں ذرا حالات کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔"

ایک جرائم پیشہ آدمی کے لئے کسی شہر میں دوسرے جرائم پیشہ لوگوں کا سراغ لگانا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی بو سونگھ لیتے ہیں۔ دوسرے ان لوگوں

کو ایک دوسرے کے ٹھکانوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہاں کہاں ہو سکتے ہیں۔ فیروز صرف جرائم پیشہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک عیار اور تیز ذہن کا مالک بھی تھا اس نے بہت جلد جرائم پیشہ لوگوں کا ایک اڈہ تلاش کر لیا۔ یہ اڈہ شہر سے دور ایک جھلار کے پاس ٹیبے کے پہلو میں واقع تھا۔ یہاں چرس اور ناجائز طریقے سے کشید کی گئی دیسی شراب چوری چھپے فروخت ہوتی تھی۔ فیروز کی مجرم شناس نگاہوں نے دو آدمیوں کو اپنے منصوبے کے واسطے چن لیا۔ یہ دو بدمعاش ٹائپ آدمی تھے جن میں سے ایک چار سال جیل کاٹ چکا تھا اور دوسرے پر قتل کے دو مقدمے چل رہے تھے۔ فیروز ان دونوں کو ٹیبے کے پیچھے لے گیا اور بغیر کسی تمہید کے بولا۔

"ایک عورت کو اغوا کرنا ہے۔ اگر تم لوگ یہ کام کر دو تو دونوں کو میں بیس ہزار روپے دوں گا۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

یہ وہ جرائم پیشہ لوگ تھے جو پانچ ہزار پر کسی کو قتل بھی کر سکتے تھے یہاں تو صرف ایک عورت کو اغوا کرنا تھا۔ جو آگے سے جوابی کاروائی بھی نہیں کر سکتی۔ عورت تو ویسے ہی بڑی نازک اور کمزور ہوتی ہے۔ اس کے عوض انہیں دس دس ہزار روپے کی رقم مل رہی تھی۔ فیروز نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے چار ہزار روپے کے نوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے ساتھ ہی دوسری جیب سے پستول بھی نکال کر نوٹوں کے اوپر رکھ دیا اور بولا۔

"یہ چار ہزار کی رقم تم دونوں کو میں ایڈوانس دوں گا یہ پستول اس لئے ہے کہ اگر تم نے ایڈوانس لے کر فرار ہونے کی کوشش کی تو اس کی گولی تمہارا پیچھا کرے گی اور تم جہاں کہیں بھی ہو گے تمہیں موت کی نیند سلا دے گی۔ بولو کیا کہتے ہو؟ اس کام کے لئے تیار ہو یا میں کوئی دوسرا آدمی تلاش کروں؟"

دونوں جرائم پیشہ آدمی سمجھ گئے تھے کہ ان کا واسطہ کسی شریف آدمی سے نہیں بلکہ ایک چھٹے ہوئے بدمعاش سے پڑ رہا ہے۔ رقم بیس ہزار کی تھی کام معمولی تھا ان میں سے ایک بدمعاش نے جس کا نام سانولا تھا فیروز سے پوچھا۔

"عورت کو کہاں سے اغوا کر کے کہاں پہنچانا ہو گا؟" فیروز نے پستول اٹھا کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ چار ہزار روپے ان دونوں میں ایڈوانس کے طور پر تقسیم کر دیے اور پھر

سب سمجھا دیا کہ انہیں کیا کرنا ہو گا۔ جانے سے پہلے فیروز نے انہیں ہدایت کی کہ وہ کل صبح نو بجے اسی ٹیبے کے پاس تیاری کر کے آ جائیں۔" سانولا کے ساتھی نے کہا۔

"کیا اس لڑکی کے ساتھ کوئی باڈی گارڈ بھی ہوتا ہے؟" فیروز بولا۔

"نہیں۔ وہ کالج سے اپنی گاڑی میں اکیلی گھر آتی ہے۔ تمہیں راستے میں ایک خاص جگہ گھات لگا کر اس کا انتظار کرنا ہو گا اور پھر اسے جس طرح بھی تم کر سکو بے ہوش کر کے اغوا کرنا اور اپنی گاڑی میں ڈال کر ہماری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچانا ہو گا۔ وہیں تمہیں باقی کے سولہ ہزار روپے کی رقم ادا کر دی جائے گی۔ ایک بار پھر غور کر لو سوچ سمجھ لو۔" سانولا سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"بادشاہو! ہاں کر دی ہے تو پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ آپ گاڑی لے کر کل یہاں آ جائیں۔ ہم تیار ہوں گے۔ ہمیں گاڑی چلانی آتی ہے۔" فیروز نے واپس اپنے ہوٹل پہنچ کر یہ خوشخبری شہاب کو سنائی تو وہ مشکوک انداز میں بولا۔

"کچھ پتا بھی کر لیا تھا ان لوگوں کا کہ یونہی چار ہزار کی رقم دے آئے ہو؟ فیروز جیب سے پستول نکال کر سرہانے کے نیچے چھپاتے ہوئے مسکرایا۔

"شہابو! تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں کوئی شریف آدمی تو نہیں ہوں۔ بس کل سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے بعد شیر خان اپنے آپ ہمارے حصے کی رقم لے کر ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔"

شہاب صوفے میں دھنستے ہوئے بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اغوا کے فوراً بعد ہم شیر خان کی بیٹی کو لے کر کراچی روانہ ہو جائیں وہ بااثر آدمی ہے۔ اغوا کے فوراً بعد پولیس حرکت میں آ جائے گی۔" فیروز نے کہا۔ "یار تم اتنا گھبراتے کیوں ہو؟ گاڑی ہمارے پاس ہو گی۔ ہم منٹوں میں کہیں سے کہیں نکل جائیں گے اور ایک بار غیر علاقے میں داخل ہو گئے تو پولیس بھی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ غیر علاقے میں جس شخص کے بارے میں میں نے تمہیں بتا رکھا ہے وہ نہایت قابل اعتبار آدمی ہے۔ سارا ڈراما وہیں ہو گا۔ شیر خان وہیں رقم لے کر اپنی بیٹی کو واپس لے جانے آئے گا۔ بس تم بے فکر ہو جاؤ۔"

شہاب نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر ہوٹل کے پچھواڑے جو احاطہ تھا وہاں

نگاہ ڈالی اور کہنے لگا۔

"ہاں صبح سے ایک ویگن بھی کھڑی ہے میرا خیال ہے ہم یہ ویگن لے جائیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ مگر کہیں یہ خراب نہ ہو۔" فیروز اٹھ کر کھڑکی میں آگیا۔ نیچے جھانک کر دیکھا۔

"یہ ہوٹل والوں کی ویگن ہے شام کو اس میں کچھ سامان آیا تھا۔ گاڑی چالو حالت میں ہے صبح دیکھیں گے۔" شہاب بولا۔

"مگر گاڑی ہمیں عین وقت پر اٹھانی ہو گی۔ تاکہ گاڑی کی گمشدگی کی خبر ہونے تک ہم شہر سے دور نکل چکے ہوں۔"

"ایسا ہی ہو گا۔ اب ذرا نیچے فون کر کے کھانا منگواؤ مجھے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

دونوں نے کمرے میں ہی کھانا کھایا۔ پھر اپنے منصوبے پر مزید غور و فکر کرنے لگے۔

پستول دونوں کے پاس تھے گولیاں بھی مناسب تعداد میں موجود تھیں۔ رات گیارہ بجے کے بعد وہ سو گئے صبح اٹھے تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ واردات شروع کرنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔ انہیں پورے نو بجے گاڑی لے کر دونوں بدمعاشوں کے پاس ان کے اڈے پر پہنچنا تھا۔ ہوٹل والوں کو کسی قسم کے بل ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد دونوں پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔ پستول انہوں نے جیکٹ کے اندر کمر کے گرد باندھ لیے تھے۔ رقم فیروز نے اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔

"ٹھیک پندرہ منٹ بعد ہمیں یہاں سے نکل جانا ہو گا۔" شہاب نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔

ہوٹل کی ویگن وہیں کھڑی تھی۔ اتنے میں ایک نیلے رنگ کی کار احاطے میں آکر رکی۔ اس میں سے ایک عورت ایک مرد اور ان کے دو بچے باہر نکلے۔ مرد نے اٹیچی کیس ہاتھ میں پکڑا۔ عورت نے گاڑی کے دروازے بند کیے مگر تالہ نہیں لگایا۔ فیروز بولا۔

"یہ گاڑی ٹھیک رہے گی۔ احمق عورت نے دروازے لاک نہیں کیے۔ جلدی سے نیچے اترو۔"

دونوں لفٹ کے ذریعے ہوٹل کی لابی میں آگئے یہاں سے تیز تیز قدم چلتے ہوٹل کے

عقبی احاطے میں پہنچے۔ نیلے رنگ کی گاڑی وہیں کھڑی تھی۔ دونوں بڑے آرام سکون سے گاڑی کے پاس گئے۔ دروازے کھول کر اگلی سیٹوں پر بیٹھے فیروز نے انجن اسٹارٹ کیا۔ گاڑی کو تھوڑا سا پیچھے لے جا کر گھمایا اور ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے گاڑی کو بڑی سڑک پر ڈالا اور اس کی رفتار بڑھادی۔

"بھائی ویگن کا کوئی اعتبار نہیں تھا کیا پتا اسٹارٹ ہی نہ ہوتی یہ چلی چلائی گاڑی ہے۔ پیٹرول کی سوئی بتا رہی ہے کہ ٹینکی آدھی سے زیادہ بھری ہوئی ہے۔"

دونوں جرائم پیشہ آدمی یعنی سانولا اور اس کا ساتھی پوری طرح تیار ہو کر ٹیبے کے پاس ایک درخت تلے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور فیروز کا انتظار کر رہے تھے سانولا کہہ رہا تھا۔

"کام بڑا آسان ہے اتنی رقم تو ہمیں کسی کو قتل کرنے پر بھی نہیں مل سکتی۔" اس کا ساتھی بولا۔

"پوری رقم پہلے پکڑ لینی چاہیے۔ آدمی بڑا کایاں ہے۔ کہیں جل نہ دے جائے۔" سانولا ہنسا ہاتھ کو جھٹک کر بولا۔

"پاگل ہو گئے ہو۔ تمہیں بندے کی پہچان نہیں ہے یہ مجھے لاکھوں کا معاملہ لگتا ہے لڑکی کو یونہی اغوا نہیں کرایا جا رہا باقی رقم کام ہوتے ہی مل جائے گی۔" ساتھی بدمعاش کہنے لگا۔

"اگر ایسی ویسی بات ہوئی تو میں اس کا لحاظ نہیں کروں گا۔" سانولا بولا۔

"تم کیا لحاظ نہیں کرو گے۔ میں وہیں موقع پر اسے ختم کر دوں گا۔ چاقو میں نے نیفے میں چھپا لیا ہے۔"

"گاڑی ادھر ہی آرہی ہے سانولے۔" دونوں بدمعاش کھڑے ہو گئے۔ نیلے رنگ کی گاڑی ذرا فاصلے پر کچی سڑک پر آکر رک گئی تھی فیروز باہر نکلا دوسرے بدمعاش نے سانولے سے کہا۔

"اوئے اس کے ساتھ دوسرا آدمی بھی ہے۔"

"پھر کیا ہوا یار؟" اتنی دیر میں فیروز ان کے قریب آچکا تھا۔

"سب ٹھیک ہے؟" اس نے سانولے سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ سانولا نے سگریٹ پھینک دیا ہنس کر بولا۔

"سب اوکے ہے بادشاہو۔"

فیروز نے دونوں بدمعاشوں کو گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی بڑی تیزی سے کچے راستے سے نکل کر کوہ مری جانے والی سڑک پر چل پڑی۔ فیروز خود گاڑی چلا رہا تھا شہاب ایک بدمعاش کے ساتھ پیچھے بیٹھا تھا دوسرا بدمعاش سانولا فیروز کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ شہر سے باہر نکلتے ہی فیروز نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ پھر مری کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ راستے میں انہیں کوئی ٹریفک کا سپاہی نہ ملا جو چوری کی گاڑی کا نمبر نوٹ کرتا۔ گاڑی پہاڑی موڑ کاٹتی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ موسم بھی ٹھیک تھا۔ آسمان بھی صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آگے صرف ایک مشکل مقام آنے والا تھا جہاں شہاب اور فیروز کو احتیاط کی ضرورت تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں گاڑی کو شیر خان کے بنگلے روبی ہاؤس کے سامنے سے گزرنا تھا۔ اگر اتفاق سے شیر خان بنگلے کے باہر سڑک پر کھڑا ہوا تو وہ ان دونوں کو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن ایسا چانس ہزاروں میں سے ایک تھا کہ شیر خان اتنی سردی میں اپنے گرم کمرے سے نکل کر باہر سڑک پر کھڑا ہو۔ پھر بھی جب شیر خان کا بنگلہ قریب آیا تو فیروز اور شہاب نے اپنے سر تھوڑے نیچے کر لئے۔ گاڑی فراٹے بھرتی روبی ہاؤس کے آگے سے نکل گئی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کافی آگے جا کر ایک جگہ پہاڑی کا ایک موڑ تھا جہاں تھوڑی سی کھلی جگہ تھی اور درختوں کے نیچے پتھر کا ایک بینچ پڑا تھا۔ ایک طرف چیڑ کے درختوں کے جھنڈ اوپر کی جانب چلے گئے تھے۔

یہاں پہنچ کر فیروز نے گاڑی روک دی اور گھڑی دیکھی۔ شیر خان کی بیٹی کے کالج سے واپس آنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ فیروز نے گاڑی کو گھما کر سڑک کی ایک طرف اس طرح لگا دیا کہ واپسی پر اسے بڑی آسانی سے اسٹارٹ کر کے واپس لے جایا جا سکتا تھا۔ فیروز اور شہاب گاڑی کے اندر ہی بدمعاشوں کے ساتھ بیٹھے رہے۔ فیروز نے سانولے سے کہا۔

"میں نے تمہیں لڑکی کی گاڑی کا رنگ اور لڑکی کا حلیہ بتا دیا ہے ہم اوپر درختوں کے پیچھے بیٹھے ہوں گے تم دونوں کو اسی جگہ واردات کرنی ہے ہم تمہیں دیکھ رہے ہوں گے

جونہی تم لڑکی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالو گے ہم بھی نیچے اتر آئیں گے۔ بے ہوش کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا کہ لڑکی کے سر میں زیادہ شدید چوٹ نہ آئے اور خون بھی نہ نکلے۔"

سانولا بولا۔

"آپ بے فکر رہیں بادشاہو۔ آپ کا بندہ آپ کو بالکل صحیح حالت میں ملے گا۔"

فیروز اور شہاب کے اندازے کے مطابق جب شیر خان کی بیٹی عائشہ کے وہاں تک پہنچنے میں بیس منٹ رہ گئے تو وہ دونوں چڑھائی چڑھ کر اوپر کچھ فاصلے پر درختوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ دونوں بدمعاش گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ سانولا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا ان کی نگاہیں اوپر کوہ مری سے آتی پہاڑی سڑک پر لگی تھیں اس دوران ایک لاری اور ایک ٹرک اوپر سے آ کر گزر گیا سیزن چونکہ ختم ہو چکا تھا اس لئے سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ سانولے کو خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ لڑکی کو بے ہوش ضرور کرنا ہے اس کام کے لئے سانولے نے اپنے بھاری چاقو کے دستے کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے ساتھی نے لڑکی کے اوپر کھیس ڈال کر اسے قابو میں کرنا تھا اور سانولے نے اس کے سر کے پیچھے ضرب لگا کر اسے بے ہوش کرنا تھا۔ ان دونوں مضبوط جسم والے بدمعاشوں کے لئے یہ کام بظاہر کوئی مشکل نہیں تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ ان دونوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ جس لڑکی کو وہ اغوا کرنے والے ہیں وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے وہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کو اس کے باپ شیر خان نے کمانڈو کی پوری ٹریننگ دے رکھی تھی اور جو بھرا ہوا پستول گاڑی چلاتے وقت ڈیش بورڈ میں ساتھ رکھتی تھی۔

شہاب اور فیروز اوپر درختوں کے پیچھے بیٹھے بے چین نظروں سے اوپر سے آتی سڑک کو تک رہے تھے۔ شہاب نے فکر مند ہو کر کہا۔

"کیا معلوم آج وہ کالج ہی نہ گئی ہو۔" فیروز نے سگریٹ کی راکھ چٹکی بجا کر جھاڑتے ہوئے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں۔ یہی واردات کل ہو جائے گی مگر شیر خان کو ہم چھوڑیں گے نہیں اس سے اپنے حصے کی پائی پائی وصول کر کے رہیں گے۔"

"میرا خیال ہے گاڑی آ گئی ہے پھوجے۔"

شہاب نے ایک طرف سڑک پر ٹکٹکی باندھ رکھی تھی۔ فیروز نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ اور سڑک پر نیلے رنگ کی گاڑی چلی آرہی تھی۔ روبی کی شیرنی بیٹی نے اس روز چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی کالج کی فرنچ ٹیچر سے فرانسیسی زبان کا درس لے کر آرہی تھی۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے گاڑی کے اندر کی فضا میں ہلکی ہلکی گرماہٹ تھی۔

بس ایک آخری پہاڑی موڑ رہ گیا تھا اس کے بعد عائشہ نے اپنے بنگلے والی سڑک کی طرف گھوم جانا تھا۔ وہ بڑی تن آسانی سے بیٹھی تھی۔ گاڑی کا انجن اس نے بند کر دیا تھا۔ کیونکہ گاڑی اترائی پر جا رہی تھی۔ اسے گھر جانے کی زیادہ جلدی بھی نہیں تھی۔ جونہی اس کی گاڑی یوٹرن والے آخری پہاڑی موڑ پر آئی عائشہ کا جو پاؤں بریک پر تھا اپنے آپ نیچے دب گیا۔ گاڑی کی رفتا ایکدم کم ہو گئی۔ سامنے سڑک کے بیچ میں ایک کار اس طرح کھڑی تھی کہ عائشہ اپنی گاڑی آگے نہیں نکال سکتی تھی۔ ایک آدمی نے گاڑی کا بونٹ کھول رکھا تھا اور انجن پر یوں جھکا تھا جیسے اس کی مرمت کر رہا ہو۔

عائشہ نے گاڑی روک لی اور دو تین بار اوپر تلے ہارن بجایا۔ سانولے کا ساتھی گاڑی کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگیا۔ وہ عائشہ کی گاڑی کی طرف بڑھا اور بولا۔

"بیگم صاحبہ گاڑی کا انجن خراب ہو گیا؟ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

اتنے میں سانولا بھی بونٹ نیچے کر کے عائشہ کی گاڑی کی طرف بڑھا۔ ان دونوں کی شکلیں عائشہ کو کچھ مشکوک سی لگیں مگر یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان لوگوں نے یہ سارا ڈرامہ اس کو اغوا کرنے کے لیے رچایا ہوا ہے۔ سانولا گاڑی کی کھڑکی پر جھک کر بولا۔

"بیگم صاحبہ آپ کے پاس چھوٹا پلاس ہو گا؟" اس کے ساتھ ہی سانولا گاڑی کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ عائشہ کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا۔ اس نے کسی قدر اونچی آواز میں کہا۔

"میرے پاس پلاس نہیں ہے۔ دروازہ کیوں کھول رہے ہو؟" اتنے میں سانولے کے ساتھی نے پوری طاقت سے پتھر مار کر دوسری طرف سے کھڑکی کا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ اب کچھ بھی سوچنا، سمجھنا باقی نہیں رہ گیا تھا۔ گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر اب عائشہ نہیں

بیٹھی تھی۔ شیرنی کی بچی شیرنی بیٹھی تھی۔ پلک جھپکنے میں اس کا ہاتھ ڈیش بورڈ کی طرف بڑھا۔ دوسرے لمحے بھرا ہوا پستول اس کے ہاتھ میں تھا پستول سے دو فائر ہوئے۔ دونوں گولیاں سانولے کے ساتھی کے جسم سے پار ہو گئیں۔ وہ خون میں لت پت ہو کر سڑک پر گرا اور تڑپنے لگا۔ سانولے نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اس لڑکی کے پاس پستول بھی ہو سکتا ہے ایک لمحے کے لئے وہ گھبرا سا گیا۔ مگر پھر فوراً ہی جیب سے کمانی دار چاقو نکال کر عائشہ پر حملہ کر دیا۔ شیرنی غافل نہیں تھی۔ اس کا پستول ایک اور فائر کر چکا تھا۔ یہ گولی سانولے کے بازو میں لگی اور وہ نیچے جھک گیا۔ عائشہ اب گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ سانولے نے موت اپنے سامنے دیکھی تو اپنے آپ کو جھاڑیوں میں نیچے کی طرف لڑھکا دیا۔ عائشہ نے اوپر سے تین فائر جھونک دیئے۔ مگر سانولا فائرنگ کی زد سے محفوظ ایک جگہ کھڈ میں جھکے ہوئے بڑے پتھر کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ شیرنی عائشہ نے جھک کر سانولے کے ساتھی بدمعاش کو دیکھا۔ اس پر غشی طاری تھی۔ وہ جلدی سے سڑک کے درمیان کھڑی گاڑی کی طرف آئی۔ اندر جھانک کر دیکھا چابی لگی ہوئی تھی۔ اس نے چابی گھمائی تو انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ ان بدمعاشوں نے صرف اسے اٹھانے یا ہلاک کرنے کے واسطے یہ سارا منصوبہ بنایا تھا۔ عائشہ نے گاڑی کو ریورس کر کے سڑک پر ایک جانب کھڑا کر دیا اور اپنی گاڑی کو وہاں سے تیزی سے نکال کر لے گئی۔ وہ اس واردات سے اپنے باپ شیر خان کو جلدی سے جلدی آگاہ کرنا چاہتی تھی۔

درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے شہاب اور فیروز نے جب کھیل کا پانسہ پلٹتے دیکھا تو وہ حیران پریشان سے ہو کر رہ گئے۔ شہاب گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"پھوجے! اب یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے بھاگ چلو۔ عائشہ اپنے باپ شیر خان کو لے کر یہاں پہنچنے والی ہے۔" فیروز بولا۔

"ایک ضروری کام کر کے یہاں سے واپس جائیں گے۔ میرے ساتھ آؤ۔ وہ جلدی جلدی جھاڑیاں پھلانگتے نیچے آگئے۔ سڑک کنارے زخمی بدمعاش کے سینے سے خون ابھی تک ابل رہا تھا۔ وہ آخری سانس لے رہا تھا۔ شہاب کہنے لگا۔

"یہاں سے بھاگ چلو۔ تم کیا سوچ رہے ہو۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر نکل چلو۔

شیر خان آگیا تو ہمارے سارے راستے بند ہو جائیں گے۔" فیروز نے جھڑک کر کہا۔

"خاموش رہو تھوڑی دیر......." پھر اس نے نیچے اترائی پر اگی ہوئی جھاڑیوں کی طرف منہ کر کے سانولے کو آواز دی۔

"سانولے! جلدی سے اوپر آجاؤ۔ یہاں پولیس آنے والی ہے۔ جلدی کرو۔" سانولا بڑے پتھر کے پیچھے سے نکل کر اوپر چڑھائی چڑھنے لگا۔ اتنی دیر میں فیروز نے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال لیا تھا۔ ابھی تک شباب کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ فیروز کیا کرنے والا ہے۔ جونہی سانولا بدمعاش جس کے بازو میں گولی لگنے کی وجہ سے خون نکل رہا تھا اس کے سامنے آیا۔ فیروز نے جیکٹ کے اندر سے اپنا ہاتھ باہر نکالا۔ جتنی تیزی سے اس نے ہاتھ باہر نکالا اس سے دوگنی تیزی کے ساتھ فیروز نے سانولے کے دل کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی سانولے کے دل میں لگی اور پار ہو گئی۔ وہ تو ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا۔ خون کا فوارہ اس کے سینے سے ابل پڑا اور وہ پیچھے کی جانب جھاڑیوں میں جا گرا۔ فیروز لپک کر اس کے قریب گیا۔ اس کے سر کے ساتھ پستول کی نالی لگائی اور دوسرا فائر کر دیا۔ سانولا وہیں مر گیا۔ شباب عجیب نظروں سے فیروز کی اس خونی کارروائی کا جائزہ لے رہا تھا۔ فیروز لپک کر سڑک کنارے پڑے سانولے کے ساتھی بدمعاش کے پاس آگیا۔ وہ شدید زخمی حالت میں آخری سانس لے رہا تھا۔ فیروز نے گولی مار کر اس کی کھوپڑی بھی اڑا دی۔

"جلدی سے گاڑی کا رخ کوہ مری کی طرف کرو میرا منہ کیا تک رہے ہو شبابو؟"

روبی کی بیٹی عائشہ شیرنی نے گاڑی کا رخ راولپنڈی کی طرف کر کے اسے سڑک کنارے کھڑا کیا تھا۔ شباب نے دوڑ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اسے ریورس کر کے اس کا منہ کوہ مری کی طرف کیا اب فیروز بھی اس کی ساتھ والی سیٹ پر لپک کر بیٹھ چکا تھا۔ گاڑی کو فل تھروٹل دیا اور تیزی سے مری کی جانب سڑک کی چڑھائی طے کرنی شروع کر دی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ سیزن گزر جانے کی وجہ سے پیچھے سے بھی کوئی گاڑی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ دور انہیں ایک ٹرک آتا نظر آیا۔ فیروز نے شباب سے کہا۔

"لیے چلو۔ لیے چلو۔ گاڑی فسٹ گیر میں ہی رہنے دو۔"

ٹرک پر لکڑی کے شہتیر لدے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے ان کی گاڑی کے قریب سے

گزر گیا۔ گاڑی جتنی تیزی سے چل سکتی تھی چڑھائی پر چلی جا رہی تھی۔ مری میں بادل چھا رہے تھے۔ بادلوں کا ایک ٹکڑا دھند کی شکل میں ان کے آگے سے گزر گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سٹی بینک میں سے گزر رہے تھے۔ چوک میں آکر فیروز نے شباب سے کہا۔

"ایجنسی کی طرف نہیں جانا سیدھے سوار گلی کی طرف نکل چلو۔"

شباب نے فیروز کے کہنے پر گاڑی دوسری چھوٹی سڑک پر ڈال دی جو نتھیا گلی کی طرف جاتی تھی۔ فیروز ان علاقوں سے واقف تھا۔ اس کا تعلق ان ہی علاقوں سے تھا۔ یہ سڑک ویران تھی۔ ایک جگہ بہت بڑی چٹان کا موڑ آگیا۔ دوسری جانب گہری کھڈ تھی۔ فیروز نے شباب کو گاڑی کھڑی کرنے کو کہا دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے۔ فیروز نے نیچے کھڈ میں جھانک کر دیکھا پھر کہنے لگا۔

"ہم اگر گاڑی اس جگہ ہی رہنے دیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر تم کہتے ہو تو ہم گاڑی یہاں سے کھڈ میں بھی گرا سکتے ہیں۔ شباب نے گاڑی کو گالی دیتے ہوئے کہا

"اس کو ختم ہی کر دو۔"

گاڑی کو آہستہ آہستہ چلاتے کھڈ کے کنارے پر لے آئے۔ اس کے بعد انہوں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ کم از کم ان کے آس پاس کوئی انسان نہیں تھا۔ اب گاڑی کو ذرا سا دھکیلنے کی ہی ضرورت تھی۔ دوسرے لمحے گاڑی تیزی سے لڑھکتی جھاڑیوں کو کچلتی تھوڑی دور نیچے کو گئی اور پھر لڑھکنیاں کھاتی دور نیچے کھڈ کی تہہ میں پتھروں سے ٹکرائی اور آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو کر ادھر ادھر بکھر گئی۔ شباب اور فیروز اس دوران وہاں سے جا چکے تھے۔ ایک جگہ آکر انہوں نے سڑک چھوڑ دی اور چھوٹی سی پگڈنڈی پر ہو گئے جو درختوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی اوپر سٹی بینک کی کوٹھیوں کی طرف چلی گئی تھی۔ یہاں انہوں نے آکر کچھ سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتے ہوئے باتیں بھی کر رہے تھے۔

"اب کیا کرنا ہو گا؟" شباب نے فیروز سے پوچھا۔ فیروز بولا۔

"ذرا اوپر چل کر کسی جگہ آرام سے بیٹھتے ہیں سب بتا دوں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

سنی بینک کی کوٹھیاں سیزن ختم ہو جانے کی وجہ سے خالی پڑی تھیں۔ ڈھلوانوں کی جھاڑیوں اور درختوں میں کہیں کہیں کوئی مقامی آدمی لکڑیاں کاٹتا یا کلہاڑی کندھے پر ڈالے چلتا نظر آجاتا تھا۔ وہ دونوں سنی بینک کے علاقے کے پہاڑی اور بہت حد تک دشوار گزار علاقے میں سے گزر کر اوپر مری جنرل پوسٹ آفس کے چوک میں نکلنا چاہتے تھے۔ شہاب ایک جگہ دم لینے کے لئے رک گیا۔ پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ ذرا دم لینے کے بعد تعجب سے کہنے لگا۔

"تم نے ایک بات نوٹ کی ہے؟"

"کیا؟" فیروز نے شہاب کی طرف دیکھا۔ شہاب بولا۔

"شیر خان کی بیٹی نے کس دیدہ دلیری سے ایک خون کر دیا۔ وہ تو اپنی طرف سے سانولے کے ساتھی کو ہلاک کر کے گئی تھی۔ اگر سانولا پہلی گولی کھا کر بھاگ نہ جاتا تو وہ اسے بھی زندہ نہ چھوڑتی۔ اس لڑکی کو قابو میں کرنے کے لئے ہمیں بڑی ہوشیاری سے کام لینا پڑے گا۔" فیروز نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ فضا میں سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"جیسا شیر خان ہے اور جیسی اس کی بیوی روبی تھی قدرتی بات ہے کہ ان کی بیٹی کو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے۔" شہاب نے ہونٹوں کو یوں سکیڑا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔ کہنے لگا۔

"تم جانو .... میرا تو خیال ہے کہ اس لڑکی کے اغوا کے لئے کوئی زبردست قسم کی اسکیم تیار کرنی پڑے گی۔" فیروز نے شہاب کے گھٹنے کو اپنے ہاتھ سے دبا کر کہا۔

"میرے یار شہابو! عورت چاہے۔ بہرام ڈاکو بن جائے۔ آخر وہ عورت ہی ہوتی ہے۔ وہ مرد کا مقابلہ کبھی نہیں کر سکتی۔ میں تمہیں اسے اغوا کر کے دکھاؤں گا۔"

"میرا خیال ہے پولیس ضرور وہاں پہنچی ہو گی۔ جب ہی تو لاش سڑک پر نہیں تھی۔" شہاب جیسے اپنے آپ سے ہمکلام تھا۔ فیروز نے کہا۔

"شیر خان نے پولیس کو رپورٹ ہی نہیں کی ہو گی اسے رپورٹ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ قتل اس کی کوٹھی سے ایک فرلانگ پیچھے ہوا ہے۔ کوئی ثبوت پیش کرنے والا ہی نہیں کہ قتل شیر خان کی بیٹی نے کیا ہے۔ ہمارے پکڑے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

شہاب نے بھی سگریٹ سلگا لیا۔ وہ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں غرق سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ پھر بولا۔

"کیا ان دونوں کا خون کرنا ضروری تھا؟ فیروز نے دائیں بائیں ایک نگاہ ڈالی اور بولا۔

"شہاب! تم آدمی ضرور دلیر ہو مگر تمہارے دماغ میں عقل کی کمی ہے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ ہم نے کروڑوں روپے داؤ پر لگا رکھے ہیں اگر ہم انہیں زندہ چھوڑ دیتے تو یہ کسی بھی جگہ کسی بھی سچویشن میں ہمیں پہچان سکتے تھے۔ یقین کرو اگر وہ شیر خان کی بیٹی کو اغوا کر کے ہمارے حوالے کر دیتے تو میں نے ان دونوں کو ختم کر دینے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔"

شہاب نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ چلنے لگے تو شہاب نے ایک بار پھر پوچھا کہ اب آگے کیا پروگرام ہے؟ فیروز پتھروں پر احتیاط سے چل رہا تھا کہنے لگا۔

"آج کی رات ہم کوہ مری میں ہی کسی جگہ گزاریں گے کل دن میں شیر خان سے ملاقات کریں گے اور اس پر یہ ظاہر کریں گے کہ ہم کراچی جانے سے پہلے اس سے آخری بار ملنے آئے ہیں۔"

"اس کے بعد؟" شہاب نے سوال کیا۔

فیروز نے جواب دیا۔ "یہ تمہیں شیر خان سے ملاقات کے وقت معلوم ہو جائے گا کہ میں نے آگے کیا پروگرام بنایا ہے۔ اتنی دیر تک میں اپنے پروگرام کو آخری شکل بھی دے

لوں گا۔"

سنی بینک کی چڑھائی ختم ہوئی تو وہ ڈاک خانے والے چوک میں نکل آئے تھے۔ آج کل یہ دشوار گزار راستہ ایک چھوٹی سی پختہ سڑک میں تبدیل کر دیا گیا ہے مگر بہت غیر ہموار پتھریلا راستہ تھا۔ جہاں سے زیادہ تر مقامی لوگ ہی شاٹ کٹ کے خیال سے گزرتے تھے۔ مری کا آسمان بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ سرد ہوا تھی۔ مال روڈ پر اکا دکا آدمی ہی دکھائی دیتا تھا۔ شہاب نے کہا کہ ہمیں یوں آزادی سے نہیں پھرنا چاہئے چلو کسی ہوٹل میں کمرہ لے لیتے ہیں۔ فیروز پنڈی پوائنٹ کی طرف نکل گیا۔ یہ علاقہ نسبتاً زیادہ خاموش اور ویران ویران تھا۔ یہاں ایک ہوٹل میں انہوں نے ایک کمرہ لے لیا۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور کمرے میں ہی آرام کرنے لگے۔

رات انہوں نے اسی ہوٹل میں بسر کی۔ دوسرے دن دوپہر تک ہوٹل کے کمرے میں ہی رہے پھر تیار ہو کر نیچے آئے۔ ہوٹل کا بل ادا کیا اور ایک لاری میں سوار ہو کر پنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔ لاری جب اسی پہاڑی موڑ پر سے گزری جہاں انہوں نے دو بدمعاشوں کا خون کیا تھا تو باہر جھانک کر دیکھا۔ جہاں سانولا کے ساتھی کی لاش گری تھی وہاں خون کے دھبے موجود تھے مگر لاش نہیں تھی۔ سانولا تو گولی کھا کر پہلے نشیب کی جھاڑیوں میں گرا تھا۔ اس کی لاش بھی انہیں کہیں نظر نہ آئی۔ لاری شیر خان کے بنگلے کے سامنے سے ہو کر پنڈی کی طرف آگے نکل گئی۔ کوئی ایک فرلانگ گزر جانے پر فیروز نے لاری رکوائی اور دونوں لاری سے اتر کر شیر خان کے بنگلے روبی ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ بنگلے کے چوکیدار نے انہیں دیکھتے ہی بڑے ادب سے سلام کیا اور ٹیلی کام پر اندر اطلاع کی۔ شیر خان نے دونوں کو اندر بلا لیا۔ حسب سابق اس بار بھی شیر خان ڈرائنگ روم سے نکل کر برآمدے میں ان کے خیر مقدم کو موجود تھا۔ فیروز اور شہاب نے بڑی خندہ پیشانی سے آگے بڑھ کر شیر خان سے مصافحہ کیا اور اسے باری باری گلے لگایا۔ فیروز بولا۔

"شیر خان! پہلے تو یہی ارادہ تھا کہ کراچی نکل جائیں اور وہاں سے سری لنکا کی فلائیٹ پکڑیں مگر پھر تمہاری محبت نے جوش مارا۔ ہم نے ارادہ بدل لیا۔ سوچا نہ جانے پھر زندگی میں ملنے کا کبھی اتفاق ہو کہ نہ ہو چل کر آخری بار اپنے پرانے ساتھی سے مل لیتے ہیں۔"

شیر خان نے بھی بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگا۔

"بڑا اچھا کیا کہ تم آ گئے۔ اب کچھ روز میرے ساتھ گزارو۔ پرانے دنوں کی یادیں تازہ کریں گے۔"

وہ ایک ڈرائینگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ شیر خان نے کھانے کا پوچھا۔ شہاب نے کہا۔

"کھانا تو ہم پنڈی سے ہی کھا کر آئے ہیں۔" فیروز بولا۔

"زیادہ نہیں یار! بس دو دن تمہارے پاس رہیں گے۔ اسی لئے ہم نے ٹیکسی بھی واپس کر دی ہے۔" شیر خان نے مٹھائی اور چائے منگوائی اور شہاب اور فیروز سے باتیں کرنے لگا۔

"مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ تم کچھ وقت میرے ہاں گزارو گے۔ ایک مدت ہو گئی ہے کبھی ہم اکٹھے رہا کرتے تھے۔" فیروز نے منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"شیر خان! پیارے ہم تو اب بھی اکٹھے ہی ہیں۔ دل ملے ہوئے ہوں تو فاصلہ کوئی چیز نہیں ہوتا۔" شیر خان نے ایک بار پھر پرانی دوستی کا احترام کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم لوگ چاہو تو پاکستان میں رہ کر اپنا کوئی باوقار کاروبار شروع کر سکتے ہو۔ میں حاضر ہوں۔ جتنی مدد ہو سکے گی کروں گا۔"

فیروز نے دل میں کہا ہمارا سارا مال ہڑپ کر کے اب ہمیں اسی میں سے ادھار دے کر احسان کر رہے ہو؟ ہم تو تیری ساری جائیداد ساری دولت پر قبضہ کریں گے۔ ایک طرح سے یہ ساری دولت ہماری ہی ہے اوپر سے مشکورانہ انداز میں کہنے لگا۔

"ارے نہیں شیرے یار! اتنی مدت سے لنکا میں رہ رہے ہیں۔ اب یہاں آ کر کیا کریں گے۔ وہیں اپنا کوئی کاروبار شروع کر دیں گے۔ اللہ مالک ہے۔"

شہاب اور فیروز دونوں اس بات کو محسوس کر رہے تھے کہ شیر خان کی بیٹی کے ساتھ اتنا بڑا واقعہ ہو گزرا ہے مگر اس بارے میں شیر خان نے ابھی تک کسی قسم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شیر خان کی بیٹی عائشہ نے اپنے ساتھ گزرے سانحے کا باپ سے ذکر ہی نہ کیا ہو؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عائشہ کی کار کا شیشہ بھی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس نے باپ سے ضرور بات کی ہو گی تو کیا

پھر شیر خان انہیں اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا؟ دونوں یہی ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ ان کے دماغوں میں اس لمحے ایک ہی طرح کے خیالات گردش کر رہے تھے۔ وہ اپنی طرف سے کوئی ذکر چھیڑ کر شیر خان کو کسی شک میں مبتلا بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ شیر خان اتنا بااثر آدمی تھا کہ اگر پولیس کو واقعے کی اطلاع مل بھی گئی ہو تو وہ اسے رفع دفع کرا دے۔ شہاب اور فیروز کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ شیر خان کو ان دونوں پر ذرا سا بھی شبہ نہیں تھا پھر بھی فیروز سے نہ رہا گیا۔ وہ قتل کی واردات کی کچھ نہ کچھ سن گن ضرور لینا چاہتا تھا۔ چائے کی پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"شیرے یار! ہم نے پنڈی میں سنا تھا کہ یہاں اوپر کوہ مری کے پاس دو لاشیں ملی ہیں کہتے ہیں دونوں غنڈہ ٹائپ آدمی تھے۔" شیر خان نے بے نیازی سے سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہاں سے تھوڑی دور یہ واقعہ ہوا تھا۔ پولیس کو دو لاشیں بھی ملی ہیں۔ کسی نے گولی ماری تھی انہیں۔ میرا خیال ہے کوئی پرانی دشمنی کا کیس تھا۔ مٹھائی اور لو ناں یار۔"

اس کا مطلب ہے کہ شیر خان نے اس واردات کو دبا دیا ہے۔ وہ کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا۔ فیروز یہ سوچ کر خاموش ہو رہا۔ شہاب نے شیر خان سے پہاڑ کے موسم کے بارے میں گفتگو شروع کر دی تھی۔ اتنے میں شیر خان کی بیٹی عائشہ آ گئی۔ اس کی گاڑی وہی تھی۔ شہاب اور فیروز نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ گاڑی کے دروازے کا شیشہ بدلوا دیا گیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ اب نیا شیشہ چڑھا ہوا تھا۔ گویا شیر خان نے معاملے کو دبا دیا ہے۔ وہ اس پوزیشن میں ہے وہ بڑی آسانی سے ایسا کر سکتا ہے۔ فیروز نے سوچا۔

رات کا کھانا ان سب نے ڈرائنگ روم میں اکٹھے بیٹھ کر کھایا۔ گیارہ بجے تک وہ تینوں آپس میں لگا اور وہاں گزارے ہوئے پرانے دنوں کی باتیں کرتے رہے پھر شیر خان اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہاب نے فیروز کی طرف دیکھا۔ گہرا سانس بھرا اور بولا۔

"اب بتاؤ۔ کیا سوچا ہے تم نے؟" فیروز نے نیا سگریٹ سلگانے کے بعد بڑے سکون سے جواب دیا۔

"دشمن کی بیٹی کے بیڈ روم کا جائزہ لینا ہو گا۔ واردات وہیں ہو گی۔ جب وہ گہری نیند سو رہی ہو۔ جاگتے میں اسکیم فیل ہو جانے کا خطرہ برابر موجود ہے۔" شہاب نے پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے یہ کام ہمیں ہی کرنا ہو گا؟"

"ہاں۔" فیروز کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔" اب ہم کسی پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ کیا ہم یہ کام نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں؟" شہاب نے آہستہ سے کہا۔" لیکن منصوبہ کیا ہو گا؟"

فیروز اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کے پاس گیا۔ باہر برآمدہ اور سامنے والا باغیچہ بجلی کی روشنی میں خالی پڑا تھا۔ یہ چھوٹا سا سجا سجایا گیسٹ ہاؤس تھا جہاں شیر خان نے اپنے دوستوں کو بڑی عزت و تکریم کے ساتھ ٹھہرایا تھا۔ فیروز نے گرم جیکٹ پہن کر سر پر مفلر لپیٹا اور شہاب سے کہا۔" تم بھی کوٹ پہن لو۔ ہم برآمدے میں چل پھر کر باتیں کریں گے۔ تاکہ یہ خطرہ ہی نہ رہے کہ ہماری باتیں کوئی سن رہا ہے۔" شہاب نے بھی کوٹ پہن کر سر پر اونی ٹوپی اوڑھ لی کیونکہ باہر دھند اور سردی تھی۔ دونوں برآمدے میں آ گئے۔ فیروز نے جب یہ یقین کر لیا کہ وہاں ان کے سوا کوئی نہیں ہے تو کہنے لگا۔

"اب میری اسکیم کو غور سے سنو۔ شیر خان کے گھر کے جو چار چھ نوکر ہیں وہ تقریباً سبھی ادھیڑ عمر اور بوڑھے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد یہ لوگ اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے ہیں۔ دوسری بات جو میں نے نوٹ کی ہے اور جس کی وجہ سے ساری اسکیم میرے دماغ میں آئی ہے یہ ہے کہ شیر خان کی بیٹی عائشہ اپنے کمرے میں اکیلی سوتی ہے اور کھانے کے بعد وہ کافی اپنے بیڈ روم میں منگواتی ہے۔ میں نے موقع نکال کر باتوں ہی باتوں میں نوکرانی سے پوچھ لیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ بی بی سونے سے پہلے کافی ضرور پیتی ہیں۔ رات کو پڑھتی بھی ہیں۔ اب منصوبہ یہ ہے کہ ہمیں عائشہ کو اس کے بیڈ روم میں پہلے بے ہوش کرنا ہو گا۔ اس کے بعد ہم اسے وہاں سے اٹھا کر لے جائیں گے۔"

شہاب بڑے غور سے فیروز کی باتیں سن رہا تھا۔ دونوں برآمدے میں ٹہلتے بھی جاتے تھے اور چاروں طرف سے چوکنے بھی تھے۔ شہاب نے کہا۔

"اوئے یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ تم عائشہ کو بے ہوش کیسے کرو گے؟"

"میں نے سارا پروگرام سوچ لیا ہے۔" فیروز نے دھیمے لہجے میں کہا۔"میں صبح راولپنڈی جارہا ہوں۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو ایک دوائی ہوتی ہے جسے ہمارا چینی باس اپنے دشمنوں کو بے ہوش کرنے کے لئے استعمال کیا کرتا تھا۔ مجھے اس کا نام اور شکل یاد ہے۔ یہ پانی کی طرح ہوتی ہے۔ باس نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ نہ اس کا کوئی ذائقہ ہوتا ہے نہ کوئی بو ہوتی ہے۔ یہ جس شے میں بھی ڈال دی جائے اس شے کا اپنا ذائقہ اور بو بھی نہیں بدلتی۔ اب ساری اسکیم کادارومدار اس دوائی پر ہے اگر مجھے راولپنڈی کی کسی دکان سے یہ دوائی مل گئی تو پھر سمجھو کہ شیر خان ہمارے قبضے میں ہوگا۔"

"اس کا نام کیا ہے؟" شہاب نے پوچھا۔

"تم نام کو چھوڑو۔ مجھے یاد ہے۔ تم یہ بات غور سے سنو کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا اگر میں یہ بے ہوشی کی دوائی لانے میں کامیاب ہوگیا تو تم میرے آنے کے فوراً بعد یہاں اوپر کوہ مری چلے جاؤ گے وہاں سے کوئی ٹیکسی یا کوئی دوسری گاڑی جیسے بھی ہو حاصل کر کے شیر خان کے بنگلے سے تھوڑا آگے کسی جگہ کھڑی کر دو گے۔ یہ خیال رہے کہ گاڑی میں سوائے تمہارے کوئی دوسرا ڈرائیور نہیں ہوگا۔" شہاب نے فیروز کی طرف گردن گھما کر دیکھا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ مجھے ......" اس کی بات کاٹ کر فیروز بولا۔

"ہاں تم ڈرائیور کو راستے میں ہی کہیں گہرے کھڈ میں پھینک دو گے۔ اگر اسے قتل کرنا پڑا تو اس سے بھی دریغ نہ کرنا۔ یہ ہماری زندگی اور ہمارے مستقبل کا سوال ہے۔ میں تمہیں وہ جگہ بتا دوں گا جہاں تم رات کو گاڑی لا کر کھڑی کرو گے۔ میں عائشہ کو لے کر وہیں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔" شہاب نے سگریٹ لان کے گھاس پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے یار سب کچھ ہو جائے گا۔ خون کرنا پڑے گا تو وہ بھی کر دوں گا۔ اس دھوکے باز شیر خان کو اپنے حصے کی دولت سے عیش کرتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"شاباش۔" فیروز نے شہاب کے کندھے کو تھپتھپا کر کہا۔"اب تم آئے ہو سیدھی راہ پر۔"

شہاب نے پوچھا۔"اگر تمہیں بے ہوش کرنے والی دوا نہ ملی تو کیا کریں گے؟"

فیروز بولا۔"پھر کوئی دوسری ترکیب سوچ لیں گے اور کچھ نہیں تو میں کسی دکان سے

کلوروفارم حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ چینی باس والی دوائی میں یہ خوبی ہے کہ اس کے ایک قطرے سے پورے گھر کو بے ہوش کیا جا سکتا ہے اور کسی کو احساس تک نہیں ہوتا کہ چائے یا کافی میں کوئی دوائی بھی اس کے معدے میں جا رہی ہے۔ چلو اندر چلتے ہیں۔ باتیں بھی کرلی ہیں ہم نے اور سردی بھی زیادہ ہوگئی ہے۔"

دونوں کمرے میں آگئے۔ کمرہ گرم تھا۔ انہوں نے کوٹ وغیرہ اتار کر ایک طرف ڈالے اور اپنے اپنے پلنگ پر چڑھ کر کمبل اوپر کر کے لیٹ گئے۔

اگلے دن فیروز ایک ضروری کام کا بہانہ بنا کر ناشتہ کرتے ہی پنڈی روانہ ہوگیا۔ صدر میں آتے ہی اس نے سیدھا کیمسٹ کی دکانوں کا رخ کیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے ایک کیمسٹ شاپ سے اپنی مطلوبہ دوائی مل گئی۔ یہ چھوٹی سی شیشی میں پانی کی شکل کی تھی اور درد چوٹ والی جگہ کو سن کرنے کے لئے استعمال کی جاتی تھی لیکن اس کا ایک قطرہ کسی کو پلا دیا جائے تو کم از کم بارہ گھنٹے سے پہلے اسے ہوش نہیں آسکتا تھا۔ بڑی چالاکی سے فیروز نے یہ بات بھی کیمسٹ سے معلوم کر لی تھی۔ وہ بڑا خوش ہوا تھا کیونکہ عائشہ کو سات آٹھ گھنٹے سے پہلے ہوش بھی نہیں آنا چاہئے تھا۔ دوائی لے کر وہ الٹے قدموں واپس کوہ مری کی طرف چل پڑا۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے پہلے وہ شیر خان کے بنگلے میں تھا۔ یہ خوشخبری اس نے شہاب کو سنائی تو وہ بڑا خوش ہوا لیکن اب اسے وہاں سے پنڈی کے لئے کھسکنا تھا۔ ایک طرح سے ان کا ایکشن پلان شروع ہو چکا تھا۔

تیسرے پہر انہوں نے چائے شیر خان کے ساتھ باغیچے میں ہلکی ہلکی دھوپ میں بیٹھ کر پی۔ یہیں شہاب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ کوہ مری کا ایک چکر لگانا چاہتا ہے۔ شیر خان نے فوراً کہا کہ گاڑی لے جاؤ اور جا کر مری کی سیر کر آؤ۔ گاڑی کی یہ پیشکش اس نے فیروز کو بھی پنڈی جاتے وقت کی تھی مگر اس نے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ مجھے کولبو میں دوستوں کے واسطے کچھ سوغاتیں دیکھنی ہیں۔ جانے کہاں کہاں پھرنا پڑے اور شہاب نے یہ کہہ کر گاڑی نہ لی کہ وہ آزادی سے گھومنا پھرنا چاہتا ہے گاڑی ساتھ ہوئی تو اسے کہاں کہاں سنبھالتا پھرے گا۔

شیر خان نے کہا۔"ڈرائیور تمہارے ساتھ ہوگا۔"

شہاب ہنس کر کہنے لگا۔"یار! میں کسی کو اپنے سر پر سوار نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے ہنسی مذاق میں بات کو ٹال دیا اور پھر ایک گھنٹے بعد یہ کہہ کر کوہ مری کی طرف چل دیا کہ رات کے کھانے پر واپس آجائے گا۔ شیر خان کی بیٹی عائشہ اور ہماری شیرنی اس وقت اپنے کمرے میں ہی تھی اور چائے پینے کے بعد کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اسے باپ نے ہر قسم کی تعلیم دلائی تھی۔ اسے ہر لحاظ سے اس قابل بنایا تھا کہ وہ وقت پڑنے پر اپنی ناموس کی بھرپور طریقے سے دلیری اور بہادری کے ساتھ حفاظت کر سکے مگر عائشہ شیرنی ابھی تجربے کی بھٹی سے نہیں گزری تھی۔ وہ لوگوں کے چہرے ابھی نہیں پڑھ سکتی تھی۔ شہاب اور فیروز کے بارے میں شیر خان نے بیٹی کو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کے پرانے دوست ہیں اور سری لنکا سے اسے ملنے آئے ہیں۔ شیرنی عائشہ نے ان دونوں کو اپنے باپ کا دوست ہی سمجھ رکھا تھا اور ان کی بڑی تعظیم کرتی تھی۔

شہاب کے جانے کے بعد فیروز اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے بے ہوشی کی دوا والی چھوٹی سی نیلی شیشی اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال رکھی تھی۔ وہ ذہن میں ایک بار پھر اپنے منصوبے کا جائزہ لینے لگا۔ دوسری طرف شہاب نے کوہ مری پہنچتے ہی گاڑی یا ٹیکسی کی تلاش شروع کر دی۔ سیزن ختم ہو جانے کی وجہ سے وہاں گاڑیاں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔ کوہ مری کو دونوں نے اس لئے چنا تھا کہ پنڈی میں وہ گاڑی اٹھانے کی ایک واردات کر چکے تھے اور پنڈی دور بھی تھا۔ شہاب نے اوپر کا علاقہ دور تک چھان مارا۔ سب کوٹھیاں بند پڑی تھیں۔ مال پر بھی کوئی کار وغیرہ نہیں آجا رہی تھی۔

وہ پنڈی پوائنٹ کی طرف گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک کلینک کے احاطے میں سفید رنگ کی ویگن کھڑی ہے۔ یہ ایمبولینس ویگن تھی۔ شہاب کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ ایک طرف ہٹ کر سڑک کی ریلنگ پر بیٹھ گیا اور کلینک کی ایمبولینس کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ گاڑی ان کے لئے بڑی فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔ جس وقت وہ شیر خان کی بیٹی کو اغوا کر کے لے جائیں گے تو وہ بے ہوش ہو گی۔ یوں اگر کسی جگہ انہیں چیک بھی کیا گیا تو وہ یہ کہہ کر بڑی آسانی سے نکل سکیں گے کہ ان کی بہن بے ہوش ہو گئی ہے وہ اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ کسی کو شک بھی نہیں پڑے گا۔ ایمبولینس پر انگریزی میں ایمبولینس کے

سرخ الفاظ لکھے تھے اور کراس کا نشان بھی تھا۔ شہاب نے یہ ایمبولینس رات کے بارہ بجے یہاں سے اڑانی تھی اور دس منٹ میں واپس نیچے اترائی پر شیر خان کے بنگلے روبی ہاؤس سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر پہنچ کر فیروز کا انتظار کرنا تھا۔

جب رات کے کھانے پر بھی شہاب کوہ مری سے واپس نہ آیا تو شیر خان نے فیروز سے کہا۔

"اس کو وہاں ایسا کونسا کام تھا؟ اپنی گاڑی لے جاتا کہیں اسے وہاں ٹیکسی وغیرہ حاصل کرنے میں وقت پیش نہ آرہی ہو۔" فیروز نے بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ایک مدت بعد مری گیا ہے۔ کوئی پرانا ساتھی مل گیا ہو گا۔ آجائے گا گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک۔ نہیں تو صبح آجائے گا۔"

فیروز نے جان بوجھ کر اس موضوع کو ٹال دیا اور شیر خان کے ساتھ سری لنکا میں گزارے ہوئے دنوں کی باتیں شروع کر دیں۔ عائشہ نے اپنے بیڈ روم میں ہی کھانا منگوا لیا تھا۔ کھانے کے بعد فیروز اور شیر خان چائے پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ موسم ابر آلود ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انہیں بادلوں میں ہلکی سی گرج سنائی دی پھر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ شیر خان بولا۔

"مجھے شہاب کا خیال آرہا ہے۔ میں ڈرائیور کو گاڑی دے کر مری بھیج نہ دوں۔ وہ اسے تلاش کر ہی لے گا۔" فیروز نے بے پروائی سے ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔

"چھوڑو یار۔ وہ کوئی بچہ نہیں ہے۔ کسی ہوٹل میں ٹک گیا ہو گا۔" پھر شیر خان کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"کوئی ساتھی تلاش کر لیا ہو گا بدمعاش نے۔" اور خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ شیر خان بھی مسکرانے لگا۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ فیروز نے ایک فرضی جمائی لی اور بولا۔

"یار مجھے تو نیند آرہی ہے۔" شیر خان بھی یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ میں بھی سونے کے لئے چلتا ہوں۔"

شیر خان اپنے بیڈ روم کی طرف چل دیا اور فیروز برآمدے میں سے گزرتے ہوئے

گیسٹ ہاؤس میں آگیا۔ یہاں آتے ہی اس نے کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے اپنے بریف کیس کو کھول کر پستول نکالا۔ رومال سے اسے صاف کیا۔ اس میں گولیاں بھریں پھر بے ہوشی کی دوا والی شیشی کو روشنی کے سامنے کر کے غور سے دیکھا۔ اسے اپنی جیکٹ کے اندر والی جیب میں ڈالا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دراز میں سے نائیلون کی رسی کا چھوٹا سا گچھا نکال کر جیب میں رکھا۔ اس رسی سے وقت آنے پر اس نے عائشہ کے ہاتھ پاؤں باندھنے تھے۔ باہر بارش کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ بریف کیس اس نے الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ اب وہ ساڑھے دس بجنے کا بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔ یہ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ شیر خان کی بیٹی کا یہ معمول ہے کہ وہ رات کو ساڑھے دس بجے کے بعد چائے منگواتی ہے پھر بارہ بجے تک پڑھتی ہے اور پھر سو جاتی ہے۔ جب ساڑھے دس بجنے میں تین منٹ باقی رہ گئے تو فیروز نے جیکٹ کے کالر اونچے کیے اور دروازے میں سے نکل کر برآمدے میں سے گزرتا پیچھے بنگلے کے کچن کی طرف آگیا۔ کچن میں روشنی ہو رہی تھی۔

خادمہ کی بجائے بوڑھا خانساماں برتن وغیرہ سمیٹ رہا تھا۔ گویا آج خادمہ کی بجائے خانساماں کو چائے لے کر عائشہ کے بیڈ روم میں جانا تھا۔ فیروز کو یہ خدشہ بھی ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خادمہ عائشہ کی چائے لے کر جا چکی ہو۔ خانساماں نے مالک کے دوست اور مہمان کو کچن میں آتے دیکھا تو سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ فیروز نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

”بابا تم اپنا کام کرتے رہو۔ سردی بڑی ہے میں نے سوچا کہ کچن میں چل کر ہی چائے کی ایک پیالی پی لی جائے۔“

بجلی کے چولہے پر پہلے سے پانی کی چمکتی ہوئی کیتلی رکھی ہوئی تھی خانساماں نے بڑی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”سر! ابھی چائے حاضر کرتا ہوں۔ آپ اپنے کمرے میں تشریف لے چلیں۔ میں وہیں چائے لے آتا ہوں۔“

فیروز گدے دار اسٹول پر بیٹھ گیا۔ بولا۔

”ارے نہیں بھائی۔ تم سردی میں چائے کی پیالی لے کر کہاں جاؤ گے۔ میں خود جو

تمہارے پاس آگیا ہوں۔ ایک پیالی بنا دو۔“ اس دوران فیروز نے دیکھ لیا تھا کہ اسٹین لیس اسٹیل کی ٹرے میں چائے کا سامان لگا ہوا ہے۔ سوات کی ٹی کوزی الگ پڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ عائشہ کو ابھی چائے نہیں گئی پھر بھی فیروز نے اپنی تسلی کے واسطے پوچھ ہی لیا۔

”بابا! یہ چائے کا سامان کس کے لئے لگایا ہوا ہے؟ کیا ہمارا یار شیر خان رات کو بھی چائے پیتا ہے؟“ خانساماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں جناب یہ ہماری بیٹی عائشہ بی بی کے لیے ہے۔ وہ رات ایک بار لائیٹ چائے کا ایک کپ ضرور پیتی ہے مگر میں آپ کو پہلے کپ بنائے دیتا ہوں۔“ فیروز جلدی سے بولا۔

”ارے نہیں نہیں بابا۔ بیٹی کو پہلے چائے دے آؤ۔ میں بعد میں پی لوں گا۔“ فیروز نے سارا منصوبہ پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ وہ اپنی جیکٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا پھر افسوس کے انداز میں بولا۔

”بابا ایک کام تمہیں کرنا پڑے گا۔“

”حکم کریں جناب۔“ خانساماں نے بڑے ادب سے کہا۔

”اصل میں میں چینی کی جگہ چائے میں سکرین استعمال کرتا ہوں میرا خیال ہے میری سکرین کی شیشی کمرے کی میز پر ہی رہ گئی ہے۔ بس اتنی تکلیف دوں گا کہ میز پر سے شیشی اٹھا لاؤ۔ سبز رنگ کی چھوٹی سی شیشی ہے۔“

”ابھی لایا جناب۔“ یہ کہہ کر خانساماں نے چائے کے لیے رکھے ہوئے پانی کی کیتلی چولہے سے اتار دی اور کچن کا دروازہ کھول کر گیسٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی فیروز اسٹول پر سے اٹھا۔ کھڑکی میں سے خانساماں کو برآمدے میں نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا پھر جیب سے بے ہوشی کی دوائی والی شیشی نکال کر چائے کے برتنوں والے ٹرے کی طرف بڑھا۔ ٹی پاٹ کا ڈھکنا اٹھایا۔ اس میں شیشی میں سے دوائی کے چھ سات سفید قطرے گرائے۔ ٹی پاٹ کا ڈھکنا بند کیا اور بڑے سکون سے اسٹول پر واپس جا بیٹھا۔ بارش کی آواز میں اسے خانساماں کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ اندر آکر بولا۔

”جناب! وہاں تو مجھے کوئی شیشی نہیں ملی۔“ فیروز نے کہا۔

”میرا خیال ہے میں نے کہیں ادھر ادھر رکھ دی ہو گی۔ کوئی بات نہیں۔ تم ایسا کرنا۔

میرے کپ میں چینی مت ڈالنا۔" اتنی دیر میں چولہے پر رکھی ہوئی کیتلی کا پانی کھولنے لگا خانساماں نے کیتلی میں سے کھولتا ہوا پانی اس چینک میں انڈیل کر اوپر ٹیکوزی ڈال دی جس میں فیروز نے تھوڑی دیر پہلے بے ہوشی کی دوائی ڈالی تھی۔ اس کے بعد خانساماں نے فیروز کو چائے کا کپ بنا کر دیا اور ٹرے اٹھاتے ہوئے بولا۔

"میں بی بی جی کو چائے دے آؤں۔ ان کا چائے کا وقت ہو گیا ہے۔"

ساڑھے دس بج چکے تھے۔ فیروز اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کہنے لگا۔

"میں بھی اپنے کمرے میں چل کر چائے پی لیتا ہوں۔ آج سردی زیادہ ہے۔"

خانساماں ٹرے لے کر شیر خان کی بیٹی عائشہ کے بیڈ روم کی طرف چل دیا۔ فیروز اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ عائشہ کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا تو فیروز اپنے کمرے کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر بنگلے کے گیٹ کی طرف دیکھا اور کان لگا دیے۔ فضا میں بارش کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔

فیروز اس طرف سے اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ شہاب گاڑی لے کر اپنی جگہ پر آ گیا ہو گا وہ وہاں سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اور ابھی شہاب کے آنے میں طے شدہ وقت باقی تھا۔ فیروز نے اپنا بریف کیس کھول کر اپنی چیزوں کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ اسے بند کر کے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ بھرا ہوا پستول اس کی جیکٹ کی جیب میں ہی تھا۔ اس نے جلدی سے چائے کے دو تین گھونٹ بھرے اور کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اس نے کھڑکی کے شیشے پر سے تھوڑا سا پردہ ہٹا دیا تھا جہاں سے اسے باغیچے کی روشنی میں بنگلے کے گیٹ کی طرف جاتا راستہ بارش میں دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے کان سڑک پر شہاب کی گاڑی کی آواز سننا چاہتے تھے مگر ابھی تک کسی بھی گاڑی کی آواز نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ فرض کر لیا اگر آج عائشہ کا چائے پینے کو دل نہ چاہا تو اس کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ جب رات کے سوا گیارہ کا وقت ہوا تو فیروز اپنے کمرے کے عقبی دروازے سے باہر چھوٹے باغیچے میں نکل آیا۔ بارش اب کافی ہلکی ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہیں بے اختیار شیر خان کی بیٹی عائشہ کے

بیڈ روم کی طرف اٹھ گئیں۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اگر عائشہ نے چائے کا ایک کپ پی لیا ہے تو وہ ضرور بے ہوش ہو چکی ہو گی۔ فیروز گیلی جھاڑیوں کے پیچھے سے ہو کر عائشہ کے بیڈ روم کی کھڑکیوں کی طرف بڑھا۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔ کہیں سے اندر نظر نہیں پڑتی تھی۔ فیروز نے بند کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ گہرا سناٹا طاری تھا۔ فیروز کا دل وسوسوں میں پڑ گیا۔ وہ عائشہ کو ایک نظر دیکھنے کو بے تاب تھا کیونکہ اس کی بے ہوشی پر ہی ان کے سارے مشن کی کامیابی کا انحصار تھا۔ فیروز دبے پاؤں بیڈ روم کے دروازے کی طرف آ گیا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا یہاں بھی کسی طرف سے اندر نظر نہیں پڑتی تھی۔ فیروز نے گردن ایک طرف اٹھا کر کچن کی طرف دیکھا۔ کچن کی بتی گل ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ خانساماں بھی کچن بند کر کے اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا اتنے میں اسے نیچے سڑک پر کسی گاڑی کے گزرنے اور پھر ذرا آگے جا کر اس کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ یقیناً شہاب گاڑی لے کر پہنچ گیا تھا۔

ایکشن شروع کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ فیروز نے جیب سے لوہے کی ایک چھوٹی سی پن نکالی۔ اسے دروازے کے لاک کے سوراخ میں ڈالا اور بڑی احتیاط سے اسے دائیں سے بائیں گھمانے لگا۔ تیسری کوشش میں لاک کھل گیا۔ فیروز نے آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر عائشہ بے ہوش نہ ہوئی ہو گی تو وہ بڑی شفقت سے مسکرا کر اس سے کہے گا۔

"بیٹی میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہارے کمرے کا لاک اسی طریقے سے کھل سکتا ہے کہ نہیں اب میں تمہیں ہدایت کروں گا کہ اندر سے چٹخنی بھی لگا لیا کرو۔" یہ بھی فیروز کی خوش قسمتی تھی کہ عائشہ نے اندر سے چٹخنی نہیں لگائی تھی۔ وہ چٹخنی نہیں لگا کر سوتی تھی۔ دھکا دینے سے بیڈ روم کا دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں ٹیبل لیمپ کی روشنی پھیلی تھی اور فضا میں کسی قیمتی پرفیوم کی خوشبو چھائی ہوئی تھی۔ فیروز نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کی نظریں پلنگ کی طرف گئیں۔ چائے کی کیتلی میں ڈالی ہوئی دوائی نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ عائشہ ریشمی تکیوں کے ساتھ ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ سینے تک

کمبل پڑا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ کتاب ہاتھ سے لڑھک کر نیچے گری ہوئی تھی۔

فیروز نے قریب جا کر عائشہ کی نبض دیکھی۔ نبض آہستہ چل رہی تھی۔ تپائی پر چائے کی پیالی میں ابھی تھوڑی سی چائے باقی تھی۔ فیروز نے ٹیبل لیمپ کو جلتے رہنے دیا۔ تیزی سے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں گیا۔ وہاں سے بریف کیس اٹھا کر واپس عائشہ کے بیڈ روم میں آیا۔ بریف کیس میں سے نائیلون کی باریک رسی نکال کر عائشہ کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے۔ کیونکہ ہوش کی حالت میں وہ اس شیرنی کا کمانڈو ایکشن دیکھ چکا تھا۔ یہ لڑکی آسانی سے قابو میں آنے والی چیز نہیں تھی۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی فیروز کمرے سے نکل کر برآمدے میں سے گزرتا باغیچے کی جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ ہوتا بنگلے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ رات کو گیٹ پر تالا ڈال دیا جاتا تھا اور کوئی پہرے دار وہاں نہیں ہوتا تھا۔ بارش پھوار کی شکل میں ہو رہی تھی۔ فیروز نے گیٹ پر جلتے بلب کی روشنی میں ایک انسانی سائے کو بائیں جانب کے درختوں سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ یہ شہاب تھا۔ گیٹ کے بنگلے کی ایک جانب لگ کر وہ جلدی جلدی باتیں کرنے لگے۔ پھر فیروز نے لوہے کی سلاخ کی مدد سے گیٹ کا تالا بھی کھول دیا۔ شہاب اندر آگیا وہ سڑک سے ہٹ کر اونچی جھاڑیوں کے پیچھے سے ہوتے ہوئے عائشہ کے کمرے میں آگئے۔ اب وہ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ شہاب نے صرف اتنا کیا کہ بے ہوش عائشہ کے منہ پر اس کے ریشمی دوپٹے کی پٹی باندھ دی اس خیال سے کہ اگر اسے ہوش آجائے تو وہ شور نہ مچا سکے۔ انہوں نے عائشہ کو کمبل میں لپیٹ کر اٹھایا اور بجائے سامنے کی طرف سے باہر نکلنے کے وہ بیڈ روم کے عقبی دروازے سے گزر کر عقبی باغیچے کے نیم اندھیرے میں سے ہوتے ہوئے نیچے اترائی اترنے لگے۔

بنگلے سے تھوڑا آگے سڑک کے کنارے شہاب نے مری والی ایمبولینس کھڑی کر رکھی تھی۔ انہوں نے عائشہ کو ایمبولینس گاڑی کے اندر سیٹ پر لٹا دیا۔ دروازہ بند کر کے وہ اگلی سیٹوں پر آکر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر بعد کوہ مری کے ایک کلینک سے اٹھائی ہوئی یہ ایمبولینس گاڑی ڈھلان پر بڑی تیزی سے رات کے اندھیرے میں راولپنڈی کی طرف

دوڑی چلی جا رہی تھی۔ جب گاڑی مری کے بلند پہاڑی سلسلے سے نکل کر چھتر پہنچی تو سڑک پر رکاوٹ لگی تھی۔ فیروز نے کہا۔

”دو سپاہی کھڑے ہیں۔ گھبرانا بالکل نہیں میں اپنی بیٹی کو اسپتال لے کر جا رہا ہوں۔“

گاڑی سڑک پر لگی رکاوٹ کے پاس آکر رک گئی۔ دونوں سپاہی گاڑی کی طرف آئے۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“ ایک سپاہی نے گاڑی کی کھڑکی کے پاس آکر شہاب سے پوچھا۔ شہاب نے وہی جواب دیا جو اسے کہنا چاہئے تھا۔ سپاہی کے کاندھے پر رائفل لگی تھی اس نے شہاب کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”پیچھے آکر دروازہ کھولو۔“

فیروز نے دونوں سپاہیوں کو باتوں میں لگا لیا۔

وہ شہاب کو موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ گاڑی کے اندر جا کر بے ہوش عائشہ کے منہ پر بندھی ہوئی پٹی کھول ڈالے۔ شہاب نے ایسا ہی کیا وہ لپک کر گاڑی کے پیچھے آیا۔ دروازہ کھولا اور اندر جاتے ہی عائشہ کے منہ سے پٹی کھول دی۔ پھر باہر آ کر اپنی طرف آتے سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر آواز کو غمناک بنا کر بولا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری بہن کو کیا ہو گیا ہے۔ بس پیٹ میں درد اٹھا اور بے ہوش ہو گئی۔ مری والے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اسے جتنی جلدی ہو سکے پنڈی اسپتال لے جاؤ۔ انہوں نے اپنی ایمبولینس گاڑی بھی ہمیں دے دی۔"

سپاہی نے گردن اندر ڈال کر دیکھا۔ ایک لڑکی سیٹ پر کمبل میں لپٹی بے ہوش پڑی تھی۔ سپاہی جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور جانے کا اشارہ کیا۔ فیروز بھی افسردہ سی شکل بنا کر وہیں کھڑا تھا۔ سپاہی کا اشارہ پاتے ہی انہوں نے گاڑی کا عقبی دروازہ بند کیا اگلی سیٹوں پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے نکل گئے۔

وہ پنڈی پہنچ کر بالکل نہ رکے بلکہ پچھلی رات کی سنسان سڑکوں پر آگے ہی آگے نکلتے چلے گئے۔ راستے میں ایک جگہ سے انہوں نے گاڑی میں پٹرول ڈلوایا اور دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ رات کے پچھلے پہر فیروز نے گاڑی سڑک سے نکال کر ایک سنگلاخ علاقے میں ڈال دی۔ اس علاقے سے گزرے تو بائیں جانب کھیت آ گئے۔ یہاں موسم خوشگوار تھا۔ آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے۔ موسم میں تھوڑا حبس تھا۔ گاڑی آگے نکلتی چلی گئی۔ یہ علاقہ بالکل غیر آباد تھا۔ زمین بنجر اور شور زدہ تھی۔

"ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں نا؟" فیروز نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں سامنے کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک جا رہے ہیں۔ بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔" نشیب میں ایک نیم پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا جس کے کنارے زمین کے ساتھ ہی ملے ہوئے تھے۔ پانی ٹخنوں تک ہو گا۔ گاڑی نالے میں سے نکل گئی۔ سامنے ذرا داہنی جانب ایک ٹیلا تھا فیروز گاڑی کو ٹیلے کے پیچھے لے آیا۔ یہاں ایک قد آدم چار دیواری تھی جس کا لکڑی کا بوسیدہ گیٹ بند تھا۔ فیروز نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی۔ دونوں گاڑی سے اتر آئے۔ اندر سے ایک شخص نے گاڑی کو آتا دیکھ لیا تھا۔ اس شخص نے سر پر رومال لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ فیروز نے آگے بڑھ کر کہا۔

"شامدو اندر ہی ہے نا؟" وہ شخص بولا۔ "تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" وہ گاڑی احاطے کے اندر لے گئے۔ یہاں گارے اور پتھروں سے بنا ہوا ایک پرانا دو منزلہ مکان تھا جس کے باہر دروازے پر لالٹین جل رہی تھی۔ شامدو گاڑی کی آواز سن کر باہر نکل آیا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا مضبوط جسم والا آدمی تھا۔ فیروز آگے بڑھ کر اس سے بغلگیر ہوا۔ شہاب کو متعارف کرایا۔ شامدو بولا۔

"سب ٹھیک ہے نا؟"

فیروز نے گردن اثبات میں ہلائی۔ "سب ٹھیک ہے لالا۔ ادھر آؤ ذرا۔" ایمبولینس میں سے انہوں نے مل کر بے ہوش عائشہ کو نکالا اور مکان کے اندر لے جا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ شامدو کہنے لگا۔ "اب اس کے ہاتھ کھول دو' ہوش میں آ بھی گئی تو یہاں سے زندگی بھر باہر نہ نکل سکے گی۔" فیروز نے عائشہ کے ہاتھ کھول دیے۔ شہاب نے کچھ سوچ کر کہا۔

"یہ بڑی شیرنی قسم کی عورت ہے۔ اس کا کچھ پتا نہیں کیا کر بیٹھے؟" فیروز نے کہا۔

"مگر اسے ابھی ہوش کہاں آئے گا۔ دوائی کا اثر کم از کم چوبیس گھنٹے تک رہے گا۔" شامدو کہنے لگا۔

"ہوش میں آ کر یہ کیا کرے گی۔ ایسی کہاں کی شیرنی ہے یہ۔ ایسی کئی عورتوں کو تو میں ہاتھوں ہاتھ کہاں سے کہاں پہنچا چکا ہوں۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ دروازے پر تالا لگ جائے گا

اور باہر میرا باڈی گارڈ پہرہ دے گا۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ صبح بات کریں گے۔" شامدو نے کوٹھری کا دروازہ بند کر کے باہر تالا ڈال دیا۔ وہی آدمی جس نے احاطے کا گیٹ کھولا تھا بندوق لیے باہر پہرے پر بیٹھ گیا۔ فیروز اور شہاب اپنے دوست شامدو کے ساتھ دوسرے کمرے میں سونے چلے گئے۔ اس وقت مشرقی افق پر صبح کا ہلکا ہلکا نور پھیلنے لگا تھا۔

کوہ مری کے راستے میں روبی ہاؤس میں بھی صبح ہو رہی تھی۔ شیر خان اپنے بیڈ روم میں سو رہا تھا۔ نوکروں کے کوارٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ خانساماں جاگ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عائشہ بی بی صبح صبح اٹھ کر چائے پیتی ہے اور اس کے بعد وضو کر کے نماز پڑھتی ہے۔ خانساماں کچن کی طرف آیا تو اس کی نگاہ عائشہ بی بی کے بیڈ روم کی طرف گئی۔ کھڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ عائشہ بی بی جاگ چکی ہے۔ وہ جلدی سے کچن میں آیا بتی جلا کر آگ روشن کی اور چائے کے لئے گرم پانی رکھ دیا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ صبح جب عائشہ کے واسطے بیڈ ٹی لے کر جاتا تو رات کے چائے کے برتن واپس لے آتا تھا۔ رات بھر کی بارش کے بعد آسمان صاف ہو گیا تھا اور سردی بڑھ گئی تھی۔

خانساماں نے چھوٹی چینک میں چائے دم کر کے ٹرے میں رکھی اور عائشہ کے بیڈ روم کی طرف چلا۔ روز کی طرح خانساماں نے دروازے پر دو بار آہستہ سے دستک دی۔ جب وہ دستک دیتا تھا تو اندر سے عائشہ کی آواز آتی تھی کہ آجاؤ بابا۔ خانساماں نے چار پانچ مرتبہ دستک دی مگر اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ اس وقت تک دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ خانساماں نے غور سے دیکھا۔ دروازہ پوری طرح سے بند نہیں تھا۔ بلکہ دونوں کواڑوں کے درمیان تھوڑی سی درز تھی۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے عائشہ بی بی صبح کی تازہ ہوا میں تھوڑی دیر کو ٹہلنے کے لئے باہر آگئی ہو اور واپس جاتے وقت دروازہ پوری طرح سے بند نہ کیا ہو۔ اس نے دوبارہ دستک دی اور اس بار عائشہ بیٹی کہہ کر آواز بھی دی۔ اس کے باوجود جب اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو خانساماں کو خیال آیا کہ عائشہ بی بی ضرور قرآن پاک پڑھ رہی ہو گی۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔

کمرے میں ٹیبل لیمپ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ عائشہ کا بستر خالی تھا۔ قالین پر بیڈ کے قریب اس کی کتاب گری ہوئی تھی۔ خانساماں کو تب بھی کوئی شک نہ ہوا۔ اس نے چائے تپائی پر رکھی۔ خالی برتن والا ٹرے اٹھایا اور یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا کہ عائشہ بی بی ضرور بنگلے کے عقبی باغیچے میں سیر کر رہی ہو گی۔ مگر اتنی سردی میں وہ کیسے سیر کر سکتی ہے؟ یہی سوچتا وہ کچن میں آیا۔ خالی برتن وہاں رکھے اور عقبی باغیچے میں آکر عائشہ کو ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ اس نے بنگلے کا کونا کونا چھان مارا۔ عائشہ کہیں بھی نہ تھی۔ اب وہ کچھ فکر مند ہوا۔ وہ سیدھا شیر خان کے بیڈ روم کی طرف گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ شیر خان جاگا ہوا تھا اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے خانساماں کو دیکھ کر بولا۔

"کیا بات ہے بابا۔" خانساماں نے کہا۔

"خان جی! عائشہ بیٹی کہیں نظر نہیں آرہی بستر خالی ہے۔" پورا گھر دیکھ ڈالا مگر کچھ پتا نہیں۔" شیر خان بولا۔

"اوپر درختوں میں سیر کرنے نہ چلی گئی ہو۔ ابھی آجائے گی۔" خانساماں نے کہا۔

"بی بی اوپر سیر کرنے کبھی نہیں جاتی۔" شیر خان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اس نے کہا۔

"بھئی بچی کا موڈ آگیا ہو گا وہ اوپر درختوں میں سیر کو چلی گئی ہو گی۔ تم میرے دوستوں کو جا کر چائے دو۔ میں ابھی آرام کروں گا۔" خانساماں چلا گیا۔ شیر خان واپس بستر پر آکر لحاف میں گھس گیا اور ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنی بیٹی عائشہ کے اغوا ہو جانے کا تو تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ چار پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "کون ہے بھئی؟" اس کے سوال کے جواب میں خانساماں کی آواز آئی۔

"خان جی! مہمان تو چلے گئے ہیں۔" شیر خان ایک لمحے کے لئے ساکت سا ہو گیا۔ جلدی سے لحاف سے نکلا اور باہر آکر خانساماں سے کہا۔

"صبح صبح یہ لوگ کہاں چلے گئے اتنی سردی میں؟" خانساماں یہ کہتا ہوا ساتھ چلنے لگا۔

"پتا نہیں خان جی! ان کا بریف کیس وغیرہ بھی وہاں نہیں ہے۔" شیر خان گیسٹ ہاؤس میں شہاب اور فیروز والے کمرے میں گیا تو وہ خالی پڑا تھا۔ الماری کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر

ان دونوں کے کپڑے بھی نہیں تھے۔ بریف کیس بھی موجود نہیں تھا۔ شیر خان تیزی سے باہر نکل آیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی بیٹی کے بیڈ روم میں آگیا۔ اس نے غور سے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھا۔ اس کا پرانا جرائم پیشہ دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ عائشہ کی کتاب قالین پر پڑی تھی۔ اس کا کمبل اس طرح آدھا بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا جیسے کسی کو بیڈ سے کھینچا گیا ہو۔

اسی اثنا میں شیر خان کے دیرینہ ملازم بھی اٹھ گئے تھے۔ سب نے جہاں جہاں متوقع ہو سکتا تھا اندر باہر دیکھا۔ عائشہ کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ عائشہ کے سلیپر بیڈ کے پاس ہی پڑے تھے۔ شیر خان نے بیٹی کی جوتیاں چیک کیں۔ اس کی ساری جوتیاں الماری میں پڑی تھیں۔ وہ ننگے پاؤں باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ شہاب اور فیروز بھی غائب تھے۔ شیر خان کا ذہن ایک نتیجے پر پہنچ گیا تھا مگر اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ شہاب اور فیروز جن کے ساتھ اس نے اتنا اچھا سلوک کیا تھا اور عائشہ کو بیٹی بیٹی کہتے جن کی زبان نہیں تھکتی تھی وہ عائشہ کو اغوا کر کے فرار ہو گئے ہیں۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا جسم پھٹ جائے گا۔ مگر شیر خان نے بڑے تحمل سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالا۔ سب نوکروں کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہنے لگا۔

"میں تمہیں اپنے گھر کے آدمی کی طرح سے سمجھتا ہوں۔ میں تم لوگوں سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ میں تمہیں واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری بیٹی اغوا ہو گئی ہے اور اسے ان لوگوں نے اغوا کیا ہے جو کسی زمانے مین میرے ساتھی رہ چکے تھے۔ اور اب مجھ سے اپنا حصہ مانگنے آئے تھے جو ایک ناجائز مطالبہ تھا۔ کیونکہ تم لوگ بھی اور اس علاقے کے سارے لوگ گواہ ہیں کہ میں نے یہ دولت اپنی محنت اور عزت سے کمائی ہے۔ میں نے شہر کے ایک صراف کے ہاں نوکری کر کے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا اور محنت اور دیانتداری سے کام کر کے آج یہاں تک پہنچا۔ چنانچہ میں نے اپنے پرانے ساتھیوں سے کہا کہ میری طرف ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ لوگ مطمئن بھی ہو گئے۔ لیکن یہ سب کچھ انہوں نے ظاہر داری سے کیا۔ اندر ہی اندر وہ مجھ سے بدلہ لینے کا پروگرام بناتے رہے اور جہاں تک میرا خیال ہے وہی لوگ مجھ سے بدلہ لینے کے واسطے میری بیٹی کو اغوا کر کے کہیں لے گئے

ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی پر اعتماد ہے۔ میں نے اسے جو تربیت دی ہے وہ ضائع نہیں جائے گی۔ میری بیٹی ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اپنی عزت کی حفاظت کرے گی اور اگر وہ کسی مقام پر بے بس ہو گئی تو بڑی آسانی سے موت کو گلے لگا لے گی مگر اپنی عزت پر داغ نہیں لگنے دے گی۔ لیکن میں اس کا باپ ہوں۔ میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ میں اپنی بچی کی عزت اور اس کی جان بچانے کے لئے وقت پڑنے پر اپنی جان بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔ میں کیا کرنے والا ہوں؟ اس بارے، میں تم لوگوں کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ مگر تم سے صرف ایک وعدہ لوں گا کہ میری بچی کے اغوا کی خبر اس گھر کی چاردیواری سے باہر نہیں جائے گی۔ کیا تم مجھ سے یہ وعدہ کرتے ہو؟"

شیر خان کے جو چار چھ ملازم تھے وہ اس کے انتہائی وفادار تھے۔ سب نے ایک زبان ہو کر خدا کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کیا کہ وہ بیٹی عائشہ کے اغوا کے بارے میں اپنی زبان پر ایک لفظ بھی نہیں آنے دیں گے۔ شیر خان بولا۔

"بس میں تم سے یہی چاہتا ہوں۔ میں پولیس کو بھی اطلاع نہیں کروں گا۔ ہم یہی کہیں گے کہ عائشہ اپنی خالہ سے ملنے بحرین گئی ہوئی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ باقی میں جانوں اور میرا خدا۔ تم لوگ اس سے زیادہ ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالو گے۔ بس اب تم جاؤ اور جس طرح روز کام کرتے ہو اسی طرح کام کرو۔ جیسے کچھ نہیں ہوا۔"

نوکروں نے ایک بار پھر شیر خان کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اپنے اپنے معمول کے کام میں لگ گئے۔ خانساماں کی بوڑھی بیوی نے عائشہ کا کمرہ ٹھیک کر دیا۔ شیر خان نے وہاں تالا لگا کر چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ اپنی بیٹی کے اغوا پر ایک ایسا آتش فشاں بن گیا تھا جس کے اندر کھولتا ہوا لاوا دھماکے سے پھٹنے ہی والا ہو۔ ایسی صورت حال میں اگر کوئی چیز اس کی مضطرب روح کو کسی حد تک تسکین بخش رہی تھی تو وہ یہ یقین تھا کہ عائشہ اپنی عزت اپنے ناموس کی خاطر مر جائے گی۔ اور مرنے سے پہلے دو چار آدمیوں کو ضرور ہلاک کر دے گی۔ شیر خان نے اسے ایسی ہی تربیت دی تھی اور اسے اپنی تربیت پر اور شیرنی کی بیٹی اپنی بچی عائشہ

پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ نہ پولیس میں رپورٹ کرنا چاہتا تھا اور نہ کسی کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی اغوا ہو گئی ہے وہ عائشہ کی تلاش میں خود نکلنا چاہتا تھا۔

جب دن کی روشنی خوب پھیل گئی تو شیر خان خود بنگلے کے گیٹ پر آیا۔ یہاں پتھریلے راستے پر باریک بجری بچھی ہوئی تھی جس پر قدموں کے نشان نہیں پڑتے تھے۔ وہ نیچے سڑک پر آگیا۔ سڑک پکی تھی مگر رات بھر کی بارش نے اسے دھو کر صاف کر دیا تھا۔ وہ ذرا آگے گیا تو اسے ایک طرف کیچڑ میں گاڑی کے ٹائروں کے نشان دکھائی دیے یہ نشان سڑک کے کنارے سے نکل کر سڑک پر راولپنڈی کی طرف دور تک چلے گئے تھے۔ جس وقت شہاب اور فیروز عائشہ کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے اس وقت بارش رکی ہوئی تھی اور بعد میں بھی بارش نہیں ہوئی تھی۔ شیر خان ایک طرف کھڑا ہو کر سوچنے لگا۔

شہاب اور فیروز اس کی بیٹی کو گاڑی میں ڈال کر پنڈی کی طرف گئے ہیں۔ شہاب گاڑی لانے کے واسطے ہی کوہ مری گیا تھا۔ مگر شیر خان حیران تھا کہ عائشہ اتنی آسانی سے کیسے اغوا ہو گئی اس نے آواز تک نہ نکالی۔ وہ تو پستول اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر سوتی تھی۔ اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ شہاب وغیرہ نے عائشہ کو اٹھانے سے پہلے کسی طریقے سے بے ہوش کیا ہو گا۔ شہاب اور فیروز کے اس علاقے میں زیادہ جاننے والے بھی نہیں ہیں۔ پھر وہ عائشہ کو کہاں لے کر گئے ہوں گے؟ شیر خان اسی قسم کے خیالات میں الجھا واپس بنگلے میں آگیا۔ اس نے راولپنڈی جانے کی تیاری شروع کر دی۔

دوسری طرف شہاب اور فیروز اپنے میزبان شامدو کی دور افتادہ پناہ گاہ میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ عائشہ اندر کوٹھری میں بے ہوش پڑی تھی۔ شامدو کہنے لگا

”تمہیں نزدیکی شہر میں جا کر لڑکی کے باپ کو ٹیلی فون کر دینا چاہئے۔“ شہاب نے فیروز کی طرف دیکھا۔

”کیا خیال ہے پھوجے؟ شامدو بھائی کا مشورہ بڑا مناسب ہے۔ شیر خان کے گھر فون لگا ہوا ہے اور میری کاپی میں اس کے گھر کا فون نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔“ فیروز نے ایک پل کے لئے کچھ سوچا پھر بولا۔

”مناسب خیال ہے۔ میں ابھی شہر جا کر فون کرتا ہوں۔ شیر خان نے پولیس کو اطلاع

نہیں دی ہو گی۔ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اس طرح سے اس کی بڑی بدنامی ہو گی۔“ شہاب بولا۔

”یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔ تم جلدی سے تیار ہو کر شہر کی طرف نکل جاؤ۔“

”مگر لڑکی کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔“ فیروز نے کسی قدر تشویش کے ساتھ کہا۔

”کہیں میں نے دوائی کی زیادہ مقدار تو نہیں پلا دی؟“ شہاب کہنے لگا۔

”اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ لڑکی مر بھی گئی تو ہم شیر خان کو تھوڑی بتائیں گے ہم اس سے اپنے حصے کی پوری رقم کا مطالبہ کریں گے رقم مل گئی تو لڑکی زندہ یا مردہ اس کے حوالے کر کے یہاں سے نکل جائیں گے۔“ شامدو نے فیروز کو پوری طرح سے سمجھا دیا کہ اسے شہر کے پبلک ٹیلی فون سے فون کرنا ہو گا اور یہ ٹیلی فون اسے پوسٹ آفس میں ہی ملے گا۔ تھوڑی دیر بعد فیروز نے گاڑی نکالی اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ادھر شیر خان بھی پنڈی جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا اس نے اپنا لائسنس والا پستول کمر کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ وہ سب سے پہلے پنڈی کے ایک ایسے آدمی سے ملنا چاہتا تھا جو کسی زمانے میں جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ رہ چکا تھا مگر اب وہ شریفانہ زندگی گزار رہا تھا۔ وہاں سے شیر خان کو شہاب اور فیروز کا کوئی سراغ مل سکتا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں آیا۔ یہاں اس کی بیوی روبی کی تصویر لگی تھی۔ اس نے تصویر کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور کہا

”میں قسم کھاتا ہوں کہ عائشہ کو ہر قیمت پر واپس لاؤں گا اور جنہوں نے اسے اغوا کیا ہے ان کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کروں گا۔ بس میں اس سے زیادہ تمہیں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“ یہ کہہ کر وہ واپس دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شیر خان ٹھٹک سا گیا۔ ہو سکتا ہے پنڈی والے آفس سے کسی نے فون کیا ہو۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے فیروز کی آواز آئی۔

”شیر خان! تم نے میری آواز پہچان لی ہو گی۔ تمہاری بیٹی ہمارے پاس ہے۔ آگے بولنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میری بات غور سے سنو ہمیں تمہاری بیٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ جس طرح تمہارے گھر میں تھی اسی طرح ہمارے پاس بطور یرغمال محفوظ ہے۔ ہمیں ہمارے حصے کی رقم ادا کر دو۔ تمہاری بیٹی تمہیں واپس کر دی جائے گی۔“ شیر خان کے کان سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پانے

itsurdu.blogspot.com

کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم کتنی رقم مانگتے ہو؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"صرف ایک کروڑ امریکی ڈالر۔" فیروز نے کہا۔

"یہ رقم تمہیں کس طرح پہنچائی جائے؟" شیر خان نے کہا۔

"ساری تفصیل تمہیں شام کو بتا دی جائے گی۔ یاد رکھو۔ اگر تم نے پولیس کو اطلاع کی تو تمہیں اپنی بیٹی کی لاش کے ٹکڑے گھر واپس لے جانے ہوں گے۔" فیروز بولا۔

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم مجھے بتاؤ عائشہ کو لے کر کہاں آؤ گے۔ میں رقم لے کر آجاؤں گا۔" شیر خان نے کہا۔

"تمہیں کہہ دیا ہے کہ شام کو تمہیں سب کچھ ٹیلی فون پر بتا دیا جائے گا۔ پانچ سے چھ بجے شام کے درمیان میں پھر فون کروں گا۔" اس کے ساتھ ہی ٹیلی فون بند ہو گیا۔

شیر خان نے ریسیور رکھا اور قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ اب اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ شہاب اور فیروز نے ہی اس کی بیٹی کو اغوا کیا ہے اور اسے یرغمالی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ عزت کے آگے ایک کروڑ ڈالر کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ شیر خان نے اسی وقت پنڈی آفس میں اپنے خاص آدمی کو فون کیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ بینک میں سے مطلوبہ رقم نکلوا کر آفس کے سیف میں بند کر کے رکھ دے۔ فیروز نے تو صرف ایک کروڑ ڈالر طلب کیے تھے اگر وہ اس کی ساری دولت بھی مانگ لیتا تو شیر خان اپنی بیٹی اپنے ناموس کی خاطر اپنی ساری دولت اس کے حوالے کر دیتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی شیر خان نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ شہاب اور فیروز کو زندہ نہیں رہنے دے گا۔ وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے خانساماں سے کہا کہ وہ پنڈی جا رہا ہے۔ دوپہر تک واپس آجائے گا۔

اس نے گاڑی نکالی اور خود ڈرائیو کرتے ہوئے وہ راولپنڈی کی طرف چل پڑا۔

جب فیروز نے شامدو کے ڈیرے پر آکر شہاب کو بتایا کہ شیر خان ایک کروڑ امریکی ڈالر ادا کرنے پر راضی ہو گیا ہے تو وہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"یار دو کروڑ ڈالر کہہ دینے تھے۔" فیروز آنکھ مار کر بولا۔

"اتنے ہی کافی ہیں۔ ہم ان ڈالروں سے واپس ہانگ کانگ جا کر اپنا الگ دھندا شروع

کر سکتے ہیں۔ میں نے شیر خان کو پانچ بجے شام کا وقت دیا ہے۔ اب یہ طے کرنا ہے کہ رقم کہاں وصول کر کے عائشہ کو اس کے حوالے کیا جائے۔ کیا اسے ہوش آگیا؟" شہاب نے کہا۔

"نہیں وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ ہم نے نالی کے ذریعے دودھ پلا دیا ہے۔"

فیروز فکر مند ہو گیا۔

"اسے اب تک ہوش آجانا چاہئے تھا۔" شامدو نے پوچھا۔

"تم نے اسے کتنی دوائی پلائی تھی؟" فیروز بولا۔

"بس اتنی ہی جتنی بے ہوش کرنے کے لئے کافی تھی۔" شامدو نے کہا۔

"میرے خیال میں تم نے خوراک زیادہ دے دی ہے۔"

شہاب بولا۔

"یار بے ہوش ہی ہے نا۔ مر تو نہیں گئی۔ تم اب یہ سوچو لالے کہ شیر خان کو کہاں بلایا جائے؟ اس نے کہیں پولیس کو رپورٹ تو نہیں کی؟" فیروز نے کہا۔

"نہیں۔ میں نے اسے خبردار کر دیا ہے کہ اگر پولیس کو خبر کی گئی تو اسے بیٹی کی لاش کے ٹکڑے ہی ملیں گے۔"

شامدو شہاب اور فیروز تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اس جگہ کے تعین کے بارے میں سوچنے لگے جہاں انہیں شیر خان سے مطلوبہ رقم حاصل کر کے اس کی بیٹی اس کے حوالے کرنی تھی۔ شامدو اس علاقے کا آدمی تھا۔ اس نے ایک جگہ طے کر دی۔ جب جگہ کا تعین ہو گیا تو شامدو کہنے لگا۔

"اب تم وہاں سے شیر خان کو فون نہیں کرو گے جہاں سے تم نے صبح فون کیا تھا۔ تم اس جگہ سے دس میل آگے ایک دوسرے شہر میں جاؤ گے۔ وہاں بھی تمہیں ڈاک خانے والوں کا ایک ٹیلی فون کا کھوکھا مل جائے گا۔ اس علاقے کے ایک وزیر اعلیٰ نے کسی زمانے میں ٹیلی فون کا سلسلہ بڑا زبردست کر دیا تھا۔ یہ میں تمہیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اگر شیر خان نے فون کے بارے میں پولیس کو اطلاع بھی کر دی ہو گی تو تم جگہ بدل کر جب فون کرو گے تو تمہارے علاقے کی نشاندہی نہیں ہو سکے گی۔"

شہاب اور فیروز نے شامدو کی زیرکی کی داد دی۔ اب وہ بے تابی سے دوپہر ڈھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ دوسری طرف شیر خان بھی بے چینی سے شام ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ مطلوبہ رقم اس کے خاص منیجر نے بینک سے نکلوا کر آفس کے تہہ خانے والی لوہے کی الماری میں بند کر دی تھی۔ پولیس کو خبر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شیر خان کو رقم کا تھیلا گاڑی میں ڈال کر طے شدہ جگہ کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ وہاں رقم شہاب اور فیروز کے حوالے کرنی تھی اور عائشہ کو ان سے واپس لے لینا تھا۔ ہاں اس کے بعد شیر خان نے موقع پا کر ان دونوں جرائم پیشہ آدمیوں کو موت کے گھاٹ ضرور اتارنا تھا۔

یہ شیر خان کی غیرت گوارا ہی نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی آدمی اس کی بیٹی کو اٹھا کر لے جائے اور پھر وہ دنیا میں زندہ حالت میں چلتا پھرتا بھی نظر آئے۔ اس مقصد کے لئے شیر خان نے بھرا ہوا پستول گاڑی کے ڈیش بورڈ میں پہلے ہی سے چھپا کر رکھ دیا تھا۔

ادھر تجربہ کار شامدو نے بھی شہاب اور فیروز کو خبردار کر دیا تھا کہ ایسے معاملوں میں دشمن پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے شیر خان نے پولیس کو خبر کر رکھی ہو اور پولیس وہیں کہیں چھپ کر بیٹھی ہو۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیر خان بیٹی کو واپس لے لینے کے بعد غیرت میں آکر تم دونوں کو قتل کرنے کی کوشش کرے۔ اس لئے تمہیں چاروں طرف سے چوکس ہو کر اور پورا انتظام کر کے طے شدہ جگہ پر جانا ہو گا۔" فیروز نے کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو لالا۔ ہم اس کی ساری چال بازیوں کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔" شہاب کہنے لگا۔

"مگر لڑکی کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ اس طرح سے معاملہ گڑبڑ ہو سکتا ہے۔" اس کے بعد وہ تینوں اس کوٹھری میں گھس گئے۔ جہاں چارپائی پر عائشہ بالکل ویسی ہی حالت میں بے سدھ پڑی تھی۔ اسے تین بار انڈا پھینٹ کر دودھ پلا دیا گیا تھا۔ شہاب نے عائشہ کی آنکھوں کو کھول کر دیکھا آنکھیں بے جان سی تھیں۔

"نبض تو دیکھو اس کی۔" شہاب نے گھبرا کر کہا۔ فیروز نے نبض دیکھی اور بولا۔

"زندہ ہے یار۔ جسم بھی گرم ہے۔ لگتا ہے میں نے دوائی کچھ زیادہ ہی چینک میں

ڈال دی تھی۔" شامدو کہنے لگا۔

"ایک گھنٹہ اور دیکھ لیتے ہیں۔ اگر پھر بھی ہوش نہ آیا تو میں قصبے سے اپنے ایک راز دار حکیم جی کو بلا لاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" فیروز نے آہستہ سے کہا اور وہ تینوں کوٹھری سے باہر نکل آئے۔

اس وقت عائشہ کو ہوش آچکا تھا۔ مگر اس نے جان بوجھ کر آنکھیں اوپر چڑھالی تھیں۔ جب کوٹھری خالی رہ گئی تو عائشہ نے آنکھیں کھول کر اوپر روشندان سے آتی دن کی روشنی کی طرف دیکھا اس روشنی کو وہ آدھ گھنٹہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ یعنی اسے ہوش میں آئے آدھا گھنٹہ ہوا تھا۔ عائشہ سمجھ گئی تھی کہ اس کے ساتھ کیا کارگزاری ہوئی ہے۔ اس نے شہاب اور فیروز کو بھی دیکھ لیا تھا۔ رات کو اس نے جو چائے پی تھی اس میں بے ہوشی کی دوائی ملا دی گئی تھی۔ چائے پینے کے کچھ ہی دیر بعد اسے ایک زور دار چکر آیا تھا کہ پیشتر اس کے کہ وہ بستر سے اٹھ سکے کتاب اس کے ہاتھ سے گر گئی اور پھر اسے کوئی ہوش نہ رہا تھا۔ یہاں اس کوٹھری میں آدھا گھنٹہ پہلے جب اسے ہوش آیا تو اس پر یہ ہولناک حقیقت کھلی کہ اسے ہوش تو آگیا ہے مگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتی۔ اس کا خیال تھا کہ دوائی کا اثر آہستہ آہستہ زائل ہو رہا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں بھی ہوش میں آجائیں گے مگر آدھا گھنٹہ گزر جانے پر بھی جب اس کے بازو اور دونوں ٹانگیں ویسی ہی سن رہیں تو اسے فکر لاحق ہوئی۔ خدا جانے ان لوگوں نے اسے کون سی دوائی پلا دی تھی۔ عائشہ کو اگرچہ اس کے باپ نے نہیں بتایا تھا مگر وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ یہ دونوں اسے یرغمال بناکر اس کے باپ سے کوئی رقم وصول کرنا چاہتے ہیں اور کچھ روز پہلے مری روڈ پر اس پر جو حملہ ہوا تھا وہ بھی اسی منصوبے کا شاخسانہ تھا مگر عائشہ نے دلیری سے کام لیتے ہوئے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کی اور چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مگر اس کی ٹانگیں ابھی تک سن تھیں۔ دونوں بازو بھی کہنیوں کے آگے سن ہو چکے تھے۔ وہ ذرا سا کھانسی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا گلا اس قدر خشک ہو گیا ہے کہ وہ اچھی طرح سے آواز بھی نہیں نکال سکتی۔ اسے باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے چارپائی پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ شہاب فیروز اور شامدو ایک بار پھر اندر داخل ہوئے

شہاب عائشہ کی نبض ٹٹولنے لگا۔ اس خیال سے کہ یہ لوگ اس کے جسم کو زیادہ نہ ٹٹولنا شروع کر دیں عائشہ نے آنکھیں کھول دیں۔

ان لوگوں نے جب دیکھا کہ لڑکی کو ہوش آگیا تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ فیروز نے بڑے صاف لفظوں میں کہا۔

"عائشہ! تم ہماری یرغمالی ہو۔ تمہارے باپ نے ہماری دولت سے سارا کاروبار شروع کیا تھا۔ ہم نے اس سے اپنا حصہ مانگا۔ اس نے انکار کیا۔ ہم تمہیں اٹھا کر یہاں لے آئے۔ اب تمہارا باپ ہمیں ہماری مطلوبہ رقم دے کر تمہیں ساتھ لے جانے پر راضی ہو گیا ہے۔ آج شام تم اپنے بنگلے پر واپس چلی جاؤ گی۔ بشرطیکہ شیر خان اپنے ساتھ پولیس کو نہ لایا۔ اگر پولیس اس کے ساتھ آئی تو ہم تمہیں تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتے اب تم کھانا کھالو۔" عائشہ خاموشی سے ساری باتیں سنتی رہی پھر بیٹھی ہوئی خشک آواز میں بولی۔

"میری دونوں ٹانگیں اور کہنیوں کے نیچے دونوں بازو سن ہو گئے ہیں۔ میں انہیں ہلا جلا نہیں سکتی تم لوگوں نے مجھے کیا پلا دیا تھا؟"

شہاب نے فیروز کی طرف دیکھا فیروز بولا

"یہ بے ہوشی کی دوا کا اثر ہے۔ تھوڑی دیر بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے فوراً بعد وہ کوٹھری سے باہر آگئے۔ شہاب نے شامدو سے کہا۔

"جب تک لڑکی پر دوائی کا اثر ہے اس کی ٹانگیں سن ہیں تم کسی عورت کا بندوبست کر دو جو لڑکی کو کھانا وغیرہ بھی کھلائے اور اس کی صفائی وغیرہ کا بھی خیال رکھے۔ کیونکہ ابھی اسے چھ سات گھنٹے اس کوٹھری میں رہنا ہے۔" شامدو بولا۔

"ساتھ والے گاؤں میں میری ایک واقف اور بھروسے والی عورت رہتی ہے۔ وہ دایہ بھی ہے۔ میں ابھی جا کر اسے لے آتا ہوں۔" شامدو اسی وقت گھوڑے پر بیٹھ کر ساتھ والے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو دوسرے گھوڑے پر ایک پکی عمر کی بھاری جسم والی دیہاتی عورت بیٹھی تھی جس نے کالا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ شامدو نے اسے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ اسی وقت عائشہ کو اس عورت کے حوالے کر دیا گیا۔ جس نے

عائشہ کو تھوڑی روٹی بھی کھلائی اور اسے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں مدد بھی کی۔

جب سہ پہر کے چار بجے تو شیر خان ٹیلی فون کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے کان بے تابی سے گھنٹی بجنے کا انتظار کرنے لگے۔ پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شیر خان نے ریسیور اٹھا کر کان کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے فیروز کی شناسا آواز سنائی دی۔

"تم کون بول رہے ہو؟"

"شیر خان۔" شیر خان نے بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا۔ فیروز نے کہا۔

"سنو شیرے!" شیر خان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ میری بیٹی کیسی ہے؟ میری اس سے بات کراؤ۔" عائشہ بالکل ٹھیک ہے ایک عورت اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ میں تمہیں ایک خاص جگہ پر آکر ٹیلی فون کر رہا ہوں۔ تم بہت جلد اپنی بیٹی کے پاس ہو گے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ تمہیں مطلوبہ رقم ایک چھوٹے بریف کیس میں ڈال کر لانی ہو گی۔ تم پنڈی سے پشاور جانے والی سڑک پر روانہ ہو گے' سڑک پر جب ...." فیروز نے جواب دیا۔

فیروز نے شیر خان کو سارا راستہ سمجھا دیا کہ اسے کہاں تک بڑی سڑک پر سفر کرنا ہے اور کہاں سے سڑک چھوڑ کر بائیں جانب گھوم جانا ہے۔ اور پھر کہاں پہنچ کر گاڑی سے باہر نکل کر مطلوبہ رقم والا بریف کیس گاڑی کے بونٹ پر رکھ کر وہاں سے کتنے گز کے فاصلے پر دونوں بازو کھول کر کھڑے ہو جانا ہے۔ شیر خان بڑے غور سے فیروز کی ایک ایک بات سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہم عائشہ کو گاڑی میں ڈال کر وہاں لائیں گے سب سے پہلے میں گاڑی سے باہر

نکلوں گا۔ عائشہ گاڑی میں بیٹھی رہے گی۔ تم کھڑکی میں اس کی شکل دیکھ سکو گے۔ اس کے بعد میں تمہاری گاڑی کے پاس آکر بونٹ پر رکھے بریف کیس کو کھول کر رقم چیک کروں گا جب میری تسلی ہو جائے گی تو میں بریف کیس وہیں رکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاؤں گا اور شہاب کو اشارہ کروں گا۔ شہاب تمہاری بیٹی کو لے کر گاڑی کی طرف آئے گا۔ اور تم اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑو گے اور ادھر میں مطلوبہ رقم والا بریف کیس اٹھا لوں گا۔ اور پھر تم بیٹی کو لے کر وہاں سے نکل جاؤ گے۔ میں ایک بار پھر تمہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ساتھ چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرنا نہیں تو تمہاری بیٹی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

شیر خان نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جیسے کہہ رہے ہو میں ویسے ہی کروں گا۔ میں ابھی یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں۔"

"ہم تمہارا انتظار کریں گے۔"

یہ کہہ کر فیروز نے فون بند کر دیا۔ دوسری طرف شیر خان نے بھی ریسیور فون پر رکھ دیا۔ اس کے جذبات میں ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ اس کی حالت اس شیر کی سی تھی جو لوہے کی موٹی سلاخوں والے تنگ پنجرے میں بند ہو اور جس کی آنکھوں کے سامنے اس کے بچوں کو ہلاک کیا جا رہا ہو۔ مگر وہ مجبور تھا۔ اونچی آواز میں بول بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ کبھی مٹھیاں بھینچتا کبھی کھول دیتا۔ اس کے پرانے دوستوں نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اس کی عزت پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی تھی وہ ان سے ایسا عبرت ناک انتقام لینا چاہتا تھا کہ ان کی آنے والی نسلیں صدیوں تک اسے بھلا نہ سکیں۔ مگر سب سے پہلے وہ اپنی بیٹی کو ان کے قبضے سے واپس لینا چاہتا تھا۔ مطلوبہ تاوان کی رقم شیر خان نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ بھرا ہوا پستول اس نے گاڑی کے ڈیش بورڈ میں چھپا دیا تھا تاکہ عائشہ کو اپنی حفاظت میں لینے کے فوراً بعد وہ شہاب اور فیروز کو یا جو کوئی بھی وہاں ہو گا اسے گولی سے اڑا کر اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر سکے۔

ان لوگوں نے رات کے پچھلے پہر کا وقت دیا تھا۔ اسی حساب سے شیر خان کو رات کے بارہ بجے کے بعد پنڈی سے روانہ ہو جانا تھا۔ گھر میں اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی

تھی۔ رقم والا بریف کیس اس نے گاڑی کی اگلی سیٹ کے نیچے چھپا کر رکھ دیا۔ جب وہ رات بارہ بجے پنڈی سے روانہ ہونے لگا تو اس کے پنڈی والے آفس کا وفادار منیجر بھی جاگ رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مالک اتنی بھاری رقم لے کر کہاں جا رہا ہے مگر اتنا اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ معاملہ خطرناک ہے اور اس کا مالک شیر خان جو ایک نہایت ایماندار اور شریف کاروباری آدمی ہے کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہے اور محض اپنی ساکھ کی وجہ سے پولیس کو کچھ نہیں بتا رہا۔

چنانچہ اس وفادار منیجر نے اپنے مالک شیر خان سے ہمدردی اور اس کی جان کی حفاظت کے خیال سے ایک گھنٹہ پہلے پولیس کو فون کر کے سارے حالات سے باخبر کر دیا تھا۔ انسپکٹر خالد نے منیجر کو ہدایت کی کہ وہ کسی سے کوئی بات نہ کرے۔ ہم خفیہ طور پر شیر خان کا پیچھا کریں گے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری لیتے ہیں اصل معاملے کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے۔ انسپکٹر خالد بذاتِ خود شیر خان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ شیر خان پاکستان کا ایک ذمہ دار شریف النفس اور محب الوطن شہری ہے اور ضلع کی کئی رفاہ عامہ کی انجمنیں اس کے ڈونیشنز سے عوام کی خدمت کر رہی ہیں۔

چنانچہ جس وقت شیر خان اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنی بیٹی کو واپس لانے کے لئے شہر سے روانہ ہوا تو اس کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے پر انسپکٹر خالد بھی عام کپڑوں میں ایک پرانی گاڑی میں سوار چل پڑا۔ اگلے ضلع کی پولیس کو بھی چوکس کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ ابھی تک انسپکٹر خالد کو یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ شیر خان کی منزل کونسی ہے۔ انسپکٹر خالد کے ساتھ چار پولیس کمانڈو بھی عام کپڑوں میں بیٹھے تھے۔ ان کے پاس پستول تھے جو انہوں نے لباس کے اندر چھپا رکھے تھے۔ فیروز نے شیر خان کو جو مقام بتایا تھا جہاں سے شیر خان نے پکی سڑک کو چھوڑ کر کچے راستے پر اتر جانا تھا وہ مقام ابھی کافی دور تھا۔ شیر خان کی گاڑی رات کے سناٹے میں پوری رفتار کے ساتھ اڑی چلی جا رہی تھی۔ پھر بھی اسے خاص مقام تک پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ یہاں پرانے زمانے کے ایک مینار کا کھنڈر تھا۔ یہ نشانی فیروز نے شیر خان کو بتائی تھی۔ شیر خان نے گاڑی پکی سڑک سے اتار کر کچی سڑک پر ڈال دی۔ اس جگہ کوئی درخت نہیں تھے۔ سنگلاخ زمین تھی۔ اندھیرے میں کہیں کہیں

چھوٹے چھوٹے ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔ انسپکٹر خالد نے تھوڑا فاصلہ رکھ کر اپنی گاڑی شیر خان کے پیچھے لگا رکھی تھی۔ رات کی تاریکی کی وجہ سے پولیس کی گاڑی شیر خان کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔ ویسے بھی انسپکٹر خالد نے گاڑی کی ہیڈ لائیٹس بند کر رکھی تھیں۔ سنگلاخ زمین ختم ہوئی تو ایک چٹیل میدان آگیا۔ فیروز نے ٹیلی فون پر اسے بتا دیا تھا کہ جب چٹیل میدان آئے گا تو سامنے ایک ٹیلے پر روشنی ٹمٹماتی دکھائی دے گی۔ تم گاڑی ٹیلے کے عقب میں لے آنا۔ بس یہی وہ جگہ ہو گی جہاں تم رقم ہمارے حوالے کر کے اپنی بیٹی حاصل کرو گے۔ شیر خان نے دور ٹیلے پر روشنی ٹمٹماتی دیکھی۔ یہ ایک لالٹین کی روشنی تھی جسے فیروز نے شامدو کو کہہ کر وہاں رکھوا دیا تھا۔ شہاب فیروز اور شامدو پہلے سے یہاں موجود تھے۔ شیر خان ٹیلے کے عقب میں پہنچا تو اسے ستاروں کی ہلکی روشنی میں ایک کافی کھلی جگہ نظر آئی۔ یہاں کوئی گاڑی وغیرہ نہیں تھی۔ شیر خان اپنی گاڑی سے نکل کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے کوئی گاڑی وغیرہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر شہاب اور فیروز نے اسے دیکھ لیا تھا۔ شیر خان ابھی گاڑی کے باہر ہی کھڑا تھا کہ سامنے کچھ فاصلے پر گاڑی کی بتیاں روشن ہو گئیں اور یہ گاڑی آہستہ آہستہ چلتی ایک جگہ کھلے میدان کے بالکل درمیان میں آ کر رک گئی۔ گاڑی کی بتیاں اسی طرح روشن رکھی گئی تھیں۔ پھر فیروز کی آواز بلند ہوئی۔

"شیر خان رقم لائے ہو؟" شیر خان نے جواب میں سوال کیا۔

"میری بیٹی کہاں ہے؟ پہلے اس سے میری بات کراؤ۔" شہاب نے غصے میں کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ ہماری رقم لائے ہو؟" شیر خان بولا۔

"شہاب! تم خوب جانتے ہو کہ میرے لئے عزت ہی سب کچھ ہے۔ رقم کی میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ مگر تم مجھے بلیک میل کر رہے تھے۔ اور یہ بھی تم دونوں اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے کوئی بلیک میل نہیں کر سکتا۔" دوسری طرف سے فیروز کی آواز بلند ہوئی۔

"شیرے! یہ واعظ بند کرو اور ہمارے سوال کا جواب دو۔ رقم لائے ہو؟"

"ہاں!" شیر خان نے جواب دیا۔ "مگر میری بیٹی کہاں ہے؟ میری اس سے بات کراؤ۔" شہاب کی آواز آئی۔

"تم صرف اس کی آواز ہی سن سکو گے اس سے ملاقات رقم ہمارے حوالے کرنے

کے بعد ہو سکے گی۔" اس کے ساتھ ہی کار میں پچھلی سیٹ پر نیم دراز عائشہ کو شہاب نے کہا کہ وہ اپنے باپ کو آواز دے۔ عائشہ اس وقت معذوری کی حالت میں تھی۔ بے ہوشی کی ضرورت سے زیادہ دی گئی دوائی کا اثر اس کی آواز پر بھی ہو چکا تھا۔ اس نے نقاہت بھری آواز میں اپنے باپ کو پکارا تو شیر خان اپنی بیٹی کی کمزور آواز سن کر تڑپ اٹھا۔ اس نے چلا کر پوچھا۔

"کیا یہ تم ہو عائشہ بیٹی؟ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے؟" عائشہ نے جواب میں کہا۔

"میں بیمار ہوں ڈیڈی!" اس پر شیر خان بھڑک اٹھا اس نے شہاب اور فیروز کو مخاطب کر کے غضبناک لہجے میں کہا۔

"تم نے میری بیٹی کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

شیر خان سے یہ غلطی ہو گئی کہ وہ جوش میں آکر کچھ فاصلے پر کھڑی کار کی طرف بڑھا۔ اسے اپنی طرف خالی ہاتھ آتا دیکھ کر فیروز یہ سمجھا کہ وہ رقم اپنے ساتھ نہیں لایا۔ شامدو بولا۔

"اس کے پاس اسلحہ بھی ہو گا۔ فائر کر دو۔" اور فیروز نے فائر کر دیا۔ گولی ایک دھماکے کے ساتھ شیر خان کے پاؤں کے قریب زمین میں دھنس گئی۔

اب جو غلطی انسپکٹر خالد کے ایک پولیس کمانڈو سے سرزد ہوئی اس نے سارا منظر ہی بدل ڈالا۔ پولیس کے تینوں کمانڈو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ شیر خان پر پستول کا فائر ہوا تو ایک سپاہی نے جوابی فائر کر دیا۔ تھری ناٹ تھری کی گولی اندھیرے میں ایک طرف بیٹھے فیروز کو قریب قریب چھوتے ہوئے نکل گئی۔

"شہابو۔ شیرا پولیس ساتھ لایا ہے۔"

فیروز گرجا اور ساتھ ہی دھڑا دھڑ فائرنگ کرتا گاڑی کی طرف دوڑا۔ شہاب نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ شامدو اور فیروز اس میں لپک کر گھس گئے اور گاڑی کچی زمین پر اندھیرے میں ایک طرف کو نکل گئی۔ شیر خان حیران تھا کہ پیچھے سے کس نے فائر کیا تھا وہ اپنی گاڑی کی طرف دوڑ کر گیا۔ ڈیش بورڈ میں سے پستول نکالا اور بغیر نشانہ لیے اس طرف اندھا دھند فائر کرنے لگا جدھر شہاب اور فیروز کی گاڑی گئی تھی۔ پیچھے سے انسپکٹر خالد اور پولیس کے کمانڈو بھی فائرنگ کرتے گھات سے نکل آئے۔ شیر خان نے ستاروں کی دھندلی روشنی

میں انسپکٹر خالد کو پہچان لیا۔

"انسپکٹر! تم نے بیڑا غرق کر دیا ہے۔" انسپکٹر خالد نے شیر خان کا جواب دینے کی بجائے اپنے آدمیوں سے چیخ کر کہا کہ وہ بدمعاشوں کا تعاقب کریں۔ پولیس والوں کی گاڑی ٹیلے کے پیچھے کھڑی تھی۔ سپاہی بھاگ کر اس میں بیٹھے اور گاڑی کو تیزی سے نکال کر شہاب اور فیروز کی گاڑی کے پیچھے لگا دیا۔ انسپکٹر خالد نے شیر خان کو بازو سے پکڑ کر اس کی گاڑی کی طرف کھینچا اور کہا۔

"خان جی! گاڑی چلائیں۔"

شیر خان نے انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی نکالی۔ مگر اس دوران میں فیروز اور شہاب کی گاڑی بیمار عائشہ کو لے کر رات کی تاریکی میں ان ٹیلوں کی طرف نکل گئی تھی جن کے پیچیدہ راستوں کا صرف شامدو ہی کو علم تھا۔ عائشہ سمجھ گئی تھی کہ سارا کھیل بگڑ گیا ہے اور اب کچھ پتا نہیں کہ یہ لوگ اگلا قدم کیا اٹھائیں گے۔ صرف ایک ہی امید تھی کہ تعاقب میں آنے والی اس کے ڈیڈی کی گاڑی کسی طرح اس تک پہنچ جائے مگر پیچھے آنے والی گاڑی کی آواز بھی اب رات کے سناٹے میں کہیں دور رہ گئی تھی۔

شامدو کی ہدایت پر شہاب نے گاڑی کو ایک گہرے پہاڑی نالے کے اوپر بنے ہوئے لکڑی کے چھوٹے سے پل پر ڈال دیا۔ اس پل پر سے صرف ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ نیچے کافی گہرائی تھی اور خشک نالے میں چھوٹے بڑے پتھر جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ یہ پل رسوں کی مدد سے بندھا ہوا تھا۔ پل کی دوسری طرف آتے ہی شامدو نے گاڑی ایک طرف رکوائی۔ لپک کر باہر نکلا۔ اس جگہ آیا جہاں موٹے موٹے رسے ایک ستون سے بندھے ہوئے تھے۔ ان رسوں کے سہارے یہ مختصر سا پل نالے کے اوپر کھڑا تھا۔ شامدو نے رسوں کو پستول کے فائر سے توڑ دیا۔ رسوں کے ٹوٹتے ہی پل ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ نالے میں گر گیا۔" اب ان کا باپ بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور وہ گاڑی لے کر اندھیرے میں گم ہو گئے۔

ایک طرف انسپکٹر خالد اپنے سپاہیوں کے ساتھ اور دوسری طرف شیر خان اکیلا بپھرے ہوئے شیر کی طرح اپنی بیٹی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ جب شامدو نے پل کے رسوں کو

فائرنگ سے اڑایا تو پستول کے دھماکے کی آواز پر پولیس اور شیر خان کی گاڑیاں اس طرف دوڑیں۔ دونوں گاڑیاں تھوڑے تھوڑے وقفے سے خشک نالے پر پہنچ گئیں۔ پل نالے میں گرا پڑا تھا۔ انسپکٹر خالد نے شیر خان کے قریب آکر کہا۔

"وہ لوگ پل توڑ گئے ہیں۔ ہمیں دوسری طرف سے ان کا تعاقب کرنا ہو گا۔" شیر خان نے انسپکٹر خالد کی طرف غضب ناک انداز میں دیکھا اور زہریلے لہجے میں بولا۔

"انسپکٹر تم نے میری بچی کو مجھ سے اتنی دور کر دیا ہے کہ اب میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" انسپکٹر خالد نے پیشہ وارانہ انداز میں کہا۔

"شیر خان ! پولیس اپنا فرض ادا کر رہی ہے۔ اگر ایک روز پہلے تم ہمیں حالات سے باخبر کر دیتے تو اس وقت تمہاری بچی تمہارے گھر میں ہوتی اور مجرم حوالات میں ہوتے۔" بہر حال وہ لوگ ہمارے چنگل سے بچ نہ سکیں گے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر تیزی سے پولیس گاڑی کی طرف گیا اور گاڑی نالے کے کنارے کنارے مغرب کی طرف نکل گئی۔ شیر خان اپنی گاڑی کے پاس کچھ دیر کھڑا گہری خاموش نظروں سے نالے کی دوسری جانب تکتا رہا جہاں صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں ٹیلوں کے خاکے ابھرنے لگے تھے۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھا۔ انجن اسٹارٹ کیا اور جس طرف پولیس کی گاڑی گئی تھی اسی طرف تیزی سے نکلتا چلا گیا۔ یہ خشک نالہ کئی میل تک چلا گیا تھا۔ راستے میں کہیں بھی کوئی ایسی جگہ نہ تھی کہ جہاں سے گاڑی گزاری جا سکتی۔ سورج نکل آیا تھا۔ جب شیر خان نے بائیں جانب ڈھلان دیکھ کر گاڑی کو خشک نالے میں اتار دیا۔

تھوڑی دور تک نالے کے اندر گاڑی کو چلانے کے بعد ایک جگہ سے وہ اسے نالے سے باہر نکال کر دوسرے کنارے پر لے آیا۔ یہاں سے وہ واپس چل پڑا۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ یہ سارا علاقہ شیر خان کے لئے اجنبی تھا۔ اس سے پہلے وہ ادھر کبھی نہیں آیا تھا۔ وہاں سوائے اونچے نیچے سنگلاخ ٹیلوں اور جگہ جگہ اگی ہوئی خشک جھاڑیوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ شہاب اور فیروز کی گاڑی کے ٹائروں کے نشان تلاش کر رہا تھا جو اسے کہیں نہیں مل رہے تھے۔ ایک دم سے اس نے گاڑی کو بریک لگائی۔ اس کے سامنے ایک اور نالہ آگیا تھا یہ بھی برساتی نالہ تھا اور کافی گہرا تھا۔

شیر خان ٹوٹے ہوئے پل تک پہنچنا چاہتا تھا مگر اس نالے نے اس کا راستہ روک دیا تھا۔ شیر خان غصیلی نظروں سے گاڑی سے اتر کر نالے کو دیکھنے لگا پھر اس نے زور سے گاڑی کے بونٹ پر مکا مارا اور کھڑے کھڑے سر کو جھکا کر گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کی بیٹی عائشہ اس کی پہنچ سے دور ہو چکی تھی۔ گاڑی میں مطلوبہ رقم ویسے کی ویسی بریف کیس میں پڑی تھی۔ وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو ریورس کیا اور واپس روانہ ہو گیا۔ دن کے دس بج رہے تھے جب وہ پنڈی پہنچا۔ اپنے ہیڈ آفس میں شیر خان نے کسی سے زیادہ بات نہ کی بریف کیس اپنے خاص منیجر کے حوالے کر کے اسے رقم واپس بینک میں جمع کرانے کی بجائے لاکر میں بند رکھنے کی ہدایت کی اور گاڑی مری روڈ پر ڈال دی۔

اپنے بنگلے روبی ہاؤس میں آکر وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور اپنے آپ کو شکست خوردگی کے عالم میں صوفے پر گرا دیا۔ پھر کسی جذبے کے زیر اثر ایک دم اٹھا اور بنگلے کے پیچھے اپنی بیوی روبی کی قبر پر آگیا۔ قبر پر تازہ پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ شیر خان کی ہدایت پر روبی کی قبر پر روزانہ تازہ پھولوں کے ہار ڈالے جاتے تھے۔ شیر خان نے اپنی بیوی کی مغفرت کے واسطے فاتحہ پڑھی اور قبر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"میں عائشہ کو اپنے ساتھ نہ لا سکا۔ مجھے معاف کر دینا لیکن میں اس وقت تک تیری قبر کو اپنا منہ نہ دکھاؤں گا جب تک بیٹی کو واپس نہیں لے آتا۔ میں اپنے خون کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ شہاب اور فیروز میرے انتقام سے نہیں بچ سکیں گے۔" شیر خان نے بیوی کی قبر پر پڑے گلاب کے ہار کو اٹھا کر چوما اور تیزی سے واپس اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

پولیس کو چونکہ شیر خان کی بیٹی کے اغوا کی خبر ہو گئی تھی اس لئے ضابطے کی کارروائی بھی شروع ہو گئی تھی۔ چونکہ انسپکٹر خالد کے شیر خان کے ساتھ گہرے مراسم تھے اس لئے شیر خان کے کہنے پر انسپکٹر خالد نے عائشہ کے اغوا کی خبر اخباروں کو نہیں دی تھی۔ محکمے کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ زیادہ سے زیادہ رازداری سے کام لیا جائے۔ شیر خان نے انسپکٹر سے یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی کہ اسے یہ خبر کس نے دی تھی کہ میں تاوان کی رقم لے کر اپنی بچی کو چھڑانے جا رہا ہوں لیکن انسپکٹر خالد نے اس ضمن میں کچھ بتانے سے انکار

کر دیا تھا۔

شیر خان نے انسپکٹر خالد کو شہاب اور فیروز کے بارے میں ساری باتیں بتا دیں تھیں۔

پولیس شیر خان کے بیان کی روشنی میں تفتیش کر رہی تھی۔ مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ شہاب اور فیروز وہاں اجنبی تھے اور کسی بھی جرائم پیشہ گروہ کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ پولیس پارٹی نے دوسرے روز نالے کے پار والے سارے علاقے کو چھان مارا۔ وہاں ایک جگہ ریتلی زمین پر شہاب اور فیروز کی گاڑی کے ٹائروں کے نشان بھی مل گئے مگر تھوڑی دور آگے جا کر یہ نشان سخت زمین پر غائب ہو گئے۔ اس کے آگے پتھریلی زمین شروع ہو جاتی تھی۔ اس کے آگے میلوں تک کوئی آبادی نہ تھی۔ سوائے چھوٹی چھوٹی سوکھی جھاڑیوں والے ٹیلوں کے اور کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ ان ٹیلوں کے پار ایک دریا بہتا تھا جہاں سے دوسرے صوبے کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ ایک پولیس پارٹی دوسرے صوبے کی طرف بھی روانہ کر دی گئی۔ مگر شہاب اور فیروز کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

شیر خان کی حالت زخمی شیر کی سی تھی جسے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ اسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ تیسرے دن سہ پہر چار بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شیر خان زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو ٹیلیفون کے قریب رکھتا اسے یقین تھا کہ شہاب اور فیروز کا فون ضرور آئے گا۔ گھنٹی کے بجتے ہی شیر خان نے ریسیور اٹھا کر اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کون؟" دوسری طرف سے فیروز کی آواز آئی۔ "شیر خان! تو نے اپنے وعدے کا پاس نہیں کیا۔" شیر خان نے جلدی سے کہا۔ "میں نے پولیس کو خبر نہیں کی تھی۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ تمہاری رقم اب بھی میرے پاس ہے۔ مجھے بتاؤ میں کہاں رقم لے کر آؤں۔ میری بیٹی کس حال میں ہے؟" فیروز بولا۔

"وقت تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے شیرے؟ تمہاری بیٹی بالکل ٹھیک ہے مگر اب تم اس کی شکل نہیں دیکھ سکو گے۔ اس کا انجام دیکھو گے۔" شیر خان نے فیروز کی بات کاٹ کر کہا۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں فیروز میں نے پولیس کو اطلاع نہیں کی تھی۔ میری ساری

جائیداد لے لو۔ میری ساری دولت لے لو۔ مگر میری بچی واپس کر دو۔" فیروز نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔

"شیر خان! موقع تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ تم نے ہمارے لئے وہ جال پھیلایا تھا کہ اگر ہم اس میں پھنس جاتے تو شاید باقی ساری زندگی جیل میں سڑتے گزر جاتی لیکن قدرت نے ہمیں بچا لیا۔ اب ہم نے اپنا فیصلہ تبدیل کر لیا ہے۔ ہم تم سے اپنے حصے کی رقم نہیں لیں گے۔ ہم تم سے بدلہ لیں گے۔ انتقام لیں گے۔ ایسا انتقام کہ جس کے تصور ہی سے تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ اس کے بعد تمہیں ہمارا فون نہیں آئے گا۔" اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔

شیر خان اپنی جگہ پر جیسے پتھر کا بت بن گیا تھا۔ ریسیور اس کے ہاتھ میں تھا اور آنکھیں سامنے دیوار کو تک رہی تھیں۔ اس نے گہرا سانس لے کر ریسیور ٹیلی فون پر رکھ دیا۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔ وہ شہاب اور فیروز کی کینہ فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے اندر جیسے آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ بے چینی سے خالی کمرے کے قالین پر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

اس وقت شیر خان کے دل کو اگر کسی خیال سے ذرا سکون مل رہا تھا تو صرف اس خیال سے کہ اس کی بیٹی اپنی عزت کی خاطر زندگی کے آخری سانس تک زخمی شیرنی کی طرح لڑے گی اور اگر دشمن کو پچھاڑ نہ سکی تو خودکشی کر لے گی۔ عائشہ کو شیر خان نے یہی تربیت دی تھی۔ یہی تعلیم دی تھی۔ وہ اپنی ماں سے بڑھ کر بہادر اور دلیر تھی۔ وہ روبی سے زیادہ خونخوار شیرنی تھی۔

شیر خان نے اسی وقت انسپکٹر خالد کو فون کر کے اپنے گھر بلوایا اور فیروز کے ساتھ ٹیلی فون پر جو بات ہوئی تھی وہ ساری کی ساری بیان کر دی۔ انسپکٹر خالد بولا۔

"ہم نے سارے صوبوں کی پولیس کو خبردار کر دیا ہے۔ ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں پر بھی پولیس تعینات کر دی ہے۔ یہ لوگ ملک سے باہر نہیں نکل سکیں گے ان کے خفیہ اڈے کی تلاش کے لئے بھی ہم سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔"

یہ پولیس کا روایتی بیان تھا۔ شیر خان کی اس بیان سے تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے اسی لمحے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔ دوسرے دن منہ اندھیرے وہ اپنی جیپ نکال کر

اس میں گولیوں کی بیلٹ اور پستول چھپا کر سوار ہوا اور اس سمت کو روانہ ہو گیا جس طرف وہ کچھ دن پہلے تاوان کی رقم لے کر گیا تھا۔ سورج کافی اوپر آگیا تھا جب وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں شہاب اور فیروز اس کی بیٹی عائشہ کو گاڑی میں ڈال کر لائے تھے۔ شیر خان کو اسی روز اندازہ ہو گیا تھا کہ فیروز اور شہاب کے ساتھ کوئی تیسرا آدمی بھی تھا۔ یہ تیسرا آدمی وہی ہو سکتا تھا جس کے خفیہ ٹھکانے پر وہ عائشہ کو لے کر چھپے ہوئے تھے۔ اصولی طور پر یہ ٹھکانہ اس مقام سے زیادہ دور نہیں ہونا چاہئے تھا۔

شیر خان نے جیپ کو اس طرف بڑھایا جس طرف پولیس مقابلے کے بعد شہاب اور فیروز گاڑی لے کر بھاگے تھے کافی آگے جا کر اسے ایک کچا راستہ دائیں جانب ایک ویران علاقے کی طرف جاتا نظر آیا۔ اس نے گاڑی اس راستے پر ڈال دی۔ میدان دو تین میل تک پھیلا ہوا تھا۔ جب وہ ختم ہوا تو اسے کچھ فاصلے پر نشیب میں دو چار کھیت دکھائی دیے۔ قریب ہی درختوں کے پاس چند ایک کچے مکان بنے ہوئے تھے۔ شیر خان نے جیپ کھیتوں کے پاس ایک جانب کھڑی کی اور بھرا ہوا پستول جیب میں ڈال کر کچے مکانوں کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک بوڑھا آدمی صحن کے باہر کلہاڑی سے لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ شیر خان نے اسے سلام کیا اور پانی مانگا۔ بوڑھے نے کلہاڑی ایک طرف ڈالی شیر خان کی طرف غور سے دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ صحن میں ایک طرف پانی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ بوڑھا کٹورے میں پانی بھر کر لے آیا۔ شیر خان نے پانی پی کر بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور گرد و پیش پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"میں اپنے ایک دوست کی تلاش میں ادھر آیا تھا مگر لگتا ہے کہ راستہ بھول گیا ہوں۔"

"تمہارا دوست کس گاؤں میں رہتا ہے۔" بوڑھے نے کلہاڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ بڑے سکون سے لکڑیاں کاٹنے لگا۔ شیر خان نے اسے ایک فرضی نام بتا دیا اور ایک فرضی کہانی بھی گھڑ کر سنا دی کہ ہم دونوں دوسری جنگ میں مصر کے محاذ پر اکٹھے رہے تھے۔ پھر وہ مجھ سے بچھڑ گیا۔ کسی نے مجھے بتایا کہ وہ اس علاقے کے ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ بس میں گاڑی لے کر ادھر نکل آیا۔ بوڑھے نے کلہاڑی ایک طرف رکھ دی اور صافے سے منہ کا

پسینہ پونچھتے ہوئے شیر خان کے پاس بیٹھ گیا۔

"جو نام تم بتاتے ہو اس نام کا تو کوئی آدمی یہاں نہیں رہتا۔ یہاں دو چار گھر ہیں جوان دن کو کام پر چلے جاتے ہیں۔ قریب ہی کوئی ڈیم بن رہا ہے۔ چھٹی کے وقت کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ تم پیچھے جاؤ۔ وہاں ایک گاؤں ہے۔ شاید وہاں تمہیں اپنے دوست کا سراغ مل جائے۔" شیر خان کو مغرب کی جانب ایک ٹیلے کے ساتھ درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے یوں ہی ان درختوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھ لیا کہ اس طرف بھی کوئی گاؤں ہے کیا؟ بوڑھے نے ٹیلے کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور کہنے لگا۔

"وہاں شامدو کا ہی مکان ہے۔ وہی اکیلا وہاں رہتا ہے۔ مگر وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ چرس کوکین کا دھندا کرتا ہے۔ گاؤں والوں میں سے کوئی اس سے نہیں ملتا۔" شیر خان کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ جس شخص کی تلاش میں نکلا تھا اس کا سراغ مل گیا ہے۔ اس نے بوڑھے سے پوچھا۔

"کیا شامدو وہاں اکیلا ہی رہتا ہے؟" بوڑھا سخت لہجے میں بولا۔ "تمہیں کہا ہے نا کہ اکیلا ہی رہتا ہے۔ ایسے شخص سے کوئی شریف آدمی ملنا پسند نہیں کرتا۔"

شیر خان نے موضوع بدل کر دوسری باتیں شروع کر دیں۔ پھر اٹھ کر بوڑھے سے مصافحہ کیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور جیپ میں بیٹھ کر اس ٹیلے کی طرف چل دیا جہاں بوڑھے کی اطلاع کے مطابق جرائم پیشہ شامدو کا مکان تھا۔ یہ وہی مکان تھا جہاں شہاب اور فیروز شیر خان کی بیٹی عائشہ کو پہلی بار لے کر آئے تھے اور اسے وہاں چھپایا تھا۔ مکان کا لکڑی کا پرانے زمانے کا دروازہ بند پڑا تھا۔ کچے صحن میں خاک اڑ رہی تھی۔ شیر خان نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ مکان کی پچھلی طرف آیا تو کچھ فاصلے پر ایک عورت کو دیکھا جو درخت کے نیچے گری پڑی سوکھی شاخیں جمع کر رہی تھی۔ شیر خان اس کے قریب گیا اور پوچھا۔

"بی بی اس مکان میں جو آدمی رہتا تھا وہ کہاں چلا گیا ہے؟" عورت کمر پر ہاتھ رکھ کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور شیر خان کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تم شامدو کا پوچھ رہے ہو؟" شیر خان نے کہا۔

"ہاں ہاں میں شامدو ہی کو ملنے آیا ہوں۔ بڑی دور سے آرہا ہوں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کہاں ملے گا؟" عورت نے کہا۔

"ایسے آدمیوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب کہاں چلے جائیں۔ دو تین روز پہلے تو وہ اپنے مکان پر ہی تھا۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے کچھ ساتھی بھی آئے ہوئے تھے۔" شیر خان نے جب شہاب اور فیروز کا حلیہ بتایا تو عورت نے تصدیق کی کہ ہاں ایسے حلیے کے آدمی ہی تھے۔ شیر خان نے آہستہ سے پوچھا۔

"بی بی! کیا ان کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی؟" وہ عورت چپ ہو گئی۔ سوکھی ٹہنیوں کو رسی سے باندھنے لگی۔ پھر شیر خان کی طرف چہرہ اٹھا کر دیکھا اور کہا۔

"کوئی عورت ضرور تھی مگر شاید وہ بیمار تھی۔ کوٹھری میں پڑی رہتی تھی۔ میں نے شامدو کو یہ کہتے سنا تھا کہ عورت کو تم نے کوئی سخت دوا تو نہیں پلا دی۔" پھر سر کو نفی کے انداز میں ہلاتے ہوئے بولی۔

"اللہ معاف کرے۔ خدا جانے کیسے کیسے گناہ کرتے ہیں یہ لوگ۔ تم بھی مجھے ان کے بھائی بند ہی لگتے ہو۔" اتنا کہہ کر عورت نے سوکھی شاخوں کا گٹھا اپنے سر پر رکھا اور وہاں سے چل پڑی شیر خان نے آگے بڑھ کر عورت سے کہا۔

"میری بہن! وہ عورت میری بیٹی تھی۔ میں شریف آدمی ہوں۔ یہ لوگ میری بیٹی کو اٹھا کر لے آئے ہیں۔ میری مدد کرو۔" عورت رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں شیر خان کے لئے ہمدردی کا جذبہ جھلک اٹھا کہنے لگی۔

"اللہ تم پر اور تمہاری بیٹی پر رحم کرے۔ شامدو بڑا سنگدل آدمی ہے۔ وہ اس عورت کو فروخت کرنے کے واسطے ضرور بارڈر کی طرف لے گیا ہو گا۔ وہاں ایسا ہی دھندا ہوتا رہتا ہے۔ تم بارڈر پر جاؤ شاید تمہیں تمہاری بیٹی مل جائے۔"

"بارڈر؟ کونسا بارڈر میری بہن؟" شیر خان نے پوچھا۔ عورت کہنے لگی۔

"افغانستان کا بارڈر۔" پھر اس عورت نے شیر خان کو ایک سرحدی گاؤں کا نام بھی بتایا جہاں جرائم پیشہ بردہ فروش لوگ اغوا شدہ عورتوں کو آگے بیچ دیتے تھے۔

شیر خان وہیں سے پنڈی آگیا۔ پنڈی پہنچ کر اس نے گاڑی وہیں چھوڑی۔ کچھ ضروری

چیزیں اور روپے اپنے پاس رکھے اور فوکر جہاز کی فلائیٹ سے پشاور روانہ ہو گیا۔ پشاور سے ٹیکسی کرائی اور افغانستان کی سرحد کی طرف چل پڑا۔ جس وقت وہ عورت کے بتائے ہوئے گاؤں سے پچاس میل پیچھے ایک پہاڑی قصبے میں پہنچا تو رات ہو گئی تھی۔ یہاں اس نے ایک سرائے میں رات گزاری۔ ٹیکسی اپنے ساتھ ہی رکھی۔ صبح اٹھ کر وہ بارڈر والے گاؤں کی طرف چل دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دس پندرہ بوسیدہ سے مکان تھے۔ ایک آدمی رائفل کاندھے پر ڈالے لاٹھی کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کی بکریاں سنگلاخ زمین پر گھاس تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔

شیر خان نے اسے سلام کیا اور کہا۔" میں اپنے ایک دوست کی تلاش میں آیا ہوں جو گھر سے ناراض ہو کر چلا آیا ہے اس کا نام شامدو ہے۔ ایک لڑکی بھی اس کے ساتھ ہے سنا ہے وہ بارڈر کراس کر کے افغانستان میں داخل ہونا چاہتا ہے۔" پٹھان چرواہے نے تیز عقابی آنکھوں سے۔ شیر خان کی طرف دیکھا۔

"اس نام کے کسی آدمی کو میں نہیں جانتا۔"

پٹھان چرواہے نے ٹیکسی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"راولپنڈی سے آیا ہوں۔ میرے دوست کی والدہ بڑی بیمار ہے۔ میں اسے واپس گھر لے جانے آیا ہوں۔" پٹھان چرواہا جیسے کچھ سوچنے لگا۔ پھر پہلو بدل کر بولا۔

"وہ سامنے والا ٹیلہ دیکھ رہے ہو؟ اس کے پاس ایک مکان ہے جہاں میرانی نام کی ایک عورت رہتی ہے وہ ایسے لوگوں کی مدد کرتی ہے۔ شاید اس سے تمہیں کچھ پتا چل سکے۔"

شیر خان شکریہ ادا کر کے ٹیلے کی طرف چل دیا۔ یہ ایک خشک سوکھی زرد جھاڑیوں والا ٹیلہ تھا اس کے پیچھے پتھروں سے بنا ہوا ایک حجرہ سا نظر آیا۔ دو بکریاں صحن میں بندھی تھیں ایک ادھیڑ عمر کی عورت گلے میں منکوں کی مالا ڈالے چارپائی پر بیٹھی بھیڑوں کی اون صاف کر رہی تھی۔ شیر خان نے سلام کیا تو عورت نے ایک نظر اسے دیکھا۔ پھر کام میں مشغول ہو گئی۔

"ابھی میرے پاس اون تیار نہیں ہے۔ کل کسی وقت آنا۔" شیر خان نے جیب سے سو سو کے بیس نوٹ نکال کر اس عورت کے سامنے رکھ دیئے اور کہا۔

"مجھے تین آدمیوں کی تلاش ہے جو بارڈر پار کرنے ادھر آئے تھے۔" عورت نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا پتا کسی کا میں تو یہاں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہوں۔"

شیر خان نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے مزید دس نوٹ نکال کر عورت کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ عورت نے جلدی سے سارے نوٹ اٹھا کر اپنی صدری میں ڈال لیے اور پوچھا۔

"ان کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں؟"

"ایک لڑکی تھی۔" شیر خان نے کہا۔"وہ میری بیٹی ہے یہ لوگ میری بیٹی کو اٹھا کر لے آئے ہیں۔" پٹھان عورت کے ہاتھ پشم صاف کرتے کرتے رک گئے۔ اس نے لڑکی کا حلیہ پوچھا۔ شیر خان نے اپنی بیٹی عائشہ کا حلیہ بتا دیا۔ پٹھان عورت نے دوسرے مردوں کا حلیہ پوچھا۔ شیر خان نے شہاب اور فیروز کا حلیہ بیان کر دیا۔ عورت خاموش تھی۔ شیر خان بولا۔

"ان کے ساتھ شامدو نام کا ایک آدمی بھی تھا۔ میں اسے نہیں جانتا۔" پھر شیر خان نے عورت سے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ پٹھان عورت نے صدری کی جیب میں ہاتھ ڈال کر شیر خان نے جو اسے رقم دی تھی وہ ساری کی ساری نکال کر نوٹ شیر خان کے آگے رکھ دی۔

"اسے واپس لے لو۔ میں ایک باپ کی بے بسی کا فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ مجھ پر گناہوں کا پہلے ہی بوجھ ہے۔ میری بات غور سے سنو۔"

اس نیک دل پٹھان عورت نے جس کا ضمیر ابھی زندہ تھا شیر خان کو بتایا کہ شامدو کو وہ جانتی ہے۔ وہ دو روز پہلے اپنے دو آدمیوں اور دو عورتوں کو لے کر بارڈر پار کرنے وہاں آیا تھا۔ ایک عورت پکی عمر کی تھی۔ دوسری نوجوان لڑکی تھی جس کی ٹانگیں کام نہیں کرتی تھیں وہ عورت کے سہارے چل رہی تھی۔ یہ لوگ اسی دن رات کو بارڈر پار کر کے کابل کی طرف چلے گئے تھے۔ مگر شامدو صبح ہونے سے پہلے واپس آ گیا تھا۔ ان لوگوں کا ارادہ

کابل سے بھی آگے ترکی ایران کی طرف جانے کا تھا۔ اب تک وہ کہیں کے کہیں نکل چکے ہوں گے۔ تم ان کی تلاش میں جاؤ گے بھی تو ان کا سراغ نہ پا سکوں گے۔" شیر خان کسی بت کی طرح مونڈھے پر ساکت بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"بہن! کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ شامدو کہاں ملے گا؟"

پٹھان عورت نے جواب دیا۔

"اس خبیث نے کہاں جانا ہے۔ وہ واپس اپنے ڈیرے پر ہی گیا ہو گا۔" پھر نفرت کے انداز میں اپنی گردن کو جھٹک کر بولی۔ "خدا جانے یہ آدمی کتنی عورتوں کے گھر تباہ کر چکا ہے۔ میں تو اس کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہوں۔" شیر خان نے بڑی مشکل سے اس عورت کو راضی کیا کہ وہ صرف ایک ہزار روپیہ ہی قبول کر لے۔ وہ گاڑی لے کر شامدو کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

صرف شامدو ہی ایک ایسا آدمی تھا جو اسے یہ حقیقت بتا سکتا تھا کہ شہاب اور فیروز عائشہ کو لے کر کس طرف گئے ہیں اور آگے ان کا کیا ارادہ ہے۔ یہ معلوم کیے بغیر شیر خان کا اپنی بچی کی تلاش میں بارڈر پار کر کے افغانستان میں داخل ہونا بے کار تھا۔ پشاور سے اس نے دوسری ٹیکسی لی اور پنڈی والی سڑک پر چل پڑا۔ سورج مغرب کی طرف کافی جھک گیا تھا جب شیر خان جرنیلی سڑک چھوڑ کر اس کچے راستے پر ہو لیا جو کافی آگے جا کر شامدو کے خفیہ ڈیرے تک جاتا تھا۔ شیر خان نے بہت پیچھے ٹیکسی رکوا کر ڈرائیور سے کہا کہ وہ یہاں اس کا انتظار کرے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو شیر خان نے اتنے روپے دیے ہوئے تھے کہ وہ اتنے پیسے ایک مہینے میں بھی نہیں کما سکتا تھا۔ وہ بولا۔

"صاحب میں جب تک آپ نہیں آتے اسی جگہ رہوں گا۔" پستول شیر خان کی واسکٹ کی جیب میں تھا۔ وہ اپنے اندر جذبات کے کھولتے ہوئے لاوے کو بڑی مشکل سے قابو میں کیے شامدو کے ڈیرے کی طرف چلنے لگا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ شامدو کے ڈیرے کی جانب وہ ٹیلے کے عقب سے ہو کر آیا۔ شامدو کے مکان کا چھوٹا سا صحن ویسے ہی ویران ویران سا پڑا تھا عورت بھی وہاں نہیں تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ مکان کے دروازے پر تالا نہیں پڑا تھا۔ کنڈی لٹک رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ شامدو مکان کے اندر ہی تھا۔

شیر خان نے اپنا سیدھا ہاتھ واسکٹ کی جیب میں ڈال کر پستول پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ وہ کچھ دیر اس انتظار میں رہا کہ شاید اندر سے کوئی شخص باہر نکلے۔ اس نے شامدو کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پٹھان عورت میربانی نے اسے شامدو کا حلیہ ضرور بتا دیا تھا۔ جب پندرہ بیس منٹ گزر گئے اور نہ باہر سے کوئی اندر گیا نہ اندر سے کوئی باہر نکلا تو شیر خان نے واسکٹ کی جیب سے ہاتھ باہر کیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر آواز دی۔

"شامدو بھائی، شامدو بھائی۔" تھوڑی دیر بعد ہی دروازہ کھلا اور سامنے ایک آدمی کھڑا شیر خان کو گھور رہا تھا۔ اس کا حلیہ وہی تھا جو نیک دل پٹھان عورت نے اسے شامدو کا حلیہ بتایا تھا۔

"کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو؟"

شامدو نے پوچھا۔ شیر خان نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے سو سو روپے کی ایک گڈی نکال کر کہا۔

"مجھے شامدو بھائی سے ملنا ہے۔ اسی سے ایک ضروری کام ہے۔"

سو سو کے نوٹ دیکھتے ہی شامدو بولا۔

"میں ہی شامدو ہوں۔ اندر آ جاؤ۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ کوٹھری میں چارپائی کے پاس لکڑی کی ایک پرانی سی کرسی پڑی تھی۔ چارپائی پر دری بچھی ہوئی تھی۔ "بیٹھو بھائی کہاں سے آئے ہو؟ کیا کام ہے تمہیں مجھ سے؟" شیر خان کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک جرائم پیشہ آدمی ہے اور نوٹ دیکھ کر یہ سب کچھ بتا دے گا۔ شیر خان نے نوٹوں کی گڈی شامدو کے ہاتھ میں تھما دی اور کہنے لگا۔

"میں تم سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ شہاب اور فیروز عائشہ کو لے کر کہاں گئے ہیں میں عائشہ کا باپ شیر خان ہوں۔"

پہلے تو یہ سنتے ہی شامدو ایک بار اپنی جگہ سے ہل گیا پھر اس نے جلدی سے نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا۔

"معاف کرنا بھائی میں کسی شہاب اور فیروز کو نہیں جانتا تمہیں کسی نے غلط بتا دیا ہے۔" شیر خان نے جیب سے کچھ اور نوٹ نکال کر رقم میں شامل کر دیے اور بڑی نرمی سے بولا۔

"شامدو بھائی! میں ایک بیٹی کا باپ ہوں میری جگہ پر آکر سوچو مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرے دشمن تو صرف شہاب اور فیروز ہیں۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ دونوں بارڈر کراس کر کے کابل سے آگے کس طرف گئے ہیں اور میری بیٹی عائشہ چل پھر کیوں نہیں سکتی؟" شامدو نے نوٹ تکیے کے نیچے رکھ لیے اور کہنے لگا۔

"تمہاری بیٹی کو ان لوگوں نے جو بے ہوشی کی دوائی پلائی تھی اس کا اثر اس کی ٹانگوں پر پڑ گیا ہے۔ وہ سہارے کے بغیر نہیں چل سکتی شہاب اور فیروز تمہاری بیٹی کو واپس کرنے ہی میرے پاس آئے تھے۔ وہ رقم لے کر تمہیں بچی واپس کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر تم پولیس کو ساتھ لے آئے ......" شیر خان نے بات کاٹ کر کہا۔

"میں پولیس کو ساتھ نہیں لایا تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ پولیس کو کیسے پتا چل گیا کہ میں اپنی اغوا شدہ بیٹی کو بدمعاشوں کے چنگل سے چھڑوانے جا رہا ہوں۔ جب پولیس نے فائرنگ شروع کر دی تو میں خود بڑا حیران ہوا کہ یہ پولیس کہاں سے آ گئی ہے۔" شامدو بولا۔

"چاہے کچھ وجہ ہوئی ہو۔ بہر حال پولیس کو دیکھ کر شہاب اور فیروز آگ بگولا ہو گئے۔ وہ تمہیں گالیاں دینے لگے۔ شہاب تو اسی وقت تمہاری بیٹی عائشہ کو قتل کر دینا چاہتا تھا مگر فیروز نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ قتل کرنے سے شیر خان کی فتح ہو گی۔ اسے صبر آ جائے گا۔ ہم شیر خان سے اس کی بدعہدی اور ہمارے ساتھ دھوکہ کرنے کا ایسا انتقام لیں گے جسے اس کی آنے والی نسلیں بھی نہ بھلا سکیں گی۔" شیر خان کا ماتھا خون کی گرمی سے تمتمانے لگا۔ وہ شامدو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے تک رہا تھا۔

"وہ مجھ سے کس بات کا انتقام لینا چاہتے ہیں؟ میں اپنی بیوی کو لے کر لنکا سے خالی ہاتھ چلا تھا۔ میں نے پاکستان میں آکر دن رات محنت کر کے دولت کمائی ہے۔ شہاب اور فیروز مجھے بلیک میل کر رہے تھے۔" شامدو نے سگریٹ سلگا لیا۔ دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"شیر خان! مجھے ان باتوں کا کچھ علم نہیں ہے کہ تمہاری آپس میں کیا دشمنی ہے مجھے

اس بات کا افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے ایک گھناؤنے جرم میں ان لوگوں کا ساتھ دیا لیکن میں بھی مجبور تھا۔ روپے کے لالچ میں نہیں آیا۔ بس فیروز سے پرانی دوستی نبھا رہا تھا۔ بہرحال اب میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں شاید اس طرح سے خدا میرے اس گناہ کو معاف کر دے۔ سنو۔ شہاب اور فیروز تمہاری بیٹی کو کابل سے ترکی یا ایران کی طرف بالکل نہیں لے جا رہے۔ اس طرف جانے کا ان کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ وہ کابل سے عائشہ کو ایک ایسے دور دراز اور خطرناک علاقے میں لے جا رہے ہیں بلکہ اب تک لے جا چکے ہوں گے جس پر آج انڈیا کا قبضہ ہے۔ لیکن جہاں انگریزوں کے زمانے میں خطرناک باغیوں اور خونخوار قاتلوں کو زندگی بھر کے لئے جلا وطن کیا جاتا تھا۔ خطرناک باغیوں میں سیاسی لوگ بھی ہوتے تھے جو انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے بموں کے دھماکے کرتے ٹرینیں الٹ دیتے اور انگریز حاکموں کو قتل بھی کر دیتے تھے۔ انڈیا سے انگریز تو چلا گیا۔ پر انڈیا کی حکومت آج بھی ایسے خطرناک مجرموں کو اس جزیرے میں جلا وطن کر دیتی ہے جو بار بار جیل توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔" شیر خان کے دماغ میں اس جگہ کا تصور آ گیا تھا۔ اس نے شامدو سے پوچھا۔

"تمہارا مطلب کالے پانی سے تو نہیں ہے؟"

"ہاں شہاب اور فیروز اسی جگہ کا ذکر کرتے تھے۔ وہ جب لنکا میں اسمگلنگ کا دھندا کرتے تھے تو اس جگہ اکثر جایا کرتے تھے۔"

شیر خان کو یاد آ گیا کہ فیروز نے لنکا کے جنگل میں سے گزرتے ہوئے ایک بار کالے پانی کا ذکر کیا تھا کہ اگر لنکا میں حالات خراب ہو گئے تو ہم کالے پانی جا کر وہاں اپنا اڈہ بنا لیں گے۔ کالے پانی یعنی جزائر انڈیا کے بارے میں شیر خان نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں ہی بڑی بڑی ہولناک داستانیں سن رکھی تھیں کہ سانپ بچھوؤں قاتل مچھروں اور کسی حد تک آدم خور جنگلیوں کے اس جزیرے میں کس طرح سیاسی اور خطرناک مجرموں کو زندگی بھر کے لئے جلا وطن کر دیا جاتا ہے اور ان میں سے اکثر لوگ جزیرے کے ناموافق پانی، ملیریا والی مرطوب فضا اور زہریلے سانپوں بچھوؤں کے ڈسنے سے مرجاتے تھے۔ جو بچ رہتے وہ زندگی بھر کے لئے مختلف جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے کالا پانی ایک ایسی جگہ تھی کہ اس

کا نام سن کر ہی لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ شامدو کہہ رہا تھا۔

"کالے پانی میں کوئی جگہ جس کا نام فیروز نے کچھ کربخیا کربخیا کر کے بتایا تھا۔ یہاں انڈیا کے شہر کاشی کا ایک بڑا خطرناک اور مشہور بدمعاش رہتا ہے جو کئی خون کر چکا ہے۔ ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اسے پھانسی تو نہ مل سکی مگر انڈیا کی حکومت نے اسے کالے پانی بھیج دیا۔ یہاں وہ عمر قید کی سزا بھگت رہا ہے اس کی شہاب اور فیروز کے ساتھ دوستی ہے اس کا نام فیروز نے کانچورام بتایا تھا۔ یہ لوگ عائشہ کو لے کر کانچورام کے پاس کالے پانی کے جزیرے کربخیا کی طرف ہی گئے ہیں۔ پاکستان سے ہوائی جہاز کے ذریعے انڈیا جانا مشکل تھا چنانچہ وہ کابل چلے گئے جہاں سے انڈیا اور پھر وہاں سے کالے پانی جانے میں انہیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کالے پانی پر بھی انڈیا کا قبضہ ہے۔"

شامدو کی باتیں شیر خان کے کانوں سے تیز آندھی کے شور مچاتے تھپیڑوں کی طرح ٹکرا رہی تھیں۔ مگر وہ بڑے ضبط اور تحمل کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے کالے پانی کی ساری باتیں اپنے ذہن میں نقش کر لی تھیں وہ اٹھا اور کوٹھری سے باہر آ گیا شامدو اس کے پیچھے پیچھے آیا احاطے کی دیوار کے پاس آ کر شامدو نے وہ رقم واپس کرنی چاہی جو شیر خان نے اسے دی تھی۔ شیر خان نے کہا۔

"نہیں شامدو اب اس پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔" اسی رات شیر خان واپس اپنے کوہ مری کے مضافات والے بنگلے میں واپس آ گیا سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اپنی بیوی روبی کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی اور اس کی قبر پر ہاتھ رکھ دیا اس کے ہونٹ اپنے آپ حرکت کرنے لگے۔

"روبی! میں اپنی بیٹی اور شیرنی کی بچی عائشہ کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ اگر اسے واپس نہ لا سکا تو اگلی دنیا میں بھی تجھے اپنا منہ نہ دکھاؤں گا۔" یہ کہہ کر شیر خان روبی کی قبر سے جدا ہو کر اپنے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ وہ رات شیر خان نے جیسے ہو سکا گزار دی۔ دوسرے روز اس نے سری لنکا جانے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ انڈیا کی بجائے لنکا سے ہوتا ہوا کالے پانی کے جزیروں میں پہنچنا چاہتا تھا۔ کرم دین اور اس کی بیوی کو شیر خان نے اصل بات بتا دی کہ وہ عائشہ کی تلاش میں جا رہا ہے باقی پنڈی آفس والوں کو اس نے یہی کہا کہ وہ

کاروباری دورے پر سنگاپور جا رہا ہے۔

دوسری طرف شہاب اور فیروز نے بھی بڑی تیزی سے اپنے سفر کے مراحل طے کیے تھے۔ عائشہ کے بازوؤں اور ٹانگوں پر دوائی کا اثر کم ہو رہا تھا۔ مگر اس نے شہاب اور فیروز پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ابھی تک سہارے کے بغیر چل پھر نہیں سکتی تھی۔ شہاب اور فیروز نے جس عورت کو عائشہ کی دیکھ بھال کے لئے رکھ لیا تھا وہ اب بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ کابل پہنچنے کے بعد انہیں وہاں دو روز قیام کرنا پڑا۔ شہاب اور فیروز سری لنکا کے شہری تھے۔ صرف عائشہ کو ساتھ لے جانے میں تھوڑی سی مشکل پیش آ رہی تھی مگر رشوت نے یہ مشکل بھی حل کر دی۔ عائشہ کا پاسپورٹ بھی بن گیا۔ سری لنکا کا ویزا بھی لگوا لیا گیا۔ تیسرے روز وہ سری لنکا ائرویز کے ایک طیارے میں سوار ہو کر کولمبو کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس دوران عائشہ کو شہاب اور فیروز نے اپنی جیب میں چھپائے ہوئے ریوالور کی زد میں لے رکھا تھا۔ عائشہ کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ اٹھ کر بھاگ سکے۔ اس کا شور مچانا بھی بے سود تھا۔ کیونکہ کابل کے ہوٹل سے ائرپورٹ تک فیروز جیب میں ریوالور چھپائے اس کے سر پر سوار رہا اور ریوالور کی نالی عائشہ کے سر کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ٹکراتی رہی تھی۔

ہوائی جہاز پر سوار ہونے سے پہلے انہوں نے عائشہ کو خواب آور دوا پلا کر نیم بے ہوش کر دیا فیروز نے ایک جعلی ڈاکٹر کا روپ دھار رکھا تھا اور اس کے پاس جعلی سرٹیفکیٹ بھی موجود تھے۔ اور عائشہ پر ایسی نیند طاری ہوئی کہ جب طیارہ کولمبو کے ائرپورٹ پر اترا تو عائشہ وہیل چیئر پر گردن ایک طرف ڈھلکائے گہری نیند سو رہی تھی۔ ائرپورٹ سے وہ عائشہ کو لے کر اپنے خفیہ ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ کولمبو شہاب اور فیروز کا اپنا شہر تھا۔ اس شہر میں ان کے کئی ٹھکانے تھے مگر وہ اپنے گینگ کے آدمیوں کو اس واردات سے بے خبر رکھنا چاہتے تھے۔ جہاں وہ عائشہ کو لے کر گئے وہ جگہ شہر سے شمال مشرق کی جانب ایک پہاڑی علاقے میں واقع تھی۔ رات کو عائشہ جاگ پڑی۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والی عورت نے اسے شوربہ اور ڈبل روٹی کھانے کو دی جسے عائشہ نے زہر مار کر لیا اس نے عورت سے پوچھا۔

"ہم کولمبو پہنچ گئے کیا؟" عورت نے کوئی جواب نہ دیا اس کی ڈیوٹی میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ عائشہ کے کسی غیر ضروری سوال کا جواب نہیں دے گی۔

شہاب اور فیروز بڑے مطمئن تھے کہ وہ شیر خان کی بیٹی کو پاکستان سے نکال کر اپنے علاقے میں لے آئے ہیں۔ اب وہ دونوں کالے پانی کے جزائر کی طرف چلنے کی تیاریاں کرنے لگے شہاب کی رائے یہ تھی کہ لڑکی کو بذریعہ بحری جہاز کولمبو سے جزائر انڈیمان یعنی کالے پانی لے جایا جائے۔ وہ کہنے لگا۔

"ہم اسے ہوائی جہاز میں لانے کا خطرہ ایک بار مول لے چکے ہیں۔" فیروز نے کہا۔

"یہ خطرہ تو پھر بحری جہاز میں بھی موجود رہے گا۔"

شہاب بولا۔ "مگر بحری جہاز میں ہم ایک الگ کیبن بھی تو لے سکیں گے جہاں وہ ہماری چوبیس گھنٹے نگرانی میں رہے گی۔"

فیروز نے کہا۔

"ہوائی جہاز کا یہ فائدہ ہے کہ ہم اپنی منزل پر جلدی پہنچ جائیں گے۔ بحری جہاز تو ڈیڑھ دن لگا دے گا۔" آخر یہی طے پایا کہ عائشہ کو بذریعہ ہوائی جہاز ہی انڈیمان لے جایا جائے۔ فیروز نے عائشہ کو اپنی بھانجی ظاہر کیا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے عائشہ کے پاسپورٹ پر بھی کولمبو کے بھارتی قونصل جنرل کے دفتر سے انڈیمان کا ویزا لگوالیا۔ انہیں یہ بتایا کہ اس کی بھانجی شدید بیمار ہے اور وہ اسے اس کی والدہ کے پاس لے کر جا رہے ہیں جو انڈیمان میں رہتی ہے۔ کولمبو میں ویسے بھی شہاب اور فیروز کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ اسے ویزہ لگوانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ انہوں نے احتیاطاً یہ ضرور کیا کہ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے اپنے ایک خاص ڈاکٹر سے عائشہ کو بے ہوشی کا انجکشن لگوا دیا۔ اسے یہ بتایا گیا کہ گلوکوز کا انجکشن دیا جا رہا ہے۔ عائشہ سب جانتی تھی مگر وہ بے بس تھی۔ اس کے بازو اور

ٹانگیں ابھی اس قابل نہیں تھیں کہ اس کا ساتھ دے سکتیں۔

عائشہ کو بے ہوشی کی حالت میں ہی کولمبو سے جزائر انڈیمان کی طرف پرواز کرنے والے طیارے پر سوار کرایا گیا۔ وہ معذوروں والی وہیل چیئر پر تھی۔ اور جب طیارہ انڈیمان کے سب سے بڑے جزیرے اور ایک طرح سے انڈیمان کے انڈین دارالحکومت پورٹ بلیئر کے ائرپورٹ پر اتر گیا تو عائشہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اب اس کی دیکھ بھال کرنے والی عورت ساتھ نہیں تھی۔ شہاب اور فیروز نے اسے کولمبو ہی سے واپس بھجوا دیا تھا۔

جزائر انڈیمان لگ بھگ ایک ہزار جزیروں پر مشتمل ہے۔ شمالاً جنوباً ان جزائر کی لمبائی کوئی ایک سو میل ہو گی۔ ان میں کچھ بڑے جزیرے بھی ہیں جہاں شہری آبادی ہے۔ باقی جزیروں میں یہاں کی بونی مخلوق رہتی ہے۔ ان جنگلیوں کے رنگ سیاہ کالے قد چھوٹے اور بال حبشیوں کی طرح گھنگریالے ہوتے ہیں۔ جو جزیرے شہری آبادی والے جزیرے کے قریب ہیں وہاں یہ جنگلی لوگ کسی کو کچھ نہیں کہتے مگر جو جزیرے چھوٹے اور سمندر میں دور دور واقع ہیں۔

وہاں ایک روایت کے مطابق آج بھی آدم خور جنگلی قبیلے آباد ہیں اور بھولے بھٹکے مسافر کو پکڑ کر بھون کر کھا جاتے ہیں۔ یہاں آتش فشاں پہاڑ بھی ہیں جس میں سے اکثر دھواں اور شعلے نکلتے رہتے ہیں۔ یہاں کوئی ندی نہر نہیں ہے۔ میٹھا پانی حاصل کرنے کے لئے کنوئیں کھودے جاتے ہیں اسے کالا پانی اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ان جزائر کے ارد گرد جو سمندر میلوں تک پھیلا ہوا ہے اس کا پانی کالا ہے۔ یہ سیاہی پانی میں سمندر کی گہرائی کی وجہ سے نظر آتی ہے جب کہ حقیقت میں پانی کو چلو میں بھریں تو وہ شفاف ہو گا۔ یہاں انگریزوں نے ایک بہت بڑا جیل خانہ بنوایا تھا۔ جہاں ان قیدیوں کو بند کیا جاتا جو کالے پانی کے جزیرے میں پہنچنے کے بعد کوئی جرم کرتے تھے۔ ورنہ سارے کا سارا جزیرہ یا جزائر ایک کھلا جیل خانہ تھا۔ قیدیوں کو یہاں کام کر کے پیسہ کمانے اور شادی کرنے کی اجازت تھی۔ مگر وہ ان جزیروں سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ انہیں ساری عمر وہیں بسر کرنی ہوتی تھی۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بھارت نے ان جزیروں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اب ان

جزیروں پر انڈیمان کی حکمرانی ہے اور اب انڈیمان کے عمر قید کی سزا پانے والے خطرناک قیدیوں کو کالے پانی کی جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔

فیروز اور شہاب کا ہندو قاتل دوست کانچورام جزائر انڈیمان کے شمال کی جانب واقع ایک جزیرے سینٹل میں رہتا تھا۔ جنوب کی طرف جو جزائر تھے انہیں نکوبار آئی لینڈ کہا جاتا تھا۔ شہاب اور فیروز یہاں اپنے جرائم پیشہ قاتل ساتھی کانچورام سے ملنے ایک سے زیادہ مرتبہ آ چکے تھے۔ انہوں نے کولمبو سے روانہ ہوتے ہوئے کانچورام کو ٹیلی گرام دے دیا تھا چنانچہ وہ پورٹ بلیئر کے ہوائی اڈے پر اترے تو کانچورام کا آدمی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ شہاب اور فیروز کو جانتا تھا۔ یہاں سے عائشہ کو ٹیکسی میں ڈال کر بندرگاہ کی طرف لے جایا گیا وہاں یہ ایک چھوٹے سے اسٹیمر میں بیٹھ کر ایک گھنٹے کا سمندری سفر طے کرنے کے بعد جزیرہ سینٹل پہنچ گئے جہاں کانچورام کا خاص ڈرائیور ایک پرانی سی جیپ لے کر انہیں لینے آیا ہوا تھا۔

یہ جو کانچورام تھا اس نے جزیرے کے ہندو مدراسی کمشنر اور وہاں کی پولیس کے ساتھ مل کر اپنی ایک الگ حکومت بنا رکھی تھی۔ کہنے کو تو وہ عمر قید کا قیدی تھا مگر جزیرے میں کسی راجہ کی طرح رہتا تھا۔ انگریز کے زمانے میں وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا مگر انگریز چلا گیا۔ جزائر انڈیمان پر انڈیا نے قبضہ کر لیا اور وہاں بھی بھارت کے دوسرے علاقوں کی طرح بدعنوانیوں اور رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا۔

کانچورام اس جزیرے کا سب سے بڑا بدمعاش اور اسمگلر تھا۔ پولیس افسروں اور مدراسی کمشنر کو گھر بیٹھے ہر ماہ بھاری رقم مل جاتی تھی چنانچہ کانچورام کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ وہ درمیانے قد مگر گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ عمر پچاس کے قریب تھی۔ سر درمیان سے گنجا تھا۔ کنپٹیوں پر سفید بال نظر آتے تھے۔ ماتھے پر ہمیشہ تلک لگا کر رکھتا اور پوجا پاٹ بھی باقاعدگی سے کرتا۔ اس کی عمل داری میں جزیرے کے مقامی انڈین قیدی بدمعاشوں کا ایک پورا گینگ تھا۔ یہ سب قاتل تھے جو کالے پانی میں عمر قید کی سزا بھگت رہے تھے۔ کانچورام نے اپنے واسطے آبادی سے تھوڑے فاصلے پر بانس اور تاڑ کے درختوں کے درمیان اپنا ایک الگ مکان بنوا رکھا تھا۔ اپنے مکان سے وہ بگھی میں سوار ہو

کر نکلتا۔ جزیرے کی آبادی کا چکر لگاتا۔ لوگ جھک جھک کر اسے سلام کرتے۔ وہ کبھی کمشنر اور کبھی ہندو انسپکٹر پولیس کے بنگلوں میں جا کر انہیں تحفے تحائف پیش کرتا۔ جزیرے کے لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بدمعاش کانچورام کو کمشنر اور پولیس کا تحفظ حاصل ہے اور اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔

سارے جزیرے میں کانچورام کے ڈیرے کی کشید کی ہوئی دیسی شراب بکتی تھی۔ اس کے پاس تھائی لینڈ سے اسمگلنگ کا مال بھی آتا تھا جسے وہ آگے انڈیمان اور لنکا میں سپلائی کرتا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی مگر گھر میں دو انڈیمانی لڑکیاں ڈال رکھی تھیں جن کے غریب ماں باپ کو وہ ہر ماہ ایک خاص رقم بھیج دیتا تھا۔ اس کے علاوہ جزیرے میں اگر کوئی لڑکی اسے پسند آجاتی تو وہ اسے راتوں رات غائب کروا کر اپنے خفیہ اڈے پر پہنچا دیتا تھا۔

شہاب اور فیروز کو لینے کے واسطے کانچورام نے اپنی بگھی بھجوا دی تھی۔ جب بگھی کانچورام کے مکان کے احاطے میں آکر رکی تو عائشہ کی جوانی اور حسن کو دیکھ کر کانچورام کے سینے میں ہوس کی آگ بھڑکنے لگی۔ وہ شہاب اور فیروز سے گلے لگ کر ملا فیروز سے دبی زبان میں پوچھا لڑکی کو وہیل چیئر پر کیوں لائے ہو؟ فیروز نے کہا۔

''اس کا نچلا دھڑ سن ہو گیا ہے فکر نہ کرو کچھ دنوں میں لڑکی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔'' پھر اسے آنکھ ماری اور شہاب کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ''شہابو اس رانی کو کمرے میں لے جا کر لٹا دو۔'' عائشہ کو وہیل چیئر میں ایک سجے سجائے کمرے میں لے جایا گیا جہاں مسہری لگی تھی۔ ریشمی گاؤ تکیے پڑے تھے۔ کھڑکیوں کے ریشمی پردوں میں سے دن کی روشنی چھن چھن کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ کانچورام کی دونوں انڈیمانی داشتائیں عائشہ کو حیرت اور رقابت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھ رہی تھیں۔ وہ کالی تھیں جب کہ ان کے مقابلے میں عائشہ کا رنگ گورا اور بال سنہری تھے اور وہ کوئی مہارانی لگ رہی تھی۔

دوسرے کمرے کے آگے لکڑی کے فرش والے برآمدے میں بانس کی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے شہاب فیروز اور کانچورام ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کے درمیان میز پر شراب کی بوتل کھلی ہوئی تھی۔ کانچورام نے فیروز کو آنکھ ماری اور شیطانی مسکراہٹ

کے ساتھ کہا۔

''مال اچھا ہے کہاں سے مارا ہے؟'' شہاب اور فیروز نے کانچو کو بالکل نہیں بتایا کہ یہ ان کے اسمگلر ساتھی شیر خان کی بیٹی ہے۔ فیروز کہنے لگا۔

''یار تمہیں اس سے کیا بس سمجھ لو۔ کہیں سے اڑا لائے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ کتنی رقم دو گے؟'' کانچو رام ہنس پڑا۔ سگریٹ کو گھاس پر پھینکا اور بولا۔

''تم میرے پرانے یار ہو۔ جو مانگو دے دوں گا۔''

شہاب کہنے لگا۔

''بس ایک بات کا خیال رکھنا کانچو کہ یہ لڑکی یہاں سے باہر نہ نکلنے پائے ورنہ پھر کوئی ہرج مرج ہو گیا تو ہم ذمے دار نہیں ہوں گے۔'' کانچورام نے شراب کا ہلکا سا گھونٹ لینے کے بعد گردن کو ذرا ٹیڑھا کر کے شہاب کی طرف دیکھا اور بولا۔

''شہابو! یہ تم مجھے کہہ رہے ہو؟ میرے ڈیرے پر جو لڑکی ایک بار آجاتی ہے پھر اس کی آتما بھی مرنے کے بعد میرے ڈیرے میں ہی رہتی ہے۔'' شہاب ہنس دیا۔ فیروز نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''بس ٹھیک ہے باقی اب یہ تمہارا مال ہے اس کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔ ہم کل واپس کولمبو چلے جائیں گے۔'' دوسرے دن شہاب اور فیروز واپس چل دیے اب عائشہ کالے پانی کے ایک چھٹے ہوئے ہندو بدمعاش اور قاتل کے قبضے میں تھی۔ کانچورام کو یہ بالکل نہیں بتایا گیا تھا کہ عائشہ ایک بہادر انسان کی دلیر لڑکی ہے اور دو بدمعاشوں کو پستول سے بھون چکی ہے۔ وہ عائشہ کو ایک عام کمزور اور نازک سی لڑکی سمجھ رہا تھا جو کہیں سے اغوا ہوئی تھی اور پھر مختلف ہاتھوں میں بکتی بکاتی شہاب اور فیروز کے ہتھے چڑھ گئی اور وہ اسے ایک معقول رقم کے عوض اس کے پاس فروخت کر گئے ہیں پہلی ہی رات وہ عائشہ کے پلنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا۔

''تمہارا نام مجھے شہابو نے عیشہ بتایا ہے۔ خیر تم ایسی عورتوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہیں پچاس ہزار روپوں میں خرید لیا ہے۔ اب تم میری داسی ہو۔ تمہیں میرے اشاروں پر چلنا ہو گا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تم کالے پانی

میں یہاں کے سب سے طاقتور بدمعاش کانچورام کے رجواڑے میں ہو۔ میں کانچورام اس جزیرے کا مالک ہوں۔ یہ میرا رجواڑہ ہے اور میں یہاں کا راجہ ہوں۔ تم میرے مکان سے بھاگ بھی جاؤ گی تو اس جزیرے سے باہر نہ نکل سکو گی۔ جزیرے کے چاروں طرف کالا سمندر ہے میرے آدمی اور میری تنخواہ دار پولیس جہاں کہیں بھی تم چھپی ہوئی ہو گی پکڑ کر میرے پاس لے آئے گی۔ پھر میں تمہارا جو حشر کروں گا اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔" پھر اس نے اپنا ہاتھ عائشہ کی گردن کی ایک جانب رکھ دیا۔ عائشہ نے اسی لمحے دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے کانچورام کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا اور بڑے محبت بھرے انداز میں کہا۔

"میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسا بہادر مرد مل گیا۔ ورنہ مجھے تو کسی نہ کسی کے پاس بکنا ہی تھا۔ لیکن ان لوگوں نے مجھے بے ہوش کرنے کے لئے کوئی ایسی دوائی پلا دی کہ جس کا اثر ابھی تک باقی ہے۔ میرا نچلا دھڑ بے حس ہو چکا ہے۔ سہارے کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتی۔ تھوڑا انتظار کر لو۔ میں تو تمہاری داسی ہوں ساری زندگی تمہارے پاس ہی رہنا ہے اب تو۔"

کانچورام سے اس قسم کی محبت بھری باتیں پہلے کسی عورت نے نہیں کی تھیں۔ انڈیمانی لڑکیاں ہندوستانی ضرور بول لیتی تھیں مگر وہ محبت کی باتیں اتنی اچھی اردو زبان میں نہیں کر سکتی تھیں۔ کانچورام کو اپنے آبائی شہر کاشی کی اردو یاد آ گئی۔ اس نے عائشہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میری رام پیاری میں یہاں کے سب سے بڑے ڈاکٹر سے تمہارا علاج کراؤں گا۔ تم دنوں میں اچھی ہو جاؤ گی۔"

پھر اس نے عائشہ سے باتیں شروع کر دیں اور پوچھنے لگا کہ وہ کون ہے اور پہلی بار کیسے گھر سے بھاگی یا اغوا ہوئی؟ عائشہ کے ذہن میں ایک پورا منصوبہ مرتب ہو چکا تھا۔ اسے یہ تو ابھی علم نہیں تھا کہ وہ اس کالے پانی سے کیسے فرار ہو سکے گی لیکن اس کے سینے میں جو یقین کا بے پایاں جذبہ اس کے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ دھڑک رہا تھا وہ اسے ہر سانس کے ساتھ یقین دلا رہا تھا کہ عائشہ تم یہاں سے ایک دن نکل جاؤ گی۔ اس نے یونہی ایک

جھوٹی کہانی گھڑ کر سنا دی کہ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ ایک لڑکے کی محبت میں وہ گھر سے نکل بھاگی لڑکا دغا دے گیا۔ پھر وہ بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ گئی اور مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی شہاب اور فیروز کے پاس پہنچ گئی۔ کانچورام نے عائشہ کا ہاتھ دبایا اس کے چہرے پر ہوس کی لہریں اٹھ آئیں کہنے لگا۔

"میری بڑی حسرت تھی کہ کسی پنجابی مسلمان لڑکی کو اپنی داسی بناؤں۔ بھگوان نے میری یہ آرزو بھی پوری کر دی۔"

عائشہ کی آنکھیں میں چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ مگر اس نے بڑی ہمت کر کے چہرے پر مسکراہٹ طاری کی اور کہا۔

"اب تو تم میرے بھگوان ہو۔ جیسے کہو گے ویسے رہوں گی۔"

پھر باتوں ہی باتوں میں عائشہ نے کانچو رام سے پوچھا کہ یہ شہاب اور فیروز کالے پانی سے کس طرف گئے ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ کانچو رام کہنے لگا۔

"اری اب تمہارا ان لوگوں سے کیا سروکار؟ چاہے وہ جہاں چلے گئے ہوں۔" مگر عائشہ ہر حالت میں ان کا اتا پتا معلوم کرنا چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں تو اس ڈر کے مارے پوچھ رہی ہو کہ کہیں یہ دونوں حرامی پھر مجھے یہاں سے اغوا کر کے نہ لے جائیں۔"

اس پر کانچورام قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"اری میری رام پیاری۔ ان گیدڑوں میں یہ ہمت کہاں کہ شیر کا مال اٹھا کر لے جائیں۔ اور پھر وہ دونوں حرامی لنکا واپس چلے گئے ہیں۔" عائشہ کو صرف اتنی ہی معلومات چاہیے تھیں۔ باقی یہ دونوں بدکار آدمی لنکا میں کیا دھندا کرتے تھے اس کے متعلق عائشہ کے باپ شیر خان نے اسے سب کچھ بتا دیا ہوا تھا۔ شیر خان نے تو اپنی شیرنی بیٹی کو اپنی زندگی کی ساری کہانی سنا رکھی تھی اور بتایا تھا کہ وہ اور اس کی ماں روبی نوجوانی کے زمانے میں سری لنکا کے شمال میں جافنا کے جنگلوں میں اسمگلنگ کا دھندا کیا کرتے تھے۔

کانچورام تھوڑی دیر عائشہ کے پاس پلنگ پر بیٹھا باتیں کرتا رہا پھر یہ کہہ کر کہ وہ ڈاکٹر سے بات کرنے جا رہا ہے چلا گیا۔ عائشہ کی جسمانی حالت یہ تھی کہ اس کے دونوں بازو پوری

طرح صحت یاب ہو چکے تھے۔ ٹانگوں کی بے حسی بھی بہت حد تک دور ہو چکی تھی۔ مگر ابھی وہ اپنے پاؤں پر پورا بوجھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ ایک نوکرانی کے سہارے غسل خانے تک آتی جاتی۔ یہ نوکرانی ادھیڑ عمر کی کالی کلوٹی عورت تھی اور کالے پانی ہی کی رہنے والی تھی۔ اسے اس جزیرے کی انگریزوں کے زمانے سے لے کر اب تک کی ساری ہسٹری معلوم تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جزائر انڈیمان کا محل وقوع کیا ہے اور یہ کہ یہاں جو قیدی آتا ہے پھر اسی جزیرے میں مر کر دفن ہوتا ہے۔ یہاں سے کبھی کوئی فرار نہیں ہو سکا تھا۔ ارد گرد سینکڑوں میل کا کالا سیاہ سمندر تھا۔ اس کے باوجود عائشہ ذہن میں فرار کے منصوبے سوچتی رہتی تھی۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ کانچو رام ایک ڈاکٹر کو لے کر آگیا۔ یہ ایک سکھ ڈاکٹر تھا جس کی داڑھی مونچھوں کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے گلے میں اسٹیتھوسکوپ لٹکی ہوئی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں کالا بیگ تھا۔ عائشہ حسب معمول پلنگ پر ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ کانچو رام نے ڈاکٹر سے کہا۔

"یہ ہے جی میری رام پیاری۔ بس اسے دو چار دن میں ٹھیک کر دو۔" سکھ ڈاکٹر نے عائشہ کی ٹانگوں سے چادر ہٹائی اور اس کے پیر کے انگوٹھے کو دبانے لگا۔ دوسرے پیر کے انگوٹھے کو دبایا۔ اور عائشہ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"کچھ محسوس ہوتا ہے؟" عائشہ نے ڈاکٹر کی انگلیوں کے دباؤ کو برابر محسوس کیا تھا۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ "کچھ محسوس نہیں ہوا۔" سکھ ڈاکٹر عائشہ کی پنڈلیوں کو دو انگلیوں سے دبانے لگا۔

"اب کچھ محسوس ہوا؟"

"نہیں۔" عائشہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے چادر دوبارہ ڈال دی۔ کرسی پر بیٹھ گیا اور کانچو رام سے کہنے لگا

"بھائیا جی! لگتا ہے اس کی دونوں ٹانگوں پر فالج گر چکا ہے۔ مجھے یہ بات مریض کے سامنے نہیں کہنی چاہیئے تھی مگر میں تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں۔" کانچو رام ڈاکٹر کا منہ تکنے لگا۔

"کیا یہ لڑکی اب ٹھیک نہیں ہو گی۔ میری ساری رقم ڈوب جائے گی؟" سکھ ڈاکٹر نے بیگ میں سے پیڈ نکالا اور پنسل سے اس پر لکھتے ہوئے بولا۔

"مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔ میں دوائی لکھے دیتا ہوں۔ اسے باقاعدہ دوائی دیتے رہو۔ میں بھی روز آکر دیکھ جایا کروں گا۔ واہگورو کی کرپا سے یہ اچھی ہو جائے گی کانچو رام جی۔" کانچو رام نے ایک دم ادھیڑ عمر سکھ ڈاکٹر کو گردن سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ ڈاکٹر بے چارہ کرسی پر سے پیچھے کی طرف قالین پر گر پڑا۔ کانچو رام نے ڈاکٹر کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور دو تین جھٹکے دے کر دانت پیستے ہوئے بولا۔

"تمہارے واہگورو نے نہیں، تم نے اسے ٹھیک کرنا ہے۔ کیا سمجھے ہو؟" ادھیڑ عمر کے سکھ ڈاکٹر کی عینک نیچے گر پڑی تھی۔ نسواری رنگ کی پگڑی اپنی جگہ سے ہل گئی تھی۔ وہ خوف زدہ تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج میں اسے ٹھیک کر دوں گا مجھے معاف کر دو۔ غلطی ہو گئی۔"

عائشہ بستر پر نیم دراز یہ سارا ڈراما دیکھ رہی تھی۔ اسے سکھ ڈاکٹر پر رحم آرہا تھا۔ کانچو رام کی دہشت اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر دوبارہ نسخہ لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے کپکپاتی ہوئی انگلیوں سے نسخہ لکھ کر عائشہ کو دیا اور کہا۔

"بیٹی یہ دوا بڑی دکان سے منگوا کر صبح شام کھانا۔ میں کل اسی وقت آکر تمہیں دیکھ جاؤں گا۔"

کانچو رام اس کے سر پر کھڑا تھا۔ سکھ ڈاکٹر نے بیگ اٹھایا کانچو کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا اور عاجزی سے قدم اٹھاتا کمرے سے نکل گیا۔ کانچو نے فاتحانہ انداز سے عائشہ کی طرف دیکھا۔

"ان لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کروں تو کبھی ٹھیک طرح سے کام نہ کریں۔"

پھر جھک کر عائشہ کے گال کو انگلیوں میں لے کر زور سے دبایا۔ عائشہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی مگر وہ بستر پر ہی لیٹی رہی۔ وہ مجبور تھی کانچو رام یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔

"جلدی ٹھیک ہو جاؤ نہیں تو تمہیں جنگلی کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

عائشہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ دوسرے روز دوپہر کے بعد سکھ ڈاکٹر آیا تو کانچو

رام اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر آتے ہی کرسی کھینچ کر عائشہ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی نبض دیکھی۔ پھر چادر ہٹا کر پاؤں کے انگوٹھوں کو دبایا اور پوچھا۔

"دوائی لی تھی؟" عائشہ کو کانچو رام نے اپنی نگرانی میں دونوں وقت دوائی کے کیپسول کھلائے تھے۔ ڈاکٹر جانے لگا تو کانچو رام بھی شراب کے نشے میں جھومتا ہوا آیا۔ آتے ہی سکھ ڈاکٹر کو گردن سے پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دے کر پوچھا۔

"کیوں بے ڈاکٹر! کب ٹھیک ہوں گی اس رام پیاری کی ٹانگیں؟"

مرنجان مرنج سکھ ڈاکٹر نے خوشامدانہ انداز میں مسکراتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! پہلے دن ہی دوائی کا اثر شروع ہو گیا ہے۔ تھوڑی مہلت دیں۔"

اگلے روز سکھ ڈاکٹر اور عائشہ کمرے میں اکیلے تھے۔ ڈاکٹر نے عائشہ کی پنڈلیوں کو انگلی سے دو تین بار دبانے کے بعد کپڑا ڈالا اور کرسی قریب کرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

"بیٹی! میرا حساب کہتا ہے کہ تمہاری ٹانگیں ٹھیک ہیں۔ تم کیا کہتی ہو؟"

عائشہ ڈاکٹر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ عائشہ کی آنکھوں کی مقناطیسی چمک کو سکھ ڈاکٹر نے بھی محسوس کیا بولا۔

"بیٹی! میں جانتا ہوں تو کسی غیرت والے مسلمان مرد کی اولاد ہے۔ اور تقدیر نے تمہیں اس حال تک پہنچا دیا ہے۔ کانچو رام بڑا خونی آدمی ہے یہاں اسی کا حکم چلتا ہے۔ جس کو چاہے قتل کروا دے۔ اس نے مجھے تمہارا نام رام پیاری بتایا ہے۔ مگر تم مجھے کسی مسلمان کی بچی لگتی ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟"

عائشہ کے دل میں امید کی ایک کرن چمک اٹھی۔ کالے پانی کے عذاب سے نکلنے کے لئے اس نیک دل سکھ ڈاکٹر سے مدد لی جا سکتی تھی۔ مگر بے حد احتیاط کی ضرورت بھی تھی۔ ذرا سی غفلت اسے ساری زندگی کے لئے جہنم میں دھکیل سکتی تھی۔ اس نے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر جی! میں مسلمان ہوں۔ ہمارا گھر راولپنڈی کے پاس مری روڈ پر تھا۔"

یہ سن کر فرط جذبات سے سکھ ڈاکٹر کی آواز بھرا گئی۔ وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"راولپنڈی؟ میں قربان جاؤں راولپنڈی کے۔ میں بھی گوجر خان کا رہنے والا ہوں۔

وہیں پیدا ہوا تھا۔" اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے پھر جلدی سے رومال کوٹ کی جیب سے نکال کر عینک اوپر کر کے آنکھیں صاف کیں۔ ایک بار پیچھے گھوم کر دیکھا اور بولا۔

"بیٹی! میں مجبور ہوں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ پوتے پوتیوں والا ہوں۔ کانچو رام بڑا ظالم آدمی ہے۔ یہ میرے سارے خاندان کو قتل کروا دے گا۔ اچھا کل آؤں گا جاتا ہوں۔"

"عائشہ کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ سکھ ڈاکٹر اس کی ضرور مدد کرے گا۔ کم از کم اتنی ضرور مدد کرے گا کہ اسے کانچو رام کی قید سے نکال دے۔ اگلے روز سکھ ڈاکٹر نے دوائی بدل دی۔ عائشہ نے نئے کیپسول کھائے تو کانچو رام پلنگ پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"کانچو رام جی! لڑکی ٹھیک ہو رہی ہے۔ اس کے پاؤں میں جان پڑ گئی ہے۔"

کانچو رام اٹھ کھڑا ہوا۔ عائشہ کے گال پر ہاتھ پھیرنے لگا تو عائشہ نے بے اختیار سی ہو کر اس کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ کانچو رام نے فوراً ہی عائشہ کے منہ پر الٹے ہاتھ سے تھپڑ مار دیا۔ عائشہ کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ سکھ ڈاکٹر پیچھے ہٹ گیا۔ کانچو نے عائشہ کی گردن کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا اور دبانے لگا۔ عائشہ کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ کانچو رام وحشی ہو گیا تھا۔ پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ ہاتھ عائشہ کی گردن سے الگ کیے اور اسے گالی دے کر کہنے لگا۔

"اپنے پچاس ہزار روپے کھرے کر کے تجھے مار دوں گا مسلمان کی اولاد مسلمانوں کا تو میں جانی دشمن ہوں۔"

سکھ ڈاکٹر سہما ہوا ایک طرف ہو کر کھڑا تھا۔ اسے بھی کانچو نے ایک موٹی سی گالی دی اور دھمکی دے کر کہا۔

"سن لے تو بھی۔ ایک ہفتے میں اس کی ٹانگیں ٹھیک نہ ہوئیں تو میں تیری پوتی اٹھا کر لے آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ غصے میں بھرا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد عائشہ نے سکھ ڈاکٹر کو بتایا کہ اس کی ٹانگیں بہت پہلے سے ٹھیک ہو چکی ہیں مگر وہ کانچو رام کو اس لئے نہیں بتا رہی تھی کہ پھر اس کی عزت ان بدمعاشوں کے ہاتھوں غیر محفوظ ہو جائے

گی۔ سکھ ڈاکٹر کو عائشہ سے بڑی ہمدردی ہو گئی تھی۔ اگرچہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا مگر اس کی تکلیف بھی ڈاکٹر سے دیکھی نہیں جاتی تھی وہ عائشہ کو انجکشن لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم یہ بات کب تک چھپاؤ گی بیٹی! یہ درندے تمہیں اب زیادہ دن تک معاف نہیں کریں گے۔ خود تمہارے سامنے اس نے مجھے بھی دھمکی دی ہے کہ اگر تم جلدی ٹھیک نہ ہوئیں تو وہ میری پوتی کو اٹھوا...... لے گا۔" عائشہ نے بڑے تحمل سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو ڈاکٹر میں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچنے دوں گی۔" سکھ ڈاکٹر بیگ بند کرتے ہوئے بولا۔

"میں رات کو پھر آؤں گا۔ اس وقت تمہیں تھوڑا چلا کر چیک کروں گا کہ تم کہاں تک ٹھیک ہو چکی ہو۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ عائشہ خادمہ کے سہارے باتھ روم گئی تو اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اس نے دونوں پاؤں پر زور ڈالا۔ اس کی ٹانگیں بالکل ٹھیک ہو چکی تھیں۔ وہ بخوبی چل پھر سکتی تھی۔ اس کے بازوؤں میں بھی تازہ گرم خون گردش کرتا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی صحت یابی کو اب زیادہ دیر تک بدمعاش کانچورام سے چھپا کر نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ شخص اس کو بے آبرو کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ عائشہ کے لئے اب وہاں سے فرار ہونا ناگزیر ہو گیا تھا۔ وہ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ یہاں سے بھاگ کر جائے کہاں؟ تھوڑی سی امید اسے سکھ ڈاکٹر پر تھی جس کا رویہ ہمدردانہ اور مشفقانہ تھا مگر وہ بھی اپنے بچوں کی وجہ سے کانچورام سے خوف زدہ تھا۔

اس روز شام کے وقت جزیرے پر بادل چھا گئے اور بارش شروع ہو گئی۔ خادمہ عائشہ کو چائے اور دو سیب دے کر چلی گئی تھی۔ اس دوران کانچورام نے ایک بار عائشہ کے بیڈ روم میں آکر اسے بتایا تھا کہ وہ اب زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ آج رات شراب کے نشے میں دھت ہو کر عائشہ کے بیڈ روم میں ضرور آئے گا۔ عائشہ بستر پر نیم دراز سیب چھیلنے لگی۔ اس نے چھری کو غور سے دیکھا۔ یہ ہاتھی دانت کے دستے والی چھری تھی اور اس کا پھل کافی مضبوط اور چوڑا تھا۔ اگرچہ دھار زیادہ تیز نہیں تھی۔ عائشہ نے سیب کو چھیلنے اور کاٹنے کے بعد چھری اپنے تکیے کے نیچے چھپا کر رکھ لی۔ یہی وہ اکیلا ہتھیار تھا جو اس کے کام آسکتا تھا۔ خادمہ برتن لینے آئی تو اسے یہ خیال ہی نہ آیا کہ طشت میں چھری نہیں ہے۔ وہ برتن لے کر چلی گئی۔ اس وقت باہر بارش ہو رہی تھی جس کی آواز کھڑکی میں سے سنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی پر گرے ہوئے ریشمی پردے ہوا میں لہرانے لگے تھے۔ باہر برآمدے کے کونے کی جانب سے عائشہ کو کانچورام کے قہقہوں اور اپنے گینگ کے ساتھیوں سے ہنسی مذاق کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ لوگ شراب پی رہے تھے۔ عائشہ کو یہ خیال بھی تھا کہ سکھ ڈاکٹر بھی رات کو آنے کے لیے کہہ گیا ہے۔ شام کے بعد رات کا اندھیرا باہر گہرا ہو گیا تھا۔ برآمدے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی آہستہ آہستہ برآمدے میں بیٹھے بدمعاشوں کی آوازیں بھی کم ہوتی گئیں۔ پھر اسے کانچورام کی آواز سنائی دی۔ اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر اپنے کسی ساتھی کو گالی دے کر اونچی آواز میں کہا۔

"جاؤ اپنی اپنی ماؤں کے پاس۔ ادھر اب کوئی نہ آئے۔" عائشہ سنبھل گئی۔ کانچورام کے ساتھی چلے گئے تھے اور یہ بدمعاش شراب پی کر اب اسی کے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ عائشہ اسے قتل کر دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کا ذہن بڑی تیزی اور پوری ہوشمندی کے ساتھ صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا اور وہ بات یہ تھی کہ سیب اور ترکاری کاٹنے والی چھری کا وار وہ کس طرف سے کرے کہ ایک ہی وار کاری ثابت ہو اور کانچورام دوسرا سانس بھی نہ لے سکے اور شور بھی نہ مچا سکے۔ کانچو کسی بدمست بھینسے کی طرح جھومتا ہوا چلا آرہا تھا۔ دروازے کو بند کر کے اس نے کنڈی نہیں لگائی تھی اسے کنڈی لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں کسی کی جرات نہیں تھی کہ اندر داخل ہو سکے۔ چھری عائشہ کے تکیے کے نیچے پڑی تھی۔ وہ عائشہ کے بستر کے پاس آکر رک گیا۔ اس کی آنکھیں شراب کے نشے میں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک ہاتھ سے عائشہ کے اوپر پڑی ہوئی چادر پرے پھینک دی۔

"میری رام پیاری آج میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔" نشے کی وجہ سے وہ اپنے پاؤں پر آگے پیچھے جھوم رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کانچورام بھوکے درندے کی طرح عائشہ پر جھپٹ

پڑا۔ اس دوران عائشہ کا ہاتھ تکیے کے نیچے چھری پر چلا گیا تھا۔ مگر وہ کانچورام کی کمر پر وار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس طرح سے چھری کے گوشت کے اندر جا کر ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا۔ وہ سامنے کی جانب اس جگہ وار کرنا چاہتی تھی جہاں دونوں طرف کی پسلیاں آ کر مل جاتی ہیں اور دل بھی بہت قریب ہوتا ہے۔ کانچورام بدمستی کے عالم میں عائشہ کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ عائشہ نے چھری کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے کانچورام کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"کیا کرتے ہو؟" کانچورام عائشہ کا ہلکا سا دھکا کھا کر بالکل سامنے آ گیا تھا۔ بس عائشہ کو اسی گھڑی کا انتظار تھا۔ اس کے اور کانچورام کے درمیان صرف آدھے گز کا فاصلہ تھا۔ عائشہ بجلی کی طرح کودی اور اس کے ساتھ ہی پوری طاقت سے سیدھے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری کانچورام کے سینے کے نیچے پسلیوں کے درمیان میں گھونپ دی۔ عائشہ نے پوری کوشش کی تھی کہ چھری کا رخ بائیں جانب دل کی طرف رہے۔ کانچورام کو ایک جھٹکا سا لگا۔ عائشہ نے چھری کو باہر نکال کر عین اسی جگہ دوسرا بھرپور وار کر دیا۔ اب اس کے ہاتھوں پر گرم خون کی دھار بہنے لگی۔ عائشہ نے چھری کانچورام کے سینے میں ہی رہنے دی۔ اور تڑپ کر اپنے آپ کو پلنگ سے نیچے قالین پر گرا دیا۔ چھری کا دوسرا وار اس بدمعاش کے دل پر لگا تھا۔ اس کے حلق سے غراہٹ کی آواز نکلی۔

عائشہ اٹھی اس کے شیر دل باپ شیر خان نے اسے جو کمانڈو ٹریننگ میں داؤ بتا رکھے تھے اس نے ان پر عمل کرتے ہوئے پیچھے سے کانچورام کی گردن پر بھرپور ہاتھ مارا۔ کانچورام آگے کو بستر پر گر پڑا۔ بیڈ روم میں صرف ایک ہی بتی جل رہی تھی۔ اس کی روشنی زیادہ نہیں تھی۔ عائشہ کو جب یقین ہو گیا کہ کانچورام جہنم کے سفر پر روانہ ہو چکا ہے تو اس نے جلدی جلدی چادر اور صوفے پر سے کمبل اٹھا کر اس کے اوپر ڈالا اور بتی بجھا دی۔ بتی کے بجھتے ہی پہلے تو اندھیرا چھا گیا پھر کھلی کھڑکی کے ریشمی پردوں میں سے باہر برآمدے والی بتی کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آنے لگی۔ عائشہ نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ وہاں کانچورام کا خون لگا تھا۔ اس نے چادر سے خون صاف کیا۔ ایک بار پھر بستر کے قریب جا کر کمبل کو پرے ہٹا کر دیکھا۔ کانچورام مر چکا تھا مگر شراب کی گرمی کی وجہ سے اس کا بدن ابھی تک گرم تھا اور خون ابل رہا تھا۔

عائشہ نے غسل خانے میں جا کر اپنا ہاتھ دھویا بالوں میں جلدی جلدی کنگھی کی باہر آ کر کھڑکی کا تھوڑا سا پردہ ہٹا کر برآمدے میں دیکھا برآمدے میں کرسیاں اور میز پر جہاں بیٹھ کر یہ بدمعاش شراب پی رہے تھے خالی پڑی تھی۔ بارش رک گئی تھی مگر بادل اسی طرح گھرے تھے اور کبھی کبھی ان میں بجلی چمک جاتی تھی۔ عائشہ نے الماری کھولی اس میں سے برساتی نکال کر پہنی۔ اس کا ہڈ سر کے اوپر کیا۔ اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں چلتی کانچورام کے بیڈ روم میں آ گئی جونہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ قالین پر کانچورام کا ایک بدمعاش ساتھی ایک انڈیمانی لڑکی کو پہلو میں لیے قالین پر شراب کے نشے میں دھت بے ہوش پڑا ہے۔ انڈیمانی لڑکی جاگ رہی تھی۔ اس نے عائشہ کو دیکھا تو اپنے کپڑے ٹھیک کرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

عائشہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دبے پاؤں آ کر شرابی بدمعاش کے قریب بیٹھ گئی۔ یہ کانچورام کا دست راست بدمعاش تھا جس کے ہاتھوں کانچورام کئی لوگوں کا خون کروا چکا تھا۔ سہمی ہوئی کالی کلوٹی انڈیمانی لڑکی ذرا پیچھے کو ہٹی تو عائشہ نے اسے گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔

"بیٹھی رہو۔ منہ بند رکھو۔"

دوسرے لمحے عائشہ کے ہاتھوں نے نشے میں بے ہوش بدمعاش کی گردن کو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ وہ آدمی پہلے ہی شراب کے نشے میں بے ہوش تھا۔ اس کا نرخرہ اور گردن کی دونوں طرف خون لے جانے والی نالیوں کو عائشہ کی مضبوط گرفت نے بند کر دیا تھا۔ ایک دو بار بے ہوش شرابی نے اپنا منہ اس طرح کھولا جیسے سانس لینے کی کوشش کر رہا ہو مگر اس نے جتنے سانس اپنی زندگی میں لینے تھے وہ لے چکا تھا۔ عائشہ نے اس بدمعاش کو اس لیے ہلاک نہیں کیا تھا کہ وہ شور نہ مچا دے۔ وہ تو اس قابل ہی نہیں تھا کہ آواز نکال سکے۔ اس نے اس لیے موت کی نیند سلا دیا تھا کہ وہ انسانیت اور معصوم عورتوں کی عزتوں کا ڈاکو تھا اور نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کی عزتیں داغدار کر چکا تھا۔ انڈیمانی لڑکی پر

دہشت طاری ہو گئی تھی۔ وہ عائشہ کو......... بیمار اور اپنی طرح کی کمزور اور مجبور لڑکی سمجھ رہی تھی۔ اس کے وہم میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہ لڑکی اتنی آسانی سے ایک آدمی کو ہلاک کر سکتی ہے۔ جب بدمعاش شرابی کے دل نے دھڑکنا بند کر دیا تو عائشہ نے انڈین لڑکی سے کہا۔

"میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ میرے جانے کے دس منٹ بعد اگر تم بھی فرار ہونا چاہو تو فرار ہو جانا۔ لیکن میرے جانے کے دس منٹ بعد۔"

عائشہ نے کانچورام کی الماری کھول کر دیکھا وہ کسی ریوالور وغیرہ کی تلاش میں تھی۔ الماری میں کچھ رجسٹر کپڑے اور انگریزی کے فحش تصویروں والے رسالے پڑے تھے۔ عائشہ نے ایک دروازہ کھولا تو وہاں سے اسے ریوالور مل گیا۔ ریوالور میں گولیاں بھری ہوئی ہوتی تھیں۔ اس نے ریوالور اپنی برساتی کی جیب میں چھپا لیا۔ انڈیمانی لڑکی بہت ڈری ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھے لاش کے پاس بیٹھی کانپ رہی تھی۔ عائشہ نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے کاندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا اور کہا۔

"یاد رکھنا میرے جانے کے دس منٹ بعد یہاں سے ہلنا۔" یہ کہہ کر عائشہ دروازہ کھول کر برآمدے میں آ گئی۔ بادلوں میں بجلی چمکی۔ کوٹھی کا باغ تھوڑی دیر کے لئے روشن ہو کر پھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹپاٹپ بارش کی بوندیں درختوں اور پودوں کے پتوں پر گرنے لگیں۔ عائشہ نے مکان کے عقبی باغیچے میں سے گزر کر باڑھ پھلانگی اور شہر کی طرف پتلی سی سڑک پر تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ وہ کہاں جا رہی تھی؟

رات کے نو بج رہے تھے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ عائشہ دو ہندو بدمعاشوں کو قتل کرنے کے بعد تیز تیز قدموں سے جزیرے کی اس پتلی سی سڑک پر چلی جا رہی تھی جو شہر کی طرف جاتی تھی۔ یہ انڈیمان کے ایک شمالی جزیرے کا چھوٹا سا شہر تھا۔ اس شہر میں ادھیڑ عمر سکھ ڈاکٹر کی دکان اور ڈسپنسری تھی جو بدمعاش کانچورام کے حکم پر عائشہ کے علاج کے لئے آیا کرتا تھا اور جس کو عائشہ سے بڑی ہمدردی تھی مگر کانچورام بدمعاش کے خوف کے مارے وہ عائشہ کی مدد کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اب جب کہ عائشہ نے کانچورام اور اس کے ساتھی کو قتل کر ڈالا تھا تو یہی ایک

نیک دل سکھ ڈاکٹر ہی تھا جو وہاں سے نکلنے میں عائشہ کی مدد کر سکتا تھا۔ اس تمام علاقے میں عائشہ کسی دوسرے آدمی کو نہیں جانتی تھی۔ چنانچہ وہ ایک موہوم سی امید لیے سکھ ڈاکٹر کے گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ کالے پانی کے ان سارے جزیروں پر انڈیمان کا قبضہ تھا۔ ہر جزیرے کا ایک گورنر تھا جو اس جزیرے کے شہروں کے نظم و نسق کا ذمہ دار تھا۔ جس جزیرے میں عائشہ کو کانچورام بدمعاش کے پاس عائشہ کے باپ کے دشمن شہاب اور فیروز پچاس ہزار روپے میں فروخت کر کے گئے تھے اس جزیرے پر عملی طور پر اس بدمعاش اور قاتل کانچورام کی حکومت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سکھ ڈاکٹر تمام تر ہمدردی رکھنے کے باوجود عائشہ کی مدد کرنے کا خطرہ مول نہیں لے رہا تھا۔ بلکہ اس نے تو ایک بار عائشہ کو کہہ بھی دیا تھا کہ میں پوتے پوتیوں والا ہوں۔ اکیلا ہوتا تو کانچورام جیسے اس بدمعاش سے ٹکر لے لیتا مگر اب مجبور ہوں میں اپنی اولاد کو قتل ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔

عائشہ نے ان حالات میں کوئی زیادہ توقعات سکھ ڈاکٹر سے وابستہ نہیں کی تھیں۔ وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ اسے کسی طرح لنکا جانے والے کسی بحری جہاز پر سوار کرا دیا جائے۔ ان جزیروں سے مال لے کر لنکا کی طرف جہاز آتے جاتے رہتے تھے اور سکھ ڈاکٹر یہاں کا بڑا پرانا باشندہ تھا عائشہ کو یقین تھا کہ وہ اس کی اتنی مدد ضرور کرے گا۔

itsurdu.blogspot.com

عائشہ کو دور سے شہر کی روشنیاں ٹمٹماتی نظر آنے لگیں۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ بارش ابھی تک بوندا باندی کی شکل میں ہی ہو رہی تھی۔ عائشہ کو سکھ ڈاکٹر نے اپنے گھر کا ایڈریس اور حدود و اربعہ بتا دیا ہوا تھا۔ وہ شہر کی سڑک پر آگئی۔ یہاں روشنی تھی۔ ہلکی ٹریفک جاری تھی۔ سکھ ڈاکٹر نے عائشہ کو جس گول دائرے اور گاندھی کے بت والے چوک کی نشانی بتائی تھی وہ اس چوک میں پہنچ کر رک گئی۔ یہاں سے وہ گول بلڈنگ والی سڑک کی طرف مڑ گئی۔ بازار میں رونق تھی۔ دکانیں کھلی تھیں ایک جگہ عائشہ کو سکھ ڈاکٹر کی ڈسپنسری کا بورڈ لگا نظر آگیا۔ یہی سکھ ڈاکٹر کا مکان تھا۔ اوپر اس کی رہائش تھی۔ نیچے ڈسپنسری تھی۔ کچھ مریض ڈسپنسری میں بینچ پر بیٹھے تھے ڈسپنسر دوائیاں بنا رہا تھا۔ عائشہ نے ڈسپنسر سے کہا وہ ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتی ہے۔ ڈسپنسر نے ایک نظر عائشہ کو دیکھا۔ اس کی گوری رنگت سے سمجھ گیا کہ یہ کوئی پنجابی عورت ہے۔ یہ ڈسپنسر بھی پنجابی ہندو تھا۔ پنجابی میں اس نے عائشہ سے کہا کہ وہ بیٹھ جائے۔

"ڈاکٹر صاحب ابھی تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں۔ وہ ایک مریض کو دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔" عائشہ بنچ پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔

"ہندو ڈسپنسر دوائیاں تیار کرتے ہوئے عائشہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عائشہ نے اپنی تیز خون پی جانے والی عقابی نظریں ڈسپنسر پر گاڑ دیں۔ ڈسپنسر کی نظریں چار ہوئیں تو اس پر جیسے بجلی سی گری۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ اس کے بعد اسے عائشہ پر نگاہ ڈالنے کی جرات نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد سکھ ڈاکٹر بھی آگیا۔ عائشہ کو دیکھ کر وہ کچھ ٹھٹکا پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ڈسپنسری کے پہلو میں سکھ ڈاکٹر کا وہ کمرہ تھا جہاں وہ مریضوں کو

دیکھتا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے عائشہ سے پوچھا۔

"تم اس وقت یہاں؟ کیا بات ہوئی ہے؟"

عائشہ نے سکھ ڈاکٹر سے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ ایک بار تو سکھ ڈاکٹر سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ عائشہ نے کہا۔

"میں آپ کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی صرف آپ سے اتنی مدد مانگتی ہوں کہ مجھے کسی طرح لنکا جانے والے اسٹیمر پر سوار کرا دیجئے۔"

سکھ ڈاکٹر نے سر اٹھا کر عائشہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ عائشہ کی ہر ممکن امداد کے لیے تیار ہے۔ اس نے کہا۔

"تم نے اس جزیرے کے سب سے طاقتور درندہ صفت بدمعاش کانچورام کو قتل کیا ہے۔ میں تمہاری دلیری سے بڑا متاثر ہوا ہوں۔ مگر جزیرے پر بھارت کے گورنر کی نہیں بلکہ کانچورام اور اس کے گینگ کی حکومت ہے تمہاری تلاش میں کانچورام کے گینگ کے بدمعاش یہاں کی پولیس کے ساتھ نکل چکے ہوں گے۔ وہ لوگ تمہیں پہچان لیں گے پورٹ کار نوالس کی بندرگاہ اور جزیرے کی دوسری چھوٹی چھوٹی جیٹیوں کو ان لوگوں نے گھیرے میں لے رکھا ہو گا۔ اگر تم اس طرف گئیں تو فوراً پکڑی جاؤ گی۔" عائشہ بڑے سکون اور غور سے سکھ ڈاکٹر کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"کیا اس جزیرے کا کوئی ویران ساحل ایسا نہیں ہے جہاں سے میں کسی کشتی میں بیٹھ کر لنکا کی طرف فرار ہو جاؤں؟"

سکھ ڈاکٹر کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ دوبارہ کرسی پر بیٹھا اور بولا "بیٹی! تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ تم لنکا سے کتنی دور ہو۔ اور تمہاری راہ میں ایک ایسا خوفناک سمندر حائل ہے۔ جس میں آج کل ہر وقت طوفان آتے رہتے ہیں۔ میں تمہیں اس طرح کشتی پر فرار ہونے کا مشورہ نہیں دوں گا۔" عائشہ نے متفکر ہو کر کہا۔

"پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں آپ کے ہاں بھی نہیں رہ سکتی۔ اس طرح سے آپ کی اور آپ کی ساری فیملی کی جان بھی خطرے میں ہو گی۔" سکھ ڈاکٹر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ باتیں بعد میں سوچیں گے ابھی تم میرے ساتھ آؤ۔ یہاں تم محفوظ نہیں ہو۔"

سکھ ڈاکٹر نے کمرے کا عقبی دروازہ کھولا۔ دوسری طرف ایک تاریک گلی تھی جہاں سے بارش کی آواز آرہی تھی۔ باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔ سکھ ڈاکٹر نے عائشہ سے کہا۔

"تم یہاں ٹھہرو۔ میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔" ڈاکٹر ڈسپنسری والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ عائشہ ادھ کھلے دروازے سے لگی گلی میں گرتی بارش کی آواز سن رہی تھی۔ اس کا ذہن بڑا مطمئن تھا۔ اسے کانچو رام اور اس کے ساتھی بدمعاش کے قتل کا ذرا بھی پچھتاوا نہیں تھا۔ یہ قتل اسے بالکل ایسے لگ رہا تھا جیسے اس نے دو باؤلے کتوں کو ہلاک کر دیا ہو۔ اسے اگر کوئی فکر تھی تو صرف اتنی کہ کسی طرح اس جزیرے سے سری لنکا کی طرف نکل جائے تاکہ وہاں اپنے باپ شیر خان کے دشمن شباب اور فیروز سے اپنے اغوا اور کانچو رام بدمعاش کے ہاتھوں فروخت کرنے کے گھناؤنے جرم کا بدلہ لے سکے۔ سکھ ڈاکٹر اپنی چھوٹی گاڑی لے کر گلی میں آگیا' دروازہ کھول کر اس نے عائشہ کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ پھر گاڑی کو گلی سے نکال کر بارش میں بھیگتی سڑک پر ڈال دیا۔ عائشہ کو اس نے پچھلی سیٹ پر لیٹ جانے کی ہدایت کی تھی تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ کچھ دور تک گاڑی روشنیوں والی سڑک پر چلتی رہی۔ پھر بائیں جانب گھوم کر ایسی سڑک پر آگئی جو غیر ہموار تھی اور جس پر کسی لیمپ پوسٹ کی روشنی نہیں تھی۔ سکھ ڈاکٹر نے عائشہ سے کہا۔

"اب بے شک اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔"

عائشہ نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ رات کے اندھیرے اور بارش میں اسے سوائے درختوں کے سیاہ دھبوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے سکھ ڈاکٹر سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ گاڑی نیم پہاڑی اونچی نیچی سڑک پر جا رہی تھی۔ اس جنگل میں سکھ ڈاکٹر کا ایک پرانا گودام تھا جہاں باہر سے آنے والی دوائیوں وغیرہ کے خالی کھوکھے اور کچھ نئے مال کا اسٹاک بھرا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے ایک کمرے کا چھوٹا سا لکڑی کا کیبن بنایا ہوا تھا جہاں وہ چھٹی کے دن آکر آرام کرتا تھا۔

وہ عائشہ کو اس کیبن میں لے آیا۔ یہاں کچن میں ریفریجریٹر بھی تھا جس کے اندر کھانے پینے کی تقریباً ساری ضروری چیزیں موجود تھیں۔ سکھ ڈاکٹر نے عائشہ سے کہا۔

"تمہیں یہاں ہو سکتا ہے کچھ دن گزارنے پڑیں اس دوران میں تمہارے یہاں سے نکلنے کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ ایک ضروری بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ کسی بھی وقت خاص طور پر رات کے وقت کچن یا کیبن کی بتی مت جلانا۔ یہاں موم بتیاں دراز میں رکھی ہیں۔ اشد ضرورت کے وقت اسے جلا لینا مگر موم بتی کو فرش پر کسی کونے میں اس طرح رکھنا کہ اس کی روشنی کھڑکیوں پر نہ پڑے۔ میں کل کسی وقت آکر تمہیں ملوں گا۔ اب تم آرام کرو۔ ادھر شہر کا کوئی آدمی نہیں آتا۔ میں دروازے پر تالا ڈال کر کچن کی کھڑکی سے چابی تمہیں دے جاؤں گا۔ تم اس کھڑکی سے باہر آ جا سکتی ہو۔ مگر کوشش کرنا کہ دن کے وقت تم کیبن میں ہی رہو۔"

سکھ ڈاکٹر چلا گیا۔ کیبن کے کمرے میں دیوار کے ساتھ چارپائی بچھی تھی جس پر مچھر دانی لگی ہوئی تھی۔ مچھر دانی کے بغیر یہاں سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ یہاں کے مچھر بڑے خطرناک تھے۔ عائشہ نے موم بتی جلائی۔ اسے کچن کے کونے میں فرش پر اس طرح لگا دیا کہ اوپر ایک طشت کا سایہ تھا اور اس کی روشنی کھڑکیوں میں سے باہر نہیں جاتی تھی۔ ساری کھڑکیاں اس نے بند کر کے اندر سے چٹخنیاں لگا دی تھیں۔ اس نے ریفریجریٹر میں سے ڈبل روٹی نکال کر کھالی۔ موم بتی کو پھونک مار کر بجھایا اور مسہری پر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ چھت پر پنکھا چل رہا تھا۔ جس کی ہلکی ہلکی ہوا مسہری کے اندر آرہی تھی۔ اس کا خیال اپنے باپ شیر خان کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ اس کا غیرت مند بہادر باپ گھر پر بیٹھا بیٹی کی یاد میں آنسو بہاتا رہ گیا ہو۔ وہ ضرور اپنی بیٹی کی تلاش اور شباب اور فیروز سے انتقام لینے کے لئے گھر سے نکل چکا ہو گا۔ لیکن وہ بھی اپنی ماں کی شیرنی اور غیور باپ کی سرفروش بیٹی ہے۔ وہ بہادر باپ کے لنکا پہنچنے سے پہلے شباب اور فیروز کو جہنم میں پہنچا چکی ہو گی۔ شیرنی کو یقین تھا کہ اس کا باپ اس کی تلاش میں سیدھا لنکا پہنچے گا۔ کیونکہ شباب اور فیروز کے ناجائز منشیات کے کاروبار کا تعلق لنکا ہی سے تھا اور شیر خان کے لیے یہ ملک کوئی نیا نہیں تھا۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے شیرنی کو نیند نے آلیا اور وہ سو گئی۔

عائشہ تین دن سکھ ڈاکٹر کے اس جنگل والے کیبن میں رہی۔ اس دوران ڈاکٹر روز

رات کو آکر اسے صورتحال سے باخبر کر جاتا کہ وہ اس کے وہاں سے نکلنے کے لیے کیا کچھ تگ و دو کر رہا ہے۔ چوتھے روز صبح صبح سکھ ڈاکٹر عائشہ شیرنی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"بیٹی! جہاں جہاں سے جہاز سری لنکا کی طرف جاتے ہیں وہاں ہر جگہ پر کانچورام کے آدمی پولیس کے ساتھ تمہیں پکڑنے کے لیے ہروقت موجود رہتے ہیں۔ اب صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے۔"

"وہ کیا؟" عائشہ شیرنی نے پوچھا۔ سکھ ڈاکٹر کہنے لگا۔

جزیرے کے شمال مشرقی گھاٹ سے انڈیا کی بندرگاہ کوکی ناڈا سے ہفتے میں دوبار مال بردار جہاز آتا ہے جس میں ہمارے لیے دوائیوں کے کریٹ بھی ہوتے ہیں۔ آج رات کو ایسا ہی ایک مال بردار جہاز یہاں سے مال لے کر واپس کوکی ناڈا جا رہا ہے۔ بس یہی ایک صورت رہ گئی ہے کہ تم اس جہاز میں سوار ہو کر انڈیا پہنچ جاؤ اور وہاں سے سری لنکا چلی جاؤ۔" عائشہ شیرنی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"مگر انکل! انڈیا میں تو مجھے پاسپورٹ کی ضرورت ہو گی۔ وہاں سے میں سری لنکا کیسے جا سکوں گی۔" سکھ ڈاکٹر بولا۔

"بیٹی پاسپورٹ کی تو تمہیں یہاں بھی ضرورت ہے۔ تم ان باتوں کو بھول جاؤ۔ سب سے پہلا کام تمہاری جان بچانا اور یہاں کے خونی غنڈوں سے تمہیں محفوظ کرنا ہے۔ کوکی ناڈا میں میرا ایک دوست ڈاکٹر ہے۔ وہ مدراسی ہے۔ اس کا نام شری ناڈ ہے۔ میں تمہیں اس کے نام خط لکھ دوں گا۔ وہ تمہیں لنکا پہنچانے میں مدد کرے گا۔ وہ اعتبار والا آدمی ہے اور میرا بڑا گہرا دوست ہے۔ وہ ہر طرح تمہاری مدد کرے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو وہ تمہارا پاسپورٹ بھی بنوا دے گا۔ اب تم تیاری کرو جہاز سورج غروب ہونے کے بعد سات ساڑھے سات بجے بندرگاہ سے انڈیا کے ساحل کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ میں پورے چھ بجے تمہارے پاس آؤں گا۔ میں نے جہاز کے کپتان سے بات کر لی ہے۔ میں نے اسے کچھ روپے بھی دے دیے ہیں۔ وہ خود تمہیں اپنے ساتھ جہاز پر لے کر جائے گا۔ صرف تمہیں مسلمان عورتوں کی طرح برقع پہننا ہو گا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔" سکھ ڈاکٹر چلا گیا۔ عائشہ شیرنی سوچ میں پڑ گئی۔

انڈیا ایک ایسا ملک ہے جو پاکستان کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے۔ اور شیرنی ایک پاکستانی لڑکی ہے۔ اگر وہاں کسی پر یہ بھید کھل گیا تو اسے پاکستانی جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا جائے گا۔ مگر بقول سکھ ڈاکٹر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس خونی جزیرے سے نکلنا بھی ضروری تھا۔

عائشہ شیرنی نے آخری فیصلہ کر لیا کہ وہ انڈیا کے راستے ہی لنکا پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ شیرنی کے لیے سارے جنگل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ جس جنگل میں بھی جائے اپنے لیے راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ ٹھیک چھ بجے شام سکھ ڈاکٹر عائشہ شیرنی کو لینے آ گیا۔ وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی جنگل میں سے گزرتی شام کے جھٹپٹے میں جزیرے کے شمال مغربی ساحل کی طرف روانہ ہو گئی۔ آدھ گھنٹے بعد شمال مغربی گھاٹ کے ٹاپوں کے درمیان بنی ہوئی شہر کی نیم روشن سڑکوں پر سے ہوتے ہوئے گاڑی ایک بوسیدہ سے گودام کی دیوار کے پاس آ کر رک گئی۔

"کپتان نے اسی گودام میں آنے کے لیے کہا تھا۔" سکھ ڈاکٹر یہ کہتا ہوا گاڑی سے باہر نکل آیا۔ گودام کا عقبی دروازہ مقفل نہیں تھا۔ سکھ ڈاکٹر نے آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے کسی کی بھاری اور کرخت آواز آئی

"کون ہے؟" سکھ ڈاکٹر نے اپنا نام بتایا۔ "آ جاؤ دروازہ کھلا ہے ڈاکٹر!" یہ کپتان تھا۔ وہ لوہے کی ایک کرسی پر اپنا بھاری بھرکم جسم سنبھالے بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کافی کا مگ تھا اور دوسرے ہاتھ میں موٹا سا کالا سگار سلگ رہا تھا۔ اس نے غور سے عائشہ کا جائزہ لیا۔

"یہ لڑکی ہے؟" سکھ ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ کپتان نے کافی کا مگ میز پر رکھا۔ منہ سے سیٹی بجائی ایک کالے رنگ کی دبلی پتلی مگر بڑی شوخ آنکھوں والی لڑکی پتلون شرٹ میں ملبوس ایک کمرے سے نکل کر کپتان کی طرف بڑھی۔

"یس۔ کیپٹن!" اس نے دل ربا انداز میں کہا۔ کپتان نے عائشہ شیرنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے جو مسلمان عورتوں والا برقع میں نے تمہیں دیا تھا وہ اسے پہنا دو۔"

کالی لڑکی نے بھی تیکھی نظروں سے عائشہ کا جائزہ لیا۔ پھر اندر گئی اور کالے رنگ کا ایک جھولا نما برقع لے آئی۔ کپتان نے شیرنی سے کہا۔

"لو اسے پہن لو۔ اور میرے ساتھ چلو۔"

پھر سکھ ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔" ڈاکٹر! تم فکر نہ کرو۔ تمہاری امانت بالکل ایسی کی ایسی کوکی ناڈا کی بندرگاہ سے باہر پہنچا دی جائے گی۔ وہ تمہارا ڈاکٹر دوست کیا نام ہے اس مسخرے کا۔"

"شری ناڈ۔" سکھ ڈاکٹر نے اس کا جملہ پورا کیا۔

"ہاں شری ناڈ! کیا وہ جیٹی کے باہر موجود ہو گا؟" کپتان نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" سکھ ڈاکٹر نے کہا۔"میں نے اس کے نام خط لکھ کر لڑکی کو دے دیا ہے۔ ڈاک کے ذریعے بھی اسے خط پوسٹ کر دیا ہے۔ میں نے خط میں سارا معاملہ لکھ دیا ہے۔ جب تک تمہارا جہاز انڈیا کے ساحل پر پہنچے گا اسے خط مل چکا ہو گا۔" کپتان نے سگار کا کش لگا کر کہا۔

"ہم دو دن میں پہنچیں گے انڈیا۔" ٹھیک ہے ڈاکٹر اب تم جاؤ۔"

سکھ ڈاکٹر نے شیرنی عائشہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹی! کاش میں اس سے زیادہ تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔ پوتے پوتیوں نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ ورنہ میں خود تمہیں تمہاری منزل تک لے جاتا۔" یہ باتیں سکھ ڈاکٹر نے پنجابی زبان میں کی تھیں جسے شوخ آنکھوں والی کالی لڑکی اور جہاز کا کیپٹن نہیں سمجھ سکا تھا۔ عائشہ شیرنی نے جذباتی ہوئے بغیر کہا۔

"آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے سردار جی! آپ کا یہ احسان مجھے یاد رہے گا۔"

جہاز کا کپتان بڑا حیران ہو رہا تھا یہ کیسی لڑکی ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی جذباتی نہیں ہوئی اس کے باوجود کپتان نے عائشہ کے انداز کو پسند کیا تھا۔ شوخ آنکھوں والی کالی لڑکی کو عائشہ شیرنی پسند نہیں آئی تھی۔ اس کی وجہ محض اتنی سی تھی کہ عائشہ کے بال سنہری اور رنگ گورا چٹا تھا۔ تھوڑی دیر بعد عائشہ بندرگاہ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ برقع اوڑھے کپتان

کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ بندرگاہ پر کانچورام اور جزیرے کی خفیہ پولیس کے آدمی عائشہ کی تلاش میں برابر موجود تھے مگر ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عائشہ برقع پہنے کپتان کے ساتھ وہاں آئے گی۔ کپتان کے ساتھ برقع پوش مسلمان عورت کو دیکھ کر پولیس والوں اور وہاں دوسرے آدمیوں کو کوئی تعجب نہ ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کپتان عورتوں کا بڑا شوقین ہے اور ہر پھیرے پر جزیرے سے ایک نئی عورت اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اس بار وہ کوئی برقعے والی عورت لے جا رہا تھا۔ کپتان بھی معمول کے مطابق جیپ سے اتر کر اپنے جہاز کی طرف بڑھا جو جیٹی پر کھڑا تھا اور جس پر ابھی کچھ کریٹ اور بوریاں لادی جا رہی تھیں۔ کپتان آگے آگے تھا۔ عائشہ شیرنی اور کالی لڑکی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ کپتان نے سگار منہ سے نکال کر چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

"جلدی کرو حرام خور جلدی کرو۔ میں آدھے گھنٹے میں انجن اسٹارٹ کر رہا ہوں۔" وہ تامل زبان میں مزدوروں کو گالیاں بکتا جہاز کے گینگ وے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ شیرنی اور کالی لڑکی اس کے پیچھے تھیں۔ جہاز پر آتے ہی تامل کیپٹن نے کالی لڑکی سے اپنی زبان میں کہا کہ وہ عائشہ کو لوئر ڈیک کے کیبن میں لے جائے اور اسے ہدایت کر دے کہ یہ کسی حالت میں بھی کیبن سے باہر مت نکلے۔ تامل لڑکی نے عائشہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ عائشہ نے ابھی تک برقعے کا نقاب گرا رکھا تھا۔ تامل لڑکی ایک پیچ دار زینہ اتر کر نچلے ڈیک کی تنگ راہ داری میں سے ہوتی ہوئی ایک کیبن میں آ گئی۔ اس نے عائشہ سے کہا کہ وہ اب برقع اتار دے اور یہاں سے باہر قدم نہ نکالے۔ باتھ روم کیبن کے ساتھ ہی ہے اور اسے کھانا وغیرہ وہیں پہنچ جایا کرے گا۔

تامل لڑکی چلی گئی۔ عائشہ نے برقع اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ چھوٹا سا کیبن تھا جس میں نیچے بیٹھنے کی جگہ تھی اور اوپر سونے کی برتھ تھی۔ ساتھ ہی چھوٹا سا غسل خانہ تھا۔ شیرنی بینچ پر بیٹھنے والی سیٹ پر لیٹ گئی اور انڈیا سے لنکا تک کے سفر کے خطرات کا جائزہ لینے لگی۔ کیا سکھ ڈاکٹر کا مدراسی دوست شری ناڈ واقعی قابل اعتبار آدمی ہے؟ شیرنی نے فیصلہ کر لیا کہ اگر اس شخص نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گی۔ میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔ عائشہ نے سوچا مجھے انڈیا کے ساحل پر

اترتے ہی کوئی ریوالور یا چاقو حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہو گی۔ وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ جہاز کے انجن اسٹارٹ ہو گئے۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے جہاز بندرگاہ سے ہٹ رہا ہے۔ پہلی بار اسے تھوڑا سا سکون میسر آیا تو اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ سو گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو تامل لڑکی کھانے کی تھالی رکھنے کے بعد اسے جگا رہی تھی۔

"چاول مچھلی کھا لو۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ جہاز بیچ سمندر میں پہنچنے کے بعد ڈول رہا تھا۔ شیرنی نے تھوڑا کھانا کھایا اور پھر سو گئی۔ خلیج بنگال کے متلاطم پانیوں میں دو دن تک سفر کرنے کے بعد یہ مال بردار جہاز آندھیرا پردیش کی بندرگاہ کوکی ناڈا کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ سکھ ڈاکٹر کا خط اس کے مدراسی دوست شری ناڈ کو مل چکا تھا۔ اور وہ بندرگاہ پر اپنے سکھ ڈاکٹر دوست کی منہ بولی بیٹی عائشہ کو لے جانے کے لیے آیا ہوا تھا۔ سکھ ڈاکٹر نے جہاز کے کپتان کو شیری ناڈ کی ایک فوٹو دکھائی تھی تاکہ وہ اسے پہچان سکے۔ یہ انڈیا کی بندرگاہ تھی اور یہاں کانچورام کے بدمعاش عائشہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ چنانچہ تامل کپتان نے عائشہ کو ساتھ لیا اور جہاز سے اتر کر جیٹی پر آ گیا۔ جنگلے کے ایک طرف اسے اسی شکل کا ایک ادھیڑ عمر دبلا پتلا کالا مدراسی بند چھتری ہاتھ میں لیے نظر آیا جو شکل سکھ ڈاکٹر نے کپتان کو دکھا رکھی تھی۔ وہ عائشہ کو ساتھ لیے شری ناڈ کے قریب آیا اور اسی کی زبان میں اس کا نام پوچھا۔ شری ناڈ نے اپنا نام بتایا اور جیب سے سکھ ڈاکٹر کا خط نکال کر دکھایا۔ کپتان نے عائشہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ میرے دوست ڈاکٹر کی منہ بولی بیٹی ہے اور اس کی امانت ہے۔ میں اسے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔" پھر عائشہ کی طرف منہ کر کے بولا۔ "لڑکی یہی وہ شری ناڈ ہے جس کے پاس سکھ ڈاکٹر نے تمہیں بھیجا ہے۔ وہ خط نکال کر اسے دے دو۔" عائشہ نے سکھ ڈاکٹر کا لکھا ہوا خط نکال کر شری ناڈ کو دیا۔ اس نے وہیں جنگلے کے پاس گرمی میں کھڑے کھڑے خط پڑھا اور مسکرا کر انگریزی میں عائشہ سے کہنے لگا۔

"تم میری بھی بیٹی ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔" پھر اس نے تامل کپتان کا شکریہ ادا کیا۔ کپتان نے شیر ناڈ سے کہا۔

"اس کا خیال رکھنا بابو۔ نہیں تو میں ادھر آتا جاتا رہتا ہوں۔" شیری ناڈ نے مسکرا کر

سلام کیا اور عائشہ کو ساتھ لے کر بندرگاہ کے مین گیٹ کی طرف بڑھا۔

شیری ناڈ بڑا شریف مدراسی تھا اور سکھ ڈاکٹر کا پرانا دوست تھا۔ کوکی ناڈا میں اس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا چھوٹا سا کاروبار تھا اور شہر کے ایک فلیٹ میں اپنی ادھیڑ عمر بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کے ہاں اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ایک لڑکی کو انہوں نے اناتھ آشرم سے لے کر پال پوس کر پڑھا لکھا کر بڑا کیا اور پھر اس کی شادی کر دی تھی۔ شادی کے بعد وہ اپنے خاوند کے پاس بمبئی میں جا کر رہنے لگی تھی۔ ان دنوں شری ناڈ اور مسز شری ناڈ اپنے فلیٹ میں اکیلے ہی رہتے تھے۔ شہر میں شیری ناڈ کا ایک چھوٹا سا دفتر تھا جہاں وہ بڑی باقاعدگی سے صبح کو جاتا اور دوپہر کے بعد واپس آ جاتا تھا۔ عائشہ کو گھر لا کر اسے اپنی بیوی سے ملایا۔ اس کی ادھیڑ عمر بیوی بھی عائشہ سے مل کر بڑی خوش ہوئی۔ شری ناڈ نے اپنی بیوی کو عائشہ کے بارے میں بتا دیا تھا کہ پاکستان سے اسے کچھ بدمعاش اغوا کر کے انڈیمان لے گئے تھے اور اب اسے سری لنکا پہنچانا ہے جہاں سے وہ واپس اپنے وطن پاکستان چلی جائے گی۔ کیونکہ انڈیا کے پنجاب اور راجستھان والے بارڈر کے مقابلے میں راس کماری کی جانب سے بارڈر کراس کرانا زیادہ آسان ہے۔ تینوں نے رات کا کھانا ایک جگہ چٹائی پر بیٹھ کر کھایا۔ کھانے کے بعد شری ناڈ کہنے لگا۔ وہ آپس میں اپنی زبان میں اور عائشہ کے ساتھ انگریزی زبان میں ہی بات کرتے تھے۔ کیونکہ عائشہ ان لوگوں کی زبان اور وہ اس کی زبان نہیں جانتے تھے۔ ہندوستانی بھی انہیں ٹوٹی پھوٹی ہی آتی تھی۔

"بیٹی! تم اب ساڑی پہن کر رکھو۔ ماتھے پر ویشنو کا تلک بھی تمہیں لگا دیں گے۔ تمہارا نام کملا ہو گا اور میں لوگوں سے یہی کہوں گا کہ تم میری بھانجی ہو جو افریقہ میں ہی پیدا ہوئی تھی اور اب بہن کی موت کے بعد میرے پاس آ گئی ہو اور چند روز بعد میں تمہیں مزید پڑھائی کے واسطے مدراس یونیورسٹی لے جانے والا ہوں۔ تم یہاں کسی سے بات نہ کرنا۔ میں یہی مشہور کر دوں گا کہ ماں کی وفات کے صدمے سے تمہارے ذہن پر اثر پڑا ہے اور تم بول نہیں سکتی ہو۔ یہاں ہمارا ایک ہی بوڑھا نوکر ہے جو دن میں آتا ہے اور شام کو چلا جاتا ہے اس کے سامنے بھی کوئی بات نہ کرنا۔"

دو دن عائشہ شری ناڈ کے ہاں رہی۔ تیسرے روز شری ناڈ اسے لے کر مدراس کی

طرف روانہ ہو گیا۔ مدراس میں وہ دونوں باپ بیٹی بن کر ایک غیر معروف سے ہوٹل میں اترے۔ یہاں شری ناڈ اور شیرنی ایک دن ٹھہرے۔ اس دوران شری ناڈ نے لنکا کے شمالی صوبے کے ساحلی شہر منار میں اپنے ایک دوست رامیکا کو ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ وہ منار پہنچ رہا ہے۔ مدراس سے وہ ایک ریل گاڑی میں سوار ہو کر انڈیا کی جنوبی تکون کی طرف چل دیئے ایک رات اور ایک دن کے سفر کے بعد ٹرین دھنش کوڈی پہنچ گئی یہاں سے انہیں سری لنکا کے شمالی ساحل کے واسطے اسٹیمر پکڑنا تھا۔ شری ناڈ کا دوست رامیکا وہاں پہلے سے موجود تھا اور اس نے کسٹمز والوں کے ساتھ مل کر شیرنی کے داخلے کا سارا انتظام کر رکھا تھا۔ کیونکہ پاسپورٹ صرف شری ناڈ کے پاس ہی تھا۔ شیرنی کے پاس کوئی پاسپورٹ نہیں تھا۔ اتنی جلدی اس کا پاسپورٹ بنوایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہاں شری ناڈ نے شیرنی کو اپنے دوست رامیکا کے حوالے کر دیا اور اسے ساری بات سمجھا دی کہ شیرنی کون ہے اور وہ کس مشن پر لنکا میں داخل ہوئی ہے۔ رامیکا اپنی بیوی بچوں کے ساتھ منار شہر میں رہتا تھا وہ ایک بااصول اور اپنا عہد نبھانے والا مدراسی تھا۔ شیرنی کے لیے اس نے گھر کا ایک کمرہ خالی کروا لیا۔ اپنی بیوی بچوں کو یہی بتایا کہ عائشہ ایک مظلوم لڑکی ہے اور یہاں اپنے گمشدہ ماں باپ کی تلاش میں آئی ہے۔ اس نے اپنی طرف سے ایک کہانی گھڑ کر گھر والوں کو سنا دی اور شیرنی کو ہدایت کر دی کہ وہ گھر میں کسی سے زیادہ بات نہ کرے۔

یہاں پہنچ کر شیرنی نے غور شروع کر دیا کہ اسے اپنا منصوبہ کہاں سے شروع کرنا چاہیے۔ یہ بات طے تھی کہ اس کے اور اس کے باپ کے دشمن شہاب اور فیروز شمالی لنکا میں جافنا کے آس پاس ہی تھے۔ مگر شیرنی اس سے پہلے کبھی لنکا نہیں آئی تھی۔ اس کی ماں تو لنکا کے جنگلوں اور شہروں کی ایک ایک شے سے واقف تھی۔ مگر اس کے لیے یہ جگہ اجنبی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گوتم بدھ کی بھکشنی بن کر وہاں زیادہ محفوظ رہ سکے گی اور اس بہروپ میں اپنے دشمنوں کو تلاش کرنے میں اسے نسبتاً زیادہ آسانی ہو گی۔ اپنے منصوبے سے اس نے رامیکا کو آگاہ کر دیا۔ پہلے تو وہ خاموش سا ہو گیا۔ اب شیرنی نے اسے بتایا کہ لنکا میں گوتم بدھ کا مذہب سرکاری مذہب ہے اور لوگ اس مذہب کے پابند ہیں اور بودھ بھکشوؤں اور بھکشنیوں کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اس وجہ سے

میں آسانی کے ساتھ چل پھر سکوں گی اور کسی کو مجھ پر شک بھی نہیں ہو گا۔ تو پھر رامیکا بھی مان گیا کہنے لگا۔

"مگر بودھ مت کی بھکشنی بننے کے لیے تمہیں اپنا سر منڈوانا ہو گا۔ زعفرانی لباس پہننا پڑے گا۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ مجھے صرف یہ معلومات مہیا کر دیں کہ شمالی لنکا میں جافنا شہر کے آس پاس بودھ مت کی خانقاہیں کہاں کہاں پر ہیں۔ کیونکہ مجھے وہیں رہ کر اپنے دشمنوں کو تلاش کرنا ہو گا۔" شیرنی نے کہا۔

رامیکا نے ایک ہی دن میں شیرنی کو شمالی لنکا کے شہر جافنا اور آس پاس کے علاقوں کی بودھ خانقاہوں کے بارے میں ساری معلومات مہیا کر دیں۔ شیرنی نے ساری تفصیلات ذہن نشین کر لیں۔ بودھ بھکشنی کے بھیس میں سفر کرنے کے باعث اسے ریل یا بس میں کرایہ خرچ کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اور خانقاہوں میں بھی وہ بڑی آسانی سے قیام کر سکتی تھی۔ چنانچہ دو دن بعد عائشہ نے رات کے پچھلے پہر رامیکا کی مدد سے اپنے سر کے بال صاف کر دیئے۔ پہلے سے لا کر رکھا ہوا زعفرانی لباس یعنی گیروے رنگ کی ساڑھی پہنی گلے میں ایک تھیلا لٹکایا۔ رامیکا نے اسے کچھ کرنسی بھی دے دی۔ کندھے کے ساتھ ناریل کے پتوں سے بنائی ہوئی چھتری لٹکائی اور اس کے گھر کے عقبی دروازے سے نکل کر منار شہر کے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دی۔ اس کی پہلی منزل جافنا سے پچاس میل پہلے پورا تھنی قصبے کی بودھ خانقاہ تھی۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو شیرنی کے باپ شیر خان کے بارے میں بھی واقعات و حالات سے آگاہ کیا جائے۔ شیر خان کراچی سے سیدھا کولمبو پہنچا تھا۔ سری لنکا کا کوئی بھی شہر کوئی بھی ساحل سمندر اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس نے اپنا بچپن لڑکپن اور جوانی یہاں کے جرائم پیشہ اسمگلروں کے ساتھ گزاری تھی۔ یہیں اس کی ملاقات روبی سے ہوئی تھی اور پھر دونوں نے زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ وہ ایک مدت کے بعد سری لنکا واپس آیا تھا۔ اب لنکا سے انگریز جا چکا تھا اور وہاں لنکا کے لوگوں کی اپنی حکومت تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ شمال کی جانب تامل ایلام باغیوں کی

تخریب کاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو کبھی ہندوستان کے جنوبی علاقوں سے آکر لنکا کے شمال میں آباد ہو گئے اور اب وہ بھارت کی شہہ پر لنکا میں اپنا ایک الگ ملک بنانا چاہتے تھے۔ یہ ہندوستان کے تربیت یافتہ تامل تخریب کار تھے اور انہوں نے لنکا کے شمالی اور شمال مشرقی علاقے میں تشدد کی خونی کارروائیاں شروع کر رکھی تھیں۔ لنکا کے یہ وہ علاقے تھے جہاں سیلونی مسلمان بھی آباد تھے۔ تامل تخریب کار ان کو بھی مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنے انتقام کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سیلونی مسلمان حکومت کے وفادار تھے اور ملک کو توڑ دینے والی پر تشدد تخریبی کارروائیوں کے خلاف تھے۔

شیر خان کے لیے یہ ایک نئی صورتحال تھی۔ وہ کولمبو کے ایک ہوٹل میں آکر ٹھہر گیا۔ اسے معلوم تھا کہ شہاب اور فیروز شمالی لنکا کی پورٹ پیڈرو کے جنگلوں میں ہی ہوں گے۔ کیونکہ یہی وہ مقام تھا جہاں سے آسٹریلیا' نیوزی لینڈ اور جاوا سماٹرا کے ملکوں کو ہندوستان کی چرس اور اب ہیروئن اسمگل کی جاتی تھی۔ کولمبو میں شیر خان کے اس زمانے کے جاننے والے اب نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس نے اپنے طور پر تحقیق کی تو اسے پتا چلا کہ اس کا پرانا ساتھی ارجنا ٹرنکو مالی کے پاس جنگل کے خفیہ ٹھکانے میں ابھی تک اسمگلنگ کا دھندا کر رہا ہے۔ باقی کے لوگوں میں سے کچھ قیدیں بھگت رہے تھے۔ کچھ مارے جا چکے تھے اور سیٹھ لوگ حکومت کی سختی کی وجہ سے لنکا چھوڑ کر ہانگ کانگ کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ شہاب اور فیروز کے بارے میں شیر خان کو کولمبو میں کچھ پتا نہ چل سکا۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ ارجنا کے پاس ٹرنکو مالی چلنا چاہیے۔ وہیں سے شہاب اور فیروز کے ٹھور ٹھکانے کا کچھ پتا چل سکے گا۔ شیر خان کے پاس کافی پیسے تھے جو ٹریول چیک کی شکل میں اس کے پاس موجود تھے۔ اس نے بینک سے کچھ رقم نکلوائی اور کولمبو کے فورٹ ریلوے اسٹیشن سے ٹرین میں بیٹھ کر ٹرنکو مالی کی طرف روانہ ہو گیا۔ کولمبو سے یہ ایکسپریس ٹرین سیدھی ٹرنکو مالی جاتی تھی۔ یہ لنکا کے مغربی ساحل سے مشرقی ساحل کی جانب کا سفر تھا اور ٹرین میں دو دن اور ایک رات لگ جاتی تھی۔ شیر خان ٹرنکو مالی پہنچ گیا۔ یہاں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا وہ رات کے وقت یہاں پہنچا تھا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد شیر خان لیٹ گیا۔ اپنی بیٹی عائشہ کا خیال اسے ہر لحظہ پریشان رکھے ہوئے تھا۔ مگر اسی خیال سے اسے

تھوڑی تسلی بھی ہوتی تھی کہ عائشہ کو اس نے شیرنی کی تربیت دی ہے اور وہ اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ اگر وہ کسی مقام پر بے بس ہو گئی تو بڑی بہادری سے دو چار کو مار کر خود بھی مر جائے گی مگر اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دے گی۔ لیکن شہاب اور فیروز کو وہ ہر حالت میں ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ جنہوں نے دوستی کے پاکیزہ رشتے کو پامال کرتے ہوئے اس بچی کو اغوا کر لیا تھا جو ان کی بیٹی کی جگہ پر تھی۔

شیر خان نے کسی نہ کسی طرح رات گزاری۔ دن نکلا تو اپنے پرانے سنہالی اسمگلر ساتھی ارجنا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ یہ علاقہ بھی شیر خان کا جانا پہچانا علاقہ تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اسمگلروں کا ٹھکانہ کہاں ہو سکتا ہے۔ وہ کچھ دور تک ساحل سمندر کے ساتھ چلتا رہا۔ پھر ایک ٹاپو کی طرف مڑ گیا۔ یہاں سمندر ایک جھیل کی شکل میں تھا اور تین اطراف اونچے اونچے تاڑ کے درخت کھڑے تھے۔ وہ ان درختوں کی طرف چل پڑا یہاں سے آگے زمین اونچی نیچی تھی اور گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ شیر خان کے پاس سوائے ایک چاقو کے دوسرا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ ایک درخت کے نیچے تھوڑی دیر ستانے کے لیے بیٹھ گیا۔ اس کی اسمگلروں والی حس بڑی تیزی سے اپنا کام کرنے لگی تھی۔ یہ جنگل اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اتنا وہ جانتا تھا کہ اس قسم کی کھاڑیوں میں اسمگلر اپنے خفیہ اڈے عام طور پر ایسی جگہوں پر بناتے ہیں جہاں کوئی ندی نالہ کھاڑی سے نکل کر جنگل میں داخل ہو گیا ہو۔ اس طرح انہیں مال لانے لے جانے میں آسانی ہوتی ہے تھوڑی دیر ستانے کے بعد وہ کھاڑی کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ آخر اسے اپنا مدعا مل گیا۔ یعنی ایک جگہ سے کھاڑی میں سے چھوٹی سی ندی نکل کر جنگل کے اندر چلی گئی تھی۔ شیر خان ندی کے ساتھ ہو لیا۔

ندی صرف اتنی چوڑی تھی کہ اس میں چھوٹی کشتی یعنی سمپان ہی چل سکتی تھی۔ کنارے پر بے شمار جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ کسی کسی وقت کسی پرندے کے بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر شیر خان رک گیا اور ندی کے کنارے کو جھک کر دیکھنے لگا۔ یہاں زمین پر ایسا راستہ سا بنا ہوا تھا جیسے کسی شے کو یہاں سے گھسیٹ کر لے جایا گیا ہو اور یہ عمل بار بار دہرایا جاتا رہا ہو۔ وہ سمجھ گیا کہ مال یہیں سے آتا جاتا ہو گا۔ اسے اسمگلنگ کے خفیہ اڈے کا سراغ مل گیا تھا۔ وہ ندی سے ہٹ کر اسی نشان کے ساتھ ساتھ جنگل کے اندر آگیا۔ یہاں بڑا حبس تھا اور دیودار کے درخت ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اچانک ایک طرف سے دو آدمی نکل کر اس کے سامنے آگئے۔ دونوں ناٹے قد کے کالے کالے سیلونی تھے۔ اور دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے جن کا رخ شیر خان کی طرف تھا۔ انہوں نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں پوچھا کہ تم کون ہو۔ ادھر کیا لینے آئے ہو؟ شیر خان نے بڑے اطمینان سے سنہالی زبان میں جواب دیا۔

"میں ارجنا سے ملنے آیا ہوں۔" ایک اونچے قد کاٹھ کے گورے چٹے ادھیڑ عمر مگر مضبوط جسم کے آدمی کو لنکا کی سنہالی زبان میں بات کرتے دیکھ کر دونوں سنہالی حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ایک نے سنہالی زبان میں شیر خان سے پوچھا۔

"تم ہماری زبان کیسے جانتے ہو؟"

شیر خان بولا "یہ تمہیں ارجنا ہی بتائے گا۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کیا ارجنا اسی جنگل میں ہے؟ اگر ہے تو اسے جا کر کہو کہ اس کا پرانا دوست اور ساتھی شیر خان اس سے ملنے آیا

ہے۔" دونوں سنہالیوں نے آپس میں سرگوشی میں کوئی بات کی پھر آگے بڑھ کر شیر خان کو ہاتھ اوپر اٹھانے کو کہا۔ شیر خان نے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ دونوں نے شیر خان کی تلاشی لی اور اس کا چاقو اپنے قبضے میں کر لیا۔ پھر کہا۔

"تم اسی جگہ بیٹھو۔"

ایک سنہالی چلا گیا۔ دوسرا سنہالی پستول ہاتھ میں لیے شیر خان سے دو چار قدم کے فاصلے پر پہرے پر کھڑا رہا۔ کوئی پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ درختوں میں سے ارجنا اس کی طرف آتا نظر آیا۔ شیر خان نے دور ہی سے اسے پہچان لیا۔ اس کے بال بھی تھوڑے تھوڑے سفید ہو گئے تھے مگر دبلا پتلا جسم اسی طرح چاق و چوبند تھا۔ شیر خان کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ پھر دونوں بازو کھول کر سنہالی زبان میں میرے پیارے شیر کہتا اس سے لپٹ گیا۔ پہرے پر کھڑے سنہالی نے اپنی پستول جیب میں ڈال لی۔ دونوں دوست ایک مدت کے بعد ملے تھے۔ بار بار ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور لپٹ جاتے ارجنا نے اپنا بازو شیر خان کی گردن میں ڈال رکھا تھا۔ وہ اسے اپنے اڈے پر لے آیا۔ یہ خفیہ اڈہ ویسا ہی تھا جیسے اسمگلروں کے خفیہ ٹھکانے ہوا کرتے ہیں۔ اوپر سے دو تین جھونپڑے ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ ایک جھونپڑے میں ناریل بھرے پڑے تھے۔ دوسری جھونپڑے کے باہر ناریل کی چھال سے رسی بٹنے والا تکلا لگا تھا اور تیسرے جھونپڑے میں بیٹھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ یہاں ناریل کی چھال سے رسیاں کاٹی جاتی ہیں مگر اصل کام ان جھونپڑوں کے پیچھے ایک زمین دوز تہ خانے میں ہوتا تھا۔ جہاں اسمگل کرنے والی کوکین چرس اور ہیروئن کی تھیلیاں پڑی تھیں۔ ارجنا شیر خان کو اس تہ خانے میں لے گیا اور بولا۔

"بس اب اتنا ہی کام باقی رہ گیا ہے بھائی چرس تو اوپر سے آنی بند ہو گئی ہے۔ ہیروئن کی مانگ زیادہ ہے۔ مگر ہیروئن کی اسمگلنگ اب بڑی خطرناک ہو گئی ہے۔ ادھر مال لینے کوئی اپنا آدمی نہیں بھیجتا۔ ہمیں خود مال اوپر کی گھاٹ تک پہنچانا پڑتا ہے۔ لنکا کی حکومت نے اتنی سختی کر رکھی ہے کہ پچھلے ایک مہینے میں ہمارے چار آدمی مارے گئے ہیں اور مال الگ پکڑ لیا گیا ہے۔ تم سناؤ تم انڈیا میں ہو یا پاکستان میں؟ ہم نے تو سنا تھا کہ تم روبی کے ساتھ انڈیا چلے گئے ہو۔ روبی کہاں ہے؟ تم بھی میری طرح بوڑھے ہو گئے ہو مگر اسی طرح

باڈی بلڈر ہو ابھی تک۔"

اور ارجنا قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ پھر دونوں دوست اوپر جھونپڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ ارجنا نے پوچھا۔

"کیا چلے گا؟ سب کچھ ہے۔ کل ہانگ کانگ سے اصلی اسکاچ آئی تھی۔ کہو تو بوتل ابھی آ جائے گی۔" شیر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں ارجنا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں تب بھی شراب نہیں پیا کرتا تھا۔ اور اب تو اس قسم کی باتوں کی عمر بھی نہیں رہی۔" ارجنا ہنس کر بولا

"میرے یار! یہی تو عمر ہوتی ہے اسکاچ پینے کی۔"

"نہیں تم چائے بنواؤ۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر لنکا کی اصلی چائے پیوں گا۔"

"بہت خوب۔" ارجنا نے اشارے سے اپنے آدمی کو بلایا اور سنہالی زبان میں اسے چائے بنانے کا حکم دیا۔ پھر کہنے لگا۔

"شیر خان! تم نے یہ نہیں بتایا کہ روبی کہاں ہے۔ تم دونوں لنکا سے کیسے فرار ہوئے تھے۔" پھر خود ہی ہنس کر بولا۔

"یار فرار ہونا اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تمہارے پیچھے لوگوں نے یہی مشہور کر دیا تھا کہ تم نے نہ جانے کتنے کروڑ کی کوکین بیچ کر سارا روپیہ لے کر روبی کے ساتھ کسی طرف بھاگ گئے ہو۔"

شیر خان سگریٹ سلگا رہا تھا۔ ایک کش لگا کر اس کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"چائے آ جائے تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

لیکن شیر خان نے ارجنا کو سب کچھ نہ بتایا صرف اتنا بتایا کہ اس نے روبی سے پاکستان میں جا کر شادی کر لی تھی۔ پھر روبی فوت ہو گئی اس کے بعد وہ اکیلا رہ گیا۔ کئی کاروبار کیے ہر کاروبار میں نقصان اٹھانا پڑا۔

"اب میں ہر طرف سے مایوس ہو کر دوبارہ یہاں تمہارے پاس آ گیا ہوں میں چاہتا ہوں کہ دوبارہ اپنا پرانا دھندا شروع کر دوں تاکہ کچھ دولت کماؤں اور پیچھے مجھ پر جو لوگوں کے قرض ہیں وہ ادا کر سکوں۔"

ارجنا بڑی دلچسپی سے شیر خان کی باتیں سنتا رہا۔ جب شیر خان نے اپنی بات ختم کی تو اس نے بڑی خوشدلی سے کہا۔

"شیر خان بھائی! میں آج سے اتنے برس پہلے بھی تمہارا دوست تھا اور آج بھی تمہارا دوست ہوں۔ مجھے وہ وقت نہیں بھولا جب تم لاکھوں میں کھیل رہے تھے اور میری ہر طرح مدد کیا کرتے تھے تم مجھ پر بھروسہ کر کے مجھے ہزاروں کا مال دے دیا کرتے تھے۔ اب اگرچہ حالات بدل گئے ہیں لیکن میں حاضر ہوں۔ جتنی بھی ہو سکی تمہاری ضرور مدد کروں گا۔"

شیر خان نے ارجنا کا شکریہ ادا کیا۔ دوپہر کو انہوں نے اسی جھونپڑی میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ باتوں ہی باتوں میں شیر خان نے بظاہر بڑی بے نیازی سے شباب اور فیروز کے بارے میں پوچھا کہ وہ آج کل کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ ارجنا سگار پی رہا تھا۔ اور دری پر ٹانگیں پھیلائے نیم دراز تھا کہنے لگا۔

"ان دونوں سے ایک عرصہ ہوا ملاقات نہیں ہو سکی اصل میں ان کا سارا کاروبار شمال میں جافنا کی طرف ہے۔ وہ وہیں رہتے ہیں۔ کولمبو والے سیٹھوں کا اڈہ تو ایک مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے سنا ہے کہ آج کل بھی وہ دونوں جافنا کے پاس کسی جزیرے میں ہوتے ہیں۔ وہیں سے مال باہر اسمگل کرتے اور وصول کرتے ہیں۔"

شیر خان نے سگریٹ جھونپڑی سے باہر اچھالتے ہوئے کہا۔

"ان دونوں سے ملاقات کرنے کو بڑا جی چاہتا ہے۔ ان کے ٹھکانے کا پتا چل جائے تو کبھی ان سے بھی ملاقات ہو جائے۔ آخر وہ بھی میرے پرانے ساتھی ہیں۔"

"کیوں نہیں۔" ارجنا بولا۔ تمہیں پتا کروا دوں گا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آج ہی ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا کر جافنا کی طرف بھیج دیتا ہوں۔" شیر خان نے جلدی سے کہا۔

"مگر ارجنا میں اپنے ان پرانے ساتھیوں سے بھی اچانک ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں تو پھر ملاقات کا مزا نہیں آئے گا اپنے آدمی سے کہو کہ وہ شباب اور فیروز کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائے۔ بس ان کا ٹھکانہ معلوم کر کے واپس آ جائے۔ میں خود ان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اور جب وہ دونوں مجھے ایک دم سے

اپنے سامنے دیکھیں گے تو کتنے حیران ہوں گے۔"

شیر خان مصنوعی ہنسی ہنس دیا۔ کیونکہ وہ یہ ہرگز ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ شہاب اور فیروز کو اس کے لنکا پہنچنے کا علم ہو۔ اس طرح سے تو وہ دونوں اپنا ٹھکانہ بدل لیں گے اور عائشہ کو لے کر کسی دور دراز مقام پر منتقل ہو جائیں گے۔ شیر خان ابھی تک اسی خیال میں تھا کہ عائشہ شیرنی شہاب اور فیروز کے پاس ہی ہو گی۔ ارجنا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے وہ بھی تمہارے بڑے پرانے ساتھی ہیں۔ بلکہ وہ تو تمہارے ملک کے رہنے والے ہیں۔ تمہیں اتنے برسوں کے بعد اچانک دیکھ کر سچ مچ وہ بڑے حیران ہوں گے۔ چلو ٹھیک ہے میں اپنے آدمی کو منع کر دوں گا کہ وہ تمہارے بارے میں کوئی بات نہ کرے۔"

شیر خان جانتا تھا کہ شہاب اور فیروز بڑے عیار ہیں۔ اگر انہیں ارجنا کے آدمی پر ذرا سا بھی شک پڑ گیا تو وہ اسے روپے کا لالچ دے کر یہ معلوم کر لیں گے کہ ارجنا کے پاس فلاں حلیئے کا آدمی آیا ہوا ہے۔ اور پھر شیر خان اور اس کے دشمنوں کے درمیان اور اس کی شیرنی بیٹی کے درمیان فاصلہ مزید طویل ہو جائے گا۔ اس نے ارجنا سے کہا۔

"میرے بھائی! تم ایسا کرو کہ احتیاط کے طور پر کسی ایسے آدمی کو بھجواؤ جس نے مجھے تمہارے پاس نہ دیکھا ہو۔" ارجنا فوراً راضی ہو گیا۔

"ٹھیک ہے شیر خان! میں دوسرے ٹاپو پر جا کر وہاں سے ایک آدمی بھیج دوں گا اور اسے تاکید کر دوں گا کہ وہ شہاب اور فیروز کو یہ بھی نہ بتائے کہ ارجنا نے بھیجا ہے بس ان کے ٹھکانے کا سراغ لگا کر واپس آ جائے یہ ہو جائے گا یار بھائی اس کی تم فکر نہ کرو۔ ویسے میں تمہیں ایک مشورہ دوں گا شہاب اور فیروز کے ساتھ کاروبار شروع کرنے کے بارے میں ہرگز نہ سوچنا میں نے ان دنوں سنا تھا کہ وہ دونوں تمہارے خلاف اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں کہ تم ان کا مال لے کر فرار ہو گئے ہو۔"

"یہ سب جھوٹ ہے ارجنا میں مال کو وہیں آگ لگا کر گیا تھا اور اگر مجھے شہاب اور فیروز کے ساتھ ہی یہاں کاروبار شروع کرنا ہوتا تو میں تمہارے پاس نہ آتا بلکہ ان کی تلاش میں سیدھا جافنا جاتا یا تیرے پاس آ کر سب سے پہلے ان کے بارے میں پوچھتا میں تو خود ان

پر اعتبار نہیں کرتا صرف تمہیں ہی اپنا سچا دوست سمجھتا ہوں اور وطن چھوڑ کر سیدھا تمہارے پاس ہی آیا ہوں۔ ان سے تو میں ویسے ہی ملاقات کرنا چاہتا تھا۔"

"بس ٹھیک ہے۔" ارجنا نے شیر خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا اور کہا۔" مجھے اپنا جگری دوست سمجھو۔ اپنا خیر خواہ سمجھو۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا تمہارے واسطے کروں گا۔" پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔" میں کچھ دنوں سے سوچ رہا تھا کہ بجائے مال ایجنٹوں کے حوالے کرنے کے خود اسے لے کر آسٹریلیا پہنچنے کی کوشش کروں۔ مگر مجھے کوئی بااعتبار ساتھی نہیں مل رہا تھا۔ اب تم آ گئے ہو تو مجھے حوصلہ ہوا ہے۔ اگر تم میرے ساتھ چلنے کی حامی بھر لو تو جو رقم ملے گی دونوں آدھی آدھی کر لیں گے۔ کیا خیال ہے؟ یار بھائی! یہ ایجنٹ تو سو کا ایک روپیہ بھی نہیں دیتے اور ہیروئن بڑا مہنگا آئیٹم ہے۔"

شیر خان نے جانا تو تھا نہیں اس لئے فوراً حامی بھ لی پھر تھوڑی مصنوعی تشویش کے ساتھ کہنے لگا۔

"ارجنا اب میری وہ جوانی والی عمر نہیں رہی۔ اتنے بڑے کام کے لیے میں اپنے کو اہل نہیں پاتا ہاں یہاں رہ کر میں تیرا ہاتھ ضرور بٹا دوں گا۔"

"اچھا یار! جیسے تیری مرضی۔ میں کسی دوسرے کو ساتھ لے چلوں گا۔ یوں تو کئی لوگ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ پر مجھے اعتبار کسی پر نہیں۔ تم پر پورا اعتبار تھا۔ چلو خیر۔ اس بارے میں پھر کبھی بات کریں گے ابھی بہت وقت پڑا ہے اب تم آرام کرو۔"

شیر خان کو بار بار اپنی بیٹی کا خیال ستا رہا تھا۔ کہ وہ نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ وہ بجلی کی طرح کڑکتا ہوا شہاب اور فیروز کے سروں پر جا پہنچنا چاہتا تھا مگر وہ مجبور تھا۔ اسے ان دشمنوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس جگہ پر ہیں۔ ذرا سی بے احتیاطی اور جذباتی پن خود شیر خان کے واسطے جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح دوسری رات بھی گزر گئی۔

دوسرے روز ارجنا نے ایک آدمی شہاب اور فیروز کا پتا چلانے کے واسطے جافنا کی طرف بھیج دیا۔ ارجنا نے دوسرے ٹاپو سے ایک ایسے آدمی کو اس کام کے لیے بھیجا تھا جس کو شیر خان کی آمد کا علم ہی نہیں تھا۔ جب تک وہ آدمی واپس نہیں آیا شیر خان اندر ہی

اندر سخت بے چین رہا۔ مگر اوپر سے اس نے اپنی بے چینی کو ذرا بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ دو دن بعد وہ آدمی واپس آ گیا اور اس نے خبر دی کہ شہاب اور فیروز پورٹ پیڈرو کے جزیرے میں ہوتے ہیں۔ وہیں ہانگ کانگ سے آنے والے ناجائز مال کو وصول کر کے اوپر انڈیا کی طرف اسمگل کرتے ہیں۔ شیر خان وہاں جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں شہاب اور فیروز اس کی بیٹی کو لے کر کہیں وہاں سے چلے نہ جائیں اس کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ شہاب اور فیروز عائشہ کو قتل بھی کر سکتے ہیں۔ وہ اسے آگے فروخت بھی کر سکتے ہیں۔ ارجنا نے شیر خان کو بہت کہا کہ ابھی کچھ روز اس کے پاس رہے مگر وہ یہی کہتا رہا کہ شہاب اور فیروز سے پہلے مل آؤں۔ پھر تمہارے پاس ہی آ کر رہنا ہے۔ چنانچہ اسی روز وہ دوپہر کی ریل گاڑی سے جافنا کی طرف چل دیا۔

اگر آپ نقشہ دیکھیں تو آپ کو سری لنکا کے جزیرے کے شمال میں جافنا کے بالکل اوپر پورٹ پیڈرو لکھا ہوا نظر آئے گا۔ یہ کوئی اتنی اہم بندرگاہ نہیں ہے۔ کیونکہ لنکا سے مال بردار جہاز ٹالی منار کی بندرگاہ ہی سے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ اور جاپان کی طرف جاتے ہیں۔ کیونکہ پورٹ پیڈرو ذرا جنوب کی طرف ہٹ کر واقع ہے اور عام سمندری شاہراہ پر نہیں ہے۔ ویسے بھی اس کے آس پاس سمندری چٹانوں کی بھرمار ہے۔ اور ایسی جگہ تجارتی بندرگاہوں کے لیے موزوں نہیں ہوا کرتی۔ لیکن وہاں حکومت کی طرف سے کوسٹ گارڈز کی پوری گارڈ ہمہ وقت موجود رہتی ہے اور ایک بہت بڑا لائٹ ہاؤس بھی سمندری چٹان پر بنا ہوا ہے کیونکہ ٹرنکو مالی اور باتی کلاوا کی طرف جانے والے بحری جہاز اسی طرف سے گزرتے ہیں۔ یہ لائیٹ ہاؤس ان کو پانی میں چھپی ہوئی نوکیلی چٹانوں سے دور رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ وہاں سمندر مختلف چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں میں تقسیم ہو کر ساحلی چٹانوں میں سے ہوتا ہوا اندر جنگل تک چلا گیا ہے۔ جرائم پیشہ لوگ اور اسمگلروں کے چھپنے اور خفیہ اڈے بنانے کے لیے یہ نہایت موزوں جگہ ہے۔ سمندر میں قریبی بندرگاہوں کی طرف آتے جاتے اسٹیمروں کو لوٹنے والے ڈاکو بھی کبھی کبھی یہاں مال لے کر چھپ جاتے ہیں ساحلی گارڈز کی اکثر ان لوگوں اور دوسرے اسمگلروں سے جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ چونکہ یہاں سے شمال مشرق اور مغرب کی طرف سمندر کھلا ہے اور رات کے اندھیرے

میں اسمگلنگ کا مال لے کر اسٹیمر اور کشتیاں تین اطراف سے آ جا سکتی ہیں اس لیے یہ سارے کا سارا شمالی سنگلاخ ساحلی علاقہ جرائم پیشہ افراد کی جنت سمجھا جاتا ہے۔ ساحلی گارڈز بھی ان کی طرف سے چشم پوشی کرتی ہے اور صرف ان لوگوں پر فائرنگ کھولتی ہے جن کے ساتھ کمیشن کا معاملہ طے نہیں ہوا ہوتا۔

یہی پورٹ پیڈرو کبھی شیر خان اور روبی کی سرگرمیوں کا مرکز ہوتا تھا۔ یہاں انہوں نے کئی معرکے مارے تھے اور ساحلی گارڈز کی فائرنگ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ یوں اس علاقے کا چپہ چپہ شیر خان کا جانا پہچانا تھا۔ وہ رات کے پچھلے پہر جافنا پہنچا۔ اتنی مدت بعد وہ یہاں آیا تھا ریلوے اسٹیشن تھوڑا بدل گیا تھا۔ شہر کی آبادی بھی گنجان ہو گئی تھی۔ کئی نئی عمارتیں اسے جگمگاتی نظر آئیں۔ باقی شہر ویسے کا ویسا ہی تھا اور شیر خان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ جافنا سے ٹرین کنکے سموریا تک ہی جاتی تھی جو شمال کی طرف جزیرہ سری لنکا کا آخری ریلوے اسٹیشن تھا۔ اس کی دائیں جانب تقریباً دس بارہ میل کے فاصلے پر پورٹ پیڈرو کا ساحلی علاقہ آ جاتا تھا۔ شیر خان نے رات کا باقی حصہ وہیں اسٹیشن پر گزارا۔

صبح کے چھ بجے ایک چھوٹی ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اس ریل گاڑی نے دو گھنٹوں میں اسے کنکے سموریا پہنچا دیا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں اس نے اپنی نوجوانی کے بہترین ایام گزارے تھے۔ وہ یہاں آنکھیں بند کر کے بھی راستہ تلاش کر سکتا تھا۔ شہاب اور فیروز کے گروہ میں ابھی تک ایسے لوگ موجود تھے جو شیر خان کو شکل سے پہچانتے تھے۔ اس لیے شیر خان بڑا محتاط ہو کر چل رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہاب یا فیروز میں سے کسی کو اس کے جزیرے پر پہنچنے کی خبر ہو۔ لیکن یہ سراغ لگانا بھی ضروری تھا کہ یہ دونوں بدکردار انسان کس ٹاپو کے جنگل میں ہیں اور انہوں نے عائشہ کو کہاں قید کر رکھا ہے۔

ایک مچھیرا چھوٹی کشتی چلاتا ٹاپو کی کھاڑی میں نمودار ہوا۔ شیر خان ایک طرف چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔ مچھیرا کشتی چلاتا آگے نکل گیا۔ شیر خان نے ماحول کا گہری نگاہ سے جائزہ لیا۔ یہ جنگل تھوڑا بدل گیا تھا۔ کہیں درختوں کے پرانے ذخیرے ختم ہو گئے تھے اور کہیں نئے درختوں کے جھنڈ اگ آئے تھے۔ شیر خان جنگل کے اندر گھستا چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں ایک اندھا خشک کنواں ہوا کرتا تھا جہاں وہ لوگ کبھی کبھی چھاپہ پڑنے پر اپنا مال چھپا

دیا کرتے تھے وہ چند قدم گیا ہو گا کہ ایک ٹھگنے قد کا سنہالی درختوں میں سے نکل کر اس کے سامنے آگیا اور سنہالی زبان میں بولا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟" جسم کے قد کاٹھ اور رنگ روپ سے شیر خان وہاں کا آدمی کسی طرح سے بھی نہیں لگتا تھا۔ مگر جب شیر خان نے بڑی رواں سنہالی زبان میں جواب دیا کہ وہ کولمبو سے جڑی بوٹیوں کی تلاش میں ادھر آیا ہے تو سنہالی ٹھیک ہے ٹھیک کہتا آگے نکل گیا۔ ذرا آگے جا کر وہ سنہالی جھاڑی میں چھپ گیا اور شیر خان کے وہاں سے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ شہاب اور فیروز کے گروہ کا آدمی تھا اور اسے سختی سے حکم دیا گیا تھا کہ کوئی بھی اجنبی ادھر سے گزرتا دیکھے تو اسے وہیں ہلاک کر ڈالے کیونکہ یہ شہاب اور فیروز کی ناجائز سرگرمیوں کا بڑا حساس علاقہ تھا۔ مشکوک اجنبی کو ہلاک کر دینے پر کارکن کو شہاب فیروز کی جانب سے بڑا انعام دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب اس سنہالی نے ایک اجنبی کو دیکھا تو انعام کے لالچ میں وہ شیر خان کو وہیں ہلاک کر ڈالنا چاہتا تھا مگر اس کے قد کاٹھ کی وجہ سے سنہالی کی ہمت نہ پڑی۔ چنانچہ وہ آگے جا کر گھات لگا کر بیٹھ گیا۔

شیر خان کے پاس بڑا کمانی دار چاقو ضرور تھا مگر وہ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا بلکہ پتلون کی جیب میں تھا۔ جونہی شیر خان جھاڑی کے قریب سے گزرا سنہالی نے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ شیر خان کی تقریباً آدھی سے زیادہ عمر انہی کاموں میں گزری تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے عین وقت پر خبردار کر دیا اور اگر وہ بجلی کی طرح تڑپ کر ایک طرف نہ ہو جاتا تو سنہالی کا دس انچ لمبا خنجر اس کی کمر کو چیرتا ہوا اس کے دل میں گھس گیا ہوتا۔ سنہالی دنگ سا ہو کر رہ گیا کہ یہ آدمی کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اب یہ سنہالی شیر خان کے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ شیر خان سمجھ گیا تھا کہ یہ شہاب اور فیروز کے گینگ کا آدمی ہے اور اسے یہاں مشتبہ افراد کی نگرانی کے لیے چھوڑ رکھا گیا ہے۔ شیر خان کو صرف ایک ہی خطرہ تھا کہ سنہالی کہیں شور نہ مچا دے۔ اس طرح شہاب اور فیروز کو وہاں سے کسی دوسری جگہ نکل جانے اور عائشہ کو گزند پہنچانے کا موقع مل سکتا تھا۔ سنہالی نے کمال جرات سے کام لیتے ہوئے خنجر تان لیا شیر خان نے بھی جیب سے کمانی دار چاقو نکال لیا۔ مگر وہ سنہالی کے ساتھ داؤ پیچ کا کھیل نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سیدھی لات اتنی زور سے سنہالی

کے بازو پر ماری کہ اس کے ہاتھ سے خنجر اچھل کر دور جا گرا۔ شیر خان نے اسے وہیں دبوچ لیا اور چاقو اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔

"شہاب اور فیروز کا اڈہ کہاں ہے؟" شیر خان اس سنہالی کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں ان لوگوں کی سرگرمیوں سے واقف ہوں اور ان ہی کی تلاش میں وہاں آیا ہوں۔ سنہالی نے پہلے تو زبان بند رکھی لیکن جب شیر خان نے چاقو کا پھل اس کی گردن میں تھوڑا دبایا تو وہ بک پڑا۔

"آگے ایک پوکھر کے پاس ہے۔" شیر خان نے دوسرا اہم ترین سوال پوچھا۔

"وہ جس لڑکی کو اپنے ساتھ ہندوستان سے لائے تھے وہ کہاں ہے۔ جلدی بتاؤ نہیں تو تمہاری گردن کاٹ دوں گا۔" سنہالی کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس نے کہا۔

"وہ کسی لڑکی کو انڈیا سے نہیں لائے وہ تو دونوں اکیلے یہاں آئے تھے۔" شیر خان تذبذب میں پڑ گیا۔ اس نے چاقو کا پھل مزید دباتے ہوئے غصے سے پھر پوچھا۔

"تم جھوٹ بکتے ہو۔ وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی بھی لائے تھے۔" پھر شیر خان نے عائشہ کا تھوڑا سا حلیہ بیان کیا۔ سنہالی نے دونوں ہاتھ کانوں سے لگائے اور عاجزی سے بولا۔

"میں بھگوان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب وہ انڈیا سے واپس آئے تھے تو ان کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو مجھے بتانے میں کیا حرج تھا؟" شیر خان نے چاقو سنہالی کی گردن سے ہٹایا وہ اٹھا ہی تھا کہ ایک آدمی جھاڑیوں میں سے نکل کر اس جھپٹا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں ڈھا تھا۔ ڈھا تلوار کی طرح کا ہتھیار ہوتا ہے مگر اس کی کاٹ تلوار سے زیادہ مہلک اور تیز ہوتی ہے۔ یہ سارے ہتھیار شیر خان کے آزمائے ہوئے تھے۔ شیر خان اچھل کر پرے ہو گیا۔ اور فوراً ہی ہاتھ کو گھما کر چاقو اس آدمی کی طرف پھینکا اس قسم کی نشانے بازی میں شیر خان کو بڑی مہارت حاصل تھی اور اس کا وار کبھی خالی نہیں گیا تھا۔ چاقو بجلی کی طرح لشکار مار کر دوسرے سنہالی کے پیٹ پر لگا اور اندر گھس گیا۔ ڈھا اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور وہ دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ کر دوزانوں ہو گیا۔ اتنی دیر میں پہلے سنہالی کو موقع مل گیا اس نے اٹھ کر اپنا خنجر پکڑنے کی کوشش کی جو چند قدم کے فاصلے پر پڑا تھا مگر اب شیر خان اسے بھی کوئی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے سنہالی پر چھلانگ لگا دی اور اس کی

گردن کو اپنے طاقتور بازو کے شکنجے میں لے کر ایک ایسا ماہرانہ جھٹکا دیا کہ سنہالی کی گردن ٹوٹ گئی۔ گردن ٹوٹنے کی آواز سنتے ہی شیر خان نے اسے وہیں گرا دیا۔ سنہالی مر چکا تھا۔
دوسرا سنہالی شدید زخمی ہو کر گھاس پر تڑپ رہا تھا۔ خون بری طرح اس کے پیٹ سے بہہ رہا تھا۔ شیر خان نے اس کے پیٹ میں کھبا ہوا چاقو نکالا۔ اسے قریب المرگ سنہالی بدمعاش کے گھٹنوں سے اوپر تک بندھی ہوئی دھوتی سے پونچھ کر صاف کیا۔ اسے بند کر کے جیب میں ڈالا۔ پاس ہی پڑا ہوا ڈھا اٹھا لیا۔ پھر شدید زخمی اور آخری سانس لینے والے سنہالی پر جھک کر پوچھا۔

"شہاب اور فیروز اپنے ساتھ پنجاب سے جو لڑکی لائے تھے وہ کہاں ہے؟"

قریب المرگ سنہالی نفی میں سر ہلانے لگا۔ شیر خان نے کہا۔

"وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی لے کر آئے تھے۔ وہ گورے رنگ کی تھی اس کے بال گولڈن تھے بتاؤ وہ انہوں نے کہاں رکھی ہوئی ہے؟"

سنہالی کا کافی خون بہہ چکا تھا اور اس پر نزع کا عالم طاری تھا۔ احساسات جواب دے رہے تھے۔ اس نے جیسے شیر خان کی بات نہیں سنی تھی۔ شیر خان نے ایک بار پھر اپنی بات کو دہرایا مگر سنہالی مر چکا تھا۔ شیر خان نے دونوں لاشوں کو وہیں جنگل میں چھوڑا اور آگے چل پڑا۔ اب وہ اس کنوئیں کے پاس آگیا جہاں کسی زمانے میں وہ اسمگلنگ کا مال چھپایا کرتے تھے۔ سنہالی نے جس پوکھر کا ذکر کیا تھا وہ شیر خان کو معلوم تھا کہ کہاں پر ہے۔ اس پوکھر کے پاس کبھی ہانگ کانگ والے ٹونی نے اپنا خفیہ اڈہ قائم کر رکھا تھا۔ اندھے کنوئیں کی مینڈیروں پر اونچی اونچی گھاس اگ رہی تھی۔ شیر خان نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ کنوئیں میں سوکھے پتوں اور درختوں کی شاخوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ کنوئیں کی پتھریلی سیڑھیاں بھی گھاس میں چھپ گئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اب اس کنوئیں کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس بات کا شیر خان کو علم ہو چکا تھا کہ شہاب اور فیروز پوکھر والے ٹھکانے میں ہوتے ہیں۔ اسے صرف ایک بات کی پریشانی تھی کہ عائشہ کو اغوا کرنے کے بعد انہوں نے کہاں رکھا ہے کہیں اسے فروخت تو نہیں کر دیا؟ شیر خان کا خون کھول اٹھا۔ اس کے کانوں سے سینک اٹھنے لگا۔ مٹھیاں بھینچ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کو اپنے اوپر ایک بے بس شیر کا گمان

ہوا جس کو چاروں طرف سے آہنی سلاخوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہو۔ دل میں شہاب اور فیروز دونوں کو قتل کر دینے کا ارادہ کر کے وہ پوکھر کی طرف چلا۔
تھوڑا آگے چلا ہو گا کہ بائیں طرف سنبل کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے بڑے گھنے درختوں کے درمیان اسے ایک جھونپڑا نظر پڑا۔ جس کی ڈھلوان چھت ناریل کی شاخوں سے بنی ہوئی تھی۔ اور جس کے باہر چٹائی پر ایک بوڑھا سنہالی ہاتھ میں تسبیح لئے بیٹھا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ قریب ہی ایک عورت مٹکے میں سے شاید اچار نکال کر لکڑی کے پیالے میں ڈال رہی تھی۔ عورت بھی ادھیڑ عمر کی تھی اور اس نے سر پر نیلا رومال باندھ رکھا تھا۔ لنکا کی مسلمان عورتیں اسی طرح اپنے سروں کو ڈھانپ کر رکھتی ہیں۔ بوڑھے نے بھی شیر خان کو دیکھ لیا تھا۔ شیر خان نے سوچا کہ یہ لوگ اسمگلروں کے خفیہ اڈے کے قریب رہتے ہیں یہ ان کے پروردہ ہی ہوں گے وہ بوڑھے سنہالی سے آنکھیں بچا کر نکل جانا چاہتا تھا کہ اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس بوڑھے کی شکل جانی پہچانی ہے۔ اب بوڑھے نے بھی شیر خان کو دیکھ لیا تھا۔ درختوں میں دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی اور وہاں کافی روشنی تھی۔ جونہی شیر خان نے آگے قدم بڑھائے بوڑھے نے سنہالی زبان میں اسے آواز دی۔

"تم شیر خان تو نہیں ہو؟" شیر خان کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ بوڑھے کے قریب آگیا۔ ادھیڑ عمر عورت بھی کام چھوڑ کر شیر خان کو تکنے لگی تھی۔ اچانک وقت کے پردے ہٹتے چلے گئے اور شیر خان نے بھی اس بوڑھے کو پہچان لیا۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھا

"تم کریم ہو کیا؟"

بوڑھے نے اٹھ کر شیر خان کو گلے لگا لیا۔" ہاں شیرا میں کریم ہی ہوں۔ مگر بوڑھا ہو گیا ہوں تم بھی وہ پہلے والے جوان شیر خان نہیں رہے مگر تمہاری شکل نہیں بدلی ادھر شہاب سے ملنے جا رہے ہو؟ بیٹھو یہ میری بیوی ہے تم نے اسے پہلے شاید نہ دیکھا ہو۔"

شیر خان وہیں بوڑھے کریم کے پاس چٹائی پر بیٹھ گیا آج سے پچیس تیس برس پہلے کریم ان لوگوں کے خفیہ اڈے پر کھانا وغیرہ پکایا کرتا تھا۔ ابھی شیر خان کریم سے بات ہی کر رہا تھا کہ کچھ اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ان درختوں کی طرف

سے آرہی تھی جدھر دو سنہالی بدمعاشوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ کریم نے اس طرف دیکھا اور بولا۔

"شاید شہاب مال لے کر آرہا ہے۔" پھر شیر خان کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔" اچھا ہوا یہ بھی اسی جگہ تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ تم ابھی ملے نہیں ہو شہاب سے کیا؟" شیر خان نے کریم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

"کریم چچا! میں ابھی شہاب اور فیروز سے نہیں ملنا چاہتا۔ اس میں ایک خاص بات ہے جو تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ تمہیں قسم ہے اسے میرے بارے میں ابھی کچھ نہ بتانا۔ میں پیچھے جھاڑیوں میں چھپ جاتا ہوں۔"

شیر خان نے کریم چچا سے قسم لے لی کہ وہ اس کے بارے میں شہاب یا فیروز وغیرہ کو کچھ نہیں بتائے گا۔ آدمیوں کی اونچی اونچی آوازیں اب قریب آرہی تھیں۔ شیر خان دوڑ کر درختوں کے پیچھے جھاڑیوں میں جا کر چھپ گیا۔ اس نے چاقو کھول کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ جھاڑیوں میں سے اسے کریم چچا کے جھونپڑے کا سامنے والا حصہ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ درختوں میں سے تین آدمی نکل کر جھونپڑے کی طرف آئے۔ یہ تینوں نوجوان تھے اور شکل و صورت اور دھاریدار بنیانوں سے ہی جرائم پیشہ اسمگلروں کے گروہ کے آدمی لگ رہے تھے۔ وہ گھبراہٹ میں تھے اور آپس میں تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ کریم چچا ان کے قریب گیا۔

"کیا بات ہے۔ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" کریم چچا نے ان سے سنہالی زبان میں پوچھا۔ ان میں سے ایک نوجوان نے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کریم چچا ادھر میش اور سمردھن کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ دونوں کی لاشیں وہاں پڑی ہیں۔"

"شہاب اور فیروز دادا کہاں ہیں؟" کریم چچا نے پوچھا۔

"وہ مال کی ڈلیوری لینے گئے ہیں کل آئیں گے مگر ان لوگوں کو کس نے قتل کیا؟ وہ تو ڈیوٹی پر تھے۔" کریم چچا بھی پریشان نظر آرہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کیا پتا انکا آپس میں جھگڑا ہو گیا ہو۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو گئے ہوں۔"

دوسرا نوجوان بولا۔

"دادا! ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ہم تو لاشیں یہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ مالک آئیں گے تو خود پتا کر لیں گے کیا ہوا۔" کریم چچا نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ارے لاشوں کو تو اڈے پر لے جاؤ۔ یہاں رات کو جانور نہ کھا جائیں انہیں۔ شہاب دادا کو کیا جواب دو گے کم بختو!" تینوں نوجوان ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ ایک نے کہا۔

"ٹھیک ہے چچا۔ ہم لاشیں لیے جاتے ہیں۔ تم گواہ رہنا ہم نے انہیں قتل نہیں کیا؟"

"ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے۔ جاؤ لاشیں لے جاؤ۔" کریم چچا نے کہا اور بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔ تینوں آدمی جدھر سے آئے تھے ادھر چلے گئے۔ ان کی باتیں شیر خان نے صاف سن لی تھیں۔ جب تینوں نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ جھاڑیوں میں سے نکل کر کریم چچا کی طرف آیا۔ کریم چچا نے غور سے شیر خان کی طرف دیکھا۔ شیر خان آگے سے کچھ نہ بولا۔ کریم کی بیوی جھونپڑی سے ایک چھاج لے کر باہر آگئی کریم نے شیر خان سے کہا۔

"میرے ساتھ جھونپڑی میں آجاؤ۔" جھونپڑی میں بھی ایک چٹائی بچھی تھی۔ اندر آتے ہی کریم نے شیر خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"جھوٹ مت بولنا۔ ان لوگوں کو تم نے قتل کیا ہے؟" شیر خان دو سیکنڈ کے لیے خاموش رہا۔ پھر اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا۔

"پہلے حملہ انہوں نے کیا تھا۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اگر میں انہیں ہلاک نہ کرتا تو ان کی جگہ اس وقت میری لاش پڑی ہوتی۔" کریم چچا نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"شیرو! تم تو شہاب سے ملنے آئے ہو۔ پھر تم نے اس کے آدمیوں کو بتا دینا تھا کہ تم شہاب کے ساتھی رہ چکے ہو۔ وہ آدمی تو نئے تھے۔" شیر خان بولا۔

"چچا! تم مسلمان ہو۔ میں بھی مسلمان ہوں تم مجھے بچپن سے جانتے ہو۔ میں ایک غیرت مند انسان ہوں۔ اب غور سے سنو میں تمہیں سارا قصہ کھول کر سناتا ہوں۔" اور پھر شر خان نے کریم چچا سے شروع سے آخر تک ساری کہانی بیان کر ڈالی۔ کریم چچا پر ان

واقعات کا بڑا اثر ہوا۔ خاص طور پر اس واقعے پر اس نے سخت برہمی کا اظہار کیا کہ شہاب اور فیروز شیر خان کی بیٹی کو اغوا کر کے لے آئے تھے۔ اس نے شیر خان سے کہا۔

"مگر شیرے! شہاب اور فیروز جب تمہارے ملک پاکستان سے واپس آئے تھے تو ان کے ساتھ کوئی عورت نہیں تھی۔" شیر خان کے چہرے پر انتہائی فکر مندی کے تاثرات تھے۔ کہنے لگا۔

"جو سنہالی میرے ہاتھوں مارا گیا اس نے بھی یہ کہا تھا۔ مگر سوال ہے کہ پھر انہوں نے میری بیٹی کو کہاں غائب کر دیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ عائشہ کو وہ کہیں فروخت کر چکے ہوں؟"

"یہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں بیٹا۔ تم ان کی خصلت سے واقف ہو۔" کریم چچا نے آزردگی سے کہا شیر خان کے بدن میں جیسے جوالا مکھی کھول رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"کریم چچا! میری بیٹی تو اپنی عزت بچانا جانتی ہے۔ وہ اب تک یا تو اپنی جان پر کھیل چکی ہو گی یا کئی لوگوں کو قتل کر چکی ہو گی میں نے اسے یہی تربیت دی ہے کہ اگر جان پر بنے تو مال قربان کر دو۔ لیکن اگر عزت پر حرف آنے کا خطرہ ہو تو اپنی جان بھی قربان کر دو۔ لیکن میں شہاب اور فیروز کو زندہ نہیں چھوڑوں گا انہوں نے برسوں کی دوستی کا گریبان تار تار کیا ہے اور میری عزت کو داغ دار کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ میں یہی مشن لے کر یہاں آیا ہوں۔" کریم چچا کہنے لگا۔

"بیٹا سب سے پہلے ہمیں بچی کا پتا چلانا ہو گا کہ وہ کہاں پر ہے۔ میرا خیال ہے کہ شہاب وغیرہ نے اسے کسی جگہ پر چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ مگر چھپائے رکھنے سے انہیں کوئی فائدہ نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ انہوں نے بیٹی کو بیچ ڈالا ہو۔ تم فکر نہ کرو۔ ابھی تم میرے پاس ہی ٹھہرو۔ میں اپنے طور پر سارا پتا کرا لوں گا۔"

شیر خان کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ سب سے پہلے اپنی بیٹی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے۔ اس کے بعد اسے شہاب اور فیروز سے نمٹنا تھا۔ اس نے کریم چچا کو سری لنکا کی کرنسی میں دو ہزار روپے دیے اور کہا کہ مجھے کہیں سے

ریوالور یا پستول لا دو۔ خالی چاقو شاید میری حفاظت نہ کر سکے۔ کریم کی بیوی چٹائی پر بچھے ہوئے کیلوں کے پتوں پر کھانا ڈال رہی تھی۔ کریم جھونپڑی میں گیا اور اندر سے ایک جرمن موزر (ریوالور) نکال کر لایا جس کے چیمبر میں میگزین بھرا ہوا تھا۔

"یہ تم اپنے پاس رکھو اور مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے شیرے۔ یہ روپے بھی واپس لے لو۔" مگر شیر خان نے اصرار کر کے روپے کریم چچا کے پاس ہی رہنے دیے۔

جرمن ریوالور آٹو میٹک تھا اور اس کے ساتھ ایک سائیلنسر بھی تھا جو شیر خان نے اسی وقت ریوالور کی نالی پر چڑھا لیا۔ دونوں نے جھونپڑی کے اندر چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔

شہاب اور فیروز کو اگلے روز پہنچنا تھا۔ کریم چچا نے انتہائی رازداری سے کام لیا۔ اس نے اپنی بیوی کو بھی ساری بات بتا دی کہ شیر خان کی بیٹی کو شہاب اور فیروز نے اغوا کر لیا ہے اور وہ اپنی بیٹی کی تلاش میں آیا ہے۔ ساتھ ہی اسے بھی تاکید کر دی کہ وہ شیر خان کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے اس جھونپڑی کے پیچھے جھاڑیوں کے اوٹ میں ڈھلان پر ایک اور جھونپڑی تھی جہاں درختوں کی سوکھی شاخوں اور ناریل کی چھال کا اسٹاک پڑا تھا۔ وہاں کریم چچا نے شیر خان کے چھپنے کے واسطے جگہ بنا دی اور ہدایت کی کہ وہ زیادہ تر جھونپڑی کے اندر ہی رہنے کی کوشش کرے۔ وہ رات گزر گئی۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت شیر خان کے پاس کریم چچا آیا اور اس نے خبر دی کہ شہاب اور فیروز ابھی ابھی پہنچے ہیں اور اپنے گینگ کے دو آدمیوں کے قتل کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ادھر بھی موقع واردات دیکھنے آئیں۔

"انہوں نے مجھے بھی پوچھا ہے کہ یہ لوگ جنگل میں کیسے قتل ہو گئے میں نے تو اسے یہی بتایا ہے کہ ہو سکتا ہے دونوں کا آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہو۔ مگر شہاب سخت برہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انہیں ہمارے کسی دشمن نے قتل کیا ہے۔" شیر خان خاموشی سے کریم چچا کی بات سنتا رہا۔ کریم چچا نے کہا۔

"تم یہاں سے باہر مت نکلنا اگر دیکھو کہ شہاب اور فیروز اس جھونپڑی کی تلاشی لینے آ رہے ہیں تو پیچھے کی طرف سے نکل کر جنگل میں چھپ جانا۔ جب تک بیٹی عائشہ کا پوری طرح سے سراغ نہیں مل جاتا تم ان دونوں میں سے کسی کو ہلاک کرنے کی کوشش نہ کرنا۔

اس طرح ہمیں کبھی عائشہ بیٹی کا سراغ نہ مل سکے گا کیونکہ میں نے دیکھ لیا ہے کہ یہاں بیٹی کے بارے میں کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔"

شیر خان زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی کہ شاب اور فیروز وہ جگہ دیکھنے آگئے جہاں اس کے گروہ کے دو آدمی قتل ہوئے تھے۔ اس کی اطلاع کریم چچا نے شیر خان کو کر دی اور خود اپنے جھونپڑے کے سامنے درخت کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ شیر خان اپنی جھونپڑی میں سے چھپ کر باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے شہاب اور فیروز کو درختوں میں سے آتے دیکھا تو اس کا خون ابلنے لگا ہاتھ بے اختیار ریوالور کی طرف چلا گیا مگر پھر کچھ سوچ کر ریوالور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ شعلے برساتی آنکھوں سے شہاب اور فیروز کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں نے پستول لٹکا رکھے تھے۔ پیچھے رائفل بردار دو باڈی گارڈ چل رہے تھے کریم چچا نے آگے بڑھ کر دونوں کا استقبال کیا اور موقع واردات کی طرف چل دیے۔ اب شیر خان کو صرف باتیں کرنے کی کبھی کبھی آواز ہی آجاتی تھی آدمی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ جہاں اس نے دو سنہالیوں کو قتل کیا تھا وہ جگہ درختوں کی آڑ میں تھی۔ بمشکل دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ شہاب اور فیروز درختوں میں سے کریم چچا کے جھونپڑے کی طرف آتے نظر آئے وہ جھونپڑے کے سامنے آکر رک گئے شہاب نے سنہالی زبان میں کریم چچا سے کہا۔

"یہ کام کسی باہر کے آدمی کا ہے۔ قاتل خفیہ پولیس کا آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ اسی جنگل میں کہیں چھپا ہوا ہو۔ تمہیں نظر رکھنی ہے اور ایک ایک پل کی مجھے خبر کرنی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے دادا۔ میں چوکس رہوں گا۔" کریم چچا نے بڑے ادب سے کہا۔ فیروز نے گردن گھما کر پچھلی جھونپڑی پر نگاہ ڈالی اور پوچھا۔

"اس میں کیا ہے؟" شیر خان نے ریوالور جیب سے نکال لیا۔ کیونکہ وہ اسی جھونپڑی میں چھپا ہوا تھا۔ کریم چچا نے کہا۔

"ناریل کی چھال پڑی ہے۔ کچھ جلانے کی لکڑیاں ہیں۔"

"چلو چل کر دیکھتے ہیں۔" شہاب بولا۔ اور پھر وہ جھونپڑے کی طرف بڑھے۔ اس کے ساتھ ہی شیر خان تیزی سے باہر نکل کر کچھ فاصلے پر جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور اپنی نگاہیں جھونپڑے پر جما دیں۔ ریوالور اس نے سیدھے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ شہاب اور فیروز آگے آگے تھے۔ پیچھے کریم چچا اور باڈی گارڈ تھے۔ شہاب نے اشارہ کیا کہ ایک باڈی گارڈ رائفل سیدھی کر کے جھونپڑے میں گھس گیا پھر باہر آکر کہا کہ اندر کوئی نہیں ہے شہاب اور فیروز جس طرف سے آئے تھے اس طرف چل دیے۔ باڈی گارڈ اور کریم بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ شہاب نے رک کر کریم چچا کو کچھ کہا اور واپس بھیج دیا۔

شیر خان یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جب شہاب اور فیروز نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ جھاڑیوں سے اٹھ کر جھونپڑے میں واپس آگیا۔ تھوڑی دیر بعد کریم چچا بھی آگیا۔ وہ کچھ پریشان تھا کہنے لگا۔

تمہارے بارے میں تو اس کا وہم و گمان بھی نہیں کہ تم یہاں آئے ہوئے ہو اسے خفیہ پولیس پر شک ہے کہ اس کے آدمی یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ فیروز کا خیال تھا کہ یہ کام تامل گوریلوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال شہاب نے اپنے آدمیوں کو یہاں نگرانی پر لگا دیا ہے اب تمہارا اس جھونپڑے میں رہنا خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

شیر خان حسب عادت خاموشی کے ساتھ کریم چچا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ کریم چچا کہہ رہا تھا۔

"تم اس سارے علاقے سے واقف ہو۔ بہتر ہو گا کہ تم دو ایک روز کے لئے جھال

والی چٹانوں کے کسی غار میں چھپ جاؤ۔ میں رات کو تمہیں کھانا دے جایا کروں گا۔ وہاں پانی کی بھی تمہیں تکلیف نہیں ہو گی۔ دو ایک دن میں بچی کے بارے میں معلومات حاصل کر لوں گا۔ بہر حال میں تمہیں اب اس جگہ رہنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

شیر خان جانتا تھا کہ اگر شہاب اور فیروز کو پتا چل گیا کہ وہ جھونپڑے میں پناہ لیے ہوئے تھا تو کریم چچا اور اس کی بیوی کی موت یقینی تھی۔ وہ ان دونوں نیک دل بوڑھوں کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ جھال یعنی چھوٹی آبشار والی چٹانوں کی طرف جانے پر راضی ہو گیا۔

"مگر چچا بچی کا سراغ معلوم کرنا بڑا ضروری ہے مجھ سے زیادہ انتظار نہیں ہو گا۔" کریم چچا نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا مگر اس میں بڑی احتیاط بھی کرنی پڑ رہی ہے کہ کہیں شہاب یا فیروز کو شک نہ ہو جائے کہ میں اس بارے میں اتنی کرید کیوں کر رہا ہوں۔ بہر حال میں اسی ٹوہ میں ہوں' تم شام کو کھانا کھا کر جھال کی طرف نکل جانا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے وہاں تین غار ہیں۔ تم آخری غار میں چھپنا۔ اس طرف کوئی نہیں جاتا۔"

شیر خان نے ایسا ہی کیا شام کو تھوڑا بہت کھانا زہر مار کرنے کے بعد وہ وہاں سے ایک فرلانگ دور پہاڑی نالے کے اوپر چٹانوں کے درمیان جہاں ایک چھوٹی سی آبشار گرتی تھی وہاں پیچھے جو چٹانوں میں تین قدرتی غار تھے ان میں جو سب سے آخری غار تھا وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ کریم چچا نے چٹائی سرہانہ' پانی پینے والا شیشے کا گلاس اور ایک باریک چادر اور دو موم بتیاں اسے ساتھ دے دی تھیں۔ مگر یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ موم بتی غار میں اس طرح جلائے کہ اس کی روشنی باہر سے ہرگز دکھائی نہ دے وہ رات شیر خان نے غار میں گزار دی۔ صبح چھوٹے سے پہاڑی چشمے پر آ کر منہ ہاتھ دھویا۔ وضو کر کے نماز پڑھی اللہ سے اپنی بچی کی خیریت کی دعا مانگی اور غار کے منہ کے قریب ایک طرف آڑ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ کریم چچا عائشہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات ضرور حاصل کرے گا۔ دوپہر کو بوڑھا کریم شیر خان کے لئے کھانا لے کر آیا تو شیر خان نے پہلا سوال عائشہ بچی کے بارے

میں پوچھا۔ کریم نے بڑی مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"شیرے بیٹا! ابھی تک میں کچھ پتا نہیں چلا سکا مجھے بہت سوچ سمجھ کر اس بارے میں پوچھنا پڑتا ہے۔ سیدھے سبھاؤ میں شہاب یا فیروز سے کوئی سوال نہیں کر سکتا۔ تم مجھے دو ایک دن کی اور مہلت دے دو۔ خدا نے چاہا تو بچی کا کچھ نہ کچھ پتہ ضرور مل جائے گا۔ یہاں تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کہہ دو۔"

شیر خان نے نفی میں سر ہلا دیا اور خاموشی سے مچھلی کے ساتھ ابلے ہوئے چاول کھاتا رہا۔ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا بھی بہت ضروری تھا۔ کریم تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ یہ علاقہ سری لنکا کے بالکل شمال میں تھا اور یہاں پر کوئی شہری آبادی نہیں تھی کہیں کہیں مچھیروں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ ان میں زیادہ تعداد مسلمان سنہالیوں کی تھی یا وہ تامل مچھیرے تھے جو صدیوں سے سری لنکا کے شمالی ساحل میں آباد تھے اور اسلام قبول کر چکے تھے۔ تامل گوریلوں کی سرگرمیاں یہاں سے ذرا نیچے دھنش کوڈی اور تالی منار سے شروع ہوتی تھیں۔ اسی مقام پر بھارت اور سری لنکا کے درمیان وہ چھوٹی سی خلیج تھی جہاں سے تامل گوریلوں کو انڈیا سے کمک پہنچتی تھی۔ مگر کبھی کبھی تامل گوریلے اوپر شمال کی بستیوں میں بھی خوراک وغیرہ حاصل کرنے آ جاتے تھے۔ شہاب اور فیروز کے اسمگلنگ گینگ سے تامل گوریلوں کے خوشگوار تعلقات تھے۔ کیونکہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ اسمگلر جرائم پیشہ تھے اور تامل گوریلے تخریب کار تھے جو بھارت کی شہ پر سری لنکا کی جمہوری حکومت کے پر امن ماحول کو تہس نہس کر رہے تھے۔ شہاب اور فیروز ان تامل گوریلوں کو مالی امداد کے علاوہ انہیں شراب اور ہیروئن بھی مفت سپلائی کر دیا کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ تامل گوریلے وہاں سے جاتے ہوئے مچھیروں کی بستی سے کسی لڑکی کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔

شیر خان کو جھال والی غار میں دوسری رات آ گئی تھی۔ وہ کچھ دیر غار کے باہر ٹہلتا رہا۔ پھر جب چٹانوں اور آس پاس کے درختوں میں رات کا اندھیرا چھا گیا تو وہ غار کے اندر آ کر موم بتی جلا کر چٹائی پر بیٹھ کر ریوالور کا میگزین نکال کر اسے صاف کرنے لگا۔ اس کا ذہن بہت پریشان اور الجھا ہوا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔

وہ عائشہ کے بارے میں آخری خبر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مرگئی ہے۔ لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ایک جگہ بیکار بیٹھ کر انتظار کی گھڑیاں شمار کرے جو شیر خان جیسے آدمی کے لئے نہایت تکلیف دہ کام تھا۔ پستول کو صاف کر کے اس میں سائیلنسر لگایا اور اسے سرہانے رکھ کر لیٹ گیا۔ مگر نیند کوسوں دور تھی۔ پھر بھی شیر خان نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا موم بتی اس نے بجھادی تھی۔ اس کی کلائی کے ساتھ بندھی ہوئی گھڑی رات کے سوا گیارہ بجا رہی تھی۔ ماحول پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا کھاڑی کے اوپر سے ہو کر جب ناریل اور تاڑ کی شاخوں میں سے گزرتی تو کسی وقت ان کی پراسرار سی سرسراہٹ سنائی دے جاتی تھی۔ ان راتوں کی یہ آوازیں اور خاموشیاں شیر خان کی جانی پہچانی اور شناسا تھیں۔ یہاں اس نے ایک عمر گزاری تھی۔ مگر یہاں کی فضا بھی کافی حد تک بدل گئی تھی۔ پہلے ادھر اسٹیمروں کی آواز نہیں آتی تھی مگر اب رات کے وقت بھی دور سے اسٹیمر کے انجن کی آواز آجاتی تھی پہلے دن رات میں شاذونادر ہی کوئی ہوائی جہاز اوپر سے گزرتا تھا۔ مگر اب دن رات میں کتنے ہی جیٹ ہوائی جہاز نکل جاتے ہیں۔ شیر خان پر غنودگی چھانے لگی تھی کہ اسے کچھ انسانی آوازیں سنائی دیں وہ ایک دم سے چوکنا ہو گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے آپ ریوالور پر چلا گیا وہ کان لگا کر سننے لگا کہ یہ آوازیں کیسی تھیں۔ ایک عورت کی آواز آئی جو سنہالی زبان میں منتیں کرنے کے انداز میں کہہ رہی تھی مجھے چھوڑ دو مجھے جانے دو۔ اس کے ساتھ ہی کسی مرد نے تامل زبان میں کسی سے پوچھا۔

"کیوں راجہ چھوڑ دیں اس کبوتری کو؟" دوسرے نے بھی تامل زبان میں ہی جواب دیا۔

"بستی سے اٹھا کر لائے ہیں ایسے ہی تو نہیں چھوڑیں گے۔ لے چل اسے غار کے اندر۔"

شیر خان سمجھ گیا کہ یہ تامل گوریلے ہیں اور مچھیروں کی بستی سے کسی عورت کو اٹھا کر لائے ہیں۔ وہ اپنی طرف سے ہوشیار ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اسے اس معاملے میں دخل دینا چاہیے یا نہیں۔ اتنے میں عورت نے اللہ رسول کا واسطہ دے کر کہا کہ میری عزت

خراب نہ کرو۔ لڑکی مسلمان تھی اس کے ساتھ ہی شیر خان کو اپنی بیٹی عائشہ کا خیال آگیا۔ اس نے ریوالور تھاما اور رات کے اندھیرے میں دبے پاؤں غار سے نکل کر اس طرف چلا جدھر سے عورت کی آواز آئی تھی۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو اور غار تھے۔ ان غاروں کا محل وقوع شیر خان کو معلوم تھا عورت بے بسی سے خدا رسول کے واسطے دیئے جا رہی تھی اور لگتا تھا کہ دونوں تامل گوریلے اسے گھسیٹتے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ پہلے غار میں کچھ نہیں تھا یہ آوازیں اگلے غار کی طرف سے آرہی تھیں۔ شیر خان نے تاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں دیکھا کہ دو آدمی جن کے کاندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں ایک عورت کو کھینچ کر غار کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ عورت بری طرح تڑپ رہی تھی اور ان کے چنگل سے نکل جانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ ایک تامل گوریلے نے زور سے عورت کے منہ پر تھپڑ مار دیا عورت کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ رونے لگی۔ اب انہوں نے مسلمان سنہالی عورت کو ٹانگوں اور بازوؤں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور ڈولی ڈنڈا کر کے غار کی طرف لے چلے۔ شیر خان دائیں جانب سے ہو کر غار کے منہ کے قریب جھاڑیوں کے پیچھے آگیا۔ جونہی وہ غار کے سامنے آئے شیر خان نے ریوالور والا ہاتھ آگے بڑھا کر اگلے گوریلے کے سینے کا نشانہ لے کر اوپر تلے دو فائر کر دیئے۔ ٹھک ٹھک کی آواز پیدا ہوئی اور اگلا تامل گوریلا منہ کے بل گر پڑا۔ دوسرے نے عورت کی ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں وہ فوراً سمجھ گیا کہ سائیلنسر لگے پستول کے فائر ہوئے ہیں وہ عورت کو چھوڑ کر بھاگنے ہی لگا تھا کہ شیر خان اس کے سر پر پہنچ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ رائفل سیدھی کرتا شیر خان نے دو گولیاں اس بدکردار تامل گوریلے کی کھوپڑی میں اتار دیں۔

دہشت زدہ عورت سہمی سہمی سی ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی اور شیر خان کو خوف بھری نظروں سے تکنے لگی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ بھی کوئی ان کا ساتھی ہے اور انہیں ہلاک کر کے اب خود اس کی عزت سے کھیلے گا وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"مجھے کچھ نہ کہنا۔ مجھے کچھ نہ کہنا۔"

شیر خان اس کے قریب آگیا اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور پوچھا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ وہ نوجوان لڑکی تھی عمر انیس بیس سال کے قریب ہو گی شیر خان کے انداز سے اسے

کچھ حوصلہ ہوا کہنے لگی۔

"ہماری بستی پوکھر کے پاس ہے ہم مسلمان تامل لوگ ہیں مجھے میرے گھر سے اٹھا کر لائے تھے میرے ماں باپ کو رسیوں سے باندھ دیا تھا تم مجھے کچھ نہیں کہو گے نا؟"

شیر خان نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "نہیں۔ کیا تم اکیلی اپنی بستی واپس جا سکتی ہو؟" لڑکی نے کہا۔

"مجھے اکیلی جاتے ڈر لگتا ہے۔ ان کے ساتھی کہیں راستے میں نہ مل جائیں۔"

شیر خان وہاں سے کہیں نہیں جانا چاہتا تھا مگر لڑکی کو بھی حفاظت سے اس کے گھر پہنچانا ضروری تھا۔ "اچھا چلو میں تمہیں تمہاری بستی میں چھوڑ آتا ہوں۔" وہ لڑکی کو لے کر پوکھر کی طرف چلا۔ پوکھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا جب بستی کے جھونپڑے تاروں کی دھیمی روشنی میں دور سے نظر آنے لگے تو شیر خان رک گیا۔ "اب تم اپنے گھر جاؤ۔" لڑکی جھونپڑوں کی طرف بھاگ گئی اس کے جاتے ہی شیر خان بھی تیزی سے واپس اپنے ٹھکانے کی طرف چلنے لگا۔

دوسرے دن بستی میں ہر ایک مچھیرے کی زبان پر یہی بات تھی کہ رات تامل گوریلے جس لڑکی کو اٹھا کر لے گئے تھے وہ ان کے چنگل سے بچ کر آ گئی ہے اور وہ دونوں گوریلوں کی لاشیں جنگل میں پڑی ہیں۔ اس بات کا علم شہاب اور فیروز کو ہوا تو وہ پریشان ہو گئے کیونکہ وہ کسی بھی صورت میں تامل ایلام یعنی تامل گوریلوں سے دشمنی پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان سے دشمنی مول لینے کا مطلب یہ تھا کہ تامل ایلام حملہ کر کے ان کے اڈے کو بموں سے اڑا دیتے اور ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ تامل گوریلوں کی لاشیں شہاب اور فیروز کے لئے خطرے کا نشان تھا۔ انہوں نے فوراً اپنے آدمی بھیج کر گوریلوں کی لاشیں وہاں سے غائب کروا دیں اور مسلمان مچھیرن لڑکی اور اس کے باپ کو بلوا کر سختی سے ہدایت کی کہ وہ کسی کے آگے اس کا ذکر نہ کرے کہ تامل ایلام کے دو گوریلے اس کی لڑکی کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ لڑکی کے باپ نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"حضور! خدا نے ہماری بچی کی عزت بچا لی ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ آپ مالک ہیں جیسا کہتے ہیں ویسا ہی کریں گے۔" فیروز نے لڑکی سے پوچھا۔

"کیا وہ بھی کوئی تامل تھا جس نے ان دونوں گوریلوں کو ہلاک کیا؟" لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ اس نے یونہی سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ شہاب نے فیروز کی طرف دیکھ کر پنجابی میں کہا۔

"اگر وہ بھی تامل ایلام کا آدمی تھا تو یہ راز تو پھر راز نہ رہا۔" شہاب نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"ہم نے لاشیں غائب کر دی ہیں۔ یہ لوگ چپ رہیں گے ہمیں اس سے کیا۔ یہاں تامل ایلام اور سنہالی فوجیوں کی جھڑپیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ وہ کوئی سنہالی فوجی بھی ہو سکتا ہے۔" فیروز نے یونہی لڑکی سے سوال کر دیا۔

"جس آدمی نے دونوں تاملوں کو گولی ماری تھی کیا اس نے فوجی وردی پہنی ہوئی تھی۔"

"نہیں۔" لڑکی نے سنہالی زبان میں آہستہ سے کہا۔ فیروز نے پوچھا۔

"اس نے تم سے بات کی تھی۔"

"ہاں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"وہ سنہالی بولتا تھا یا تامل؟"

"سنہالی۔"

"اس کا حلیہ کیسا تھا؟" فیروز نے پوچھا۔ لڑکی ڈری ہوئی تھی۔ آگے سے چپ رہی۔ اس کا باپ کہنے لگا۔

"بچی ڈری ہوئی ہے حضور۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی کوئی مسلمان تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھی۔" یہ سنتا تھا کہ شہاب اور فیروز نے چونک کر یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے ان کے اوپر سے کوئی انتہائی زہریلا سانپ گزر گیا ہو۔ گورے رنگ کا مسلمان آدمی یہاں کون ہو سکتا ہے؟ دونوں کے دماغ میں یہی ایک سوال تھا۔ شہاب نے اب لڑکی کو جیب سے کچھ روپے نکال کر دیئے اور بڑی شفقت سے پوچھا۔

"بیٹی اس کی عمر کیا ہو گی؟ ہاں ہاں ڈرو نہیں بتاؤ۔" لڑکی کو ذرا سا حوصلہ ہوا کہنے لگی۔

"جتنی آپ کی ہے اتنی ہی عمر ہو گی۔" شہاب نے ایک بار پھر فیروز کی طرف دیکھا اور پنجابی میں کہا۔

"مجھے وہی لگتا ہے۔"

پھر لڑکی اور اس کے باپ کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ وہ اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرے اور خود فیروز کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے سے شیڈ کے اندر جاتے ہی شہاب نے الماری میں سے دو پستول نکالے ایک پستول فیروز کی طرف اچھال دیا اور دوسرے پستول میں گولیاں بھرتے ہوئے بولا۔

"شیر خان یہاں پہنچ چکا ہے فیروز۔ اس سے بڑا خطرہ ہمارے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔" فیروز کہنے لگا۔

"تو پھر کیا ہوا شہابو۔ وہ ہم سے بچ کر نہیں جائے گا۔ ابھی چل کر اس کا کام تمام کئے دیتے ہیں۔"

"چلو۔" یہ کہہ کر شہاب اور فیروز ان چٹانوں کی طرف چل پڑے جہاں ساتھ ساتھ تین غار تھے اور جن کے ایک غار میں شیر خان چھپا ہوا تھا۔ شہاب اور فیروز پیچھے سے ہو کر آئے وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر شیر خان نے انہیں دیکھ لیا تو پھر ان کا بچنا ناممکن نہ ہو گا وہ سب سے پہلے جنوب کی طرف جو بڑا غار تھا وہاں آئے۔ شہاب جھاڑیوں میں چھپا رہا۔ اس نے فیروز کو اشارہ کیا۔ فیروز پستول ہاتھ میں لئے چٹان کی دیوار کے ساتھ آہستہ آہستہ کھسکتا غار کے منہ پر آیا اور پھر اندر جھانک کر دیکھا۔ غار خالی پڑا تھا۔ اس نے شہاب کو اشارہ کیا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح وہ دوسرے غار میں ہو گئے۔ شیر خان وہاں بھی نہیں تھا۔ تیسرے غار میں جانے سے پہلے دونوں بے حد محتاط ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ شیر خان اسی غار میں چھپا بیٹھا ہو گا۔ اب فیروز پیچھے رہا۔ شہاب خود پتھروں پر رینگتا ہوا غار کے پاس پہنچا اور دن کی روشنی میں غار کے اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک پتھر اٹھا کر غار کے اندر پھینکا غار سے کوئی باہر نہ آیا۔ دوسرا پتھر پھینکا جب پھر بھی کوئی اندر سے کوئی نہ نکلا تو وہ دونوں پستولیں تانیں دوڑ کر غار میں گھس گئے۔ غار خالی پڑا تھا۔ مگر انہیں کسی انسان کی موجودگی کا ثبوت مل گیا تھا۔ زمین پر چٹائی بچھی تھی۔ ایک جگہ پتھر پر بجھی ہوئی موم بتی اور ماچس پڑی تھی۔ پلاسٹک کی چھوٹی بالٹی اور شیشے کا ایک گلاس بھی رکھا تھا۔ شہاب دھیمی آواز میں بولا۔

"فیروز مجھے یقین ہے کہ یہ شیر خان ہی ہے۔" فیروز شہاب کو بازو سے پکڑ کر غار سے باہر لے آیا۔ باہر آتے ہی وہ لپک کر ایک طرف درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ فیروز نے آہستہ سے کہا۔

"یہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔" شہاب نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں پھوجے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ شیر خان ہی ہے۔ وہ کہیں ادھر ادھر گیا ہے ہم اس کا انتظار کرتے ہیں۔ آج اس کا کام تمام کر کے ہی یہاں سے واپس جائیں گے۔"

فیروز ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ساحلی چٹانیں اور کہیں کہیں کھڑے تاڑ اور ناریل کے جھنڈ دن کی حبس آلود فضا میں خاموش تھے۔ شہاب نے ایک نظر اپنے پیچھے ڈالی اور سرگوشی میں کہا۔

"وہ یہیں کہیں ہو گا۔" فیروز نے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ قصبے کی طرف کچھ کھانے پینے کی چیزیں لینے گیا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے ہم یہاں اس کا انتظار کریں گے۔" شہاب بولا۔

شیر خان ان دونوں کے پیچھے کوئی تیس قدموں کے فاصلے پر سنبھل کر ایک درخت کے پیچھے بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ ریوالور اس کے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ شہاب اور فیروز اس کی زد میں تھے وہ بڑی آسانی سے ان کو ہلاک کر سکتا تھا۔ مگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا ان دونوں کے ہلاک ہو جانے سے اس کی بیٹی عائشہ کے اغوا کا معمہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف یہی اسے بتا سکتے تھے کہ عائشہ کہاں ہے۔ ویسے بھی شیر خان کے لئے ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنا کوئی مشکل کام نہیں تھا یہ کام تو یہاں آنے کے ساتھ ہی کر سکتا تھا۔ لیکن جب تک اسے اپنی بیٹی کا سراغ نہیں مل جاتا وہ انہیں مارنا نہیں چاہتا تھا شیر خان اسی بات پر بھی حیران تھا کہ شہاب اور فیروز کو کیسے پتا چل گیا کہ وہ اس غار میں چھپا ہوا ہے۔ اسے اچانک مسلمان مچھیرن لڑکی کا خیال آ گیا۔ ہو سکتا ہے اس کے منہ سے یہ بات نکل گئی ہو کہ اس کو ایک اجنبی آدمی نے بچایا تھا۔ دن کے وقت جب شیر خان نے تامل گوریلوں کی دونوں لاشوں کو وہاں سے غائب دیکھا تھا تو اس کا اسی وقت ماتھا ٹھنکا تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اسی وجہ سے وہ غار سے نکل کر درخت کی اوٹ میں آ کر بیٹھ گیا تھا اب جب اس نے

شہاب اور فیروز کو وہاں آتے دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسی کی تلاش میں وہاں آئے ہیں ان لوگوں نے لڑکی سے پوچھ گچھ کی ہو گی لڑکی نے ضرور بتایا ہو گا کہ جس آدمی نے اسے تال گوریلوں سے بچایا ہے اس کا رنگ گورا ہے اور گورا رنگ اس علاقے میں کسی کا نہیں ہوتا۔ یہاں سے شہاب اور فروز کو شک پڑا ہو گا کہ ہو نہ ہو یہ شیر خان کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ شیر خان کے دل میں کئی بار خیال آیا کہ ابھی ان دونوں کا خاتمہ کر دوں۔ پھر یہ سوچ کر وہ ریوالور کی نالی کا رخ نیچے کر لیتا کہ نہیں۔ اتنی آسانی سے میں انہیں مرنے نہیں دو گا۔ پہلے ان سے عائشہ کے بارے میں پوچھوں گا کہ وہ کہاں ہے پھر ان دونوں کو ایسی ہولناک اذیت دے کر ماروں گا کہ جہنم میں پہنچ کر ان کی روحیں بھی اس اذیت کو فراموش نہ کر سکیں گی۔ جب پندرہ بیس منٹ انتظار کرتے گزر گئے اور شیر خان نہ آیا تو فیروز نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کھاڑی کی طرف اسے تلاش کرنا چاہئے۔ اگر وہ قصبے میں گیا ہے تو ادھر ہی سے واپس آ رہا ہو گا۔ یہاں ہمارا چھپے رہنا ویسے بھی خطرناک ہے۔ شیر خان اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے اور وہ پورا کمانڈو بھی ہے۔ اگر اس کی نگاہ ہم پر پڑ گئی تو پھر ہمارے لئے جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔"

شہاب نے ماحول کا جائزہ لیا اور جھاڑیوں کے پیچھے سے اندر کو چل پڑا۔ فیروز اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ جب وہ دونوں شیر خان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو شیر خان وہاں سے اٹھا نہیں وہیں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب اسے کونسی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے غار میں پناہ لئے رہنے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ جگہ یقیناً شہاب اور فیروز کی مسلسل نگرانی میں رہے گی۔ اسے کوئی دوسرا ٹھکانہ تلاش کرنا ہو گا۔ مگر سب سے پہلے کریم چچا کو صورت حال سے باخبر کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ کھانا لے کر آ گیا تو شہاب کے آدمی اسے دیکھ لیں گے اور پھر اس کا اور اس کی بیوی کا نہایت اندوہناک انجام ہو گا۔ شیر خان کو یہ ہرگز گوارا نہیں تھا۔ یہ خیال آتے ہی شیر خان اٹھا اور جھاڑیوں پتھروں درختوں اور چٹانوں کی آڑ لیتا ایک لمبا چکر کاٹ کر کریم چچا کے جھونپڑے کے عقب میں نکل آیا۔

جھونپڑے کے باہر کریم کی بیوی کھانا تیار کر رہی تھی۔ چولہے میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

کریم چچا شیر خان کو دکھائی نہ دیا۔

وہ کچھ دیر وہیں سے ماحول کا جائزہ لیتا رہا جب اسے یقین ہو گیا کہ وہاں شہاب فیروز وغیرہ کا کوئی آدمی نہیں ہے تو وہ اٹھ کر جھونپڑے کی طرف آیا کریم کی بیوی نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ شیر خان نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پوچھا چچا کہاں ہے۔ بیوی نے بتایا کہ جھونپڑے میں سو رہا ہے شیر خان جھونپڑے میں گھس گیا اسی وقت کریم چچا چٹائی پر آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے شیرے خیر تو ہے؟"

شیر خان نے مختصراً الفاظ میں کریم چچا سے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ کریم چچا نے پہلا سوال کیا۔

"تمہیں یہاں آتے تو کسی نے نہیں دیکھا؟" شیر خان بولا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا ویسے اس وقت شہاب اور فیروز چلے گئے تھے۔" کریم چچا جلدی سے باہر آ گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی بیوی سے کہا کہ وہ شیر خان کے بارے میں خاموش رہے اور جھونپڑے میں آ گیا۔

"شیرے بیٹا! تم نے اچھا کیا کہ سیدھے میرے پاس آ گئے۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہارے لئے کھانا لے کر جانے ہی والا تھا اور اس وقت تک شہاب کے خاص جاسوسوں نے غار کی نگرانی شروع کر دی ہو گی۔ تم ایسا کرو کہ یہاں سے بھی نکل جاؤ کیونکہ اب یہاں بھی خطرہ ہے۔ مگر تم کہاں جاؤ گے؟" شیر خان نے کریم چچا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا کہنے لگا۔

"چچا! میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری مدد کی۔ میں کہیں بھی جا سکتا ہوں اس علاقے کی کوئی بھی جگہ مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈال سکتا۔ میں پھر آؤں گا۔" تم اس دوران کوشش کرتے رہنا کہ میری بیٹی کا کچھ اتا پتا معلوم ہو سکے۔" کریم چچا نے شیرے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔ اور بولا۔

"کھانا کھا کر جاؤ۔"

"نہیں چچا! شیر جہاں جاتا ہے اپنی خوراک پیدا کر لیتا ہے۔ خدا حافظ!" یہ کہہ کر شیر خان جھونپڑی کے پچھلے چھوٹے دروازے سے نکل کر ان چٹانوں کی طرف چلا گیا جن کے عقب

میں ایک چھوٹا سا ٹاپو تھا اور ٹاپو کی دوسری جانب منڈالی نام کا بڑا قصبہ ہوتا تھا۔ اب یہ قصبہ ایک چھوٹا سا بندرگاہی شہر بن چکا تھا۔ شیر خان شارٹ کٹ راستوں سے گزر رہا تھا پھر بھی جب وہ منڈالی میں پہنچا تو سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ اس کے پاس روپے تھے کبھی یہ چھوٹا سا قصبہ ہوا کرتا تھا مگر اب ایک شہر بنتا جا رہا تھا۔ کئی نئی عمارتیں بن گئی تھیں۔ ان میں چھوٹے اور سستے ہوٹل بھی تھے۔ شیر خان سیدھا ایک ہوٹل میں آگیا جو سمندر سے تھوڑا ہٹ کر بازار کی نکڑ پر تھا۔ یہاں اس نے ایک کمرہ لے لیا۔ سب سے پہلے کھانا کھایا پھر اپنے چھوٹے سے کمرے میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ کتنی دیر تک یوں انتظار کی حالت میں رہ سکتا ہے۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ صرف مزید تین روز انتظار کرے گا۔ اسی دوران اگر کریم چچا کو عائشہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی تو پھر وہ خود ڈائریکٹ ایکشن شروع کر دے گا۔ اور سب سے پہلے فیروز کو کسی طرح اغوا کر کے جنگل میں لے جائے گا اور اسے جتنی اذیت دے سکتا ہے دے کر عائشہ کے بارے میں پوچھے گا۔ شیر خان ایسا کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس میں خود اسی کے پکڑے جانے اور جال میں پھنس جانے کا اندیشہ بھی تھا کیونکہ شیر خان وہاں اکیلا تھا اور شہاب اور فیروز کا پورا ایک گینگ تھا اور ان کے پاس بے شمار اسلحہ بھی تھا۔ اس کے باوجود شیر خان نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ تین دن تک دیکھے گا اس دوران اسے عائشہ بیٹی کی کوئی خبر نہ ملی تو پھر وہ فیروز کو اغوا کر کے جنگل میں کہیں بھی لے جائے گا۔

دوسری طرف شہاب نے غاروں والی چٹانوں کی نگرانی شروع کرا دی تھی۔ اس کے چھ مسلح غنڈے باری باری نگرانی کرتے تھے۔ شہاب نے انہیں شیر خان کا حلیہ بتا دیا تھا یہ سارے نئے بھرتی کئے ہوئے جرائم پیشہ نوجوان تھے۔ پرانے لوگ یا تو مر کھپ گئے تھے یا قید کاٹ رہے تھے اور یا کہیں ادھر ادھر چلے گئے تھے اس زمانے کے لوگوں میں سے کریم چچا کے علاوہ چند ایک لوگ ہی شہاب اور فیروز کے پاس باقی رہ گئے تھے۔ اسی دن رات کے وقت شہاب اور فیروز اپنے زیر زمین گودام میں ہانگ کانگ سے آیا ہوا مال چیک کر رہے تھے کہ ٹرنکو مالی سے ایک خاص آدمی ارجنا کا خط لے کر آگیا۔ خط چونکہ ضروری تھا اس لئے اسے نیچے گودام میں شہاب کے پاس جانے کی اجازت مل گئی۔ ارجنا بھی فیروز اور شہاب کے

پرانے ساتھیوں میں سے تھا اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اب ٹرنکومالی میں اسمگلنگ کا اپنا الگ دھندا کرتا تھا شہاب خط پڑھنے لگا۔ فیروز پلاسٹک کے ایک لفافے کو کھول کر ہیروئن چکھ رہا تھا۔ خط میں ارجنا نے لکھا تھا کہ ایک بہت بڑا سودا ہو رہا ہے۔ بنگال سے ایک خاص ایجنٹ آیا ہوا ہے اگر تم چاہو تو اس میں حصہ ڈال سکتے ہو۔ رقم زیادہ چاہیے۔ میرے پاس فی الحال اتنی رقم نہیں ہے۔ اس کا جواب ابھی لکھ کر میرے آدمی کو دے دو۔ پچھلے دنوں پاکستان سے اپنا پرانا ساتھی شیر خان میرے پاس آیا تھا وہ صرف تمہیں ملنے یہاں آیا ہے کہہ رہا تھا ابھی میرا ذکر کسی سے نہ کرنا میں شہاب اور فیروز کو اچانک مل کر انہیں حیران کرنا چاہتا ہوں۔ اب تک تو وہ تمہیں حیران کر چکا ہو گا۔ اسے میری طرف سے گڈ لک کہنا۔ پرانا تجربے کار ساتھی ہے اور آج کل اسے کام کی ضرورت بھی ہے۔ اگر اسے بھی ساتھ ملا لیں تو ہمارے حق میں اچھا ہو گا۔ بہرحال تمہارے جواب آنے پر ہی کوئی فیصلہ ہو سکے گا۔ تمہارا ارجنا۔ شہاب نے فیروز کو سارا خط سنا دیا فیروز بولا۔

"تمہارا اندازہ درست تھا شہابو۔ وہ شیر خان ہی ہے۔"

"دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا تھا۔"

"مگر شہابو۔" فیروز فکر مند سا ہو کر بولا۔ "ہمیں فوراً اس کا کام تمام کر دینا چاہئے۔ وہ زہریلا سانپ اپنی بیٹی کا بدلہ لینے آیا ہے اور ہمیں کسی وقت ڈس کر ہلاک کر سکتا ہے۔"

شہاب گلاس میں وائین ڈال رہا تھا۔ اس کا ایک گھونٹ پی کر کہنے لگا۔

"فیروز! تم بڑی جلدی جی چھوڑ دیتے ہو۔ شیر خان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں نے اپنے آدمی اس کے پیچھے لگا دیے ہیں۔ لگتا ہے اسے ہمارے ارادوں کی خبر ہو گئی ہے اور وہ کسی دوسری جگہ جا کر چھپ گیا ہے۔ مگر فکر نہ کرو۔ آج نہیں تو کل وہ ہمارے آدمیوں کے قابو میں آجائے گا۔" فیروز اپنا وائین کا گلاس بھرتے ہوئے بولا۔

"مگر شیر خان نے ابھی تک ہم پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ ورنہ وہ اگر چاہتا تو اس کے واسطے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔" شہاب نے کہا۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ ہم سے اپنی بیٹی کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے اور ہمارے اغوا کی فکر میں ہو گا اکیلا ہونے کی صورت میں وہ اپنے منصوبے پر ابھی عمل

نہیں کر سکا۔ بہرحال ہمیں خبردار اور چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔"

"مگر وہ چلا کہاں گیا؟" فیروز نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے پوچھا۔ "یہیں کہیں کھاڑی میں چھپا ہوا ہو گا۔ ہمیں دو مزید باڈی گارڈ رکھنے ہوں گے۔ صرف دو باڈی گارڈوں سے کام نہیں چلے گا۔" فیروز زیادہ پریشان تھا کہنے لگا۔

"تم بھی شیر خان کی خصلت سے واقف ہو اور اس وقت وہ اپنی بیٹی کے اغوا کی وجہ سے غضبناک ہو رہا ہے۔ اسے زیادہ مہلت نہ دو شہابو۔ اس کی گولی کسی بھی وقت ہمارا خاتمہ کر سکتی ہے۔" شہاب نے گلاس کو زور سے میز پر رکھا اور بولا۔

"ٹھیک ہے مجھے صرف کل کا دن دے دو۔ اگر میرے آدمی اسے نہ پکڑ سکے تو میں خود اس کی تلاش میں نکلوں گا۔"

دوسری طرف شیر خان نے تین دن بعد اکیلے ہی شہاب کے خفیہ اڈے پر چھاپہ مار کر فیروز کو اغوا کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ اس دوران اس نے علاقے کے مختلف مقامات پر گھوم پھر کر عائشہ کا کھوج لگانے کی کوشش جاری رکھی۔ ادھر شہاب نے فیروز سے صرف ایک دن کی مہلت مانگی تھی۔ جب یہ مہلت ختم ہو گئی تو اس نے دو باڈی گارڈ اپنے ساتھ لئے اور صبح صبح شمال مشرق کی چٹانوں کی طرف چل دیا۔ فیروز کو خطرہ تھا کہ شیر خان کسی بھی وقت کسی طرف سے اچانک نکل کر حملہ کر دے گا اور پھر، شیر خان کے حملے سے بچ نہ سکے گا دراصل فیروز اندر ہی اندر شیر خان سے خوف زدہ تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود باڈی گارڈ لے کر شیر خان کو تلاش کرے گا اور جہاں کہیں وہ نظر آیا اسے قتل کر کے یہ قصہ ہی ختم کر دے گا۔ شہاب جس طرف گیا تھا شیر خان اس طرف نہیں تھا۔ فیروز شمال مغرب کی طرف چلا۔ شیر خان اسی علاقے کی چٹانوں میں اپنی بچی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ فیروز نے بھی اپنے ساتھ ایک باڈی گارڈ لےلیا تھا۔ خود اس کے پاس رائفل تھی۔ باڈی گارڈ نے بھی رائفل اٹھا رکھی تھی اور جیکٹ کی جیب میں چاقو بھی تھا۔ فیروز چاروں طرف سے بڑا چوکنا ہو کر چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں اور چٹانی جنگل سے گزر رہا تھا۔ باڈی گارڈ کو اس نے اپنے پیچھے رکھا ہوا تھا کہ کہیں شیر خان اچانک نکل کر پیچھے سے حملہ نہ کر دے۔ دوپہر تک وہ پتھریلے راستوں پر پھرتے رہے۔ یہاں ایک جگہ بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا اور تھوڑی دیر سستانے کے بعد ایک بار پھر شیر خان کی تلاش شروع کر دی۔ وہ ایک ایسی جگہ سے گزر رہے تھے جس کی ایک طرف نسواری رنگ کی اونچی اونچی چٹانیں تھیں اور دوسری طرف گھاٹی کی ڈھلان تھی جہاں نیچے ایک تیز رفتار پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا اس وقت فیروز کا پاؤں

گارڈ اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ چلتے چلتے باڈی گارڈ ایک دم سے رک گیا اور اس نے پیچھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ فیروز بھی اشارہ دیکھ کر رک گیا۔ باڈی گارڈ وہیں بیٹھ گیا فیروز بھی بیٹھ گیا پھر کھسکتا ہوا باڈی گارڈ کے قریب آیا۔ باڈی گارڈ نے ہاتھ سے ذرا آگے ایک درخت کی طرف فیروز کو متوجہ کیا۔ فیروز نے گردن اٹھا کر دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا درخت کی اوٹ میں شیر خان گھاس پر سویا ہوا تھا اس پر ایسی ہی دہشت طاری ہو گئی جیسے وہ بے خیالی میں کسی سوئے ہوئے آدم خور شیر کے پاس پہنچ گیا ہو۔ رائفل اس کے ہاتھ میں کپکپانے لگی۔ اس نے باڈی گارڈ کو اشارہ کیا کہ اس پر فائر کرے۔ باڈی گارڈ نے رائفل سیدھی کر کے فائر کر دیا۔ دھماکے سے جنگل گونج اٹھا۔ گھبراہٹ میں اس کا نشانہ بھی خطا گیا تھا اور گولی شیر خان کے بازو کو چھوتی ہوئی زمین میں دھنس گئی تھی۔ شیر خان ایک دم جاگ پڑا۔ وہ پستول نکال ہی رہا تھا کہ باڈی گارڈ نے دوسرا فائر جھونک دیا مگر اب شیر خان بیدار ہو چکا تھا وہ تڑپ کر ایک طرف ہو گیا۔ فیروز نے چلا کر کہا۔

"اسے ختم کر دو۔" اب ایک فائر فیروز نے بھی کر دیا۔

دوسری طرف سے شیر خان نے ریوالور چلا دیا۔ گولی فیروز کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کا اوپر کا تھوڑا سا حصہ اڑاتی ہوئی اسے ناکارہ کرتی ہوئی نکل گئی۔ دوسرا فائر باڈی گارڈ کے پیٹ میں لگا اور وہ شیر خان کے اوپر گر پڑا۔ دونوں ایک طرف کو لڑھک گئے۔ فیروز کے لئے شیر خان کو ہلاک کرنے کا یہ نادر موقع تھا۔ رائفل پھینک کر اس نے خنجر نکالا اور باڈی گارڈ کے نیچے سے پہلو بدل کر نکلتے ہوئے شیر خان کی پشت پر خنجر کے اوپر تلے دو چار وار کر دیے۔ شیر خان نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ایک زخم بڑا کاری لگا تھا وہ اٹھ نہ سکا۔ ریوالور اس کے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ سا گیا تھا اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ فیروز پر فائر کر سکتا فیروز کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا وہ چلایا۔

"شیرے! آج تمہیں ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دوں گا۔" وہ شیر خان کی شہ رگ کاٹنے کے لئے بڑھا ہی تھا کہ شیر خان نے اپنے جسم کی بچی کھچی طاقت کو جمع کیا اور اپنے آپ کو گھاٹی کی ڈھلان پر لڑھکا دیا۔ وہ جنگلی جھاڑیوں کے اوپر سے لڑھکتا ہوا نیچے گہرائی میں بہنے والے تیز رفتار پہاڑی نالے میں گر پڑا اور فیروز کے دیکھتے دیکھتے پانی کا تیز بہاؤ اسے لے

کر آگے نکل گیا۔ اس نے اوپر سے دو تین گولیاں چلائیں مگر شیر خان کو پانی کا ریلا وہاں سے بہا کر لے جا چکا تھا۔

فیروز کو یقین ہو گیا کہ شیر خان ہلاک ہو گیا ہے ورنہ وہ آگے سے ضرور مقابلہ کرتا۔ اب وہ اپنے باڈی گارڈ کی طرف آیا شیر خان کے ریوالور کی گولی نے باڈی گارڈ کے ایک پھیپھڑے کو پھاڑ ڈالا تھا اور وہ جان کنی کے عالم میں تھا۔ فیروز نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر باڈی گارڈ کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ فیروز اکیلا اس کی لاش کو واپس اتنی دور اپنے ٹھکانے پر نہیں لے جا سکتا تھا وہ تیز تیز چلتا اپنے اڈے پر آیا وہاں سے چار آدمی اور ایک بانس کی کھاٹ ساتھ لی اور باڈی گارڈ کی لاش اٹھوا کر لے آیا۔ سہ پہر کے قریب شہاب بھی واپس آ گیا۔ اس نے لاش دیکھی تو فیروز سے پوچھا۔

"کیا ہوا تھا؟" فیروز نے سارا ماجرا بیان کیا اور آخر میں فاتحانہ انداز میں بولا۔

"شہابو لالے۔ شیر خان کو میں نے ختم کر دیا ہے۔" شہاب کو یقین نہ آیا کہنے لگا۔

"تمہیں شیر خان کی لاش بھی نالے سے نکال کر یہاں لانی چاہیے تھی۔"

"مگر لالے دی جان۔ نالے میں پانی بڑی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی لاش کو بہا کر کہیں سے کہیں لے گیا۔" شہاب بانس کے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ چہرہ متفکر تھا۔ پھر تیزی سے اٹھا اور بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ فیروز کے علاوہ تین چار آدمی بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں سے وہ سیدھا اس جگہ پہنچے جہاں نالے کا پانی ایک آبشار کی شکل میں چھوٹی سی جھیل میں گرتا تھا۔ انہوں نے کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں شیر خان کی لاش کی تلاش شروع کر دی۔ یہ خیال ان کا بالکل صحیح تھا کہ لاش کو نالے میں بہتے ہوئے اس جھیل میں آ کر گرنا چاہئے تھا مگر لاش کہیں بھی نہیں تھی فیروز بولا۔

"یار اتنی دیر تک لاش میں پانی بھر گیا ہو گا اور وہ جھیل کی تہہ میں بیٹھ گئی ہو گی۔" شہاب نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تو پھر جھیل میں غوطہ لگا کر نکالو لاش کو ...." اور زیر لب فیروز کو گالیاں دینے لگا۔

"جب تک اس کی لاش نہیں ملے گی میں کیسے یقین کر لوں کہ شیر خان مر گیا ہے؟" وہ

اس دشوار گزار چڑھائی کی طرف بڑھے جہاں سے چھوٹا راستہ اوپر پہاڑی نالے کی طرف جاتا تھا۔ شہاب ہر حالت میں شیر خان کے بارے میں تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ وہ مر گیا ہے یا زخمی ہو کر کسی طرف کو نکل گیا ہے۔

اب ہم شیر خان کی طرف چلتے ہیں جب وہ نالے میں گرا تو پانی کی تیز لہریں اسے لے کر آگے بڑھنے لگیں کچھ فاصلے پر جا کر پہاڑی نالا ایک طرف گھوم جاتا تھا جہاں پانی کے کٹاؤ کی وجہ سے درختوں کی کٹی ہوئی شاخیں رکی ہوئی تھیں۔ شیر خان کی "لاش" اس میں الجھ کر رہ گئی۔

اتفاق سے اس وقت پہاڑی نالے کی ڈھلان پر منگلی نام کی ایک سنیاسن معمول کے مطابق جنگلی پگڈنڈی پر آئی تو اس کی نظر ایک انسانی لاش پر پڑی جو نالے کے موڑ پر جھاڑیوں میں الجھی ہوئی تھی وہ دوڑ کر لاش کے پاس آئی اور جھک کر شیر خان کو دیکھا اس کی پیٹھ میں خنجر کے تین گھاؤ تھے جن میں سے خون ابھی تک نکل نکل کر پانی میں بہہ رہا تھا۔ سنیاسن منگلی نے شیر خان کی گردن پر کان کے نیچے الٹا ہاتھ رکھا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ شخص ابھی زندہ ہے منگلی لنکا کے ایک قدیم سنیاسی قبیلے کی مضبوط جسم والی جوان عورت تھی جو اپنے بوڑھے سنیاسی باپ کے ساتھ اس وقت ساحلی علاقے کی چٹانوں اور ٹیلوں میں جڑی بوٹیاں تلاش کر رہی تھی اس نے اپنے باپ کو آواز دی۔ اس کا باپ بوٹیوں کا جھولا کاندھے سے لٹکائے درختوں سے نکل کر آ گیا۔ منگلی نے کہا۔

"باوا یہ آدمی ابھی زندہ ہے۔ گورے چٹے رنگ کا ہے پردیسی لگتا ہے۔"

باوا نے بھی شیر خان کے زخموں کو جھک کر دیکھا۔ پھر اسے پانی سے نکال کر پتھروں پر لٹا دیا۔ منگلی نے کہا "باوا تم اس کے پاس بیٹھو میں بیل گاڑی لے کر آتی ہوں۔" ان کی چھوٹی سی بیل گاڑی جس پر جلانے کے واسطے سوکھی لکڑیاں لدی تھیں وہاں سے تھوڑی دور پیچھے کھڑی تھی۔ منگلی دوڑتی ہوئی گئی اور بیل گاڑی لے آئی انہوں نے لکڑیوں کے درمیان جگہ بنا کر بے ہوش اور شدید زخمی شیر خان کو لٹا دیا اور بیل گاڑی چلاتے اپنے ڈیرے پر آ گئے ان کا ڈیرہ ٹیلے کے عقب میں تھا۔ چھوٹے سے تالاب کے کنارے درختوں کے درمیان انہوں نے ناریل اور بانس کی شاخوں کو جوڑ کر ایک جھونپڑا ڈال رکھا تھا یہ ان

کا عارضی ڈیرا تھا یہاں وہ برسات کے بعد جڑی بوٹیاں جمع کرنے آتے تھے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ انہیں لگ جاتا اس کے بعد واپس اپنے قبیلے میں چلے جاتے جو وہاں سے کافی دور جافنا کے قرب و جوار میں تھا جافنا میں ہی وہ جڑی بوٹیوں کو فروخت بھی کر دیتے تھے۔ انہوں نے شیر خان کو جھونپڑے میں لٹا دیا۔ یہ سنیاسی بیماریوں اور زخموں کا علاج بڑی مہارت سے کرتے تھے۔ انہیں ایسی ایسی بوٹیوں کا علم تھا کہ ان کے لگانے سے زخم دنوں میں بھر جاتا تھا۔ منگلی نے فوراً کچھ بوٹیاں پیس کر ان کا لیپ بنایا اور کیلے کے پتوں پر ڈال کر شیر خان کے تینوں زخموں پر باندھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد شیر خان کو ہوش آ گیا اس نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے ایک سیاہ فام سفید بالوں والے پستہ قد بوڑھے سنہالی اور جوان چوڑے شانوں والی سانولی جوگن نما عورت کو دیکھا تو بولنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکا۔ منگلی نے کہا۔

"باوا اسے ہوش آ گیا ہے۔ شیر خان کو انہوں نے پہلو کے بل لٹا رکھا تھا کیونکہ خنجر کے تینوں زخم شیر خان کی کمر پر لگے تھے خوش قسمتی یہ ہوئی تھی کہ ریڑھ کی ہڈی بچ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شیر خان نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں اور کوشش کر کے سنہالی زبان میں پوچھا۔

"میں کہاں ہوں اور تم لوگ کون ہو۔" اسے سنہالی زبان میں بولتے دیکھ کر منگلی نے خوش ہو کر باوا سے کہا۔

"باوا یہ ہماری زبان بول لیتا ہے۔" پھر منگلی نے شیر خان کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کسی نے اپنی طرف سے قتل کر کے نالے میں پھینک دیا تھا میں منگلی سنیاسن ہوں یہ میرا باپ ہے ہم تمہیں بہت جلد اچھا کر دیں گے۔" شیر خان کے ذہن میں وہ سارا منظر گھوم گیا جب اس پر خنجروں سے پیچھے سے وار کیا گیا تھا اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

سمندر میں دھماکہ

اے حمید



کمانڈو کی بیٹی

Sajid

itsurdu.blogspot.com

شہاب اور اس کے ساتھیوں نے پہاڑی نالے کو شروع سے آخر تک دیکھ ڈالا انہیں شیر خان کی لاش کہیں نظر نہ آئی شہاب کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ فیروز اور اپنے آدمیوں کو گالیاں بکنے لگا۔

"تم سے ایک آدمی نہیں مارا گیا۔" وہ فیروز پر برس پڑا۔ "تم نے اسے شوٹ کیوں نہیں کر دیا؟" اس وقت دن کی روشنی شام کے جھٹپٹے میں بدل رہی تھی شہاب اپنے اڈے پر واپس آگیا وہ سخت غصے کی حالت میں تھا اس کا وہ دشمن جال میں آکر نکل گیا تھا جو کسی بھی وقت اسے گولی سے اڑا سکتا تھا اس نے خشمگیں آنکھوں سے فیروز کی طرف دیکھا اور بولا۔

"وہ اگر زخمی ہے تو زیادہ دور نہیں گیا ہو گا نالے کے آس پاس کہیں کسی چٹانی غار میں چھپا ہوا ہو گا ابھی آدمی لے کر جاؤ اور ٹارچوں کی روشنی میں اسے تلاش کرو۔"

شہاب بڑبڑاتا' گالیاں بکتا نیچے تہہ خانے میں چلا گیا۔ فیروز نے اسی وقت دو آدمی ساتھ لئے اور اس طرف کو چلا جہاں انہوں نے اپنی طرف سے شیر خان کو ہلاک کیا تھا۔ وہ نالہ پار کر کے دوسرے کنارے پر آگئے اور ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک طرف چل پڑے۔ رات ہو گئی تھی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ فیروز نے ایک جھونپڑا دیکھا جس کے باہر لالٹین جل رہی تھی۔ جھونپڑے کے پاس آکر اس نے سنہالی میں پکار کر کہا۔

"کون ہے یہاں؟" آواز سن کر سنیاسن منگلی باہر نکل آئی۔ فیروز نے اس کے توانا جسم کو اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر پوچھا۔ "ادھر کوئی زخمی آدمی تو نہیں آیا؟ اس کا رنگ گورا ہے عمر چالیس پینتالیس کے قریب ہے اگر اس کے بارے میں کچھ بتا دو گی تو بڑا انعام ملے گا۔" سنیاسن آگے سے کچھ نہ بولی۔

سنیاسن منگی کی خاموشی پر فیروز نے بڑے رعب سے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ یہاں کوئی گورے چٹے رنگ کا زخمی تو نہیں آیا۔ تم بولتی کیوں نہیں ہو؟" سنیاسن منگی نے جواب دیا۔

"حضور یہاں تو کوئی ایسا زخمی نہیں آیا۔"

"فیروز کو شک پڑ گیا تھا کہ سنیاسن اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔ زخمی شیر خان ضرور اس کی جھونپڑی میں ہے۔ فیروز جانتا تھا کہ یہ سنیاسی لوگ پیسے لے کر علاج معالجہ بھی کرتے ہیں۔ اس نے اپنے آدمیوں کو وہیں کھڑا رہنے کو کہا اور سنیاسن کو ہاتھ سے پرے ہٹاتے ہوئے جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ جھونپڑی میں اندھیرا تھا اس نے ٹارچ روشن کر دی۔ جھونپڑی خالی تھی۔ زمین پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ کچھ مٹی کے مٹکے اور ٹوکریاں پڑی تھیں جن میں جڑی بوٹیاں تھیں۔ جتنی دیر فیروز جھونپڑی کی تلاشی لیتا رہا سنیاسن منگی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی رہی۔ فیروز نے جھونپڑی سے باہر آکر پوچھا۔

"تم یہاں اکیلی کیسے رہتی ہو؟" سنیاسن نے کہا۔

"حضور! میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرا باپ بھی میرے ساتھ ہے۔" فیروز نے باپ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے منگی نے درختوں اور چٹانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میرا باوا جنگل میں جڑی بوٹی کی تلاش میں گیا ہے۔"

"فیروز کو یہ تو معلوم تھا کہ یہ سنیاسی لوگ ہیں اور جنگلوں میں جڑی بوٹیاں تلاش کر کے انہیں شہر میں بیچ کر گزارہ کرتے ہیں مگر وہ بڑا حیران ہوا کہ سنیاسن کا باپ رات کے اندھیرے میں جڑی بوٹی کی تلاش میں کیسے چلا گیا جب اس نے سنیاسن سے پوچھا کہ اس کا باپ رات کے وقت کیوں گیا ہے۔ تو وہ بولی۔

"حضور! بعض جڑی بوٹیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ صرف رات کو ہی ملتی ہیں۔ کیونکہ وہ رات کے اندھیرے میں جگنو کی طرح چمکتی ہیں اس لئے ان کی تلاش میں ہمیں رات ہی کو جانا پڑتا ہے۔"

فیروز ویسے بھی ذرا موٹی عقل کا آدمی تھا۔ اتنا کہہ کر وہاں سے اپنے آدمیوں کے ساتھ چل دیا کہ اگر کوئی زخمی ادھر آئے تو ہمیں اڈے پر فوراً اطلاع کرنا۔ ان کے جانے

کے بعد سنیاسن جھونپڑی کے دروازے میں ہی بیٹھ گئی اور دل میں اپنے بھگوان اور دیوتاؤں کا شکر ادا کرنے لگی کہ اس شام انہوں نے شیر خان کو جنگل میں ایسی جڑی بوٹیوں کی جھاڑیوں کے پاس پہنچا دیا تھا جن کے بارے میں ان سنیاسیوں کا عقیدہ تھا کہ رات کے وقت ان بوٹیوں سے ایسی شعاعیں نکلتی ہیں جو زخموں کو شفا دیتی ہیں۔ چنانچہ شیر خان اس وقت جھونپڑی سے کوئی آدھے فرلانگ کے فاصلے پر ان جڑی بوٹیوں کی جھاڑیوں کے پاس چٹائی پر اوندھا پڑا تھا اور سنیاسن منگی کا باپ اس کی خبر گیری کر رہا تھا۔ سنیاسن منگی کے دل نے سوال کیا۔

"تو نے زخمی شیر خان کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟ وہ لوگ تو تجھے انعام بھی دیتے۔" منگی نے اپنے دل سے کہا۔

"زخمیوں کی خبر گیری کرنا ان کی حفاظت کرنا ہم سنیاسی لوگوں کا دھرم ایمان ہوتا ہے۔" منگی کے دل نے کہا۔

"کہیں ایسا تو نہیں منگی کہ یہ پختہ عمر کا چوڑے شانوں والا گورا چٹا مرد تجھے اچھا لگا ہے؟"

سنیاسن منگی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک پاؤں زور سے زمین پر مارا اور بولی۔

"ہاں ہاں مجھے یہ مرد پسند ہے۔ تم کون ہوتے ہو بیچ میں بولنے والے؟" اور پھر کچھ فکر مند سی ہو کر اس جانب اندھیرے میں دیکھنے لگی جہاں شیر خان زخموں سے نڈھال پڑا تھا۔ منگی کو خیال آیا کہ کہیں یہ لوگ جو شکل و صورت سے اسے اسمگلر اور جرائم پیشہ لگے تھے شیر خان کو ڈھونڈ نہ لیں وہ تیز تیز چل پڑی۔ راستے میں اس نے سوچا کہ یہ مرد بھی ضرور جرائم پیشہ ہو گا۔ ورنہ اس کے دشمن اس پر قاتلانہ حملہ کیوں کرتے؟ منگی کو یہ بات بڑی اچھی لگی کہ وہ ایک ایسے مرد سے پیار کرنے لگی ہے جو بدمعاش ہے۔ اسمگلر ہے جرائم پیشہ ہے۔ سنیاسن منگی کا اپنا مزاج بھی ایسا ہی تھا۔ اسی لئے اسے اس قسم کے یعنی جرائم پیشہ لوگ اچھے لگتے تھے۔ کیونکہ اس کے خیال کے مطابق ایسے لوگ بہادر ہوتے ہیں۔ پورے مرد ہوتے ہیں ان میں زنانہ پن نہیں ہوتا۔

اس وقت مشرق کی طرف سے آدھا چاند نکل آیا اور چٹانی جنگل میں اس کی ہلکی ہلکی

دھندلی روشنی پھیل گئی۔ شیر خان طلسمی بوٹیوں والی جھاڑیوں کے درمیان چٹائی پر اوندھا پڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کسی بھی وقت کراہنے لگتا تھا۔ اگر سنیاسن کے باپ نے اسے درد کی شدت کو کم کرنے والی خاص بوٹی کا عرق نہ پلایا ہوتا تو اس وقت شیر خان زخموں کی تکلیف سے تڑپ رہا ہوتا۔ ان لوگوں کے پاس ایسی ایسی بوٹیاں تھیں کہ اگر آدمی اس کو پی لے تو سارا جسم سن ہو جائے۔ نہ بول سکے نہ ہاتھ پاؤں ہلا سکے۔ ایک بوٹی ایسی تھی کہ اگر اس کی ایک خوراک کسی کو پلا دی جائے تو وہ کچھ وقت کے لئے اپنی یادداشت بھول جاتا ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس کا نام کیا ہے۔ کہاں سے آیا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ اس بوٹی کو استعمال کبھی کبھی ہی کیا جاتا تھا اور وہ بھی اپنے قبیلے کے کسی دشمن پر۔

سنیاسن نے اپنے باپ کو بتایا۔

"کچھ لوگ اس زخمی شیر خان کو تلاش کرتے وہاں آئے تھے۔" سنیاسی بوڑھا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

"جب تک یہ آدمی اچھا نہیں ہو جاتا اسے اپنی حفاظت میں رکھنا ہمارا دھرم ہے۔"

منگی نے جھک کر شیر خان کے چہرے کو دیکھا جو دھندلی چاندنی میں زیادہ زرد اور کمزور نظر آ رہا تھا۔ شیر خان بے ہوش تھا۔ منگی نے باوا سے کہا۔

"باوا وہ لوگ ادھر جنگل میں اس کی تلاش میں ہیں ادھر آ گئے تو اسے یا تو قتل کر ڈالیں گے یا اٹھا کر لے جائیں گے اور ہمارا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔" سنیاسی نے ایک نگاہ ہلکی چاندنی میں خاموش کھڑے تاڑ کے درختوں پر ڈالی اور بولا۔

"اس کا ان بوٹیوں کے پاس رہنا ضروری ہے ہم اسے کسی دوسری جگہ تو اب سورج نکلنے پر ہی لے جا سکیں گے۔ جب تک یہ بوٹیاں زخموں کو ٹھیک کرنے والی شعاعیں نہیں چھوڑتیں۔"

"اچھا تو پھر تم جھونپڑے میں جا کر آرام کرو۔ میں اس کا خیال رکھتی ہوں۔" منگی کے سنیاسی باپ نے کہا۔

"نہیں بٹی! اس وقت تمہارا جھونپڑی میں رہنا ہی مناسب ہے۔ اگر وہ لوگ واپس آئے اور تمہاری جگہ مجھے جھونپڑی میں دیکھیں گے تو انہیں ضرور شک پڑ جائے گا۔ تم جا

کر سو جاؤ۔ میں اس کا خیال رکھتا ہوں۔"

منگی جھونپڑی میں آ کر چٹائی پر لیٹ گئی۔ اس نے ایسی ہی ایک جھونپڑی میں آنکھ کھولی تھی اور ساری زندگی سنیاسیوں میں جڑی بوٹیاں تلاش کرتے۔ انہیں بازار میں لے جا کر بیچتے۔ انہیں کوٹتے پیستے اور قبیلے میں مریضوں اور کوئی زخمی ہو جاتا تو اس کی مرہم پٹی کرتے گزار دی تھی۔ قبیلے کے ہی ایک سنیاسی سے اس کی شادی ہوئی مگر خاوند ایک ماہ بعد مر گیا۔ وہ بیوہ ہو گئی اور پھر اس نے شادی نہ کی۔ اب اس کی عمر چالیس کے قریب تھی مگر جنگل کی کھلی فضاؤں میں آزادی سے رہنے کے باعث وہ مضبوط اور شباب سے بھرپور جسم کی مالک تھی۔ وہ ماں کے مرنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ ہی رہ رہی تھی۔ جڑی بوٹیوں کی پہچان اور مختلف بیماریوں میں ان کے استعمال میں وہ ماہر ہو گئی تھی۔ اپنے خاوند کے مرنے کے بعد منگی کو کبھی کوئی مرد پسند نہ آیا تھا۔ وہ عام سنہالی عورتوں کے برعکس قد کاٹھ میں بھی مضبوط اور چوڑی چکلی تھی اور طبیعت کی بھی تیز تھی۔ پہلی نظر میں ہی شیر خان کی مردانہ وجاہت اس کے دل پر اثر کر گئی تھی۔ وہ جھونپڑی میں اکیلی لیٹی شیر خان کی شکل آنکھوں کے سامنے لا کر سوچتی رہی کہ وہ اگر اچھا ہو گیا تو چلا جائے گا۔ منگی کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ جس سے وہ محبت کرنے لگی ہے اس کا تعلق جرائم پیشہ لوگوں سے ہے۔ بلکہ وہ شریف اور کم ہمت لوگوں کے مقابلے میں جرائم پیشہ لوگوں کو زیادہ پسند کرتی تھی۔ بس یہ اس کی اپنی پسند کا معاملہ تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ شیر خان اس کے پاس رہے۔ اس کے ساتھ رہے کیا معلوم اس کے بیوی بچے ہوں۔ پھر تو وہ ضرور واپس چلا جائے گا۔ منگی نے آنکھیں بند کر لیں وہ یہ تصور نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جس سے وہ محبت کرتی ہے اس کو کوئی دوسری عورت بھی چاہتی ہو۔

منگی کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔ وہ پانی پینے کے لئے اٹھی۔ لالٹین جھونپڑی کے باہر لٹک رہی تھی جس کی روشنی اندر آتی تھی۔ جھونپڑی میں پانی کا مٹکا رکھا تھا۔ پہلے اسے خیال آیا کہ پانی کی بجائے تھوڑی سی تاڑی پی لے اس سے اسے نیند بھی آ جائے گی تاڑی کا مٹکا بھی پاس ہی رکھا تھا جہاں مختلف جڑی بوٹیوں والے مٹی کے چھوٹے چھوٹے مٹکے اور تھیلیاں بھی پڑی تھیں تاڑی اس کے قبیلے میں عورتیں بھی عام پیتی تھیں اور چاندنی

راتوں میں تو وہ تاڑی پی کر ساری ساری رات ڈانس کرتی تھیں۔ جانے کیوں اس کا تاڑی پینے کو دل نہ چاہا مٹکے میں سے پانی ڈالنے لگی تو اس کی نگاہ جڑی بوٹیوں والی تھیلیوں پر پڑی۔ ان میں ایک چندن بوٹی کے سوکھے پھول تھے جس کے استعمال سے آدمی کو بڑی گہری نیند آجاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری تھیلی تھی جس میں اس جڑی بوٹی کا پسا ہوا سفوف تھا۔ جس کے پینے سے آدمی کا بدن تھوڑی دیر کے لئے بے حس ہو جاتا تھا اور اگر اس کی زیادہ مقدار کسی کو پلا دی جائے تو وہ اگلی دنیا کو سدھار جاتا تھا۔ منگی کا خواب آور بوٹی پینے کو بھی دل نہ چاہا اور وہ صرف پانی پی کر چٹائی پر جا کر لیٹ گئی اور شیر خان کے بارے میں سوچنے لگی کہ اس کے زخم گہرے ہیں انہیں اچھا ہونے میں کافی دن لگ جائیں گے اور اتنی دیر شیر خان اس کے پاس ہی رہے گا۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اسے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اس کے ساتھ ہی ایک مرد جھونپڑی کے دروازے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کا رخ منگی کی طرف تھا۔

"ڈرو نہیں میری رانی! اسی طرح آرام سے لیٹی رہو۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ زخمی شیر خان کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

منگی فوراً سمجھ گئی کہ یہ اسمگلروں کے اسی گروہ کا آدمی ہے جو پہلے بھی شیر خان کی تلاش میں وہاں آچکے تھے۔ اس نے کہا۔

"میں نے تو کسی زخمی کو نہیں چھپایا ہوا۔ تم کس کی بات کر رہے ہو؟" ان کی گفتگو سنہالی زبان میں ہو رہی تھی۔

یہ آدمی شہاب کے گینگ کا ایک بڑا چھٹا ہوا جاسوس ٹائپ بدمعاش تھا جو اسی امید پر اپنے طور پر شیر خان کی تلاش میں نکل آیا تھا کہ شیر خان مل گیا تو شہاب کی نظروں میں اس کی قدر و منزلت ہی نہیں بڑھے گی بلکہ اسے انعام میں رقم بھی ملے گی۔ اس کا نام کریانی تھا۔ یہ کئی خون بھی کر چکا تھا اور کسی آدمی کو قتل کرنا اس کے نزدیک ایسا ہی تھا جیسے کوئی جسم پر رینگتی ہوئی کسی چیونٹی کو ہاتھ سے مسل ڈالے۔ اس نے منگی کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور الٹے ہاتھ سے ایک زور دار تھپڑ مارا۔

منگی کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا جس سے وہ کریانی پر حملہ کر سکتی۔ شور مچا کر اپنے باپ کو بھی نہیں بلا سکتی تھی۔ کیونکہ اس طرح شیر خان جنگل میں اکیلا رہ جاتا اور اس کی خون کی بو پا کر کوئی بھی جنگلی درندہ اسے شدید نقصان پہنچا سکتا تھا۔ منگی کو یہ ڈر بھی تھا کہ اس کے شور مچانے سے اس بدمعاش کا کوئی دوسرا ساتھی وہاں نہ آجائے۔ کریانی بدمعاش نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"حرام زادی! بتاتی کیوں نہیں ہمارا آدمی کہاں ہے؟" منگی نے ایک بار پھر اپنے غصے کو پی کر کہا۔

"تمہیں کسی نے غلط خبر دی ہے یہاں کوئی آدمی زخمی حالت میں نہیں آیا۔"

کریانی بدمعاش کی آنکھوں میں ہوسناکی کے سائے اترنے لگے۔ اس نے منگی کے عریاں بازوؤں کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے میری رانی! یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ تھوڑی دیر کے لئے تم سے پریم کی باتیں ہو جائیں۔" کریانی نے منگی کو بھینچنا چاہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں کی؟ میں تو خود تم سے پریم کرنا چاہتی ہوں۔" بدمعاش کی تو جیسے باچھیں کھل گئیں۔ منگی نے ایک ہاتھ سے بڑی آہستگی سے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"لیکن تاڑی پیئے بغیر میں محبت نہیں کر سکتی۔" کریانی بدمعاش نے جھوم کر کہا۔

"یہ تو سونے پر سہاگہ ہو گا۔ میں بھی تاڑی پیوں گا۔"

"وہ تو تمہیں ضرور پینی پڑے گی میرے ساتھ۔" اور منگی نے بڑی ادا سے مسکرا کر کریانی بدمعاش کی طرف دیکھا۔ "تم چٹائی پر بیٹھ جاؤ۔ میں مٹکے میں سے تاڑی نکال کر لاتی ہوں۔"

کریانی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ چٹائی پر بیٹھ گیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ منگی کونے میں رکھے تاڑی کے مٹکے کے پاس پہنچ کر مٹی کے دو پیالوں میں تاڑی ڈال رہی تھی اس کی پیٹھ کریانی بدمعاش کی طرف تھی۔ منگی نے جڑی بوٹیوں کی دوسری تھیلی میں سے اتنا سفوف نکال کر تیزی سے ایک پیالے میں ڈال دیا جس سے کم از

کم چار مرد ہلاک ہو سکتے تھے۔ یہ وہی بوٹی تھی جس کی قلیل مقدار آدمی کے جسم کو تھوڑی دیر کے واسطے سن کر دیتی تھی مگر زیادہ مقدار اسے ہلاک کر دیتی تھی۔

منگی سنہالی زبان کا ایک محبت بھرا گیت گنگناتی کریانی بدمعاش کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بوٹی کے سفوف والا تاڑی کا پیالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"میرے راجہ جی! اسے ایک ہی بار چڑھا جاؤ۔" منگی نے دوسرا ہاتھ بڑی محبت اور پیار کے ساتھ کریانی کے کندھے پر رکھ دیا کریانی اس وقت جذباتی اشتعال کی حالت میں تھا اسے کہاں خیال آتا کہ تاڑی میں کچھ ملایا نہ گیا ہو۔ پیالہ اس نے ہونٹوں کے ساتھ لگایا اور غٹاغٹ ساری تاڑی چڑھا گیا۔

تاڑی کے بارے میں شاید آپ نہ جانتے ہوں یہ تاڑ کے درخت بلکہ اس کی شاخوں سے نکالا گیا دودھ ہوتا ہے۔ تاڑ کے درخت کی دو چار اوپر والی شاخیں کاٹ کر ان کے منہ پر مٹی کے چھوٹے مٹکے باندھ دیے جاتے ہیں ساری رات ان میں دودھ قطرہ قطرہ ٹپکتا رہتا ہے۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے ان مٹکوں کو اتار لیا جاتا ہے۔ اس وقت اگر وہ تاڑی پی جائے تو اس میں نشہ بالکل نہیں ہوتا۔ میں نے ایک جنگل میں صبح کے وقت درخت سے اتارے ہوئے مٹکے کی تاڑی پی تھی۔ اس کا ذائقہ دہی کی گاڑھی لسی کی طرح تھا۔ یہ جگر کے واسطے بڑی مفید ہوتی ہے لیکن جب ان مٹکوں کو بند کر کے دن بھر دھوپ میں رکھ دیا جاتا ہے تو اس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے یہ تو اصلی نشے والی تاڑی ہوتی ہے۔ اس کے بعد جو تاڑی لنکا برما اور تھائی لینڈ وغیرہ ملکوں کے بازاروں میں بکتی ہے اس تاڑی میں الکوحل یا میتھولیٹڈ ڈ اسپرٹ ملا دی جاتی ہے اور پھر اس کے ڈرموں کے ڈرم بھر دیے جاتے ہیں۔ یہی تاڑی پھر تاڑی خانوں میں فروخت ہوتی ہے۔ یہ ان ملکوں کے مزدوروں اور غریب محنت کش عوام کا مشروب ہے۔ یہ تاڑی انتہائی نشہ آور اور صحت کے لئے مضر ہوتی ہے۔ میں نے لنکا اور رنگون کے تاڑی خانوں میں لوگوں کو تاڑی پی کر اودھم مچاتے ایک دوسرے سے لڑتے دیکھا ہے۔ ان ملکوں میں گھروں اور گلیوں میں صفائی کرنے والی عورتیں بھی تاڑی خانوں کے باہر زمین پر بیٹھ کر تاڑی پیتی ہیں اور پھر آپس میں خوب لڑائی کرتی ہیں۔

سنیاسن منگی کے جھونپڑے میں جو تاڑی کا مٹکا رکھا ہوا تھا وہ بھی بڑی تیز نشہ آور تاڑی تھی اوپر سے منگی نے اس میں بے حس کر دینے والی بوٹی کا سفوف بھاری مقدار میں ملا دیا تھا۔ اس تاڑی نے بڑی جلدی اپنا اثر دکھا دیا۔ کریالی بدمعاش نے تاڑی پینے کے بعد

سگریٹ لگایا اور سنیاسن کو اپنی طرف کھینچا۔ سنیاسن نے آگے سے کوئی مزاحمت نہ کی وہ جانتی تھی کہ جس بوٹی کا سفوف اس کو پلا دیا ہے وہ مزید حرکت کرنے کی اجازت نہیں دے گی اور ایسا ہی ہوا۔ کریانی بدمعاش کو ایک جھٹکا سا لگا۔ سگریٹ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ سنیاسن منگلی پیچھے ہٹ گئی۔ کریانی چٹائی پر بیٹھے بیٹھے پیچھے گر پڑا۔

منگلی نے سب سے پہلے اس کے ہاتھ سے گرا ہوا جلتا سگریٹ تاڑی میں ڈال کر بجھایا۔ پھر چٹائی کے قریب بیٹھ کر بدمعاش کریانی کو غور سے دیکھنے لگی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ کھینچ گیا آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔ منگلی نے اس کا بازو اوپر اٹھا کر چھوڑا تو وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح نیچے گر پڑا۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔ کریانی کے دل کی دھڑکن ڈوب رہی تھی۔ وہ اسی وقت جھونپڑی سے نکل کر جنگل میں اپنے سنیاسی باپ کی طرف دوڑ پڑی۔ بوڑھا سنیاسی شیر خان کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بیٹی کو دیکھ کر اس نے گھبراہٹ میں پوچھا۔

"دوڑی کیوں آ رہی ہو؟"

منگلی نے جلدی جلدی ساری بات بیان کر دی سنیاسی باوا نے کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کیا سنیاسیوں کی بہو بیٹیوں کی بھی عزت آبرو ہوتی ہے۔ لاش کا جھونپڑی میں پڑے رہنا ٹھیک نہیں اس کے ساتھی تلاش میں وہاں آسکتے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ" منگلی نے کہا۔

"مگر شیر خان یہاں اکیلا رہے گا؟"

"اس کی تم فکر نہ کرو میں نے اسے چندن بوٹی کا پانی پلا دیا ہے۔ یہ صبح تک سویا رہے گا۔"

"مگر باوا جنگل کا کوئی درندہ ادھر آجائے گا۔" منگلی کی اس بات کے جواب میں سنیاسی باوا یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس کے زخموں پر جس بوٹی کا لیپ لگایا گیا ہے اس کی بو کسی جانور درندہ تو کیا کسی کیڑے مکوڑے کو بھی اس کے پاس نہیں آنے دے گی۔"

بیٹی کے ساتھ سنیاسی باوا جھونپڑی میں آیا۔ آتے ہی اس نے کریانی بدمعاش کی نبض

دیکھی نبض خاموش تھی۔ کریانی مر چکا تھا انہوں نے مل کر لاش کو اٹھایا اور کچھ فاصلے پر ان چٹانوں میں لے آئے جہاں کھاڑی کا سمندری پانی اندر تک آگیا تھا۔ یہاں زمین بے حد نرم اور ریتلی تھی وہ ایک کھرپا اپنے ساتھ لائے تھے۔ رات کے اندھیرے میں انہوں نے ایک چٹان کی اوٹ میں آکر زمین میں گڑھا کھودا اور کریانی بدمعاش کی لاش کو اس میں گرا کر اوپر ریت ڈال کر اسے بھر دیا منگلی ادھر ادھر سے چھوٹے پتھر اکٹھے کر کے لے آئی سنیاسی باوا نے ان پتھروں کو اوپر بکھیر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی جھونپڑی میں آگئے۔ سنیاسی باوا کہنے لگا۔

"تم یہاں آرام کرو۔ میں شیر خان کے پاس جاتا ہوں۔" پھر اس نے رومال میں لپٹا ہوا کریانی بدمعاش کا پستول نکال کر بیٹی کو دیا اور کہا۔ "اس میں گولیاں پڑی ہوئی ہیں اگر اب کوئی بدمعاش ادھر آیا تو بے شک اس پر گولی چلا دینا۔ پھر جو ہو گا میں دیکھ لوں گا۔ ہم لوگ اپنی عزت بچانا جانتے ہیں۔"

پستول چاقو خنجر چھرا ان سنیاسیوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ ان کے قبیلے میں بھی جرائم پیشہ لوگ تھے جو آئے دن چوریاں ڈاکے مارتے رہتے تھے اور گولیاں بھی چلتی رہتی تھیں۔ منگلی نے پستول لے کر سرہانے کے نیچے رکھ لیا اور گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو جھونپڑی میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور درختوں پر چڑیاں بول رہی تھیں۔ اتنے میں اس کا باپ بھی آگیا۔ کہنے لگا۔

"بانس کا بھوپان لاؤ۔ شیر خان کو وہاں سے دوسری جگہ لے جانا ہو گا۔ اب خطرہ ہے کہ اسمگلر اپنے آدمی کی تلاش میں ادھر ضرور آئیں گے۔"

"مگر ہم اسے کہاں لے کر جائیں گے؟"

"میں نے ایک جگہ دیکھ لی ہے تم جلدی سے بھوپان نکالو۔"

یہ بانس کو جوڑ کر انہوں نے ایک ہلکا پھلکا اسٹریچر بنایا ہوا تھا۔ منگلی جھونپڑی کے پیچھے سے بانس کا بھوپان لے آئی۔ وہ چھوٹی سیڑھی کی طرح تھا۔ پستول کو سنیاسی باوا نے جھونپڑی کے سامنے ایک درخت کے پاس زمین کھود کر چھپا دیا۔ بھوپان کاندھے پر رکھ کر وہ منگلی کے آگے آگے چل پڑا۔ شیر خان ہوش میں تھا۔ منگلی نے جھک کر کہا۔

"ہم تمہیں ایک دوسری جگہ لے جا رہے ہیں تمہارے دشمن تمہارے پیچھے لگے ہیں۔"

شیر خان کے ذہن پر ابھی تک چندن بوٹی کا اثر تھا اور اس پر غنودگی سی طاری تھی۔ زخموں میں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ کیلے کے پتوں کے بستر پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف آنکھوں سے ایسا اشارہ کیا جیسے اس نے سب کچھ سن لیا ہے۔

سنیاسی باوا اور اس کی بیٹی نے شیر خان کو بڑی احتیاط سے اٹھا کر بانس کے اسٹریچر پر ڈالا اور اسے لے کر ایک طرف چل پڑے۔ سنیاسی باوا نے اسٹریچر کو آگے سے پکڑ رکھا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کہاں جانا ہے۔ جگہ جو سنیاسی باوا نے شیر خان کو چھپانے کے واسطے منتخب کی تھی وہاں سے کچھ فاصلے پر ہی تھی یہ ایک قدرتی چٹانی غار تھا جو زمین سے کوئی پچاس فٹ کی بلندی پر تھا اور پیچھے سے ایک تنگ راستہ چڑھائی پر جاتا تھا

سنیاسی باوا اور منگلی نے زخمی شیر خان کو غار میں ایک طرف دیوار کے ساتھ گھاس پھوس کا نرم بستر بچھا کر منہ کے بل لٹا دیا۔ کیونکہ تینوں زخم شیر خان کی پیٹھ پر لگے تھے۔ یہاں وہ محفوظ تھا۔ یہ ایسا غار تھا جہاں نہ تو کبھی کوئی آتا تھا اور نہ کسی کا اس طرف خیال ہی گیا تھا۔ سنیاسن منگلی اور اس کے باپ نے غار میں لگے سارے جالے صاف کر کے وہاں پانی سے بھرا ہوا مٹکا دو چٹائیاں اور شیر خان کے زخموں پر لگائی جانے والی جڑی بوٹیاں بھی لا کر رکھ دیں جنہیں پیس کر صبح شام ان کا لیپ لگایا جاتا تھا۔ کھانے پینے کے بارے میں سنیاسیوں کا اپنا طریقہ ہے۔ شیر خان کے واسطے منگلی اپنے قبیلے میں سے ایک بکری لے آئی تھی جس کا دودھ اسے پلاتی تھی۔

یہ لوگ شیر خان کی بڑی اچھی طرح سے دیکھ بھال کر رہے تھے۔

اب ہم اپنی شیرنی یعنی عائشہ کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کس حال میں ہے۔

ہم نے عائشہ شیرنی کو اسی عالم میں چھوڑا تھا کہ اس نے بودھ بھکشوں والا بھیس بدل رکھا تھا۔ یعنی سر کے بال اور بھویں صاف کروادی تھیں بدن پر زعفرانی رنگ کی بھکشوؤں والی چادر تھی۔ گلے میں کھدر کا پرانا تھیلا لٹک رہا تھا اور کاندھے پر ناریل کی شاخوں سے بنی

ہوئی چھتری تھی۔ رامیکا نے اسے کچھ پیسے بھی دے دیئے تھے اور وہ پورا تھنی کی بودھ خانقاہ کی طرف جا رہی تھی۔ یہ خانقاہ جافنا سے پچاس میل پہلے آتی تھی۔ چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر وہ ٹرین میں بیٹھ گئی۔ لنکا میں ریلوے والے بودھ بھکشوؤں سے کوئی کرایہ نہیں لیتے۔ یہ لوگ ٹرین میں مفت سفر کرتے ہیں۔ چنانچہ شیرنی بھی ٹکٹ لئے بغیر ٹرین میں سوار ہو گئی۔ گیٹ سے گزرتے وقت ٹکٹ چیکر نے اس سے ٹکٹ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا تھا۔ یہاں سب سے بڑا مسئلہ اس کے سامنے زبان کا تھا۔ وہ لنکا کی سنہالی زبان نہیں جانتی تھی۔ وہ پنجاب میں پیدا ہوئی تھی۔ پنجابی اس کی مادری زبان تھی۔ اردو قومی زبان تھی اور انگریزی فرانسیسی زبانیں اس نے کانونٹ میں پڑھی تھیں۔ یہاں وہ اب تک انگریزی یا ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں ہی بات کرتی آئی تھی۔ کیونکہ جنوبی ہند اور لنکا میں انگریزی اور ہندوستانی ہر کوئی بول لیتا تھا۔ ٹرین اپنی منزل کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ شیرنی کے سامنے والی سیٹ پر ایک دبلی پتلی لڑکی بیٹھی تھی جو شکل صورت سے پڑھی لکھی لگتی تھی۔ جنوب میں عام بھکشنی عورتوں کا رنگ سانولا اور سبزی مائل ہوتا ہے جب کہ عائشہ کا رنگ سرخ و سفید تھا اس لڑکی نے عائشہ سے پوچھ ہی لیا۔

"تم کہاں سے آ رہی ہو بہن؟" یہ جملہ اس نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی یا اردو زبان میں ادا کیا تھا۔ عائشہ نے بھی ویسی ہی شکستہ اردو میں جواب دیا

"میں پنجاب سے آ رہی ہوں۔" اس سنہالی لڑکی نے تعجب سے پوچھا۔

"مگر پنجاب میں تو مہاتما بدھ کو ماننے والے نہیں ہوتے۔" عائشہ نے پہلے سے اس کا جو جواب سوچ رکھا تھا وہ دے دیا اور اس نے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا۔ میں پنجاب کی برہمن ہندنی ہوں۔ میرا نام ساوتری ہے۔ مجھے مہاتما بدھ کے وچار بڑے اچھے لگے۔ میں نے بدھ مت اختیار کر لیا اور بھکشنی بن گئی۔ اب لنکا کی بودھ خانقاہوں کی یاترا کے لئے یہاں آئی ہوں۔"

ادھر ادھر بیٹھے ہوئے دوسرے مسافروں نے بھی عائشہ کی طرف دیکھا اور ان کی بھی تسلی ہو گئی ورنہ عائشہ کا سرخ و سفید رنگ انہیں بھی مغالطے میں ڈالے ہوئے تھا کہ اتنی گوری چٹی بھکشنی کہاں سے آ گئی ہے پورا تھنی اسٹیشن پر گاڑی رکی تو سنہالی لڑکی نے عائشہ

سے کہا کہ وہ اس کے گھر چل کر رات ٹھہرے عائشہ نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"ہم بھکشو لوگ کسی کے ہاں مہمان نہیں ٹھہرتے۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اسٹیشن سے باہر آ گئی۔ رامیکا نے اسے پوراتھنی خانقاہ کا محل وقوع بتادیا تھا۔ چنانچہ وہ بودھ خانقاہ میں پہنچ گئی۔ یہاں تین چار اور بھکشو عورتیں بھی ٹھہری ہوئی تھیں۔ عائشہ کے رنگ روپ نے ان عورتوں کو بھی اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ عائشہ نے یہاں بھی وہی سوچی سمجھی وضاحت پیش کر دی۔ ان سے عائشہ نے جافنا کے آس پاس کی دو تین بودھ خانقاہوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں مگر ان عورتوں نے عائشہ کو جافنا کی خانقاہوں میں جانے سے منع کیا۔

"بہتر ہو گا کہ تم یہیں سے کسی گاڑی میں بیٹھ کر کولمبو چلی جاؤ کیونکہ شمال میں آج کل تامل ٹائیگرز نے بڑی تباہی مچا رکھی ہے وہ یہاں کے لوگوں کو بے دریغ قتل کر رہے ہیں۔ تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔"

لیکن عائشہ جن لوگوں سے اپنی اور اپنے ماں باپ کی بے عزتی کا بدلہ لینے آئی تھی وہ تو جافنا کے اردگرد ہی تھے وہ کیسے کولمبو جا سکتی تھی اس نے یونہی کہہ دیا۔

"جافنا کی ایک خانقاہ کی زیارت کے بعد میں کولمبو چلی جاؤں گی۔" عائشہ کو ملنے والی اطلاعات کے مطابق یہ بودھ خانقاہ جافنا شہر کے شمال میں ایک پہاڑی جنگل میں واقع تھی۔ یہاں شہاب اور فیروز کے خفیہ اڈے کی موجودگی کا امکان تھا۔ عائشہ کے سامنے سب سے پیچیدہ پرابلم یہ تھی کہ وہ ان دشمنوں کا سراغ کیسے لگائے؟ اپنے آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نے بودھ بھکشو عورت کا بھیس بدلا تھا۔ لیکن مصیبت یہ بن گئی تھی کہ وہ اس بھیس میں بدمعاشوں جرائم پیشہ لوگوں اور اسمگلروں کی دنیا کا رخ نہیں کر سکتی تھی۔

پوراتھنی کی خانقاہ میں چٹائی پر لیٹے وہ سونے سے پہلے کافی دیر تک اسی مسئلے پر غور و فکر کرتی رہی۔ وہ کوئی کمزور دل نازک اندام عورت نہیں تھی۔ اس کا جگر شیرنی کا تھا اور اس کے شیر دل ماں باپ نے اسے کمانڈو کی تربیت بھی دے رکھی تھی اور وہ ہر قسم کا اسلحہ چلا سکتی تھی۔ دشمن سامنے آجائے تو جھجکے بغیر اسٹین گن کا پورا برسٹ مار سکتی تھی۔ ایک مذہبی فرقے سے تعلق رکھنے والی فقیرنی جو گن ٹائپ عورت کا اسمگلروں سے کیا کام ہو سکتا

تھا۔ دوسرے اسے یہ خیال بھی تھا کہ اگرچہ اس نے سر کے بال اور بھویں منڈوا کر کافی حلیہ بدل لیا تھا مگر شہاب اور فیروز کی تیز آنکھیں اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کھا سکتی تھیں۔ لنکا میں اسے کسی نہ کسی طرح پہنچنا تھا سو وہ پہنچ گئی تھی اب آگے اسے اپنے اور اپنے باپ کے دشمنوں کو تلاش کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارنا باقی تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ سب سے پہلے تو اسے مہلک قسم کا اسلحہ حاصل کرنا چاہئے اس کے بعد شہاب اور فیروز کا کھوج لگا کر ایک منٹ ضائع کئے بغیر ان کو گولیوں سے بھون ڈالنا چاہئے چاہے اس میں اس کی اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

پوراتھنی کی بودھ خانقاہ مین رات بسر کرنے کے بعد عائشہ اگلے روز جافنا کی طرف روانہ ہو گئی۔ جافنا کا اسٹیشن کافی بڑا تھا مگر تامل ٹائیگرز یا تامل ایلام کی دہشت گردیوں کی وجہ سے خالی پڑا تھا۔ جو مسافر ریل سے اترے وہ بھی جلدی جلدی اسٹیشن سے باہر نکل گئے تھے۔ عائشہ بھی بدھ بھکشنی کے لباس میں اسٹیشن سے باہر نکل آئی۔ یہ ساری جگہیں اس کے لئے اجنبی اور بالکل نئی تھیں لیکن عائشہ اعتماد کی طاقت سے مالا مال تھی۔ وہ بہادر تھی۔ بہادر ان معنوں میں کہ اپنی عزت اور اپنے ناموس کی خاطر جان لے بھی سکتی تھی اور اپنی جان قربان بھی کر سکتی تھی۔ ایک طرح سے وہ موت کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس مہم پر نکلی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وطن سے دور ایک اجنبی ملک میں آکر بھی وہ بے خوف اور بے باک تھی۔ اس کے علاوہ عائشہ کے دل میں ان گھناؤنے جرائم کرنے والے لوگوں کے خلاف انتقام کی آگ بھی مسلسل بھڑک رہی تھی۔ جنہوں نے اسے اغوا کر کے بدکردار بدمعاش لوگوں کے پاس فروخت کر دیا تھا ان تمام باتوں نے مل کر عائشہ کو ایک خونخوار شیرنی بنا دیا تھا جو اجنبی جنگل میں آکر اپنے دشمن کی بو سونگھتی پھر رہی تھی۔

جس بودھ خانقاہ کا پتا پوراتھنی کی بھکشو عورتوں نے اسے دیا تھا وہ جافنا کے شمال میں شہر سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی مقام پر واقع تھی۔ لنکا میں چونکہ بودھ مت سرکاری مذہب ہے اس لئے وہاں لوگ بودھ بھکشوں اور بھکشنوں کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک سائیکل رکشا والے سنہالی نے عائشہ کو خانقاہ تک پہنچا دیا۔ یہ خانقاہ بھی پہلی خانقاہ کی طرح ہی تھی۔ وہی افسردہ سی خاموشی درودیوار سے لپٹا ہوا اندھیرا زندگی کے میدان جنگ سے

بھاگی ہوئی عورتوں کے لٹکے ہوئے اداس چہرے اور ان چہروں پر فطری جذبوں کے خلاف کی ہوئی ریاضتوں کی تھکن ...... اس خانقاہ میں بودھ مت کے مرد بھکشو راہب بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ سب کے سر منڈے ہوئے تھے۔ بظاہر ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا جس کمرے میں گوتم بودھ کی مورتی رکھی تھی اس طرف سے بودھ اشلوک پڑھنے کی دھیمی دھیمی دردناک سی آواز آ رہی تھی۔ فضا میں لوبان اور اگربتیوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ ایک مرد بھکشو عائشہ کو غور سے دیکھتا ہوا بھکشنوں کے پاس لے گیا۔ ہر کوئی عائشہ کے گورے چٹے رنگ دراز قد اور چوڑے قد کاٹھ کی وجہ سے بڑے تعجب سے اسے دیکھتا تھا یہاں بھی عائشہ نے بودھ مت اختیار کرنے کا وہی فرضی افسانہ دہرا دیا جو پہلے والی خانقاہ میں اس نے عورتوں کو بتایا تھا۔

اسی خانقاہ کے پیچھے ایک چشمہ بہتا تھا۔ شام کو سب راہب عورتیں وہاں اشنان کرنے جاتی تھیں۔ یہاں قصبے سے خیرات میں ملا ہوا کھانا وغیرہ آتا تھا۔ اس میں ہر قسم کی سبزیاں' پھل' چاول' اور پکا ہوا کھانا بھی ہوتا تھا۔ عائشہ کو اس خانقاہ میں رہتے ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ اس دوران اس نے ہر شے کا اچھی طرح سے جائزہ لیا تھا۔ ایک بھکشنی عورت عائشہ کو کچھ مشکوک سی نظر آئی تھی۔ مہاتما بدھ کی مورتی کی پوجا کرتے وقت وہ قطار میں سب سے پیچھے ہوتی اور کسی وقت اس کا سر یوں ایک جانب اپنے آپ جھک سا جاتا تھا جیسے اس نے کوئی نشہ کیا ہوا ہو۔ اس بھکشنی کو وہاں سب جانکی کے نام سے بلاتے تھے۔ عائشہ نے ایک عورت سے جانکی کے بارے میں بات کی تو اس نے رازدارانہ انداز میں عائشہ کو بتایا کہ یہ عورت نشہ کرتی ہے چونکہ بڑے بھکشو کے ساتھ اس کی دوستی ہے اس لئے بیٹھی ہے ورنہ کب کی یہاں سے نکالی جا چکی ہوتی۔ عائشہ نے سوچا کہ اگر یہ عورت جانکی نشہ کرتی ہے تو ضرور کہیں سے ہیروئن یا کوئی دوسری نشہ آور شے خریدتی ہو گی۔ یا کوئی اسے دینے یہاں چھپ کر آتا ہو گا۔ اس عورت سے یہاں کے جرائم پیشہ لوگوں کے کسی ٹھکانے کا سراغ مل سکتا تھا۔

عائشہ نے جانکی کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی کوشش کی مگر جانکی نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور اپنے رویے سے عائشہ کو بتا دیا کہ وہ دوستی نہیں کرنا چاہتی۔ عائشہ نے سوچا

کہ اس عورت سے دوستی تو نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ پتا چلانے کی کوشش کرنی چاہئے کہ یہ نشہ آور چیزیں لینے کہاں جاتی ہے یا اسے یہ چیزیں یہاں کون دینے آتا ہے۔ عائشہ نے جانکی کو اپنی نگاہوں میں رکھ لیا اور اس کی نگرانی شروع کر دی۔

اسی خانقاہ میں بھکشو عورتوں کی تعداد سات تھی جب کہ مرد بھکشو دس گیارہ کے قریب تھے۔ عورتیں رات کو ایک کمرے کے فرش پر چٹائیاں بچھا کر سوتی تھیں اور مرد ساتھ والے کمرے میں سوتے تھے۔ اسی رات کا ذکر ہے کہ آدھی رات کے وقت باہر سے اچانک فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ خانقاہ کے بھکشو مرد اور عورتیں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ عائشہ بھی جاگ پڑی۔ فائرنگ کی آواز قریب آ رہی تھی۔ یہ اسٹین گنوں کے برسٹ فائر کیے جا رہے تھے جس کمرے میں مرد بھکشو تھے ادھر بھی شور مچ گیا۔ کسی نے چلا کر کہا۔

"تامل ایلام والے آ گئے ہیں۔ بھاگ جاؤ۔"

کچھ عورتیں پچھلے دروازے میں سے بھاگ گئیں۔ تامل گوریلے دروازہ توڑ کر اندر گھس آئے۔ آتے ہی انہوں نے پورا برسٹ دیوار پر مارا اور لنکا کی سنہالی زبان میں کچھ کہا جسے عائشہ نہ سمجھ سکی۔ اس وقت کمرے میں صرف تین بھکشو عورتیں رہ گئی تھیں۔ ایک عائشہ ایک جانکی اور ایک اور بھکشو عورت۔ تامل گوریلے ان سب کو بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ باہر دوسرے گوریلے دھڑا دھڑ فائرنگ کر رہے تھے اور چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے۔ بھکشو مردوں کو وہ ٹھڈے مار مار کر ایک طرف بٹھا رہے تھے۔ یہ چھ گوریلے تھے۔ ان سب نے گوریلوں والی خاکی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ سب کے پاس اسٹین گنیں تھیں۔ عائشہ پہلی بار تامل گوریلوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھتے دیکھتے انہوں نے دو بھکشوؤں کو برسٹ مار کر ہلاک کر دیا۔ خانقاہ کے برآمدے میں جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی میں بے گناہ بھکشو مردوں کی لاشیں خون میں تڑپ رہی تھیں۔ باقی دونوں عورتوں کے ہوش اڑ گئے تھے عائشہ پر بھی خوف طاری تھا مگر وہ اپنے ہوش و حواس کو سنبھالے ہوئے تھی۔ ایک گوریلا ان کا لیڈر تھا وہ اسٹین گن ہاتھ میں لئے عائشہ۔ جانکی اور دوسری بھکشو عورتوں کے پاس آیا۔

اس نے عائشہ کو غور سے دیکھا اور اپنے ساتھی سے سنہالی زبان میں کچھ کہا اور پھر

سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ ظاہر ہے یہی کہا ہو گا کہ یہ گوری چٹی بھکشنی یہاں کہاں سے آگئی ہے۔ گوریلا لیڈر نے سنہالی زبان میں عائشہ سے کچھ پوچھا۔ عائشہ نے انگریزی میں کہا کہ میں انڈیا کی رہنے والی ہوں۔ سنہالی زبان نہیں سمجھتی اس پر گوریلا لیڈر نے انگریزی میں کہا۔

"تم چاہے جہاں سے بھی آئی ہو اب ہمارا مال ہو۔ چلو۔"

وہ عائشہ اور دوسری دونوں عورتوں کو کھینچتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ تینوں عورتوں کو کمرے میں بند کر دیا اور باہر برآمدے میں بیٹھ کر وہ شراب پینے لگے۔ جانکی اور دوسری بھکشو عورت کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ خوف کے مارے ان سے بولا نہیں جاتا تھا۔ عائشہ نے انہیں ٹوٹی ہوئی ہندوستانی میں کہا۔ "مری کیوں جاتی ہو۔ جب تک جان میں جان ہے مقابلہ کریں گی۔" باہر تامل گوریلوں کے قہقہوں اور اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان آوازوں سے عائشہ کو اندازہ ہوا کہ یہ لوگ وہاں سے کچھ دور بیٹھے ہیں۔ بند دروازے اور دیواروں میں باہر جھانکنے کے لئے کوئی دراڑ بھی نہیں تھی۔ اتنے میں بھاری بوٹوں کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھلا اور سامنے تامل گوریلوں کا لیڈر ہاتھ میں اسٹین گن لئے کھڑا تھا۔ اس نے پاؤں سے دروازہ بند کر دیا۔ صاف لگتا تھا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے۔ عائشہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں بولا۔

"پہلے تم میرے ساتھ آؤ۔"

عائشہ کمرے میں جلتے بلب کی روشنی میں گوریلا لیڈر کو تکنے لگی۔ یہ سب گوریلے ناٹے قد کے دبلے پتلے کالے کالے تھے۔ قد کاٹھ میں عائشہ ان سب سے مضبوط اور توانا تھی۔ گوریلا لیڈر کو عائشہ کی طرف اسٹین گن کا رخ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ تو ان کی مفتوحہ عورتیں تھیں۔ اس کو کیا پتا تھا کہ وہ کس عورت پر ہاتھ ڈالنے والا ہے۔ وہ وقت آگیا تھا جس وقت کے لئے عائشہ نے اپنی جان اور عزت سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ اسے اپنی عزت بچانے کے لئے سب سے پہلے دشمن پر ہلاکت خیز حملہ کرنا تھا اور ناکامی کی صورت میں اس چاقو سے اپنے آپ کو ہلاک کر دینا تھا جو عائشہ ہمیشہ اپنے لباس میں چھپا کر

رکھتی تھی۔ ایک سیکنڈ کے اندر اندر عائشہ کے جسم میں جیسے ایک جوالا مکھی سا پھٹ پڑا۔ اس کے ساتھ ہی عائشہ وہ غضبناک شیرنی بن چکی تھی جو دشمن پر حملے کرتے ہوئے یہ کبھی نہیں سوچتی کہ وہ خود بھی ہلاک ہو سکتی ہے۔ عائشہ نے پلک جھپکتے میں طے کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جونہی گوریلا لیڈر نے آگے بڑھ کر عائشہ کو بازو سے پکڑنا چاہا۔ عائشہ نے اچھل کر پوری قوت اور مہارت سے گوریلا لیڈر کے پیٹ میں ٹھڈا مارا جونہی وہ دہرا ہوا عائشہ نے اوپر سے اپنا سیدھا بازو اس کی گردن پر مارا۔ یہ ایسی ضرب تھی جس کی شیر خان نے خاص طور پر عائشہ کو ٹریننگ دی ہوئی تھی۔ یہ اتنی شدید تھی کہ دبلے پتلے جسم والے تامل گوریلا لیڈر کو کوئی ہوش نہ رہا۔ بجلی کی چمک کی طرح عائشہ شیرنی نے گوریلے کی ٹھوڑی کے نیچے اپنا بازو ڈال کر اوپر کو زبردست جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور تامل گوریلا لیڈر کی گردن کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی۔

سارا منظر دونوں بھکشو عورتیں دہشت زدہ ہو کر دیکھ رہی تھیں۔ شیرنی نے گوریلے لیڈر کی اسٹین گن سنبھال لی اور اشارے سے دونوں عورتوں کو فرش پر لیٹ جانے کو کہا۔ دونوں عورتیں اسی وقت فرش پر اوندھے منہ لیٹ گئیں۔ دروازہ بند تھا۔ شیرنی نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ چار تامل گوریلے برآمدے والے بلب کی روشنی میں ذرا نیچے زمین پر بیٹھے شراب پی رہے تھے ان میں سے ایک گوریلے نے دروازے کی طرف منہ کر کے اونچی آواز میں کچھ کہا۔ شاید وہ اپنے لیڈر کو بلا رہا تھا۔ جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ قہقہہ لگا کر اپنے ساتھی گوریلوں سے کچھ کہنے لگا۔

عائشہ کے لئے ان چاروں گوریلوں کو ہلاک کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں تھا۔ یہ سوچنے اور منصوبہ بندی کرنے کا نہیں بلکہ عمل کرنے بے دھڑک ایکشن کرنے کا وقت تھا۔ یہی عائشہ کو اپنے باپ اور شیرنی ماں سے ٹریننگ ملی تھی۔ اس نے ایک دم دروازہ کھولا اور اسٹین گن کولہے سے لگا کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ یہ ناممکن تھا کہ عائشہ کا نشانہ خطا جاتا۔ جب کہ ٹارگٹ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس نے چاروں گوریلوں کو بھون کر رکھ دیا۔ وہ جانتی تھی کہ فائرنگ کی آواز سن کر باقی کے دو تین گوریلے بھی ادھر دوڑیں گے۔ عائشہ نے لات مار کر کمرے کا دروازہ بند کیا۔

وہ اچھل کر برآمدے کا جنگلہ پھلانگا اور جہاں تال گوریلوں کی لاشیں خون میں تڑپ رہی تھیں وہاں پتھر کے چبوترے کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔ اس کی گن کا رخ خانقاہ کے بڑے کمرے کی طرف تھا جہاں باقی تال گوریلے بھکشوؤں کو بند کر کے ان سے علاقے میں موجود لنکا کے نیم فوجی دستوں کے ٹھکانوں کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ فائرنگ کی آواز سن کر تینوں گوریلے باہر نکل آئے۔ شیرنی انہیں ایک سیکنڈ کی بھی مہلت نہیں دینا چاہتی تھی۔ اگر ان میں ایک بھی گھات لگا کر بیٹھ جاتا ہے تو مقابلہ لمبا ہو سکتا تھا اور اس میں شیرنی کا نقصان تھا۔

چنانچہ جونہی تینوں گوریلے بڑے دروازے سے نکل کر اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیتے باہر آئے، شیرنی نے انہیں اپنی اسٹین گن کی زد میں لے لیا اور اس کی گن کی نالی شعلے اگلتی دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چلنے لگی۔ میگزین ختم ہو گیا تو شیرنی نے گن پھینک کر مرے ہوئے تال گوریلے کی اسٹین گن اٹھا لی۔ مگر اس دوران تینوں گوریلے پیٹ اور سینوں میں گولیوں کے برسٹ کھانے کے بعد خون میں لت پت ہو کر برآمدے کے فرش پر گر چکے تھے۔ شیرنی فائرنگ کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور دوڑ کر ان گوریلوں کے سر پر پہنچ گئی۔ اس نے بڑے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کی طرف گن کا رخ کیا اور انگریزی میں چیخ کر کہا۔

"باہر آ جاؤ۔"

اندر صرف سہمے ہوئے چھ سات بھکشو مرد ہی تھے جو سہمے سہمے سے باہر نکل آئے۔ ان کا خیال تھا کہ باہر تال گوریلے ہوں گے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ فرش پر تینوں گوریلوں کی لاشیں پڑی ہیں اور سامنے اسٹین گن لئے ان کی خانقاہ میں آئی ہوئی مہمان بھکشنی کھڑی ہے تو حیرت اور خوشی سے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ عائشہ نے ہندوستانی میں پوچھا۔

"اندر کوئی تال گوریلا تو نہیں ہے؟" بڑے راہب نے سینے پر ہاتھ باندھ رکھے تھے وہ گھبرایا ہوا تھا۔ بولا۔

"نہیں میری بچی! اندر اب کوئی بدمعاش نہیں ہے۔" اگرچہ بودھ خانقاہ کے کچھ بھکشو

بھی مارے گئے تھے مگر اس کے باوجود تال گوریلے اور ان کا لیڈر بھی مارا گیا تھا جس سے خانقاہ کے بڑے راہب کو تشویش تھی کہ تال ایلام اب اس خانقاہ کو تباہ کر دیں گے۔ جب چیف بھکشو نے عائشہ سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تو اس نے انگریزی میں کہا۔

"تو کیا تم یہ چاہتے تھے کہ تال گوریلے تمام بھکشو عورتوں کی عزتیں لوٹ کر انہیں ہلاک کر کے چلے جاتے؟ اور تم دیکھتے رہتے؟ میں نے جو کچھ کیا تم لوگوں کی جانیں اور خانقاہ کی بھکشو عورتوں کی عزتیں بچانے کے لئے کیا ہے اور مجھے اس پر کوئی پریشانی کوئی ڈر خوف نہیں ہے۔"

اسٹین گن ابھی تک عائشہ شیرنی کے ہاتھ میں تھی۔ اتنے میں وہ بھکشو عورتیں بھی واپس آ گئیں جو تال گوریلوں کے حملے کے وقت بھاگ گئی تھیں۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ بہادرانہ کارنامہ ان ہی کی خانقاہ کی ایک بھکشنی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوا ہے۔ وہ سب بڑی خوش اور جوش میں تھیں اور عائشہ کی جرات مندی کی تعریف کر رہی تھیں۔ جانکی تو بہت زیادہ عائشہ کی حمایت کر رہی تھی اور بار بار اس کا ہاتھ چوم رہی تھی۔

"ساوتری! تمہارا مقابلہ تو کوئی بڑے سے بڑا کمانڈو بھی نہیں کر سکتا۔ تم نے جس طرح گوریلا لیڈر کو گرا کر اس سے گن چھینی میں اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔"

بھکشو مرد بھی اب عائشہ کی حمایت کرنے لگے کہ اگر یہ لڑکی جرات سے کام نہ لیتی تو تال گوریلے ان میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑتے۔ چیف راہب دل سے عائشہ کی بہادری کا قائل ہو گیا ہوا تھا مگر وہ تال گوریلوں کی طاقت سے گھبراتا تھا۔ کہنے لگا۔

"وہ تو میں بھی مانتا ہوں مگر ان لاشوں کو کہاں لے جائیں؟" عائشہ کہنے لگی۔

"تال گوریلوں کی لاشوں کو ہم گڑھا کھود کر زمین میں دبا دیں گے۔ اپنے بھکشوؤں کا ہم عزت و احترام کے ساتھ کریا کرم کریں گے۔ ہم قریبی چوکی میں جا کر رپورٹ کریں گے کہ ہماری خانقاہ میں رات تال گوریلوں نے حملہ کیا اور ہمارے بھکشوؤں کو ہلاک کر کے رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ ہم اس کا ذکر ہی نہیں کریں گے کہ یہاں کسی تال گوریلے کا خون ہوا ہے جب ان کی لاشیں یہاں نہیں ہوں تو ہمارے بیان پر سب کو یقین آ جائے گا۔"

itsurdu.blogspot.com

چیف بھکشو نے ایسا ہی کیا۔ ابھی کافی رات باقی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ سب بھکشو اور بھکشو عورتوں نے مل کر خانقاہ کے پیچھے ایک کھڈ میں کافی بڑا خندق نما گڑھا کھود ڈالا۔ پھر سارے تامل گوریلوں کی لاشیں اس میں ڈال کر اسے مٹی پتھروں سے بھر دیا اور اوپر درختوں کے پتے اور جھاڑیاں کاٹ کر بکھیر دیں۔ گوریلوں کی اسٹین گنیں' شراب کی خالی بوتلیں اور سگریٹوں کے ٹکڑے بھی ایک الگ گڑھے میں دبا دیئے گئے۔ صرف ایک اسٹین گن اور گولیوں کی ایک بیلٹ عائشہ نے اپنے پاس رکھی اور اسے الگ جگہ ایک درخت کے نیچے دبا دیا۔ یہ کام ختم کرنے کے بعد چیف بھکشو نے قریبی قصبے کے تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرا دی۔ وہاں کی پولیس خود تامل ایلام سے ڈرتی تھی پولیس نے رپورٹ درج کر لی اور چیف بھکشو سے کہا۔

"تم خوش قسمت ہو کہ تم زندہ بچ گئے اب اس کا ذکر کسی فوج والے سے نہ کرنا نہیں تو تامل ٹائیگرز تمہاری خانقاہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اس بات کو دبا ہی دو تو بہتر ہے۔ ہم بھی آگے اس کی رپورٹ نہیں کریں گے۔ بس تم یہی سمجھو کہ کچھ نہیں ہوا۔ اب جاؤ اور اپنے آدمیوں کا کریا کرم بھی خاموشی سے ہی کرو۔"

صبح ہونے تک خانقاہ کے جو بے گناہ بھکشو مارے گئے تھے ان کی لاشوں کو وہاں کی رسم کے مطابق خاموشی سے دوسری خانقاہ میں جلانے کے لئے پہنچا دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد خانقاہ میں عائشہ کی بڑی دھاک بیٹھ گئی۔ ہر بھکشو اور بھکشنی اس سے ڈرنے لگی۔ عائشہ شیرنی کو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ نشے کی عادی جانکی بھکشنی اس کی دوست بن گئی اور اس نے شیرنی کے ذرا سے پوچھنے پر صاف صاف بتا دیا کہ وہ ہیروئن کے نشے کی عادی ہو چکی ہے۔

"مگر ساوتری! میں زیادہ ہیروئن نہیں لیتی دن میں دو ایک بار اسے تھوڑا تھوڑا استعمال کرتی ہوں۔"

"یہ ہیروئین تم کہاں سے لیتی ہو؟ کیا کسی جگہ خود جاتی ہو یا کوئی آدمی تمہیں یہاں دے جاتا ہے؟" جانکی نے شیرنی کی منت کرتے ہوئے کہا۔

"بھگوان کے لئے کسی کو بتانا نہیں۔ نہیں تو یہ لوگ مجھے یہاں سے نکال دیں گے۔"

"میں کسی کے آگے ذکر نہیں کروں گی۔ تم یہ بتاؤ کہ یہ دوا تم کہاں سے لاتی ہو؟"

جانکی اور شیرنی اس وقت خانقاہ کے پچھواڑے کیلے کے درخت کے پاس بیٹھی تھیں۔ جانکی کہنے لگی۔

"یہاں سے تھوڑی دور نالے کے پار ایک جھونپڑی میں بیوہ مچھیرن رہتی ہے۔ وہ یہی دھندا کرتی ہے میں ہفتے میں ایک دن شام کو اس کے پاس جاتی ہوں اور ایک پڑیا لے آتی ہوں۔" شیرنی نے پوچھا۔

"وہ مچھیرن یہ دوا کہاں سے لاتی ہے؟" جانکی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم اتنا کرید کرید کر کیوں پوچھ رہی ہو؟ کیا تم بھی چکھنا چاہتی ہو؟" پھر جانکی خود ہی ہنس دی۔ شیرنی نے کہا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے مجھے اس نشے کا شوق نہیں ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ پیچھے انڈیا میں میرے ایک ماموں تھے وہ بھی یہی نشہ کیا کرتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ کسی وجہ سے ان کا ہیروئن بیچنے والوں سے جھگڑا ہو گیا۔ سنا ہے کہ وہ لوگ اسے اغوا کر کے یہاں جافنا کے کسی اسمگلروں کے اڈے میں لے آئے ہیں اور یہاں اس سے مشقت کراتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اب یہاں آئی ہوں تو ماموں کا ہی کچھ پتا چلا لوں۔" جانکی بولی۔

"اس مچھیرن کو اسمگلروں کے سارے اڈوں کا پتا ہے کیونکہ یہ نشے والی دوائی باہر سے ہی اسمگل ہو کر یہاں آتی ہے۔ تم کسی روز میرے ساتھ مچھیرن کے پاس چلنا۔ وہ تمہیں ان کے اڈے بتا سکے گی۔ کہ کہاں کہاں ہیں۔ آگے پتا چلانا تمہارا کام ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" عائشہ نے کہا۔ دو دن بعد جانکی دوپہر کے بعد شیرنی کے قریب سے گزرتے ہوئے رک گئی اور دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

"آج شام کو مچھیرن کے پاس چلیں گے۔ تم تیار رہنا۔" شام کو جب خانقاہ کے سبھی بھکشو اور بھکشنیں پوجا پاٹ میں لگی تھیں جانکی نے شیرنی کو اپنے ہمراہ لیا اور مچھیرن کی طرف چل دی۔ مچھیرن کی جھونپڑی نالے کے پار ایک چھوٹے سے تالاب کے پاس تھی۔ کالے رنگ اور شنگرفی آنکھوں والی بوڑھی مچھیرن کے موٹے موٹے سفید بال ناریل کے تیل میں چمک رہے تھے۔ اس نے شیرنی کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ جانکی نے اسے اپنی زبان میں کہا۔

"یہ میری سہیلی ہے۔ انڈیا سے آئی ہے۔ ابھی اسے نشہ نہیں لگا۔ آہستہ آہستہ میں اسے بھی لگا دوں گی۔"

بوڑھی مچھیرن اپنے ٹوٹے پھوٹے لال پیلے دانت نکال کر ہنسنے لگی۔ شیرنی عائشہ بھی مسکرا دی۔ اس کے بعد شیرنی عائشہ نے اپنے فرضی ماموں کے بارے میں مچھیرن سے پوچھ گچھ کی۔ مچھیرن نے حلیہ پوچھا تو شیرنی نے شہاب یا فیروز کا حلیہ بتانے کی بجائے یونہی فرضی حلیہ بیان کر دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شہاب یا فیروز تک یہ اطلاع پہنچے کہ ایک بھکشنی جو شمالی انڈیا سے آئی ہے اس کا حلیہ پوچھ رہی تھی شیرنی کا مقصد یہ تھا کہ وہ مچھیرن سے ادھر ادھر کی باتوں سے شہاب اور فیروز کے بارے میں ان کا حلیہ بتائے بغیر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن مچھیرن کی باتوں سے شیرنی کو اندازہ ہوا کہ اس کا تعلق بڑے اسمگلروں کے کسی گینگ سے نہیں ہے۔ اسے ہیروئن اور چرس کی تھوڑی سی مقدار ایک آدمی آکر دے جاتا ہے جسے وہ آگے لگے بندھے گاہکوں میں فروخت کر دیتی ہے۔

شیرنی نے قصداً اس کے بعد کوئی بات نہ کی اور جانکی کے ساتھ خانقاہ میں واپس آگئی۔

ایک دن چھوڑ کر شام کے وقت شیرنی خود مچھیرن سے ملنے چلی گئی۔ مچھیرن شیرنی کو دیکھ کر بڑی خوش ہوئی اور کہنے لگی۔

"تھوڑی سی دوائی لاؤں؟ ایک بار پی کر تو دیکھو۔ ساری زندگی مجھے یاد کرو گی۔" شیرنی ہنسنے لگی۔

"نہیں ابھی نہیں۔ میں تو تم سے ایک اور بات کرنے آئی ہوں۔"

"کیا بات کرنی ہے کہو؟" مچھیرن شیرنی کے قریب ہو گئی۔ شیرنی نے بظاہر بڑی رازداری کے ساتھ کہا۔

"تم اپنا دھندا کیوں نہیں شروع کر دیتیں؟ جھونپڑی کی جگہ بے شک اپنا محل بنا لینا۔ باقی زندگی عیش آرام سے گزارو گی۔ نوکر چاکر خدمت کریں گے۔" مچھیرن ہنسنے لگی۔

"اپنے پاس اتنی رقم کہاں ہے بیٹی۔ یہ تو بڑے پیسوں والوں کا کام ہے اور پھر میں اکیلی یہ سب کچھ کیسے کر سکتی ہوں؟" عائشہ شیرنی نے فوراً کہا۔

"میں پیسہ لگاؤں گی۔ میرے پاس پیسہ ہے۔"

مچھیرن کی آنکھیں ایک بار تو چمک اٹھیں کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ہیروئن کے ناجائز دھندے میں دولت ہی دولت ہوتی ہے اگر برائی کرنی ہی ہے تو پھر بڑے پیمانے پر ہی کی جائے۔ خطرہ تو ایک سو روپے کی ہیروئن میں بھی ہے اور ایک لاکھ کی ہیروئن میں بھی۔ شیرنی مچھیرن کو زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔

"تم اتنا پتا کرو کہ جو آدمی تمہیں تھوڑا سا مال دے کر جاتا ہے وہ یہ کہاں سے لاتا ہے۔" مچھیرن کہنے لگی۔

"مگر تم بھکشنی ہو۔ تم یہ کام کیسے کرو گی؟" شیرنی بولی۔

"عورت اگر چاہے تو کیا کچھ نہیں کر سکتی؟ اور پھر ہو سکتا ہے کہ اسی طرح مجھے میرا گمشدہ ماموں بھی کہیں سے مل جائے۔ میں کل آؤں گی اسی وقت۔ تم سارا پتہ کر رکھنا۔ اور ہاں اس کا ذکر کسی سے مت کرنا۔"

"میں پاگل تو نہیں ہوں۔" مچھیرن نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ شیرنی نے مچھیرن کو پچاس روپے دے کر کہا۔

"انہیں اپنے پاس رکھ لو۔ یہ میری طرف سے تمہارے واسطے ہیں۔" مچھیرن پچاس روپے لے کر بڑی خوش ہوئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ بھکشنی جو اپنا نام ساوتری بتاتی ہے مالدار عورت ہے اور ہیروئن کی اسمگلنگ سے اور دولت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے شیرنی

کے ہاتھ چوم لیے اور شکریہ ادا کرنے لگی۔

اگلے روز عائشہ شیرنی پھر شام کے وقت مچھیرن کی جھونپڑی میں پہنچ گئی۔ مچھیرن نے ساری معلومات لے رکھی تھیں کہنے لگی۔

"یہ آدمی جن لوگوں سے مال لاتا ہے ان کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ یہ لوگ ہیروئن کے علاوہ ہیرے جواہرات بھی باہر سے لاتے ہیں۔" شیرنی نے پوچھا۔

"یہ کون لوگ ہیں اور ان کا ڈیرہ کہاں پر ہے؟ میں یہ اس لیے پوچھ رہی ہوں تاکہ میں خود ان کی جانچ پڑتال کر سکوں۔ اس کے بعد ہم براہ راست ان سے بات کر کے اپنا حصہ ڈالیں گے۔ اور منافع آدھا آدھا کریں گے۔" مچھیرن کو اپنا بڑھاپا بڑا شاندار نظر آنے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسمگلر لوگ ایک ایک پھیرے میں کروڑوں روپے کما لیتے ہیں۔ کہنے لگی۔

"وہ آدمی بتا رہا تھا کہ ان لوگوں کے کئی ڈیرے ہیں۔ یہاں ان کا ڈیرہ کھناڑی کے جنگل میں ہے۔ یہاں سے چھ سات میل دور ہو گا۔"

"ڈیرے کو کون چلاتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ اس کا یہاں مالک کون ہے؟ کیونکہ ہم تو ڈیرے کے مالک ہی سے بات کریں گے نا؟" مچھیرن نے کہا۔

"وہ میں نے اس سے پوچھا تھا۔ مگر جو آدمی مجھے مال دیتا ہے اسے ڈیرے کے مالک کا نام معلوم نہیں۔ اتنا بتا رہا تھا کہ وہ دو آدمی ہیں۔ لنکا کے نہیں ہیں۔ اوپر انڈیا کے ہیں۔ پر بڑے سالوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔" شیرنی کی آنکھوں میں ایک بجلی سی چمک گئی۔ اس نے مچھیرن سے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم خود اس آدمی کے ساتھ جا کر معلوم کرو کہ یہ آدمی کون ہیں اور کس وقت ڈیرے پر ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے ہزاروں روپے لگانے ہیں۔ اپنی تسلی تو کر لینی چاہیے نا۔"

"کیوں نہیں۔ میں کل ہی ڈیرے پر جا کر سب کچھ معلوم کر لوں گی۔"

"مگر ایک بات کا دھیان رہے۔ وہاں کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم کسی مقصد کو دل میں لے کر آئی ہو۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں کوئی اناڑی نہیں ہوں۔" مچھیرن نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"میں کل خود کسی بہانے آدمی کے ساتھ وہاں جاؤں گی۔ اس آدمی کو بھی نہیں بتاؤں گی کہ میں ڈیرے کے آدمیوں کا پتا کرنے آئی ہوں۔"

شیرنی کو کافی تسلی ہو گئی کہ یہ عورت تجربہ کار ہے اور رازداری سے بھی کام لینا جانتی ہے۔ اس نے مزید پچاس روپے نکال کر اسے دیے۔ جسے مچھیرن نے بڑے خوش ہو کر شکریے کے ساتھ قبول کر لیے۔ شیرنی دوسرے روز آنے کا کہہ کر خانقاہ میں واپس آ گئی۔ خانقاہ میں کسی کو اس کے آنے جانے کا علم نہیں ہوا تھا۔

مچھیرن بڑی ہوشیار اور ذمے دار عورت نکلی۔ اگلے روز جب شیرنی اس کے پاس گئی تو مچھیرن نے وہ سب کچھ بتا دیا جس کی شیرنی کو ضرورت تھی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ اس ڈیرے کو شہاب اور فیروز ہی چلاتے ہیں اور وہ ایک دو دن سے زیادہ ڈیرے پر نہیں ٹھہرتے۔ مگر آج کل وہ اپنے کسی دشمن کی کھوج میں ہیں جس نے ان کے کچھ آدمی قتل کر دیے ہیں۔ اسی واسطے اکثر ڈیرے پر ہی ہوتے ہیں۔ شیرنی کے لیے یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ اسے معصوم عورتوں کی عزتوں کے سودے کرنے والے قاتلوں کا پتا چل گیا تھا۔ جنہوں نے شیرنی کو بھی اغوا کر کے بدمعاشوں کے پاس فروخت کر دیا تھا اور ان کے ہنستے بستے گھر کا سکون تہ و بالا کر دیا تھا۔ اس نے مچھیرن کو مزید کچھ رقم دی اور کہا۔

"اب تم میرا انتظار کرنا۔ میں کولمبو رقم لینے جاؤں گی۔ وہاں ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ سیدھی تیرے پاس آؤں گی۔ پھر ڈیرے پر چل کر ان لوگوں سے بات کریں گے۔" مچھیرن نے کہا۔

"اتنی دیر میں تو شاید وہ دونوں چلے جائیں۔" شیرنی نے ہنس کر کہا۔

"فکر نہ کرو۔ وہ کہیں نہیں جائیں گے۔" شیرنی واپس چل پڑی راستے میں سوچنے لگی کہ اسے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ بہت ممکن ہے کہ شہاب اور فیروز وہاں سے کہیں نکل جائیں۔ ان کے ٹھکانے کا سارا راستہ شیرنی نے معلوم کر لیا تھا۔ رات کو اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ یہی سوچتی رہی کہ کوئی پستول ریوالور وغیرہ کیسے اور کہاں سے حاصل کیا جائے؟ ایک دم اسے خیال آیا کہ جن تامل گوریلوں کو اس نے ہلاک کیا تھا ان کی اسٹین

گنیں اور گولیوں کے بلٹ اس نے خانقاہ کے پیچھے ایک درخت کے پاس زمین میں دبا دیے تھے۔ پہلے اس کا پروگرام اگلی رات کو وہاں سے نکلنے کا تھا۔ مگر جب اسلحہ ایک طرح سے مل گیا تو شیرنی نے اسی رات خانقاہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب یہ خانقاہ اس کے لیے بیکار تھے۔

کافی رات گزر گئی تھی جب اس کے دماغ میں دبائے ہوئے تامل گوریلوں کے اسلحہ کا خیال آیا تھا۔ چنانچہ شیرنی ایک منٹ ضائع کیے بغیر اٹھی اور کمرے سے باہر آگئی۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا خانقاہ کے دروازے پر ہی ایک کمزور سا بلب روشن تھا شیرنی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جس کمرے کا دروازہ وہ بند کر کے آئی تھی وہ ویسے ہی بند پڑا تھا۔ شیرنی خانقاہ کے پیچھے درخت کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اور ایک جگہ سے پتھر ہٹا کر ہاتھوں سے مٹی باہر نکالنی شروع کر دی اسلحہ بھی زیادہ گہرا نہیں دبا ہوا تھا۔ تھوڑی سی محنت کے بعد اس کا ہاتھ پہلے اسٹین گن سے ٹکرایا۔ اس نے گن باہر نکال کر چادر کے پلو سے صاف کی۔ پھر گولیوں کی بیلٹ بھی باہر کھینچ لی۔ اسے مزید اسلحہ کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے مٹی اور پتھر ڈال کر زمین کو پہلے کی طرح برابر کر دیا اور اٹھ کر درختوں کے نیچے آگئی۔ اس نے میگزین اور اسٹین گن کو دیکھا جس میں سے آدھی گولیاں چل چکی تھیں۔ شیرنی نے اس میں نیا میگزین بھر دیا۔ بیلٹ کے ساتھ چھ میگزین تھے۔ یہ بیلٹ اس نے اپنے زعفرانی لبادے کے نیچے کمر کے ساتھ باندھ لی۔ اسٹین گن کو بھی لبادے کے اندر ایک جگہ اڑس لیا اور مچھیرن کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑی۔ اس کے سر اور بھنوؤں کے بال اس لیے نہیں اگے تھے کہ یہ بال عبادت سے پہلے روزانہ صبح انہیں استرے سے صاف کرنے پڑتے تھے۔ اس اعتبار سے شہاب اور فیروز سے سامنا ہو جانے پر عائشہ کو اتنی جلدی پہچان نہیں سکتے تھے۔ مگر اب شیرنی اس بھکشوؤں والے زعفرانی لباس سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اسی لباس میں ڈیرے کے ارد گرد کسی نے اسے دیکھ بھی لیا تو کوئی اس پر شک نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس نے زعفرانی لباس سے نجات حاصل کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

شیرنی عائشہ کے سامنے چھ سات میل کا سفر تھا جو زیادہ تر ساحلی چٹانوں اور چھوٹے

چھوٹے جنگلوں پر مشتمل تھا۔ شیرنی ویسے ہی بے خوف قسم کی لڑکی تھی اور اسے رات کے اندھیرے میں اکیلی سفر کرتے ہوئے کبھی ڈر نہیں لگا تھا اور اب تو اس کے پاس اسٹین گن تھی۔ میگزین میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ اگر اسے کوئی خطرہ تھا تو صرف یہ کہ کہیں کسی طرف سے تامل گوریلوں کے آدمی اس پر اچانک حملہ نہ کر دیں۔ اس خیال کے پیش نظر اس نے اپنا سیدھا ہاتھ لبادے کے اندر ڈال کر اسٹین گن پر مضبوطی سے جمایا ہوا تھا۔ تاکہ اگر کوئی خطرہ آجائے تو وہ تیزی سے گن نکال کر حالات کا مقابلہ کر سکے۔ اور بروقت فائرنگ کر سکے۔ باہر سے تو عائشہ شیرنی نے بدھ مت کی بھکشنی کا لبادہ پہن رکھا تھا لیکن اندر سے وہ چنگیز خان تھی مظلوم عورتوں کی عزتوں کا سودا کرنے والے جرائم پیشہ لوگوں کے حق میں ایک خونخوار شیرنی بن چکی تھی۔ مچھیرن نے اسے ایک نشانی بتائی تھی۔ یہ نشانی ایک ٹاور کی بتی تھی جو شہاب اور فیروز کے اڈے کی طرف جاتے ہوئے کھاڑی کے کنارے چٹانوں پر رات کو جلا کرتی تھی۔

شیرنی کو وہ بتی نظر آگئی۔ وہ محتاط ہو گئی۔ ایک طرح سے وہ دشمن کے علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ لوگ رزق حلال کا کاروبار نہیں کرتے بلکہ انسان دشمن ساج ہیں اور اخلاق سوز کام کرتے ہیں جو ناجائز بھی ہے اور غیر قانونی بھی ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنے اڈے کے آس پاس رات کو ضرور پہرہ لگایا ہو گا۔

شیرنی مچھیرن کے بتائے ہوئے اشاروں کے مطابق آگے بڑھ رہی تھی۔ اگرچہ چاروں طرف رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر شیرنی کی آنکھیں ستاروں کی دھندلی روشنی میں بھی اپنا راستہ تلاش کر سکتی تھی۔ یہاں اس کے باپ شیر خان اور ماں روبی شیرنی کی دی ہوئی کمانڈو ٹریننگ کام آرہی تھی۔

وہ زمین پر بچھے ہوئے سوکھے پتوں اور درختوں کی گری پڑی شاخوں پر اس طرح جما کر قدم رکھتی اور پھر جما کر اٹھاتی کہ آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس کی چھٹی بلکہ ساتویں حس بھی بیدار تھی۔ اچانک اس نے فضا میں سگریٹ کے تمباکو کی بو سونگھی۔ وہ وہیں سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی اور اسٹین گن لبادے کے اندر سے نکال لی۔ دو تین بار فضا میں سونگھنے کے بعد اسے معلوم ہو گیا کہ یہ بو اس کی بائیں جانب ایک ٹیلے کے پیچھے سے آرہی

ہے۔ وہ دبے پاؤں اس ٹیلے کی طرف بڑھی۔ قریب جانے پر اسے دو آدمیوں کے ہلکا سا قہقہہ لگا کر باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے کان لگا دیئے۔ یہ دونوں وہاں کی زبان میں باتیں کر رہے تھے جو شیرنی کی سمجھ سے باہر تھی۔ اب وہ انتظار کرنے لگی کہ یہ لوگ یہاں سے ہٹیں تو وہ آگے بڑھے۔ کیونکہ مچھیرن کے مطابق وہ ہی ایک پگڈنڈی شہاب اور فیروز کے اڈے کو جاتی تھی۔ وہ ٹیلے کی ڈھلان پر جھاڑیوں کے پیچھے اسٹین گن لیے بیٹھی رہی۔

اچانک دونوں آدمی انگریزی میں باتیں کرنے لگے۔ شیرنی کے کان کھڑے ہو گئے۔ ان کی باتوں سے سوائے اس کے شیرنی کو اور کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اسمگلروں کے گروہ کے آدمی ہیں اور رات کے پہرے پر ہیں۔ پھر دونوں باتیں کرتے آئے اور شیرنی کے آگے سے ہوتے ہوئے گزر گئے اندھیرے میں شیرنی ان کے کاندھوں سے لٹکی ہوئی اسٹین گنیں ہی دیکھ سکی۔ جب دونوں گارڈ وہاں سے کافی دور نکل گئے تو شیرنی جھاڑیوں سے نکل کر پگڈنڈی پر چل پڑی۔ ایک جگہ سے پگڈنڈی سے ہٹ کر کیلے اور پپیتے کے درختوں کے نیچے ایک جیپ کا ڈھانچہ نظر آیا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ سامنے ایک روشنی ٹمٹما رہی تھی۔

شیرنی رک گئی۔ یہ لالٹین کی روشنی ہو سکتی تھی۔ کیونکہ بجلی ادھر نہیں تھی اور دیے کی روشنی اتنی تیزی سے نہیں ٹمٹماتی۔ وہ تھوڑا چکر کاٹ کر اس مقام پر آئی جہاں یہ لالٹین لکڑی کے ایک کیبن کے سامنے بانس کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ ایک ناٹے قد کا سنہالی کاندھے پر اسٹین گن لٹکائے کیبن کے آگے بیزاری سے ٹہل رہا تھا۔ کیبن کے اندر بھی روشنی ہو رہی تھی۔ اچانک اندر سے کسی مرد کی آواز آئی۔ اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا تھا۔ پہریدار سنہالی لپک کر کیبن کے اندر چلا گیا۔ اندر کوئی مرد غصے سے بولے جا رہا تھا۔

یہ آواز شیرنی کو بہت مانوس محسوس ہوئی اس آواز کو شیرنی نے اپنے گھر میں سنا تھا جب شہاب اور فیروز ان کے گھر آکر کئی روز رہے تھے۔ شیرنی نے ذہن پر زور دیا تو اسے یاد آگیا کہ یہ آواز شہاب کے ساتھی فیروز کی تھی۔ یہ جس کی بھی آواز تھی وہ شیرنی کا دشمن تھا اور شیرنی اس آواز کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دینا چاہتی تھی۔ جس کی یہ آواز تھی شیرنی اسے موت کی نیند سلانے کے لیے ہی یہاں تک آئی تھی۔ پہریدار کیبن سے باہر آگیا

اور ایک طرف گیا جدھر ایک دوسرا کیبن بنا ہوا تھا۔ شیرنی کو موقع مل گیا وہ درختوں کے پیچھے سے ہوتی ہوئی اسی کیبن کے پاس آگئی جس میں روشنی ہو رہی تھی اور جہاں سے اسے اپنے دشمن کی آواز آئی تھی۔ کیبن کی ایک کھڑکی ضرور تھی مگر وہ بند تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی آگے کو کھسکتی ہوئی دروازے کے پاس آگئی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ شیرنی نے جھانک کر دیکھا سب سے پہلے اسے اپنے دشمن فیروز کی شکل نظر آئی جو بانس کے صوفے پر لیٹا تھا۔ اس کے پاس ہی لکڑی کے فرش پر شراب کی بوتل اور گلاس پڑا تھا۔ ایک سنہالی اس کے پاؤں دبا رہا تھا۔ دوسرا سنہالی فیروز کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر سہلا رہا تھا۔ دونوں آدمیوں کے کاندھوں کے ساتھ اسٹین گنیں لٹک رہی تھیں۔ اچانک پیچھے سے کسی نے سنہالی زبان میں شیرنی کو آواز دی یہ پہریدار تھا ظاہر ہے اس نے یہی کہا ہو گا کہ کون ہے؟ یہ پہریدار ضرور فائر کر دیتا مگر لالٹین کی روشنی میں شیرنی کے بھکشوؤں والے زرد کپڑے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ شیرنی نے پلٹ کر دیکھا تو پہریدار کو اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹین گن نظر آگئی۔ اس نے شیرنی پر فائر کر دیا۔ شیرنی اس سے ایک سیکنڈ پہلے چھلانگ لگا کر ایک طرف ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے بھی گن کو لبے کے ساتھ لگا کر برسٹ مارا اور سنہالی پہریدار اچھل کر زمین پر گر پڑا۔

فائرنگ کی آواز سن کر فیروز اور دونوں سنہالی بھی کیبن سے فائرنگ کرتے باہر نکل آئے۔ شیرنی اوٹ میں تھی۔ اس نے فیروز کو نشانہ بنا کر ٹریگر دبا دیا۔ تڑاتڑ گولیاں گن کی نالی سے شرارے اڑاتی نکلیں اور فیروز لڑکھڑا گیا۔ شیرنی نے گن کا رخ اس کے ساتھیوں کی طرف کر دیا۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ مگر انہیں شیرنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اتنی دیر میں شیرنی کی گن سے نکلی ہوئی گولیوں نے دونوں سنہالیوں کو بھون کر رکھ دیا اور لالٹین کی روشنی میں سارا منظر اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ فیروز شدید زخمی ہونے کے بعد زمین پر پڑا رینگ رہا تھا۔ شیرنی ابھی تک گھات میں ہی تھی وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس اڈے پر اگر کوئی اور آدمی ہے تو وہ بھی باہر آ جائے۔ تینوں سنہالیوں کے جسم بے حس و حرکت پڑے تھے اس کا مطلب تھا کہ وہ یا تو مر چکے ہیں یا مرنے والے ہیں صرف فیروز کیبن کی طرف رینگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولیوں کے دھماکوں کے بعد جنگل میں ایک بار پھر رات

کا سناٹا چھا گیا تھا۔

شیرنی نے جب دیکھا کہ وہاں اور کوئی نہیں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید کہیں سے شہاب نکل آئے۔ مگر ایسا نہ ہوا تب شیرنی گھات سے نکل کر فیروز کے سر پر جا کر کھڑی ہوئی۔ اس نے پنجابی میں کہا۔

"مجھے پہچانا؟" اسٹین گن گولیوں کا پورا برسٹ فیروز کے پیٹ کو ادھیڑتا ہوا نکل گیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے پیٹ کو پکڑ رکھا تھا جہاں سے خون کا پرنالہ بہہ رہا تھا۔ فیروز نے لالٹین کی روشنی میں اپنے سامنے زرد لباس میں ملبوس ایک بدھ بھکشن کو دیکھا تو اس پر نزع کی حالت طاری تھی۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ عورت کون ہے اور کیا کہہ رہی ہے۔ اس کے کان میں سیٹیاں بج رہیں تھیں۔ شیرنی عائشہ فیروز کے سرہانے بیٹھ گئی اور اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کر پیچھے کو جھٹکا دیا اور بولی۔

"میں شیر خان کی بیٹی عائشہ ہوں۔ کیا اب بھی تم نے نہیں پہچانا؟ شہاب کہاں ہے؟"

فیروز کی ریڑھ کی ہڈی کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ منہ کھل گیا۔ یوں سانس لینے لگا جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ شیرنی نے کہا۔

"نہیں ابھی نہیں مرنا۔ ابھی نہیں مرنا۔" اس نے اسٹین گن کی نالی فیروز کے کھلے ہوئے منہ کے اندر ڈالی اور پورا برسٹ فائر کر دیا۔ جب اس نے نالی باہر نکالی تو اس سے خون ٹپک رہا تھا۔

پہلی بار جب فائرنگ کی آوازیں جنگل میں گونجیں تو ان دو سنہالی جو راستے میں شیرنی کو ملے تھے یہی سمجھا کہ یہ گھاٹ کی طرف سے آواز آئی تھی جہاں رات کو ساحلی گارڈ کے سپاہی اسمگلروں کو خبردار کرنے کے واسطے اکثر فائرنگ کرتے رہتے تھے مگر جب دوسری بار برسٹ فائر ہوا تو ان میں سے ایک بولا۔

"یہ آواز تو بڑے قریب سے آئی ہے۔" دوسرے نے سگریٹ پھینک دیا۔

"چلو چل کر دیکھتے ہیں۔ کہیں اڈے پر چھاپہ تو نہیں پڑ گیا۔"

شیرنی اتنی احمق نہیں تھی کہ فیروز کی لاش کے پاس بیٹھی رہتی۔ اسے اس بات کا

افسوس تھا کہ شہاب اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ وہاں پر نہیں تھا لیکن وہ اس کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ وہ وہاں سے لوٹ کر کیبن کے پیچھے لکڑی کی دیوار کے پاس بیٹھ گئی۔ اس خیال سے کہ فائرنگ کی آوازیں پیدا ہوتی رہی ہیں تو کوئی نہ کوئی ادھر ضرور آئے گا۔ اس کا خیال ان دو سنہالیوں کی طرف بھی گیا جنہیں شیرنی نے راستے میں دیکھا تھا۔ ابھی وہ ان کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ وہ دونوں وہاں آ گئے۔ زمین پر فیروز اور دوسرے آدمیوں کی لاشیں دیکھ کر وہ تو حواس باختہ ہو گئے۔ ایک نے اسٹین گن سے ہوائی فائر بھی کر دیا۔ دوسرا گھبرا کر کچھ بکتا اور ادھر ادھر اچھلنے لگا۔ شیرنی نے دونوں کو نشانے کی زد میں لے کر ٹریگر پر اپنی انگلی کا پورا دباؤ ڈالا اور گولیوں کی بوچھار اس کی گن سے نکلی اور دونوں اسمگلروں کے جسموں کو ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔ وہ گرے اور تڑپنے لگے۔ شیرنی دوڑ کر ان کے پاس آئی۔ دونوں کی اسٹین گنیں پاؤں کی ٹھوکر سے دور پھینکیں اور انگریزی میں پوچھا۔

"شہاب کہاں ہے؟" ایک کی تو بری حالت تھی۔ وہ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسرے میں کچھ جان باقی تھی۔ اس نے انگریزی میں پانی مانگا شیرنی اسے گھسیٹتی ہوئی کیبن کے دروازے کے پاس لے گئی کیبن کے اندر جا کر فیروز کی بوتل جو اسی طرح فرش پر رکھی ہوئی تھی اٹھائی اور اسمگلر کے منہ کے پاس لا کر بولی۔ "شہاب کہاں ہے؟" سنہالی اسمگلر کی انتڑیاں باہر نکل آئی تھیں۔ وہ ہاتھ ادھر ادھر مار رہا تھا۔

"پانی پانی۔" شیرنی نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

"پہلے بتاؤ شہاب کہاں ہے؟"

"جافنا...... جافنا......" اس کا سانس اکھڑنے لگا۔

شیرنی نے بوتل اس کے منہ میں انڈیل دی۔ شراب اس کے حلق سے نیچے اتر کر خون کے ساتھ مل کر انتڑیوں کے شگافوں سے باہر بہہ نکلی۔

شیرنی نے خالی بوتل ہوا میں ایک طرف اچھال دی اسمگلر کی لاش کو زور سے ٹھوکر ماری۔ لبادے کے اندر سے میگزین کی نئی اسٹک نکال کر اسٹین گن میں چڑھائی۔ ایک فاتحانہ نگاہ چاروں طرف ڈالی اور جنگل میں اس طرف چل پڑی جدھر سے وہ یہاں آئی تھی۔ واپس خانقاہ کے پیچھے آ کر اس نے اسٹین گن اور میگزین وہیں زمین میں دبا دیا اور

پچھلے دروازے سے ہو کر کوٹھری میں آکر چٹائی پر لیٹ گئی۔ اندھیرے میں ایک عورت نے پہلو بدل کر اس کی طرف منہ کیا اور سرگوشی میں پوچھا۔

کہاں گئی تھیں ساوتری؟" یہ جانکی تھی جس نے شیرنی کو کوٹھری میں دبے پاؤں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا وہ ہنس رہی تھی۔ "بڑے بھکشو نے تو نہیں بلایا تھا؟" شیرنی نے اپنا ہاتھ جانکی کے منہ پر رکھ کر اتنی زور سے دبایا کہ وہ بلبلا اٹھی۔

"پھر کبھی ایسی بات نہ کہنا۔" شیرنی نے غصیلی آواز میں جانکی کو متنبہ کرتے ہوئے کہا۔ جانکی ڈر گئی۔ وہ اس بھکشنی کو تامل گوریلوں کو گولیوں سے اڑاتا دیکھ چکی تھی اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے معاف کردو ساوتری۔ میں مذاق کر رہی تھی۔"

شیرنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور چٹائی پر منہ دوسری طرف کر کے لیٹ گئی۔ جس سنہالی سے شیرنی نے شہاب کے بارے میں پوچھا تھا اس نے جافنا شہر کا نام لیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ شہاب جافنا میں ہے۔ سنہالی نے آگے کچھ نہیں بتایا تھا اور مر گیا تھا۔ جافنا شہر میں ایک چھٹے ہوئے تجربہ کار اسمگلر بدمعاش کو تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ خاص طور پر جب کہ شیرنی یہاں کے لوگوں کی زبان نہیں بول سکتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شہاب اگلے روز جافنا سے واپس چل پڑے۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اگر حالات معمول کے مطابق رہتے ہیں تو وہ شہاب کو اس کے اڈے پر ہی ملے گی۔ اور وہ جہاں کہیں بھی ہو گا آئے گا اپنے اڈے پر ہی۔ اور شیرنی اس کے اڈے کے قریب ہی مقیم تھی۔ اسے انتظار کرنا چاہیے۔

دوسرا دن چڑھا تو شہاب صبح صبح ہی جافنا سے واپس آگیا۔ اڈے پر تباہی مچی ہوئی دیکھی تو ششدر ہو کر رہ گیا۔ فیروز کی لاش اوندھی پڑی تھی۔ وہاں لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ کوئی زندہ شخص نہ تھا جو اسے بتاتا کہ یہ سب کچھ کس نے کیا؟ کیسے ہو گیا؟ شہاب کے ساتھ اس کے دونوں باڈی گارڈ بھی تھے کہ ایک ہی آدمی پر اسے شک تھا اور وہ شیر خان تھا شیر خان وہاں پہنچ چکا تھا اور یہ کام سوائے شیر خان کے اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ شہاب نے اسی وقت ایک آدمی ارجنا کی طرف ٹرنکو مالی دوڑا دیا کہ وہ اسے جا کر فوراً لے آئے۔ ہندو

سنہالیوں کی لاشوں کو جلا دیا گیا۔ فیروز کی لاش کو شہاب نے خود غسل دے کر کفن پہنایا اور اشکبار آنکھوں سے قبر میں اتار دیا۔ فیروز کی موت کا اسے گہرا صدمہ ہوا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کا ایک بازو کاٹ دیا گیا ہے۔ دونوں کا اتنی مدت کا ساتھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں شیر خان کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جیسے بھی ہو وہ شیر خان کا کھوج لگائے اور اسے اپنے ہاتھوں گولیوں سے بھون ڈالے۔

لیکن دل کے کسی گوشے میں خوف کی ایک لہر بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ شیر خان کی پوری ہسٹری سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شیر خان ایک جی دار اور غیرت مند آدمی ہے اور یہ معاملہ اس کی بیٹی کے اغوا کا ہے اور وہ جوالا مکھی بن چکا ہے شہاب نے اسی دن اپنے باڈی گارڈز کی نفری میں مزید تین آدمیوں کا اضافہ کر دیا۔ دن کے ڈیڑھ بجے ارجنا آگیا۔ شہاب اسے لے کر نیچے خفیہ تہہ خانے میں آگیا اور سارا قصہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

"ارجنا! یہ سارے قتل شیر خان ہی نے کیے ہیں اور اب وہ میری تلاش میں ہے۔ لیکن میں نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔" ارجنا کہنے لگا۔

"مگر شہاب تمہیں شیر خان کی بیٹی کو اغوا کر کے بدمعاشوں کے پاس فروخت نہیں کرنا چاہیے تھا۔" شہاب آگ بگولا ہو کر بولا۔

"میں نے تمہیں یہاں نصیحتیں کرنے کے لیے نہیں بلایا۔ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا ہے۔" ارجنا چپ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ مجھے شہاب کے معاملات میں اتنا دخل نہیں دینا چاہیے۔ ارجنا کی تقریباً ساری آمدنی کا انحصار شہاب کی سپلائی پر تھا۔

"شہاب بھائی۔ میں نے محض اس خیال سے یہ بات کہہ دی تھی کہ اس طرح سے تمہیں خواہ مخواہ پریشان ہونا پڑ رہا ہے ویسے شیر خان کی اتنی جرات نہیں ہو سکتی کہ تم پر ہاتھ اٹھائے۔" شہاب نے چائے کا مگ ہاتھ سے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ میرے دو چار آدمیوں کو ساتھ لو اور اس سارے علاقے کا چپہ چپہ چھان مارو۔ اس وقت یہاں سوائے تمہارے اور میرے تیسرا کوئی آدمی نہیں۔ جس نے شیر خان کی شکل دیکھی ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ شیر خان تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہے۔ وہ تمہیں دیکھ کر سامنے آجائے گا۔ بس تمہارا صرف اتنا کام ہے کہ شیر

خان جہاں کہیں بھی ہو اسے وہیں رکھو اور مجھے آکر اطلاع کر دو۔ کیونکہ میں تم پر یہ بھروسہ نہیں کر سکتا کہ تم اسے قتل کر دو گے۔" ارجنا بولا۔

"شہاب بھائی۔ تمہاری خاطر تو میں جس کو کہو قتل کر سکتا ہوں۔" شہاب جانتا تھا کہ ارجنا ایسا نہ کر سکے گا۔ اس نے کہا۔

"نہیں تم صرف مجھے اس کی نشان دہی کر دینا باقی کام میں خود کر لوں گا۔ باڈی گارڈ تمہیں اس لیے دے رہا ہوں کہ غلط فہمی میں آکر کہیں شیر خان تم پر حملہ نہ کر دے۔"

"تو کیا میں بھاگ جاؤں گا دادا؟" ارجنا نے ہنس کر کہا۔ "تمہارا شاگرد ہوں سات خون تو کر چکا ہوں۔ تم میرے ساتھ اتنے آدمی کیوں کرتے ہو؟ صرف رنجھو ٹھیک رہے گا۔ یہ میرا پرانا ساتھی بھی ہے اور نشانے کا بھی بڑا پکا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" شہاب بولا۔ "جیسے تمہاری مرضی تم رنجھو کو ساتھ لے جاؤ۔ مگر تم پہلے کس طرف جاؤ گے؟" ارجنا سوچنے لگا۔ پھر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔

"شیر خان نے رات کو واردات کی ہے۔ میرے خیال میں وہ ٹاور کے پیچھے کھاڑی کے جنگل میں کہیں چھپا ہوا ہو گا۔ آخر یہ جگہ اس کے لیے نئی نہیں ہے۔ وہ تو اس جگہ جما پلا ہے۔ ان جنگلوں کی ایک ایک چٹان ایک ایک درخت سے وہ واقف ہے۔"

شہاب نے فکر مندی سے کہا۔

"اسی وجہ سے تو میں کہہ رہا ہوں کہ تمہیں زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہو گی۔ ممکن ہے وہ تمہارے ساتھ رنجھو سنہالی کو دیکھ کر شک کرے کہ تم اس کا سراغ لگانے آئے ہو۔" ارجنا سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے بولا۔

"دادا! مجھے اتنا بیوقوف تو مت سمجھو یار........"

ارجنا نے شہاب کے اڈے کو مرکز بنایا اور آس پاس کے علاقے میں شیر خان کی تلاش کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ رنجھو سنہالی اس کے ساتھ تھا۔ رنجھو کے پاس اسٹین گن تھی اور ارجنا نے بھرا ہوا ریوالور اپنی جیکٹ میں چھپا رکھا تھا اگرچہ وہ شیر خان کا بھی دوست رہ چکا تھا مگر شہاب کی وجہ سے ارجنا کا سارا کاروبار چل رہا تھا۔ شیر خان اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اور جرائم پیشہ زندگی خاص طور پر اسمگلنگ کے کاروبار میں دوستیاں نہیں چلتیں

روپے کا لین دین چلتا ہے۔ شہاب کی وجہ سے ارجنا کو ٹرنکو مالی میں بیٹھے بیٹھے ایک پھیرے میں لاکھوں روپے کا فائدہ ہو جاتا تھا۔ شیر خان کی دوستی تو اب ارجنا کو نقصان ہی پہنچا سکتی تھی۔ وہ دل میں یہ طے کر کے شیر خان کی تلاش میں نکلا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو گا اس کی اطلاع شہاب کو دے' دے گا اور خود ان کے درمیان سے ہٹ جائے گا۔ شیر خان جانے اور شہاب جانے۔

شہاب نے اپنی حفاظت کے پیش نظر اس اڈے میں آنا جانا ملتوی کر دیا اور کھاڑی کے کنارے ٹاور کی طرف ایک پرانے غار والے گودام میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ اس ٹھکانے کی خبر اس کے باڈی گارڈوں کے سوا اور کسی کو نہیں تھی۔ شہاب نے اپنی تمام کاروباری مصروفیات کو کچھ وقت کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔ وہ خود بھی اپنے حفاظتی دستے کے ساتھ شام کا اندھیرا پھیل جانے کے بعد شیر خان کی تلاش میں نکل جاتا تھا۔ دن کے وقت شہاب یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال کے مطابق شیر خان اس کی تلاش میں اتنے آدمیوں کو قتل کرتا چلا آرہا تھا چونکہ شیر خان اسی سارے علاقے کا بھیدی تھا اس لیے کسی بھی جگہ وہ موجود تھا اور کسی طرف سے اچانک شہاب پر قاتلانہ حملہ کر سکتا تھا۔ یہ بات تو شہاب کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ یہ قتل عام شیر خان نہیں بلکہ اس کی شیرنی بیٹی کر رہی ہے۔ اس کے گروہ میں سے جس جس نے شیرنی کو دیکھا تھا وہ اس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ پھر شہاب کو کون بتاتا کہ یہ کام ایک عورت کر رہی ہے۔

دوسری طرف شیر خان کے تینوں زخم بھرنا شروع ہو گئے تھے۔ سنیاسن اور اس کا باپ اس کی بڑی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ منگلی سنیاسن تو اپنا زیادہ وقت ٹیلے والی خفیہ غار میں شیر خان کے پاس ہی گزارتی تھی۔ صبح و شام خود ہی اس کے زخموں کی پٹی بدلتی اسے مچھلی کا شوربہ اور مختلف جڑی بوٹیوں کے عرق تیار کر کے پلاتی۔ شیر خان بڑی تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ سنیاسن منگلی نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کے دشمن اسے اپنی طرف سے قتل کر کے نالے میں پھینک گئے تھے۔

"مگر ہم تمہیں اٹھا کر اپنی جھونپڑی میں لے آئے۔" منگلی نے اس کے بعد کے واقعات بھی شیر خان کو بتا دیے تھے کہ کس طرح فیروز اور اس کے ساتھی یہاں اس کا کھوج لگانے آتے رہے ہیں۔ شیر خان چونکہ خود سنہالی اور تامل زبانیں بڑی روانی سے بول لیتا تھا اس لیے اسے منگلی اور اس کے باپ سے بات کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ شیر خان نے منگلی اور اس کے سنیاسی باوا سے اصلی بات پوشیدہ رکھی تھی۔ جس محبت اور جانفشانی سے سنیاسن اس کی تیمارداری کر رہی تھی اس سے شیر خان بڑا متاثر ہوا تھا۔ سنیاسن کے دل میں شیر خان کے بارے میں جو محبت بھرے جذبات تھے اس کا بھی شیر خان کو احساس ہو گیا تھا۔ مگر شیر خان یہاں محبت کی پینگیں بڑھانے نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی تلاش میں تھا اور اپنے دشمنوں سے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے آیا تھا۔ فیروز کا تو اس کا آمنا سامنا بھی ہو گیا تھا۔ اس نے فائر بھی کیا تھا۔ مگر فیروز کے محافظ نے پیچھے سے شیر خان پر حملہ کر کے اسے بے بس کر دیا تھا۔ اگر وہ اپنے آپ کو نیچے نالے میں نہ گراتا تو فیروز نے اسے ہلاک کر دیا ہوتا۔ کبھی شیر خان کو خیال آتا کہ وہ ان سنیاسی باپ بیٹی کو اصل حقیقت بتا دے کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہتا کہ اگر ان سے بات آگے نکل گئی تو دشمن یہاں پہنچ جائے گا اور شیر خان اس حالت میں نہیں تھا کہ اپنے دشمنوں کا پوری طرح مقابلہ کر سکتا۔ سنیاسن منگلی اور اس کے باپ کو شیر خان نے یہ فرضی کہانی بیان کر کے اعتماد میں لے لیا تھا کہ وہ اس کی فیروز اور شہاب اسمگلروں سے دشمنی ہے اور وہ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی شیر خان نے دونوں سے یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ شیر خان بڑی بے صبری اور بے چینی سے اپنے صحت یاب ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ اپنی بیٹی عائشہ کے بارے میں بھی پریشان تھا۔ کیونکہ ابھی تک اسے بچی کی موجودگی کا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔ ایک تشویش شیر خان کو یہ بھی تھی کہ فیروز نے اسے دیکھ لیا ہے اور اس نے شہاب کو بھی بتا دیا ہو گا کہ شیر خان آگیا ہے۔ دونوں نے اس کی لاش کو نالے میں ضرور تلاش کیا ہو گا۔ جب لاش نہیں ملی ہو گی تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ شیر خان زخمی حالت میں کسی طرف نکل گیا ہے۔ چنانچہ اس کے آدمی نیچے والی جھونپڑی

میں اس کی تلاش میں آئے بھی تھے جس کے متعلق سنیاسن نے شیر خان کو سارا قصہ بیان کر دیا تھا شیر خان اس سنیاسن عورت کی دلیری اور جرات پر بڑا حیران ہوا تھا۔ شیر خان اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ وہاں سے تھوڑے فاصلے پر بودھ خانقاہ میں اس کی بہادر اور غیرت مند بیٹی عائشہ شیرنی بھکشنی کے بھیس میں موجود ہے اور اس کے ایک دشمن فیروز کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہے۔

شیرنی بھی اپنی جگہ پر ایک اضطرابی کیفیت میں تھی۔ وہ ایک دشمن کو جہنم میں پہنچا چکی تھی۔ اب اسے دوسرے دشمن اور مجرم شہاب کی تلاش تھی۔ مگر وہ خانقاہ میں رہ کر اسے تلاش نہیں کر سکتی تھی۔ اس حقیقت سے بھی وہ بے خبر نہیں تھی کہ شہاب خود اپنے دست راست فیروز کے قاتل کی تلاش میں ہو گا اور اس کے جرائم پیشہ ساتھی شکاری کتوں کی طرح علاقے میں پھر رہے ہوں گے۔ شیرنی اسٹین گن تو اپنے پاس نہیں رکھ سکتی تھی مگر ایک چاقو وہ ہروقت اپنے پاس رکھنے لگی تھی۔ اس دوران شہاب کو شمالی بندرگاہ پورٹ پیڈرو جانا پڑ گیا۔ کیونکہ ہانگ کانگ سے مال آنے والا تھا۔ پیچھے اڈے پر ارجنا ہی تھا وہ بھی دن بھر اپنے خاص آدمی کے ساتھ شیر خان کی تلاش میں رہتا کہ اگر شیر خان کسی طرح ہتھے چڑھ جائے تو وہ اسے قتل کر کے شہاب کی خوشنودی اور مزید لاکھوں کا بزنس حاصل کر سکے۔ دولت کے لالچ نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور اس نے شیر خان کے ساتھ اپنی پرانی دوستی کو بھلا دیا تھا۔

جانکی بھکشنی جس کو ہیروئن کا نشہ لگ چکا تھا ایک روز ہیروئن کی پڑیا لینے معمول کے مطابق ایک روز خانقاہ سے نکل کر مچھیرن کے جھونپڑے میں گئی تو وہاں مچھیرن نہیں تھی۔ کچھ دیر وہاں انتظار کرنے بیٹھ گئی۔ پھر اس کا جسم ٹوٹنے لگا۔ نشے کے بغیر اس کی حالت بگڑنے لگی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ خود اڈے پر جا کر ہیروئن خرید لے؟ وہ یہ سوچ کر جھونپڑی سے باہر نکل رہی تھی کہ سامنے سے ارجنا چلا آ رہا تھا۔ اس کا محافظ سنہالی اس کے ہمراہ تھا۔ ارجنا نے جھونپڑی میں سے ایک زرد کپڑوں والی بھکشنی کو نکلتے دیکھا تو اسے شک پڑا کہ یہ عورت یہاں کیا کر رہی ہے۔ جانکی بھی اپنے سامنے دو آدمی دیکھ کر کچھ گھبرا گئی۔ ارجنا نے پوچھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" جانکی کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ اس کا جسم ہیروئن کا نشہ طلب کر رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود جانکی اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ کہنے لگی۔

"یہاں مچھیرن رہتی ہے۔ وہ بیمار تھی میں اس کی خبر معلوم کرنے آئی تھی۔" ارجنا کے ساتھ جو سنہالی تھا اس نے ارجنا کے کان میں کہا۔

"یہاں جو مچھیرن رہتی ہے وہ ہیروئن سپلائی کرتی ہے۔ یہ بھکشن بھی ہیروئن لینے آئی ہو گی۔" ارجنا ہنس پڑا۔ اس نے جیب سے پلاسٹک کا چھوٹا سا لفافہ نکال کر جانکی کو دکھایا اور بولا۔

"تم اس کی تلاش میں تو نہیں آئی ہو؟" اس میں تمہارا نشہ ہے۔

پلاسٹک کے لفافے میں سے جھانکتی سفید ہیروئن کے سفوف کو دیکھ کر جانکی کے صبر کا بندھ ٹوٹ گیا۔ ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ ارجنا نے ہاتھ پیچھے کر لیا اور بولا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے کسی زخمی آدمی کو تو یہاں نہیں دیکھا؟ وہ گورے رنگ کا ہے سنہالی نہیں ہے۔" جانکی نے کہا۔

"نہیں۔ میں نے تو ایسے کسی زخمی کو نہیں دیکھا۔" ارجنا نے سنہالی زبان میں جانکی کو گالی دی اور اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"تم بکواس کرتی ہو۔" اصل میں ارجنا نے یونہی اندھیرے میں تیر چلا دیا تھا۔ یہ ایک طرح سے فلوک ہی تھا۔ جو کام کر گیا۔ جانکی نے ہاتھ باندھ دیے اور بولی۔

"بھگوان کے لیے مجھے ہیروئن دے دو میں نے کسی گورے رنگ کے زخمی کو نہیں دیکھا۔" پھر ذرا ٹھٹک کر کہا۔

"ہماری خانقاہ میں ایک نئی بھکشنی آئی ہے۔ اس کا نام ساوتری ہے۔ اس کا رنگ بھی گورا ہے۔ وہ بھی سنہالی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اسے کسی گورے رنگ والے زخمی کا پتا ہو۔" ارجنا نے اپنے سنہالی ساتھی کی طرف دیکھا۔ پھر جانکی سے پوچھا۔

"وہ خانقاہ میں کب آئی تھی؟"

"کچھ روز ہی ہوئے ہیں۔ بڑی بہادر ہے تامل گوریلوں نے خانقاہ پر حملہ کر دیا تھا تو اس عورت نے فائرنگ کر کے انہیں ہلاک کر ڈالا تھا۔" جانکی اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے ارجنا

کو زیادہ سے زیادہ معلومات دینا اور اسے مطمئن کرنا چاہتی تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ کسی طرح اسے ہیروئن کا لفافہ مل جائے۔ "اب مجھے یہ لفافہ دے دو۔" ارجنا نے کہا۔

"صرف ایک شرط پر تمہیں یہ لفافہ ملے گا۔ بلکہ میں تمہیں دو اور لفافے بھی دے دوں گا۔"

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔" جانکی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

ارجنا کو شک ہو گیا تھا کہ جو بھکشنی سنہالی نہیں ہے اور اتنی بہادر ہے کہ تامل گوریلوں کو گولیوں سے بھون سکتی ہے وہ ضرور اسے بتا سکے گی کہ شیر خان کہاں ہے یا یہ کہ فیروز اور اس کے ساتھیوں کو کس نے ہلاک کیا تھا۔ یہ بھی ایک طرح سے ہوا میں تلوار چلانے کے مترادف تھا۔ مگر ارجنا کو امید تھی کہ کوئی نہ کوئی سراغ ضرور مل جائے گا۔ کیونکہ اس نے آج تک ایسی کوئی بھکشنی نہیں دیکھی تھی جو اسٹین گن کے برسٹ مار کر تامل گوریلوں کو خون میں نہلا دے۔ ارجنا کو یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے اسی بھکشنی کا تعلق اس گروہ سے ہو جس کے آدمیوں نے فیروز اور اس کے اڈے کے دوسرے لوگ قتل کیے ہیں اس نے جانکی سے کہا۔

"میں تمہیں اس وقت نشہ پورا کرنے کے لیے تھوڑی سی ہیروئن دوں گا۔ باقی لفافے اس وقت دوں گا جب تم اس گوری بھکشنی کو کسی طریقے سے اس جھونپڑی میں لاؤ گی۔"

ارجنا کے محافظ سنہالی نے جانکی کو اطلاعاً کہا۔

"اور یہ بات دھیان میں رکھنا کہ جو مچھیرن تمہیں پڑیا دیا کرتی تھی وہ بیمار ہو کر یہاں سے بہت دور اپنی بیٹی کے پاس جا چکی ہے اور تمہارا نشہ صرف ہم لوگ ہی تمہیں سپلائی کر سکتے ہیں۔"

جانکی کے لیے یہ بڑی آسان شرط تھی جب اس نے وہیں بیٹھ کر ہیروئن کے سفوف کے چند کش نتھنوں کے ذریعے اپنے بدن میں پہنچائے تو اس کی جان میں جان آ گئی۔ یہ نشہ اس کو صرف ایک گھنٹہ تک سکون میں رکھنے کے لیے کافی تھا۔ اس کے بعد پھر اسے نشے کی ضرورت پڑنے والی تھی اس نے ارجنا کو پورا اعتماد دلاتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی تھوڑی دیر میں بھکشنی ساوتری کو یہاں لے آتی ہوں۔ مگر ایک وعدہ کرو کہ تم لوگ اسے خراب نہیں کرو گے۔" ارجنا ہنس دیا کہنے لگا۔

"نہیں۔ ہم ایسا نہیں کریں گے وعدہ کرتے ہیں۔ جاؤ اور اسے لے کر آجاؤ تمہارا باقی نشہ تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔ یہ دیکھو ہیروئن کے چار لفافے میرے پاس موجود ہیں۔"

ارجنا نے جیکٹ کی جیب سے ہیروئن کے سفوف والے چار چھوٹے چھوٹے لفافے نکال کر جانکی کو دکھائے جانکی کی آنکھیں کھل گئیں۔ اتنی ہیروئن اسے ایک مہینے کے لیے کافی تھی۔ اور وہ بھی اسے مفت مل رہی تھی۔ جانکی فوراً خانقاہ میں واپس آگئی۔ راستے میں اس نے سارا منصوبہ سوچ لیا تھا۔ خانقاہ میں آتے ہی وہ شیرنی کو ایک طرف لے گئی اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ساوتری! مجھے اکیلی مچھیرن کی جھونپڑی میں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے اپنی دوا لانی ہے تم میرے ساتھ چلو۔" شیرنی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ جانکی سے ہمدردی بھی رکھتی تھی۔ اور پھر مچھیرن کی جھونپڑی قریب ہی تھی۔ جب وہ جھونپڑی میں پہنچیں تو شیرنی نے پوچھا۔

"تمہاری مچھیرن کہاں ہے جانکی؟"

جھونپڑی کے باہر لالٹین جل رہی تھی۔ یہ لالٹین ارجنا اور اس کے ساتھی نے جلا دی تھی تاکہ وہ گورے رنگ کی بھکشنی کو دیکھ سکے کہ وہ کون ہے۔ جانکی نے کہا۔

"پتا نہیں آج کہاں چلی گئی ہے یہ عورت۔ شام کو تو جھونپڑی میں ہی ہوتی ہے۔"

اتنے میں اچانک ارجنا اور اس کا سنہالی ساتھی اسلحہ تان کر ان کے سامنے آگئے۔

"خبردار! تم میں سے کوئی ذرا سی بھی ہلی تو ہماری گولیاں تمہیں بھون کر رکھ دیں گی۔"

ارجنا شیرنی کے قریب آگیا۔ جونہی روشنی میں قریب آکر شیرنی کے چہرے پر اس کی نظر پڑی تو وہ اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ یہ گوری لڑکی ہو بہو شیر خان کی محبوبہ روبی کی تصویر

تھی۔ ارجنا ان دنوں شیر خان اور روبی کے ساتھ ہی ہوا کرتا تھا جب وہ تمام اسمگلنگ گینگ کے ممبر تھے اور لنکا ہانگ کانگ کے سیٹھوں کے اشارے پر اسمگلنگ کیا کرتے تھے۔ شہاب اور فیروز بھی ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے شیر خان اور روبی کی ان دنوں بڑی دوستی تھی۔ بعد میں دونوں وہاں سے فرار ہو کر پاکستان چلے گئے تھے۔ شیرنی کی شکل میں اور شیر خان کی اس زمانے کی دوست اور بعد کی بیوی روبی کی شکل میں حیرت انگیز حد تک مشابہت تھی۔ ارجنا کو فوراً یاد آگیا شہاب نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اور فیروز شیر خان کی بیٹی کو پاکستان سے اغوا کر کے انڈیمان فروخت کر آئے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ شیر خان کی بیٹی ہی ہو اور انڈیمان سے بھاگ کر شہاب اور فیروز سے بدلہ لینے یہاں پہنچ گئی ہو۔ اگرچہ شیرنی کے بال غائب تھے مگر باقی سارا چہرہ روبی کا تھا۔ ارجنا کو روبی کی شکل بڑی اچھی طرح یاد تھی۔ ارجنا یہ بھی جانتا تھا کہ شیر خان بھی لنکا پہنچ چکا ہے۔ ارجنا کے ذہن میں تیزی سے ایک اسکیم آگئی۔ اگر شیر خان نہیں مل سکا تو وہ اس کی بیٹی کو پکڑوا کر شہاب کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔ بیٹی کے یرغمالی بن جانے سے شیر خان کو آسانی سے پکڑا جا سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں ایک سیکنڈ کے اندر اندر ارجنا کے دماغ میں لہرا گئی تھیں۔ اس نے اب خاص اداکاری شروع کر دی۔ اور انتہائی حیرت بھرے لہجے میں انگریزی میں پوچھا۔ کیونکہ جانکی نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ گوری لڑکی سنہالی نہیں ہے۔ ارجنا اپنے شک کی تصدیق بھی چاہتا تھا۔

"بیٹی تمہاری ماں کا نام روبی تو نہیں تھا؟"

جانکی بڑی حیران ہوئی کہ اس آدمی کو کیا ہو گیا ہے کہ ساوتری کو اچانک اپنی بیٹی بنا بیٹھا۔ ماں کا نام سنتے ہی شیرنی ایک دم سے چونک پڑی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں اور باپ نے اسی علاقے میں اپنی نوجوانی کا زمانہ گزارا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس آدمی نے یہ کیسے اندازہ لگالیا کہ میں روبی کی بیٹی ہوں؟ شیرنی نے آہستہ سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں میری ماں کا نام روبی تھا۔ مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اس کی بیٹی ہوں؟"

جب اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ لڑکی شیر خان کی ہی بیٹی ہے تو ارجنا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ مگر باہر سے وہ پورا سنجیدہ بنا رہا۔ اداکاری کرتے ہوئے اس نے فوراً

اسٹین گن نیچے کر دی۔ اور ہاتھ باندھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"بھگوان کا میں کس زبان سے شکر ادا کروں بیٹی کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ میرا نام ارجنا ہے۔ میں تمہارے باپ شیر خان کا پرانا دوست ہوں۔ تمہاری ماں جب تمہاری طرح کی لڑکی تھی تو ہم سب ایک ہی جگہ پر یہاں کام کیا کرتے تھے۔ تمہاری شکل تمہاری ماں روبی سے اتنی ملتی ہے کہ میں حیران رہ گیا ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے خیال آیا کہ تم ضرور روبی کی بیٹی ہو گی بھگوان کے لیے میرے ساتھ چلو بیٹی! تمہارا باپ اور میرا جگری دوست شیر خان تمہاری تلاش میں یہاں مارا مارا پھر رہا ہے۔" شیرنی عائشہ نے باپ کا نام سنا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"کیا ابو یہاں آئے ہوئے ہیں؟"

"ہاں بیٹی! وہ میرے ہی پاس ٹھہرے ہوئے ہیں جلدی سے میرے ساتھ چلو۔ شیر خان تمہیں دیکھ کر کتنا خوش ہو گا۔"

باپ کی محبت نے وقتی طور پر شیرنی پر غلبہ حاصل کر لیا اور وہ کچھ بھی نہ سوچ سکی۔

اوپر سے ارجنا نے ایک اور اثر یہ ڈالا اسے کہنے لگا۔

"بیٹی! کیا تمہارے ڈیڈی نے میرا کبھی ذکر نہیں کیا تھا میرا نام ارجنا ہے میں نے ہی تمہارے باپ اور تمہاری ماں کو یہاں سے بارڈر پار کرایا تھا۔" تب بدقسمتی سے شیرنی کو یاد آگیا کہ جب کبھی اس کے ابو لنکا کے زمانے کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ تو ارجنا نام کے ایک آدمی کا ذکر بھی کیا کرتے تھے کہ ارجنا اس کا بڑا اچھا دوست تھا۔ اور اس میں شک کی بات بھی نہیں تھی۔ ارجنا کو شیر خان نے ہمیشہ اپنا بہترین دوست سمجھا تھا۔ مگر ارجنا اس دوستی کا خون کر رہا تھا۔ شیرنی نے کہا۔ "ہاں ابو آپ کا ذکر کیا کرتے تھے۔"

ارجنا نے آگے بڑھ کر شیرنی کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا اور آنکھوں میں مصنوعی آنسو بھر کر بولا۔

"چلو بیٹی۔ اپنے باپ سے چل کر مل لو۔"

جانکی یہی سمجھی کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے بالکل صحیح ہو رہا ہے اور ساوتری واقعی کسی شیر خان کی بیٹی ہے جو اپنی بیٹی کی تلاش میں یہاں آیا ہوا ہے اور جو ارجنا کا دوست بھی ہے۔ وہ

بڑی خوشی ہوئی کہ اس بھکشنی کو اس کا بچھڑا ہوا باپ مل گیا۔ شیرنی ارجنا کے ساتھ آگے بڑھی تو ارجنا نے گردن گھما کر اشارے سے اپنے ساتھی سے کہا کہ وہ جانکی کو اس کی مطلوبہ شے دے' دے سنہالی محافظ کی جیب میں ہیروئن کا ایک پیکٹ پڑا ہوا تھا وہ اس نے جانکی کو دیا اور جلدی سے ارجنا اور شیرنی کے قریب آکر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ارجنا شیرنی کو اتنا موقع ہی نہیں دینا چاہتا تھا کہ اس کے ذہن میں کسی قسم کا شک پیدا ہو۔ چنانچہ وہ بولے جا رہا تھا۔

"بیٹی! تمہارا باپ شیر خان یہاں سیدھا میرے پاس ہی آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ شہاب اور فیروز دشمنی کی وجہ سے تمہیں اغوا کر کے لے آئے ہیں۔ میں خود ان دونوں کو مدت ہوئی چھوڑ چکا ہوں۔ تم کو بھی یہ سن کر خوشی ہو گی کہ ہمارے دشمن فیروز کو کل رات کسی نے قتل کر دیا ہے۔ شیر خان کو بھی یہ سن کر خوشی ہوئی تھی۔"

ارجنا بڑا چالاک شخص تھا اس نے اندازہ لگا لیا کہ یہ روبی کی بیٹی ہے۔ اور جانکی بتا چکی ہے کہ اس نے خانقاہ پر حملہ کرنے والے تمام کے تمام تامل گوریلوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ شہاب کے اڈے پر جو قتل عام کل رات ہوا ہے۔ وہ بھی اس روبی کی بیٹی کا ہی کارنامہ ہوا اور فیروز کو بھی اس نے ہلاک کیا ہو۔

اس پس منظر میں اگر وہ اسے شہاب کے ٹھکانے کی طرف سے گیا تو وہ فوراً پہچان لے گی کہ ارجنا اسے شہاب کے اڈے کی طرف لے آیا ہے اور وہ مقابلے پر اتر آئے گی اور بہت ممکن ہے کہ شیر خان کی دلیر بیٹی وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب بھی ہو جائے ارجنا یہ خطرہ مول لینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے وہیں سے پٹڑی بدل لی اور شہاب کے اڈے کا رخ کرنے کی بجائے دیوار اور تاڑ کے درختوں کی طرف ہو گیا جہاں وہ ٹارچ روشن کر کے آگے بڑھ رہا تھا۔ شیرنی نے پوچھا۔

"ڈیڈی خیریت سے ہیں نا انکل؟"

"ہاں بیٹی بالکل خیریت سے ہیں بس تمہاری وجہ سے پریشان ہیں۔ بے حد پریشان۔ لیکن اب تمہیں دیکھے گا تو بے حد خوش ہو جائے گا میرا دوست۔" اتنا کہہ کر مکار ارجنا بار بار بھگوان کا نام پکارنے لگا۔ "بھگوان! تمہارے کام بھی نیارے ہیں۔ کیسے باپ بیٹی کو ملوا دیا۔"

بھگوان تیری لیلا نیاری ہے۔" وغیرہ وغیرہ اس وجہ سے شیرنی کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی کوئی شک پیدا نہ ہوا کہ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا جا رہا ہے۔ شیرنی اپنے پیارے ڈیڈی سے ملنے کے لیے بے تاب تھی۔ اس نے دو ایک بار پوچھا بھی کہ ابھی کتنی دور جانا ہے انکل؟ اس کے جواب میں ارجنا یہی کہتا۔ بس بیٹی دو قدم کا فاصلہ رہ گیا ہے اس دوران ارجنا بڑی ہوشیاری سے شیرنی کو جنگل میں اس جگہ لے آیا جہاں انہوں نے اپنے تعاقب میں آنے والی پولیس کے واسطے زمین میں گہرا گڑھا کھود کر اوپر گھانس پھوس ڈال رکھا تھا۔ اس ٹریپ کے پاس آکر ارجنا رک گیا اور شیرنی سے جو ذرا پیچھے چلی آرہی تھی کہا۔ "آجاؤ بیٹی وہ سامنے والی جھونپڑی میں تمہارا ڈیڈی ہے۔" جونہی شیرنی ارجنا کے قریب آئی اس نے شیرنی کو گھاس پھوس کی چھت پر دھکا دے دیا شیرنی اس چھت کے ساتھ ہی پندرہ فٹ گہرے گڑھے میں گر گئی۔

شیرنی بانس کی تیلیوں اور گھاس پھوس والی نازک چھت کے ساتھ ہی پندرہ فٹ گہرے گڑھے میں گری تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا جسم سن ہو کر رہ گیا۔ اسے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گڑھے کے باہر سے اسے ارجنا کی آواز آرہی تھی۔ وہ سنہالی زبان میں اپنے ساتھی کو کچھ کہہ رہا تھا جو شیرنی کی سمجھ سے باہر تھا۔ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اس کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے اور یہ ارجنا اس کے ڈیڈی کا دوست نہیں بلکہ دشمن تھا اور اس نے صرف شیرنی کو قابو میں کرنے کے لیے یہ سارا کھیل رچایا تھا۔ کیا جانکی بھی ارجنا کے ساتھ مل گئی تھی؟ شیرنی کو یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ گڑھے میں بے کسی کی حالت میں پڑی تھی اس نے سب سے پہلے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ اس کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی بانس کے چھاپے اور گھاس پھوس نے اسے بچا لیا تھا۔ گڑھے کے اوپر سے دھم دھم کی آوازیں آنے لگیں۔

اندھیرے میں شیرنی نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔ چکور گڑھے کے اوپر دھندلی سی روشنی نظر آرہی تھی۔ وہاں اب درختوں کے گرے پڑے تنے اٹھا کر ڈالے جا رہے تھے۔ ارجنا اپنے گارڈ اور سنہالی ساتھی بندرا کو جلدی جلدی درختوں کے تنے اور کٹی ہوئی شاخیں لانے کو کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے گڑھے کے اوپر بھاری تنے اور درختوں کی

ٹہنیاں ڈال کر اسے بند کر دیا۔ صرف ایک طرف تھوڑا سا شگاف ہوا کے لیے رکھ دیا۔ گڑھے میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔ ارجنا نے بندرا سے کہا۔

"سن! یہاں ایک طرف بیٹھ کر پہرہ دینا۔ اگر اس عورت نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو بے شک اس کے بازو پر گولی مار کر تھوڑا زخمی کر دینا اور ہرگز ہرگز گڑھے سے باہر مت نکلنے دینا۔ ویسے وہ گڑھے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ میں اڈے پر جا رہا ہوں۔ خبردار یہاں سے ادھر ادھر مت جانا۔ اگر گڑھے میں لڑکی نے شور مچانے کی کوشش کی تو اوپر سے گڑھے میں اس طرح فائر کرنا کہ گولی عورت کو نہ لگے۔ ہوشیار رہنا اگر یہ بھاگ گئی تو تیری خیر نہیں ہے۔"

ارجنا یہ کہہ کر وہاں سے شہاب کے اڈے کی طرف چل دیا۔ شہاب پورٹ پیڈرو سے ابھی نہیں آیا تھا۔ اس نے اسی وقت ایک آدمی کو یہ پیغام دے کر شہاب کی طرف دوڑا دیا کہ بڑی مچھلی ہاتھ آئی ہے۔ فوراً پہنچو۔ کہیں مچھلی جال سے نکل نہ جائے۔ پورٹ پیڈرو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ آدمی اگر جیپ پر جائے تو ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آسکتا تھا۔ شہاب اسی وقت مال کی تھیلیاں زیر زمین گودام میں رکھوا رہا تھا۔ اسے ارجنا کا پیغام ملا تو یہی سمجھا کہ اس نے شیر خان کو قابو کر لیا ہے۔ یہ بڑی خوشخبری تھی یہ سوچ کر کہ ارجنا اناڑی ہے اور شیر خان بڑا دلیر اور تجربہ کار آدمی ہے۔ کہیں واقعی وہ اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائے شہاب اسی وقت واپس روانہ ہو گیا۔

itsurdu.blogspot.com

اڈے پر پہنچا تو دن کی ہلکی ہلکی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ ارجنا اسے آگے بڑھ کر ملا اور ایک طرف لے گیا۔

"کہاں ہے شیر خان؟" اس نے ارجنا سے پوچھا۔ ارجنا نے بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"دادا بھائی! شیر خان نہیں شیر خان کی بیٹی ہاتھ آگئی ہے۔" شہاب جیسے سناٹے میں آگیا۔ یہ عورت انڈیمان کے چھٹے ہوئے قاتل بدمعاشوں کے چنگل سے کیسے نکل بھاگی۔ اس کے دماغ میں یہی ایک سوال گونجنے لگا۔ اس نے پوچھا۔

"کہاں ہے وہ؟"

ارجنا نے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اسے گڑھے میں بند کر دیا ہے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ شیر خان کی بیٹی ہے؟" شہاب نے پوچھا۔ ارجنا نے کہا۔

"ایک تو اس کی شکل ہو بہو روبی سے ملتی تھی جس کو ہم جوانی میں دیکھتے آئے تھے اور جب میں نے اس سے پوچھا تو اس نے اعتراف کیا کہ وہ شیر خان کی بیٹی ہے اور اپنے باپ کی تلاش میں ہے۔" شہاب نے کہا۔

"مجھے چل کر دکھاؤ۔" اور وہ جنگل کی طرف چل پڑے۔ شہاب کے دل میں شیرنی کی طرف سے ایک خوف سا بھی پیدا ہو گیا تھا کہ جو عورت اتنی دلیری دکھا سکتی ہے کہ کانچو رام ایسے بدمعاشوں کے چنگل سے نکل بھاگے وہ اس کے لیے یہاں بھی مسائل پیدا کر سکتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ہی اسے خوشی بھی ہوئی تھی کیونکہ بیٹی کو یرغمال بنا کر شہاب اس کے باپ شیر خان کو آسانی سے اپنے ہاں بلا کر قتل کر سکتا تھا۔ عورت کا کیا ہے۔ شہاب نے

اپنے دل کو تسلی دی۔ عورت کتنی دلیر کیوں نہ ہو آخر عورت ہے وہ مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

شیرنی گڑھے کے اندر بند پڑی تھی۔ سنہالی بندرا باہر اسٹین گن لیے بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ شہاب اور ارجنا کو آتا دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ارجنا نے اشارہ کیا۔ بندرا جلدی گڑھے کے اوپر سے درختوں کے تنے ایک طرف ہٹانے لگا۔ گڑھے میں طلوع ہوتے سورج کی روشنی میں شہاب نے جھانک کر دیکھا۔ ارجنا نے اسے بتا دیا تھا کہ شیر خان کی بیٹی بودھ بھکشو عورتوں کے لباس میں ہے اور اس نے سر کے بال منڈوا رکھے ہیں مگر شہاب نے اس حلیئے میں بھی عائشہ کو پہچان لیا۔ یہ شیر خان کی بیٹی عائشہ ہی تھی۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ اس نے گڑھے میں جھانک کر عائشہ شیرنی سے کہا۔

"بیٹی عائشہ! مجھے معاف کر دو۔ میرے آدمیوں نے تجھے بڑی تکلیف پہنچائی ہے۔ میں تمہیں اپنی بیٹی ہی سمجھتا ہوں۔ مجھ سے اور فیروز سے جو غلطی ہو گئی تھی وہ محض غصے اور جذبات کے بھڑکنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ فیروز بے چارہ تو اگلی دنیا کو چلا گیا۔ وہ بھی بڑا پچھتاتا تھا۔ میں تم سے ایک بار پھر معافی مانگتا ہوں۔"

شہاب نے ارجنا کو یونہی ڈانٹ کر کہا۔

"تم سے یہ حرکت کرنے کو کس نے کہا تھا؟ اگر تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ میرے دوست شیر خان کی بیٹی ہے تو اسے میرے ڈیرے پر کیوں نہیں لائے۔ نکالو میری بچی کو۔"

اسی وقت گڑھے میں درختوں کے تین چار تنے اس طرح گرا دیئے گئے کہ ان کی ایک ڈھلان سی بن گئی۔ شہاب نے اوپر سے آواز دی۔

"عائشہ بیٹی! اوپر آجاؤ۔"

شیرنی جانتی تھی کہ پہلے شہاب کے ساتھ ارجنا نے اسے دھوکا دیا تھا اور اب شہاب خود اسے دھوکا دے رہا ہے۔ وہ شہاب کی باتوں پر کبھی بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔ جس نے اپنے پرانے دوست شیر خان کے اعتماد کا خون کیا تھا اور اس کی بیٹی کو اغوا کر کے بدمعاشوں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ وہ اس کا خیر خواہ کیسے ہو سکتا تھا لیکن شیرنی کے سامنے اب کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ وہ دشمنوں میں گھر چکی تھی اور اس وقت مصلحت اسی میں تھی کہ

خاموشی سے شہاب کی ہدایات پر عمل کرتی جائے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ مرنے سے پہلے کم از کم شہاب کو ضرور مار دے گی۔ اس بات کا شیرنی نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ گڑھے سے باہر آگئی۔ دن کی روشنی میں شہاب نے اسے دیکھ کر کہا۔

"عائشہ بیٹی! میں اپنے گناہ پر سخت شرمندہ ہوں۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم گناہ کی اس دلدل سے نکل کر آگئی ہو جس میں ہم تمہیں پھینک آئے تھے۔ کئی روز سے میرا ضمیر مجھے تڑپا رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ سلامت آگئیں۔ خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" ارجنا سمجھ گیا کہ استاد عیاری سے کام لے رہا ہے۔ شہاب عائشہ سے اردو میں بات کر رہا تھا۔ جسے ارجنا بڑی آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔

شیرنی نے بھی عیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"انکل! اگر آپ واقعی اپنے کیے پر نادم ہیں تو میں بھی آپ کو معاف کرتی ہوں لیکن میں نے سنا ہے کہ میرے ابو میری تلاش میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ مجھے میرے ابو کے پاس لے چلو۔" شہاب نے ایک نظر ارجنا کو دیکھا پھر بولا۔

"سنا تو میں نے بھی تھا کہ میرا دوست شیر خان لنکا آیا ہوا ہے مگر میری اس سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔ تم فکر نہ کرو میں چاروں طرف آدمی دوڑا دوں گا۔ شیر خان جہاں کہیں بھی ہو گا میں خود تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا اور اس کے قدموں میں گر کر اس سے معافی مانگوں گا۔ آؤ بیٹی میرے ساتھ آؤ۔"

شہاب شیرنی کو اپنے ڈیرے پر لے گیا۔ لکڑی کا ایک کیبن اس کے واسطے خالی کروا کر ضرورت کی ہر شے رکھوا دی۔ شیرنی کو ناشتہ پیش کیا خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔

"بیٹی جو ہو چکا اسے بھول جاؤ۔ ہم نے تمہارے ساتھ جو ظلم کیا اس کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میں شیر خان کے بھی پاؤں پڑ جاؤں گا۔ میں تو خوش قسمت ہوں کہ مجھے زندگی میں ہی تم سے اپنے گناہ بخشوانے کا موقع مل گیا۔ فیروز تو اس گناہ کی آگ میں جلتا ہوا ہی مر گیا۔"

پھر باتوں ہی باتوں میں شہاب نے شیرنی سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ جزائر

انڈیمان سے کس طرح بھاگی اور وہاں کانچو رام اور اس کے ساتھی بدمعاشوں کو کہیں اس نے قتل تو نہیں کر دیا؟ کیونکہ شہاب جانتا تھا کہ عائشہ کو اس کے باپ نے کمانڈوز کی زبردست ٹریننگ دے رکھی ہے اور پہلے شیر خان کے بنگلے پر وہ عائشہ کی بہادری اور کمانڈو ایکشن کے حیرت انگیز کارنامے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ شیرنی بھی پوری طرح ہوشیار تھی۔ اس کا ذہن بھی حالات کے عین مطابق کام کر رہا تھا۔ ایسا ممکن تھا کہ شہاب کو کالے پانی والے بدمعاش کانچو رام اور اس کے ساتھیوں کے قتل کا پتا چل چکا ہو مگر شیرنی ان کے قتل کو اپنے نام نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس نے بھی یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ وہاں کانچو رام اور ان کے ساتھیوں کی آپس میں لڑائی ہو گئی تھی جس میں کانچو رام بھی مارا گیا اور مجھے وہاں سے نکل بھاگنے کا موقع مل گیا۔

"بس پھر ایک نیک دل آدمی نے میری مدد کی مجھے بودھ خانقاہ میں داخل کروا دیا اور یوں میں یہاں پہنچ گئی۔ یہاں سے میں واپس پاکستان چلے جانا چاہتی تھی کہ مجھے یہ خبر ملی کہ میرے ابو یہاں میری تلاش میں آئے ہیں۔ بس پھر میں نے پاکستان جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ تب سے اپنے ابو کے لیے پریشان ہوں۔ ارجنا نے کہا کہ وہ مجھے میرے باپ کے پاس لے جائے گا میں اس کے ساتھ چل دی اور اس نے دھوکے سے مجھے گڑھے میں بند کر دیا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ارجنا نے ایسا کیوں کیا؟" شہاب نے ارجنا کو برا بھلا کہتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک متعصب ہندو ہے اس کی بات نہ کرو۔ اس نے یہی سوچا کہ تم وہاں سے فرار ہوئی ہو تو شاید اب مجھ سے اور فیروز سے بدلہ لینے کی کوشش کرو۔ بس اسی لیے ارجنا نے تمہیں قید کر لیا اور مجھے اطلاع کرنے چلا آیا۔ تم بے فکر ہو کر یہاں رہو۔ میں آج ہی سے شیر خان کی تلاش شروع کر دیتا ہوں۔ ایک عورت تمہاری خدمت کے لیے آجائے گی اور اب اپنے سر اور بھنوؤں کے بال مت اتارنا۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شیر خان تمہیں اس حالت میں دیکھ کر کیا کہے گا۔"

ایک بات شیرنی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ شہاب یہ سارا ڈراما کس مقصد کے لیے کر رہا ہے اس نے کافی غور کیا مگر وہ کسی واضح نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ ایک بات صاف تھی

کہ شہاب کی نیت صاف نہیں وہ اسے اپنے پاس رکھ کر کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے؟ یہ شیرنی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سوچ کے کسی کمزور لمحے میں اسے یہ بھی خیال آنے لگتا کہ انسان پھر انسان ہے ہو سکتا ہے شہاب کو اپنے گناہ کا احساس ہو گیا ہو اس کا ضمیر بیدار ہو کر اسے کچوکے لگا رہا ہو اور وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہو۔ جب شہاب کی شکل سامنے آتی تو شیرنی کا اس خیال پر سے یقین اٹھ جاتا۔ شیرنی کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ وہ یہاں بڑی چوکس ہو کر رہے۔ ہاں اپنے پیارے ڈیڈی کا اسے ضرور انتظار تھا۔ جانے کیوں اس کا دل کہتا کہ اس کا پیارا باپ لنکا میں موجود ہے اگر وہ لنکا میں موجود ہے تو ظاہر ہے بیٹی کی تلاش میں ہو گا اور وہ شہاب کے ٹھکانے پر ضرور آئے گا۔ یہ جگہ اس کے لیے کوئی نئی نہیں ہے۔ دوسری طرف شہاب نے شیرنی کے ساتھ اس قدر شفقت کا برتاؤ شروع کر دیا کہ کبھی کبھی تو شیرنی کو یقین ہونے لگتا کہ شہاب انکل واقعی بدل چکا ہے اور اپنے گناہوں پر نادم ہے۔ ایک سنہالی عورت اس نے شیرنی کی خدمت پر مامور کر رکھی تھی جو شیرنی کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ اس جگہ پر شہاب نے اسمگلنگ اور منشیات کی سرگرمیوں کو بھی ختم کروا دیا تھا۔ یہ سارا کام وہاں سے کچھ ہی دور دوسرے اڈے پر منتقل کر دیا گیا تھا۔

شیرنی کو بہت جلد یہ بھی احساس ہو گیا کہ کوئی اس کی نگرانی نہیں کر رہا۔ وہ پوری طرح آزاد ہے جنگل میں جس طرف چاہے آزادی سے آ جا سکتی ہے۔

مگر ایسی بات نہیں تھی یہاں شیرنی دھوکا کھا رہی تھی۔ کیونکہ دو آدمی دن کے وقت دو آدمی رات کے وقت شیرنی کی مسلسل نگرانی کرتے تھے۔ ان آدمیوں کو شہاب نے اس طرح سے روپوش رکھا ہوا تھا کہ شیرنی ایسی ہوش مند عورت بھی انہیں نہیں دیکھ سکی تھی۔ اس خیال سے کہ ارجنا کو دیکھ کر عائشہ کو دھوکے سے گڑھے میں قید کر دینا یاد نہ آئے۔ شہاب نے ارجنا کو شیرنی کے سامنے آنے سے منع کر دیا تھا شہاب خود دن میں دو تین مرتبہ عائشہ شیرنی کے پاس اس کا حال پوچھنے اور شیر خان کی تلاش کے سلسلے میں جھوٹی کارروائی بتانے آتا تھا۔ وہ ہر بار عائشہ کو تسلی دیتا کہ شیر خان کی تلاش زور شور سے جاری ہے خدا نے چاہا تو بہت جلد وہ تم سے آن ملے گا۔

شہاب اپنے طور پر سخت پریشان بھی تھا کیونکہ اسے ابھی تک شیر خان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور شیرنی کے بارے میں اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ تنگ آ کر خود باپ کی تلاش میں نہ نکل کھڑی ہو۔ وہ عائشہ کی عادت کو جانتا تھا جب کہ وہ عائشہ شیرنی کو کسی بھی حالت میں وہاں سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے عائشہ کو ایک طرح سے یرغمال بنا رکھا تھا۔ شہاب کو اس بات کا بھی یقین ہو چکا تھا کہ یہ عائشہ ہی تھی جس نے رات کے وقت حملہ کر کے فیروز اور اس کے ساتھیوں کو اڈے پر گولیوں سے اڑا دیا تھا کیونکہ وہ فیروز اور شہاب سے بدلہ لینے کے لیے ہی لنکا آئی تھی ورنہ انڈیمان سے فرار ہونے کے بعد وہ سیدھی پاکستان چلی جاتی باپ کے یہاں پہنچنے کی اطلاع تو عائشہ کو اب ملی تھی اور وہ بھی اس کے لیے ابھی تک ایک افواہ ہی تھی کیونکہ اسے ارجنا نے یہ نہیں بتایا تھا کہ شیر خان اس کے پاس ٹرنکومالی پہنچا تھا۔

شہاب نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ اس بار وہ ان باپ بیٹی سے ایسا انتقام لے گا کہ دنیا یاد رکھے گی مگر شیر خان کا جلدی سراغ لگانا بہت ضروری تھا کیونکہ صرف اس کے ملنے سے ہی شیر خان کو پنجرے میں پھنسایا جا سکتا تھا۔ اصل میں شہاب بھی شیر خان سے خوف زدہ تھا۔ یہ وہ جانتا تھا کہ شیر خان اتنی آسانی سے قتل نہیں ہو گا لیکن اگر اس کی بیٹی کو ڈھال بنا کر پیش کیا جائے تو پھر شیر خان کا قابو میں آ جانا یقینی بات تھی ورنہ دوسری صورت میں اس کی بیٹی کے ساتھ جھوٹ موٹ کا ڈرامہ کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ شہاب نے ارجنا کے ساتھ مل کر شیر خان کا سراغ لگانے کی مہم تیز تر کر دی۔ اس نے ٹرنکومالی اور پورٹ پیڈرو سے بھی کچھ آدمی بلوا کر اس کام پر لگا دیے۔ انہیں شیر خان کا حلیہ بتا دیا گیا اور سب کو تاکید کی گئی کہ اگر آسانی سے شیر خان کو گولی ماری جا سکے تو گولی مار دی جائے لیکن دوسری صورت میں خطرہ مول نہ لیا جائے اور اڈے پر آ کر صرف اطلاع کر دی جائے۔

بدھ مت خانقاہ میں صرف جانکی ایک ایسی عورت تھی جس کو عائشہ شیرنی کے بارے میں تشویش تھی۔ یہ راز جانکی پر بھی کھل گیا تھا کہ ساوتری مسلمان ہے اور اسے اپنے باپ کی تلاش ہے۔ تین چار روز گزر جانے پر بھی جب وہ خانقاہ میں واپس نہ آئی تو جانکی شہاب

کے اڈے کی طرف روانہ ہوئی کہ شیرنی کی خیریت معلوم کرے۔ سنہالی بندرا کو بھی شیرنی کی خفیہ نگرانی پر لگایا گیا تھا جو اڈے کے قریب ہی ایک جگہ چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے جانکی کو جاتے دیکھا تو اٹھ کر اس کے سامنے آگیا۔

"کیا بات ہے جانکی؟ تمہیں تو نشے کا پورا پیکٹ دیا تھا میں نے۔ پھر ادھر کیا لینے آئی ہو؟" جانکی نے عورتوں والا حربہ استعمال کرتے ہوئے بندرا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور کہا۔

"وہ میری سہیلی ہے۔ میں اس کے بغیر اداس ہو گئی ہوں مجھے اس سے ملا دو بندرا۔"
بندرا نے ادھر ادھر دیکھا اور کہا۔

"صرف ایک شرط پر۔" جانکی بولی۔

"مجھے منظور ہے۔ مگر پہلے میری ملاقات کراؤ۔" یہ بات بندرا بھی جانتا تھا کہ عائشہ پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی اور اسے یہاں سب سے بات چیت کرنے کی اجازت ہے۔ اس کی نگرانی صرف اس لیے کی جا رہی ہے کہ کہیں وہ وہاں سے فرار نہ ہو جائے۔ بندرا نے کیبن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کیبن کے اندر ہے مگر جلدی واپس آجانا۔"

دوپہر کا وقت تھا آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور ہوا چل رہی تھی۔ جانکی سیدھی کیبن کے اندر چلی گئی۔ شیرنی نے جانکی کو دیکھا تو خوش ہو کر بولی۔

"جانکی تم۔ اچھا کیا جو مجھ سے ملنے آگئیں۔" جانکی اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"ساوتری اب تو مجھے بھی معلوم ہو گیا ہے کہ تم ہندو نہیں ہو مسلمان ہو۔ کیا تم مجھے اپنا نام نہیں بتاؤ گی۔" عائشہ شیرنی نے اسے اپنا اصلی نام بتایا۔ جانکی نے شیرنی کے باپ کے بارے میں پوچھا۔ شیرنی نے سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر ڈیڈی یہاں ہیں تو پھر ان لوگوں کو ان کا سراغ کیوں نہیں مل رہا۔" جانکی نے آہستہ سے کہا۔

"عائشہ! مجھے تو دال میں کچھ کالا کالا نظر آتا ہے۔" شیرنی ذرا سا مسکرائی۔ اس نے جانکی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"پھر یہ لوگ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔" جانکی نے کہا۔

"تم بڑی نڈر ہو۔ تمہیں اپنے اوپر بڑا بھروسہ ہے مگر عائشہ میں تمہیں مصیبت میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"کونسی مصیبت؟" عائشہ نے پوچھا۔ جانکی نے کہا۔

"تم بہت بڑے بدمعاشوں کے پھندے میں گھری ہوئی ہو۔ تمہاری نگرانی بھی ہو رہی ہے۔"

"یہ تمہیں کس نے کہا؟" شیرنی نے جانکی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جانکی نے بندرا کے بارے میں بتا دیا کہ وہ درختوں میں چھپا اس کی نگرانی کی ڈیوٹی پر ہے۔ شیرنی سوچ میں پڑ گئی۔ جانکی نے رازداری کے ساتھ کہا "تم فکر نہ کرو ابھی مجھے بندرا کے پاس جانا ہے وہ بھی نشہ کرتا ہے میں اس سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ یہ سارا چکر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے ضرور پتا ہو گا۔ میں کل پھر تمہارے پاس آؤں گی۔"

جانکی شیرنی سے مل کر واپس چلی گئی۔ راستے میں بندرا اس کا انتظار کر رہا تھا وہ اسے ایک طرف لے گیا۔ دونوں نے مل کر ہیروئن پی اور پھر باتیں کرنے لگ گئے۔ جانکی نے بندرا سے پوچھا۔ "یہ عورت یہاں کس واسطے لائی گئی ہے۔" بندرا نے کہا۔

"جانکی! مجھے صرف اتنی ہی معلومات ہے کہ شہاب دادا اور ارجنا اس عورت کے باپ کی تلاش میں ہیں۔ پہلے ارجنا نے اسے گڑھے میں ضرور پھانس لیا تھا مگر پھر شہاب کے آنے پر سارا ڈرامہ بدل گیا۔ اب شہاب دادا اس لڑکی کو بیٹی کہتا ہے اور ارجنا بھی اس کے ساتھ اخلاق سے پیش آتا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے ہمیں سختی سے ہدایت کی گئی ہے کہ ہم اس عورت کی نگرانی کرتے رہیں اور یہ علاقے کی حدود پار کرنے کی کوشش کرے تو اسے فوراً پکڑ لیا جائے۔ گولی بالکل نہ ماری جائے۔" جانکی نے بندرا کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بندرا تمہارا کیا خیال ہے یہ سارا چکر کیا ہے؟"

بندرا کو ہیروئن کا بھرپور نشہ ہو گیا تھا اور وہ باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جانکی پیچھے ہٹ گئی۔ بندرا سے اصل بات اگلوانے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں

مل سکتا تھا۔ بندرا کو نشہ چڑھ گیا تھا جانکی کو اپنی سہیلی اور دوست شیرنی سے محبت تھی اور وہ اس کے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہتی تھی۔ اس نے تھوڑا سا ہاتھ کھینچا تو بندرا نے کچھ نشے کی کیفیت اور زیادہ ہوس کے طوفان میں بہہ کر سارا راز اگل دیا۔ ساتھ ہی جانکی کو تاکید بھی کرتا گیا کہ وہ اس کا ذکر کسی کے آگے نہ کرے۔ جانکی اسے تسلی دیتی ہوئی بولی۔

"میں کوئی پاگل ہوں کیا؟ میں تو یونہی تمہاری محبت کو آزمانے کے لیے پوچھ رہی تھی ورنہ مجھے اس بھکشنی سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

بندرا تو بعد میں وہیں جھاڑیوں میں بے سدھ ہو کر پڑ گیا۔ اس نے ہیروئن کا زیادہ نشہ کر لیا تھا' جانکی نے ساڑھی درست کی اور اسی وقت سیدھی عائشہ کے پاس آگئی۔

"جانکی! تم ابھی گئی نہیں تھیں؟" جانکی نے ماحول کا جائزہ لیا۔ سنہالی خادمہ صحن میں مسالہ پیس رہی تھی۔ کیبن خالی تھا۔ جانکی عائشہ کو کیبن کے اندر لے گئی اور کہنے لگی۔

"تمہیں شہاب نے جال میں پھنسایا ہوا ہے عائشہ۔"

شیرنی خاموش نگاہوں سے جانکی کا منہ تکنے لگی۔ جانکی بولی: "میں ٹھیک کہہ رہی ہوں میری دوست! بندرا نے نشے کی حالت میں مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمہارا باپ لنکا میں ضرور آیا ہوا ہے مگر شہاب تمہیں دھوکے سے یہاں لے آیا ہے تاکہ تمہیں یرغمال بنا کر تمہارے باپ کو بے بسی کی حالت میں پکڑ لیا جائے اور پھر اس کے سامنے تمہیں اذیتیں دی جائیں۔ شہاب کا پروگرام پہلے تمہیں اذیتیں دے دے کر تمہارے باپ کے سامنے ہلاک کرنے کا ہے۔ پھر تمہارے باپ کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہ اصل کہانی ہے جو میں تمہیں بتانے اس وقت آگئی ہوں۔ اس کا ثبوت ایک یہ بھی ہے کہ تمہاری چاروں طرف سے نگرانی ہو رہی ہے۔"

شیرنی بڑے غور سے جانکی کے بیان کو سنتی رہی۔ جب جانکی نے بات ختم کر لی تو شیرنی نے پوچھا۔

"کیا تمہیں ارجنا نے یہ نہیں بتایا کہ میرے ڈیڈی لنکا میں کہاں ہیں؟"

"یہ بات ان لوگوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں یہ سارے کے سارے تمہارے باپ کو بڑے زور و شور سے تلاش کر رہے ہیں۔ تمہیں ملوانے کے لیے نہیں بلکہ تمہارے

باپ کو بلیک میل کرنے کے لیے۔" شیرنی اٹھ کر لکڑی کے فرش پر ٹہلنے لگی۔

"مجھے پہلے ہی شہاب کی نیت پر شک تھا۔" پھر شیرنی نے جانکی کو اپنے قریب بٹھا لیا۔ اس کو رازداری سے کہا۔

"جانکی! جب تک ان لوگوں کو میرے ڈیڈی کا کوئی سراغ نہیں ملتا مجھے یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اصل حالات کا مجھے علم ہو گیا ہے۔ اب میں کھلی آنکھ سے سب کچھ دیکھوں گی۔ تم بندرا سے رابطہ رکھنا اور جونہی میرے باپ کا کوئی کھوج ملے مجھے اسی وقت اطلاع کر دینا۔" جانکی شیرنی کو اطمینان دلا کر واپس چلی گئی۔

شیرنی اب کسی دوسرے انداز میں حالات کو دیکھ رہی تھی۔ اسے صرف ایک ہی خوشی تھی کہ اس کا پیارا باپ اسی علاقے میں کہیں موجود تھا۔ شہاب کی ایک ایک حرکت کا اب وہ بڑے غور سے جائزہ لیتی اور اسی کی روشنی میں آگے کوئی عمل کرتی۔

دوسری طرف شیر خان کے زخم کافی بہتر ہو گئے تھے اور اب وہ اپنے آپ کو پہلے سے صحت مند محسوس کرنے لگا تھا۔ مگر سنیاسن نے اسے غار سے باہر نکلنے سے منع کر دیا تھا۔ شیر خان کو یہ پابندی ہرگز قبول نہیں تھی۔ جب اس نے احتجاج کیا تو سنیاسن نے بڑے محبت بھرے انداز میں کہا۔

"تمہاری ابھی پٹی نہیں کھلی۔ جس روز مرہم پٹی ختم ہو گئی۔ بے شک باہر کی سیر کرنے نکل جایا کرنا۔" شیر خان نے کہا۔

"مگر میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں منگی اب مجھے ذرا سا بھی درد محسوس نہیں ہوتا۔"

مگر منگی سنیاسن تو محض اپنی محبت کی وجہ سے شیر خان کو وہاں روکے رکھنا چاہتی تھی اسے معلوم تھا کہ شیر خان باہر نکلا تو پھر اس کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ کہنے لگی۔

"تمہارا علاج ہم نے کیا ہے ہمیں زیادہ معلوم ہے کہ تم کب صحت مند ہو گے۔ ابھی تمہارے زخموں کو ہوا نہیں لگنی چاہیے۔ کیا تم تھوڑے دن بھی صبر نہیں کر سکتے۔" شیر خان چپ ہو گیا۔

اب ایسا ہوتا تھا کہ رات کو سنیاسی اور اس کی بیٹی سنیاسن منگی' شیر خان کو غار میں اکیلا چھوڑ کر اپنی جھونپڑی میں آجاتے تھے۔ پھر صبح صبح سنیاسن شیر خان کے لیے ناریل کا پانی اور

جنگلی کیلے اور تھوڑے سے ابلے ہوئے چاول لے کر غار میں پہنچ جاتی۔ جس رات شیر خان اور منگلی کی گفتگو ہوئی اسی رات کا ذکر ہے کہ سنیاسن منگلی اور اس کا باپ حسب معمول شیر خان کو غار میں چھوڑ کر چلے گئے۔ سنیاسن منگلی نے یہ حماقت کی کہ جانے سے پہلے شیر خان کو ایک خواب آور مشروب پلا دیا تاکہ وہ رات بھر گہری نیند سویا رہے اور اسے چھوڑ کر نہ جائے کیونکہ اب شیر خان پہلے سے بہت بہتر تھا اور منگلی کو خطرہ تھا کہ وہ کسی بھی رات کو اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے وہاں سے چل دے گا۔ ان کے جانے کے بعد شیر خان پر کچھ زیادہ ہی غنودگی طاری ہونے لگی اس سے پہلے کہ شیر خان سوچتا کہ آج ایسا کیوں ہو رہا ہے وہ گہری نیند میں کھو چکا تھا۔

اتفاق سے عین اسی وقت ٹیلے کے قریب سے شہاب کے آدمی کا گزر ہوا۔ چاندنی رات تھی۔ چاروں طرف چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہ ٹیلے کے اوپر گئی تو اسے وہاں غار کا منہ دکھائی دیا۔ اس خیال سے کہ شاید وہاں کوئی چھپا ہوا ہو وہ اسٹین گن ہاتھ میں تھامے ٹیلے کی تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر غار میں آ گیا۔ غار کے اندر اندھیرا تھا اور ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے ٹارچ روشن کر دی تو دیکھا کہ آدمی چٹائی پر گہری نیند سو رہا ہے۔ سنہالی نے جھک کر دیکھا تو اس شخص کا رنگ گورا چہرہ چوڑا اور بالوں میں ہلکی ہلکی سفیدی تھی۔ یہ شخص لنکا کا باشندہ نہیں لگ رہا تھا۔

وہ آدمی وہیں سے اپنے اڈے کی طرف دوڑ پڑا۔ شہاب ارجنا کے ساتھ بیٹھا شیر خان کے بارے میں باتیں کر رہا تھا کہ وہ آدمی ہانپتا ہوا داخل ہوا اور اس نے بتایا کہ ایک آدمی غار میں سو رہا ہے جس کا رنگ گورا ہے وہ یہاں کا باشندہ نہیں لگتا۔ ارجنا اور شہاب نے اس وقت اسٹین گنیں اٹھائیں اور سنہالی کے ساتھ ٹیلے کی طرف دوڑ پڑے۔

سب سے پہلے شہاب دبے پاؤں غار میں داخل ہوا خراٹوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی اس نے ٹارچ روشن کر دی اور اسٹین گن تان لی۔ اس کے سامنے اس کا دشمن اس کا شکار اس کا پرانا ساتھی شیر خان چٹائی پر بے خبر سو رہا تھا۔ ارجنا بھی اسٹین گن تانے اندر آ گیا۔ شہاب نے اشارہ کیا۔ ارجنا نے لپک کر شیر خان کی گردن کو دبوچ لیا۔ جب اس پر بھی شیر خان نے کوئی مزاحمت نہ کی تو شہاب بڑا حیران ہوا ارجنا نے آہستہ سے کہا۔

"دادا بھائی! لگتا ہے اسے کوئی چیز پلا دی گئی ہے۔ اس کے زخموں پر پٹی بندھی ہے۔ یہاں اس کا علاج ہوتا رہا ہے۔"

شہاب نے اسٹین گن زمین پر رکھ دی۔ انہوں نے اس وقت شیر خان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے پھر ارجنا اور دوسرے سنہالی نے شیر خان کو اٹھایا اور اڈے کی طرف لے کر چل پڑے۔ یہ شہاب کا دوسرا اڈہ تھا۔ پہلے اڈے کو اس نے عائشہ شیرنی کے لیے خالی کرا دیا تھا۔ اس دوسرے اڈے کے نیچے بھی ایک تہہ خانہ تھا۔

انہوں نے شیر خان کو تہہ خانے میں لا کر ڈال دیا۔ شیر خان کو سنیاسن منگلی نے خواب آور مشروب اندازے سے کچھ زیادہ ہی پلا دیا تھا۔ اسے بالکل ہوش نہیں تھا۔

شہاب اور ارجنا بے حد خوش تھے۔ انہوں نے بے ہوشی کی حالت میں شیر کو پنجرے میں بند کر دیا تھا ارجنا نے مشورہ دیا کہ ہمیں شیر خان کو سوتے میں ہی ہلاک کر دینا چاہیے۔ شہاب کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"نہیں ارجنا ابھی اس کی موت کا وقت نہیں آیا۔ ہمیں تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔"

وہ شیر خان کو اسی حالت میں سوتا چھوڑ کر تہہ خانے سے باہر آ گئے۔ ساری رات شیر خان پر گہری نیند طاری رہی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک اجنبی جگہ پڑا پایا۔ یہ ایک تہہ خانہ تھا جہاں دیوار کے ساتھ چھوٹا مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ شیر خان جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

شہاب نے اس کے ہاتھ پاؤں رات کو ہی کھول دیے تھے۔ فوراً سمجھ گیا کہ اسے نیند کی حالت میں اٹھا کر یہاں لایا گیا ہے۔ لکڑی کا ایک تنگ سا زینہ اوپر چھت کی طرف جاتا تھا جہاں لوہے کا دروازہ فرش کے برابر بند حالت میں تھا یہ کام شہاب کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا گویا وہ اپنے دشمن کی قید میں تھا۔ مگر شہاب نے اسے ہلاک کیوں نہیں کیا۔ وہ بڑی آسانی سے ایسا کر سکتا تھا۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فرش کا آہنی تختہ اوپر کو اٹھا اور شہاب اسٹین گن پکڑے زینہ اتر کر شیر خان کے سامنے آگیا۔ ارجنا اسٹین گن تانے اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ دونوں دوستوں' دونوں دشمنوں کی نگاہیں ملیں تو ایک پل کے لیے دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر شیر خان نے کہا۔

"شہاب! مجھے صرف اتنا بتا دو کہ میری بیٹی کہاں ہے؟" شہاب اسی طرح گن ہاتھ میں تھامے کھڑا رہا۔

"میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں کہ تمہاری بیٹی عائشہ ہمارے پاس ہی ہے۔" شیر خان نے کہا۔

"شہابو۔ تم دونوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ تم مجھے اور میری بیٹی کو یہاں سے نکل جانے دو۔ میں تم سے کوئی بدلہ نہیں لوں گا۔ میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ مجھے صرف اپنی بیٹی چاہیے اور کچھ نہیں۔"

شہاب آخری زینے پر بیٹھ گیا۔ ارجنا اس کے پیچھے تھا اور اس کی گن کا رخ شیر خان کی طرف اور انگلی اسٹین گن کے ٹریگر پر تھی۔ ایک سیکنڈ کے اشارے پر اس کی گن شعلے اگل سکتی تھی۔ شہاب نے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔

"تمہاری بیٹی نے میرے ساتھی فیروز کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس نے میرے کئی دوسرے ساتھی بھی ہلاک کر ڈالے ہیں۔ پھر بھی میں نے اسے اپنے ہاں بڑی عزت سے رکھا ہوا ہے۔ مگر تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تم سے اور تمہاری بیٹی سے اپنے دوست فیروز اور اپنے آدمیوں کے قتل کا بدلہ نہیں لوں گا؟" شیر خان نے بھی تلخی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"میری بیٹی نے اگر ان لوگوں کو قتل کیا ہے تو اپنی جان اور عزت کی حفاظت کی خاطر قتل کیا ہو گا اور یہ ہر عورت کا حق ہے۔" شہاب غصے میں آگیا اس نے گن کی نالی چھت کی طرف کر کے پورا برسٹ فائر کر دیا اور بولا۔

"عزت۔ عزت۔ عزت۔ تم جس عزت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو میں تمہاری آنکھوں کے سامنے اس کے پرزے اڑاؤں گا اور تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ یہ میرا انتقام ہو گا۔" شیر خان کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس نے گرج دار آواز میں کہا۔

"شہاب! تم اتنے ذلیل ہو جاؤ گے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"خاموش!" شہاب نے چلا کر کہا اور ارجنا کو ساتھ لے کر تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ لوہے کا تختہ گرا کر تہہ خانے کا راستہ بند کر دیا گیا باہر سے ارجنا نے تالا لگا دیا ارجنا نے پوچھا۔

"دادا بھائی! تم کیا کہہ رہے تھے اس نے کیا کہا؟"

شہاب اور شیر خان کیونکہ پنجابی زبان میں باتیں کرتے رہے تھے جو ارجنا نہیں سمجھ سکا تھا۔ شہاب ناگ کی طرح پھنکارتا اپنے کیبن کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"ارجنا! عائشہ کی نگرانی سخت کر دو اسے ہرگز یہ نہیں پتا چلنا چاہیے کہ اس کا باپ یہاں موجود ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا دادا بھائی۔" ارجنا نے فوراً جواب دیا۔

شیر خان زخمی شیر کی طرح تہہ خانے میں بے چین اور بے قرار تھا۔ اب جب کہ خود شہاب نے عائشہ بیٹی کے وہاں موجود ہونے کی تصدیق کر دی تھی تو شیر خان اپنی بیٹی کے تحفظ کے لیے بجلی بن کر اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر انسان کتنا ہی بہادر' دلیر اور جان پر گزر جانے والا کیوں نہ ہو۔ آخر وہ انسان ہوتا ہے اور کوئی انسان خالی ہاتھوں سے لوہے کی چادر کو نہیں کاٹ سکتا۔ زینے کے اوپر لوہے کی بھاری چادر کا دروازہ صندوق کے ڈھکنے کی

طرح بند تھا۔ تہہ خانے میں کہیں کوئی روشندان بھی نہیں تھا۔ اندر تازہ ہوا صرف ایک نالی سے آرہی تھی جو کوٹھری کے کونے میں ایک کھرے میں بنی ہوئی تھی جہاں سے منہ ہاتھ دھونے والا پانی باہر جاتا تھا۔ ایک کموڈ اور پانی کی بھری ہوئی بالٹی بھی وہیں رکھی تھی صبح ناشتہ تہہ خانے کا ڈھکنا ذرا سا اٹھا کر اندر پھینک دیا گیا تھا۔ یہ احساس کہ عائشہ بیٹی وہیں کسی جگہ قید ہے اور وہ اس کے پاس نہیں جاسکتا۔ اسے قید سے نکال نہیں سکتا شیر خان کو دیوانہ بنائے ہوئے تھا۔ اسے شاید زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ انسان کس طرح بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے اس عالم میں شیر خان نے خدا سے ایک ہی دعا مانگی کہ اے خدا! مجھے اتنی طاقت دے کہ میں اپنے دشمنوں کو خون میں نہلا کر اپنی بیٹی کو عزت آبرو کے ساتھ یہاں سے نکال کرلے جاؤں۔

جانکی ارجنا کی کمزوری بن چکی تھی اور جانکی کو اپنی پیاری سہیلی عائشہ کو دیکھنے اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے روز وہاں آنا پڑتا تھا۔ راستے میں ارجنا اسے جنگل میں روک لیتا تھا۔ جانکی نے اس روز بھی ارجنا سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ارجنا اس وقت اپنے ہوش میں تھا۔ اس نے جانکی کو کچھ نہ بتایا بلکہ الٹا اسے ڈانٹا کہ وہ اس سے ایسی باتیں مت پوچھا کرے۔

جانکی نے ارجنا کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ معاملہ گڑ بڑ ہے اور عائشہ شیرنی کی نگرانی یونہی سخت نہیں کر دی گئی۔ ارجنا نے جانکی کو ہدایت بھی کی وہ کچھ دنوں کے لیے دن کے وقت وہاں نہ آیا کرے۔ جانکی نے کہا۔

"آج تو میں اپنی سہیلی سے ضرور ملوں گی۔ کل نہیں آؤں گی۔"

"مگر مجھے ملنے تو رات کو جنگل میں آؤ گی نہ؟" ارجنا نے کہا۔

"ہاں ہاں۔" جانکی نے بڑے انداز سے جواب دیا۔ "تم سے ملنے تو میں ضرور آؤں گی رات کو......"

جانکی کو ارجنا نے عائشہ شیرنی سے ملنے کی اجازت دے دی۔ وہ اس کے کیبن میں آئی۔ عائشہ کچھ پریشان سی نظر آرہی تھی۔ جانکی کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی اور پوچھنے لگی۔

"میرے ڈیڈی کی کوئی خبر ملی تمہیں؟" جانکی نے کہا۔

"نہیں مگر آج ارجنا بڑا گھبرایا گھبرایا سا ہے اس نے مجھے اب یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔" وہ عائشہ کے پاس لکڑی کے فرش پر بیٹھ گئی اور آہستہ سے بولی۔

"عائشہ! مجھے لگتا ہے یہ لوگ تمہارے خلاف کچھ کرنے والے ہیں۔ میری مانو اور یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے میرے ساتھ نکل چلو۔"

شیرنی خود رات سے بے چین اور مضطرب تھی۔ شاید یہ محبت کرنے والے بہادر باپ کی وہاں موجودگی کا اثر تھا۔ شہاب نے بھی اسی رات کو عائشہ کو اس کے باپ کی آنکھوں کے سامنے ذلیل اور بے عزت کرنے کا ناپاک اور گھناؤنا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ شیرنی اس منصوبے سے بے خبر تھی مگر اس کی چھٹی حس اسے خبردار کر رہی تھی۔ اسے بے قرار کئے ہوئے تھی۔ چنانچہ جب جانکی نے ارجنا کے پراسرار رویے کے حوالے سے اسے وہاں سے فرار ہونے کی تجویز پیش کی تو شیرنی فوراً تیار ہو گئی۔

بظاہر اس جگہ سے فرار ہونا بڑا آسان لگتا تھا۔ کیونکہ کیبن کے باہر ارد گرد کوئی پہرہ نہیں تھا اسے وہاں چلنے پھرنے کی مکمل آزادی تھی۔ مگر وہاں سے تھوڑے فاصلے پر دائرے کی شکل میں شہاب کے چار آدمی اسٹین گنیں لیے جھاڑیوں اور درختوں میں چھپے اس کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ چار آدمی دن کو نگرانی کرتے اور چار آدمی رات کو ان کی جگہ پر آجاتے تھے۔ شیرنی کو یہ صورت حال جانکی کی زبانی معلوم ہو چکی تھی۔ اس نے وہاں سے نکلنے کا پروگرام بنایا جہاں ارجنا پہرہ دے رہا تھا۔

جب دن ڈوب گیا اور شام کا اندھیرا جنگل میں اترنا شروع ہو گیا تو جانکی ارجنا کے پاس جنگل میں پہنچ گئی' ارجنا کی جگہ دوسرا پہرے دار ایک گھنٹے بعد آنے والا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں شیرنی کو وہاں سے نکلنا تھا۔ ارجنا اس وقت جانکی کو دیکھ کر بولا۔ "تمہیں تو رات کو کہا تھا تم شام ہی کو آگئیں۔" جانکی نے جیب سے ہیروئن نکال کر اسے سفید پنی پر بکھیرا اور نیچے ماچس جلا کر ارجنا کی طرف بڑھایا اور ذرا سا ناک کو سکیڑ کر کہا۔

"تم کیسے مرد ہو!" ارجنا اس کھلی دعوت کے سامنے ڈگمگا گیا۔ دوسری جانب طے شدہ پروگرام کے مطابق جب جانکی کو دیر لگ گئی اور جنگل میں اندھیرا بھی چھا گیا تو شیرنی کیبن

کے عقبی دروازے سے نکلی اور جھاڑیوں کی باڑھ پھلانگ کر جنگل کے درختوں میں غائب ہو گئی۔ یہ وہی علاقہ تھا جس میں ارجنا کا پہرہ لگایا گیا تھا مگر اس وقت وہاں ارجنا نہیں تھا وہ جانکی کے ساتھ وہاں سے تھوڑی دور گھنے درختوں میں رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ جب شیرنی ارجنا کے حلقے سے نکل گئی تو پھر اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق شیرنی وہاں سے سیدھی بودھ خانقاہ میں آگئی۔ یہاں وہ اس چھوٹے سے اسٹور ہاؤس میں آ کر چھپ گئی جو خانقاہ کے پیچھے کیلے کے درختوں کے درمیان واقع تھا اور جہاں کبھی کبھار کوئی بھکشو ضرورت کی کوئی چیز لینے آتا تھا۔

جانکی نے اسے اس جگہ چھپنے کو کہا تھا۔ کیونکہ جانکی نہیں چاہتی تھی کہ خانقاہ میں کسی کو شیرنی کے آنے کی خبر ہو۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد جانکی بھی وہاں آگئی اس نے آتے ہی شیرنی سے کہا۔

"تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں میرے ساتھ قصبے میں چلو۔ وہاں میری بڑی بہن کا مکان ہے وہ بیوہ ہے اور اکیلی رہتی ہے جب تک تمہارے باپ کا کھوج نہیں لگتا تم وہیں رہنا۔"

"شیرنی نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ قصبہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس میں زیادہ آبادی غریب کاشتکاروں اور مزدوروں کی تھی جو شہر میں جا کر مزدوری کرتے تھے۔ جانکی کی بیوہ بہن کا مکان قصبے کے باہر ایک پرانے تالاب کے کنارے ایک جھونپڑے کی شکل میں تھا۔ جس کی دیواریں لکڑی کی مگر چھت ناریل کی شاخیں جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ سامنے ایک آنگن تھا جس کے گرد کانٹے دار شاخوں کی باڑھ کھینچی ہوئی تھی۔ جانکی کی بڑی بہن کافی بوڑھی لگتی تھی۔ جانکی نے شیرنی کا تعارف ساوتری کے نام سے ہی کروایا اور کہا کہ ساوتری کی طبیعت خانقاہ میں ٹھیک نہیں رہتی اس لیے وہ یہاں کچھ دن رہے گی۔ جانکی کی بیوہ بہن بے چاری کم زبان گائے کی مانند تھی اس نے سر ہلا کر خوشی کا اظہار کیا اور ہاتھ جوڑ کر زعفرانی لبادے میں ملبوس شیرنی کا احترام کیا۔

جانکی کی بہن ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان بول لیتی تھی۔ جانکی اس وقت واپس خانقاہ کی طرف چلی گئی تاکہ اگر شہاب کے گینگ کا کوئی آدمی عائشہ کی تلاش میں وہاں آئے تو جانکی کی عدم موجودگی سے انہیں اس پر شک نہ پڑ جائے۔

ابھی رات کا پہلا پہر ہی تھا کہ وہاں شور مچ گیا کہ شیرنی غائب ہے۔ یہ اطلاع دوسرے اڈے پر شہاب کو ملی تو غضبناک ہو کر پھنکارتا ہوا وہاں آن پہنچا ارجنا اور دوسرے نگرانی کرنے والے پہریدار بھی وہاں آگئے تھے۔ کوئی ذمے داری قبول کرنے پر تیار نہیں تھا کہ عائشہ شیرنی اس کے علاقے سے گزر کر فرار ہوئی ہے۔ شہاب آتش پارہ بنا ہوا تھا۔ وہ سب کو پنجابی انگریزی اور سنہالی میں گالیاں دے رہا تھا۔ ایک سنہالی گارڈ کو تو وہ گولی مارنے لگا تھا کہ سنہالی ہاتھ باندھ کر زمین پر گر پڑا۔ ارجنا کو اندر سے احساس ہو گیا تھا کہ یہ ساری کارستانی اور سازش جانکی کی ہے مگر وہ اس کا نام نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس طرح سے وہ خود بھی پھنس جاتا تھا۔ اس لیے خاموش تھا۔ شہاب نے سب کو ایک جگہ جمع کیا۔ ان پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور کہا۔

"لڑکی کو ہم تلاش کر لیں گے مگر خبردار یہاں تمہارے سوائے کسی اور کو خبر تک نہ ہو کہ لڑکی بھاگ گئی ہے۔ اگر یہ خبر باہر نکل گئی تو میں تم سب کو لائن میں کھڑا کر کے خود اپنے ہاتھ سے شوٹ کر دوں گا۔"

اس نے ارجنا کو ساتھ لیا اور اس کیبن میں آگیا جہاں شیرنی فرار ہونے سے پہلے رہتی تھی۔ اس نے کیبن کی ایک ایک چیز کو بڑے غور سے دیکھا۔ چھوٹا گیس جل رہا تھا۔ اس نے زور سے ٹھوکر مار کر بانس کی تپائی کو دور گرا دیا اور غصے سے بولا۔

"وہ بڈھی کھوسٹ عورت کو بھی پتہ نہ چلا اس کے بھاگنے کا۔ میں ان سب کو گولی سے اڑا دوں گا۔" ارجنا نے بڑی سیاست کاری سے کام لیتے ہوئے شہاب سے کہا۔

"دادا بھائی! عائشہ کو کوئی باہر کا آدمی یہاں سے نکال کر لے گیا ہے۔ ہم اسے چھوڑیں گے نہیں۔" شہاب دھاڑا۔

"باہر کے آدمی کو یہاں آنے کی جرات کیسے ہوئی۔ تم بھی جنگل میں جا کر سو گئے تھے؟" ارجنا چپ ہو گیا۔ اسٹین گن گلے سے اتار کر اپنے سامنے میز پر رکھی اور سنہالی میں بولا۔

"دادا بھائی میں تمہیں بھگوان کے نام پر وچن دیتا ہوں کہ ایک دن کے اندر اندر اس لڑکی عائشہ کو وہ جہاں کہیں بھی چھپی ہو گی نکال کر تمہارے سامنے لے آؤں گا۔"

شہاب نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس وقت ارجنا ہی اس کا ایک ایسا پرانا ساتھی تھا جس پر وہ بھروسہ کر سکتا تھا اور جس کی بات کو وہ سن بھی لیتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ سب کچھ ارجنا کی رنگ رلیوں ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ شروع شروع میں تو ارجنا اس خیال سے ہر جائز و ناجائز کام پوری دیانت داری سے کرتا رہا تھا۔ کہ اسے شہاب کی خوشنودی کی ضرورت تھی اور وہ اس سے اسمگلنگ کے کاروبار میں زیادہ زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

مگر اب ارجنا نے اپنے دل میں ایک اور ہی پروگرام طے کر رکھا تھا وہ شہاب کا تختہ الٹ کر خود اس کے کاروبار پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا۔ فیروز کی موت کے بعد شہاب بے سہارا اور اکیلا رہ گیا تھا وہ ارجنا ہی پر بھروسہ کرنے لگا تھا۔ شیر خان بھی اس کی جان کا دشمن تھا۔ گویا ارجنا کی بغاوت کے لیے حالات خود بخود سازگار ہوتے جا رہے تھے۔ ارجنا کو اب شیرنی کے فرار ہونے اور اپنے رنگ رلیاں مناتے رہنے اور ڈیوٹی سے غفلت برتنے کا کوئی ملال نہیں تھا وہ عائشہ شیرنی کو بھی کسی جگہ تلاش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یونہی دکھاوے کے لیے وہ ادھر ادھر کا چکر لگاتے رہنے کا ارادہ کئے ہوئے تھا۔ شہاب کے گینگ میں چار پانچ ایسے سنہالی تھے جو اس کے بڑے وفادار باڈی گارڈ تھے اور اس کی خاطر کئی بار اپنی جانیں خطرے میں ڈال چکے تھے ارجنا سب سے پہلے انہیں اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے جانکی کو اپنے ذہن میں رکھ لیا تھا۔ چنانچہ اس روز شیرنی کو تلاش کرنے کے بہانے ارجنا سیدھا بودھ خانقاہ میں جانکی سے ملاقات کے لیے جا پہنچا۔

جانکی سے ارجنا نے شیر خان کی بیٹی کے بارے میں بظاہر تشویش کے ساتھ کہا کہ جس وقت وہ دونوں جنگل میں ایک طرف چلے گئے تھے اس وقت موقع پا کر شیر خان کی بیٹی فرار ہو گئی ہے۔ جانکی نے بھی بظاہر تعجب کا اظہار کیا اور ارجنا سے جھوٹ موٹ کی ہمدردی جتانے لگی کہ اس وجہ سے کہیں اس پر تو کوئی مصیبت نازل نہیں ہو گی ارجنا نے جانکی پر اپنی محبت کا اثر جمانے کی خاطر کہہ دیا۔

”مصیبت آتی ہے تو آتی رہے مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ اس وقت میں تمہارے پاس تھا اور ہم دونوں پیار محبت کی باتیں کر رہے تھے۔“

جانکی پر محبت کے اس روایتی جملے نے گہرا اثر کیا۔ آج تک اسے کبھی کسی نے ایسا

محبت بھرا جملہ نہیں کہا تھا۔ اس کی جوانی بودھ خانقاہ کے خشک ماحول میں ڈھلنے لگی تھی۔ محبت کی محرومی اسے ہیروئن کے نشے کی طرف کھینچ کر لے گئی تھی۔ اس نے ارجنا کی طرف خالص اور بے لوث پیار بھری نظروں سے دیکھا مگر ہوس کا غلام ارجنا عورت کی پیار بھری نگاہوں کو نہ پہچان سکا۔ جانکی نے کہا۔

”ارجنا! چلو یہاں سے کسی دوسرے ملک میں بھاگ چلیں۔ وہاں ہم اپنی مرضی سے رہیں گے تم کچھ نہ کرنا میں کام کیا کروں گی۔“

ارجنا ہنس پڑا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ آئندہ زندگی کے لیے اس نے جو منصوبہ بنایا ہے اس میں اسے ایک ساتھی عورت کی ہر لحہ ضرورت رہے گی۔ اور اس عورت کا وفادار اور سچا ہونا بڑا ضروری ہے۔ اس کے واسطے جانکی سے بہتر عورت اسے کہیں نہیں ملے گی۔ وہ اس سے محبت بھی کرتی تھی۔ ارجنا نے جانکی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اوپر کے دل سے بولا۔

”جانکی بھگوان کے سامنے کہتا ہوں کہ میں بھی تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔“

جانکی نے فوراً یقین کر لیا اور ارجنا کے ہاتھوں کو چومنے لگی۔ ارجنا نے کہا۔

”مگر جانکی ہم یہ جگہ چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے ہم اسی جگہ رہیں گے یہاں ہم لاکھوں کی جگہ کروڑوں روپے کما سکتے ہیں۔“ جانکی نے پوچھا۔

”وہ کیسے ارجنا؟“

ارجنا کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ جانکی اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اس کوٹھری میں اور کوئی نہیں تھا۔ خانقاہ کے راہب جانکی کے جرائم پیشہ لوگوں سے تعلقات کی وجہ سے اس سے ڈرتے تھے اور جان بوجھ کر اس کے معاملے میں چشم پوشی کرتے تھے۔ ارجنا نے کہا۔

”میرے دماغ میں ایک اسکیم ہے مگر تمہیں ابھی نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ میرے راستے میں کچھ رکاوٹیں ہیں جنہیں دور کرنا ضروری ہے۔ ایک رکاوٹ تمہاری دوست عائشہ بھی ہے جو شیر خان کی بیٹی ہے یہ ٹھیک ہے کہ وہ یہاں شہاب اور فیروز سے انتقام لینے کے لیے آئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ فیروز کو اسی نے قتل کیا ہے اور اب وہ شہاب کو موت کے

گھاٹ اتارنے کی کوشش میں فرار بھی ہوئی ہے لیکن یہ عورت شہاب کو قتل کرنے کے بعد ممکن ہے یہاں سے واپس پاکستان نہ جائے اور مجھے بھی ہلاک کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس پر یہ راز فاش ہو چکا ہے کہ میں شہاب کا ساتھی ہوں اور میں نے ہی اسے اس جال میں پھنسایا تھا۔"

جانکی کو عائشہ شیرنی سے ہمدردی ضرور تھی مگر وہ یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس کے محبوب ارجنا کو کوئی نقصان پہنچائے۔ مگر عائشہ سے یہ بات کوئی بعید نہیں تھی جانکی اس کی طبیعت اور مزاج سے واقف تھی۔ جانکی نے ارجنا سے کہا۔

"اگر عائشہ کے باپ کا پتہ چل جائے تو ہو سکتا ہے وہ اس کے ہمراہ واپس پاکستان چلی جائے۔" ارجنا نے کہا۔

"نہیں۔ یہ دونوں جب تک شہاب کو قتل نہیں کر دیتے واپس نہیں جائیں گے۔"

"تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ تمہارے دل میں کیا ہے ارجنا؟" جانکی نے بڑی اپنائیت اور محبت کے جذبے کے ساتھ پوچھا۔ ارجنا ابھی اصل اسکیم جانکی کو نہیں بتانا چاہتا تھا اس نے صرف اتنا کہا۔

"بس جانکی تم یہ سمجھ لو کہ ہم دونوں کے روشن مستقبل کے درمیان یہ تمہاری سہیلی عائشہ اور اس کا باپ دو بڑی رکاوٹیں ہیں یہ دونوں ہمارے راستے سے ہٹ جائیں تو بات بنے۔" جانکی نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

"شیر خان کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی نہ کچھ کر ہی سکتی ہوں لیکن عائشہ کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ بلکہ ممکن ہے وہ یہاں بھی کسی روز آجائے اور پھر میں اسے انڈیا کی طرف بھیج سکتی ہوں۔"

"وہ کیسے؟" ارجنا نے پوچھا۔

"اگر تم یہی چاہتے ہو کہ شیر خان کی بیٹی تمہارے راستے سے قتل کئے بغیر ہٹ جائے تو میں اس کا ذمہ لیتی ہوں۔"

ارجنا خود شیر خان کی بیٹی کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ اور اس کا مطلب تو صرف اتنا تھا کہ یہ عورت جو شیر خان کی بیٹی ہے اور بڑی دلیر اور گوریلا ٹائپ ہے

اس کے راستے سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔ باقی شیر خان کے بارے میں ارجنا کو معلوم تھا کہ اسے شہاب زندہ نہیں چھوڑے گا اور جب شیر خان کو شہاب مار ڈالے گا تو وہ یقیناً ارجنا موقع پا کر شہاب کو قتل کر ڈالے گا اور پھر اس کے کاروبار پر قبضہ کر لے گا۔ وہ بولا۔

"مگر تم عائشہ کو کیسے ڈھونڈ نکالو گی اور یہ بات بھی یقینی نہیں ہے کہ عائشہ تمہاری بات مان لے اور انڈیا چلی جائے۔" جانکی نے ارجنا کی کمر میں بازو ڈال کر کہا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑو۔"

ارجنا چلا آیا وہ سمجھ گیا تھا کہ جانکی کو معلوم ہے کہ عائشہ کہاں چھپی ہوئی ہے۔ ارجنا کو عائشہ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اگر وہ جانکی اس کو یہاں سے انڈیا بھجوا سکتی ہے تو یہ اسے قتل کرنے سے بہتر بات تھی۔ باقی شیر خان کو قتل کرنے کا تو شہاب کا پروگرام تھا ہی۔

!........

جانکی بھی یہی چاہتی تھی کہ عائشہ کی زندگی بچی رہے اور وہ ان دونوں یعنی جانکی اور ارجنا کے راستے سے ہٹ جائے۔ ارجنا کے چلے جانے کے بعد جانکی نے ایک اسکیم سوچی اور خانقاہ سے نکل کر سیدھے قصبے کی طرف روانہ ہو گئی۔ قصبے میں اپنی بیوہ بہن کے ہاں اس نے عائشہ کو چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ جانکی نے ارجنا کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ارجنا اس کی سہیلی عائشہ کو قتل کر کے اپنے راستے سے ہٹائے۔ وہ جانتی تھی کہ ارجنا ایسا بڑی آسانی سے وقت آنے پر کر گزرے گا اور جانکی نہیں چاہتی تھی کہ ایسا ہو۔ ایک ترکیب اس کے ذہن میں آ گئی تھی۔

عائشہ اس کی بیوہ بہن کے مکان میں موجود تھی۔ جانکی کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

"میرے باپ کا کچھ پتا چلا جانکی؟" جانکی اس کے پاس چٹائی پر بیٹھ گئی اور بہن سے چائے بنانے کے واسطے کہا جانکی نے اپنی سوچی ہوئی ترکیب پر عمل کرتے ہوئے کہا۔

"عائشہ! تمہارے ڈیڈی کا پتا چل گیا ہے۔"

"کہاں ہے میرا ڈیڈی؟ پلیز مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

عائشہ اپنے باپ کا سن کر بے چین ہو گئی۔ جانکی پورا ڈرامہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی کہنے لگی۔

"تمہارے ڈیڈی کو انڈیا پہنچا دیا گیا ہے۔"

"وہ کیسے؟ اور کیوں؟" عائشہ بے حد افسردہ ہو گئی۔ جانکی کہنے لگی۔

"یہ سب کچھ ایک ایسے شخص نے کیا ہے جو تمہارے باپ کا پرانا ساتھی رہ چکا ہے اور جو شہاب اور اس کے قاتل غنڈوں سے اس کی جان بچانا چاہتا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے عائشہ کہ شہاب اور اس کے جرائم پیشہ گروہ کی کتنی طاقت ہے۔ تمہارا باپ اکیلا تھا اسے کسی وقت شہاب کے آدمی قتل کرنے والے تھے۔ انہوں نے تمہارے باپ کے گرد گھیرا تنگ کر دیا تھا۔"

"تو کیا میرے ڈیڈی واپس جانے پر تیار ہو گئے تھے؟ کیا انہیں اپنی جان مجھ سے بھی پیاری تھی؟" عائشہ نے اداس لہجے میں کہا۔ جانکی اسی کلائی میکس کے انتظار میں تھی۔ اس نے فوراً جواب دیا۔

"نہیں عائشہ ایسی بات نہیں تھی۔ تمہارا باپ تو ایک بہادر مرد ہے۔ وہ تو شہاب کو مارنے یا خود مر جانے پر تلا بیٹھا تھا۔ مگر اسے یہ کہا گیا کہ شیر خان! تمہاری بیٹی کو لے کر شہاب لنکا کا بارڈر کراس کر گیا ہے اور اس وقت مدراس میں ہے۔ پہلے تو تمہارے ڈیڈی کو یقین نہ آیا۔ مگر جب تمہارے باپ کو مدراس کے ایک اسمگلر کا نقلی خط دکھایا گیا جو ارجنا کے نام تھا اور جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ شہاب شیر خان کی بیٹی کو لے کر میرے پاس پہنچ گیا ہے اور وہ اسے مقبوضہ جموں کشمیر کی طرف لے جا کر فروخت کرنے دو دن بعد نکل جائے گا تو تمہارے باپ شیر خان کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ ارجنا کی یہ اسکیم محض تمہارے باپ کی زندگی بچانے کے واسطے تھی۔ کیونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ شیر خان اکیلا رہ گیا ہے اور شہاب کے وار سے اب بچ نہیں سکے گا۔ اور اسی وقت ارجنا نے تمہارے باپ کو اپنے ایک خاص آدمی کے ساتھ جافنا سے انڈیا کی طرف روانہ کر دیا۔" عائشہ شیریں بت بنی جانکی کی باتیں سن رہی تھی۔ اتنا وہ بھی جانتی تھی کہ ارجنا کسی زمانے میں اس کے باپ کا خیر خواہ اور دوست تھا اور دوسرے یہ کہ جانکی کے پاس ارجنا آتا جاتا رہتا ہے اس نے مایوس ہو کر پوچھا۔

"یہ کب کا واقعہ ہے؟"

"آج صبح یہ سب کچھ ہوا ہے۔ اس وقت تو تمہارے ڈیڈی انڈیا پہنچ گئے ہوں گے اور ارجنا کے آدمی کے ساتھ مدراس جا رہے ہوں گے۔"

"مگر یہ آدمی میرے ڈیڈی کے ساتھ کس لیے گیا ہے؟" عائشہ کے اس سوال پر جانکی نے کہا۔

"یہ آدمی مدراس میں تمہارے باپ کو ایک سرائے کے مالک کے پاس پہنچا دے گا۔ تمہارے باپ کو یہی کہا جائے گا کہ شہاب اور تمہاری بیٹی دو ایک دن میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اتنی دیر میں تم وہاں پہنچ جانا۔ یوں تم اپنے ڈیڈی سے مل جاؤ گی۔" عائشہ بولی۔

"مگر میں شہاب سے انتقام لیے بغیر اسے قتل کئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔" جانکی نے کہا۔

"عائشہ! یہ کام بعد میں ہو سکتا ہے مگر اس وقت تمہیں اپنے باپ کو مزید پریشان ہونے سے بچانا ہے۔ تمہارے ڈیڈی تو مدراس کی طرف سفر شروع کر چکے ہیں وہ مدراس کی سرائے میں دو تین دن ضرور رہیں گے اگر اس دوران تم اس کے پاس نہ پہنچیں تو پھر نہ جانے تمہارا باپ تمہاری تلاش میں انڈیا میں کس طرف نکل جائے۔ انڈیا تمہارا دشمن ملک ہے۔ اگر انڈیا پولیس نے اسے پکڑ لیا تو اسے پاکستانی جاسوس سمجھ کر بڑی بھیانک اذیتیں دی جائیں گی۔ تم باپ کے پاس ہو گی تو اسے حوصلہ ہو گا۔ سرائے کا مالک تمہیں پاکستان پہنچانے میں مدد کرے گا۔ وہ ارجنا کا بڑا اعتبار والا دوست ہے۔ ارجنا سے میں اس کے نام چٹھی لے کر تمہیں دے دوں گی۔"

عائشہ عجیب الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ جتنی جلدی ہو سکے اسے اپنے باپ کے پاس پہنچنا چاہیے تاکہ وہ مدراس میں بیٹی کو نہ پا کر اس کی تلاش میں آگے نہ نکل پڑے۔ اس نے جانکی سے کہا۔

"ٹھیک ہے جانکی! میں اپنے ڈیڈی کے پاس جانے کو تیار ہوں۔"

جانکی نے اسی شام ارجنا کو جا کر بتا دیا کہ عائشہ اس کے پاس ہے اور وہ یہاں سے مدراس جانے کو تیار ہے۔ پھر جانکی نے ساری اسکیم جو اس نے بنائی تھی ارجنا سے بیان کر دی۔ ارجنا بڑا خوش ہوا وہ خود یہی چاہتا تھا کہ شیر خان کی بیٹی کسی طرح اس کی راہ سے اپنے

آپ ہٹ جائے۔ شیر خان کو شہاب نے قتل کرنا ہی تھا۔ یا پھر خود قتل ہو جانا تھا۔ دونوں صورتوں میں ارجنا کی فتح ہی تھی۔ چنانچہ اس نے جانکی سے کہا۔

"میں آج رات ہی اس کے یہاں سے نکل جانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے تم نے ٹھیک کیا جو مدراس کی سرائے والے میرے دوست مورتی کا پتا اسے بتا دیا میں اس کے نام ایک خط بھی لکھ دوں گا وہ عائشہ کو پاکستان کی سرحد پار کرانے میں مدد کرے گا۔ وہ میرا بڑا با اعتبار دوست ہے وہ عائشہ کے پہنچتے ہی اسے بتا دے گا کہ اس کا باپ وہاں اس کی تلاش میں آیا تھا مگر اسے نہ پا کر اور ایک دن انتظار کرنے کے بعد جموں شہر کی طرف چلا گیا ہے۔ میں نے مدراس میں مورتی کو ٹیلی فون کر کے ساری بات سمجھا دوں گا۔ تم عائشہ کو لے کر رات کے پچھلے پہر ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جانا میرا آدمی وہاں پر موجود ہو گا۔ وہ عائشہ کو اپنی حفاظت میں مدراس تک لے جائے گا۔"

ایسا ہی کیا گیا رات کے پچھلے پہر جانکی عائشہ کو لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔ وہاں ارجنا کا آدمی موجود تھا جس کو جانکی شکل سے پہچانتی تھی۔ اس نے عائشہ کو اس کے حوالے کر دیا۔ اس شخص نے جافنا سے آگے انڈیا اور لنکا کے درمیان والی آبنائے پار کرنے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب سورج نکلا تو عائشہ بدھ بھکشنی کے حلیئے میں ارجنا کے خاص آدمی کے ساتھ ٹرین کے ایک ڈبے میں بیٹھی تھی اور ٹرین دھنش کوڈی کے اسٹیشن سے نکل کر مدراس کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔

عائشہ کے لنکا سے نکل جانے اور اس کے راستے سے ہٹ جانے سے ارجنا کی راہ ہموار ہو گئی تھی اب اس کے راستے میں شہاب اور شیر خان صرف دو ہی آدمی تھے۔ ان دونوں میں سے ایک نے زندہ رہنا تھا اور جسے بچ جانا تھا اسے ارجنا نے قتل کر کے شہاب کے مافیا گینگ پر ایک دم سے قبضہ کر لینا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ دس پندرہ آدمیوں کو بھاری رقوم کا لالچ دے کر ملا لیا تھا۔ ارجنا اب شہاب اور شیر خان کے دوبدو معرکے کا انتظار کرنے لگا۔ ارجنا ویسے تو شہاب کو خود بھی ہلاک کروا سکتا تھا مگر اس طرح سے شہاب کے وفادار گروہ کے ساتھ اس کی ٹھن سکتی تھی۔ اگر وہ شیر خان کا مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہوتا ہے تو ظاہر ہے ارجنا پر کوئی الزام نہیں آسکتا تھا۔ عائشہ کے فرار ہو جانے سے شہاب

سخت الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ اب عائشہ کسی بھی وقت کسی بھی طرف سے اس پر قاتلانہ حملہ کر سکتی ہے۔ وہ شیر خان کو تو وقتی طور پر بھول گیا اور عائشہ کی تلاش میں سرگرم ہو گیا۔ ارجنا ساری بات تو نہیں بتا سکتا تھا۔ اس نے شہاب سے صرف اتنا ہی کہا کہ میرے خفیہ آدمیوں نے خبر دی ہے کہ عائشہ انڈیا کی طرف چلی گئی ہے شہاب نے ارجنا کو موٹی سی گالی دے کر کہا۔

"اس کا باپ یہاں بیٹھا ہے اور وہ انڈیا کیا لینے جائے گی؟ اسے علم ہو چکا ہے کہ شیر خان اسی علاقے میں موجود ہے۔ وہ یہاں سے باہر نہیں جائے گی اس کو زندہ یا مردہ گرفتار کرو ارجنا۔ تم اسے نہیں جانتے وہ گوریلا لڑکی ہے۔ وہ ہم سب کو اچانک حملہ کر کے موت کے گھاٹ اتار دے گی۔"

ارجنا شہاب کو بار بار اکساتا اور یہی کہتا کہ شیر خان کو ختم کر دیا جائے۔ شہاب کے پاس اس کا ایک ہی جواب تھا۔ اس نے کہا۔

"ارجنا! میں شیر خان کو اب بطور ترپ کے پتے کے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے میں نے اس کی بیٹی کو یرغمال بنایا تھا تاکہ شیر خان کو قابو میں کر سکوں۔ اب شیر خان کو عائشہ کے واپس لانے میں استعمال کروں گا۔ تم دیکھتے جاؤ۔ جب عائشہ کو معلوم ہوا کہ اس کا باپ میرے پاس ہے تو وہ ضرور واپس آئے گی اگر وہ واپس نہ آئی تو میں اس کے باپ کو قتل کر دوں گا جو میرے پاس قید ہے تو وہ اپنے آپ واپس آ جائے گی۔ تم فوراً سب آدمیوں کو اطلاع کر دو کہ علاقے میں یہ افواہ پھیلا دی جائے کہ شیر خان شہاب کے پاس قید ہے یہ افواہ عائشہ تک ضرور پہنچے گی اور وہ دوبارہ میرے ڈیرے پر آنے کی کوشش کرے گی۔ تم ڈیرے پر نگرانی کی نفری دوگنی کر دو۔ اب جاؤ اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔"

ارجنا گردن پر ہاتھ پھیرتا وہاں سے چل دیا۔ دل میں یہی سوچ رہا تھا کہ معاملہ طول پکڑ رہا ہے کوئی دوسری اسکیم لڑانی پڑے گی۔

اس دوران شیر خان شہاب کے دوسرے ڈیرے کے تہ خانے میں قید و بند کی حالت میں پڑا تھا۔ دو دن گزر گئے تھے۔

اب ہم اس سنیاسن منگلی کیطرف چلتے ہیں کہ جب اس نے خفیہ غار میں اپنے

محبوب شیر خان کو نہ دیکھا تو اس پر کیا گزری! جب اس نے شیر خان کو غائب پایا تو گھبرا کر اسے غار کے باہر تلاش کرنے لگی کہ شاید وہ کہیں ادھر ادھر گیا ہو۔ یہاں ایک جگہ اسے کچھ آدمیوں کے قدموں کے نشانات نظر آئے ساتھ ہی وہاں جھاڑیوں کی کچھ شاخیں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اتنے میں منگلی کا باپ سنیاسی باوا بھی آگیا۔

"بیٹی! شیر خان کہاں ہے؟" سنیاسن نے کہا۔

"اسے ہی تلاش کر رہی ہوں۔ باوا مجھے لگتا ہے کہ اسے شہاب کے آدمی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ یہ دیکھو ان آدمیوں کے پاؤں کے نشان ہیں۔" سنیاسی نے کہا "مگر شیر خان نے انہیں کچھ نہ کہا؟" سنیاسن منگلی نے اپنا سر پیٹ لیا اور بولی۔

"باوا! غلطی میری ہے۔ میں نے شیر خان کو نیند لانے والی بوٹی پلا دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بوٹی زیادہ پڑ گئی تھی اور شیر خان کو ہوش نہ آسکا۔" سنیاسی باوا بھی تیز نظروں سے پاؤں کے نشان دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"بیٹی! یہ دو بدمعاشوں کے گروہوں کی دشمنی کا معاملہ ہے۔ ہمیں درمیان میں نہیں آنا چاہیے اگر شہاب کے آدمی شیر خان کو لے گئے ہیں تو ہمیں بات یہیں ختم کر دینی چاہیے بلکہ ہمیں اپنا ٹھکانہ ہی بدل لینا چاہیے۔ شہاب کو پتا لگا کہ ہم نے شیر کو چھپا رکھا تھا تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔" سنیاسن نے تڑپ کر کہا۔

"اس کو کیسے پتا چل جائے گا کہ اس غار میں ہم نے شیر خان کو رکھا ہوا تھا؟ یہ کوئی ہمارا جھونپڑا تو نہیں ہے ہمارا ڈیرا تو نہیں ہے۔" سنیاسی بولا۔

"بیٹی کچھ بھی ہو اب ہمیں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے۔" سنیاسن منگلی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جب تک میری جان میں جان ہے شیر خان کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ شہاب اس کا بال بھی نہیں بگاڑ سکتا میں اسے وہاں سے نکال کر لاؤں گی۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو۔" سنیاسی نے ڈانٹ کر کہا۔

سنیاسن منگلی نے غصے میں کہا۔

"باوا! تم اس معاملے میں مت آؤ۔ بس میں نے تمہیں کہہ دیا ہے میرا جو جی چاہے گا

کروں گی۔"

اور وہ غصے میں پھنکارتی غار سے اتر کر اپنے جھونپڑے کی طرف چل دی۔ سنیاسن منگلی نے ساری زندگی جنگلوں میں جڑی بوٹیاں تلاش کرتے گزار دی تھی۔ اس کی محبت شہریوں والی محبت نہیں تھی بلکہ یہ ایک ایسی محبت تھی جو صرف ایک جنگلی عورت ہی کر سکتی تھی۔ اس میں مصلحت اور ریاکاری نہیں تھی۔ سنیاسن منگلی جھونپڑی میں آکر سوچنے لگی کہ شیر خان کو اگر شہاب اسمگلر کے گروہ کے آدمی اغوا کر کے لے گئے ہیں تو اسے ان کے قبضے سے کیسے چھڑایا جائے۔ وہ لوگ شیر خان کے دشمن ہیں۔ شیر خان منگلی کو بتا چکا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ منگلی نے خود دیکھ لیا تھا کہ وہ شیر خان کو اپنی طرف سے قتل کر کے نالے میں پھینک گئے تھے۔ منگلی کو اتنا معلوم تھا کہ ان اسمگلروں کا اڈہ ٹاور کے آس پاس کی جگہ ہے اور یہاں وسیع پیمانے پر منشیات کا کاروبار ہوتا ہے۔ منگلی کے پاس اپنے قبیلے کا ایک روایتی ہتھیار موجود تھا۔ یہ ہتھیار ان کے قبیلے کے لوگ اپنے دشمن کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ اگرچہ اس کی نوبت کبھی کبھار ہی آتی تھی مگر قبیلے کی روایت کے مطابق یہ لوگ اس ہتھیار کو اپنے پاس ضرور رکھتے تھے۔

منگلی جلدی سے اٹھ کر جھونپڑی کے کونے میں گئی۔ وہاں ایک بانس کا پرانا صندوق پڑا تھا۔ اسے کھولا پرانے کپڑے ہٹائے اور نیچے سے ناریل کی تیلیوں سے بنا ہوا ایک چکور ڈبہ نکال کر لے آئی۔ اس ڈبے میں عام سگریٹ ہولڈر سائز کی ایک بانس کی پھونکنی اور اس کے ساتھ بانس کی پتلی پتلی سوئیوں جیسی تیلیاں پڑی تھیں۔ اوپر کی جانب چھوٹے سے خانے میں نیلے رنگ کی پتھر کی چھوٹی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ اس شیشی میں جنگل کے سب سے زیادہ زہریلے کالے بھنیر سانپوں کا زہر قطرہ قطرہ نکال کر بھرا ہوا تھا۔ جب کسی دشمن کو ہلاک کرنا ہوتا تو بانس کی سوئی کو اس بوتل میں ڈال کر اس کے سرے کو زہر میں بجھا دیا جاتا۔ پھر یہ سوئی بانس کی پھونکنی میں ڈال دی جاتی۔ دشمن سامنے آتا یا کسی جگہ بیٹھا ہوتا یا کسی جگہ سے گزر رہا ہوتا تو پھونکنی منہ کے ساتھ لگا کر زور سے پھونک ماری جاتی۔ اس میں سے زہر میں بجھی ہوئی بانس کی سوئی تیزی سے نکل کر دشمن کے جسم میں کھب جاتی

اور اس کے ساتھ ہی ٹمنیئز سانپ کا زہر دشمن کے اعصاب کو مفلوج کر کے وہیں گرا دیتا اور بغیر تڑپے دشمن کا جسم سیاہ پڑتے پڑتے پگھلنا شروع ہو جاتا۔ اس میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ دشمن پر حملہ کرنے کے لیے نشانہ درست ہونا چاہیے۔

سنیاسن منگلی بانس کی سوئیوں کو غور سے دیکھ رہی تھی جن پر ابھی زہر نہیں لگا تھا پھر اس نے بانس کی پھونکنی کو آنکھ کے ساتھ لگا کر اس کے سوراخ کا جائزہ لیا۔ اس میں ایک خالی تیلی ڈالی۔ منہ کے ساتھ لگایا۔ سامنے الگنی پر لٹکے ہوئے کپڑے کو نشانہ بنا کر زور سے پھونک ماری۔ بانس کی سوئی پھونکنی میں سے نکل کر کپڑے میں الجھ گئی۔ منگلی بڑی خوش ہوئی اگرچہ اس نے پہلے کبھی اس ہتھیار کو استعمال نہیں کیا تھا لیکن اس کا فن اور مہارت اس کے خون میں روایت کے طور پر شامل تھی اور تھوڑی سی مشق کے بعد منگلی اپنے نشانے میں مہارت حاصل کر سکتی تھی۔ ایک ہی ہتھیار تھا جو منگلی کے کام آسکتا تھا کسی کو اس پر شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ساری بانس کی سوئیاں نکال کر ایک طرف رکھ دیں پھر زہر کی بوتل کا ڈاٹ کھولا۔ شیشی کو بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا اور ایک ایک کر کے بانس کی ساری سوئیوں کے سرے کافی نیچے تک بوتل میں ڈال ڈال کر زہر میں بجھا دیے۔ جب سوئیوں کا زہر خشک ہو کر تیلیوں کے ریشوں تک میں اتر گیا تو اس نے سوئیوں کو پھونکنی کے ساتھ خشک رومال میں لپیٹ کر اپنی ساڑھی میں چھپا کر رکھ لیا۔

دن کافی نکل آیا تھا آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ سنیاسن منگلی نے سنیاسیوں والا کپڑے کا پرانا تھیلا جس میں مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں تھیں کاندھے سے لٹکایا اور جھونپڑی سے نکل کر ایک طرف چل پڑی وہ اس راستے پر چل رہی تھی جو چھوٹی چھوٹی چٹانوں ٹیلوں اور درختوں جنگلی گھاس کے اونچے اونچے ٹکڑوں میں سے ہوتا ہوا کھاڑی کنارے والے ٹاور کی طرف نکل گیا تھا۔ اس کی منزل اسمگلروں کا ٹھکانہ تھا جو منگلی نے کبھی دیکھا تو نہیں تھا مگر جس کے بارے میں اس نے سن رکھا تھا کہ وہیں کہیں ہے۔ منگلی سنیاسن تھی اور اس پر کوئی شک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سنیاسی عورتیں کبھی کبھی اس علاقے میں جڑی بوٹیاں بیچتی نظر آجایا کرتی تھیں یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ چلتے چلتے منگلی ٹاور کے شمال مغرب کی طرف آگئی۔ یہاں اسے مچھیروں کی دو تین جھونپڑیاں دکھائی دیں

ایک بوڑھا مچھیرا ریت پر بیٹھا پرانے جال کی مرمت کر رہا تھا۔ ایک عورت چولہے میں آگ جلا رہی تھی۔ کچھ بچے ادھر ادھر ریت پر کھیل رہے تھے۔ سنیاسن منگلی نے قریب جا کر اپنی مخصوص آواز لگائی تو بوڑھے مچھیرے نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ قریب آکر منگلی نے کچھ جڑی بوٹیوں کے نام لے کر بوڑھے سے کہا کہ وہ انہیں خرید لے۔ گھر میں کبھی کوئی بیماری نہیں آئے گی۔ مچھیرے کی بہو نے زور سے کہا۔

”اری ہم تو غریب مچھیرے ہیں ادھر جا۔ ادھر امیر لوگ رہتے ہیں۔“ مچھیرن نے جس طرف اشارہ کیا تھا ادھر دو تین لکڑی کے کیبن ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے اور تاڑ کے درختوں میں صاف نظر آرہے تھے۔

”ادھر کون رہتا ہے بہن؟“ منگلی نے انجان بن کر پوچھا۔ بوڑھا مچھیرا بولا۔

”جن کے پاس دولت ہے وہی لوگ رہتے ہیں۔ جاؤ گی تو پتا چل جائے گا۔“ منگلی سمجھ گئی یہ اسمگلروں کا اڈہ ہے منگلی نے مصنوعی خوف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں باوا جی! میں ادھر نہیں جاتی میں نے سنا ہے کہ ادھر بڑے خطرناک لوگ رہتے ہیں۔“ بوڑھا مچھیرا خاموش رہا۔ اس کی بہو نے چولہے میں خشک جھاڑیاں ٹھونستے ہوئے کہا۔

”تو پھر تجھے کون کہتا ہے وہاں جانے کو۔ مگر ہمارے سر پر کیوں سوار ہو گئی ہے ہم تم سے کچھ نہیں خرید سکتے۔“

منگلی سنیاسیوں کے روایتی حسن اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرائی اور بڑی ملائمت سے بولی۔

”بھگوان تمہیں خوش رکھے بہن۔“ اور آگے بڑھ گئی۔ اب وہ سیدھی اس طرف جا رہی تھی جدھر کیبن بنے ہوئے تھے۔ یہ لکڑی اور بانس سے بنے ہوئے تین کیبن تھے۔ جن کے درمیان میں کھلی جگہ تھی۔ ایک طرف ناریل کے ڈھیر پڑے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کی سلونی عورت ناریل کی چھال صاف کر رہی تھی وہاں کوئی مرد نظر نہیں آرہا تھا۔ منگلی نے احاطے میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی۔ تو سلونی عورت نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اری تو یہاں کیا لینے آگئی؟“ منگلی اس عورت کو بڑی محبت سے اپنی زبان میں اسیس دیتی قریب جا کر زمین پر جھولا رکھ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"بہن! میرے پاس ایسی بوٹی بھی ہے کہ اپنے مرد کو گھول کر پلا دو گی تو ساری عمر تمہارا غلام رہے گا۔ کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔" سیلونی عورت ہنس پڑی۔

"میرا مرد تو پہلے ہی میرا غلام ہے۔" منگلی نے جھولے میں سے ایک سوکھی سی بوٹی نکال کر اسے دکھائی۔

"یہ اسے پلا دو۔ وہ تمہارا اور زیادہ غلام ہو جائے گا۔" سیلونی عورت نے کہا۔

"نہیں نہیں مجھے کسی بوٹی کی ضرورت نہیں۔ تو یہاں سے ادھر قصبے میں جا۔ یہاں کیوں آ گئی ہے۔" منگلی نے اپنی میٹھی میٹھی باتیں شروع کر دیں اور عورت سے پوچھا۔

"یہاں کون رہتا ہے۔ کوئی مرد دکھائی نہیں دیتا۔" سیلونی عورت نے منگلی کو تھوڑا ڈانٹ کر کہا۔

"تجھے اس سے کیا؟ جا اپنا راستہ لے۔" تب منگلی نے اپنے قیافے سے کام لیتے ہوئے دوسرا حربہ استعمال کیا اور جھولے میں سے ایک دوسری بوٹی نکال کر اسے دکھائی اور بڑے اعتماد سے کہا۔

"یہ بوٹی ایک خاص تحفہ ہے جو میں تجھے مفت دیتی ہوں۔ یہ کنچن بوٹی ہے اس کو ناریل میں ڈال کر پندرہ دن کے لیے زمین کے اندر کسی کوٹھری میں بند رکھو۔ اس کے بعد ناریل توڑ کر اسے دیکھو گی تو بوٹی ناریل کے پانی میں حل ہو گئی ہو گی۔ بس وہ پانی لوہے کی جس چیز پر لگاؤ گی وہ سونا بن جائے گی۔" سیلونی عورت دانت نکال کر ہنسنے لگی اور بولی۔

"تم خود کیوں نہیں سونا بناتی ہو؟ ماری ماری کیوں پھر رہی ہو؟" اس کے جواب میں منگلی نے کہا۔

"ہم پر سونا حرام ہے۔ ہم صرف دوسروں کی خدمت کرتے ہیں۔ خود سنیاسی کے سنیاسی ہی رہتے ہیں یہ لو بوٹی۔ تمہیں مفت دیتی ہوں۔ کیا یاد کرو گی مگر شرط یہ ہے کہ اسے زمین کے اندر کسی تہہ خانے کے اندھیرے میں پندرہ دن بند رکھنا ہو گا۔"

منگلی نے تہہ خانے کا جان بوجھ کر کہا تھا کہ اسے معلوم ہو سکے کہ یہاں کوئی تہہ خانہ بھی ہے کہ نہیں۔ کیونکہ اس کا اندازہ تھا کہ شہاب وغیرہ نے شیر خان کو کسی تہہ خانے میں

رکھا ہو گا۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ سیلونی عورت سونے کے لالچ میں آ گئی۔ اس نے بوٹی اپنی ساڑھی کے پلو کے ساتھ باندھی اور کہنے لگی۔

"مگر سنیاسن! یہاں کوئی ایسا تہہ خانہ نہیں ہے جہاں میں بوٹی کو پندرہ دن کے لیے بند رکھوں۔" سنیاسن منگلی نے ایک نگاہ ادھر ادھر ڈالی اور کہا۔

"کیا یہاں کوئی تہہ خانہ نہیں؟ ہمارے ہاں تو ناریل کے اکثر گودام زمین کے اندر بنائے جاتے ہیں۔"

سیلونی عورت بولی۔

"ایک کوٹھری زمین کے نیچے ضرور ہے مگر وہ خالی نہیں۔" منگلی نے پوچھا۔

"تو کیا ہوا تم بوٹی ناریل میں ڈال کر اسے کسی کونے میں رکھ دینا تمہیں تو کوٹھری میں تھوڑی سی جگہ ہی چاہیے۔" سیلونی عورت نے کہا۔

"نہیں بہن اس تہہ خانے میں کوئی نہیں جا سکتا۔ مالک نے باہر سے تالا لگا کر پہرہ بٹھایا ہوا ہے۔" منگلی سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

"کیا وہ تہہ خانہ سامنے والے کیبن کے نیچے ہے؟"

سیلونی عورت نے آخری کیبن کی طرف اشارہ کیا جس کے درختوں میں سے اس وقت ایک پہرے دار شاٹ گن ہاتھ میں لیے سگریٹ کا دھواں اڑاتا چلا آ رہا تھا۔ اس کی نظر سیلونی ملازمہ کے پاس بیٹھی ایک جوگن ٹائپ عورت پر پڑی تو تیز تیز قدموں سے قریب آ کر بڑے رعب سے بولا۔

"کون ہے تو؟ یہاں کیوں آئی ہے؟" سنیاسن منگلی بھی آگے سے بڑے جلال کے ساتھ بولی۔

"خبردار ہمیں کچھ نہ کہنا ہم سنیاسی لوگ ہیں۔ کسی سے کچھ نہیں مانگتے۔ جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں کہو۔ تمہیں ایسی بوٹی دوں کہ سو سال تک جوان رہے؟"

پہرے دار گارڈ خود سیلونی تھا اور ان سنیاسی لوگوں کو جانتا تھا کہ یہ جڑی بوٹیاں فروخت کرتے ہیں اور بے ضرر لوگ ہوتے ہیں پھر بھی شہاب کا حکم تھا کہ اس علاقے میں کوئی غیر شخص داخل نہ ہو کیونکہ تیسرے کیبن کے تہہ خانے میں شیر خان قید تھا۔ گارڈ

نے سختی سے کہا۔

"چل اٹھ .... یہاں سے چلی جا اور پھر کبھی ادھر مت آنا۔ یہاں تیری بوٹیوں کی کسی کو ضرورت نہیں ہے۔"

سنیاسن منگلی کو جو کچھ معلوم کرنا تھا اس کا اشارہ اسے مل گیا تھا۔ تیسرے کیبن کے نیچے تہہ خانہ تھا۔ وہاں پہرہ بھی لگا تھا۔ ظاہر ہے شیر خان اسی تہہ خانے میں بند ہو گا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جھولا کاندھے پر ڈالا اور بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے واپس چل پڑی۔ اس کے جانے کے ساتھ ہی گارڈ سیلونی عورت پر برس پڑا کہ اس نے سنیاسن کو وہاں کیوں آنے دیا؟ سیلونی عورت معافیاں مانگنے لگی۔ اندر سے وہ بڑی خوش تھی کہ سونا بنانے والی بوٹی اس کے ہاتھ آ گئی ہے جو حقیقت میں ایک بیکار چیز تھی۔

منگلی وہاں سے سیدھی اپنی جھونپڑی میں آ گئی۔ اس کا باپ وہاں پہلے سے موجود تھا اور چاول پکا رہا تھا۔

"کہاں گئی تھی؟" اس نے منگلی سے پوچھا۔ منگلی نے منہ بنا کر کہا۔

"یہیں تھی۔" سنیاسی باوا کہنے لگا۔

"بیٹی! شیر خان کا خیال دل سے نکال دے میں اب بھی تمہیں یہی نصیحت کروں گا۔"

منگلی نے باوا کو بالکل نہ بتایا کہ وہ شیر خان کا پتا لگا آئی ہے۔ الٹا اداس لہجے میں بولی۔

"باوا! تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ شیر خان اب واپس نہیں آئے گا۔ ہمیں شہاب کے غنڈوں سے خوامخواہ کی دشمنی مول نہیں لینی چاہیے۔" سنیاسی نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"شاباش! اب تجھے سمجھ آ گئی ہے چل اب چاول ابال۔ میں کیلے کے پتے توڑ کر لاتا ہوں۔"

منگلی بڑی بے چینی سے اب رات کا انتظار کر رہی تھی آج رات اسے بجلی بن کر اسمگلروں کے بادشاہ شہاب کے ڈیرے پر ٹوٹنا تھا اور اپنے محبوب کو نکال کر لانا تھا۔ یہ جنگل کی رہنے والی جنگلی عورت کی محبت کا قدرتی تقاضا تھا۔ رات کو سنیاسی باوا تو جھونپڑی کے باہر سو گیا اور منگلی جھونپڑی میں چٹائی پر لیٹ گئی اس کے پاس گھڑی نہیں تھی جس سے ٹائم دیکھتی۔ اسے رات کا ہر گزرنے والا لمحہ جنگل سے گزرتے ہوئے ٹائم بتا دیتا تھا۔ وہ فضا میں سبزے کی مہک سونگھ کر معلوم کر لیتی تھی کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔

جو لوگ شہروں میں رہنے کے عادی ہیں وہ نہیں جانتے کہ جنگلوں میں شروع رات کی

فضا میں خاص طور پر مشرقی ایشیا کے جنگلوں کی فضا میں ہلکی ہلکی بے معلوم سی مرعوب گرماہٹ ہوتی ہے جوں جوں رات گہری ہوتی جاتی ہے۔ یہ گرماہٹ یا معمولی سا حبس کھلتا چلا جاتا ہے۔ آدھی رات کو جنگلی درختوں پر شبنم ٹپکنے لگتی ہے۔ یہ وہ شبنم ہوتی ہے جو نصف شب تک درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں پر جمع ہوتی رہتی ہے۔ شبنم کے ٹپکنے کی آواز بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے بوندا باندی ہو رہی ہو۔ رات کے پچھلے پہر شبنم گرنا بند ہو جاتی ہے اور جنگل کی فضا پھول پتوں اور جھاڑ جھنکاڑ کی خوشبو سے لبریز ہو جاتی ہے اور ہوا ٹھنڈی اور شبنمی ہو جاتی ہے۔ ہاں اگر بارش ہو رہی ہو تو معاملہ گڑ بڑ ہو جاتا ہے پھر کوئی جنگل کا رہنے والا جنگلی ہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس وقت رات کتنی گزر چکی ہے۔

جب باہر درختوں سے شبنم کے گرنے کی آواز آنے لگی تو منگلی چٹائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی اس نے زہر میں بجھی ہوئی بانس کی سوئیوں اور بانس کی نلکی کو کپڑے کے ایک چھوٹے سے تھیلے میں ڈال کر اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ کالی ساڑھی کو جو دھوتی کی طرح کی تھی اپنے جسم کے گرد اچھی طرح سے لپیٹا اور جھونپڑی کے دروازے پر لٹکتی لالٹین کی بتی نیچی کر کے جنگل کی طرف نکل گئی۔ جنگل سنیاسن منگلی کا بچپن کا ساتھی تھا۔ اس کا کوئی راز منگلی سے پوشیدہ نہیں تھا ۔ جس طرح جنگلی درندے انسان کی بو پا لیتے ہیں اسی طرح منگلی بھی جنگلی جانوروں کی بو دور سے محسوس کر لیتی تھی۔ اس علاقے میں سب سے زیادہ خطرہ سانپوں کا ہوتا ہے یہاں کے سانپ بڑے زہریلے ہوتے ہیں اس کا علاج منگلی نے یہ کیا تھا کہ شام کو نہانے کے بعد ایک خاص بوٹی کا تیل اپنے سارے بدن پر اچھی طرح مل لیا تھا اس تیل کی خاص بو کی وجہ سے سانپ کبھی قریب نہیں آتا تھا۔ اس قسم کے ٹوٹکے سنیاسیوں کے پاس عام ہوتے ہیں ہمارے لیے جنگل میں اندھیرا ہو سکتا ہے مگر منگلی اس اندھیرے میں ہر شے کی پرچھائیاں دیکھ رہی تھی۔ اسے ایک ایک درخت صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی تھیں۔ وہ اندھیرے جنگل میں رات کے وقت اطمینان کے ساتھ چلی جا رہی تھی منگلی کے ذہن میں ایک تناؤ ضرور تھا یہ اس کا اندازہ ہی تھا کہ شیر خان تیسرے کیبن کے نیچے جو تہہ خانہ ہے اس میں قید ہے اس اندازے کو تقویت یوں ملی تھی کہ منگلی نے اپنی آنکھوں سے وہاں پہرے دار کو دیکھا تھا اور سیلونی

عورت نے بھی کہا تھا کہ تہہ خانے میں کوئی نہیں جا سکتا۔

وہ اپنی محبت کے جوش میں چلی جا رہی تھی۔ جب وہ خفیہ اڈے کے قریب پہنچی تو تاڑ کے درختوں کے نیچے تیسرا کیبن اس کے سامنے تھا۔ وہ ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر غور سے دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں اسے ایک انسانی سایہ کیبن کے باہر ایک جگہ بیٹھا نظر آیا۔ منگلی چپ چاپ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ انسانی سایہ اٹھ کر کیبن کے سامنے ٹہلنے لگا۔ پھر کیبن کے پیچھے سے ایک اور انسانی سایہ نکل کر اس کے ساتھ آن ملا۔ اب دونوں باتیں کرتے ٹہلنے لگے۔ ان میں سے ایک نے سگریٹ سلگایا۔ لائیٹر کی روشنی میں منگلی صاف طور پر ان دونوں کے چہرے نہ دیکھ سکی۔ بہر حال وہ سمجھ گئی کہ یہ دونوں پہرے دار ہیں اور اسی کیبن کے نیچے کسی تہہ خانے میں وہ چیز قید ہے جس کی خاطر یہ پہرہ دے رہے ہیں اور وہ چیز سوائے شیر خان کے اور کون ہو سکتا تھا۔

شیر خان کے خیال سے منگلی کے سامنے اس کا گورا چٹا پختہ کار چوڑا چکلا مضبوط جسم لہرا سا گیا۔ منگلی ایک وحشی جنگلی عورت کی طرح بے سوچے سمجھے آگے بڑھنے لگی تھی کہ اس کی چھٹی حس نے وہیں روک دیا۔ سنیاسن کی عمر جنگل میں جڑی بوٹیوں کے درمیان ضرور گزری تھی مگر وہ ان جڑی بوٹیوں کو بیچنے شہر والوں کے پاس جاتی تھی اور یوں اس کے جنگل میں شہر داخل ہو چکا تھا یا اس کے جنگل کی فضا کو شہر نے متاثر کیا ہوا تھا۔ اتنی دور سے وہ دونوں میں کسی کو بھی زہریلی سوئی کا نشانہ نہیں بنا سکتی تھی۔ فاصلہ بھی زیادہ تھا اور وہ نشانے کی اتنی ماہر بھی نہیں تھی اس وقت منگلی کو افسوس ہوا کہ وہ اپنے اصلی جنگلی قبیلے سے بچھڑ کر بستیوں کے قریب کیوں آ گئی اور اس کا نشانہ کند ہو گیا اگر وہ اپنے اصلی جنگلی لوگوں میں ہی رہتی تو ظاہر ہے اپنے دشمنوں کو زہریلے تیروں سے مارتی رہتی اور اس کا نشانہ پختہ ہو چکا ہوتا۔ وہ ان پر حملہ کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔

بانس کی نلکی میں ایک زہریلی سوئی اس نے پہلے سے ڈال رکھی تھی اور نلکی اس کے سیدھے ہاتھ میں تھی۔ وہ اندھیرے میں جھک کر چلتی درختوں جھاڑیوں کے پیچھے سے ہوتی پہرے دار آدمیوں کے بائیں جانب آ گئی۔ منگلی کے پاؤں جھاڑ جھنکاڑ اور گھاس پتوں پر اسی طرح پڑ رہے تھے کہ کیا مجال ذرا سی بھی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو۔ شبنم کی وجہ سے ویسے بھی

گھاس گیلی تھی مگر اس پر گرے ہوئے پتے اور خشک ٹہنیاں آواز پیدا کر سکتی تھیں۔ وہ دونوں پہرے داروں سے کوئی دس پندرہ قدموں کے فاصلے پر تھی۔ یہاں سے بھی وہ زہریلی سوئی شوٹ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ ویسے بھی اگر وہ ایک کو ہلاک کرتی ہے تو ظاہر ہے دوسرا مزاحمت کے لیے ہوشیار ہو سکتا تھا اور شور مچا کر اپنے ساتھیوں کو بھی بلا سکتا تھا لیکن منگلی وقت بھی ضائع نہیں کر سکتی تھی۔ وہاں کوئی تیسرا پہرے دار بھی آ سکتا تھا۔ وہ اسی الجھن میں تھی کہ قدرت نے مہربان ہو کر اسے خود ایک موقع مہیا کر دیا۔ ایک پہریدار نے سنہالی میں اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور کیبن کی پچھلی طرف چلا گیا۔ شاید وہ شراب لینے گیا تھا کیونکہ منگلی نے سنہالی زبان میں شراب کا لفظ سن لیا تھا۔

اب ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی تھا جو نہی ایک پہریدار اکیلا رہ گیا منگلی ایک ہوشیار شیرنی کی طرح اپنے پنجوں اور پٹھوں کو کنٹرول میں رکھتے ہوئے آگے بڑھی۔ پہریدار کسی چیز پر بیٹھ گیا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا اگرچہ سانپ کے مہلک زہر والی بانس کی سوئی کپڑوں میں سے گزر کر بھی جسم میں زہر شامل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی لیکن منگلی چاہتی تھی کہ دشمن کے جسم کے کسی ننگے حصے پر حملہ کیا جائے۔ وہ ایک ایسی جگہ پر آکر رک گئی جہاں سے ایک قدم بھی آگے بڑھانے سے دشمن خبردار ہو سکتا تھا۔ کیبن کے باہر کوئی لالٹین بھی روشن نہیں تھی۔

پہریدار کا ہیولا منگلی کے سامنے کوئی پانچ قدموں کے فاصلے پر تھا۔ منگلی نے بانس کی نلکی اپنے منہ کے ساتھ لگائی۔ پہریدار کے جسم کا کوئی ننگا حصہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ چاروناچار اس نے دشمن کی گردن اور دونوں شانوں کے درمیان حصے کو نشانہ بنایا اور نلکی میں زور سے پھونک ماری۔ اسے ایسی ہلکی سی آواز سنائی دی جیسے نلکی میں سے کوئی شے باہر کو نکلی ہے۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں بیٹھے سگریٹ پیتے پہریدار پر جم گئی تھیں اچانک پہریدار کے جسم کا ہیولا پہلے ذرا سا بائیں جانب کو جھکا پھر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ منگلی اس کامیابی پر بڑی خوش ہوئی اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب اسے اپنے دوسرے شکار کا انتظار تھا جو شراب لینے گیا ہوا تھا۔ پہلا پہریدار ایک ایسا ٹارگٹ ثابت ہوا تھا جو ایک جگہ ساکت تھا۔ چنانچہ منگلی کو اسے آسانی سے ہٹ کرنے کا سنہری موقع مل گیا تھا۔ دوسرا ٹارگٹ یعنی آنے

والا دوسرا پہریدار ظاہر ہے اپنے ساتھی کو زمین پر بے ہوش دیکھ کر پہلے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرے گا پھر شور مچا کر اپنے ساتھیوں کو بلائے گا۔ اس حساب سے منگلی کے پاس صرف اتنا ہی وقت تھا جس دوران دوسرا پہریدار زمین پر گرے ہوئے اپنے ساتھی کو ہلاتا جلاتا ہے۔ اسی دوران دوسرے پہریدار کا جسم بھی حرکت میں ہوگا۔ اس لیے دوسرے پہریدار کو نشانہ بنانا خاصا مشکل تھا اور دوسرے پہریدار کو ہلاک کرنا پہلے پہریدار کو ہلاک کرنے سے زیادہ ضروری ہو گیا تھا۔

منگلی نے دوسری زہریلی سوئی نلکی میں ڈال دی تھی۔ ایک آسیبی خاموشی چاروں طرف جنگل میں چھائی ہوئی تھی۔ کسی نے کسی کا نام لے کر پکارا۔ منگلی کی آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں۔ دوسرا پہریدار ہاتھ میں بوتل لیے کیبن کی دیوار کے قریب سے نمودار ہو کر اپنے ساتھی کو بلاتا آ رہا تھا۔ اتنی دیر میں منگلی تین قدم آگے بڑھ کر پہلے پہریدار کی لاش کے قریب جھاڑی کے پیچھے چھپ گئی تاکہ دوسرے شکار کو نشانہ بنانے میں مزید آسانی پیدا ہو جائے۔ دوسرے پہریدار نے اپنے ساتھی کو زمین پر پڑے دیکھا تو جھک کر اسے آواز دے کر بلانے اور ہلانے جلانے لگا سانپ کا زہر بڑا ہی ہلاکت خیز تھا۔ منگلی کے قبیلے والے واقعی اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنے میں بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے خدا جانے کتنی قسم کے زہروں کو آپس میں ملا کر اسی شیشی میں بند کر رکھا تھا۔ حملہ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ دوسرا پہریدار جھک کر اپنے ساتھی کے دل کی دھڑکن کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ایک پہلو اس جھاڑی کی طرف تھا جس کے پیچھے منگلی چھپی ہوئی تھی اور جس کی ایک شاخ میں سے زہریلی سوئی والی نلکی ذرا سی باہر نکلی ہوئی تھی۔ دوسرے پہریدار نے بھی نائیلون کی پتلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جونہی دشمن ایک سیکنڈ کے لیے زد میں آیا منگلی نے پھونک مار دی۔ وہی پر اسرار آواز آئی اور زہریلی سوئی نلکی میں سے گزر کر دشمن کے بازو اور شانے کے درمیان گوشت میں اتنی ضرور اتر چکی تھی کہ اس نے زہر خون میں شامل کر دیا تھا۔ پہلے تو پہریدار کو یوں لگا جیسے اسے کسی مچھر نے کاٹا ہو اس نے بازو کو ذرا سا جھٹک دیا اور اپنے ساتھی کو اٹھا کر وہاں سے لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بے ہوش ہو

گیا ہے۔ اس نے اپنے ساتھی کی کمر میں بازو ڈال کر اسے اٹھایا ہی تھا کہ خود بھی اس کے اوپر گر پڑا۔

منگلی نے دل ہی دل میں اپنے قبیلے کے اس جنگلی جد امجد کو پرنام کیا جس نے یہ زہر اور زہریلی نلکی ایجاد کی تھی۔ نہ کوئی شور مچا نہ کوئی دھماکہ ہوا نہ کسی نے کسی کو آواز دی۔ نہ کوئی تڑپا اور دونوں دشمن خاموشی سے موت کی آغوش میں اتر گئے تھے۔ منگلی نے نلکی میں تیسری زہریلی سوئی ڈالی اور وہیں بیٹھے بیٹھے کوئی ایک ڈیڑھ منٹ انتظار کیا جب دوسرے پہریدار کے جسم نے بھی کوئی حرکت نہ کی تو وہ اٹھی۔ قریب جا کر ان دونوں لاشوں کو جھک کر دیکھا۔ پہلی والی لاش سے ایک عجیب غیرمانوس سی بو آنے لگی تھی۔ یہ سانپ کے زہر اور انسانی خون سے مل کر پھٹے ہوئے گوشت کی بو تھی۔ منگلی کیبن کی طرف دوڑ کر آئی۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا منگلی لاشوں کے پاس واپس آگئی۔ ان کی تلاشی لینے پر ایک کی پتلون کی پچھلی جیب میں سے چابی نکل آئی۔ منگلی نے آہستہ سے چابی لگا کر تالا کھولا۔ دروازے کا ایک پٹ ذرا سا اندر کو دھکیلا۔ اندر اندھیرا تھا کمرے میں داخل ہوتے ہی منگلی نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر لکڑی کے فرش پر تہہ خانے میں کھلنے والا تختہ تلاش کرنے لگی۔ ایک جگہ اس کا ہاتھ لوہے کی چادر پر پڑا اس نے اس کا کھٹکا کھینچ کر ایک جانب سے چادر کو اوپر اٹھا دیا۔ نیچے سے بوجھل ہوا کا ایک بھپکا سا اوپر کو آیا۔ منگلی نے آہستہ سے آواز دی۔

"شیر خان!"

نیچے سے کسی نے جواب نہ دیا۔ منگلی نے ٹٹولا تو زینہ نیچے جاتا تھا وہ زینہ اتر کر تہہ خانے میں آگئی۔ یہاں اس نے گھپ اندھیرے میں بھی ایک انسانی ہیولے کو دیوار کے پاس لیٹے دیکھ لیا۔ وہ جلدی سے قریب آگئی یہاں اس نے شیر خان کے جسم کی خوشبو محسوس کی۔ منگلی نے اسے جھنجوڑا۔

"شیر خان اٹھو۔" شیر خان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کون ہو؟" منگلی نے کہا۔

"میں منگلی ہوں۔ تمہیں یہاں سے نکالنے آئی ہوں۔"

شیر خان جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اب وہ پوری طرح سے اپنے ہوش و حواس میں تھا۔

"پہریدار کہاں ہیں؟" اس نے چٹائی پر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ منگلی نے کہا۔

"میں نے دونوں کو مار دیا ہے۔" شیر خان اس سنیاسن کی اس دلیری پر کچھ حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ وہ جلدی سے زینہ چڑھ کر اوپر والے کمرے میں آیا پھر وہاں سے دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ منگلی نے کہا۔

"وہ دیکھو دونوں کی لاشیں ایک دوسرے کے اوپر پڑی ہیں۔" شیر خان کی تیز نگاہیں اردگرد کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"صرف دو ہی آدمی تھے؟" اس نے منگلی سے دھیمی آواز میں پوچھا۔ منگلی نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

"میں نے صرف یہ دونوں ہی دیکھے تھے کسی اور کا مجھے پتا نہیں اب یہاں سے نکل چلو۔"

وہ دونوں کیبن سے نکلے اور دوڑ کر سامنے والے درختوں کے اندھیرے میں آگئے۔ منگلی نے شیر خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور اسے اپنے ساتھ تیز تیز چلا رہی تھی۔ شیر خان نے غصے میں اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔"

سنیاسن منگلی نے دل میں شیر خان کو اپنی زبان میں ایک فحش گالی دی اور دل ہی میں کہا کہ ظالم تیرا یہ جنگلی پن ہی تو مجھے پسند ہے۔ زبان سے منگلی نے کوئی بات نہ کی اور شیر خان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ آگے آگے جا رہی تھی شیر خان اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ شیر خان ان سارے راستوں سے واقف تھا جب وہ شہاب کے ڈیرے سے کافی آگے نکل آئے تو شیر خان نے ترش روئی سے کہا۔

"یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تمہیں کس الو کے پٹھے نے کہا تھا کہ مجھے نیند کی دوائی پلا دو اور اتنی دوائی پلا دی کہ شہاب کے آدمی مجھے باندھ کر لے گئے اور مجھے کچھ پتا نہ چل سکا۔ میں بے ہوش ہی رہا۔" منگلی نے اپنی غلطی مان لی اور معذرت کرنے لگی۔

"میں نے صرف تمہارے آرام کی خاطر ایسا کیا تھا لیکن غلطی سے دوائی زیادہ

دی۔ اچھا اب مجھے معاف کر دو۔" شیر خان نے غصے سے کہا۔

"تم بے وقوف ہو۔ سب عورتیں بیوقوف ہوتی ہیں۔" "شیر خان ایک جگہ رک گیا۔" شہاب نے میری بیٹی کو بھی اپنے اڈے پر کسی جگہ قید کر رکھا ہے میں اسے بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔" منگی کہنے لگی۔

"تمہاری بیٹی عائشہ یہاں نہیں۔"

"تو پھر کہاں ہے؟" منگی نے شیر خان کا بازو تھام لیا۔

"وہ لنکا کا بارڈر کراس کر کے انڈیا جا چکی ہے۔"

"کیا مطلب؟ شیر خان چونک سا گیا۔" وہ کیسے انڈیا چلی گئی؟ انڈیا کیوں گئی؟ منگی نے کہا۔

"میری بات ٹھنڈے دل سے سنو گے تو تمہارے پلے کچھ پڑے گا۔" شیر خان نے جھنجلا کر کہا

"عائشہ میرے بغیر انڈیا نہیں جا سکتی تھی۔ اسے تو بتا دیا گیا تھا کہ میں شہاب کی قید میں ہوں۔" منگی نے کہا۔

"نہیں .... یہی تو اصل بات ہے۔ عائشہ کو یہ نہیں بتایا گیا تھا بلکہ اس کو کسی نے بھگوان جانے کیوں یہ بتا دیا کہ تمہارا باپ شیر خان تمہاری تلاش میں مدراس چلا گیا ہے۔ اب تمہارے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ تم بھی مدراس چلی جاؤ تاکہ اپنے والد سے مل سکو۔"

"یہ بات اسے کس بدبخت نے کہی تھی؟" شیر خان نے غصیلی آواز میں پوچھا۔ منگی بولی۔

"مجھے کیا پتا کس بدبخت نے اسے یہ غلط اطلاع دی تھی مگر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جس کسی نے بھی تمہاری بیٹی کو تمہارے بارے میں غلط اطلاع دے کر خود عائشہ کو لنکا کا سمندر پار کروا کر انڈیا اسمگل کر دیا ہے وہ اسے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہو گا۔"

"مگر وہ آدمی کون ہے؟" شیر خان غصے میں تھا۔ منگی نے کہا۔

"اس آدمی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس آدمی کو بھی تمہارے کسی ایسے دشمن نے یہ اطلاع دی تھی جو تمہاری بیٹی کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تمہاری بیٹی کو قتل بھی کر سکتا تھا مگر نہیں اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ تمہاری بیٹی کا دشمن نہیں دوست تھا۔" شیر خان اپنے ماتھے کو ہاتھ سے دبانے لگا۔

"کیا واقعی میری بیٹی انڈیا چلی گئی ہے منگی؟" منگی کا شیر خان نے نام لیا تو اس کو بڑا اچھا لگا کہنے لگی۔

"ہاں شیر خان! میں نے خود اسے اپنے ایک ملنے والے کی حفاظت میں مدراس کی طرف روانہ کیا تھا۔"

اس کے ساتھ ہی منگی کو افسوس لگ گیا کہ اس نے شیر خان کو سچ بات کیوں بتا دی اس طرح سے تو وہ اس کے پاس نہیں رہے گا اور اپنی بیٹی کے پیچھے انڈیا چلا جائے گا۔ مگر منگی کی محبت جنگلی محبت تھی اور جنگلی محبت کرنے والے جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ ریاکاری سے کام نہیں لیتے۔ یہاں پہلی بار منگی نے بھکشنی جانکی کا نام لیا جس سے منگی دو دن پہلے مل چکی تھی اور جس نے اسے لنکا سے عائشہ کی انڈیا کو روانگی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا مگر منگی کے آگے یہ جھوٹ نہیں بولا تھا کہ عائشہ کا باپ شیر خان بھی مدراس جا چکا ہے۔ اس کے بارے میں جانکی نے منگی کو ہی کہا تھا کہ شیر خان سنا ہے زخمی ہو جانے کے بعد کسی جگہ روپوش ہے۔ منگی خاموش رہی تھی اس نے بھی جانکی کے آگے یہ راز نہیں کھولا تھا کہ شیر خان زخمی ہونے کے بعد اسی کے پاس تھا اور اس نے اس کی تیمارداری کی تھی۔ اور اب وہ خفیہ غار سے اغوا کر لیا گیا ہے۔ شیر خان کہنے لگا۔

"میں شہاب سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ مجھے تو اس نے ہی کہا تھا کہ عائشہ اس کے پاس ہے اور یہ کہ عائشہ نے ہی فیروز کو قتل کر دیا ہے۔" منگی نے کہا۔

"اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا تمہارے دوسرے دشمن فیروز کو تمہاری بیٹی نے ہی قتل کیا تھا۔ تمہاری باپ بیٹی کی پوری کہانی مجھے جانکی نے سنا دی ہے۔ میں نے بھی تمہیں سچائی سے کام لیتے ہوئے کسی فریب کے بغیر سارے واقعات بیان کر دیے ہیں حالانکہ مجھے تم سے جو محبت ہے اس کا تقاضا تھا کہ میں تمہیں یہ باتیں بیان نہ کرتی اور تمہیں یہی کہتی کہ تمہاری بیٹی لنکا میں ہی کسی جگہ روپوش ہے تاکہ تم زیادہ سے زیادہ وقت میرے پاس رہتے

مگر تمہاری محبت ہی نے مجھے تم سے سچ بولنے پر مجبور کیا ہے۔"

شیر خان پہلی بار منگلی کی زبان سے اعتراف محبت سن رہا تھا۔ اس نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ منگلی کے ان جذبات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

ہم نے بھی آپ کو ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ شیر خان کے غار میں سے اغوا ہونے کے بعد سنیاسن منگلی نے اپنے طور پر تفتیش کرتے ہوئے بودھ خانقاہ میں جا کر جانکی سے ملاقات کی تھی جس نے اسے عائشہ کے انڈیا جانے کے بارے میں ساری کہانی بیان کر دی تھی اور منگلی کو یہ بھی بتایا تھا کہ شیر خان اصل میں اپنی بیٹی کی تلاش اور شہاب فیروز گینگ سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے اور انہیں قتل کرنے آیا ہوا ہے۔ جانکی نے منگلی کو ارجنا کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ عائشہ کو لنکا سے نکلوانے کی ساری اسکیم اسی نے تیار کی تھی۔ اس نے منگلی کو یہ کہا تھا کہ میں عائشہ کی خیر خواہ ہوں اور چونکہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ عائشہ کی زندگی یہاں خطرے میں ہے اور اس کے باپ کا بھی کچھ پتا نہیں کہ وہ لنکا میں کس جگہ پر ہے اس لیے میں نے عائشہ کو اپنے ایک خاص آدمی کے ذریعے مدراس بھجوا دیا جہاں وہ ایک سرائے میں کچھ روز ٹھہرے گی کیونکہ اسے یہی کہا گیا ہے کہ اس کا باپ شیر خان بھی اس کی تلاش میں مدراس کی سرائے میں پہنچ چکا ہے۔ یہ ساری باتیں ہم اپنے قارئین کو پہلے بتا چکے ہیں لیکن ہم نے منگلی اور جانکی کی ملاقات اپنے قارئین سے ابھی تک چھپائے رکھی تھی۔ یہ ایک ہم نے بھی نیا تجربہ کیا ہے۔ یہ ایک نئی طرح کا سسپنس ہم نے آپ سے متعارف کروایا ہے۔ بہرحال اب ساری صورتحال آپ پر بھی واضح ہو چکی ہے۔

عائشہ جانکی کے ایک عزیز کے ساتھ مدراس کی طرف جا رہی ہے۔ شیر خان کو منگلی شہاب کی قید سے نکال لائی ہے۔ اس نے شیر خان کو بتا دیا ہے کہ اس کی بیٹی عائشہ انڈیا چلی گئی ہے اور جن حالات میں اسے انڈیا بھیجا گیا ہے وہ بھی منگلی نے شیر خان سے بیان کر دیے ہیں۔ شیر خان اور منگلی رات کے وقت جنگل میں ایک جگہ ذرا دم لینے کو بیٹھ گئے تھے۔ شیر خان اپنی بیٹی کے انڈیا چلے جانے سے خاصا پریشان تھا۔ منگلی نے کہا۔ "تم اس کی فکر نہ کرو کیونکہ عائشہ ایک بااعتبار آدمی کے ساتھ مدراس گئی ہے اور وہ ایک سرائے میں ٹھہری رہے گی کیونکہ اسے اس غلط فہمی میں مبتلا کیا گیا ہے کہ شیر خان بھی وہیں ہے۔" شیر

خان نے غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا۔

"یہ ساری اسکیم کس ذلیل آدمی نے تیار کی تھی؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

منگلی نے شیر خان کی اس اکھڑ طبیعت کے پیش نظر جانکی کا اس کے آگے نام نہیں لیا تھا وہ بولی۔

"اب اس شخص کا نام بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ آدمی خود بھی لنکا سے باہر جا چکا ہے۔" شیر خان اٹھ کھڑا ہوا۔ منگلی نے اس کے زخموں کے بارے میں پوچھا۔

"زخموں میں اب درد تو نہیں ہوتا نا؟ پھر بھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" شیر خان نے منگلی کو بازو سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔ منگلی کا جسم بھی لوہے کی طرح مضبوط تھا مگر شیر خان کی آہنی گرفت نے اس کے بازو کو بھی جیسے شل کر دیا۔

"میں شہاب کو قتل کیے بغیر ایک سیکنڈ کے لیے بھی آرام نہیں کروں گا۔ سمجھ گئی ہو تم؟ اور یہ جو تم محبت وغیرہ کی بات کر رہی تھیں۔ آئندہ ایسی بات مت کرنا میں کسی محبت وحبت کو نہیں جانتا۔"

منگلی نے آگے سے بالکل ترش روی سے جواب نہ دیا بلکہ یہی کہا کہ میرے ساتھ چل کر تھوڑی دیر آرام کرو پھر شہاب سے بھی انتقام لے لیں گے۔ منگلی شیر خان کو اب اپنی جھونپڑی میں لے آئی جہاں اس کا سنیاسی باپ پریشان بیٹھا تھا کہ اس کی بیٹی رات کے وقت کہاں چلی گئی ہے۔ اس نے منگلی کے ساتھ شیر خان کو دیکھا تو بڑا حیران ہوا۔ منگلی نے کہا۔

"باوا! میں اسے شہاب کی قید سے نکال لائی ہوں۔"

سنیاسی بوڑھا نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی ایک جرائم پیشہ شخص کے چکر میں پڑے۔ اس نے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ منگلی نے اپنے باپ کے شبہات کو ختم کرنے کے لیے کہا۔

"باوا! شیر خان انڈیا جا رہا ہے۔" شیر خان چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے غراتے ہوئے کہا۔

"مگر شہاب کو قتل کر کے جاؤں گا۔"

"ہاں .... وہ تو تم ضرور کرو گے۔ تمہیں اپنی بیٹی کا خیال نہیں جو پردیس میں ایک اجنبی ہندو کی سرائے میں تمہارے انتظار میں بیٹھی ہے اور تمہیں شہاب سے بدلہ لینے کی پڑی ہے۔" شیر خان نے جھنجلاہٹ سے اپنا سر دائیں بائیں جھٹکا اور بولا۔

"اس ذلیل عورت جانکی نے میری بیٹی کو یہاں سے مدراس کیوں بھیج دیا؟ میں اسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" منگلی نے کہا۔

"اس نے تمہاری بیٹی کی بھلائی کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہاں تمہاری بیٹی کی زندگی خطرے میں تھی۔ وہ کسی بھی وقت قتل ہو سکتی تھی۔" شیر خان دہاڑتے ہوئے بولا۔

"میری بیٹی شیرنی ہے۔ اس کو اتنی آسانی سے قتل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تم سب لوگوں نے مل کر ہمارے خلاف سازش کی ہے تم لوگ بھی میرے دشمنوں سے ملے ہوئے ہو۔" منگلی نے غصے سے کہا۔

"اگر میں تمہارے دشمنوں سے ملی ہوتی تو اپنی جان خطرے میں ڈال کر تمہیں قید خانے سے نکال کر نہ لاتی، وہاں تو تمہاری شیرنی بیٹی بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ایسی بات پھر مت کرنا میرے بارے میں۔" شیر خان غصے میں بڑبڑا تا رہ گیا۔ سنیاسی باوا نے کہا۔

"ٹھیک ہے یہ باتیں صبح کرلیں گے۔ ابھی سو جاؤ مگر شہاب کے آدمی شیر خان کو تلاش کرتے یہاں نہ آجائیں۔" منگلی نے کہا۔

"وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ انہیں ہماری اس جھونپڑی کا کوئی علم نہیں ہے۔ کل شیر خان کو میں کسی دوسری جگہ لے جاؤں گی۔"

شیر خان نے چٹائی پر لیٹ کر منہ دیوار کی طرف کر رکھا تھا۔ منگلی نے لالٹین بجھا دی اور اپنے باپ کو لے کر جھونپڑی سے باہر آگئی اور انہوں نے جھونپڑی کے باہر ہی رات گزار دی۔

جب دن نکلا تو شہاب کے تین سبز کیبنوں والے ڈیرے پر شور مچ گیا۔ دونوں پہریداروں کی لاشیں سانپ کے زہر کے اثر سے بے حد خراب ہو رہی تھیں اور تہہ خانے سے شیر خان غائب تھا۔ شہاب سر پکڑ کر بیٹھ گیا زندگی میں شاید پہلی بار وہ اپنے آپ کو شیر خان اور اس کی بیٹی کے آگے بے بس محسوس کر رہا تھا۔ ارجنا اس کے ساتھ تھا۔ شہاب نے منہ سے پھنکار کی سی آواز نکالتے ہوئے کہا۔"ارجنا! یہ کام شیر خان کی بیٹی کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔" ارجنا کیسے مان لیتا۔ اس کو تو معلوم تھا کہ شیر خان کی بیٹی لنکا سے جا چکی ہے مگر اس نے شیر خان کے شبہے کی تردید نہ کی۔ اس لیے کہ ارجنا کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ شیر خان کو کس نے فرار کرایا ہے وہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ شیر خان رہا ہونے کے بعد شہاب کو قتل کر دیتا وہ تو شہاب کو شیر خان کے ہاتھوں ہلاک ہوتا دیکھنا چاہتا تھا تاکہ اس قتل کی ذمے داری یا الزام ارجنا پر نہ آئے اور شہاب کے قتل کے بعد گینگ کے آدمیوں پر ارجنا کا اعتماد اور عزت بحال رہے۔ ارجنا کو صرف اس لیے شیر خان کے فرار کا افسوس ہوا تھا کہ وہ شہاب کو قتل کیے بغیر فرار ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"مگر دادا بھائی! شیر خان کی بیٹی کے متعلق میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں وہ یہاں سے انڈیا جا چکی ہے۔"

"بکواس کرتے ہو تم؟" شہاب غصے سے بپھر کر چلایا۔

ارجنا نے دل میں کہا اسی لیے تو میں شیر خان کے ہاتھوں تمہیں قتل کروانا چاہتا ہوں۔ شہاب کو پہلی بار اپنی زندگی شدید خطرے میں محسوس ہوئی۔ اسے ڈر لگا کہ اب دونوں باپ بیٹی آزاد ہو گئے ہیں اور اسے نہیں چھوڑیں گے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ شیر خان اکیلا ہے اور اس کی بیٹی لنکا سے نکل چکی ہے۔ اپنے دل کے خوف کا اظہار شہاب نے ارجنا پر بالکل ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ کچھ دنوں کے واسطے وہاں سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس نے ارجنا سے کہا۔

"ارجنا! ایک سودا طے کرنے کے لیے میرا کچھ دنوں کے لیے ہانگ کانگ جانا ضروری ہے۔ اگر نہ گیا تو کروڑوں ڈالر کا نقصان ہو جائے گا۔ میرے بعد تم میری جگہ رہ کر پیچھے تمام معاملات کا خیال رکھنا۔ اگر شیر خان یا اس کی بیٹی کا کوئی کھوج ملا تو ایک منٹ کی تاخیر کیے بغیر دونوں کو ہلاک کر ڈالنا۔ ان باپ بیٹی نے میرے کاروبار کو بھی تباہ کر دیا ہے۔ سارا وقت ان کے پیچھے بھاگتا رہتا ہوں میرے آدمی بھی گدھے ہیں۔ کوئی آکر انہیں آسانی سے مار کر اپنا بندہ نکال کر لے جاتا ہے۔ خیر میں یہ سودا نہیں چھوڑ سکتا۔ ہانگ کانگ سے ہو کر آجاؤں اگر میرے پیچھے تم لوگ ان دونوں باپ بیٹی کا کام تمام نہ کر سکے تو میں خود آکر ان سے نمٹ لوں گا۔"

شہاب نے ارجنا کو ڈیرے پر چھوڑا اور خود کھاڑی میں ساحل کے ساتھ لنگر انداز ایک چھوٹے اسٹیمر میں بیٹھ کر پورٹ پیڈرو کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں بھی اس نے اپنے

آدمیوں کو یہی بتایا کہ میں ہانگ کانگ جا رہا ہوں اور اسی روز تیسرے پہر وہ جافنا سے ایک ریل گاڑی کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں سوار ہو کر کولمبو کی طرف چل دیا۔ کولمبو اس نے اپنے آدمی کو فون کر دیا تھا۔ اس نے رات بارہ بجے کی فلائٹ میں شہاب کی سیٹ ریزرو کروا دی تھی۔ یہ جہاز برٹش ائرویز کا تھا اور کولمبو سے کلکتہ ہوتا ہوا بمبئی اور آگے لندن جا رہا تھا۔ شہاب کی منزل کلکتہ تھی جہاں اس کا ایک جرائم پیشہ گہرا دوست رہتا تھا۔ شہاب کچھ وقت کلکتے میں اپنے دوست کے پاس سکون سے گزارنا چاہتا تھا جہاں اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ کلکتے میں بیٹھ کر پرسکون دماغ کے ساتھ اور اپنے دوست کے مشورے سے شیر خان اور اس کی بیٹی کو ختم کرنے کے بارے میں کوئی منصوبہ بھی تیار کرے گا۔ کولمبو ائرپورٹ پر شہاب نے اپنے آدمی کو خاص طور پر ہدایت کر دی تھی کہ وہ سب کو یہی بتائے کہ شہاب ہانگ کانگ گیا ہے۔

شیر خان نے اسی رات شہاب کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا اور منگلی کی جھونپڑی میں اسے سوتا چھوڑ کر اٹھا اور شہاب کے اڈے کی طرف چل پڑا اس کے پاس سوائے ایک خنجر کے دوسرا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ منگلی نے اپنے زہریلے تیروں والے روایتی ہتھیار کا راز شیر خان پر ظاہر نہیں کیا تھا وہ کسی اجنبی کو یہ راز نہیں بتا سکتے تھے۔ شیر خان یا میں نہیں یا شہاب نہیں کا جذبہ لے کر رات کی تاریکی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

شیر خان کے لیے بھی یہ جنگل اور اس جنگل کے راستے اجنبی نہیں تھے۔ انہی جنگلوں میں اس نے اپنی پیاری محبوبہ اور بیوی روبی کے ساتھ لڑکپن اور پھر جوانی کے دن گزارے تھے۔ ان ہی جنگلوں میں شیر خان نے کئی جرائم پیشہ لوگوں کو ہلاک بھی کیا تھا اور خود بھی کئی بار زخمی ہوا تھا اور ہلاک ہوتے ہوتے بچا تھا۔ وہ شہاب کے دونوں ٹھکانوں سے واقف تھا۔ ابھی وہ پہلے والے اڈے کے احاطے میں داخل ہی ہوا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کا نام لے کر کہا۔

"شیر خان تم ہو کیا؟"

سنہالی زبان میں ادا کیے گئے جملے پر شیر خان نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ آواز اسے مانوس لگی تھی۔ اندھیرے میں سے ارجنا نکل کر سامنے آگیا۔ آتے ہی بازو پھیلا دیے۔

"میرے دوست شیر خان!" شیر خان ابھی تک ارجنا کو اپنا دوست ہی سمجھتا تھا۔ ارجنا نے کیا چکر چلایا ہوا تھا اس کا شیر خان کو علم ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ خنجر ابھی تک شیر خان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ارجنا کے قریب آ کر کہا۔

"ارجنا اگر تم میرے دوست ہو تو مجھے صرف اتنا بتا دو کہ شہاب کہاں ہے؟"

ارجنا کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ جب شہاب اسے ہانگ کانگ ضروری کام پر جانے کا کہہ کر کولمبو روانہ ہوا تھا تو اسے شہاب کے بیان پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے کولمبو میں شہاب کے خاص آدمی کو بھی ساتھ ملا لیا تھا۔ ارجنا نے فوراً کولمبو میں اس آدمی کو فون پر ہدایت کی کہ شہاب جہاں جا رہا ہے اس بارے میں مجھے اطلاع کرنا۔ رات کے بارہ بجے شہاب نے کلکتے کی طرف پرواز کی اور اگلے روز اس خاص آدمی نے جس پر شہاب کو بڑا بھروسہ تھا ارجنا کو اطلاع کر دی کہ شہاب ہانگ کانگ نہیں بلکہ کلکتے گیا ہے۔ جہاں وہ کچھ روز رہے گا۔ چنانچہ جب شیر خان نے ارجنا سے شہاب کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے صحیح صورتحال سے اسے باخبر کر دیا اور کہا۔

"میرے دوست شیر خان! تمہیں میں اندھیرے میں نہیں رکھ سکتا۔ اگرچہ شہاب نے یہاں سب کو یہی بتایا ہے کہ وہ ہانگ کانگ جا رہا ہے لیکن میری سی آئی ڈی نے بھی مجھے اطلاع کر دی ہے کہ وہ کلکتے میں اپنے دوست جھترو کے پاس گیا ہے۔"

شیر خان کو یہ سن کر سخت مایوسی ہوئی۔ اس نے خنجر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ دونوں وہیں اندھیرے میں گھاس پر بیٹھ گئے۔ ارجنا کہنے لگا۔

"یہاں تو اب وہ شاید پندرہ بیس دن کے بعد آئے۔ وہ جاتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ میں واپس آ کر شیر خان کو جہاں بھی وہ چھپا ہو گا تلاش کر کے خود گولی سے اڑاؤں گا۔"

ارجنا جان بوجھ کر شیر خان کو بھڑکانا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ شہاب کے تعاقب میں کلکتہ جا کر اسے ختم کر دے۔ کیونکہ یہی شیر خان ایک ایسا شخص تھا جو شہاب کو قتل کر سکتا تھا اور ارجنا قتل کے الزام سے محفوظ بھی رہ سکتا تھا۔ شیر خان نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

"ارجنا! وہ بزدل ہے۔ وہ مجھ سے ڈر کر بھاگا ہے مگر میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ میں کل کلکتے روانہ ہو جاؤں گا۔ میری بیٹی میری تلاش میں مدراس پہنچ چکی ہے۔ میں سب

سے پہلے اپنی بیٹی سے ملوں گا۔ پھر شہاب سے انتقام لینے کلکتے جاؤں گا۔ ارجنا! شہاب کو قتل کرنے کے بعد میں یہاں واپس نہیں آسکوں گا مگر تمہیں شہاب کے قتل کی خبر مل جائے گی۔ اب میں چلتا ہوں۔" ارجنا نے کہا۔

"کیا تم سمندر میں سے نکل جاؤ گے؟" شیر خان طنزیہ مسکرایا۔

"ارجنا تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں وہ سمندری خفیہ راستے بھی جانتا ہوں جہاں سے شاید ہی کوئی اسمگلر انڈیا گیا ہو۔ تم فکر نہ کرو میرا راستہ کوئی نہیں روک سکے گا۔"

شیر خان ارجنا سے گلے مل کر واپس جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔

شیر خان ارجنا سے گلے مل کر واپس جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ اگلے دن شیر خان نے منگلی کے ذریعے بھی دو تین جگہوں سے شہاب کے بارے میں پتا کرایا۔ اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ شہاب وہاں نہیں ہے۔ تب شیر خان نے منگلی سے کہا۔

"میں آج رات کے پچھلے پہر جافنا سے سمندر پار کر کے انڈیا چلا جاؤں گا۔" منگلی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ شیر خان جانتا تھا کہ یہ سنیاسن اس سے محبت کرنے لگی ہے مگر وہ اس سے بالکل محبت وغیرہ نہیں کرتا تھا۔ شیر خان نے زندگی میں صرف ایک عورت سے اس قسم کی محبت کی تھی اور وہ روبی اس کی بیوی تھی۔ سنیاسن منگلی کی خدمت گزاری کا وہ احسان مند ضرور تھا۔ چنانچہ اس نے منگلی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے اور تمہارے باوا نے میری جس طرح سے تیمارداری کی اور مجھے موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا میں اسے کبھی نہیں بھلاؤں گا۔" منگلی زیر لب مسکرائی کہنے لگی۔

"یہ تو ہم سنیاسی لوگوں کا دھرم ہے۔"

شیر خان خود بھی بات کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسی رات وہ منگلی اور اس کے باپ کا آخری بار شکریہ ادا کر کے وہاں سے جافنا کی جانب روانہ ہو گیا۔ جافنا وہ راتوں رات پہنچ گیا۔ یہاں سے ایک اسٹیمر میں سوار ہو کر رامیشورم کے جزیرے پر آگیا۔ اس مقام سے اس سمندر کی وہ مختصر سی ابنائے عبور کرنی تھی جو انڈیا اور سری لنکا کے درمیان حائل ہے۔ تامل ٹائیگرز کی دہشت گردیاں بڑے عروج پر تھیں۔ چنانچہ یہاں بڑی سختی تھی۔ لیکن شیر خان تمام خفیہ ذرائع سے واقف تھا۔ اس کے پاس اتنا روپیہ تھا جس سے وہ یہ سمندر پار کر سکتا تھا۔ روپے کے لالچ میں یہاں سب کام ہو جاتے تھے۔ وہ ایک ایسے آدمی

سے ملا جس نے شیر خان سے صرف پانچ سو روپے لے کر اسے کشتی میں آبنائے پار کروا کر انڈیا کے ساحل پر پہنچا دیا۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں بیان کیا تھا کہ شیر خان باقاعدہ پاسپورٹ ویزے کے ساتھ لنکا میں داخل ہوا تھا مگر اس پاسپورٹ پر انڈیا کا ویزہ نہیں لگ سکا تھا۔ اس کے پاس ٹریولز چیک بھی تھے جس کے واسطے شیر خان نے کراچی میں ہی کافی زرمبادلہ جمع کروا دیا تھا۔ اور کولمبو سے بھی کچھ زرمبادلہ خرید کر اپنے حساب میں جمع کروا دیا تھا۔ انڈیا کے ساحل پر پہنچنے کے بعد صرف اسے ایک ہی تشویش تھی کہ کسی نے اسے چیک کر لیا تو وہ بغیر ویزے کے انڈیا میں داخل ہونے والے پاکستانی کی حیثیت سے گرفتار ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا پاسپورٹ پاکستانی تھا اور پاسپورٹ پر بھی اس کے نام کے آگے پاکستانی شہریت درج تھی۔ ایک خیال اسے آیا کہ اپنا پاسپورٹ ضائع کر دے اور ہندوستانی مسلمان کے طور پر سفر کرے۔ کیونکہ یہ بات سب کے علم میں تھی کہ جالندھر وغیرہ میں کئی پنجابی مسلمان آباد ہو گئے ہیں۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو مالیر کوٹلہ میں فسادات کے دنوں میں رہ گئے تھے ان کی اب اگلی نسل جالندھر لدھیانہ وغیرہ میں آباد تھی اور چھوٹا موٹا کاروبار کرتی تھی۔ پنجاب کے سکھوں کا ان کے ساتھ بڑا اچھا سلوک تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے پاسپورٹ ضائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جنوبی ہند کے اس علاقے میں شیر خان اپنی نوجوانی کے زمانے میں کئی بار سفر کر چکا تھا۔ اگرچہ یہاں بھی آبادی بڑھ گئی تھی اور کئی نئی بستیاں آباد ہو چکی تھیں مگر ریل گاڑیاں ابھی تک اسی طرح چلتی تھیں۔ اس کی پہلی منزل مدراس تھی جہاں اس کی اطلاع اور جانکی کے بیان کے مطابق اس کی بیٹی عائشہ اسٹیشن والی سرائے کے مالک مورتی کے یہاں ٹھہری اس کا انتظار کر رہی تھی۔

شیر خان کا لباس پاکستانی لباس نہیں تھا۔ وہ پتلون بش شرٹ میں ملبوس تھا جو وہاں کا عام پہناوا ہے۔ اس کے پاس کوئی خنجر یا پستول بھی نہیں تھا۔ یہ چیزیں اس نے لنکا میں ہی رہنے دی تھیں۔ کیونکہ ان کا بندوبست انڈیا میں کسی کو روپے دے کر کیا جا سکتا تھا۔ [illegible] کے بینک سے شیر خان نے ٹریولر چیک کے ذریعے جو کرنسی نکلوائی تھی وہ اس نے سمندر عبور کرنے سے پہلے ہی انڈین کرنسی میں تبدیل کروا لی تھی۔ یہ کافی رقم تھی۔ [illegible]

کی شکل میں شیر خان نے کپڑے میں ڈال کر اپنی کمر کے گرد باندھ رکھی تھی۔ کچھ روپے اس کی جیب میں تھے۔ یہاں سے وہ مدراس جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔

شیر خان کو مدراس ایکسپریس میں چھوڑ کر ہم مدراس کی سرائے میں چلتے ہیں جہاں اس سے پہلے شیرنی پہنچ چکی تھی۔

عائشہ شیرنی نے سر کے بالوں کی شیو بند کر دی تھی۔ کیونکہ انڈیا میں بدھ مت کی بھکشو عورتیں بالوں کو مونڈنے کی بجائے سر پر رومال باندھے رکھتی تھیں۔ جس وقت شیرنی مدراس ریلوے اسٹیشن والی سرائے کے پتے پر پہنچی تو ارجنا کے بااعتبار دوست مورتی نے اس کا خیر مقدم کیا ایک خفیہ پیغام کے ذریعے مورتی کو ارجنا نے خبر کر دی تھی کہ عائشہ کو یہی کہا جائے کہ اس کا باپ شیر خان آیا تھا مگر دو روز رہ کر جموں کی طرف چلا گیا ہے۔ چنانچہ مورتی نے عائشہ شیرنی کو یہی بیان کر دیا۔ شیرنی سخت پریشان ہوئی کہ اس کے ڈیڈی بیٹی کا انتظار کیے بغیر وہاں سے چل دیے۔ کیونکہ عائشہ کو یہی کہا گیا تھا کہ اس کا باپ مدراس کی سرائے میں اس کی راہ دیکھ رہا ہے۔ شیرنی جب مدراس مورتی کے پاس پہنچی تو اس نے یہ کہہ کر آگے کی طرف روانہ کر دیا شیرنی تھوڑی دیر پریشان تو ہوئی مگر وہ وقت ضائع کیے بغیر جموں کی طرف روانہ ہو گئی۔

جس روز لنکا سے شیر خان چلا اسی روز سرائے کے مالک کو ارجنا کا خفیہ پیغام ملا۔ اس پیغام میں مورتی کو بتایا گیا تھا کہ عائشہ کا ڈیڈی شیر خان بھی اپنی بیٹی کی کھوج میں اس کے پاس آ رہا ہے۔ خبردار عائشہ کے باپ کو یہ ہرگز نہ بتایا جائے کہ اس کی بیٹی جموں گئی ہے۔ بلکہ اسے یہ کہا جائے کہ وہ کلکتے چلی گئی ہے۔ اس پیغام سے ارجنا کا مقصد صرف اتنا تھا کہ شیر خان کو جموں جانے سے روکا جائے اور اسے کلکتے کی طرف دھکیل دیا جائے جہاں شہاب پہلے سے موجود تھا۔ یوں شیر خان اسے قتل کر سکتا تھا۔ یہی ارجنا کی زندگی کی اس وقت سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی طریقے سے شہاب شیر خان کے ہاتھوں قتل ہو جائے۔ اور اس کی کامیابیوں کے راستے کا سب سے بڑا پتھر شیر خان کے ہاتھوں اکھاڑ پھینکا جائے۔

شیر خان بھی مدراس شہر پہنچ گیا۔ وہ سیدھا ارجنا کے دوست مورتی کی سرائے میں آ گیا۔ مورتی سے ملاقات ہوئی تو شیر خان نے سب سے پہلا سوال اپنی بیٹی کے بارے میں

کیا۔

"وہ کہاں ہے؟"

مورتی نے ارجنا کی ہدایت کے مطابق شیر خان کو بتایا کہ بیٹی وہاں آئی ضرور تھی مگر دو دن ٹھہرنے کے بعد چلی گئی تھی۔ شیر خان بھی سخت پریشان ہوا کہ عائشہ اپنے باپ کا انتظار کئے بغیر وہاں سے کیوں چل دی۔ اس نے مورتی سے پوچھا۔

"وہ کدھر گئی ہے کیا تم بتا سکتے ہو؟" مورتی کہنے لگا۔

"بیٹی نے میرے پوچھنے پر صرف اتنا ہی کہا تھا کہ میں کلکتے جا رہی ہوں۔ وہاں ڈیڈی کا ایک دوست ہے۔ شاید ڈیڈی اس کے پاس گئے ہیں۔"

شیر خان سخت الجھن میں تھا۔ صورت حال ایک عجیب گورکھ دھندے کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کی اطلاع درست ہے۔ کس کا بیان صحیح ہے اور کون کدھر گیا ہے۔ اس کو بہرحال مورتی کے بیان پر یقین کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے کلکتے ہی کی طرف جانا تھا۔ سوچا کہ ہو سکتا ہے عائشہ بیٹی چاند چچا کے ہاں جا کر ٹھہر گئی ہو۔ چاند چچا کا کلکتے میں پان بیڑی کے پتے کا چھوٹا سا کاروبار تھا اور شیر خان اکثر اس کا ذکر عائشہ کے سامنے کیا کرتا تھا ایک بار شیر خان نے عائشہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ چاند چچا کی دکان ہارلے اسٹریٹ کولوٹولہ میں ہے۔

شیر خان نے ایک رات بھی مدراس میں قیام نہ کیا۔ اور اسی دن بنگال جانے والی ریل گاڑی میں سوار ہو کر کلکتے کی طرف روانہ ہو گیا۔ روبی اپنے باپ شیر خان کے برعکس بغیر پاسپورٹ کے سفر کر رہی تھی۔ اس نے اپنا نام پھر سے وہی ساوتری رکھ لیا تھا۔ بھکشوؤں کے بھیس کی وجہ سے اسے ریلوے کا ٹکٹ بھی نہیں لینا پڑ رہا تھا۔ تھوڑے سے پیسے اس نے بچا کر رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس کے کھانے پینے کے کام آ رہے تھے۔ اکثر ریلوے اسٹالوں پر اس سے چائے روٹی کے دام وصول نہیں کئے جاتے تھے۔

دوسری طرف شیر خان دو دن کے سفر کے بعد کلکتہ پہنچ کر سیدھا ہارلے اسٹریٹ میں چاند چچا کی دکان پر پہنچا۔ ایک مدت بعد شیر خان کو دیکھا تو چاند چچا پہلے تو پہچان ہی نہ سکا۔ وہ خود بوڑھا ہو گیا تھا۔ پھر جب پہچانا تو شیر خان کو گلے لگا لیا اور بولا۔

"شیر خان! اتنی مدت بعد تم کہاں سے آ گئے میرے بیٹے۔"

شیر خان کی چاند چچا کے ساتھ ہمیشہ سے بڑی گہری دوستی رہی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے ہمراز بھی رہے تھے۔ سفر کی تھکان اتارنے کے بعد دونوں بیٹھک میں بیٹھ گئے اور شیر خان نے ساری کہانی چاند چچا کو بیان کر دی اور پھر بیٹی عائشہ کا پوچھا۔ چاند چچا کہنے لگا

"شیر خان! یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تمہاری بیٹی میرے پاس آتی اور میں آتے ہی تمہیں اس کے بارے میں نہ بتاتا۔"

شیر خان کو دوبارہ پریشانی نے گھیر لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ مسلسل غلط بیانی سے کیوں کام لیا جاتا رہا ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے عائشہ ابھی سفر میں ہو یا راستے میں اسے کوئی واقعہ پیش آ گیا ہو۔ اس نے چاند چچا سے شہاب کی بات کی۔ چاند شہاب کو جانتا تھا۔ بلکہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں وہ کسی زمانے میں شہاب کے اسمگلنگ کے کاروبار میں برابر کا شریک رہ چکا تھا۔ چاند چچا بولا

"مجھے معلوم نہیں کہ شہاب یہاں ہے۔ مگر میں پتہ کروا دوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

شیر خان نے چاند چچا کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ شہاب کے قتل کا ارادہ لے کر وہاں آیا ہے۔ رات کو دونوں پرانے دوست آپس میں پرانے دنوں کی باتیں کرتے رہے۔ چاند چچا نے شیر خان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے آپ کو پاکستانی کی بجائے ہندوستانی ہی ظاہر کرے اور کوئی پوچھے تو یہی کہے کہ وہ لدھیانے سے چچا کو ملنے آیا ہے۔ شیر خان رات کو دیر تک نہ سو سکا۔ اسے بیٹی کا خیال پریشان کئے ہوئے تھا کہ خدا جانے وہ کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔ اگرچہ اسے عائشہ پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ اپنی حفاظت کر سکتی ہے پھر بھی اپنی بیٹی کی طرف سے شیر خان کو ایک مسلسل تشویش لگی ہوئی تھی۔ چاند چچا نے اگرچہ اسمگلنگ کا دھندا ایک عرصہ ہوا چھوڑ رکھا تھا لیکن اس پیشے سے تعلق رکھنے والے اور شہر کے دوسرے جرائم پیشہ لوگ اب بھی کبھی کبھی چاند چچا کے پاس آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی شیر خان کو نہیں جانتا تھا۔ چاند چچا نے شیر خان کا سب سے یہی کہہ کر تعارف کرایا کہ یہ میرا دوست شیرا ہے اور لدھیانے سے مجھے ملنے آیا ہے۔ کسی شخص نے بھی شیر خان میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی نہیں لی تھی۔ ان میں دھنی رام ایک بدمعاش ٹائپ کا

تھا۔ چاند چاچا نے اس کی ڈیوٹی لگائی کہ شہر کے جتنے بدمعاشوں اور جرائم پیشہ افراد کے اڈے ہیں ان کا چکر لگائے اور معلوم کرے کہ لنکا سے کسی کے ہاں کوئی مہمان آیا ہوا ہے کہ نہیں۔

پہلی قسط میں ہم نے شہاب کو وہاں چھوڑا تھا جہاں وہ اپنے ساتھی ارجنا کو یہ کہہ کر کولمبو سے روانہ ہوا تھا کہ وہ ایک ضروری سودا طے کرنے ہانگ کانگ جا رہا ہے دراصل وہ شیرنی کی لنکا میں موجودگی کے ڈر سے گھبرا کر کلکتے اپنے ایک خاص بدمعاش اور کلکتے کے بدنام اور ہسٹری شیٹر بدمعاش بھاشو کے پاس جا رہا تھا۔ شہاب کو یہ خبر نہیں تھی کہ شیرنی بھی لنکا سے مدراس اور وہاں سے جموں شہر کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔ اس پر شیرنی کا خوف بیٹھ گیا تھا۔ وہ شیر خان سے زیادہ شیرنی سے خوف زدہ تھا۔ شیرنی کے ہاتھوں اپنے کئی آدمیوں کے قتل کے بعد شہاب کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ شیرنی کا پنجہ اس کی گردن پر پڑنے ہی والا ہے اس کے اعصاب اور اس کا ذہن جواب دے چکے تھے۔ ایسے میں اس کی مدد کرنے والا اور اسے حوصلہ دینے والا اس کا ساتھی فیروز بھی نہیں تھا۔ چنانچہ شہاب نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ان سب جھنجھٹوں سے الگ ہو جائے اور کلکتہ اپنے دوست بھاشو کے پاس کچھ دن رہ آئے۔ وہاں بیٹھ کر وہ اپنے طور پر شیر خان اور خاص طور پر اس کی بیٹی عائشہ شیرنی کو اپنے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹانے کے بارے میں کوئی نیا پلان بھی تیار کر سکے گا۔

چاند چاچا کلکتے میں شہاب کی کھوج پر لگا دیا اور خود بھی شہر کے بدنام اڈوں کے چکر لگانے لگا۔ ایک روز وہ بھاشو کے اڈے پر بھی جا پہنچا۔

بھاشو چاند چاچا کو جانتا تھا۔ اس وقت شہاب بھاشو کے ساتھ اندر بیٹھا چائے پیتے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے بھی اپنے جگری دوست بھاشو کو سب کچھ بتا دیا تھا کہ شیر خان اور اس کی بیٹی اسے قتل کرنے کے واسطے اس کے پیچھے لگے ہیں اور اس پر کئی قاتلانہ حملے بھی ہو چکے ہیں۔ اس کے جواب میں بھاشو نے شہاب کو یہ کہہ کر تسلی دی تھی کہ یہاں شیر خان کا باپ بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اگر آیا بھی تو اس کی لاش کے ٹکڑے کر کے دریائے ہگلی میں پھینکوا دوں گا۔ جب شہاب نے چاند چاچا کو بھاشو کے اڈے میں داخل ہوتے کھڑکی میں

سے دیکھا تو بھاشو کے منہ پر فوراً ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کہا۔

"بھاشو چاند چاچا کو پتہ نہ چلے کہ میں یہاں پر ہوں۔ مجھے دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔"

بھاشو نے مسکرا کر کہا۔

"ابھی پتہ کر لیتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔" بھاشو کمرے سے باہر نکل کر چاند چاچا سے ملا اور پوچھا۔

"کہو چاچا آج ادھر کیسے آنا ہوا۔ تم تو اب شریف آدمی بن گئے ہو۔ یہ بدمعاشوں کے ڈیرے پر کس لیے آ گئے؟" چاند چاچا لوہے کی کالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیڑی نکال کر سلگائی اور بولا۔

"ارے بھاشو میاں۔ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا چاچا۔ کیا پھر سے پرانا دھندا شروع کرنے کا ارادہ ہے۔"

بھاشو چاند چاچا کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ چاند چاچا کہنے لگا۔

"بھاشو میاں! بیڑی تمباکو کے کاروبار میں کچھ نہیں بچتا۔ سارا منافع اوپر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے سیٹھ لے جاتے ہیں بک بک زیادہ ہے۔" بھاشو نے ہنس کر کہا "چاند چاچا اب تو یہی کام تمہارے لیے اچھا ہے۔" چاند چاچا تو شہاب کی سو لینے آیا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"بھاشو! وہ دن بڑے اچھے تھے جب میں لنکا میں شہاب، فیروز کے ڈیرے پر کام کیا کرتا تھا۔ ہر وقت جیبوں میں نوٹ رہتے تھے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شہاب فیروز کے پاس واپس چلا جاؤں۔" بھاشو نے کہا۔

"چاچا! اب تمہاری وہ عمر نہیں ہے۔ جہاں بیٹھے ہو بس وہیں بیٹھے رہو۔ اب تو تم چھاپہ پڑنے پر بھاگ بھی نہیں سکو گے۔" چاند چاچا ہنس کر کہنے لگا۔

"ہاں میاں! یہی سوچ کر چپ ہو رہتا ہوں۔ ویسے بھاشو شہاب، فیروز تمہارے گہرے یار ہیں۔ ان سے کہہ کر مجھے کلکتے میں کوئی چھوٹا سا ٹھیکہ دلا دو۔"

شہاب کمرے میں ادھ کھلی کھڑکی سے لگا چاند چاچا کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ چاند خاص طور پر اس کا ذکر کیوں لے آیا ہے۔ بھاشو بولا۔

"چاچا یہ کام تو میں بھی تمہیں دے سکتا ہوں مگر تم سے ہو گا نہیں۔ اسے بھول جاؤ۔"

بیڑی تمباکو میں ہی لگے رہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بھاشو میاں۔" یہ کہہ کر چاند چچا خاموشی سے بیڑی کے کش لگانے لگا۔ شہاب نے کھڑکی کی جھری میں سے دیکھا کہ چاند چچا بڑی مشتبہ نظروں سے اڈے کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔

"سنا تھا کہ شہاب اور فیروز کلکتے آنے والے ہیں۔ پر ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی کیا تمہارے پاس آئے تھے۔" بھاشو ذرا سا چونکا۔ پھر فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔

"ان کا بڑا کاروبار ہے وہاں۔ کہاں فرصت ملتی ہے ان لوگوں کو ادھر آنے کی۔" چاند اٹھنے لگا تو بھاشو نے اسے تاڑی شراب سے بھرا ہوا گلاس پیش کیا۔" چچا میں تو اس وقت یہی خاطر کر سکتا ہوں۔" چاند چچا نے ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھاشو! یہ چیزیں میں نے چھوڑ دی ہیں اب دوبارہ ان میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اچھا چلتا ہوں۔ آج تم سے ملنے کو بڑا دل چاہ رہا تھا۔ مل لیا۔ دل خوش ہو گیا۔" بھاشو مسکراتا رہا۔ چاند چچا چلا گیا تو شہاب کمرے میں آ گیا۔ شہاب کچھ پریشان پریشان تھا کہنے لگا۔

"بھاشو! مجھے شک ہے۔"

"کس بات کا؟" بھاشو نے پوچھا شہاب بولا۔

"چاند چچا میری کھوج میں یہاں آیا تھا۔" بھاشو گردن کو اثبات میں ہلانے لگا۔

"مگر شہابو تم پیچھے تو سب کو یہی بتا کر آئے ہو کہ تم ہانگ کانگ جا رہے ہو۔ چاند کو یہاں کا کیسے پتا چل گیا؟"

"یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ بہر حال تم اپنا ایک آدمی اس کے پیچھے لگا دو جو اس کی مکان کی نگرانی کرے اصل بات کیا ہے؟" بھاشو دلیر ٹائپ بدمعاش تھا۔ کہنے لگا۔

"تم تو خواہ مخواہ گھبرا رہے ہو۔ کیا بات ہے شہابو؟ واقعی تم اس شیر خان کی بیٹی سے اتنا زیادہ خوف زدہ ہو؟ ارے اسے یہاں آنے تو دو۔ وہ آخر عورت ہے یار۔"

شہاب کو دل میں کچھ شرمندگی سی ہوئی۔ واقعی وہ شیرنی سے کچھ زیادہ ہی ڈرنے لگا تھا۔ آخر ایسی بھی کیا بات ہے۔ اگر یہاں اس کا آمنا سامنا بھی ہو گیا تو وہ اس بار بچ کر نہیں جا سکے گی۔ شہاب نے بھاشو سے کہا۔ "لاؤ یار تازہ تاڑی کا ایک گلاس پلاؤ۔ حلق

خشک ہو رہا ہے۔" بھاشو ہنس کر بولا۔

"یہ بات ہوئی نا۔"

چاند چچا جب اپنی دکان پر پہنچا تو شیر خان اس کے پیچھے والی کوٹھری میں چارپائی پر لیٹا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شیر خان کے پوچھنے پر چاند چچا مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے شہاب بھاشو کے ڈیرے پر نہیں ہے۔" شیر خان نے کہا۔

"تم نے اچھی طرح پوچھ گچھ کی تھی نا؟"

"ارے شیر خان تم مجھے بچہ سمجھتے ہو۔" چاند چچا نے بیڑی کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں بھاشو کی دیواروں تک کا ایکس رے کر کے دیکھ لیا تھا۔ شہاب ابھی تک وہاں نہیں پہنچا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی دوسری جگہ اترا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی ہوٹل میں ٹھہر گیا ہو۔" تب شیر خان بیٹی کے بارے میں فکر مند ہوا کہنے لگا۔

"عائشہ کی بھی کوئی خبر نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ انڈیا میں ہی ہے۔ کس شہر میں ہے؟ کچھ معلوم نہیں۔" پھر وہ سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ چاند چچا نے کہا۔

"شیر خان! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ لڑکی تمہاری بیٹی ہے اور جیسا کہ تم نے مجھے اس کے بارے میں بتایا ہے وہ ایک دلیر لڑکی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مردانہ لباس میں تمہاری تلاش میں ہو؟" شیر خان بے چینی سے کہنے لگا۔

"یہی تو بات مجھے بے چین کرتی ہے کہ عائشہ میری تلاش میں دربدر ہو رہی ہے اور میں یہاں بیٹھا ہوں۔ پھر ایک لمحے کے لیے خاموش رہنے کے بعد بولا" لیکن میں شہاب کو قتل کیے بغیر اس سے اپنی بے عزتی اپنی بیٹی کے اغوا کا بدلہ لیے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتا۔ چاند چچا! جس طرح بھی ہو سکے شہاب کا سراغ لگاؤ۔ اس کا پتہ چلاؤ۔ وہ ضرور کلکتے میں ہی ہے۔ یہ مجھے اس کے خاص آدمی نے بتایا ہے۔ یہ اطلاع غلط نہیں ہو سکتی۔" چاند چچا نے شیر خان کو تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"شیر بابو! میں اتنا جانتا ہوں کہ اگر شہاب اس کلکتہ شہر میں ہی ہے تو وہ میرے آدمیوں سے چھپ نہیں سکتا۔ ایک دو دن کے اندر اندر تمہیں اس کا سراغ لگا کر بتا دوں گا۔ پھر تم

اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرنا۔ لیکن مجھے ایک دو دن تو دے دو۔"

اتنے میں لڑکا چائے کے گلاس لے آیا۔ دونوں چائے پینے لگے۔ شیر خان نے پوچھا۔

"یہاں جو طوائفوں کا علاقہ ہے وہاں دیکھ لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں گانا سننے آجائے۔ میں خود اس لیے باہر جانے سے کتراتا ہوں کہ اگر شہاب کو میری بھنک بھی پڑ گئی تو یقین کرو وہ یہاں سے کسی دوسری جگہ فرار ہو جائے گا اور پھر میرے لیے اسے ڈھونڈنا مشکل ہو جائے گا۔" چاند چچا نے کہا۔

"اس کا بھی بندوبست کر دوں گا۔ بلکہ رات کو میں خود یہاں کی سونا گاچی کا چکر لگاؤں گا۔ ساری گانے والیاں مجھے جانتی ہیں۔ ایک دو ایسی ہیں جن پر میں بھروسہ کر سکتا ہوں۔ انہیں شہاب کا حلیہ بتا دوں گا۔"

ایک دن چھوڑ کر چاند چچا کلکتہ کی ہیرا منڈی سونا گاچی کے علاقے کی طرف نکل گیا۔

ابھی شروع رات تھی اور بیٹھکوں میں گانے بجانے کی محفلیں سجانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چاند چچا شوبھا نام کی ایک نائیکہ کے کوٹھے پر آگیا۔ نائیکہ نے چاند چچا کو دیکھا تو بڑے خاص انداز سے مسکراتے ہوئے بولی۔

آج پرانا چاند کدھر سے نکل آیا؟"

چاند چچا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ شوبھا نائیکہ نے اسے پان بنا کر پیش کیا۔ چاند چچا نے دو چار ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا۔

"شوبھا میں تمہارے پاس ایک خاص کام سے آیا ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ بات تمہارے اور میرے درمیان ہی رہنی چاہیے۔"

شوبھا نے پان دان بند کر کے ایک طرف کھسکایا اور لڑکے کو آواز دے کر کہا کہ بائی سے کہو جلدی جلدی سنگھار کرے گانے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ پھر چاند چچا کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"چچا! تم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ ہم لوگ رازوں کو اپنے سینے میں کیسے دفن کر دیتے ہیں اور پھر تم تو ہمارے پرانے دوست ہو۔ بات کرو۔ بات کیا ہے؟"

چاند میاں نے شہاب کا پورا حلیہ بیان کرنے کے بعد کہا۔

"کیا اس شکل کا کوئی تماش بین پچھلے دنوں تمہارے کوٹھے پر آیا ہے؟ اگر نہیں آیا تو خیال رکھنا جب وہ آئے تو اس سے یہ کسی طرح معلوم کرنا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ بس اس کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔" شوبھا نائیکہ زیر لب ہنس رہی تھی۔ جب چاند چچا نے اپنی بات ختم کی تو اس نے چاند چچا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور بولی۔

"اگر میں تمہیں بتا دوں کہ اس حلیئے کا آدمی کل رات ہی میرے ہاں گانا سننے آیا تھا تو مجھے کیا انعام دو گے؟" چاند چچا اچھل سا پڑا۔

"تم کو یقین ہے کہ وہ اسی حلیئے کا آدمی تھا؟ وہ کس کے ساتھ آیا تھا؟" شوبھا نائیکہ نے کہا۔

"بھاشو بابو کے ساتھ آیا تھا۔" بھاشو کے نام سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ شہاب کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ چاند چچا نے پوچھا۔

"وہ پھر کب آئے گا؟" شوبھا نے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ آج ہی رات کو آجائے یا کل آئے۔ مگر آئے گا رات کو گیارہ بجے کے بعد جب بازار کی رونقیں مدھم پڑنے لگتی ہیں اور لوگوں کی آمد و رفت کم ہو جاتی ہے۔ مگر بات کیا ہے؟ کہیں کسی کا خون تو نہیں کروا رہے ہو چاند چچا؟" چاند چچا نے نفی میں سر ہلایا۔

"اری نہیں پگلی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ یہ شخص میرے ایک دوست کی رقم لے کر بھاگا ہوا ہے۔ اب وہ میرا دوست اس کی تلاش میں ہے تاکہ اس سے رقم واپس لی جائے۔ بس اتنا سارا قصہ ہے۔" شوبھا نائیکہ نے کان پر ہاتھ لگا کر کہا۔

"نا بابا! میرے کوٹھے پر کوئی دنگا فساد نہ ہو میں نے یونہی تمہیں بتا دیا؟" چاند چچا نے جھٹ کہا۔

"تمہارے کوٹھے پر تو کسی کو آنا ہی نہیں ہے تم تو صرف اتنا کرو کہ اس کے بارے میں یہ پتہ کر کے مجھے بتاؤ کہ وہ بھاشو کے ڈیرے پر ہی ٹھہرا ہوا ہے یا کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ اگر ہوٹل میں ٹھہرا ہے تو اس ہوٹل کا نام کیا ہے۔ میرا دوست اپنے آپ اس ہوٹل میں پہنچ جائے گا تاکہ اس سے اپنی رقم واپس لے سکے۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" شوبھا بولی۔

"یہ میں تمہیں پتہ کر دوں گی۔ تم پرسوں میرے پاس آجانا۔" چاند چچا شوبھا کا شکریہ ادا کر کے واپس آگیا۔ ساری بات اس نے شیر خان کو بتا دی۔ وہ بڑا خوش ہوا کہ شہاب کلکتے میں آچکا ہے وہ اسی رات بھاشو کے ڈیرے پر جا کر شہاب کا کام تمام کر دینا چاہتا تھا مگر چاند چچا نے اسے روک دیا۔

"خواہ مخواہ کہیں الٹے خود نہ پھنس جانا۔ بھاشو نے تو پولیس کو بھی اپنے ساتھ ملایا ہوا ہے اور اس کے ڈیرے پر دن رات خفیہ پہرہ لگا رہتا ہے پھر اس کا بھی یقین نہیں کہ رات کو شہاب بھاشو کے پاس ہی ہوتا ہے۔ ایک دن صبر کر لو پرسوں شوبھا سے سب پتا چل جائے گا کہ تمہارا دشمن رات کو کہاں سوتا ہے۔" شیر خان کو اس دلیل نے خاموش کر دیا اس نے چاند چچا سے کہا۔

"چچا! مجھے کہیں سے پستول لا کر دے سکتے ہو؟" چاند چچا بولا۔

"کبھی پستولیں بندوقیں چلایا کرتے تھے۔ اب تو بیڑی تمباکو بناتا ہوں۔ ویسے تمہیں سونا گاچی میں ایک آدمی کا پتا بتا دوں گا۔ وہاں سے تم پستول وغیرہ خرید سکو گے۔"

چاند چچا کو معلوم تھا کہ شیر خان شہاب کو قتل کرنے والا ہے اور وہ آلہ قتل مہیا کر کے خود کو اس قتل میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس بارے میں بھی اس نے شیر خان سے وعدہ لے لیا ہوا تھا۔ کہ وہ شہاب کے قتل کے بعد وہاں سے چلا جائے گا اور اگر بدقسمتی سے پکڑا گیا تو وہ چاند چچا کا نام کہیں بھی نہیں لے گا۔ شیر خان بھی سمجھ گیا کہ چچا خود پستول لا کر نہیں دینا چاہتا اس کے پاس رقم کی کمی نہیں تھی۔ دوسرے ہی دن شیر خان سونا گاچی گیا اور چاند چچا کے بتائے ہوئے اڈے سے ایک ریوالور اور گولیاں خرید کر لے آیا۔ یہ چرایا ہوا ریوالور تھا اور بڑی اچھی حالت میں تھا۔ شیر خان نے اس کو آدھا دن لگا کر صاف کیا۔ اسے تیل وغیرہ دیا اور اس میں گولیاں بھر کر رکھ لیا۔ ایک دن کے بعد شام کو چاند چچا نائیکہ شوبھا کے پاس پہنچ گیا۔ شوبھا نے کہا۔

"چچا! آدمی تو وہی ہے۔ گورا چٹا ہے ادھر کا نہیں ہے۔ پنجاب کا ہے۔ بھاشو کہہ رہا تھا کہ مجھے تو اس کا نام بھی معلوم نہیں۔ میرا یہیں سونا گاچی میں دوست بنا ہے مجھے نہیں معلوم کہ کہاں رہ رہا ہے۔ اس تمہارے آدمی نے بھی اپنا ٹھکانہ نہیں بتایا۔ اب باقی تم خود

معلوم کر لو۔ اس سے زیادہ میں سراغ رسانی نہیں کر سکتی۔ آخر وہ ہمارے کوٹھے پر گانا سننے آتا ہے۔ یہ بھی میں نے تمہاری خاطر کیا ہے۔"

چاند چچا نے واپس آکر شیر خان کو بتایا کہ شہاب کا اصل ٹھکانہ معلوم نہیں ہو سکا۔ ساری بات سن کر شیر خان نے کہا۔

"کوئی بات نہیں چچا۔ میں خود پتا کر لوں گا۔" چاند چچا نے احتیاط کے طور پر شیر خان کو ایک بار پھر اس کا وعدہ یاد دلا دیا۔ شیر خان بولا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو چچا۔ میرا کام ہو گیا تو میں وہاں سے سیدھا ریلوے اسٹیشن جاؤں گا اور کسی بھی ریل گاڑی میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

شیر خان نے یہی فیصلہ کیا کہ دشمن کو کلکتے کی ہیرا منڈی میں ہی پکڑا جائے چنانچہ اس سے اگلی رات کو ریوالور جیب میں چھپا کر کلکتے کی ہیرا منڈی یعنی سونا گاچی کی طرف چل پڑا۔ چاند چچا سے اس نے شوبھا نائیکہ کے کوٹھے کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ یہ بھی اسے بتا دیا گیا تھا کہ بھاشو کے ساتھ شہاب عام طور پر آدھی رات کے بعد وہاں گانا سننے آتا ہے۔ شیر خان آدھی رات سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا اور شوبھا نائیکہ کے مکان کے آس پاس منڈلانے لگا۔ شیر خان نکڑ والے بنگالی پنواڑی کی دکان پر آیا اور سگریٹ خرید کر وہیں کھڑے ہو کر کش لگانے لگا۔ بنگالی پنواڑی پہلے بھی شیر خان کو ادھر ادھر منڈلاتے دیکھ چکا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"بابو موشا کی بات ہے۔ تم کس کو کھوج رہے ہو؟" شیر خان جانتا تھا کہ پنواڑی اس سے یہی سوال پوچھے گا۔ وہ جان بوجھ کر وہاں آیا تھا تا کہ اسی سے شہاب اور بھاشو بابو کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ اس نے کہا۔

"دادا! ہمارا ایک یار سنا ہے ادھر آیا ہوا ہے ہمیں اس کا ٹھکانہ معلوم نہیں۔ کسی نے کہا کہ وہ سونا گاچی گانا سننے آتا ہے۔ اپنے دوست سے ملاقات ہی نہیں ہو رہی۔"

"کون ہے وہ بابو موشائے۔" پنواڑی نے پوچھا شیر خان کہنے لگا۔

"سنا ہے وہ بھاشو دادا کے ساتھ یہاں آتا ہے رات کو گانا سننے۔ گورا چٹا ہے۔ بنگالی نہیں ہے پنجابی ہے۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں بھی ہیں؟" پنواڑی سمجھ گیا۔ اس سے پہلے پنواڑی نے بھاشو بدمعاش کے ہمراہ ایک ایسی ہی شکل صورت والے گورے سے ادھیڑ عمر کے مگر مضبوط جسم والے آدمی کو شوبھا کے کوٹھے پر جاتے دیکھا تھا۔ پنواڑی بولا۔

"بابو میں سمجھ گیا۔ تم جس کی بات کر رہے ہو وہ رات کے تین بجے شوبھا بائی کے کوٹھے پر آتا ہے لیکن آج شاید وہ نہ آئے۔"

"کیوں؟ آج کیا بات ہے؟" شیر خان نے پوچھا۔ پنواڑی بولا۔" بھاشو دادا کل رات بھی اسے ساتھ لے کر ڈھولی کے جوا خانے لے گیا تھا۔ مجھے خبر ملی ہے کہ آج بھی وہ دونوں وہیں پر ہیں" پھر ہنس کر بولا۔" ہمیں ایک ایک کی خبر رکھنی پڑتی ہے بابو۔ یہ بازار ہی ایسا ہے۔ میں تو تم پر بھی برابر نگاہ رکھے ہوئے تھا" شیر خان نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر پنواڑی کی مٹھی میں تھمایا اور پوچھا۔

"کیا تم مجھے ڈھولی کے جوا خانے کا ایڈریس بتا سکتے ہو؟ میرا اپنے دوست سے ملنا بڑا ضروری ہے۔" پنواڑی بڑا خوش ہو گیا۔ اسی وقت ایک لونڈے کو آواز دی۔ ایک آٹھ دس سال کا بنگالی لڑکا آ گیا۔ پنواڑی نے کہا۔

"ابے رامی! یہ ہمارے مہمان ہیں۔ انہیں ڈھولی کے اڈے پر لے جا۔"

"چلو بابو۔" اور رامی آگے آگے چل پڑا۔ شیر خان نے پوچھا۔

"کتنی دور ہو گا ڈھولی کا ڈیرا رامی یار؟" بنگالی لڑکے نے چٹکی بجا کر کہا۔

"ارے بابو اگلی گلی میں ہے اور کہاں ہو گا؟" ڈھولی کے اڈے پر جوا ہو رہا تھا۔ اڈے کا دروازہ بند تھا۔ باہر ایک غنڈہ اسٹول پر بیٹھا بیڑی پیتے ہوئے پہرہ دے رہا تھا۔ دو سپاہی ادھر ادھر ٹہل رہے تھے مگر انہیں رات کو جوا ختم ہونے کے بعد اپنا حصہ مل جاتا تھا اس لیے اب وہ ڈھولی کے جوا خانے کی حفاظت کے لیے وہاں ہوتے تھے کہ باہر سے کوئی جواری آ کر کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرے۔

بنگالی لڑکا شیر خان کو دور سے جوئے خانے کا دروازہ دکھا کر واپس چل دیا۔ شیر خان اس غنڈے کے پاس آیا جو اسٹول پر بیٹھا تھا۔ وہ گھور کر شیر خان کو تکنے لگا۔ شیر خان کے گورے چٹے رنگ اور قد کاٹھ نے اسے ضرور متاثر کیا تھا۔ مگر اسے آرڈر تھا کہ کسی غیر آدمی کو اندر نہ آنے دے۔ شیر خان نے کہا۔

"بھائی! میرا ایک جگری یار اندر ہے۔ میں بڑی دور پنجاب سے اسے ملنے یہاں آیا ہوں۔ مجھے اس کے پاس لے چل۔ تیری مہربانی ہو گی۔"

پہریدار غنڈہ انکار کرنے ہی لگا تھا کہ شیر خان نے جیب سے سو سو روپے کے چار نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے اور کہا "اس وقت میں تیری بس اتنی ہی خدمت کر سکتا ہوں۔" غنڈے نے جلدی سے نوٹ اپنی پتلون کی جیب میں ٹھونسے اور کہا۔

"کیا نام ہے اس کا میں اسے باہر بلائے دیتا ہوں۔ تم اندر نہیں جا سکتے تم مجھے اپنا نام بھی بتا دو۔" معاملہ خراب ہو گیا تھا۔ شیر خان جانتا تھا۔ اس آدمی نے اندر جا کر جب شہاب کو میرا حلیہ بتایا تو وہ باہر نہیں نکلے گا اور ممکن ہے دوسرے دروازے سے فرار بھی ہو جائے گا شیر خان نے مزید ایک سو روپیہ نکال کر غنڈے کو تھما دیا اور کہا۔

"تیری مہربانی ہو گی۔ مجھے خود ہی اندر جانے دے۔ شاید میں بھی دو ایک داؤ لگا لوں۔ میں کوئی اجنبی نہیں ہوں۔ پنجاب میں بڑا بڑا جوا کھیلا ہے۔" پہریدار غنڈہ مزید ایک سو روپیہ لے کر کچھ زیر بار سا ہو گیا اٹھا اور بولا۔

"میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔" جوا خانے کا ایک پچھلا دروازہ بھی تھا جو اندر سے بند تھا۔ اس نے دستک دی۔ اندر سے کسی نے بنگلہ میں کرخت آواز میں پوچھا "کون ہے؟" پہریدار غنڈے نے جواب میں اپنا نام لیا اور کہا "تھوڑی دیر کو کھول دروازہ ایک بندے کو اندر بٹھانا ہے۔" ان لوگوں کا شاید آپس میں معاملہ طے تھا اور وہ پیسے لے کر جواریوں کو پچھلے دروازے سے اندر دھکیل دیا کرتے تھے۔ چنانچہ کنڈی کھل گئی۔ دروازے کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا۔ اندر جوا خانے کی روشنی آوازیں اور سگریٹوں کا دھواں باہر کو نکلا اور ایک بنگالی نے شیر خان کو بازو سے پکڑ کر اندر کھینچا اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

"ادھر پیچھے ہو کر بیٹھ جاؤ۔ ابھی داؤ مت لگانا۔" شیر خان نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اور جہاں کچھ آدمی جھک کر جوا ہوتے دیکھ رہے تھے ان کے پیچھے ایک طرف ہو کر صف پر بیٹھ گیا۔ فضا سگریٹ شراب اور پان کی ملی جلی بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ سو کا بلب، چھت کے ساتھ تار سے لٹکا روشن تھا۔ یہاں جوا زمین پر ہو رہا تھا۔ جوا کھیلنے والے صف پر بیٹھے تھے اور پندرہ بیس آدمی دائرے کی شکل میں انہیں گھیرے ہوئے تھے اور ان پر جھکے ہوئے بھی تھے جس کی وجہ سے جوا کھیلنے والے شیر خان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کی آہستہ سے اٹھ

کر آگے آیا۔ دو چار آدمیوں کو دھکیل کر پیچھے کیا۔ جونہی نیچے نگاہ ڈالی تو صف پر شہاب بیٹھا دانہ پھینک رہا تھا۔ نوٹوں کی دو گڈیاں پاس ہی رکھی تھیں۔ ایک بنگالی اس کے ساتھ بیٹھا تھا جو یقیناً بھاشو ہی تھا۔ شہاب کو اپنے دشمن کو اتنا قریب دیکھ کر شیر خان کا خون کھول اٹھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے ریوالور جیب سے نکالا اور اس کی نالی شہاب کی گردن کے ساتھ لگا دی۔ شہاب نے ہڑبڑا کر اوپر چہرہ اٹھایا۔ جونہی سامنے شیر خان پر نظر پڑی تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ شیر خان نے شہاب کو گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور کہا۔

"آخر موت نے تمہیں تلاش کر ہی لیا۔"

جوئے خانے میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ سب جان گئے کہ یہاں خون خرابہ ہونے والا ہے۔ بھاشو نے بھی شیر خان کو پہچان لیا۔ جوئے خانے کے مالک دھول نے یہ منظر دیکھا تو چلا کر کہا۔

"خبردار! یہاں خون نہ کرنا۔" شیر خان کے ریوالور کی نالی شہاب کی گردن کے ساتھ لگی تھی۔ شہاب نے کہا۔

"شیر خان! تم ایک نہتے آدمی پر گولی چلاؤ گے تم سے میں یہ امید نہیں کر سکتا۔"

شیر خان پر یہ جملہ اثر کر گیا۔ اس نے شہاب کو لات مار کر سامنے والی دیوار کی طرف گرایا۔ ریوالور جیب میں ڈالا اور دوسری جیب سے چاقو نکال کر کھولا اور شہاب سے کہا۔

"میں جانتا ہوں تمہارے پاس ایک چاقو ضرور ہوتا ہے۔ نکالو چاقو۔ مرنے سے پہلے تمہاری یہ حسرت بھی پوری کر دوں کہ میں نے ایک نہتے کو قتل نہیں کیا۔"

بھاشو نے بیچ میں پڑنے کی کوشش کی تو شیر خان نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایسا زبردست الٹا ہاتھ مارا کہ وہ پیچھے کی طرف گر پڑا۔ اسی دوران شہاب بھی چاقو نکال کر کھول چکا تھا۔ دھول پولیس کو بلانے دروازے کی طرف بڑھا۔ شیر خان نے اس پر فائر کیا۔ شہاب نے لپک کر شیر خان کی پسلیوں میں چاقو گھونپنے کی کوشش کی جسے شیر خان نے ایک طرف اچھل کر ناکام بنا دیا۔ جو لوگ باہر کو دوڑے تھے انہوں نے پولیس کو خبر کر دی کہ اندر خون خرابہ ہونے والا ہے۔ شیر خان کو باہر پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا موقع اسے دوبارہ نہیں مل سکتا تھا۔ اس کا دشمن اس کی عزت اور غیرت کا دشمن اس

کے سامنے تھا۔ شیر خان نے پوری طاقت سے لات شہاب کے پیٹ پر ماری۔ وہ پیٹ پکڑ کر جھکا ہی تھا کہ شیر خان نے چاقو کا آدھے سے زیادہ پھل شہاب کی گردن میں گھونپ دیا۔ چاقو زور سے باہر نکالا۔ دوسرا وار کمر پر کیا۔ خون ابل کر شیر خان کے اوپر گرا۔ بھاشو دھول ڈر کر دروازے کی طرف دوڑے۔ دروازہ کھولا اور پولیس پولیس کی آوازیں لگاتے چوک میں آگئے۔ پولیس ابھی تک محض سیٹیاں بجا رہی تھی۔ وہ قتل کا خونی کھیل ختم ہونے کے بعد جوئے خانے میں آنا چاہتی تھی۔ ایک جواری نے کانسٹیبل سے کہا۔

"ارے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ میرے بیٹھک کی سخت بدنامی ہو گی۔ قاتل کو پکڑو۔ اس نے بھاشو کے دوست کا خون کر دیا ہے۔"

شیر خان نے گرتے ہوئے شہاب کی پیٹھ پر چاقو کے مزید وار کیے۔ چاقو اس کی پیٹھ میں ہی چھوڑا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ وہ جان بچا کر وہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے ابھی زندہ رہنا تھا۔ اپنی بیٹی کو ملنے اور اسے یہ خوش خبری سنانے کے لیے زندہ رہنا تھا کہ اس نے شہاب سے اس کی بے عزتی کا بدلہ لے لیا ہے۔ مگر باہر پولیس پوری طرح چوکس ہو چکی تھی۔ وہ دھول جوئے خانے کے مالک سے ماہانہ لیتی تھی اور جب دھول کے ساتھی نے کہا کہ قاتل کو ہر حالت میں پکڑنا ہے تو وہاں دوسرے پولیس والے بھی آگئے۔ جونہی شیر خان باہر نکلا ساتھ آٹھ رائفلوں کی نالیاں اس کی طرف اٹھ گئیں بھاشو گھبرایا ہوا جوئے خانے میں گیا پھر فوراً ہی باہر نکل کر چیخ پڑا۔

"اس نے شہاب کو قتل کر دیا ہے۔" بنگالی تھانیدار نے پستول دکھا کر شیر خان سے کہا۔

"ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ بھاگنے کی کوشش کی تو یہ ساتوں رائفلیں تم پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گی۔"

شیر خان کا دل مطمئن تھا۔ اس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا تھا۔ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ گرفتار ہونے کی صورت میں جیل سے فرار کا چانس موجود تھا جب کہ اس وقت فرار ہونے کی صورت میں اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو سکتا تھا۔ شیر خان نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ پولیس نے اسی وقت شیر خان کے ہاتھ پیچھے کر کے ہتھکڑی لگا دی۔ تلاشی کے بعد شیر خان کی جیب سے ریوالور بھی برآمد کر کے پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

پولیس کی جیپ بھی وہاں آگئی۔ اسی وقت شیر خان کو جیپ میں بٹھایا اور پولیس اسے تیزی سے تھانے کی طرف لے گئی۔

شیر خان نے جوئے خانے سے نکلنے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیا تھا کہ شہاب مر چکا ہے۔ وہ بڑے سکون سے جیپ میں بیٹھا تھا۔ اتنا افسوس اسے ضرور تھا کہ شہاب کو قتل کرنے کے بعد وہ وہاں سے فرار نہیں ہو سکا تھا لیکن اس نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ وہ بہت جلد فرار ہو جائے گا۔ اس وقت اگر شیر خان کو کوئی ملال تھا تو صرف اتنا کہ وہ اپنی بیٹی سے نہ مل سکا تھا۔ شیر خان کو تھانے کی حوالات میں بند کر کے باہر سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ قتل کے عینی گواہ موجود تھے۔ آلہ قتل بھی برآمد ہو گیا تھا۔ چاقو پر شیر خان کی انگلیوں کے نشان بھی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شیر خان نے قتل کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ دوسرے ہی دن پولیس نے قتل کی ایف آئی آر بھر کر شیر خان کو مقامی عدالت میں پیش کر کے پانچ دن کا ریمانڈ لے لیا۔ عدالت نے ریمانڈ کی وجہ دریافت کی تو ایس پی نے کہا۔

"ملزم پر ہمیں شک ہے کہ وہ پاکستان کا جاسوس ہے۔ پولیس اس سے اسی سلسلے میں مزید پوچھ گچھ کرنا چاہتی ہے۔"

عدالت نے پولیس کو پانچ دن کا ریمانڈ دے دیا۔ یہ پانچ دن شیر خان پر عذاب کے دن تھے۔ اسے ہر طرح کی اذیت دی گئی کہ کسی طرح سے وہ اعتراف کر لے کہ وہ پاکستان کا جاسوس ہے اور انڈیا میں تخریب کاری کی نیت سے آیا تھا۔ مگر شیر خان یہی کہتا رہا کہ وہ لنکا میں اسمگلنگ کا دھندا کرتا ہے اور کلکتے اپنے دشمن شہاب کو قتل کرنے آیا تھا۔ اس نے پولیس کے سامنے چاند چچا کا بھی نام نہ لیا۔ یہی کہا کہ وہ دو دن ریلوے اسٹیشن پر سوتا رہا تھا۔ پولیس نے عدالت سے مزید پانچ دن کا ریمانڈ حاصل کر لیا۔ وہاں شیر خان کی ہمدردانہ وکالت کرنے والا کون تھا۔ ایک بار پھر شیر خان پر انتہائی گھناؤنی اذیتوں کے دروازے کھل گئے۔ مگر شیر خان ثابت قدم رہا۔ نہ اس نے یہ کہا کہ وہ پاکستان کا جاسوس ہے۔ ریمانڈ کی مدت گزر جانے پر پولیس نے عدالت میں کیس پیش کر دیا اور مقدمہ شروع ہو گیا۔ شیر خان کو تھانے کی حوالات سے نکال کر جوڈیشنل جیل کی کال کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔

شیر خان کو ذرا ہوش آیا تو اس نے وہاں سے فرار کے منصوبے پر غور شروع کیا۔ بہت جلد اسے محسوس ہو گیا کہ وہاں سے فرار تقریباً ناممکن ہے۔ اس جیل میں حفاظتی انتظامات اتنے سخت تھے کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ شیر خان کو جس کوٹھری میں بند کیا گیا تھا اس کے دروازے پر لوہے کی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ احاطے کا دروازہ بھی سلاخوں والا تھا۔ احاطے کے اوپر بھی چھت پڑی تھی۔ قدم قدم پر پہرہ لگا رہتا تھا۔ شیر خان کو پیشی کے لیے عدالت میں لے جاتا تو اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ اس دوران ہماری شیرنی پر کیا گزری؟

آیئے شیرنی کی طرف چلتے ہیں۔ ہم اس وقت شیرنی سے الگ ہوئے تھے۔ جب وہ

مدراس سے جموں شہر کی طرف جا رہی تھی۔ اور بودھ بھکشو عورتوں کے حلیئے میں تھی۔ وہ زرد دھوتی نما ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اس نے سر کے بال بڑھانے شروع کر دیئے تھے کیونکہ شمال انڈیا میں بودھ بھکشوؤں کی جگہ عام جوگی جوگنوں کی لوگ زیادہ عزت و تکریم کرتے تھے اور اگر جوگی یا جوگن یونہی جلالی رنگ دکھائے اور لوگوں کو برا بھلا کہے تو لوگ اس سے بہت ڈرتے بھی تھے اور اس کی بڑی آؤ بھگت بھی ہوتی تھی۔ شیرنی نے جوگن کے بہروپ کو اپنے واسطے پسند کر لیا تھا۔ وہ ریل کے ڈبے میں دوسری عورتوں کے درمیان بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ انڈیا اتنا بڑا ملک ہے۔ وہ اپنے باپ کو کیسے اور کہاں کہاں تلاش کرے گی؟ کیا اس کے ڈیڈی اب اسے مل جائیں گے؟ بس ایک موہوم سی امید اسے جموں کی طرف لیے جا رہی تھی۔ وہ حیران ضرور تھی کہ اس کے ڈیڈی جموں کی طرف کیوں نکل گئے ہیں۔ اگر کسی نے انہیں یہ کہا تھا کہ آپ کی بیٹی جموں میں ہے تو انہیں سوچنا چاہیے تھا کہ جموں اتنا دور ہے وہ وہاں کیوں جائے گی۔ شیرنی کی سمجھ میں واضح طور پر کچھ نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس کے سامنے دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ پڑھی لکھی خاتون تھی۔ اس نے انگریزی اسکولوں میں تعلیم پائی تھی۔ انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان بھی روانی سے بول لیتی تھی۔ اسے اس بات کی خبر تھی کہ وہ خود پاکستانی ہے اور ایک دشمن ملک میں بغیر پاسپورٹ ویزے کے اور پھر بودھ بھکشنی کے بھیس میں سفر کر رہی ہے۔ اس کو بڑی آسانی سے پاکستانی جاسوس سمجھ کر گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ ان تمام خدشات کے باوجود شیرنی پورے اعتماد اور دلیری کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ پیچھے ہٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ خواہ راستے میں آگ کے دریا حائل ہوں۔ اسے ہر حالت میں اپنے پیارے ڈیڈی سے ضرور ملنا تھا۔

ان علاقوں میں شیرنی نے پہلے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ وہ پہلی بار انڈیا کے ملک میں سفر کر رہی تھی۔ اپنا نام اس نے ساوتری ہی رکھ لیا تھا۔ تین دن کے تھکا دینے والے سفر کے بعد جب ٹرین دلی پہنچی تو شیرنی ٹرین سے اتر کر سیکنڈ کلاس کے مسافر خانے میں آ گئی۔ یہاں اس نے غسل کیا۔ ناشتہ وہیں منگوایا اور بڑے اعتماد کے ساتھ ناشتہ کرنے لگی۔ انڈیا کے اسٹیشنوں پر زنانہ مسافر خانے الگ نہیں ہوتے۔ ایک پڑھی لکھی ہندو خاتون نے نوجوان

اور خوبصورت جوگن کو ناشتہ کرتے دیکھا تو قریب آکر بڑے ادب سے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور بولی۔

"جوگن میا! میرے بیاہ کو سات برس ہو گئے ہیں۔ پر اولاد نہیں ہوئی۔ مجھ پر دیا کریں۔ ایشور سے پرارتھنا کریں کہ میرے ہاں بچہ ہو جائے۔ نہیں تو میرا پتی مجھے نکال کر دوسرا بیاہ کر لے گا۔" شیرنی نے ایک نظر اٹھا کر اس عورت کو دیکھا۔ گوری چٹی ہندنی ٹائپ کی بھاری بدن والی عورت تھی۔ قیمتی لباس اور زیور پہن رکھا تھا۔ شیرنی کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ مگر اسے اپنا پارٹ پوری ذمے دار سے نبھانا تھا۔ ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھایا اور انگریزی میں کہا۔

""بھگوان تمہاری گود بھر دیں گے۔" عورت بڑی حیران ہوئی۔ وہ خود کیمبرج کی پڑھی ہوئی تھی اور دلی کے ایک لڑکیوں کے کالج کی پرنسپل تھی۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

"جوگن میا! آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔" شیرنی نے اب اردو میں کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دل کی زبان ایک ہوتی ہے۔ بھگوان سے دل کی زبان میں بات کی جاتی ہے۔" ہندو خاتون نے کہا۔

"میا! میرا نام رجنی مترا ہے۔ میرے پتی دیو ساجن مترا دلی میں کاروبار کرتے ہیں۔ اگر آپ کو کہیں آگے نہیں جانا تو مجھے سیوا کا موقع دیں۔ میرے گھر چل کر دو چار دن آرام کریں میرا پتی آپ سے مل کر بڑا خوش ہو گا۔ میں بیجواڑہ سے آرہی ہوں۔ ابھی ٹرین سے اتری ہوں۔ یہاں باتھ روم جانے کے لیے آئی تھی۔ میرا نوکر گاڑی لے کر اسٹیشن کے باہر موجود ہو گا۔"

شیرنی نے اس دوران وہاں ایک نئی بات محسوس کی تھی۔ ایک آدمی شیشے والے اسٹینڈ کے پاس بیٹھا شیرنی کو برابر تک رہا تھا۔ یہ آدمی جس کی توند پتلون سے باہر نکلی ہوئی تھی ٹرین میں بھی شیرنی کے ڈبے میں سفر کرتا آیا تھا اور اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ جس دوران شیرنی ہندو خاتون رجنی سے باتیں کر رہی تھی تب بھی یہ پراسرار آدمی وہاں موجود اسے برابر گھورتا رہا تھا۔

شیرنی سمجھ گئی کہ یہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ اور شیرنی کا پیچھا کر رہا ہے۔ گویا یہ ایک

بلا شیرنی کے پیچھے لگ گئی تھی جس سے چھٹکارا بڑا ضروری تھا۔ اس کے باوجود شیرنی کو کوئی زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ جب وہ رجنی سے گفتگو کر رہی تھی تو یہ آدمی باہر جا کر ایک اور آدمی کو لے آیا اس نووارد نے ایک نظر گھور کر شیرنی کو دیکھا اور باہر چلا گیا۔ تب شیرنی کے لیے اس آدمی سے پیچھا چھڑانا ضروری ہو گیا۔ اس نے ہندو عورت سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے گھر تھوڑی دیر کے لیے پرارتھنا کرنے جاؤں گی تاکہ بھگوان تیری گود ہری کر دے۔"

ہندو عورت بڑی خوش ہوئی جھک کر شیرنی کے پاؤں چھونے لگی۔ شیرنی کا پروگرام یہ تھا کہ اس عورت کے گھر میں جانے کے بعد وہ موقع پا کر وہاں سے نکل آئے گی۔ ہندو عورت رجنی شیرنی کو ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن سے باہر آئی تو ڈرائیور گاڑی لے کر آیا ہوا تھا۔ دونوں اس میں بیٹھ گئیں اور گاڑی دلی کے بازاروں میں تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی رجنی مترا کا چھوٹا سا بنگلہ مہرولی میں تھا یہ بستی کبھی دلی شہر سے سترہ میل کے فاصلے پر ہوتی تھی مگر اب دلی کا حصہ بن گئی ہے۔ قطب کی لاٹھ اسی جگہ پر ہے۔ بزرگان دین کے مزار بھی اسی بستی میں ہیں۔ یہ دلی کے ماڈرن علاقوں میں شمار ہوتی ہے۔ پارک اور باغ بنے ہوئے ہیں۔ کشادہ سڑک کے کنارے کنارے بنگلے ہیں۔ ایسے ہی ایک بنگلے میں رجنی مترا اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ رجنی نے شیرنی کو اپنے کمرے میں لا کر بٹھا دیا۔ اس کے آگے پھول اور مٹھائیاں رکھیں۔ کونے میں کرشن کی مورتی پڑی تھی جس کے گلے میں پھولوں کی مالا تھی رجنی نے کہا۔

"میا! آپ یہاں بیٹھیں۔ میں اپنے پتی کو فون کر کے بلاتی ہوں۔ وہ آپ کے درشن کر کے بڑے خوش ہوں گے۔"

رجنی دوسرے کمرے میں فون کرنے گئی تو شیرنی نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر بنگلے کے گیٹ پر نگاہ ڈالی۔ اسے وہاں خفیہ پولیس کا کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ اب وہ سوچنے لگی کہ اسے جموں کی ٹرین کیسے پکڑنی چاہیے خفیہ پولیس کا آدمی ظاہر ہے وہیں کہیں آس پاس موجود ہو گا۔ شیرنی کا جموں جانا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ صرف وہیں اسے اپنے پیارے ڈیڈی کا کوئی سراغ مل سکتا تھا۔ لیکن اگر خفیہ پولیس والا یونہی اس کا پیچھا کرتا رہا تو بہت ممکن ہے

کہ جموں پہنچنے سے پہلے پہلے کسی اسٹیشن پر پولیس اسے پاکستانی جاسوس سمجھ کر پکڑ لے۔ شیرنی اس مصیبت سے ہر حالت میں بچنا چاہتی تھی۔ رجنی بڑی خوش خوش کمرے میں داخل ہوئی۔ کہنے لگی۔

"میا! پتی دیو آرہے ہیں۔"

رجنی شیرنی کے قریب تخت پر بیٹھنے لگی تو اس پر اثر ڈالنے کے لیے شیرنی نے کڑک کر انگریزی میں کہا۔

"نیچے ہو کر بیٹھو۔"

ضعیف الاعتقاد ہندو عورت ڈر کر جلدی سے نیچے قالین پر ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں اس کا سانولے رنگ کا ذرا ذرا گنجہ خاوند مترا بھی آگیا۔ وہ ہاتھ باندھے اندر داخل ہوا اور آتے ہی شیرنی کے پاؤں چھو کر ادب سے نیچے بیٹھ گیا۔ وہ اپنی بیوی سے زیادہ ضعیف الاعتقاد معلوم ہوتا تھا۔ شیرنی نے جلالی لہجے میں انگریزی میں کہا۔

"خبردار کسی کو بھی نہ بتایا جائے کہ بھگوان کرشن کی ایک بھکشنی جوگن ساوتری اس مکان میں ٹھہری ہوئی ہے نہیں تو تمہارے ہاں جو بچہ پیدا ہوگا وہ اندھا ہو جائے گا۔"

رجنی اور مترا دونوں ضعیف الاعتقاد میاں بیوی تو شیرنی کے قدموں پر لیٹ گئے۔ مترا نے انگریزی میں ہی کہا۔

"ساوتری دیوی! ہم کبھی اپنا منہ نہیں کھولیں گے۔ آپ ہمارے بچے کو اندھا نہ کریں۔ ہمیں بچے کی بڑی خواہش ہے دیوی جی!"

شیرنی کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اگر خفیہ پولیس والوں کا آدمی یہاں بھی منڈلا رہا ہے اور وہ ان لوگوں سے پوچھ بیٹھے تو یہ لوگ اسے کچھ نہ بتائیں۔ باقی شیرنی نے رات کے اندھیرے میں یہاں سے اسٹیشن کی طرف فرار ہونے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ کیونکہ یہاں ایک رات سے زیادہ دیر رہنا بہرحال خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی شیرنی نے ہندو میاں بیوی کو گھور کر دیکھا اور انگریزی میں کہا۔

"جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرنا۔"

"ٹھیک ہے دیوی جی۔" مترا ہاتھ باندھ کر اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ دلی پولیس کے چھ سات سپاہی ایک انسپکٹر کے ساتھ زبردستی گھر میں گھس آئے۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں مکان کی تلاشی کا وارنٹ تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔

"ہمیں مکان کی تلاشی لینی ہے۔" سامنے تخت پر شیرنی جوگیوں کے بھیس میں بیٹھی دیکھی تو ہندو ایس پی نے پستول نکال لیا اور بولا۔

"تمہارا ڈرامہ ختم ہو چکا۔"

پھر اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ شیرنی کی طرف بڑھے شیرنی نے انگریزی میں پوچھا۔

"مجھے کس جرم میں پکڑا جا رہا ہے؟" جوگن کو انگریزی بولتے دیکھ کر ایس پی اور دوسرے سپاہی بھی حیران سے ہوئے۔ ایس پی نے کہا۔

"تم پاکستانی جاسوس ہو۔ ہمارے پاس اس کے ثبوت موجود ہیں۔" شیرنی نے کہا۔

"وہ ثبوت کیا ہیں۔ مجھے بھی بتایا جائے۔" انسپکٹر پولیس نے کہا۔ "بکواس بند کرو اور سیدھی طرح ہمارے ساتھ چلو۔ ثبوت تمہیں تھانے پہنچ کر مل جائے گا۔"

رجنی اور مترا بے چارے مارے حیرت کے منہ کھولے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ شیرنی نہتی تھی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اگر وہ اپنے کراٹے کے فن کا مظاہرہ بھی کرتی تو وہاں سے اس کے پکڑے جانے کا ڈر تھا کیونکہ چار سپاہی پہلے ہی اس پر رائفلیں تانے ہوئے تھے۔ سپاہیوں نے اتنی دیر میں اسے قابو کر کے ---- ہتھکڑی ڈال دی انسپکٹر پولیس نے رجنی اور مترا سے کہا۔

"آپ لوگ اتنا خیال کیا کریں کہ آپ جس کو جوگی جوگن سمجھ کر گھر میں لے آئے ہیں وہ اصل میں کون ہیں۔"

دونوں بے چارے ان سب کا منہ ہی دیکھتے رہ گئے۔ ہندو انسپکٹر پولیس کا نام دین دیال شرما تھا اور وہ مسلمانوں کا بڑا جانی دشمن تھا۔ دلی میں پہلی بار جب فسادات ہوئے تو اس نے خود ہندوؤں غنڈوں کو اسلحہ دے کر مسلمانوں کے محلوں پر حملے کرائے تھے اور کئی مسلمانوں کو قتل کرایا تھا۔ خفیہ پولیس والے نے دلی پہنچتے ہی آئی جی پولیس دلی کو اطلاع کر دی تھی

کہ ایک پاکستانی جاسوسہ عورت جوگن کے بھیس میں مدراس سے سفر کرتی ہوئی پہنچی ہے اور مہرولی کے فلاں نمبر بنگلے میں ٹھہری ہوئی ہے۔ آئی جی پولیس نے اس وقت انسپکٹر شرما کو حکم دیا کہ اس جوگن کو فوراً گرفتار کر کے اس سے پوچھ گچھ کی جائے کہ اس کے دوسرے ساتھی ہندوستان میں کہاں کہاں کارروائیاں کر رہے ہیں۔ انسپکٹر شرما نے اسی وقت پولیس کی ایک پارٹی تیار کی اور مترا کے بنگلے پر چھاپہ مار کر شیرنی کو گرفتار کر لیا۔ شیرنی کے انگریزی بولنے سے انسپکٹر شرما کو یقین ہو گیا کہ یہ عورت جاسوسہ ہی ہے۔ کیونکہ ایک عام جوگن کہاں انگریزی بول سکتی ہے۔

انسپکٹر شرما نے تھانے پہنچتے ہی آئی جی پولیس کو فون پر بتایا کہ چھاپہ کامیاب رہا ہے اور پاکستانی جاسوسہ جوگن کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ آئی جی نے حکم دیا کہ اس سے ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد فوراً رپورٹ مجھے پیش کرو تاکہ یہ پتا چل سکے کہ اس عورت کے دوسرے ساتھی بھارت میں کہاں کہاں سرگرم عمل ہیں۔ انسپکٹر شرما ایک متعصب اور مسلمان دشمن ہندو ہی نہیں بلکہ ایک عیاش شرابی کبابی آدمی تھا۔ جب آئی جی پولیس کی طرف سے اسے پوچھ گچھ کی کھلی چھٹی مل گئی تو اس نے مہرولی تھانے کی بجائے شیرنی سے پوچھ گچھ کے لیے اپنی خاص جگہ کو منتخب کیا۔ جو قطب صاحب کی لاٹھ والے بڑے پارک کے عقب میں واقع تھی۔ یہ ایک دو منزلہ رہائشی عمارت تھی جس کی پہلی منزل کے کونے والا فلیٹ انسپکٹر شرما نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ یہاں وہ اکثر راتوں کو اپنی عیش و نشاط کی محفلیں لگایا کرتا تھا۔ شام تک اس نے شیرنی کو تھانے کی حوالات میں ہی رکھا۔ جب شام گہری ہو گئی تو اس نے سپاہی کھنہ سے جو اس کا رازدار سپاہی تھا کہا۔

"ارے کھنہ! اس پاکستانی جوگن کو حوالات میں ہی دال روٹی کھلانے کے بعد میرے فلیٹ پر لے آنا اس سے وہیں فلیٹ پر پوچھ گچھ کروں گا۔" سپاہی کھنہ مسکرا کر بولا۔

"جو حکم مہاراج؟"

جس وقت سپاہی کھنہ شیرنی کو ہتھکڑی لگائے جیپ میں پولیس گارڈ کی حفاظت میں لے کر انسپکٹر شرما کے پاس آیا اس وقت رات کے نو بج رہے تھے اور انسپکٹر شرما نے فلیٹ میں پہلے ہی سے بوتل کھول رکھی تھی۔ سپاہی کھنہ شیرنی کی ہتھکڑی کھول کر انسپکٹر شرما کے کمرے میں لے آیا اور پوچھا۔

"مہاراج اور کیا حکم ہے۔"

انسپکٹر شرما نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

"تم باہر ڈیوٹی دو باقی سپاہیوں کو بھیج دو۔ ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب!"

کمرے میں آتے ہی شیرنی نے شراب کی بو محسوس کی۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے کس لیے یہاں لایا گیا ہے۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دیوار کے ساتھ پلنگ لگا تھا۔ قریب ہی صوفہ سیٹ تھا۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا جس کی روشنی دھندلی دھندلی تھی۔ چونکہ رات کو خنکی ہو جاتی تھی اس لیے چھت کا پنکھا نہیں چل رہا تھا۔ انسپکٹر شرما نے سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس نے انگریزی زبان میں بات شروع کی۔ شیرنی کو سامنے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا دیا۔ شیرنی عائشہ کے سر پر بال اگ آئے تھے۔ بھوئیں بھی بالوں سے بھر گئی تھیں۔ انسپکٹر شرما نے ولایتی شراب کی بوتل صوفے کے ساتھ ہی فرش پر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے گلاس میں تھوڑی سی شراب ڈال کر پی۔ نیا سگریٹ سلگایا اور شیرنی کی طرف آگے کو ذرا سا جھک کر غور سے تکتے ہوئے بولا۔

"تمہارے بارے میں ہمیں فل رپورٹ مل چکی ہے۔ تم جوگن کے بھیس میں پاکستانی ایجنٹ ہو۔ میں نے تمہیں اپنے اس فلیٹ پر اس لیے بلایا ہے کہ میں تمہارے ساتھ روایتی سلوک نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ پورا تعاون کرو گی۔"

شیرنی نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں پاکستانی ایجنٹ نہیں ہوں۔ میں لنکا کے ایک کالج کی لیکچرار ہوں۔ مجھے اپنی ہندو مائیتھالوجی نے بے حد متاثر کیا اور میں جوگن بن کر ہندوستان کے ہندوؤں کے مقدس مقامات کی یاترا کو نکلی ہوں۔ میرا نام ساوتری ہے۔"

انسپکٹر شرما نے گہرا سانس لیا ایک لمحے کے لیے ٹکٹکی باندھ کر شیرنی کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم ہمیں صرف ان لوگوں کے

نام پتے بتا دو جو تمہارے ساتھ یہاں بھارت میں رہ کر پاکستان کے لیے جاسوسی کر رہے ہیں میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ان لوگوں کی گرفتاری کے بعد تمہیں پورا پورا تحفظ دیا جائے گا۔ اور ہمارا محکمہ تمہیں اپنے خرچ پر کسی پرفضا مقام کے فائیو اسٹار ہوٹل میں بھیج دے گا جہاں تم مہینہ دو مہینہ آرام سے رہو گی۔" شیرنی نے جواب دیا۔

"مسٹر شرما! میں تمہیں کہہ چکی ہوں کہ میرا کسی جاسوس گروہ سے تعلق نہیں ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی جاسوسی نہیں کی۔ میں ایک پڑھی لکھی جوگن ہوں اور ہندوستان کی یاترا پر آئی ہوئی ہوں۔"

انسپکٹر شرما اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر وہ کمرے کے دروازے کی طرف گیا۔ اس کی چٹخنی چڑھائی۔ واپس آکر صوفے کے پیچھے سے اسکاچ کی بوتل اٹھا کر کھڑے کھڑے گلاس میں ایک ڈبل پیگ بنایا۔ وہیں کھڑے اسے پانی ملائے بغیر چڑھا گیا۔ شیرنی یہ سب کچھ گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ انسپکٹر شرما اپنے طور پر بڑا مطمئن تھا۔ اسے مطمئن ہونا بھی چاہیے تھا۔ ایک قیدی عورت اس کے قبضے میں تھی۔ باہر اس کے سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ اگر وہ اس عورت کی عزت برباد کر کے اسے قتل بھی کر دیتا ہے تو اسے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ مگر وہ صرف ایک حقیقت سے بے خبر تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والا ہے۔ شیرنی عائشہ انسپکٹر شرما کی ایک ایک حرکت کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ انسپکٹر شرما کو اب ہلکا ہلکا سا نشہ ہو گیا تھا جس نے اس کی درندگی اور خباثت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ شیرنی عائشہ نے جب ایک بار پھر اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ بے قصور ہے۔ تو انسپکٹر شرما نے اسے بڑی غلیظ گالی دے دی۔ شیرنی کی آنکھوں مین سرخ رنگ کی چمک سی پیدا ہو کر گزر گئی۔ انسپکٹر شرما نے شیرنی عائشہ کو اوپر تلے چھ سات گالیاں دے دیں اور بولا۔

"تم کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو؟ میں نے بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیے ہیں تم تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہو۔ چلو اٹھو اور اپنا یہ فراڈ جوگنوں والا لباس اتار کر ایک طرف رکھ دو۔"

عزت کی خاطر مر جانے یا مار دینے کا وقت آن پہنچا تھا۔ دنیا کے سارے لعل و جواہر

ساری دولتیں سارے رشتے ناتے سوکھے پتوں کی طرح ہوا کے ساتھ اڑ گئے تھے۔ اب صرف ایک ہی رشتہ باقی تھا۔ عزت اور غیرت کا رشتہ۔ اسی رشتے کی آبرو بچانے کے واسطے یا خود مرجانا تھا یا اس پر حملہ کرنے والے کو ہلاک کر دینا تھا۔ شیرنی تمام امکانات کا جائزہ لے چکی تھی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ انسپکٹر شرما کا پیٹی میں لگا ہوا پستول پلنگ کے سرہانے کے پاس پڑا تھا۔ شیرنی کو اپنے باپ کی دی ہوئی کمانڈو ٹریننگ کو ہی بروئے کار لانا تھا۔ مگر زیادہ وقت نہیں لگانا تھا۔ انسپکٹر شرما نے دوسری بار پھر گالی دے کر غصے میں شیرنی کو حکم دیا کہ وہ ساڑھی اتار دے۔ یہ ساری باتیں انگریزی زبان میں ہو رہی تھیں۔ عائشہ شیرنی کے بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ وہ صوفے پر سے اٹھی اور انسپکٹر شرما سے باتھ روم کا پوچھا۔ انسپکٹر شرما بھی صوفے پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ میرے ساتھ آؤ۔" شیرنی کو ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں اپنا پلان تبدیل کرنا پڑا۔ اسے باتھ روم جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ محض اپنی جگہ سے کچھ قدم پیچھے ہٹنا چاہتی تھی۔ انسپکٹر شرما نے شیرنی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔ شیرنی تیز تیز قدم اٹھاتی باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ انسپکٹر بھی اس کے ساتھ ہی باتھ روم میں آگیا۔ جونہی انسپکٹر شرما باتھ روم کا دروازہ بند کرنے کے لیے گھوما شیرنی نے اپنا سیدھا بازو اوپر اٹھایا۔ اس کا بازو کہنی سے لے کر کلائی تک فولاد کی لٹھ بن چکا تھا۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کر شیرنی نے پوری مہارت اور پوری طاقت سے بازو کا لٹھ انسپکٹر شرما کی گردن کے پچھلے حصے پر مارا۔ یہ ضرب اتنی شدید اور ٹھیک نشانے پر لگی تھی کہ انسپکٹر شرما چکرا کر گرا شیرنی نے اسے گرتے ہوئے میں ٹھوڑی کے نیچے اسی بازو سے حلق پر ایک اور شدید ضرب لگائی۔ پھر دونوں ہاتھوں کے پنجے کھول کر اوپر اٹھائے اور جھپٹا مار کر انسپکٹر شرما کی گردن میں گاڑ دیے۔ اور اسے جھٹکے دینے لگی۔ گردن کی ہڈی پر پیچھے سے پہلی ضرب کے لگتے ہی انسپکٹر شرما کی ہنسلی کی ہڈی کی ایک ڈسک اپنی جگہ سے ہل گئی تھی اور اس کا نچلا دھڑ سن ہو گیا تھا۔ دوسری ضرب پر وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور جب حلقوم میں پنجہ گاڑ کر شیرنی نے چھ سات جھٹکے دیے تو گلے کی ہڈی کی اکھڑی ہوئی ڈسک الگ ہو گئی۔

شیرنی پیچھے ہٹ کر باتھ روم کی روشنی میں ٹائیلوں والے فرش پر پڑے انسپکٹر شرما کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس شخص کے بدن کے پٹھوں نے اپنا آپ چھوڑ دیا تھا۔ شیرنی نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ رکھ دیا۔ اسے سانس کی ہلکی سی گرماہٹ محسوس ہوئی۔ پھر اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ دل کی دھڑکنیں گہرائیوں میں ڈوب رہی تھیں۔ اب شیرنی کو اس لاش سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ باتھ روم کا کوئی عقبی دروازہ نہیں تھا۔ صرف ایک کھڑکی تھی جو سنک کے پیچھے بنی ہوئی تھی اور جس پر پردہ گرا تھا۔ شیرنی نے سب سے پہلے باتھ روم کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ پھر کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ بند کھڑکی کی اوپر نیچے والی دونوں چٹخنیاں لگی ہوئی تھیں۔ شیرنی کو صرف ایک ڈر تھا کہ کہیں کھڑکی کے پیچھے لوہے کی سلاخوں والا جنگلا نہ لگا ہو۔ اس نے آہستہ سے چٹخنیاں اتار کر کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھولا۔ اور ہاتھ آگے بڑھایا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ یہاں ابھی تک جالی دار گرل نہیں لگائی گئی تھی۔ اور اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انسپکٹر شرما نے کمرے کی ساری کھڑکیوں پر سلاخ دار گرل لگائی تھیں مگر باتھ روم کی کھڑکی پر لوہے کی گرل اس لیے نہیں لگائی تھی کہ اگر کبھی کوئی ہنگامی صورتحال پیدا ہو جائے تو وہ فلیٹ پر لائی ہوئی عورت کو وہاں سے باہر بھگا سکے۔ یہ کھڑکی شیرنی کے کام آگئی تھی۔ شیرنی کھڑکی کی طرف بڑھی تو اچانک اسے ایک خیال آگیا۔ اس نے جلدی سے باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ ڈرائینگ روم میں آئی۔ پلنگ پر پڑا ہوا انسپکٹر شرما کا پستول ہولسٹر میں سے نکال کر اس کا میگزین چیک کیا۔ یہ ریوالور تھا اور اس میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ شیرنی نے بیلٹ وہیں رہنے دی۔ ریوالور اپنی زرد ساڑھی میں اچھی طرح سے چھپا لیا۔ واپس باتھ روم میں آکر ایک نظر انسپکٹر شرما پر ڈالی۔ وہ مرچکا تھا۔ پھر کھڑکی میں سے دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ یہ پہلی منزل کا فلیٹ تھا باہر سامنے والے فلیٹوں کے پچھواڑے لگتے تھے جہاں کہیں کہیں بجلی کا بلب روشن تھا۔ اور باتھ روموں میں بھی روشنی ہو رہی تھی۔ نیچے سوکھی گھاس اور کچھ اینٹیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ شیرنی جلدی سے کھڑکی میں سے نیچے اتر گئی۔ نیچے اترتے ہی اس نے باتھ روم کی کھڑکی بند کر دی۔ پولیس پارٹی کو چونکہ معلوم تھا کہ انسپکٹر شرما پاکستانی جاسوسہ عورت کے ساتھ اپنے کمرے میں ہے اور وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اندر لگائے گا چنانچہ پولیس مطمئن

تھی اور کسی سپاہی نے پیچھے آکر پہرہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

شیرنی نے اپنے آپ کو اچھی طرح سے سمیٹا اور سامنے والے فلیٹوں کے درمیان جو گلی بنی ہوئی تھی اس طرف چل پڑی۔ وہ جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتی تھی۔ ریوالور ذرا سا کھسک کر نیچے آگیا تھا۔ شیرنی نے چلتے چلتے ساڑھی کو کھینچ کر اسے اوپر کر لیا۔ اس کے اندازے کے مطابق کم از کم آدھے گھنٹے تک تو انسپکٹر شرما کی لاش کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس آدھے گھنٹے میں شیرنی کو اس شہر سے نکل جانا تھا۔ اس کے پاس دس پندرہ روپے ہی باقی رہ گئے تھے۔ اسے راستوں کا بھی پتہ نہیں تھا کہ کون سی سڑک ریلوے اسٹیشن کو جاتی ہے۔ اب اس بات کی بھی سخت ضرورت تھی کہ شیرنی زرد رنگ کی جوگنوں والی ساڑھی سے بھی نجات حاصل کرے۔ کیونکہ گھنٹے آدھ گھنٹے بعد جب انسپکٹر شرما کے قتل کا پولیس کو علم ہو گا تو شہر کے تمام تھانوں اور خصوصی طور پر ریلوے اسٹیشن کی پولیس کو فوراً خبر کر دی جائے گی اور اس کے بعد پولیس اسے کہیں بھی پکڑ سکتی ہے۔ مگر سوال یہ تھا کہ ساڑھی کس کے ساتھ بدلے؟ وہ یہ سوچتی فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی کہ ایک خالی ٹیکسی تھوڑا آگے جا کر رک گئی۔ اس میں سے ایک بڑی مسکین صورت والا دبلا پتلا آدمی باہر نکلا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"بھکشنی جی! مجھے حکم کریں۔ جہاں آپ نے جانا ہے۔ میں وہاں پہنچائے دیتا ہوں۔"

شیرنی جانتی تھی کہ انڈیا میں لوگ جوگی جوگنوں کی خدمت کرنا بڑا ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ وہ بھی اس وقت اس علاقے سے نکل جانا چاہتی تھی پھر بھی اس نے پوچھ لیا کہ ریلوے اسٹیشن تک کتنا کرایہ ہو گا۔ ہندو ڈرائیور نے عاجزی سے کہا۔

"میا! مجھے سیوا کرنے کا موقع دو۔ میں بھگت جنوں سے کرایہ لے کر پاپ نہیں کماؤں گا۔ بیٹھیے میں آپ کو اسٹیشن پہنچائے دیتا ہوں۔"

شیرنی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ہندو ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ شیرنی نے کہا" مجھے جلدی اسٹیشن پہنچنا ہے۔"

"فکر نہ کریں میا جی!"

اس نے ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی شیرنی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سی سڑکیں

ہیں۔ جب ٹیکسی ذرا خالی خالی سے علاقے میں آئی تو شیرنی نے پوچھا۔

"ادھر کہاں آ گئے ہو؟"

وہ یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ ان سڑکوں سے واقف ہے۔ ہندو ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور ہاتھ باندھ کر بڑے مسکین لہجے میں کہنے لگا۔

"میا جی! میری ماتا جی بڑی بیمار ہیں ان کے واسطے ڈاکٹر سے دوائی لایا تھا۔ اتنی اجازت دے دیں کہ میں دوائی اپنی ماتا کو پکڑا کر آتا ہوں۔ ایک منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ بس وہ سامنے ہی گھر ہے۔"

شیرنی نے اسے اجازت دے دی مگر ساتھ ہی تاکید کی کہ وہ زیادہ دیر نہ لگائے۔ ٹیکسی پھر روانہ ہو گئی۔ ایک جگہ کچے راستے پر اتری اور پھر ایک اونچے درخت کے پاس جا کر رک گئی۔ یہاں دو کچے کوٹھے تھے۔ ایک طرف اندھیرے میں گائے بندھی ہوئی تھی۔ ڈرائیور یہ کہہ کر ایک کچے مکان کے اندر چلا گیا کہ وہ اپنی ماتا جی کو دوائی دے کر آتا ہے۔ کوئی ایک منٹ بعد وہ گھبرایا ہوا شیرنی کے پاس آکر ہاتھ باندھ کر بولا۔

"بہن جی! میری ماتا کو کچھ ہو گیا ہے۔ بھگوان کے لیے انہیں چل کر دیکھیں یہاں میرا کوئی نہیں ہے۔" اور وہ رونے لگ گیا۔ شیرنی دل میں کڑھتی ہوئی اس کے ساتھ کوٹھری کی طرف بڑھی۔ جونہی وہ کوٹھری میں داخل ہوئی تین ہٹے کٹے بدمعاش ٹائپ آدمی ایک طرف سے نکل کر اس کے سامنے آ گئے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا جب کے دوسرے دو نے چاقو تان رکھے تھے۔ مکار ڈرائیور ہنستا ہوا اندر داخل ہوا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"لو بھئی ارجن! آج منہ کا مزا بدلنے کے خیال سے ایک جوگن کو پکڑ لایا ہوں۔"

ارجن کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے شیرنی سے کہا۔

"بیٹھو جی! چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ ذرا تمہارے ساتھ تھوڑی دیر گیان دھیان کر لیں۔"

اور دوسرے غنڈے نے شیرنی کو چارپائی پر دھکا دے دیا۔ شیرنی کا ریوالور نیچے گرتے گرتے بچا۔ اس نے جلدی سے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔ شیرنی چارپائی پر گرتے ہی سنبھل گئی تھی اور ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ارجن غنڈے نے پستول ایک

طرف رکھا اور شیرنی کو چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شیرنی نے پیٹ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اصل میں اس نے ساڑھی کے اندر ریوالور کو سنبھالا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"میرے پیٹ میں درد ہے۔" ایک ہندو بدمعاش نے ارجن سے کہا۔ "ارجن بھائی اسے سکاچ کا ایک ڈبل پیگ پلاؤ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" ارجن نے ڈرائیور کی طرف دیکھا اور کہا۔

"الماری میں سے اسکاچ کی بڑی بوتل نکالو یار۔" جونہی ٹیکسی ڈرائیور نے الماری کھولی شیرنی نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ساڑھی کے اندر ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالا اور فائر کر دیا۔ پہلی گولی مکار ہندو ڈرائیور کو لگی جو وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسری گولی ارجن کے سینے میں۔ تیسری چارپائی کے سرہانے کی طرف کھڑے بدمعاش کو اور چوتھی گولی دروازے کی طرف دوڑتے غنڈے کی پیٹھ پر لگی اور وہ بھی وہیں گر پڑا۔ شیرنی کی شبانہ اور انتھک ٹریننگ کا تقاضہ تھا کہ اس کا نشانہ خطا نہ ہو اور اس کا ایک بھی نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔ چاروں گولیوں نے چاروں بدمعاشوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ شیرنی نے دروازے میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی اور وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ فائرنگ کی آواز سن کر وہاں کوئی آیا تو نہیں۔ وہاں کوئی نہیں آیا تھا یہ جگہ ویسے بھی آبادی سے کچھ فاصلے پر تھی۔ صرف درخت کے نیچے بندھی ہوئی گائے نے بولنا شروع کر دیا تھا۔

شیرنی نے لاشوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اپنی ساڑھی بدلنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کسی جگہ ان لوگوں کے مردانہ کپڑے ضرور ہوں گے۔ اچانک اسے ساتھ والی کوٹھری سے گھٹی گھٹی سی انسانی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے کوٹھری کے اندر آ گئی۔ اندر اندھیرا تھا۔ دروازہ کھلنے سے اس کمرے کی روشنی اندر گئی تو شیرنی نے دیکھا کہ ایک دبلی پتلی سیاہ بالوں والی لڑکی چارپائی کے ساتھ بندھی پڑی ہے اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا ہے۔ شیرنی نے ریوالور ساڑھی میں چھپا لیا اور جلدی سے لڑکی کے منہ میں سے کپڑا نکال دیا اور اس کی رسیاں کھولتے ہوئے پوچھا۔ "تم کون ہو؟" لڑکی سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے شیرنی کو تک رہی تھی۔ شیرنی نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ وہ لوگ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ کیا تم کو یہ لوگ اغوا کر کے لائے

ہیں؟" لڑکی نے شیرنی کے گھٹنے پکڑ لیے۔

"خدا کے لیے مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ یہ لوگ مجھے خراب کر کے مار ڈالیں گے۔"

شیرنی نے پوچھا۔

"کیا تم مسلمان ہو؟" لڑکی نے کہا۔

"ہاں میرا نام سلطانہ ہے یہ غنڈے مجھے تھوڑی دیر پہلے اٹھا کر یہاں لے آئے تھے خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو۔ یہ پٹاخے کہاں چلے تھے؟" شیرنی نے لڑکی کو حوصلہ دیا اور کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گی۔"

"تم جوگن ہو ناں؟" لڑکی نے پوچھا۔ جب وہ لاشوں والے کمرے سے گزرنے لگی تو چار لاشیں پڑی دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی۔ شیرنی نے اس کا بازو پکڑ کر آگے کو کیا اور کہا۔

"ادھر مت دیکھو۔ باہر چلو۔" باہر ٹیکسی تو کھڑی تھی مگر شیرنی اب ٹیکسی میں جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی کیونکہ اب انسپکٹر شرما کے قتل کا راز کھل گیا ہو گا۔ اور دلی کی پولیس زرد کپڑوں والی جوگن کی تلاش میں ہو گی۔ اس نے سلطانہ سے پوچھا کہ اس کا گھر وہاں سے کتنی دور ہے۔ سلطانہ نے بتایا کہ ریلوے اسٹیشن کے پیچھے ان کا مکان ہے۔ شیرنی نے سلطانہ سے پوچھا کہ کیا اسے ریلوے اسٹیشن تک کا راستہ آتا ہے؟ سلطانہ نے کہا۔

"ہاں یہاں سے کافی دور ہے۔"

شیرنی نے مجبور ہو کر ٹیکسی میں ہی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جوگن ٹیکسی چلاتے عجیب لگتی۔ مگر شیرنی کے پاس کوئی اور حل نہ تھا۔ سلطانہ کہنے لگی یہاں سے ایک بس سیدھی ریلوے اسٹیشن کو جاتی ہے۔ شیرنی کو یہ ترکیب پسند آئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی بڑی سڑک پر آ گئیں۔ سلطانہ ان سارے راستوں اور سڑکوں سے واقف تھی۔ آگے ایک بس اسٹاپ آ گیا۔ دونوں وہاں کھڑی ہو گئیں۔ اتنے میں وہاں بس آ گئی۔ بس بھری ہوئی تھی۔ وہ دونوں بھی گھس کر بس میں بیٹھ گئیں۔ شیرنی نے چار پانچ روپے پہلے ہی ہاتھ میں تھام رکھے تھے۔ بس تیزی سے سڑک پر روانہ ہو گئی۔ اس کے اسٹاپ کافی لمبے لمبے تھے۔ پھر بھی جب بس اسٹاپ پر بس رکتی تو شیرنی اپنا سر دوسرے مسافروں کی اوٹ میں کر لیتی۔ آخر ریلوے

اسٹیشن کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ بس ریلوے کا ایک بڑا پل عبور کر کے اسٹیشن کے پیچھے ایک بستی کے بس اسٹاپ پر رکی تو سلطانہ شیرنی کو ساتھ لے کر نیچے اتر پڑی اور گلی کے پیچھے کی طرف سے جب اپنے گھر میں داخل ہوئی تو اس کے ماں باپ نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ خوشی سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک گھنٹہ پہلے جب سلطانہ اپنے باپ کے ساتھ اپنے ماموں کے گھر سے واپس آ رہی تھی تو محلے کے ہندو غنڈے پرکاش نے اپنے دو غنڈوں کے ساتھ مل کر سلطانہ کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور اس کے باپ کو چیخ وپکار کرتا چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ وہ دلی کا ہندو اکثریت کا محلہ تھا۔ کسی نے سلطانہ کے باپ کی آہ وبکا پر کان نہیں دھرا تھا۔ ویسے بھی پرکاش محلے کا خطرناک غنڈہ تھا۔ اس سے کوئی دشمنی مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ اب جب بیٹی گھر میں واپس آ گئی اور اس نے بتایا کہ جوگن بہن نے اسے وہاں سے نکالا ہے اور پرکاش سمیت چاروں غنڈے ہلاک ہو چکے ہیں تو سلطانہ کے ماں باپ پریشان ہو گئے۔ شیرنی کہنے لگی ”آپ لوگ پریشان کیوں ہیں۔ غنڈے اپنے انجام کو پہنچے۔ خواہ انہیں کسی نے بھی قتل کیا ہو۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔“ ماں نے جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ باپ تخت پوش پر بیٹی کے پاس بیٹھ گیا اور شیرنی سے مخاطب ہو کر بولا۔

”بیٹی! پرکاش اور اس کے ساتھیوں کے قتل کا بدلہ اب ہم سے لے لیا جائے گا۔ بیٹی کو یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ میں اسے اپنے بھائی کے پاس امرتسر لے جاتا ہوں۔ ساڑھے دس بجے والی جنتا ایکسپریس مجھے مل سکتی ہے۔“ شیرنی نے کہا۔

”اگر آپ بھی یہاں سے غائب ہو گئے تو پولیس یہی سمجھے گی کہ ان بدمعاشوں کے قتل میں آپ کا بھی ہاتھ ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ دونوں یہیں رہیں۔ سلطانہ کو میں امرتسر اس کے چچا کے گھر پہنچائے دیتی ہوں۔ پولیس آپ پر شک نہیں کر سکے گی۔ آپ یہی بیان دیں گے کہ ہماری بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ ہمیں کیا معلوم ہماری بیٹی کو ان بدمعاشوں نے کہاں قید میں ڈال رکھا ہے ہمیں تو اپنی بیٹی کی فکر ہے کہ کہیں اسے بھی قتل نہ کر دیا گیا ہو۔“ سلطانہ کی والدہ نے اپنے خاوند سے کہا۔

”جوگن بیٹی ٹھیک کہتی ہے۔ تمہیں اس وقت گھر سے غائب نہیں ہونا چاہیے۔“ اب

سلطانہ کی ماں اور باپ جوگن کی طرف تکنے لگے۔

”بیٹی!“ ماں نے کہا۔ ”کیا تو ہماری بچی کو خیریت کے ساتھ پہنچا دے گی؟“ شیرنی نے کہا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی جوگن وغیرہ نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور یہ جوگن کا بھیس میں نے اسی لیے بدل رکھا ہے کہ میرا تعلق کشمیری حریت پسندوں کی تحریک آزادی سے ہے اور میں یہاں ایک خاص مشن پر آئی ہوئی تھی کہ بدقسمتی سے ان غنڈوں کے ہتھے چڑھ گئی مگر میرے پاس ریوالور تھا اور میں نے ان چاروں کو مار ڈالا۔“ سلطانہ اس کی والدہ اور باپ تو شیرنی کی بلائیں لینے لگے اور باپ کہنے لگا۔

”بیٹی! خدا کرے کہ کشمیر آزاد ہو۔ انشاء اللہ ایک دن کشمیر ضرور آزاد ہو گا۔ کیا نام ہے تمہارا بیٹی؟ شیرنی نے اپنا اصلی نام عائشہ ہی بتا دیا۔

”مجھے بھی واپس کشمیر ہی جانا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں سلطانہ کو اس کے چچا کے گھر پہنچانے کے بعد آگے جاؤں گی۔ مگر سب سے پہلے میں یہ لباس تبدیل کرنا چاہتی ہوں۔“ اسی وقت سلطانہ نے صندوق میں سے اپنا ایک دھلا ہوا جوڑا نکال کر شیرنی کو دیا جو اس نے پہن لیا۔ اس کے سر کے بال ابھی لڑکیوں جتنے نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ سلطانہ کی والدہ کا برقعہ شیرنی نے اوڑھ لیا۔ اس طرح سے وہ پہچانی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ انسپکٹر شرما کا ریوالور شیرنی نے اپنے پاس ہی رکھا۔ سلطانہ کے باپ نے کچھ روپے شیرنی کو دیئے جو انہیں امرتسر تک پہنچانے کے لیے کافی تھے۔

سلطانہ نے بھی برقعہ اوڑھ لیا تھا۔ دونوں برقعہ پوش خواتین یعنی شیرنی اور سلطانہ مکان سے نکلیں اور ریلوے اسٹیشن کی طرف پیدل ہی چل دیں۔ سلطانہ یہاں کے ایک ایک پلیٹ فارم اور ایک ایک ریل گاڑی سے واقف تھی۔ شیرنی برقعے میں بھی بڑی محتاط تھی۔ ماحول کا پورا پورا جائزہ لے رہی تھی۔ سلطانہ نے ہی امرتسر کے دو ٹکٹ خریدے۔ پلیٹ فارم پر کافی رش تھا۔ دلی کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہوا تھا۔ رات دن میں کوئی گاڑی ایسی نہ ہوتی جس میں مسافروں کا ہجوم نہ ہوتا۔

شیرنی اور سلطانہ بھی دوسری عورتوں کے ساتھ ایک ڈبے میں بیٹھ گئیں۔ خدا خدا کر کے گاڑی نے پلیٹ فارم چھوڑا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی۔ کسی نہ کسی طرح رات

کٹ گئی۔ دن نکلا تو ٹرین مشرقی پنجاب کے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔ امرتسر اس سفر کا آخری اسٹیشن تھا۔ وہاں شیرنی اور سلطانہ ٹرین سے اتر پڑیں۔ سلطانہ کو چچا کے مکان کا پتہ تھا۔ اسٹیشن کے باہر سے انہوں نے سائیکل رکشہ پکڑا اور پتلی گھر چچا کے مکان پر پہنچ گئیں۔ چچا سلطانہ کے ساتھ دوسری عورت کو دیکھ کر کچھ حیران سا ہوا۔ کہنے لگا۔

"تمہاری والدہ ساتھ کیوں نہیں آئیں؟" سلطانہ نے شیرنی کا یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ یہ میری سہیلی ہے۔ چچی اور ان کے بچے بھی آ گئے۔ وہاں رونق سی لگ گئی۔ شیرنی اور سلطانہ نے کچھ نہ بتایا کہ پیچھے کیا واردات ہوئی ہے۔ ایک رات شیرنی ان لوگوں کے ہاں رہی اس نے سلطانہ اور اس کے چچا کو یہی بتایا تھا کہ وہ جموں جا رہی ہے جہاں اس کا باپ کسی جگہ ٹھہرا ہوا ہے مگر اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ جگہ کونسی ہے۔ سلطانہ کے چچا نے پوچھا۔

"بیٹی تمہارے باپ کا وہاں کیا کاروبار ہے؟" شیرنی نے کہا "یہی تو مجھے معلوم نہیں ہے۔ میرے ڈیڈی کشمیری حریت پسندوں کے خفیہ اڈوں پر راشن وغیرہ سپلائی کیا کرتے تھے۔ پھر سنا کہ بھارتی پولیس نے انہیں پکڑ لیا ہے۔ اب یہ خبر ملی ہے کہ بے قصور ثابت ہونے پر بھارتی پولیس نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور وہ جموں میں ہی کسی جگہ مقیم ہیں۔ بس میں ان کی کھوج میں جا رہی ہوں۔" سلطانہ کے چچا نے کہا۔

"بیٹی! جموں صرف بڑا شہر ہی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں اور خاص طور پر پنجابی مسلمانوں کے لیے بڑا خطرناک شہر ہے۔ تمہیں بھارتی فوجی کسی وقت بھی پاکستانی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر سکتے ہیں۔ سلطانہ کے چچا نے کہا "تم ایسا کرو کہ جموں شہر میں اسٹیشن کے پاس ہی ریل بازار ہے۔ وہاں میرے ایک دوست عبدالستار کی چوڑیوں کی دکان ہے۔ تم میرا خط اس کو جا کر دے دینا۔ تم اسی کے گھر میں ہی ٹھہرنا۔ وہ تمہارے والد کی تلاش میں تمہاری مدد کرے گا۔" یہ بڑی اچھی سہولت تھی جو شیرنی کو مل گئی تھی۔ اسے جموں شہر میں ایسا ہی ایک شریفانہ ٹھکانہ چاہیے تھا جہاں رہ کر وہ اپنے باپ شیر خان کو تلاش کر سکے جس کے بارے میں شیرنی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کلکتہ کی جیل میں بند ہے اور اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔

شیرنی نے یہاں برقعہ اتار دیا تھا اور وہاں کی عورتوں کا عام پہناوا یعنی شلوار قمیص پہن لی تھی۔ ریوالور ابھی تک اس کے پاس ہی تھا۔ اس ریوالور کو چھپانا شیرنی کے واسطے ایک مسئلہ بنا ہوا تھا مگر وہ اسے ہر حالت میں اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ امرتسر سے بذریعہ پسنجر ٹرین شیرنی مجیٹھ انبالہ 'گورداسپور' سجان پور اور کٹھوعہ کے راستے سے جموں کی طرف روانہ ہو گئی۔

ٹرین مجیٹھ اور انبالہ کے درمیان پہنچی تو اس کا انجن اچانک فیل ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ سنگل ٹریک کی وجہ سے جالندھر سے نئے انجن کو آتے آتے دیر ہو جائے گی اور رات وہیں گزارنی ہو گی۔ شیرنی کے ساتھ کچھ دوسری عورتوں نے پروگرام بنا لیا کہ وہ آگے کا سفر بس میں کریں گی۔ ویران علاقے میں رات گزارنے میں خطرہ تھا کہ خالصتان کے حامی حملہ نہ کر دیں کیونکہ ٹرین میں ہندو یاتریوں کی تعداد زیادہ تھی۔ کچھ ہندو یاتری بھی بس پکڑنے کے لیے بڑی سڑک پر آ کر بیٹھ گئے۔ شیرنی بھی دوسری سکھ اور ہندو عورتوں کے ساتھ سڑک پر آ گئی۔ ایک بس میں اسے بھی جگہ مل گئی۔ یہ بس جموں جا رہی تھی۔ اس میں پہلے سے ہندو سواریاں بیٹھی تھیں۔ سکھ صرف دو چار ہی تھے۔ بس گورداسپور کے قریب پہنچی تو اس نے ایک نہر کا پل عبور کیا۔ جونہی پل کی دوسری جانب آئی آگے سڑک پر دو چار کٹے ہوئے درخت ڈال کر سڑک بند کر دی گئی تھی۔ ڈرائیور سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے بس کو پیچھے موڑ کر بھاگ جانے کی کوشش کی مگر اتنی دیر میں ایک طرف درختوں سے چھ سات ڈاکو منہ پر کپڑا باندھے بندوقیں فائر کرتے آ گئے۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے دس بارہ ہندوؤں کو بھون کر رکھ دیا۔ باقیوں کو حکم دیا کہ نیچے اتر کر لائن میں کھڑے ہو جائیں۔ سب کا سامان لوٹ لیا۔ اب مسافر عورتوں اور مردوں کی تلاشی شروع ہوئی۔ عورتوں کے زیور وغیرہ اتروائے جانے لگے۔

ایک ڈاکو شیرنی کی تلاشی لینے لگا تو شیرنی نے فوراً ریوالور نکال کر فائر کر دیا۔ گولی ڈاکو کے ماتھے میں شگاف ڈالتی ہوئی اس کی کھوپڑی کی دوسری طرف سے نکل گئی۔ گولی کی آواز پر اس کے ساتھی ڈاکوؤں نے ادھر دیکھا۔ شیرنی انہیں اتنا وقت نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے ریوالور کا رخ ان کی طرف کیا اور اوپر تلے چار ڈاکوؤں کو نشانے کی زد میں لے کر بھون

ڈالا۔ باقی ڈاکوؤں میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ انہیں کسی عورت سے اس رد عمل کی توقع ہی نہیں تھی۔ مسافر ادھر ادھر بھاگ اٹھے۔ چار ڈاکو باقی رہ گئے تھے۔ بس کا ڈرائیور بھی بھاگ گیا تھا۔ ڈاکوؤں نے بس کے اگلے دونوں ٹائر پہلے ہی گولیوں سے چھلنی کر دیے تھے۔ شیرنی کے پاس زیادہ گولیاں نہیں تھیں۔ ریوالور میں صرف تین گولیاں باقی رہ گئی تھیں۔ اس نے ایک گولی ڈاکوؤں کی طرف فائر کی اور درختوں کی طرف پیچھے ہٹنے لگی۔ یہ بات اس کے ذہن میں تھی کہ یہ ڈاکو پیچھے جو درخت تھے اس طرف سے آئے تھے اور ظاہر ہے وہاں ان کی کوئی نہ کوئی جیپ یا دوسری گاڑی ضرور کھڑی ہو گی۔ وہ درختوں کی طرف دوڑ پڑی۔ پیچھے ڈاکو اس پر گولیاں برسانے لگے۔ شیرنی نے رک کر پیچھے کی طرف ایک فائر کیا اور جتنی تیزی سے دوڑ سکتی تھی دوڑنے لگی۔ وہ درختوں سے نکل کر ایک کچی سڑک پر آئی تو ایک کھلی جیپ آرہی تھی جس میں چھ سات سکھ بیٹھے تھے۔ شیرنی پر پہلے سے ڈاکو برابر گولیاں چلاتے چلے آرہے تھے۔ سکھوں نے جیپ جلدی سے درختوں کے پیچھے لے جا کر روک لی۔ شیرنی نے پیچھے مڑ کر ایک اور فائر کیا تو ایک سکھ لپک کر اس کے پاس آیا اور اسے بازو سے پکڑ کر تیزی سے درختوں کے پیچھے لے گیا۔ دوسرے سکھ بھی شیرنی کو غور سے دیکھنے لگے۔

"واہ بھئی واہ! بڑی شیرنی کی بچی ہو کون ہو تم؟" جو سکھ شیرنی کو فائرنگ میں سے نکال کر لے گیا تھا اس نے پوچھا۔ دوسرا سکھ کہنے لگا۔

"گردیال سیاں! امید تے ہرنامے ڈاکو دے آدمی نے۔" (یہ تو ہرنامے ڈاکو کے آدمی ہیں ۔ دیال نے دو نالی بندوق ان کی طرف کر دی۔ پھر سب نے اپنی بندوقوں اور رائفلوں کا رخ ڈاکوؤں کی طرف کر دیا جو شیرنی کے پیچھے پیچھے سڑک پر آ گئے تھے۔ ان سکھوں نے فائر کھول دیا۔ گردیال سنگھ نے بھڑک مار کر کہا۔

"کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑنا۔" وہ کل چار تھے۔ ان سکھوں کی فائرنگ میں چاروں کے چاروں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ گردیال سنگھ نے شیرنی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"تو کون ہے بھئی کڑیے! تیرا نام کیا ہے؟" شیرنی نے کہا۔

"میرا نام ہربنس کور ہے۔ میں انبالے اپنی بہن کے گھر آئی ہوئی تھی۔ واپس جموں جا

رہی تھی کہ ان ڈاکوؤں نے ہماری بس پر حملہ کر دیا۔" ایک سکھ نے پوچھا۔

"مگر تم تو ریوالور چلا رہی تھی۔ یہ ریوالور تم نے کہاں سے لے لیا ہے؟" وہ ریوالور گردیال نے لے لیا تھا اور اسے غور سے دیکھ رہا تھا کہنے لگا۔

"یہ ریوالور تو پولیس کا ہے بی بی۔" شیرنی نے کہانی گھڑتے ہوئے کہا۔

"بس میں ایک مسافر کے پاس تھا۔ وہ اسے ڈاکوؤں پر چلاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ میں نے پکڑ کر ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے اپنے کالج میں پستول چلانے کی ٹریننگ لی تھی۔"

"شاباش!" گردیال سنگھ نے شیرنی کی بہادری کی داد دیتے ہوئے کہا۔" بیٹھ جا بی بی ہم کٹھوعہ جا رہے ہیں۔ وہاں تمہیں آگے جموں جانے والی بس میں سوار کرا دیں گے۔"

شیرنی کو گردیال سنگھ نے جیپ کی اگلی سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھا لیا اور جیپ کٹھوعہ کی طرف ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ شیرنی کو ابھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ یہ لوگ اصل میں کون ہیں۔ انہوں نے آپس میں ابھی تک ایسی کوئی بات بھی نہیں کی تھی کہ جس سے شیرنی کو پتہ چلتا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ وہ انہیں ابھی زمیندار ٹائپ سکھ ہی سمجھ رہی تھی۔ جو شکار کرنے کی غرض سے بندوقیں وغیرہ لے کر نکلے تھے۔ جیپ تیزی سے کچی سڑک پر کھیتوں کے درمیان دوڑی جا رہی تھی۔ یہ علاقہ ایسا تھا کہ کبھی زمین ڈھلانی ہو جاتی تھی۔ اور کبھی اونچی جھاڑیوں میں سامنے کا منظر چھپ جاتا تھا۔ ایک جگہ جیپ جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلی تو پیچھے بیٹھے کسی سکھ نے چلا کر کہا۔

"گردیال سیاں! پولس آگئی او۔" (گردیال سنگھ پولیس آگئی ہے)

شیرنی نے بھی سامنے سے اچانک پولیس کی ایک گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھتے دیکھا۔ گردیال سنگھ نے فوراً جیپ کا اسٹیرنگ ایک طرف کو گھمایا۔ جیپ تیزی سے ایک طرف گھوم گئی۔ سارے سکھ چھلانگیں لگا کر جھاڑیوں کے پیچھے گرے اور پولیس کی گاڑی پر فائر کھول دیا۔ شیرنی بھی چھلانگ لگا کر ایک جھاڑی کے پیچھے جا گری تھی گردیال بھی وہیں گرا تھا اور اپنی شاٹ گن سے فائر کر رہا تھا۔ شیرنی نے دیکھا کہ پولیس کی نفری سات آٹھ

سپاہیوں سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ تو اس کے دیکھتے دیکھتے گر پڑے تھے۔ یہ سارے سپاہی ہندو تھے۔ ان میں کوئی ایک بھی سکھ نہیں تھا۔ گردیال نے اپنا پستول نکال کر شیرنی کی طرف پھینکا اور کہا۔

"تو بھی فائر کر بی بی۔ ہم مرگئے تو پولیس تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

تب شیرنی کو خیال آیا کہ ضرور یہ بھی ڈاکوؤں کا کوئی گروہ ہے جس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ شیرنی نے پستول سنبھالا اور ایک سپاہی کو نشانے میں لے کر فائر کیا۔ وہ ویگن کے قریب ہی گر پڑا۔ گردیال نے چیخ کر اسے شاباش دی۔

"شاباشے شیرنی دئی بچیے!" (شاباش! شیرنی کی بیٹی)۔ شیرنی گولیاں چلاتی رہی۔ اس کی گولیاں ختم ہوگئیں۔ گردیال اپنی شاٹ گن زمین پر رکھ کر جیب میں سے پستول کی گولیاں نکال کر شیرنی کو دینے لگا تو اچانک ایک جانب سے ہندو تھانیدار اس کے سر پر پہنچ گیا۔ جونہی شیرنی نے دشمن کو دیکھا۔ اس نے بجلی کی طرح تڑپ کر زمین پر سے شاٹ گن اٹھائی اور ہندو تھانیدار پر یکے بعد دیگرے دو کارتوس فائر کر دیے۔ ہندو تھانیدار کے تو پرخچے اڑ گئے۔ گردیال سنگھ نے فتح کا نعرہ مارا اور پولیس ویگن کی طرف دوڑ پڑا۔ اس کے ساتھی بھی فائرنگ کرتے ویگن کی طرف لپکے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے باقی ہندو سپاہیوں کو بھی ختم کر دیا تھا۔ پولیس ویگن میں سے رکھا ہوا سارا اسلحہ وغیرہ انہوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ گردیال نے سب کے سامنے کہا کہ بی بی ہربنس کور نے اس کی جان بچائی ہے۔

"اگر یہ بہادر بی بی اس وقت پھرتی سے کام لے کر شاٹ گن فائر نہ کرتی تو لالے تھانیدار نے مجھے بھون دیا تھا۔" پھر اس نے شیرنی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا۔ "بی بی ہربنس کور! تو آج سے میری چھوٹی بہن ہے۔ گردیال سنگھ آج سے تمہارا بڑا بھائی ہے۔ کبھی زندگی میں میری ضرورت پڑی تو ضرور مجھے یاد کرنا۔ گردیال سنگھ اپنی بہن کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دے گا۔"

تب شیرنی پر یہ راز کھلا کہ یہ لوگ سکھوں کی تحریک خالصتان کے کمانڈو ہیں جو سکھوں کی اکثریت والے مشرقی پنجاب میں ہندو کی حکومت سے نجات حاصل کر کے

خالصتان قائم کرنے کے لیے سخت جدوجہد کر رہے ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں۔ شیرنی ان کے ساتھ کٹھوعے تک آئی۔ یہاں گردیال سنگھ نے خود شیرنی کو جموں جانے والی بس میں سوار کرایا۔ ڈرائیور کو کہا۔

"یہ ہماری بہن ہے۔ اسے خود جموں اس کے گھر پہنچا دینا۔" ڈرائیور نے کہا۔

"کوئی بات نہیں سردارو! ہم خود بی بی کو اس کے گھر جا کر چھوڑ آئیں گے۔" یہ ڈرائیور ہندو ڈوگرہ تھا اور شیرنی نے محسوس کیا کہ اس نے شراب پی رکھی تھی۔ گردیال سنگھ نے شیرنی کو بس سے اچانک اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ اتر پڑی۔ گردیال سنگھ اسے ایک طرف لے گیا۔ جیب سے کچھ روپے نکال کر اسے دیے۔ شیرنی نے انکار کیا تو گردیال سنگھ نے ضد کر کے اسے روپے تھما دیے اور گردیال نے شیرنی کے کان میں گردوارے کا نام لیا اور کہا۔

"وہاں کے گرنتھی کے پاس جا کر میرا نام لینا۔ کہنا میں گردیالے کی چھوٹی بہن ہوں بس پھر دیکھنا وہ لوگ تمہاری کس طرح مدد کرتے ہیں۔ بس اب جاؤ۔ شاباش!"

"شیرنی نے ہاتھ جوڑ کر گردیال سنگھ کو ست سری اکال کہا اور بس میں آکر بیٹھ گئی۔ بس جموں کی طرف چل پڑی۔ راستے میں ہندو ڈرائیور شیرنی سے بے تکلف ہونے کی برابر کوشش کرتا رہا۔ یہ ڈرائیور نہیں جانتا تھا کہ گردیال کا تعلق خالصتان تحریک سے ہے۔ شیرنی خاموش بیٹھی رہی اور اس نے ڈرائیور کو منہ نہ لگایا۔ جموں لاری اڈے پر جا کر بس رکی تو ہندو ڈرائیور نے شیرنی سے پوچھا۔

"کہاں جاؤ گی بی بی۔ چلو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔" شیرنی نے سختی سے جواب دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود اپنے گھر پہنچ جاؤں گی۔" اور شیرنی ایک رکشے میں بیٹھ گئی۔ رکشے والے کو ریل بازار چلنے کو کہا۔ ریل بازار وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ریل بازار آکر شیرنی نے رکشا چھوڑ دیا اور ایک منیاری والے سے عبدالستار چوڑی گر کے مکان کا پتہ پوچھا۔ اس نے کہا۔

"بی بی! وہ تو آج صبح ہی بال بچوں کو لے کر اپنے بھائی کے پاس دلی چلا گیا ہے۔" شیرنی نے مایوسی کے عالم میں گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہاں ہندو رکشا ڈرائیور ایک رکشے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ شیرنی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر انتہائی مکروہ انداز میں مسکرایا۔

ہندو رکشا ڈرائیور نشے میں تھا اور شیرنی کے لیے مصیبت کا باعث بن سکتا تھا۔ وہ دشمن ملک کے ایک شہر جموں میں تھی جہاں پہلے ہی کشمیری مسلمانوں کو ذرا ذرا سے بہانے پکڑ کر تشدد کر کے ہلاک کیا جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دلی کی سلطانہ بہن کے چچا یا تایا عبدالستار کا گھر مل جائے گا تو وہ وہاں رہ کر اپنے باپ شیر خان کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گی مگر یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ عبدالستار چوڑی گر تو بال بچوں سمیت دلی جا چکا ہے اور اس کا مکان بند پڑا ہے۔

ایک لمحے کے لیے اسے محسوس ہوا کہ وہ دشمنوں کے درمیان بالکل اکیلی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس پر ستم یہ کہ ایک رکشہ ڈرائیور بھی اس کے پیچھے پڑ گیا ہے جس نے شراب وغیرہ پی رکھی ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ریل بازار کے جس نیاری والے سے شیرنی نے سلطانہ کے تایا یا چچا کا پوچھا تھا وہ اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بی بی! تم واپس چلی جاؤ تو بہتر ہو گا۔ یہاں کس کے پاس جاؤ گی۔" شیرنی کو اچانک خالصتان کمانڈو تنظیم کے گردیال سنگھ کا خیال آگیا۔ اس نے شیرنی کو جموں کے ایک گردوارے کا نام کان میں بتا کر کہا تھا کہ اگر جموں میں کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے یا کوئی تکلیف ہو تو اس گردوارے کے گرنتھی کو میرا پرنام دینا وہ تمہاری مدد کرے گا۔

شیرنی نے دکاندار کو گردوارے کا نام بتایا اور پوچھا کہ یہ گردوارہ کہاں ہے۔ دکاندار نے اسے گردوارے کا پتہ بتا دیا۔ شیرنی اس طرح چل پڑی۔ اس نے اپنے پیچھے رکشہ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ وہ سمجھ گئی کہ رکشہ ڈرائیور بھی اس کے پیچھے چل پڑا ہے۔ بازار ختم ہو گیا۔ آگے دائیں جانب ایک گھاٹی اترتی تھی۔ اس سے آگے بائیں طرف

والے میدان میں سے گزر کر آگے آ کر رک گیا۔ ہندو ڈرائیور رکشے سے اتر پڑا۔ اس نے وہاں کی ڈوگری زبان میں شیرنی سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے وہ اسے جہاں جانا چاہتی ہے پہنچادے گا۔ شیرنی کے پاس پستول موجود تھا مگر وہ فائر کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتی تھی اور رکشے والا بدمعاش آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا بھی نہیں تھا۔ شیرنی اسے محض اتنی سی بات پر ہلاک کرنے کے حق میں نہیں تھی کہ اس نے شیرنی کو ایک عورت کو بری نیت سے دیکھا ہے یا اس پر مجرمانہ حملہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ یہ شخص جو اپنی موت کو بار بار آواز دے کر بلا رہا ہے وہاں سے واپس چلا جائے۔ شیرنی نے بڑے شریفانہ لہجے میں کہا۔

"بھائی! مجھے یہاں قریب ہی جانا ہے۔ میں پیدل چلی جاؤں گی۔ تم مجھے کیوں تنگ کرتے ہو۔" مگر رکشے والے پر تو ایک بھوت سوار تھا۔ اس نے شیرنی کے ساتھ دست درازی شروع کر دی۔ شیرنی وہاں مجمع نہیں لگانا چاہتی تھی۔ اس میں اس کی سلامتی کو بھی شدید خطرہ تھا۔ ایک سیکنڈ میں اس کے ذہن میں ایک خیال فلش کی طرح آ گیا۔ وہ رکشے میں بیٹھ گئی اور بولی۔

"چلو تم جہاں چاہتے ہو مجھے لے چلو۔" رکشہ ڈرائیور کی تو باچھیں کھل گئیں۔ سگریٹ سڑک پر پھینکا اور رکشہ اسٹارٹ کر کے گھاٹی اترنے لگا۔ آگے وہ بائیں طرف ہو گیا۔ شیرنی کو میدان کے کونے میں درختوں کے بیچ میں سے گردوارے کی سفید عمارت دکھائی دی۔ مگر رکشہ دوسری طرف جا رہا تھا۔ شیرنی نے رکشے کے پیچھے جو چھوٹی سی کھڑکی بنی ہوئی تھی اس میں سے دیکھا۔ بازار میں لوگوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس شیطان صفت اور خطرناک ہندو رکشہ ڈرائیور سے پیچھا چھڑانے کا وقت آ گیا تھا۔

وہ بڑی ترنگ میں رکشہ چلا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کوئی فلمی گیت بھی گانے لگا تھا۔ ایک جوان عورت اسے مفت میں مل گئی تھی۔ وہ خوش کیوں نہ ہوتا۔ لیکن اس کے لیے اسے جو قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی اس کا اس نے کبھی خواب میں نہیں سوچا ہو گا۔ ڈرائیور اور شیرنی کے درمیان صرف لوہے کی چار سلاخیں حائل تھیں۔ رکشہ ڈرائیور کی پشت شیرنی کی طرف تھی۔ اتنے آسان شکار پر شیرنی کو ترس بھی آیا۔ مگر وہ کیا کرتی۔ یہ شخص

خود موت کے منہ میں اپنا سر دے رہا تھا۔ اب شیرنی کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ شیرنی سیٹ پر آگے کو ہو گئی۔ ایک کمانڈو عورت یا کمانڈو مرد کے واسطے یہ ایک انتہائی آسان ٹارگٹ تھا۔ یہاں کسی رسی، خنجر یا پستول کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ شیرنی نے سلاخوں کے اندر دونوں ہاتھ ڈالے اور ڈرائیور کے کندھے کو بڑے پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔

"تم بڑا اچھا گا لیتے ہو۔ یہ گانا پھر سے سناؤ۔" رکشہ ڈرائیور تو خوشی سے نہال ہو گیا۔ نشے میں جھومتے ہوئے بولا۔

"میری جان! اپنی کوٹھری میں چل کر سناؤں گا۔ شراب بھی تو راستے میں لینی ہو گی۔" وہ کچھ آگے کہنے والا تھا۔ شیرنی کو چاہیے تھا کہ وہ اسے کہہ لینے دیتی۔ کم از کم اس شخص کی آخری خواہش کا تو علم ہو جاتا۔ مگر شیرنی نے اسے آگے ایک لفظ بولنے کی بھی اجازت نہ دی۔ اس نے اپنا بایاں بازو آگے ہو کر تیزی سے ڈرائیور کی گردن میں ڈالا اور گردن کو پیچھے سلاخوں کے ساتھ لگا کر اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ ڈرائیور کی گردن آگے کو ڈھلک گئی۔ رکشہ بے قابو ہونے لگا۔ شیرنی نے ڈرائیور کے مردہ جسم کو ایک طرف دھکا دے کر ہٹایا اور بازو لمبے کر کے رکشے کا ہینڈل کنٹرول میں کر لیا۔ مگر وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر رکشہ زیادہ دیر نہیں چلا سکتی تھی وہ رکشے کو گھما کر میدان میں لے آئی۔ یہاں زمین کچی تھی۔ شیرنی نے ایک پل کے لیے ہینڈل کو چھوڑا اور بائیں جانب سے نکل کر ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھی۔ ڈرائیور کی لاش ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔ شیرنی تیزی سے رکشے کو واپس موڑ کر درختوں کے درمیان لے گئی اور بریک لگا دی۔ نیچے اتر کر اس نے سب سے پہلے یہ دیکھا کہ آس پاس کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ یہ کافی کھلا میدان تھا وہاں اسے کوئی آدمی دکھائی نہ دیا۔ شیرنی میدان کے کنارے کنارے چلنے لگی گردوارہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ گردوارے کا پھاٹک کھلا تھا۔ شلوار قمیض دوپٹہ اور بغل میں چھوٹی سی کرپان...... شیرنی کا حلیہ خالص سکھنیوں ایسا تھا ایک سکھ سیوادار اس کی طرف آیا۔

"بی بی پرشاد لینا ہے تو اس طرف جاؤ۔" شیرنی نے کہا۔

"مجھے گرنتھی صاحب سے ملنا ہے۔"

"باوا سنگھ جی کے درشنوں کو آئی ہو؟ میرے ساتھ آجاؤ۔" یہ کوئی زیادہ بڑا گردوارہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس میں بارکوں کی طرز پر کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ پتھر کی چاردیواری تھی۔ درمیان میں زرد رنگ کا جھنڈا کھمبے پر لہرا رہا تھا ایک کمرے میں سے شبدبانی کیرتن کی آواز آرہی تھی۔ دھیمی دھیمی طبلے کی تھاپ کے ساتھ ہلکا ہلکا ہارمونیم بھی بج رہا تھا۔

سیوادار شیرنی کو کمرے میں لے آیا۔ یہاں پہلے سے پندرہ بیس سکھ مرد عورتیں بڑے ادب سے بیٹھی شبد کیرتن سن رہی تھیں۔ سامنے ایک اونچے استھان پر پالکی سی بنی ہوئی تھی جس میں گرنتھ ماہر کھا تھا اور گرنتھی مور چھل ہلا رہا تھا۔ شبد کیرتن کرنے والے دو سکھ راگی تھے جو استھان کے نیچے ایک طرف بیٹھے گربانی گا رہے تھے۔ سیوادار سکھ نے پالکی کے پیچھے بیٹھے سیاہ داڑھی والے سکھ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"باوا سنگھ گرنتھی وہی ہے۔ یہاں بیٹھ کر گربانی کا انند لو۔ جب وہ فارغ ہو جائیں گے تو مل لینا۔" یہ کہہ کر سیوادار چلا گیا۔ شیرنی وہیں بڑے ادب سے بیٹھ گئی اور گربانی سننے لگی۔ کان اس کے گربانی پر لگے تھے اور ذہن میں صرف ایک ہی خیال سوالیہ نشان کی شکل میں گردش کر رہا تھا کہ وہ جموں شہر میں کہاں رہے گی اور اپنے باپ کو کیسے تلاش کرے گی۔ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اسے جموں پہنچ کر بے راہ کیا گیا ہے اصل میں اس کا باپ شیر خان تو کلکتے کی جیل میں ہے جہاں اس پر سوناگاچی کے جوا خانے میں شہاب کے قتل کے الزام یا جرم میں مقدمہ چل رہا ہے۔

شبد کیرتن ختم ہو گیا۔ سکھ شردھالو متھاٹیک کر باہر جانے لگے۔ شیرنی نے بھی گرنتھ صاحب کو متھا ٹیکا اور دری پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ شبد گانے والے بھی چلے گئے۔ سیوادار اندر داخل ہوا۔ گرنتھی باوا سنگھ پالکی سے اترا تو سیوادار نے شیرنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے کان میں کچھ کہا۔ گرنتھی نے ایک سرسری سی نگاہ شیرنی پر ڈالی اور سیوادار کو کچھ ضروری ہدایات دینے لگا۔ پھر وہ سب کا سانجھا اکو سائیں کی بانی کا ورد کرتا شیرنی کے پاس آیا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں بی بی۔ تو مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے میں نے تو پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔" کمرے میں اس وقت ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ شیرنی اٹھ کھڑی ہوئی اس نے

آہستہ سے کہا۔

"مجھے گردیال سنگھ جی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

گرنتھی باوا سنگھ کا ہاتھ داڑھی پر تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ پھر دوبارہ چل پڑا۔ اس نے شیرنی کی طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے آجاؤ بی بی۔" گرنتھی شیرنی کو گردوارے کے کونے والے کمرے میں لے گیا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کونے میں چارپائی پر بستر لگا تھا۔ پتلا سا لحاف بھی تہہ کیا ہوا تھا۔ دو مونڈھے قریب ہی پڑے تھے۔ چھوٹی سی گول میز پر تانبے کا جگ اور لمبا تانبے کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ گرنتھی نے شیرنی کو بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود مونڈھا کھلے دروازے کے قریب کھینچ کر بیٹھ گیا اور داڑھی کے بالوں میں چھوٹی سی کنگھی پھیرتے ہوئے بولا۔

"گردیال نے کیا کہا تھا تمہیں؟ تم اسے کہاں ملی تھیں؟" وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازے کے باہر بھی دیکھ لیتا تھا۔ شاید وہ اس واسطے دروازے کے آگے بیٹھا تھا کہ باہر کوئی چھپ کر ان کی گفتگو سننے کی کوشش ہی نہ کر سکے۔ خالصتان تحریک کا سارے پنجاب میں بڑا زور تھا اور اس کے حامیوں نے سارے صوبے میں ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ پولیس کی سی آئی ڈی گردواروں میں بھی پہنچی ہوئی تھی۔ گرنتھی باوا سنگھ اسی لیے احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ پہلے تو اس نے شیرنی کو قریب ہی نہ پھٹکنے دیا۔ یہی کہتا رہا کہ گردیال اس کا بچپن کا ساتھی ضرور تھا مگر خالصتان کی تحریک میں جب سے اس نے بولنا شروع کیا ہے میں نے اس سے اپنی دوستی ختم کر لی ہے۔ گرنتھی اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ اس عورت شیرنی کا سی آئی ڈی سے کوئی تعلق تو نہیں ہے۔ شیرنی بھی اس بات کو بخوبی سمجھ رہی تھی۔

آخر شیرنی نے اپنے دوپٹے کے ساتھ بندھی ہوئی وہ خاص شے نکال کر گرنتھی کے سامنے میز پر رکھ دی جو اس بات کا آخری ثبوت تھا کہ جس شخص کے پاس یہ شے ہے وہ خالصتان تحریک کا خاص آدمی ہے۔ وہ کیا شے تھی؟ ہمیں افسوس ہے کہ بعض وجوہات کی بنا پر ہم اس راز پر سے پردہ نہیں اٹھا سکتے۔ گرنتھی نے وہ خاص چیز دیکھی تو جلدی سے اسے

اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر بڑی شفقت سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے بھنے؟" شیرنی نے جو نام گردیال سنگھ کو بتایا تھا وہی نام یہاں بھی بتا دیا۔

"میرا نام ہربنس کور ہے ویر جی۔" گرنتھی نے ایک بار پھر دروازے کے باہر بظاہر بڑی بے نیازی سے ایک نگاہ ڈالی اور شیرنی سے پوچھا۔

"اب بولو۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" شیرنی کو صرف رہائش کے لیے محفوظ جگہ چاہیے تھی۔ اس نے یہی مدد گرنتھی سے طلب کی۔ گرنتھی بولا۔

"بی بی اسی کمرے میں جب تک رہنا چاہو رہو۔ تمہیں ہر چیز مل جائے گی۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا۔ رام گڑھ کی سیوا دارنی ہوں۔ گرو کے درشنوں کو آئی ہوں۔ ویسے یہاں تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔" شیرنی نے گرنتھی کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو وہ باہر نکلتے ہوئے ہاتھ جھٹک کر بولا۔

"رہنے دے شکریہ کڑیے۔ بس یہاں رہ اور موج لے۔ تو گردیال کی بہن ہے تو ساڈی وی بہن اے۔" گردوارے سے تھوڑی دور میدان کے کنارے درختوں میں وہ رکشہ اسی طرح کھڑا تھا جس میں ہندو رکشہ ڈرائیور کی لاش پڑی تھی۔ شام کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ کچھ لوگوں نے رکشے میں پڑی لاش کو دیکھا تو پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس فوراً وہاں پہنچ گئی۔ ایک ڈوگرہ انسپکٹر تفتیش کرتا کرتا گردوارے میں پہنچ گیا۔ اس وقت گرنتھی برآمدے میں بیٹھا منہ ہاتھ دھونے کے بعد سر کے بالوں کو باندھ رہا تھا۔ پولیس انسپکٹر اور دو سپاہیوں کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ڈوگرہ انسپکٹر نے آتے ہی پوچھا۔

"آج گردوارے میں باہر سے کون آیا ہے؟" گرنتھی انجان بن گیا۔

"مہاراج یہاں تو سارا دن گرو کے شرو مالو متھا ٹیکنے گروبانی سننے آتے ہی رہتے ہیں۔" انسپکٹر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اپنے ہاتھ پر بید کو آہستہ آہستہ بجاتے ہوئے بڑی چالاکی سے کہنے لگا۔

"میرا مطلب ہے کہ تمہارا جو مہمان آیا ہے وہ کون ہے۔" گرنتھی یہی سمجھا کہ جس عورت کو گردیال نے یہاں بھیجا ہے کسی نے اس کی مخبری کر دی ہو گی۔ مگر وہ بھی کچی

گولیاں نہیں کھیلا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس کو یہ پتہ چل جائے گا کہ یہاں ایک عورت ٹھہری ہوئی ہے۔ اس نے کہا۔

"میری ایک سیوادارنی بہن جی ہیں وہ کئی روز سے گردوارے میں ٹھہری ہوئی ہے۔"

ڈوگرہ ہندو انسپکٹر بھی بڑا تجربہ کار تھا۔ کہنے لگا۔

اس کو ذرا یہاں لاؤ۔ ایک آدمی رکشے میں قتل ہو گیا ہے۔ رکشہ گردوارے کے قریب ہی کھڑا پایا گیا ہے۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں سیوادارنی جی کو کیوں بلا رہا ہوں۔"

گرنتھی کو اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ معاملہ خالصتان کا نہیں ہے۔ اس نے اسی وقت شیرنی کو بلوا لیا۔ انسپکٹر نے بڑی غور سے شیرنی کو دیکھا۔ شکل صورت اور لباس سے وہ پوری سکھنی لگ رہی تھی۔ انسپکٹر نے پوچھا۔

"بی بی تم کب یہاں آئی تھیں؟" گرنتھی نے باہر لاتے وقت شیرنی کو ساری بات سمجھا دی تھی۔ تو شیرنی نے بڑی شرمائی ہوئی آواز میں کہا۔

"دو ڈھائی ہفتے تو ہو گئے ہیں ویر جی۔"

"کہاں سے آئی ہو تم؟" انسپکٹر نے پوچھا گرنتھی فوراً بول پڑا۔

"جالندھر سے آئی ہیں جی وہاں ہماری برادری کے لوگ رہتے ہیں۔ وہ بھی سیوادار ہیں۔ میرے پتا جی تو ابھی تک وہاں گرنتھی ہیں۔" انسپکٹر نے گرنتھی کی طرف گھور کر دیکھا۔

"آپ بیچ میں نہ بولیں گرنتھی جی اس عورت کو میرے سوالوں کا جواب دینے دیں۔ ہاں بی بی! تمہارا نام کیا ہے۔"

"ہربنس کور۔" شیرنی نے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ڈوگرہ انسپکٹر نے ایک دم سوال کر دیا۔

"تم رکشے میں آئی تھیں؟" شیرنی بھی کوئی اناڑی قسم کی ناپختہ ذہن کی لڑکی نہیں تھی' وہ سب سمجھتی تھی۔ سب جانتی تھی کہ انسپکٹر اسے گھیرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کہنے لگی۔

"اسٹیشن سے اتر کر تانگے میں آئی تھی ویر جی۔" ڈوگرہ انسپکٹر چپ ہو گیا۔ پھر گرنتھی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

"معاف کرنا گرنتھی جی۔ واردات قتل کی ہے۔ یہ تفتیش ضروری تھی۔" یہ کہہ کر وہ سپاہیوں کی طرف مڑا اور گردوارے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد گرنتھی شیرنی کو لے کر اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اس نے شیرنی سے پوچھا۔

"بیٹے! یہ قتل کیسے ہوا؟ تم رکشے میں آئی تھیں کیا؟" شیرنی اسے کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔

"نہیں ویر جی! میں تو اسٹیشن سے ریل بازار پیدل گئی تھی۔ وہاں اپنے تایا جی کا پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ جموں میں نہیں ہیں دلی گئے ہوئے ہیں۔ بس میں وہاں سے پیدل ہی گردوارے میں آگئی۔" گرنتھی کو یقین آگیا کہ قتل اس لڑکی نے نہیں کیا۔ وہ دل میں ہنس پڑا۔ بھلا ایک عام سی لڑکی ایک آدمی کو کیسے قتل کر سکتی ہے۔ دوسری طرف ڈوگرہ انسپکٹر کو نہ جانے کیوں کچھ شک سا پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے ایک سفید کپڑوں والے مخبر کو گردوارے میں بھیج کر سیوادار سکھ کو چپکے سے بلوا لیا۔ جب وہ تھانے میں آیا تو انسپکٹر نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا اور کہا۔

"سیوادار جی! میں جو پوچھوں وہ سچ سچ بتا دینا۔ اگر کوئی بات چھپانے کی کوشش کی تو یاد رکھو میں قتل تمہارے اوپر ڈال کر ایسا کیس بنا دوں گا کہ تم سیدھا پھانسی پر لٹکا دیے جاؤ گے۔" سیوادار ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ بے چارہ گھبرا گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ آپ جو پوچھیں گے سچ سچ بتا دوں گا۔" انسپکٹر نے پہلا سوال یہ کیا۔

"یہ سیوادارنی گردوارے میں کب آئی تھی؟" سیوادار بولا۔

"مہاراج آج ہی شام ہونے سے ذرا پہلے آئی تھی۔" انسپکٹر کو یوں لگا جیسے اس کا ہاتھ قاتل کی گردن تک پہنچ گیا ہے۔ وہ رکشے میں آئی تھی۔

"یہ مجھے پتہ نہیں جناب۔ گردوارے میں تو وہ پیدل ہی آئی تھی۔"

"تم نے باہر رکشے کی آواز نہیں سنی تھی۔"

انسپکٹر نے بارعب آواز میں پوچھا۔ سیوادار گھبرا کر بولا۔

"کہہ نہیں سکتا جناب۔ شاید میں نے کسی رکشے کے کھڑے ہونے کی آواز سنی

تھی۔" انسپکٹر کرسی سے ایکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

"سیوادار کو ابھی تھانے میں ہی رکھو۔" سپاہی سیوادار کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ڈوگرہ انسپکٹر نے پوری پولیس گارڈ ساتھ لی اور گردوارے کی طرف چل دیا۔ یہ شہر کے مضافات میں ایک چھوٹا سا گردوارہ تھا۔ پھر بھی ڈوگرہ ہندو انسپکٹر کو معلوم تھا کہ وہ پولیس لے کر گردوارے پر دھاوا نہیں بول سکتا۔ اس نے پولیس ویگن کو گردوارے کی ایک طرف کھڑا کیا اور دو سپاہیوں کے ساتھ گردوارے میں آگیا۔ اس وقت شیرنی گردوارے کے اندر ہی تھی۔ انسپکٹر کو دیکھ کر گرنتھی باوا سنگھ کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"کیا بات ہے انسپکٹر صاحب۔" انسپکٹر گرنتھی کو ایک طرف لے گیا اور کہا۔

"سردار جی! ہمارے پاس ایک ایسا گواہ موجود ہے جس نے آپ کی سیوادارنی کو آج دوپہر کے بعد اس رکشے سے اترتے دیکھا ہے جس میں رکشا ڈرائیور کی لاش ملی ہے اور ہمیں یہ ثبوت بھی مل گیا ہے کہ اس قتل میں آپ کی سیوادارنی کا ہاتھ ہے۔ میں آپ کو اعتماد میں لے کر یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمیں بھی کاغذات کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ سیوادارنی کو ہمارے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے تھانے بھیج دیں۔ ہم اس کا بیان لے کر اسے واپس گردوارے میں پہنچا دیں گے۔ دوسری صورت میں اس کیس میں آپ کو بھی شامل تفتیش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ آپ نے ایک قاتل کو اپنے ہاں چھپایا ہے۔" گرنتھی باوا سنگھ کچھ گھبرا گیا۔ یہ سچ تھا کہ عورت رکشے میں اسی روز آئی تھی۔ اور ممکن ہے کہ ڈرائیور کو اسی نے قتل کیا ہو۔ باوا سنگھ اپنے آپ کو اس کیس میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ خالصتان کے کمانڈو گردیال سنگھ کا کبھی دوست اور ساتھی ضرور رہ چکا تھا مگر اس نے اس تحریک میں کبھی عملی حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ قتل کا معاملہ تھا۔ گرنتھی نے کہا

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر عورت نے کوئی جرم کیا ہے تو اسے اس کی سزا قانون کے مطابق ضرور ملنی چاہیے۔"

اس دوران شیرنی نے ایک ادھ کھلی کھڑکی کی اوٹ سے پولیس انسپکٹر کو گرنتھی سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ گرنتھی کے باتیں کرنے کے انداز نے یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ وہ پولیس کے ساتھ تعاون کرنے پر تیار ہے۔ شیرنی جانتی تھی کہ وہ ایک بار پولیس کے ہتھے

چڑھ گئی تو پھر اس کی زندہ واپسی ممکن نہیں ہو گی۔ وہ کمرے کے دوسرے دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ پستول اس کے پاس ہی رہتا تھا۔ جو اس نے اپنے لباس کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ سامنے گردوارے کی دیوار تھی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ ایک جگہ دیوار کے ساتھ پتھروں کا ڈھیر پڑا تھا۔ شیرنی ڈھیر پر چڑھ گئی۔ دوسری جانب میدان سا تھا جس کے کنارے کچھ فاصلے پر سڑک کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ شیرنی نے دیوار پر سے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ جونہی اس نے چھلانگ لگائی پولیس کے دس بارہ سپاہیوں نے اسے وہیں دبوچ لیا۔ ڈوگرہ انسپکٹر اتنا احمق نہیں تھا کہ ایک طرف تو وہ مجرم کو پکڑنے کے لیے گرنتھی سے بات چیت کر رہا ہو اور دوسری طرف اس بات سے غافل ہو جائے کہ مجرم دیوار پھاند کر فرار بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے پولیس کے دس بارہ سپاہیوں کو پہلے سے نگرانی کے لیے گوردوارے کی دیوار کے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس کا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا۔ جب شیرنی کو ہتھکڑی سمیت انسپکٹر کے سامنے پیش کیا گیا تو گرنتھی بھی حیران رہ گیا۔ انسپکٹر اپنی اور سپاہیوں کی کارکردگی پر بے حد خوش تھا۔ اس نے گرنتھی سے کہا۔

"سردار جی! قاتل خود چل کر ہمارے پاس آگیا ہے۔ اب آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" گرنتھی باوا سنگھ نے بے بسی اور کچھ شرمندگی کے احساس کے ساتھ شیرنی کو پولیس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا اور اپنے آپ کو یہ کہتا ہوا استھان کی طرف بڑھا۔" میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر یہ لڑکی ایک آدمی کو قتل کر کے آگئی ہے گردیال نے پوچھا تو کہہ دوں گا۔ لڑکی قاتلہ تھی۔ میں اسے کس طرح بچاتا؟"

تھانے میں شیرنی کی تلاشی لی گئی تو اس سے ایک بھرا ہوا پستول برآمد ہو گیا۔ انسپکٹر کو یقین ہو گیا کہ یہ خطرناک کیس ہے۔ یہ عورت جو اپنے آپ کو محض ایک سیوادارنی بتا رہی ہے اس کا تعلق خالصتان کے دہشت گرد کمانڈوز سے ہے۔ یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس عورت کو وہ قتل کے جرم میں پکڑ کر تھانے لایا ہے وہ مسلمان ہے اور نہ جانے کتنے جرائم پیشہ تخریب کاروں کو قتل کر چکی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "وہ ایک مکمل تربیت یافتہ دلیر کمانڈو ہے۔ اس نے شیرنی سے پستول کے بارے میں سوالات کیے جس کا شیرنی خاطر خواہ جواب نہ دے سکی۔ انسپکٹر نے اسے حوالات میں بند کر دیا اور

راتوں رات پولیس پارٹی کو گرنتھی باوا سنگھ کے گاؤں کی طرف روانہ کر دیا تھا کہ یہ پتہ چلایا جا سکے کہ اس عورت کا گرنتھی باوا سنگھ کی برادری سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ ساتھ ہی اس ہندو انسپکٹر نے جالندھر پولیس ہیڈ کوارٹر کو بھی مطلع کر دیا کہ جموں میں خالصتان کی ایک سکھ کمانڈو عورت کو گرفتار کیا گیا ہے۔ جس سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔

شیرنی حوالات میں پھٹے پرانے کمبل پر بیٹھی رہی شبد اونچی آواز میں پڑھنے لگی جو اس نے گردوارے میں سنا تھا اور اسے یاد ہو گیا تھا۔ اس طرح وہ تھانے کے سکھ اہل کاروں کے دلوں میں اپنے لیے ہمدردی کے جذبات ابھارنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اندر سے ہر سکھ خالصتان کا حامی ہے اور سکھ مت پر اپنی جان قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہتا ہے۔ شیرنی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا اونچی آواز میں شبد گانے سے وہاں کے سکھ سپاہی تو چپ رہے مگر ایک ہندو ڈوگرہ کانسٹیبل نے شیرنی کو گالی دے کر شبد پڑھنے سے منع کیا۔ اس پر سکھ کانسٹیبل نے ہندو کانسٹیبل کو جھاڑ پلائی اور کہا۔ وہ گواروں کا بانی کا پاٹھ کر رہی ہے۔ تم اسے گالی دینے والے کون ہوتے ہو؟" شیرنی اسی قسم کی فضا پیدا کرنا چاہتی تھی تاکہ اس پر تشدد نہ ہو۔ وہ صرف تشدد سے گھبرا رہی تھی۔ کیونکہ وہ نہتی تھی۔ اور دشمنوں میں گھر گئی تھی۔ انسپکٹر نے اس پر تشدد کیا تو اس کے لیے اپنی عزت بچانی مشکل ہو جائے گی۔ شیرنی اور اونچی آواز میں شبد پڑھنے لگی۔ پھر اس نے زور سے نعرہ لگایا۔

"جو بولے سو نہال
ست سری اکال"

غیر ارادی طور پر حوالات کے باہر جو سکھ کانسٹیبل کھڑے تھے انہوں نے بھی نعرے کے جواب میں ست سری اکال کہہ دیا۔ ہندو انسپکٹر آگ بگولا ہو کر حوالات کی طرف آیا۔ اس نے شیرنی کو شبد گانے اور نعرے لگانے سے سختی سے منع کیا۔ وہ بھی فضا کو مذہبی اور سیاسی رنگ اختیار کرتے دیکھ کر محتاط ہو گیا تھا۔ شیرنی اس فضا کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ وہ برابر جھوم جھوم کر گوربانی پڑھ رہی تھی۔ خالصتان کے بارے میں اس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھی کہ اگر اس نے

خالصتان کا نام لیا تو ہندو انسپکٹر کو اس پر تشدد کرنے کا جواز مل جائے گا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اونچی آواز میں ایک ہی جملہ دہراتی کہ میں ہربنس کور گورو کی سیوادارنی ہوں۔ میں گردوارے میں سیوا کرنے آئی تھی۔ اس ہندو نے مجھے قتل کے الزام میں پکڑ لیا ہے۔ سچے گرو بادشاہ میری مدد کریں گے۔ ہندو پولیس انسپکٹر نے فوراً ایس پی کو فون پر ساری صورتحال بیان کر دی۔ ایس پی سکھ تھا اس نے کہا۔

"آج کل سیاسی حالات ویسے بھی گڑ بڑ ہیں اس عورت کو زیادہ مت چھیڑو۔ صبح دیکھ لیں گے۔"

ہندو انسپکٹر خاموش ہو گیا۔ اندر سے وہ بھی کچھ گھبرا گیا تھا۔ شیرنی نے جو سیاسی حکمت عملی اختیار کی تھی وہ بڑی کامیاب ثابت ہو رہی تھی۔ اب وہ محض ایک اخلاقی مجرمہ نہیں تھی بلکہ ایک سیاسی اور مذہبی کارکن تھی جس پر قتل کا الزام تھا اور جو تھانے کے ایک خاص مذہبی طبقے میں جوش و خروش کو ہوا دے سکتی تھی۔ ہندو انسپکٹر یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جموں میں بھی خالصتان کے حامی سکھ ہندوؤں کو قطاروں میں کھڑے کر کے گولیوں سے اڑا رہے ہیں۔ پھر اس کی ترقی کا معاملہ بھی تھا۔ جب کہ اس کا انچارج بھی ایک سکھ تھا۔

ان تمام حالات پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد انسپکٹر نے شیرنی کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے کے فیصلے کے ساتھ اس نے یہ بھی طے کر لیا کہ صبح ہوتے ہی شیرنی کو تھانے کی حوالات سے جوڈیشنل جیل میں منتقل کر دیا جائے گا۔ پھر جیل والے جانیں اور وہ جانے۔ قتل کے کیس کی وہ بے دلی سے پیروی ضرور کرتا رہے گا۔ کسی نہ کسی طرح انسپکٹر نے رات گزار دی۔ صبح ہوتے ہی اس نے سکھ ایس پی کو فون پر بتایا کہ سر میں ملزمہ کو جوڈیشنل حوالات میں بھجوا رہا ہوں یہاں اس کے رہنے سے نقص امن کا خطرہ ہے۔ ایس پی نے اسے اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ ہی ہندو انسپکٹر نے پولیس گارڈ کے ساتھ شیرنی کو جموں کی جوڈیشنل حوالات کی طرف روانہ کر دیا اور سکھ کا سانس لیا۔

جوڈیشنل حوالات زنانہ جیل میں بنی تھی۔ یہاں شیرنی کو دوسری قیدی عورتوں سے الگ رکھا گیا۔ جیل کا وارڈن برہمن ہندو تھا وہ بے حد متعصب اور کٹر برہمن تھا اور

خالصتان کا جانی دشمن تھا۔ جب اسے شیرنی کے بارے میں پوری رپورٹ ملی تو اس نے خود حوالات میں جا کر شیرنی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا بید تھا جس پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ وارڈن نے بید کو آہستہ آہستہ اپنی ہتھیلی پر گھماتے ہوئے شیرنی سے پوچھا۔

"تم نے اور کتنے ہندو قتل کیے ہیں؟" شیرنی نے ست سری اکال کا نعرہ لگا کر کہا"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" برہمن وارڈن نے اپنی چھوٹی چھوٹی سنگدل آنکھیں شیرنی پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ اچانک اس کا بید والا ہاتھ اوپر اٹھا اور پھر اتنی زور سے شیرنی کے جسم پر پڑا کہ شیرنی کی بے اختیار چیخ نکل گئی۔ وارڈن نے بید کو شیرنی کی گردن کے ساتھ لگا کر زور سے پیچھے دھکا دیا اور اسے باپ کی گالی دے کر کہا۔

"یہاں بہت جلد تیرے ہوش درست ہو جائیں گے۔ یہاں کوئی تیرا باپ نہیں ہے۔ ہم سب تیرے خاوند ہیں۔"

شیرنی فرش پر بیٹھی اپنے بازو کو سہلا رہی تھی جس پر پوری طاقت سے بید سے ضرب لگائی گئی تھی۔ شیرنی نے وارڈن کو ایک سرسری نگاہ سے دیکھا اور اس لمحے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے قتل کیے بغیر اس جیل سے فرار نہیں ہو گی۔ جیل کی فضا تھانے کی فضا سے مختلف تھی۔ یہاں کا سپرنٹنڈنٹ جیل وارڈن حوالدار جمعدار وغیرہ سب ہندو ڈوگرے تھے۔ شیرنی کی سیاست یہاں نہیں چل سکتی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہیڈ وارڈن ایک کٹر برہمن ڈوگرہ تھا۔ اور خالصتان کا جانی دشمن تھا۔ پھر بھی شیرنی نے اپنا ایک مذہبی سیوادارنی کا رویہ جاری رکھا۔ اس کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ وہاں سے فرار ہونے کے طریقوں پر بھی غور کرنے لگی۔

دوسرے روز دوپہر کو پولیس گارڈ جالندھر سے واپس آ گئی۔ اس نے ہندو انسپکٹر کو رپورٹ دی کہ ہربنس کور نام کی کوئی عورت گرنتھی کی برادری میں نہیں ہے۔

"سر اس عورت کا تعلق ڈائریکٹ خالصتان کمانڈو سے لگتا ہے۔"

ہندو سپاہی نے انسپکٹر کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ہندو انسپکٹر خالصتان اور کمانڈو کے نام سے الرجک ہو چکا تھا۔ کہنے لگا۔ یہ ٹھیک ہے مگر ہم اس پر قتل کا کیس ہی بنا کر تفتیش شروع کریں گے۔ ہماری یہی ڈیوٹی ہے۔"

چنانچہ ہندو انسپکٹر نے قتل کے کیس کے کاغذات تیار کر کے معاملہ عدالت میں پیش کر کے دس دن کا ریمانڈ لے لیا۔ ریمانڈ کے واسطے بھی انسپکٹر نے شیرنی کو تھانے کے تہہ خانے میں نہ بلایا بلکہ جوڈیشنل جیل کے ایک کمرے میں ہی اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ پوچھ گچھ کرنے میں بھی وہ بہت محتاط تھا اور بے دلی سے ساری کاروائی کر رہا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی خالصتانی کمانڈوز سے جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیرنی جرم سے مسلسل انکار کر رہی تھی۔ انسپکٹر اس پر تشدد نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ سمجھا رہا تھا کہ تم جرم کا اقرار کر لو میں آگے جا کر تمہیں بچا لوں گا۔ مگر شیرنی اس کے بچھائے ہوئے جال میں نہیں آ رہی تھی۔

ریمانڈ کے دن گزر گئے۔ انسپکٹر نے عدالت سے مزید پانچ دن کا ریمانڈ لے لیا۔ اس دوران بھی وہ شیرنی سے اقرار جرم کرانے میں ناکام رہا تو ایس پی کے مشورے سے انسپکٹر نے اپنی طرف سے اقرار جرم ڈال کر کیس عدالت میں پیش کر دیا۔ شیرنی اگر عدالت میں جا کر "منحرف" ہوتی تو ہوا کرے۔ کم از کم میری جان تو چھوٹے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ کیس لٹک جائے گا۔ ہندو انسپکٹر نے یہی سوچ کر کاروائی کو آگے بڑھایا۔

یہ صورتحال شیرنی کے لیے اس لیے بھی مفید تھی کہ اسے جیل سے فرار ہونے کے کسی منصوبے پر غور کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ قدرت نے اسے تشدد سے بھی بچا لیا تھا۔ گربانی کا پاٹھ اور ست سری اکال کے نعرے اس کے کام آ گئے تھے۔ اسے جس جوڈیشنل حوالات میں رکھا گیا تھا وہ جیل کے اندر سب سے الگ تھلگ تھی اس کی ایک جانب چھوٹا میدان اور پیچھے برہمن وارڈن کا دفتر تھا۔ آگے برآمدہ تھا جہاں ہر وقت ہندو ڈوگرہ سپاہی پہرے پر موجود رہتے تھے۔ حوالات کا دروازہ سلاخ دار تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی کھڑکی کھول کر شیرنی کو دن میں دو بار باسی روٹیوں کے ساتھ گندی دال کھانے کو دی جاتی تھی۔ باتھ روم بھی اس کوٹھری کے اندر ہی ایک چار فٹ اونچی دیوار کھڑی کر کے بنا دیا گیا تھا۔ دن میں صرف ایک بار سہ پہر کے وقت شیرنی کو دو ہندو کانسٹیبل حوالات سے نکال کر باہر میدان میں تھوڑی دیر ٹہلواتے اور دوبارہ حوالات میں بند کر دیتے۔

اس دوران خالصتانی کمانڈو گردیال سنگھ کو بھی پتہ چل گیا کہ اس کی منہ بولی بہن

ہربنس کور کو جموں پولیس نے کسی ہندو رکشہ ڈرائیور کے قتل کے کیس میں پھانس کر جوڈیشنل حوالات میں بند کر دیا ہے۔ وہ یہ سن کر بپھر گیا۔ اس کے دونوں کمانڈو ساتھی فوجا سنگھ اور جرنیل سنگھ اس کے پاس بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ گردیال نے گرنتھی باوا سنگھ کو گالی دے کر کہا۔" وہ میری بہن کی بھی حفاظت نہیں کر سکا؟ اس سے تو میں بعد میں نٹ لوں گا پہلے ہمیں اپنی بہن کو ہندو کی قید سے نکالنا ہے۔ کیوں فوجا سیاں تیار ہو؟" فوجا سنگھ اور جرنیل سنگھ دونوں مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بھڑک مار کر کہا۔

"فوجاں تیار ہیں گردیال سیاں۔"

انہوں نے اسی وقت منصوبہ بندی پر غور کرنا شروع کر دیا فوجا سنگھ کہنے لگا۔

"سردارا اتنا سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں سوچتے رہے تو ہماری بہن ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں جوڈیشنل جیل کے برہمن وارڈن کو جانتا ہوں۔ وہ تو ہمارا جانی دشمن ہے۔"

گردیال سنگھ بولا "تو پھر فکر کیوں کرتے ہو۔ اس کو سب سے پہلے ختم کریں گے۔"

جرنیل سنگھ نے مشورہ دیا کہ ہمیں بھیس بدل کر جموں شہر میں داخل ہونا ہو گا۔ ہم اس باوا سنگھ والے گردوارے میں نہیں جائیں گے۔ کیونکہ پولیس ضرور گردوارے کی نگرانی کر رہی ہو گی۔

"فکر کیوں کرتے ہو۔" گردیال سنگھ بولا۔" ہم بیری والی دھرم شالے میں چلے چلیں گے۔ وہاں ساری سنگتاں اپنی ہیں۔"

آخر یہی طے پایا کہ وہ سکھ یاتریوں کا بھیس بنا کر جموں شہر میں داخل ہوں گے اور بیری والی دھرم شالہ میں قیام کریں گے۔ وہاں سے پھر ہربنس کور کو فرار کروانے کا منصوبہ تیار کیا جائے گا۔

رات انہوں نے گزار دی۔ دوسرے روز تینوں خالصتانی سکھ کمانڈوز نے اپنے حلیے سکھ یاتریوں والے بنائے۔ لمبے لمبے کرتے اور تنگ موری والے پاجامے پہنے۔ گلے میں زرد رنگ کے صافے ڈالے' چھوٹے چھوٹے بستر باندھ کر کاندھے سے لٹکائے۔ بغل میں کرپانیں اور گربانی کے گٹکے ڈالے اور واہگورو کے نام کا جاپ کرتے جالندھر شہر کے موٹروں کے اڈے پر آ گئے۔ یہاں سے جموں کی طرف لاریاں جاتی تھیں۔ وہ الگ الگ لاریوں میں سوار ہو کر جموں کی طرف روانہ ہو گئے۔

جموں پہنچ کر وہ سب بیری والی دھرم شالہ میں ایک دوسرے سے آن ملے۔ اس دھرم شالہ کا سکھ انچارج گردیال سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو جانتا تھا اور ان کا ہمدرد اور دوست تھا۔ اس نے تینوں کمانڈوز کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایک الگ کمرہ انہیں رہنے کے لیے دے دیا۔ اس نے بالکل نہ پوچھا کہ وہ کس مشن پر جموں آئے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ یہ لوگ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینے آئے ہیں۔

اس دھرم شالہ کے باہر سی آئی ڈی والا ایک بوڑھا پنڈت چائے کی دکان کے آگے اسٹول پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہتا تھا۔ وہ یہ ڈیوٹی بے دلی سے دے رہا تھا۔ زیادہ وقت وہ چائے کی دکان کے اندر سونے یا لوگوں سے گپ شپ کرنے میں گزارتا۔ کسی وقت باہر اسٹول پر آکر بیٹھ جاتا اور رات کو ڈائری میں یہ لکھ دیتا کہ سب ٹھیک ہے۔ کوئی مشکوک آدمی دھرم شالہ میں نہیں آیا۔ سی آئی ڈی کے اس آدمی کی تن آسانی کے باعث تینوں خالصتانی کمانڈوز دھرم شالہ میں محفوظ ہو گئے تھے۔

اپنی کوٹھری میں تینوں سکھ کمانڈو سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ ہربنس کور یعنی

شیرنی کو جیل سے کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ جرنیل سنگھ کہنے لگا۔

"گردیال سیاں! ہمارے پاس اتنا اسلحہ نہیں ہے کہ ہم جیل پر ہلہ بول دیں۔ یہی ہو سکتا ہے کہ پہلے سی آئی ڈی کی جائے اور پتہ چلایا جائے کہ رات کو جیل کی حوالات میں کتنے آدمی پہرے پر ہوتے ہیں۔ پھر اسی حساب سے پروگرام بنایا جائے۔" فوجا سنگھ نے مشورہ دیا۔

"ملاقاتی بن کر اندر جاتے ہیں اور ساری سی آئی ڈی کر لیتے ہیں۔"

گردیال سنگھ نے ہاتھ کے اشارے سے دونوں کو بیٹھے رہنے کو کہا اور بولا۔

"تمہاری مت ماری گئی ہے۔ ہماری تصویریں اس جیل میں بھی پہنچی ہوئی ہیں۔ ہم کوئی بھیس بدل کر بھی ملاقات کرنے گئے اسی وقت پکڑے جائیں گے۔"

جرنیل سنگھ نے چڑ کر کہا۔

"تو پھر جا کر برہمن کی منت کریں کہ ہربنس کور کو چھوڑ دو؟"

گردیال نے غصے میں آ کر کہا۔

"اس کی تو میں......"

آگے جو کچھ گردیال سنگھ نے کہا تھا وہ ہم یہاں لکھ نہیں سکتے۔ بہرحال اس میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ پہلے جوڈیشنل حوالات کا محل وقوع اور رات کو سپاہیوں کی نفری کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں گی اور اس کے بعد اٹیک کیا جائے گا۔ یہ جرنیل سنگھ کی ڈیوٹی لگی۔ کیونکہ وہ ہر قسم کا پارٹ ادا کرنے اور بھیس بدل لینے میں بڑا ماہر تھا۔ چنانچہ جب دن نکلا تو جرنیل سنگھ نے سر کے بال کھلے چھوڑ کر سادھو کا بھیس بدلا اور گڑوی بجا کر میرا بائی کے بھجن گاتا جیل کی طرف چل پڑا۔ ایک گھنٹے بعد جب واپس آیا تو اس کے پاس کافی معلومات تھیں اس نے اپنے ساتھی کمانڈوز کو بتایا۔

"ہربنس کور کو جس جوڈیشنل حوالات میں رکھا گیا ہے وہ جیل کے پچھم کی طرف ہیڈ وارڈن کے آفس کے بالکل ساتھ ہے۔ پچھلی طرف بیچ میں جیل کی دیوار ہے۔ رات کو برہمن ہیڈ وارڈن بارہ بجے تک دفتر میں ہی ہوتا ہے۔ برآمدے میں چار پانچ سپاہی ڈیوٹی پر ضرور موجود رہتے ہیں۔"

یہ ساری معلومات جرنیل سنگھ نے ایک ایسے ضعیف الاعتقاد ہندو سے حاصل کی تھیں

جو جیل کا دھوبی تھا اور وہیں اندر ایک کوارٹر میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ گردیال سنگھ نے کہا۔

"تو پھر کیا رائے ہے سنگستاں کی؟"

"اٹیک کر دو آج رات۔" فوجا سنگھ بولا۔

"لیکن ہربنس کور کو ہم دھرم شالا میں نہیں لائیں گے۔" جرنیل سنگھ نے کہا گردیال نے جواب میں کہا۔

"یہاں کیوں لاتا ہے اس کو .... سیدھا کٹھوعہ کی طرف فرار ہوں گے۔ جنگل کا کونسا خفیہ راستہ ہے جو ہمیں معلوم نہیں۔"

"ہمیں گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔"

"گاڑی اسی برہمن وارڈن کی جو ہو گی۔ وہ کس کے کام آئے گی؟" گردیال سنگھ نے اسے گالی دے کر کہا۔ انہوں نے اسی روز رات کو جیل توڑنے کا پروگرام طے کر لیا۔ یہ تینوں اس کام کے ماہر تھے۔ ان میں ہر کوئی کمانڈو کم از کم چار مرتبہ جیل توڑ چکا تھا۔ اس جوڈیشنل جیل میں سے رات کے وقت ایک عورت کو نکالنا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ صرف ان کی جان کو خطرہ تھا۔ سو وہ کوئی بھی کام کرتے جان ہتھیلی پر رکھ کر کرتے تھے۔ جرنیل سنگھ نے اپنا سادھوؤں والا حلیہ ویسے ہی رہنے دیا۔ باقی دونوں کمانڈوز نے رات کے دس بجے کے قریب اپنے بستروں میں ساتھ لائی ہوئی کمانڈوز کی وردیاں یعنی سیاہ پتلونیں' سیاہ جیکٹیں پہن لیں۔ سروں پر پگڑیوں کے اوپر خوب کس کر سیاہ رومال باندھ لیے۔ ریوالور جیبوں میں رکھ لیے جن کے میگزین بھرے ہوئے تھے۔ کرپانوں کے علاوہ ہر ایک کے پاس خاص قسم کے کمانڈو خنجر بھی تھے جن کا وار کبھی خالی نہیں جاتا تھا۔ ان چاقوؤں کی ایک طرف تیز دھار تھی اور دوسری جانب بڑے بڑے تیز دندانے تھے۔ ان کا وار زیادہ تر گردن پر کیا جاتا۔ گردن پر وار کرنے کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ دوسرا وار کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور دشمن کی شہ رگ کٹ جاتی تھی۔ اس کام میں یہ تینوں بڑے تربیت یافتہ تھے۔

رات کے ٹھیک ساڑھے دس بجے یہ تینوں کمانڈوز دھرم شالا کے پچھلے دروازے سے

باری باری تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ نکلے اور جوڈیشنل جیل کی طرف روانہ ہو گئے اندھیری رات تھی شہر کی طرف ضرور بتیاں روشن تھیں مگر اس طرف صرف سڑک پر اسٹریٹ لائٹیں جل رہی تھیں۔ وہ بھی بڑی مدھم مدھم۔ یہ سڑک سے ہٹ کر کھیتوں اور فصلوں میں سے گزر رہے تھے۔ جرنیل سنگھ جو سادھو کے بھیس میں تھا جیل کے قریب پہنچ کر بڑے گیٹ کی طرف ہو گیا۔ انہیں جو کچھ کرنا تھا وہ سب آپس میں طے کر لیا گیا تھا۔ فوجا سنگھ اور گردیال کمانڈو جیل کی دیوار کے پیچھے وہاں آ کر رک گئے جس طرف جوڈیشنل حوالات کی عقبی دیوار لگتی تھی۔ یہ دیوار بیس پچیس فٹ اونچی تھی۔ یہ کوئی امریکی جیل نہیں تھی کہ جس کے ہر کونے پر روشنی پھینکنے والی مچان بنی ہوتی اور وہاں پر مورچہ بھی لگا ہوتا۔ یہاں صرف پھاٹک کے اوپر جو ٹاور بنا تھا وہاں پر سرچ لائٹس کا بندوبست تھا۔ باقی جیل کی دیوار کے ساتھ ساتھ ہر پچاس فٹ کے بعد ایک کھمبا لگا تھا جس پر کمزور سا بلب رات بھر جلتا رہتا۔ جیل کے اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

گردیال سنگھ نے تھیلے میں سے نائیلون کی رسی کا گچھا نکال کر کھولا۔ اس کے آگے فولاد کا آنکڑا بندھا ہوا تھا۔ یہ آنکڑا اوپر جا کر کسی نہ کسی جگہ ضرور اٹک جاتا تھا۔ جیل کے اندر جانے کا ان کے پاس صرف یہی ایک ذریعہ تھا۔ گردیال نے رسی کو زور سے گھما کر دیوار کے اوپر پھینک دیا اور ہاتھ کی رسی بالکل ڈھیلی کر دی تاکہ دوسری طرف اگر آنکڑا دیوار کے ساتھ ٹکرائے تو زیادہ آواز پیدا نہ ہو۔ یہ دیوار بھی آدھی کچی اور آدھی پکی تھی۔ آنکڑا ہلکی سی آواز کے ساتھ دیوار کی دوسری جانب زمین پر جا گرا۔ گردیال رسی کو آہستہ آہستہ کھینچنے لگا کہ کہیں آنکڑا اٹک جائے۔ مگر رسی اس کے ہاتھوں میں کھنچی چلی آ رہی تھی۔ فوجا سنگھ جو قریب کھڑا تھا دھیمی آواز میں بولا۔

"جگہ ہم نے غلط چن لی ہے۔"

گردیال سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اچانک رسی اٹک گئی۔ گردیال نے رسی کو ڈھیلا کرنے کی بجائے اسے تان لیا اور زور لگا کر کھینچا۔ آنکڑا کسی جگہ مضبوطی سے اٹک گیا تھا۔ گردیال نے فوجا سنگھ سے کہا۔

"چل بلے۔ دھیان سے۔"

فوجا سنگھ اسی وقت رسی کو ہاتھ میں لے کر دیوار کے ساتھ پاؤں ٹیک کر اوپر چڑھنے لگا۔ وہ ایک تجربہ کار کمانڈو کی طرح دیکھتے دیکھتے دیوار کے اوپر پہنچ گیا۔ اوپر جاتے ہی وہ دیوار کے اوپر لیٹ گیا پھر دوسری طرف اتر گیا۔ رسی گردیال کے ہاتھ میں تھی۔ رسی کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ یہ لائن کلیر کا سگنل تھا۔ گردیال بھی دیوار چڑھنے لگا۔

دونوں کمانڈو دیوار کی دوسری طرف اندھیرے میں بیٹھ گئے۔ گردیال نے دیکھا کہ آنکڑا وہاں زمین پر پڑے درخت کے ایک تنے کے ساتھ اٹکا ہوا تھا۔ اس نے آنکڑے کو وہیں اٹکا رہنے دیا کیونکہ کچھ پتا نہیں تھا کہ انہیں وہیں سے دیوار پار کرنی پڑ جائے۔ دونوں کمانڈو جھک کر اندھیرے میں حوالات کے برآمدے کی طرف چلنے لگے۔ چند قدم چلنے کے بعد انہیں دو کانسٹیبلوں کی آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر سگریٹ کے تمباکو کی بو آئی۔ دونوں اب صرف اشاروں میں باتیں کر رہے تھے۔ گردیال نے فوجا سنگھ کو برآمدے کے دوسری طرف جانے کا اشارہ کیا۔ فوجا سنگھ برآمدے کے قریب پہنچ کر اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ ادھر گردیال بھی دیوار کے ساتھ اندھیرے میں نیچے ہو کر بیٹھ گیا۔

اب انہیں جرنیل سنگھ کے سب ٹھیک ہے کے سگنل کا انتظار تھا۔ جرنیل سنگھ اس وقت پھاٹک پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے پہرہ دینے والے سپاہی کو جاتے ہی بڑی محبت اور شفقت بھری آواز میں کہا۔

”بیٹا شیراں والی ماں تم پر بڑی مہربان ہے۔ تیرے دل میں جو چھپا ہے۔ خواہش ہے وہ بڑی جلدی پوری ہو جائے گی۔“ جموں میں شیراں والی ماں دیوی کو بہت مانا جاتا ہے اور گھر گھر میں اسی کی پوجا ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ شیراں والی ماں کے نام پر اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ سپاہی ڈوگرہ ہندو تھا اور شیراں والی ماں دیوی کا پجاری تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک دراز قد باریش سادھو سنت کو کھڑے دیکھا اور اس کی زبان سے ماں شیراں والی کا آشیرباد سنا تو اس کی ضعیف لاعتقادی بیدار ہو گئی۔ جرنیل سنگھ نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہا۔

”ماں شیراں والی نے تیری ماتا جی اور تیرے لیے پرشاد بھیجا ہے۔ آؤ۔ اپنا پرشاد لے

لو۔ ہم تو سادھو سنت ہیں۔ ماں کے درشن کرنے آئے تھے۔ ماں نے کہا جاؤ میرا ایک اور شردھالو ہے۔ وہ جیل کے باہر پہرے پر کھڑا ہے۔ اسے میرا پرشاد دے آؤ۔ اسی غرض سے میں تیرے پاس آیا ہوں۔“

سپاہی نے ادھر ادھر دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ جیل کا پھاٹک بند تھا۔ روز ہی پھاٹک بند ہوتا ہے۔ کبھی کچھ نہیں ہوا۔ پھر آج کیا ہو جائے گا۔ سپاہی سادھو کے ساتھ ایک طرف ہو گیا۔ جرنیل سنگھ سادھو بنا پہلے سے تھیلے میں ہاتھ ڈالے نقلی پرشاد نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جونہی ڈوگرہ سپاہی اس کے قریب آیا تو تھیلے میں سے پرشاد کی بجائے کمانڈو چاقو باہر نکل آیا اور پلک جھپکنے میں سپاہی کی گردن پر پھر گیا۔ گردن کی شہ رگ پوری کی پوری کٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ خون کا فوارہ چھوٹتا جرنیل سنگھ کمانڈو نے بڑی مہارت سے سپاہی کو پرے پھینک دیا۔ سپاہی زمین پر گرا۔ اس کے حلق سے عجیب قسم کی خر خر کی آوازیں نکلنے لگیں۔ جرنیل سنگھ نے اس کی گردن پاؤں سے دبا دی۔ آوازیں بھی دب گئیں۔ یہ زندگی کی آخری آوازیں تھیں۔ جب یہ آوازیں نکلنا بند ہو گئیں تو جرنیل سنگھ نے سپاہی کی وردی کے ساتھ لٹکا ہوا چابیوں کا چھلا اتارا اور دبے پاؤں پھاٹک کے پاس آ کر گیٹ کے نچلے چھوٹے دروازے کا تالا کھول دیا۔ دوسرے لمحے وہ جیل کے احاطے میں تھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا پہلو کی طرف سے آ کر برآمدے میں آ گیا۔ یہاں ہیڈ وارڈن کے کمرے میں سے بجلی کی روشنی باہر آ رہی تھی۔ ہیڈ وارڈن برہمن پنڈت میز پر سر جھکائے بیٹھا ضروری اندراج کر رہا تھا۔ ایک آدمی اس کے سامنے کوئی فائل لیے کھڑا تھا۔ جرنیل سنگھ دیوار کے ساتھ لگا اندھیرے میں تھا۔ اسے سامنے سے ایک جمعدار آتا دکھائی دیا۔ جرنیل سنگھ وہیں نیچے ہو گیا۔ اس کا پروگرام ہیڈ وارڈن کو ہلاک کر کے آگے نکلنا تھا مگر اب حالات ایسے نہ رہے تھے۔ جیل کے پھاٹک پر سے پہرہ دار سپاہی کی عدم موجودگی زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ کسی بھی وقت یہ راز کھل سکتا تھا۔ اور خطرے کا الارم بج سکتا تھا۔

جرنیل سنگھ وہیں سے زمین کے ساتھ رینگتا ہوا جوڈیشنل حوالات کی دیوار کی طرف چلا برآمدے میں چھپ کر بیٹھے فوجا سنگھ نے ایک سایہ اپنی طرف رینگ کر آتا دیکھا تو چاقو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ کیونکہ پروگرام کے مطابق جرنیل سنگھ کو برآمدے کی طرف

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

سے آنا تھا۔ بہت جلد اس کو علم ہو گیا کہ یہ جرنیل سنگھ ہی ہے۔ جرنیل سنگھ جلدی سے لپک کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"وہاں آدمی ہیں۔"

گردیال سنگھ نے ایک دوسرے سائے کو پہلے سائے کے ساتھ آ کر ملتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ جرنیل سنگھ کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا اور وہ اپنا کام کر آیا ہے یعنی برہمن وارڈن کو قتل کر آیا ہے۔ اس وقت دو جمعدار سپاہی شیرنی کی حوالات کے باہر پہرہ دے رہے تھے۔

پروگرام کے مطابق اب فوجا سنگھ کو برآمدے کی ایک طرف سے اور گردیال سنگھ کو دوسری طرف سے آگے بڑھ کر ایک ایک سپاہی کو اس طرح دبوچ لینا تھا کہ ان کی ہلکی سی آواز بھی نہ نکل سکے۔ اس صورتحال سے فوجا سنگھ بھی باخبر تھا۔ چنانچہ اس نے برآمدے کی دوسری جانب گردیال سنگھ کے سائے کو حرکت میں آتے دیکھا تو فوجا سنگھ کے کان میں کہا۔

"یہاں خبردار ہو کر رہنا۔" ساتھ ہی وہ بھی برآمدے کی دیوار کے ساتھ ہو گیا۔

دونوں پہریدار جمعدار سپاہی ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے باتیں کرنے لگے تھے۔ اسی طرح ایک سپاہی برآمدے کے مشرق کی جانب اور دوسرا برآمدے کی مغرب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان دونوں کی نظریں ایک طرف ہوں تاکہ دوسری جانب سے ان میں سے ایک پر حملہ کیا جائے اور جب دوسرا اس کی طرف متوجہ ہو تو اس جانب سے ان پر گردیال سنگھ کمانڈو بجلی بن کر گرے۔ یہ خیال دونوں کمانڈوز کے ذہن میں ایک ساتھ گردش کر رہا تھا۔ گردیال نے اس کا حل تلاش کرتے ہوئے اپنی طرف زمین سے ایک کنکر اٹھا کر برآمدے میں پھینکا۔ دونوں سپاہیوں نے ایک ہی طرف دیکھا۔ یہی ایکشن کا وقت تھا اور وقت صرف ایک سیکنڈ ہی تھا۔ اگر انہیں کمانڈو ٹریننگ نہ ہوتی اور موقع کی نزاکت کا احساس نہ ہوتا تو یہ وقت ایک سیکنڈ کا بڑا ہی قیمتی لمحہ گزر گیا ہوتا۔ مگر فوجا سنگھ نے اس لمحے کا بھرپور فائدہ اٹھا لیا۔ وہ بجلی کی طرح اپنی طرف والے جمعدار سپاہی پر گرا اور اس کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر نیچے کھینچ لیا۔ اسی لمحے دوسرا جمعدار اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ ادھر سے گردیال سنگھ نے بلّے کی طرح چھلانگ لگا کر

اس کی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑتے ہوئے نیچے گرا لیا۔

شیرنی جاگ رہی تھی۔ وہ دوڑ کر سلاخوں کے پاس آ گئی۔ یہاں برآمدے میں بتی جل رہی تھی جس کی روشنی میں اس نے گردیال سنگھ کو پہچان لیا۔ موت کے اس کھیل میں کسی کو کوئی مہلت تو دی ہی نہیں جا سکتی تھی اور تربیت یافتہ خالصتانی دہشت گردوں کے سامنے جیل کے معمولی جمعدار سپاہیوں کی کیا حیثیت ہو سکتی تھی اور انہیں کیا مہلت مل سکتی تھی۔ ایک سیکنڈ گزر گیا تھا اور دوسرے سیکنڈ دونوں سپاہیوں کی گردنیں آدھی سے زیادہ کٹ گئی تھیں اور انہیں گھسیٹ کر برآمدے کی دوسری طرف اندھیرے میں ڈال دیا گیا تھا۔

فوجا سنگھ جرنیل سنگھ کے پاس تیزی سے چلا گیا جو اندھیرے میں چھپ کر بیٹھا۔ یہ سارا خونیں ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ گردیال سنگھ نے چابی ایک جمعدار کی پیٹی سے نکال لی تھی۔ اس نے دوڑ کر حوالات کا دروازہ کھول دیا۔

"ہربنس بہنے باہر آ جا۔"

شیرنی پہلے ہی تیار تھی۔ وہ اس کے ساتھ برآمدے سے دوڑ کر اندھیرے میں آتے ہی اس نے گردیال سنگھ کے دوسرے ساتھیوں کو دیکھا تو آہستہ سے کہا۔

"میں وارڈن کو قتل کیے بغیر نہیں جاؤں گی۔

اس نے مجھے باپ کی گالی دی تھی۔"

اتفاق ایسا ہوا کہ شیرنی کی آواز وارڈن کے دفتر کے اندر تک پہنچ گئی۔ برہم وارڈن رجسٹر پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر باہر دیکھا۔

"یہ باہر کون ہے؟" جو نائب جمعدار وہاں کھڑا تھا دروازے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"چوکیدار جوان ہیں جناب۔"

"یہ کسی عورت کی آواز تھی۔"

عیاش وارڈن نے شیرنی کی سرگوشی بھی سن لی تھی۔ وہ کرسی پیچھے کھینچ کر اٹھا اور جونہی دروازے کی طرف بڑھا۔ فوجا سنگھ گردیال سنگھ اور شیرنی .... تینوں ریوالور تان کر اندر آئے اور دونوں کو وہیں کھڑے رہنے کو کہا۔ وارڈن کا رنگ اڑ گیا۔ اپنی ساری

سروس خاک میں ملتی نظر آئی۔ الارم کا بٹن اس کی دراز کے نیچے لگا تھا۔ وہ دونوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے میز کی طرف پیچھے ہٹا تو شیرنی نے اس کے حلق پر اتنی زور سے الٹا بازو مارا کہ وارڈن نیچے گر پڑا۔ شیرنی نے اس کی گردن اپنے گھٹنے پر رکھی اور بازو کے دوسرے بھرپور وار سے اس کی گردن کا منکا توڑ ڈالا۔ یہ ایک ایسا داؤ تھا جو ایک ماہر کمانڈو ہی جان سکتا تھا۔ گردیال سنگھ شیرنی کی مہارت اور دلیری سے بڑا متاثر ہوا۔ نائب جمعدار کو انہوں نے اسی دوران گلا دبا کر اگلی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔

"فوجا سیاں۔! پھاٹک پر کون ہے؟"

جرنیل سنگھ نے کہا "میں گارڈ کو مار آیا ہوں۔"

چاروں دیوار کے ساتھ اندھیرے میں تیز تیز چلتے گیٹ کے چھوٹے گیٹ میں سے باہر نکل گئے۔ ایک طرف گیراج میں ہیڈ وارڈن کی جیپ کھڑی تھی۔ کچھ فاصلے پر اوپر بنی ہوئی مچان پر سے کسی نے بلند آواز میں پوچھا۔

"ادھر کون ہے اوئے؟"

جب کوئی جواب نہ ملا تو سرچ لائٹ کی روشنی گیراج کے باہر پڑی۔ گردیال سنگھ نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ جیپ گیراج کے باہر نکلی تو مچان پر سے کسی نے ڈیوٹی گارڈ کا نام لے کر پکارا۔ اسی کے ساتھ ہی مشین گن کا ایک برسٹ فائر ہوا۔ گولیاں جیپ کے پیچھے آکر گریں۔

"بریک نہ لگانا گردیال سیاں۔"

اور جیپ پوری رفتار سے دو ایک بار اچھل کر شہر کو جاتی سڑک کی طرف دوڑنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی جیل کا الارم چیخ اٹھا۔ شیرنی کی جیپ وہاں سے کافی دور نکل چکی تھی اور اب وہ شہر کے باہر بڑی سڑک پر دوڑتی ہوئی کٹھوعہ روڈ پر پہنچنے والی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں تھا۔ کسی وقت کوئی ٹرک سامنے سے آکر گزر جاتا تھا۔ گردیال سنگھ فل اسپیڈ پر جیپ لے جا رہا تھا۔ اسے یہاں کے چپے چپے کا پتہ تھا۔ جموں کی حدود سے نکلنے کے بعد انہیں اپنے روپوش اور جنگلوں کے خفیہ ٹھکانوں میں چھپے ہوئے ساتھیوں کا تحفظ مل سکتا تھا۔ اسی لیے جیپ کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری سے دوڑا رہا تھا۔

شہر سے باہر آکر بڑی سڑک پر کچھ میل چلنے کے بعد گردیال نے جیپ کو ایک کچے راستے پر ڈال دیا۔ یہ کچا راستہ اسے اونچی اونچی گھاٹیوں میں سے گزارتا ایک چھوٹی نیم پختہ سڑک پر لے آیا جو کٹھوعہ کے بے آباد جنگلی علاقے میں نکل جاتی تھی۔

شیرنی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ گردیال اور جرنیل سنگھ اگلی سیٹوں پر تھے۔ رات آدھی ہو گئی تھی۔ چھوٹی سڑک کی دونوں جانب قد آدم جھاڑیاں تھیں۔ کبھی سامنے کوئی ٹیلہ آجاتا۔ پھر یہ ٹیلہ پیچھے رہ جاتا اور جیپ کسی دوسرے ٹیلے کی طرف چلتی چلی جاتی۔ ایک جگہ کسی کھنڈر کی پتھریلی دیوار گزر گئی۔ جرنیل سنگھ نے کہا "یہاں سے میرا خیال ہے کھبے پاسے ہونا ہے۔" گردیال نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"فکر نہ کرو۔ مجھے سب پتہ ہے کہاں جانا ہے۔" کافی دیر تک ان نیم پہاڑی علاقے میں رات کے اندھیرے میں سفر کرنے کے بعد جیپ اچانک دائیں طرف ڈھلان اترنے کے بعد گھوم کر ایک گھنے درخت کے نیچے رک گئی۔ یہاں ان لوگوں کا ایک خفیہ ٹھکانہ تھا۔ کچھ خالصتان کی تحریک سے تعلق رکھنے والے کمانڈو یہاں پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے اسی وقت دودھ گرم کر کے سب کو پلایا پھر بستر لگا دیے اور سب سو گئے۔

اگلے روز شیرنی نے اپنی جھونپڑی سے نکل کر باہر ایک نگاہ ڈالی۔ کچھ دیر درختوں کے نیچے ٹہلتی اور سوچتی رہی کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ ان لوگوں کو بھی شیرنی نے اپنی اصل حقیقت نہیں بتائی تھی۔ وہ اسے ہربنس کور ہی سمجھ رہے تھے۔ جو خالصتان تحریک کی کارکن تھی اور جموں اپنے کسی رشتے دار کے پاس جا رہی تھی کہ ایک ہندو رکشہ ڈرائیور نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہا اس نے رکشہ ڈرائیور کو قتل کر دیا۔ وہ پکڑی گئی اور گردیال سنگھ اسے اپنے ساتھیوں کی مدد سے جیل میں سے نکال کر لے آیا تھا۔

شیرنی کو اپنے باپ شیر خان کی تلاش تھی۔ وہ یہی مشن لے کر جموں آئی تھی۔ گردیال سنگھ کو صحیح صورت حال بتانے کے بارے میں کئی بار شیرنی کے دل میں خیال آیا مگر اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اصلی حقیقت جان لینے کے بعد گردیال سنگھ کے ساتھیوں کا کیا ردعمل ہو گا۔ ناشتہ کرنے کے بعد گردیال نے شیرنی سے پوچھا۔

"بہن ہربنس کور اب تم بتا دو کہ تمہیں جالندھر چھوڑ آئیں یا کسی دوسرے شہر جانا چاہتی ہو جہاں تمہارے رشتے دار ہوں۔"

شیرنی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"اصلی بات یہ ہے بھائی جی کہ میں اپنے پتا جی کے ایک مسلمان دوست کی تلاش میں جموں آئی تھی جس کے پاس میرے پتا جی کے کچھ ضروری کاغذات ہیں جن کا تعلق ہماری فیروز پور والی جائیداد سے ہے۔"

گردیال سنگھ نے پوچھا۔

"تمہارے پتا جی کے دوست کا کیا نام ہے۔"

"شیر خان .... اس کی عمر پچاس ساٹھ کی ہے۔ بھاری صحت مند بدن ہے۔ تھوڑے تھوڑے بال سفید ہیں۔ وہ مالیر کوٹلے میں رہتا تھا اور پتا جی کا دوست تھا۔ پھر اس پر قتل کا کیس بن گیا اور وہ مفرور ہو گیا۔ پتا جی نے مرنے سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ جموں میں نام بدل کر کوئی دکان کرتا ہے۔"

"پھر تم نے پتہ کیا تھا اس کا؟" جرنیل سنگھ نے پوچھا شیرنی کہنے لگی۔

"ہاں .... مگر اس نام کا کوئی دکاندار وہاں نہیں تھا۔ میرے رشتے دار بھی جموں سے واپس جا چکے تھے۔"

گردیال سنگھ اور جرنیل سنگھ چپ ہو گئے۔ پھر گردیال کہنے لگا۔

"بی بی! تمہیں بہن بنایا ہے تو تم جیسے کہو گی میں ویسے ہی کروں گا۔ بے شک ہمارے ساتھ رہنا ہے تو ہمارے ساتھ رہو۔ تم دلیر عورت ہو تم نے وارڈن کو جس طریقے سے ہلاک کیا میں تمہاری بہادری اور مہارت پر حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا ہوں ہمیں تمہاری ایسی بہادر سکھ شیرنیوں کی ضرورت ہے۔"

اس دوران شیرنی سوچ رہی تھی کہ اگر وہ ان لوگوں کے گروہ میں شامل ہو گئی تو جموں کے علاقے سے دور ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ لوگ جموں سے دور رہنے کا عہد کیے ہوئے تھے۔ ان کی گفتگو سے شیرنی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جالندھر امرتسر کے گرد و نواح میں جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ شیرنی کے لیے وہاں جانا بیکار تھا۔ اسے یہی اطلاع دی گئی تھی

کہ اس کا باپ جموں شہر میں کسی جگہ روپوش ہے۔ چنانچہ وہ جموں کے آس پاس ہی اپنے باپ کو تلاش کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ جموں میں اب اسے اپنی گرفتاری کا بھی قدم قدم پر خطرہ تھا مگر شیرنی ان خطروں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اس نے دل میں یہی فیصلہ کیا کہ وہ جموں کا علاقہ چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ جب اس فیصلے سے شیرنی نے گردیال سنگھ کو آگاہ کیا تو وہ کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے بی بی اگر تم جموں کی پولیس اور ان کی سی آئی ڈی کی نظروں سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم تو جالندھر چلے جائیں گے۔ ہمارا ایک خالصہ مکھن سنگھ بابا اس جگہ پر موجود رہے گا۔ تم یہاں جتنے دن چاہوں رہ سکتی ہو۔ جیپ ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ تم اپنے پتا جی کے دوست کی تلاش میں شہر جاؤ تو کوئی دوسرا بھیس بنا کر جاؤ۔ مکھن سنگھ تمہیں بس پر چڑھا دیا کرے گا تمہیں راستے بھی بتا دے گا۔ شام سے پہلے تم یہاں واپس آ سکتی ہو۔"

اسی روز سورج غروب ہونے کے بعد گردیال سنگھ اور اس کے ساتھی شیرنی کو بابا مکھن سنگھ کے حوالے کر کے جالندھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ بابا مکھن سنگھ خالصہ تھا اور خالصتان کا زبردست حامی تھا اس کی عمر ساٹھ کے قریب تھی۔ اگرچہ بوڑھا ہو رہا تھا مگر اس کے دل میں آزادی حاصل کرنے کا جذبہ جوان تھا۔

شیرنی کو ہم تھوڑی دیر کے لیے جموں کے اس خفیہ پہاڑی ٹھکانے پر چھوڑتے ہیں اور واپس کلکتے چلتے ہیں جہاں شیرنی کا باپ شیر خان سونا گاچی کے سب سے بڑے دشمن اور شہاب کے قتل کے الزام میں جیل میں بند ہے اور اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پولیس نے اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا مقدمہ بھی بنا دیا ہوا ہے اور تقریباً روزانہ اس پر تشدد کیا جا رہا تھا تا کہ وہ پاکستان کے بارے میں اہم معلومات مہیا کرے اور انڈیا میں موجود اپنے دوسرے ساتھیوں کے ٹھکانے بتائے۔ شیر خان نہ تو پاکستانی جاسوس تھا اور نہ اپنے وطن کے ساتھ غداری کر سکتا تھا۔ اس نے پاکستان کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اور کلکتہ پولیس کا تشدد برداشت کر رہا تھا۔ دوسری طرف اسے اپنی بیٹی شیرنی کی بھی فکر لگی تھی کہ خدا جانے وہ کہاں ہو گی۔ کس حال میں ہو گی۔

پیچھے سری لنکا سے سنیاسن منگلی بھی شیر خان کی تلاش میں نکل چکی تھی۔ اور اسے کسی نہ کسی طرح یہ خبر مل گئی تھی کہ شیر خان اپنی بیٹی کی تلاش میں کلکتے پہنچ چکا ہے۔ سنیاسن منگلی کو شیرنی سے ہمدردی تھی اور شیر خان سے وہ محبت کرتی تھی۔ شیرنی اسے اس لیے پسند نہیں تھی کہ وہ اس کے محبوب کی بیٹی تھی بلکہ شیرنی کو وہ اس کی دلیری جرات اور بے باکی کی وجہ سے پسند کرتی تھی۔ شیر خان سے منگلی کی محبت دنیاوی طبقوں کے قید و بند سے آزاد تھی وہ شیر خان کی مردانہ وجاہت اور اس کی شجاعت کی وجہ سے اس سے محبت کرتی تھی۔ یہ محبت آزاد اور بے باک تھی۔ منگلی کو آج تک شیر خان ایسا بہادر اور ادھیڑ عمری میں بھی جوان نظر آنے والا مرد نہیں ملا تھا۔ وہ ایسے ہی بے خوف مرد سے محبت کر سکتی تھی جو اس کی حفاظت کر سکے اور اسے نیچرل محبت کی بلندیوں سے روشناس کروا سکے۔

منگلی سنیاسن کے بھیس میں تھی۔ یعنی اپنے اصل حلیئے میں تھی۔ وہ سنیاسن تھی اور اس کے پاس وہ زہریلے تیر بھی تھے جو اس نے انتہائی مہلک سانپوں کے زہر سے خود تیار کیے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے ماچس کی تیلی جتنے سائز کے تیر تھے جنہیں بانس کی چھوٹی سی پھونکنی میں ڈال کر منگلی چلاتی تھی جس کو تیر لگتا تھا اس کا جسم اسی لمحے زہر کے اثر سے سن ہو جاتا تھا۔ وہ کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ گرتا اور چند سیکنڈ میں مرجاتا تھا اور اس کی لاش سانپ کے زہر کے اثر سے گلنا شروع ہو جاتی تھی۔

منگلی نے اپنے تھیلے میں تیروں کا جائزہ لیا۔ اس کے پاس صرف چار تیر ہی باقی بچے تھے۔ وہ جنوبی بھارت کے ایک شہر کے ریلوے اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوئی تھی اور کلکتے کی طرف جا رہی تھی۔ سنیاسی اور جوگیوں کے پہناوے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان لوگوں سے کچھ عقیدت اور کچھ ڈر خوف کی وجہ سے ریلوے والے ٹکٹ طلب نہیں کرتے تھے۔ سنیاسن نے بھی ٹکٹ نہیں خریدا تھا اور بغیر ٹکٹ ہی ریل میں سوار ہو گئی تھی۔ وہ کلکتے پہنچ گئی۔ شیرنی کے بارے میں منگلی کو علم تھا کہ اسے غلط اطلاع دی گئی ہے کہ اس کا باپ جموں میں ہے اور وہ یقیناً جموں میں ہی ہو گی۔ وہ سب سے پہلے کلکتے میں شیر خان کا سراغ لگانا چاہتی تھی۔ کلکتہ ایک بڑا شہر تھا مگر منگلی کے لیے یہ کوئی اجنبی شہر نہیں تھا۔ اس شہر میں وہ پہلے بھی اپنے ڈیرے دار سنیاسیوں کے ساتھ دو تین بار آچکی

تھی۔ چنانچہ وہ جانتی تھی کہ اسے کس جگہ قیام کرنا ہے۔

کلکتے میں سونا گاچی کے شمال کی جانب ایک بستی میں جینی ہندوؤں نے ایک مذہبی سرائے بنا رکھی تھی جہاں ان کے مذہبی بھائی اور یاتری آکر قیام کرتے تھے۔ وہاں ان کے قیام اور کھانے کا مفت انتظام کیا جاتا تھا۔ ایک بار منگلی اپنے باپ کے ساتھ وہاں چند روز آکر ٹھہری تھی۔ وہ کلکتے پہنچتے ہی سیدھی جینی سرائے میں آگئی۔ اس کا نام مہاویر آشرم تھا۔ رات سنیاسن منگلی نے آشرم میں آرام کیا اور اگلے دن وہ شیر خان کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ شیر خان کا سراغ جن ٹھکانوں پر لگایا جا سکتا تھا وہ منگلی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ سونا گاچی کے بدنام علاقے سے بھی واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں ناچ گانا ہوتا ہے اور جرائم پیشہ لوگوں کا یہاں اکثر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ سنیاسن منگلی اس علاقے میں آگئی۔ دن کے وقت یہاں کاروبار ٹھنڈا پڑا ہوتا ہے۔ یہ راتوں کو جاگنے والا علاقہ تھا۔ سنیاسی اور جوگی لوگ یہاں آتے ہی رہتے تھے کیونکہ یہاں کی طوائفیں اور ان کے ڈیرہ دار انتہائی توہم پرست تھے اور وہ جوگی جوگنوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے اور ان سے دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

منگلی نے گلے میں خوب مالائیں ڈال رکھی تھیں۔ ماتھے پر کالی ماتا کا تلک لگا تھا۔ ہاتھ میں ترشول اور بغل میں گیروے رنگ کا تھیلا پڑا تھا۔ یہاں سندری نام کی ایک بائی جی کو منگلی جانتی تھی۔ ایک بار اپنے باپ کے ساتھ وہ اس کے مکان پر آچکی تھی۔ وہ سیدھی سندری بائی کے مکان پر گئی۔ سندری نے ایک سنیاسن کو اپنے دوارے دیکھا تو جلدی سے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ پاؤں چھوئے اور کہا

"میرے دھن بھاگ کہ آپ میرے دوار آئیں۔" اس نے منگلی کو بڑی عزت و تکریم کے ساتھ کمرے میں بٹھایا۔ گرمی تھی۔ پنکھا چلا دیا۔ نوکر بھیج کر فوراً بازار سے ٹھنڈی بوتل منگا کر پیش کی۔ منگلی نے بوتل پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی ہم سنیاسی لوگ ہیں۔ صرف تازہ پانی پیتے ہیں۔ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں اپنے سوگباشی پتا کے ساتھ ایک بار تمہارے ہاں آچکی ہوں۔"

تب سندری نے منگلی کو پہچان لیا اور بولی۔

"ماتا! میرے بڑے سوبھاگ ہیں کہ آپ کے ایک بار پھر درشن ہوئے۔ اب آپ جتنے دن کلکتے میں ہیں میرے ہاں ہی رہیں۔"

منگلی نے کہا۔ "سنیاسیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا آج یہاں تو کل وہاں۔ ہم تو ہوا کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔"

سندری نے اس وقت پچاس روپے کی نذر پیش کی جسے منگلی نے قبول کر لیا اور اس کے حق میں درگا ماتا کے حضور پرارتھنا کی۔ باتوں ہی باتوں میں منگلی نے سندری سے کہا۔

"بچی! یہاں کلکتے میں ہمارا داس ہوا کرتا تھا۔ وہ مسلمان تھا اور ہمارے سوگباشی باپ کا چیلا بن گیا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہمارے پتا کی ایک نشانی شیر کا پنجہ ہے جو ہم اس سے واپس لینا چاہتے ہیں۔ بھلا سا نام تھا اس کا۔ ہاں یاد آیا۔ شیر خان نام تھا اس کا .... کیا تم نے اسے کبھی یہاں دیکھا ہے؟" سندری سوچنے لگی۔ سوچ سوچ کر بولی۔

"ماتا! ایسے آدمی کا نام میں نے سنا نہیں کبھی۔

لیکن اگر وہ ہمارے علاقے میں آتا جاتا رہا ہے تو میں اس کا پتہ کروا سکتی ہوں۔"

"ہاں سندری اس کا پتہ معلوم کرو۔" منگلی نے حکم دینے کے انداز میں کہا۔

"جو حکم ماتا دیوی! یہ فرمائیے میں بھوجن میں کیا بناؤں؟"

منگلی تو سب کچھ کھا لیتی تھی۔ بلکہ وہ تو شراب بھی کبھی کبھی پی لیا کرتی تھی۔ مگر وہاں اسے اپنا بڑا بھرم رکھنا تھا کہنے لگی۔ "ہم سنیاسی لوگ صرف ترکاریاں کھاتے ہیں ہمارے لیے کوئی ترکاری بنوا لو۔ ساتھ چاول ٹھیک رہیں گے۔"

سندری کے ڈیرے کے نوکر چاکر اور دوسرے لوگ بھی منگلی سنیاسن کی خدمت گزاری میں لگ گئے تھے۔ شام کو سندری نے اپنے ایک خاص آدمی کو بدمعاشوں جواریوں کے ایک اڈے پر شیر خان کا سراغ لگوانے کے لیے بھیجا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس آدمی نے واپس آ کر سندری بائی کو بتایا کہ شیر خان نام کا ایک پنجابی مسلمان ڈھومل اورشہاب قتل کے جرم میں جیل کی حوالات میں بند ہے اور اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ سندری بائی کے لیے اس قسم کے سنگین جرائم کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ کہنے لگی۔

"اس کا پیچھے کوئی آدمی نہیں ہے؟" اس آدمی نے رازداری سے کہا۔

"بائی جی! سنا ہے یہ آدمی شیر خان پاکستانی جاسوس بھی ہے۔ اس پر جاسوس کا بھی ایک مقدمہ بنا ہوا ہے۔"

یہ بلا شبہ اس کے لیے بڑی تشویش ناک بات تھی۔ اگر شیر خان پر پاکستانی جاسوس ہونے کا پولیس کو شبہ ہے تو پھر یہ سنیاسن بھی اس کے کاروبار کے واسطے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ پولیس شک وشبے میں سندری کو بھی پکڑ سکتی ہے۔ پاکستانی جاسوس ہونا بڑی خطرناک بات تھی۔ شیر خان خواہ پاکستانی جاسوس ہو یا نہ ہو لیکن اگر پولیس نے اس پر اس قسم کے جرم میں مقدمہ دائر کر دیا ہے تو پھر سندری کو اس سنیاسن سے بھی بڑی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ جتنی جلدی ہو سکے اسے اپنے ڈیرے سے چلتا کرنا چاہیے۔ سندری نے اپنے آدمی کو ہدایت کی کہ وہ شیر خان کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہ کرے اور اپنی زبان بند رکھے۔

رات کو اپنا دھندا شروع کرنے سے پہلے سندری بائی منگلی کے چھوٹے سے کمرے میں گئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"ماتا دیوی! شیر خان کا پتا چل گیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟"

منگلی سنیاسن نے کچھ ایسی بے ساختگی اور بے تابی سے یہ جملہ کہا کہ سندری بائی جو ایک تجربہ کار تماش بین عورت تھی فوراً سمجھ گئی کہ معاملہ گڑبڑ ہے اور اس سنیاسن کے شیر خان کے ساتھ خاص قسم کے مراسم ہیں۔ اس کے دل سے منگلی سنیاسن کی وقعت کم ہو گئی اور وہ اسے دنیا دار فراڈ قسم کی جوگن سمجھنے لگی۔ یہ احساس سنیاسن کو وہاں سے چلتا کرنے کی راہ ہموار کرنے میں سندری کی مدد کرتا تھا۔ اس نے کہا۔

"ماتا دیوی! شیر خان نے ایک جوئے خانے کے مالک ڈھومل اور اس کے ساتھی کو قتل کر دیا تھا اور اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔"

"وہ خود کہاں ہے؟" منگلی نے پوچھا۔

"ماتا! وہ تو جیل کی حوالات میں بند ہے۔ اور آج کل میں اس کے کیس کا فیصلہ ہونے والا ہے۔"

سندری نے منگلی کو یہ نہ بتایا کہ اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا بھی الزام ہے۔ منگلی جس کام کے واسطے وہاں سے آئی تھی وہ پورا تو ابھی نہیں ہوا تھا لیکن اسے شیر خان کے بارے میں یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ کسی مشکل میں پھنس چکا ہے۔ یہ جان کر منگلی کو خوشی بھی ہوئی کہ اس کے شیر مرد نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو خون کرتا دیکھ کر خوش ہونے والی عورت تھی۔ مگر یہ سوچ کر اس کا دل غم زدہ بھی ہو گیا کہ شیر خان جیل میں بند ہے۔ منگلی نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی جان پر بھی کھیل کر شیر خان کو جیل سے فرار کرائے گی۔ اس کے لیے بڑی منصوبہ بندی اور معلومات حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ منگلی نے اس پر مرحلہ وار عمل کرنے کا پروگرام سوچ لیا۔ کیونکہ ابھی شیر خان کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی وہ جیل میں بند تھا۔ منگلی کے پاس سوچ بچار کے واسطے کافی وقت تھا۔ اس نے سندری بائی سے کہا۔

"بائی! مجھے شیر خان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسے پھانسی لگتی ہے تو لگ جائے۔ مجھے تو صرف اپنے پتا کی وہ نشانی واپس لینی ہے جو شیر خان کے پاس ہے۔ کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ وہ جیل کہاں ہے جہاں شیر خان بند ہے؟"

سندری بائی دل میں ڈر گئی کہ یہ عورت تو جیل توڑنے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ اسے تو جتنی جلدی ہو سکے اپنے گھر سے نکال دینا چاہیے نہیں تو یہ اس کے لیے کوئی بہت بڑی مصیبت کھڑی کر دے گی۔ سندری بائی نے انتہائی سمجھداری اور تحمل سے کام لیتے ہوئے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔

"ماتا دیوی! بھگوان جیل سے بچائے۔ میں کبھی وہاں نہیں گئی۔ پر اتنا معلوم ہے کہ یہ جیل جنگل کے پار کہیں پر ہے۔ میں آپ کو خود اپنے ساتھ لے جا کر جیل دکھا دیتی مگر کیا کروں۔ مجھے آج ہی شام کی گاڑی سے رام پور جانا پڑ گیا ہے جہاں میری چھوٹی بہن سخت بیمار ہے۔ مجھے شما کر دیجیے گا۔"

سنیاسن منگلی کوئی بچی نہیں تھی۔ اس نے ہر قسم کا آدمی دیکھا تھا۔ انسانوں کے بارے میں منگلی کے تجربے سندری بائی سے کم نہیں تھے۔ بلکہ جنگل جنگل شہر شہر پھرتے رہنے کے باعث منگلی اس نائیکہ سے دس قدم آگے ہی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ سندری نہیں چاہتی کہ وہ

اس کے ڈیرے پر بیٹھ کر ایک قاتل کی تلاش جاری رکھے۔ منگلی کے پاس اگر شہر میں کوئی دوسرا ٹھکانہ نہ ہوتا تو پھر وہ سندری کو اپنے پاس ٹھہرانے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے مجبور بھی کر سکتی تھی۔ لیکن صورتحال یہ تھی کہ منگلی کے پاس ایک آشرم کی خالی کوٹھری موجود تھی۔ جہاں پر رہ کر اس کی سرگرمیوں پر نہ تو کسی کی نظر پڑ سکتی تھی اور نہ کوئی اس پر شک ہی کر سکتا تھا۔ اس نے سندری سے کہا۔

"کوئی بات نہیں سندری! ہم سنیاسی لوگ ہیں ہم تو کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ کہیں بھی ٹھہر سکتے ہیں اور پھر ہم تو صرف ایک دن اور شہر میں ہیں۔ ہمیں شیر خان کا پتہ چلانا تھا جو پتہ چل گیا۔ اب اُس شہر سے واپس چلے جائیں گے۔ کیونکہ ہُم کسی مجرم کو جیل سے رہا نہیں کرا سکتے۔"

سنیاسن منگلی سندری کے ہاں سے واپس آشرم میں آ گئی۔ اس بات کا منگلی کو پتہ چل گیا تھا کہ شیر خان نے دھول کے اڈے پر شہاب اور دھول کو قتل کیا ہے اور دھول کا اڈہ سونا گاچی کے علاقے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کا پتہ منگلی نے سندری کے آدمی سے معلوم کر لیا تھا۔ وہ رات منگلی نے آشرم میں گزاری۔ دوسرے روز وہ شہر میں ایک سنیاسن جوگن کے روپ میں پھرتی پھراتی دھول کے جوئے خانے والے علاقے میں پہنچ گی۔

جوا خانہ بند نہیں ہوا تھا مگر دھول کے قتل کے بعد وہاں اب جوا نہیں ہوتا تھا۔ صرف ناجائز منشیات چوری چھپے بیچی جاتی تھیں۔ یہ کام دھول کا ایک بنگالی ملازم گھوش چلاتا تھا۔ منگلی نے دھول کے ڈیرے پر جاتے ہی اولکھ نجن کا نعرہ لگایا۔ ڈیوڑھی میں سے ایک دبلا پتلا کالا کلوٹا آدمی باہر نکلا۔ منگلی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا۔

"دیوی ماتا! ڈیوڑھی میں پدھاریں میں بھوجن پیش کرتا ہوں۔"

منگلی کوئی بھوجن کرنے وہاں نہیں آئی تھی۔ وہ تو اپنے خاص مشن پر آئی تھی۔ اس نے ہنس کر بنگالی کی طرف دیکھا اور بولی۔

"بچہ ہم بھوجن کرنے نہیں آئے۔ ہم اپنے چیلے دھول داس سے ملنے آئے ہیں۔ ہم نے اسے سپنے میں دیکھا کہ وہ پریشان ہے۔ بس اسی وقت ریل میں بیٹھ کر اپنے چیلے کا حال معلوم کرنے چل پڑے۔ کہاں ہے ہمارا داس دھول؟"

بنگالی گھوش نے جب دیکھا کہ دھول کی گروماں آئی ہے تو وہ منگلی کے آگے بچھ گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔

"دیوی ماں! دھول سیٹھ تو قتل ہو گیا ہے۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ منگلی نے بنگالی گھوش کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"ہمیں یہ سن کر دکھ ہوا کس نردئی نے اسے قتل کیا ہے۔ ہمیں بتاؤ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ایسا منتر پڑھ کر پھونکیں گے کہ وہ وہیں بھسم ہو جائے گا۔"

"دیوی ماں! اندر آجایئے۔" بنگالی بدمعاش گھوش ہی اب اس اڈے میں ناجائز منشیات کا کاروبار چلاتا تھا۔ وہ منگلی کو بڑی تعظیم کے ساتھ اندر لے گیا۔ اندر ایک بڑی سجی

سجائی بیٹھک تھی جہاں پلنگ پر مسہری لگی تھی۔ دیواروں پر انگریزی ایکٹروں کی عریاں تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ منگلی صوفے پر بیٹھ گئی۔ بنگالی گھوش اس کے قدموں میں بیٹھ گیا اور سارا قصہ سنایا۔

"دیوی ماں! شیر خان کے مقدمے کی یہ آخری پیشی ہے۔ اس پیشی پر فیصلہ سنا دیا جائے گا اور اسے پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔" منگلی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اور اگر عدالت نے اسے پھانسی کی سزا نہ سنائی تو میں اپنے منتروں سے اسے ہلاک کر ڈالوں گی۔" بنگالی گھوش بولا۔

"ایسا نہیں ہو گا دیوی ماں! کیونکہ اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام بھی ہے۔ ہماری حکومت اسے خود زندہ نہیں چھوڑنا چاہتی اسے ضرور پھانسی مل جائے گی۔" منگلی نے دل میں اس کالے بنگالی کو دو چار گالیاں دیں اور کہا۔

"سنو گھوش! دھول ہمارا بڑا پیارا داس تھا۔ جب تک اس کا قاتل پھانسی کے تختے پر نہیں چڑھ جاتا ہمیں چین نہیں آئے گا۔ ہمیں یہ پتہ کر کے بتاؤ کہ ہمارے دھول کے قاتل کی عدالت میں پیشی کس تاریخ کو ہے۔"

"یہ میں آپ کو تھوڑی دیر میں پتہ کر دیتا ہوں دیوی ماں۔ ہمارا ایک کارندہ عدالت سے آنے ہی والا ہو گا۔" اس دوران گھوش منگلی کی خدمت میں لگ گیا دوپہر کے بعد ڈیرے کا جو آدمی عدالت گیا ہوا تھا واپس آیا تو وہ بڑے جوش میں تھا۔ آتے ہی بولا۔

"گھوش بابو! شیر خان کو موت کی سزا ہو گئی ہے۔"

گھوش یہ سنتے ہی بیٹھک میں آگیا۔ منگلی نے اندر بیٹھے بیٹھے یہ افسوسناک خبر سن لی تھی۔ اس کو بڑا صدمہ ہوا تھا جب گھوش نے اندر آکر بڑی خوشی سے یہ خبر منگلی کو سنائی تو منگلی نے چہرے پر بڑی مشکل سے مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"بھگوان نے نیائے کیا ہے۔ میرے داس کے قاتل کو موت کی سزا ہی دی جانی چاہیے تھی۔ ہم بڑے خوش ہوئے ہیں۔"

دل میں منگلی کو بے چینی سی لگ گئی۔ یہ بہت برا ہوا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ فیصلہ سنانے کے کتنے دن بعد مجرم کو پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس نے گھوش سے اس

بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

"ماں دیوی! گورنمنٹ تو پہلے ہی شیر خان کو پاکستانی جاسوس بھی سمجھتی ہے۔ یہاں اس کی اپیل کرنے والا کوئی نہیں۔ اگر اس نے خود بھی اپیل کی تو گورنمنٹ اسے نامنظور کر دے گی۔ بس اب سے دس پندرہ دن کے بعد پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔"

منگلی سنیاسن کا تو دل بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ سنیاسی لوگ خواہ عورت ہوں یا مرد ان کے اعصاب بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ بڑے جتی ستی لوگ ہوتے ہیں۔ مگر یہ معاملہ محبت کا تھا۔ اور محبت بڑے بڑے پہاڑوں کو ایک بار تو اپنی جگہ سے ہلا دیتی ہے۔ لیکن منگلی بڑی مضبوط عورت تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ کسی حد تک سنگدل بھی تھی۔ سنگ دلی اسے پسند تھی۔ یہی سنگ دلی وہ اپنے محبوب شیر خان میں بھی دیکھ چکی تھی اور اسے اچھی لگی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے سوچنا شروع کر دیا کہ وہ شیر خان کو موت کے منہ سے کیسے بچا سکتی ہے۔ اسے شیرخان کو بچانا ضرور تھا۔ اس کی موت منگلی کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ زندگی میں یہی ایک پہلا مرد اسے ملا تھا۔ وہ اسے کسی حالت میں بھی اپنے ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتی تھی۔ معاملہ پیچیدہ ہو گیا تھا۔ بنگالی کہہ رہا تھا کہ اب شیر خان کو پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے گا جہاں کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ منگلی کو جیل کے اندرونی حالات اور معاملات کا علم نہیں تھا۔ وہ جیل کے اندر جا کر شیر خان کو پھانسی کی کوٹھڑی سے فرار نہیں کروا سکتی تھی۔ اسے کوئی دوسرا طریقہ کوئی دوسری ترکیب استعمال کرنی ہو گی۔ ایک حقیقت منگلی پر اس کی سنیاسن کی زندگی نے بالکل واضح کر دی تھی کہ انسان خواہ چاند پر چہل قدمی کر کے واپس آجائے وہ اپنے اندر چھپے ہوئے توہمات کے بھوت سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ وہ بھوت ہے جو جنگل کے زمانے سے اس کے ساتھ شہر میں آیا ہے۔ خاص طور پر پس ماندہ ملکوں کے لوگوں پر تو یہ بھوت بڑی جلدی سوار ہو جاتا ہے۔ ان علاقوں میں آدمی کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو توہمات کے بھوت سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اس بھوت کی مدد سے آدمی قتل کی ایسی واردات بھی کروا سکتا ہے۔ سنیاسن منگلی نے انسان کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی محاذ پر منگلی بھرپور طاقت اور اعتماد کے ساتھ حملہ کر کے دشمن کو چاروں شانے چت گرا سکتی تھی۔

اس نے باتوں باتوں میں بنگالی گھوش سے کہا۔

"کہیں یہ شیر خان جیل توڑ کر باہر نہ آجائے۔ وہ بڑا عیار ہے۔ اگر فرار ہو گیا تو میں اس پر موت بن کر سوار ہو جاؤں گی۔"

گھوش بولا۔ "نہیں دیوی! پھانسی کی کوٹھڑی سے آج تک کوئی بہادر سے بہادر اور عیار سے عیار آدمی بھی فرار نہیں ہو سکا۔ وہاں تو چوبیس گھنٹے پہرہ لگا ہوتا ہے۔"

منگلی نے پوچھا۔

"جیل کا جو مالک ہوتا ہے اس کو بڑا خبردار رہنا چاہیے۔"

بنگالی نے ہنس کر کہا۔

"دیوی ماتا! جیل کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔ جیل کا تو جیلر ہوتا ہے اور رہتا بھی وہیں ہے۔ جیل کے ساتھ ہی اس کی سرکاری کوٹھی ہوتی ہے۔"

"بس پھر ٹھیک ہے۔"

منگلی نے بڑے اطمینان کا اظہار کیا۔ اور بنگالی گھوش سے جو معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی وہ اسے مل گئی تھیں۔ اب صرف اسے یہ پتہ کرنا تھا کہ جیل کہاں پر واقع ہے۔ یہ کوئی وقت طلب کام نہیں تھا۔ سڑک پر کوئی بھی رکشہ ٹیکسی ڈرائیور اسے جیل کے پھاٹک تک پہنچا سکتا تھا۔ منگلی جیل کے مالک یا سپرنٹنڈنٹ کے کچھ گھریلو حالات معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ یہ بنگالی اسے اس سلسلے میں کچھ بتا سکے گا مگر غیر متوقع طور پر اس نے منگلی کو بڑی اہم معلومات مہیا کر دیں۔ منگلی نے محض موضوع کو جاری رکھنے کی خاطر کہا۔

"یہ جیل کا مالک تو بڑا پتھر دل آدمی ہو گا سنا ہے۔ یہ لوگ ذرا کسی قیدی پر رحم نہیں کھاتے۔"

بنگالی بیڑی سلگاتے ہوئے بولا۔

"نہیں دیوی ماں! یہ جو جیلر سانیال جی ہے یہ تو بڑا دیوتا سمان ہے۔ درگا ماتا کا بھگت ہے۔ پر اس کے بھاگ اچھے نہیں۔"

منگلی نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ بھاگ اچھے کیوں نہیں ہیں بھلا؟"

بنگالی گھوش بولا۔

"اس کا اپنا جوان بیٹا کہیں چلا گیا ہے۔ آج دو برس ہو گئے ہیں۔ اخباروں میں اشتہار بھی چھپا۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔"

"کیا جھگڑا ہو گیا تھا اس کا ماتا پتا سے؟"

"نہیں دیوی ماں! اصل میں اسے اپنی پتنی سے بڑی محبت تھی۔ پتنی مر گئی تو وہ اداس رہنے لگا۔ کہتے ہیں ایک رات گھر سے نکل گیا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ بیٹے کے غم میں ماں بے چاری بستر پر پڑ گئی ہے۔ باپ اس دکھ کو سینے میں دبائے ہوئے ہے۔ ایک ہی لڑکا تھا ان کا۔"

منگلی کا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ جیلر کے بارے میں جو معلومات اسے شاید بڑی تگ و دو کے بعد حاصل ہوتیں بنگالی گھوش نے وہ ایک ہی سانس میں اس کو دے دی تھیں۔ اس قسم کے مصیبت اور آفت زدہ گھرانے پر تو منگلی اپنا جادو بڑی کامیابی سے چلا سکتی تھی۔ اب اس کے لیے ڈھول کا جوا خانہ ایک بیکار جگہ تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بنگالی گھوش ایک دم سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ماں دیوی! بھوجن کر کے جائیں۔ میں ہوٹل سے آپ کی مرضی کا بھوجن بنوا لاتا ہوں۔"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

اور سنیاسن منگلی وہاں سے نکلی اور واپس آشرم میں آ گئی۔ یہاں بیٹھ کر اس نے دل میں پورا منصوبہ تیار کیا۔ تھیلے میں رکھی ہوئی اپنی ان چیزوں کو دیکھا جو تقریباً ہر وقت اس کے پاس ہوتی تھیں۔ لومڑی کے ناخن سیسہ کے چار پانچ لمبے کانٹے کچھ جڑی بوٹیاں سو پچاس روپے اور ایک نیلی شیشی میں بند چندن بوٹی کی راکھ زہریلے تیر اس نے الگ لفافے میں لپیٹ کر رکھے ہوئے تھے۔

جب دن ڈھلنے لگا تو سنیاسن منگلی نے تھیلے میں سے چھوٹی ڈبی اور ٹوٹا ہوا آئینہ نکالا۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالا۔ ماتھے پر درگا ماتا کا لمبا زعفرانی تلک لگایا۔ لمبے بالوں کو جھٹک کر اپنے کاندھوں پر ڈالا اور ترشول ہاتھ میں لے کر کوٹھری بند کر کے آشرم سے نکل کر سڑک

کے کنارے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک خالی ٹیکسی کو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور ڈرائیور سے کہا کہ مجھے شہر کی سب سے بڑی جیل تک پہنچا دو۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ٹیکسی میں بٹھا لیا۔ وہ ایک جوگن ٹائپ عورت کو انکار کر کے اس کی بدعا نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہ اس ٹیکسی ڈرائیور کی ضعیف الاعتقادی تھی۔ ٹیکسی نہ جانے شہر کے کن کن علاقوں کا چکر لگا کر سینٹرل جیل کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ "ماں دیوی! ہمارے دھن بھاگ، ہیں تم ہماری ٹیکسی میں بیٹھیں۔ ہمیں تمہارا آشیرباد چاہیے۔ پیسے نہیں۔"

منگلی نے اسے آشر باد دی اور ٹیکسی میں سے نکل کر ایک طرف درختوں کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اچھی طرح سے ماحول کا جائزہ لیا۔ چند قدموں کے فاصلے پر ٹریفک پولیس کا ایک سپاہی فٹ پاتھ پر ٹہل رہا تھا۔ منگلی اس کے پاس آ گئی اور سینٹرل جیل کے جیلر کے گھر کا پتہ پوچھا۔ سپاہی نے سامنے ایک جانب اشارہ کر کے کہا۔

"سانیال جی کا بنگلہ وہ سامنے ہے ماتا۔"

"بنگلے کا چھوٹا سا لوہے کا گیٹ تھا جس کے باہر اسٹول پر ایک وردی والا چوکیدار بندوق لیے بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ منگلی نے جاتے ہی جے ہو درگا میا کی کا نعرہ لگایا اور بڑے جلالی لہجے میں کہا۔

"سانیال دادا سے کہو ایک جوگن سنیاسن تم سے ملنے آئی ہے۔"

چوکیدار احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"دیوی ماتا! تم یہاں ٹھہرو میں صاحب سے پوچھ کر آتا ہوں۔"

چوکیدار تھوڑا سا پھاٹک کھول کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد تیز تیز چلتا واپس آیا اور بولا۔

"ماتا اندر آ جاؤ۔ صاحب جی بلاتے ہیں۔"

منگلی پھاٹک سے گزر کر اندر گئی تو دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا بنگالی جس نے دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پر چشمہ لگائے برآمدے میں اس کے استقبال کو موجود ہے یہ جیلر سانیال پیٹر جی تھا۔ اس نے منگلی کو بڑی تعظیم سے برآمدے میں بٹھایا اور پوچھا۔

"میں کیا سیوا کر سکتا ہوں جوگن ماتا؟"

جیلر کا لہجہ اگرچہ بڑا بااخلاق تھا مگر منگی نے بھی ایک زمانہ دیکھا ہوا تھا۔ اس نے صاف پتہ کر لیا یہ شخص اس کے جوگنوں والے پہناوے سے متاثر نہیں ہوا اور چاہتا ہے کہ جو بات کرنی ہو کرے اور پھر چلی جائے۔ اس کے انداز میں ایک بے تعلقی اور بے نیازی سی تھی۔ منگی نے کہا۔

"مجھے اس بڑی جیل کے جیلر سانیال سے ملنا ہے۔" جیلر کی انگلیوں میں سگار سلگ رہا تھا۔ اس نے سگار کا ہلکا سا کش لگایا اور بولا

"میں ہی سانیال چیٹر جی ہوں.......... کہو۔ تم کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

سنیاسن منگی نے اپنی انگلی سانیال کی طرف اٹھاتے ہوئے بارعب آواز میں کہا۔"کام مجھے نہیں تمہیں مجھ سے ہے۔ تم میرے کس کام آؤ گے۔ جاؤ اب۔ تمہارا بیٹا تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔"

یہ کہا اور منگی غصے میں اٹھ کر کوٹھی کے گیٹ کی طرف چل پڑی۔ دل میں اپنے آپ سے یہ کہتے ہوئے کہ اے بھگوان یہ کالا کلوٹا جیلر میرے پیچھے آجائے۔ مجھے واپس بلانے۔ نہیں تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔ بنگالی جیلر بہت پڑھا لکھا تھا اور جتنا پڑھا لکھا تھا اتنا ہی توہم پرست بھی تھا۔ قیدیوں سے سخت برتاؤ کرتے کرتے اس کے مزاج میں بھی سختی اور درشتی آگئی تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ سانیال نے پہلی نظر میں منگی کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی مگر جب منگی نے ہندو جوگی جوگنوں والے بناوٹی جلال سے کام لیا اور خاص طور پر اس کے گمشدہ بچے کا حوالہ دیا تو جیلر اپنی جگہ سے ہل گیا۔ فوراً منگی کے پیچھے لپکا اور سامنے آکر ہاتھ باندھ کر بولا۔

"ماتا! مجھے شما کر دو۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ مجھے سیوا کا موقع دیں۔ میرے بچے کے حق میں پرارتھنا کریں۔"

منگی نے سکھ کا سانس لیا۔ ہاتھ اونچا کر کے بولی۔

"معلوم ہوتا ہے درگا ماتا تجھ پر مہربان ہے جس نے تیرے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ جا سنیاسن کے پاؤں پکڑ ورنہ تیرا بچہ تجھے کبھی نہ مل سکتا۔" جیلر نے عاجزی سے کہا۔

"ماں دیوی! ہمیں ہمارا بیٹا ملا دو۔ اس کی ماں کو تو اس غم نے موت کے کنارے پہنچا

دیا ہے۔"

منگی نے حکم دیا۔ "چلو مجھے بچے کی ماں سے ملاؤ۔"

جیلر فوراً منگی کو لے کر برآمدے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے نوکر کو اشارہ کیا۔ نوکر جلدی سے دوسری طرف کچن میں مٹھائیاں وغیرہ تھال میں لگانے چلا گیا۔

جیلر سانیال چیٹر جی کی بیوی گمشدہ جوان بیٹے کے غم میں وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی تھی۔ بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔ اور بدن بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ وہ مسہری والے ایک بڑے سے پلنگ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔ سانیال کے ساتھ ایک جوگن سنیاسن کو دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ منگی نے وہیں ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"نہیں، نہیں میا! لیٹی رہو۔ تمہاری بپتا کے دن کٹ گئے ہیں۔"

مسز سانیال کے چہرے پر رونق کی ایک لہری دوڑ گئی۔ جیلر نے جھک کر پتنی سے کہا۔

"دیوی ماتا نے کہا ہے کہ ہمارا بیٹا گوپی ناتھ بہت جلد گھر واپس آجائے گا۔"

مسز سانیال کا چہرہ یہ سن کر کھل اٹھا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہاتھ باندھ کر بولی۔

"دیوی ماں! مجھے میرا بچہ ملا دے۔ میں تمہاری جنم جنم کی داسی بن کر رہوں گی۔"

منگی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے سجے ہوئے آراستہ کمرے کی دیواروں پر نگاہ ڈالی۔ پلنگ کے سرہانے کی طرف دیوار میں کالی ماتا کی بڑی تصویر لگی تھی۔ منگی نے کہا۔

"تم کالی ماتا کے سیوک ہو۔ اس لیے ماں کالی نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

مسز سانیال تو یہ سن کر نہال ہو گئی۔

"درگا میا نے تمہیں بھیجا ہے۔ میرے یہ بھاگ کہاں سنتے ہو۔ درگاہ ماں نے دیوی ماتا کو ہمارے پاس بھیجا ہے۔ ان کی سیوا کرو۔ میرا بچہ اب مجھے ضرور مل جائے گا۔"

سانیال اپنی بیوی کے پاس پلنگ پر بیٹھا اس کے کاندھے دباتے ہوئے کہنے لگا۔

"نیلنی؟ درگا ماں کی جے بولو۔ دیوی ماں ہمارے گھر پدھار رہی ہیں ان کی بھی جے بولو۔" اتنے میں نوکر تھال میں سجی ہوئی مٹھائیاں لے کر آگیا۔ دوسرے نوکر نے چائے کا

ٹرے اٹھا رکھا تھا۔ منگلی نے کہا۔

"ہم کسی کے گھر سے کبھی کچھ نہیں کھاتے۔ یہ سب کچھ واپس لے جاؤ۔" سانیال نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"دیوی ماں! یہ تو آپ کے سیوک کا گھر ہے آپ کے داس کا گھر ہے کچھ نہ کچھ ضرور لیجئے۔" منگلی نے تھوڑی سی برفی کھائی اور چائے پینے لگی۔

"تم درگا ماتا کے بھگت ہو۔ یہ درگا ماں کی خوشی کے لیے کھا رہی ہوں۔ ورنہ ہم سنیاسی لوگ کسی کے گھر سے کبھی کچھ نہیں کھاتے۔"

"یہ آپ کی کرپا ہے ماں دیوی!"

مسز للیتی سانیال نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔

"دیوی ماں! میرا بچہ گوپی کہاں ہے۔ وہ تندرست ہے ناں؟ وہ اپنی ماں کے پاس کب واپس آئے گا؟"

منگلی نے اپنے منصوبے کی دوسری شق پر عمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے مجھے ایک چھوٹا سا چلہ کاٹنا ہو گا پھر تمہارا بیٹا تمہارے پاس واپس آجائے گا۔"

سانیال اور مسز سانیال کے مردہ دلوں میں تو جیسے کسی نے نئی روح پھونک دی۔ وہ اب تک اپنے بیٹے کی تلاش کے سلسلے میں ہزاروں روپے خرچ کر چکے تھے۔ کوئی مندر انہوں نے نہیں چھوڑا تھا جہاں پرارتھنا نہ کرائی ہو اب تک ہزاروں جوگیوں اور سادھوؤں کو کھانا کھلا چکے تھے۔ اور یہ تو ایک چھوٹے سے چلے کی بات تھی۔

"کیا سچ مچ ہمارا بیٹا ہمارے گھر واپس آجائے گا۔" سانیال نے بے بسی کے لہجے میں سوال کیا۔ منگلی نے اس کیطرف گھور کر دیکھا اور درشتی سے کہا۔

"کیا تم درگا ماتا کے منتروں کو جھوٹا سمجھتے ہو؟"

"نہیں نہیں ماں دیوی! درگا ماتا تو مہان ہے۔ اس کے منتر بھی مہان ہیں۔ مجھے شما کر دیں۔

بیٹے کی محبت میں ایسا فقرہ منہ سے نکل گیا۔"

سانیال جیلر نے منگلی کے پاؤں چھوئے۔ "آپ ہم پر کرپا کر کے چلہ کاٹیں۔ ہمارے دکھ دور کریں۔ مجھے حکم کریں۔ میں اس میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ کیا آپ بھی جنگل میں جا کر چلا کاٹیں گی دیوی ماتا؟"

منگلی نے دل میں کہا۔ جنگل میں تو میں اپنے یار شیر خان کو ساتھ لے جاؤں گی۔ بنگالی بابو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ حالانکہ اس نے پہلے سے سب کچھ سوچ رکھا تھا۔ آنکھیں کھول کر چھت کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اپنے ہاتھ کو بلند کر کے دائرے کی شکل میں گھمایا اور نفی میں سرہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں نہیں۔ یہ چلہ نا ممکن ہے۔ نا ممکن ہے۔" جیلر سانیال چیٹر جی اور اس کی بیمار بیوی کے چہرے اتر گئے۔

"ایسا نہ کہیں دیوی ماں!" جیلر کی بیوی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "میری جان لے لیں مگر میرے بچے کو واپس لانے کا چلہ ضرور کاٹیں۔" منگلی نے غصے میں کہا۔

"اس چلے کے واسطے مجھے کسی ایسے آدمی کا خون چاہیے جو مر رہا ہو۔ بتاؤ۔ تمہیں کون اپنے کسی عزیز کا خون نکالنے دے گا جو مرنے والا ہو؟ بہتر یہی ہے کہ اپنے بیٹے کی قسمت کو بھگوان پر چھوڑ دو۔"

جیلر سانیال اور اس کی بیوی پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ مسز سانیال نے کہا۔

"دیوی ماں! آپ میرا خون لے لیں۔ میں تو مرنے ہی والی ہوں۔"

منگلی نے اس عورت کی طرف دیکھا جو اولاد کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دینے کو تیار تھی۔ وہ ماں تھی۔ منگلی کے دل میں اس عورت کا احترام بڑھ گیا۔ اس نے اپنے دل میں خدا کے آگے اپنے گناہ کی معافی مانگتے ہوئے کہا کہ بھگوان! تو جانتا ہے میں ان کے ساتھ فریب کر رہی ہوں۔ یہ ماں ہے۔ میرے گناہ کو معاف کر دینا۔ میں بھی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا کر رہی ہوں۔ تو ان پر کرپا کرنا اور ان کے گمشدہ بچے کو ملا دینا۔ اس نے ایک بار پھر نفی میں سرہلایا

"نہیں نہیں بھگتن! مجھے کسی ایسے انسان کا خون چاہیے۔ جو خون دینے کے دو چار

دن بعد مرجائے۔ جس کی موت لکھ دی گئی ہو۔ تم تو بچ بھی سکتی ہو۔"

اب ترپ کا پتا پھینکنے کا وقت آگیا تھا۔ منگلی نے جھوٹ موٹ چونک کر کہا۔

"ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔"

"بھگوان کے لیے وہ ترکیب بتا دو دیوی ماں!"

جیلر سانیال نے بیتاب ہو کر کہا۔ منگلی پھر ایک پل کے لیے جیسے سوچ میں ڈوب گئی۔

پھر دوبارہ آنکھیں کھول کر جیلر سانیال کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تمہاری جیل میں کوئی ایسی عورت یا مرد ہے جس کی موت لکھ دی گئی ہو؟" جیلر نے فوراً جواب میں کہا۔

"کیوں نہیں۔ اس وقت ہماری جیل میں ایک ایسا قیدی کوٹھڑی میں بند ہے جس کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی ہے۔"

منگلی نے ہونٹوں کو پکڑ کر کہا۔

"اس سے کام نہیں چلے گا۔ اس کو صرف سزا سنائی گئی ہے۔ وہ تو اپیل میں بری بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے کوئی ایسا قیدی بتاؤ جس کو ہر حالت میں پھانسی دی جانے والی ہو۔"

سانیال چیٹرجی نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"دیوی ماں! اس قیدی کو ہر حالت میں پھانسی دے دی جائے گی۔ کیونکہ ایک تو اس کی اپیل کرنے والا کوئی نہیں۔ دوسرے قتل کے علاوہ اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا جرم بھی ثابت ہو گیا ہے۔ اس کو ان دونوں جرائم کے بدلے موت کی سزا سنائی گئی ہے۔ حکومت نے اسے پھانسی کے تختے پر چڑھانے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ یقین کرو دیوی ماں! میں جیلر ہوں مجھے معلوم ہے کہ شیر خان کو اگلے ہفتے پھانس دے دی جائے گی۔"

"شیر خان؟" منگلی نے نقلی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ مجرم مسلمان ہے؟"

"ہاں دیوی ماں! یہ پاکستان کا جاسوس ہے۔ اس نے یہاں کلکتے میں ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جاسوس بھی ہے اس کو تو ہماری بھارتی حکومت کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ تو اگلے ہفتے مار دیا جائے گا۔ تم اس کا خون لے سکتی ہو۔ میں تمہیں

اس کا خون نکلوا کر لا دوں گا۔"

منگلی اتنی احمق نہیں تھی۔ فوراً ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"تم کون ہوتے ہو میرے چلے کے لیے خون لا کر دینے والے؟"

سانیال اور اس کی بیوی سہم گئے بیوی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے خاوند کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا سانیال ہاتھ باندھ کر چپ ہو گیا۔ مسز نیلنی چیٹرجی نے بڑے ادب سے عرض کی۔

"دیوی ماں! آپ جیسے مناسب سمجھیں کریں آپ جیسے چاہیں گی میرے پتی دیو ویسے ہی کریں گے۔"

اب منگلی کو اپنے منصوبے کے اہم ترین حصے پر عمل کرنا تھا۔ جیلر کو اس کے کیریئر کے سب سے مشکل ترین امتحان میں ڈالنا تھا۔ اس کو ایک ایسی بات پر عمل کے لیے مجبور کرنا تھا جس کو عام حالات میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ منگلی نے یونہی انگلیوں پر منتر پڑھتے ہوئے کچھ گنا اور پھر جیلر کی طرف یعنی ایک گمشدہ بچے کے مجبور باپ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"سنو سانیال! تمہیں ایک رات کے لیے مجھے اس آدمی کی پھانسی کی کوٹھڑی میں لے جانا ہو گا جس کا نام تم نے شیر خان بتایا ہے اور جسے پھانسی ملنے والی ہے۔"

جیلر سانیال نے دل میں اپنے بھگوان کا شکر ادا کیا کہ منگلی سنیاسن نے یہ نہیں کہا کہ شیر خان کو کوٹھڑی سے باہر نکال کر جیل کی چھت پر یا چلہ کاٹنے کے لیے کسی کھلی جگہ پر پہنچانا ہو گا۔ کیونکہ ایسا جیلر سانیال نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے منگلی کو بھی معلوم تھا کہ جیلر جتنا کر سکتا ہے اسے اس کی حدود میں رہ کر اپنے منصوبے پر عمل کرنا ہو گا سانیال نے پوچھا۔

"دیوی ماں! میں تمہیں کسی نہ کسی طرح شیر خان کی کوٹھڑی میں بیٹھا دوں گا مگر تم اس کا خون کس طرح نکالو گی؟"

منگلی نے تھیلے میں سے چربی کی ایک جھلی اور سینگی جو لوہے کی قلفی کی طرح تھی نکال کر سانیال کو دکھائی اور کہا۔

"ہم جوگی سنیاسی لوگوں کے پاس اس قسم کے چلہ کاٹنے کا سامان پہلے سے موجود ہوتا

ہے۔ میں پھانسی پانے والے کے گھٹنے پر یہ سینگی لگا کر اس کا تھوڑا سا خون نکال کر مٹی کے پیالے میں ڈالوں گی اور اس پر منتر پڑھ کر چلہ کاٹوں گی۔"

سانیال جیلر کے لیے یہ کوئی خطرہ مول لینے والی بات نہیں تھی۔ پھانسی کی کوٹھڑی جیل کے اندر ہوتی ہے اور اس کے سلاخ دار دروازے کے باہر بھی برآمدے میں دو سپاہی پہرے پر ہر وقت موجود رہتے ہیں اور پھر احتیاط کے طور پر وہ خود بھی رات کو اپنے دفتر میں ہی رہے گا۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ کہیں شیر خان کوئی حملہ نہ کر دے یا گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس نے منگلی سے اس کا ذکر کیا تو منگلی مسکرا دی کہنے لگی۔

"میں چلہ کاٹنے سے پہلے ایک خاص منتر شیر خان پر پڑھ کر پھونکوں گی جس سے وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں بڑے سکون سے رات بھر چلہ کاٹ سکوں گی۔" مجھے آدھی رات کے وقت پھانسی پانے والے کی کوٹھڑی میں داخل ہونا ہو گا اور صبح سورج نکلنے سے پہلے چلہ ختم کر کے کوٹھڑی سے نکل آؤں گی۔ اس کے تین دن کے بعد تمہارا بیٹا گوپی تمہارے گھر آجائے گا۔"

سانیال اور اس کی بیوی کے چہروں پر خوشی کی چمک سی آگئی۔ سانیال بولا۔

"دیوی ماں! آپ چاہیں تو آج رات ہی چلہ شروع کر دیں۔"

منگلی کو کچھ دوسرے انتظام بھی کرنے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"نہیں۔ آج ستاروں کے حساب سے لگن ٹھیک نہیں ہے۔ میں کل رات چلہ کاٹوں گی اب چلتی ہوں۔ کل شام کو آؤں گی اور یہیں سے مجھے پھانسی کی کوٹھری میں لے جانا۔ خبردار کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا جائے۔" جیلر سانیال کہنے لگا۔

"مگر دیوی ماں! پھانسی کی کوٹھڑی کے باہر جو سپاہی پہرہ دیتے ہیں ان کو تو بتانا ہی پڑے گا۔"

منگلی نے سخت لہجے میں کہا۔

ٹھیک ہے ان کے سوا اور کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔"

منگلی خود چاہتی تھی کہ پہرے دار سپاہیوں کو علم ہونا چاہیے کہ میں جیلر کی اجازت سے اس کے واسطے چلہ کاٹ رہی ہوں۔ اس طرح سپاہی اسے پریشان نہیں کر سکتے تھے۔

اور وہ ان کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنے منصوبے پر عمل کر سکتی تھی۔

منگلی واپس آشرم میں آگئی۔ کافی رات گئے تک وہ اپنی اسکیم پر مزید غور و فکر کرتی رہی۔ اس کے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ صرف چند ایک زہریلے تیر ہی تھے۔ باقی شیر خان کو اپنی جرات اور بہادری سے کام لینا تھا۔ منگلی کو جو کچھ کرنا تھا وہ اسے معلوم تھا۔ اور وہ اس پر انتہائی ہوشیاری سے عمل کر سکتی تھی۔ باقی سب سے اہم مرحلہ جیل کی دیوار پھاندنے کا تھا۔ جیلر کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے منگلی نے پھانسی کی کوٹھڑی کے حدود اربعے کی کافی تفصیلات حاصل کر لیں تھیں۔ اس کوٹھڑی کے پیچھے کھلی جگہ تھی۔ وہاں سے کوئی پچاس قدموں کے فاصلے پر جیل کی اونچی دیوار تھی۔ یہ دیوار شیر خان کو اکیلے ہی پھاندنی تھی۔ منگلی نے نائیلون کی باریک رسی کا گچھا ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چونکہ دیوار کے اوپر خاردار تار کھینچی ہوئی تھی اس لیے رسی کے آگے کوئی آنکڑا یا ہک لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔

اگلے روز منگلی بازار سے نائیلون کی رسی کا ایک گچھا خرید کر لے آئی۔ اس کے ایک سرے کے آگے منگلی نے پرانا کپڑا باندھ کر اس پر گانٹھیں لگا دیں تا کہ وہ کانٹے دار تاروں کے گچھے میں جا کر پھنس جائے۔ اسے پورا یقین تھا کہ شیر خان اکیلا دیوار پھاندنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ کیونکہ پھانسی کی کوٹھڑی کے باہر وہ اس کی اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شیر خان کے کوٹھڑی سے نکلنے کے بعد کیا صورتحال ہو گی اس کا اسے واضح طور پر علم نہیں تھا۔

جب دن ڈوب گیا اور کلکتہ شہر کے بازاروں اور گھروں میں بتیاں روشن ہو گئیں تو منگلی اپنے مشن پر پوری طرح سے تیار ہو کر آشرم سے نکل پڑی۔ سانیال چیٹرجی اور اس کی بیوی سنیاسن کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ منگلی ان کے بنگلے پر پہنچی تو اس کا بڑی تعظیم سے خیر مقدم کیا گیا۔ اس دوران جیلر سانیال نے ان دونوں سپاہیوں کو اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔ جو رات کو پھانسی کی کوٹھڑی کے آگے برآمدے میں پہرہ دیتے تھے۔ اپنی مرضی کے مطابق کھانا منگلی نے وہیں سانیال کے گھر پر ہی کھایا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کچھ منتر بھی پڑھتی رہی۔ جب رات آدھی گزر گئی تو منگلی نے ڈرائننگ روم سے باہر جا کر آسمان پر

ایک نگاہ ڈالی اور جیلر سانیال چیٹرجی سے کہا۔

"چلے کا لگن آسمان پر بن گیا ہے اب مجھے پھانسی کی کوٹھری میں لے چلو۔ اگر وقت نکل گیا تو چلہ بے فائدہ ہو جائے گا۔"

سانیال جیلر نے سارا بندوبست پہلے سے کر رکھا تھا۔ وہ کوٹھی کے عقبی دروازے سے منگلی کو نکال کر اپنے دفتر میں لے آیا۔ اس رات جیلر نے اپنے دفتر کے باہر پہرہ دینے والے سپاہی کی ڈیوٹی بھی زنانہ وارڈ کی طرف لگا دی تھی۔ منگلی کو دفتر میں بٹھا کر سانیال چیٹرجی تھوڑی دیر کے لیے پھانسی کی کوٹھری کی طرف گیا۔ اس وارڈ میں صرف تین پھانسی کی کوٹھڑیاں تھیں جن میں سے دو خالی تھیں اور ایک میں شیر خان تھا۔ سانیال نے شیر خان کو دن کے وقت ہی بتا دیا تھا کہ ایک دیوی ماتا کو کوئی چلہ کاٹنے کے لیے اس کے تھوڑے سے خون کی ضرورت ہے۔ وہ رات کو آئے گی۔ شیر خان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کہ یہ دیوی ماتا کون ہے۔ اور اسے اس کے خون کی کس لیے ضرورت پڑ گئی۔ اور جیلر بھی اتنا خطرہ مول لینے پر کیسے تیار ہو گیا ہے۔ منگلی کا خیال تو اسے بالکل ہی نہیں آیا تھا۔ جب سانیال جیلر منگلی کو ساتھ لے کر پھانسی کی کوٹھری میں داخل ہوا تو شیر خان اسے دیکھ کر دیکھتا ہی رہ گیا۔ منگلی نے اسے آنکھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور اس کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر سانیال سے کہا۔

"بابا لوگ! اب تم جاؤ اور باہر جمعداروں کو کہہ دو کہ اس طرف کوئی نہ آئے۔ جب تک کہ میں نہ بلاؤں۔ نہیں تو سارا چلا سارے منتر بھنگ ہو جائیں گے۔"

سانیال بہت اچھا دیوی ماں کہہ کر چلا گیا۔

کوٹھری میں کوئی بلب نہیں لگا تھا۔ سامنے برآمدے میں جو بلب روشن تھا اس کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ دروازہ سلاخوں والا تھا۔ جس پر باہر کی جانب بھاری تالا پڑا تھا۔ شیر خان منگلی کی جرات پر حیران تھا کہ یہ عورت کیسے وہاں پہنچ گئی ہے۔ اس نے کچھ بولنا چاہا تو منگلی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش کرا دیا اور خود ذرا اونچی آواز میں منتروں کا جاپ کرنے لگی اور وہ برآمدے کے بڑے دروازے پر بیٹھے ہوئے دونوں سپاہیوں کو تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ چلہ کاٹ رہی ہے۔ تھوڑی دیر منتر پڑھنے کے بعد منگلی نے دھیمی آواز میں

شیر خان سے کہا۔

"آگے سب کچھ تمہیں ہی کرنا ہو گا۔"

اس نے تھیلے سے نائیلون کی رسی کا گچھا نکال کر شیر خان کو دے دیا۔ شیر خان نے جلدی سے اسے اپنی قمیض کے اندر چھپا لیا۔ اب ایسا ہوتا کہ تھوڑی دیر تک منگلی ذرا بلند آواز میں منتروں کا جاپ کرتی اور پھر تھوڑی دیر شیر خان کو سمجھانے لگتی کہ اسے کیا کرنا ہے اور جیل کی دیوار پھاندنے کے بعد اسے کہاں پہنچنا ہے۔ منگلی نے اسے اپنے آشرم کا پورا حدود اربعہ اور سڑک کا اور چوک کا نام سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ منگلی نے جیلر سانیال کو منع کر دیا تھا کہ وہ چلے کاٹنے کے دوران کم از کم ایک گھنٹے تک وہاں نہ آئے۔

جب آدھا گھنٹہ گزر گیا تو منگلی نے شیر خان سے کہا۔

"اب میں اپنا کام شروع کرتی ہوں۔ اس کے بعد تمہیں اپنا کام شروع کر دینا ہو گا۔

منگلی اٹھ کر سلاخوں کے پاس گئی۔ اس نے آواز دی۔

ایک سپاہی ادھر آیا۔

دونوں سپاہی برآمدے والے سلاخ دار دروازے کے آگے اندر کی جانب کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ منگلی کی آواز پر ایک سپاہی دوڑ کر قریب آیا۔ منگلی نے کہا" دروازہ کھولو۔ میں باہر نکلنا چاہتی ہوں۔" سپاہی نے فوراً تالا کھول کر دروازے کو باہر کی جانب کھول دیا۔ اسی اثنا میں منگلی نے زہریلے تیر والی پھونکی اپنے ہاتھ میں دبائی ہوئی تھی باہر آتے ہی جب سپاہی دروازے کو تالا لگانے لگا تو منگلی نے بڑے قریب سے زہریلا تیر اس کی گردن پر چلا دیا۔ تیر کے لگتے ہی سانپ کے مہلک تیر میں زہر نے اپنا اثر دکھایا۔ سپاہی لڑکھڑا کر گرا تو منگلی نے دوسرے سپاہی کو آواز دے کر کہا۔

"دیکھو تو یہ بے ہوش کیوں ہو گیا ہے۔"

دوسرا سپاہی بندوق لے کر دوڑ کر منگلی کے پاس آیا۔ وہ بندوق ایک طرف رکھ کر اپنے ساتھی کو اٹھانے لگا تو منگلی نے دوسرا زہریلا تیر چلا دیا۔ یہ تیر دوسرے سپاہی کی گردن کے پچھلے حصے میں جا کر لگا اور وہ بھی پہلے سپاہی کے اوپر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ منگلی نے شیر خان سے کہا۔

"اپنا کام شروع کر دو۔ جہاں تمہیں سمجھایا ہے وہیں پہنچ جانا۔ میں وہیں جا رہی ہوں۔" اتنا کہہ کر منگلی تیز تیز قدم اٹھاتی بانس کی کوٹھریوں والے برآمدے سے نکلی اور دیوار کے ساتھ اندھیرے میں چلتی سانیال چیٹر جی جیلر کی کوٹھی کے عقبی دروازے میں آ گئی۔ یہاں چوکیدار موجود تھا۔ وہ منگلی سے واقف تھا۔ اس نے منگلی کو کچھ نہ کہا۔ اور کوٹھی میں جانے دیا۔ منگلی کوٹھی کے اندر جانے کی بجائے کوٹھی کے لان میں سے گزر کر پھاٹک پر آ گئی۔ یہاں بھی چوکیدار پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے منگلی سنیاسن کو دیکھا تو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ فوراً پھاٹک کھول دیا۔

"دیوی ماں جا رہی ہیں؟"

"نہیں۔ ابھی واپس آتی ہوں۔"

چوکیدار کو اتنا کہہ کر منگلی کوٹھی میں سے نکلی اور سڑک کے کنارے کنارے فٹ پاتھ پر چل پڑی۔ کافی آگے جا کر اسے ایک رکشہ مل گیا۔ رکشے میں بیٹھی اور اسے آشرم والے چوک کی طرف چلنے کو کہا۔ چوک میں آشرم سے کچھ دور سنیاسن منگلی نے رکشہ چھوڑ دیا۔ چوک میں آشرم کے قریب برگد کا ایک پرانا پیڑ تھا۔ جس کے نیچے لکڑی کی کھوکھوں کی کچھ دکانیں تھیں جو بند پڑی تھیں۔ منگلی نے شیر خان کو اسی جگہ آنے کو کہا تھا۔ برگد کے پیڑ اور کھوکھوں کی نشانی اسے بتائی تھی۔ کھوکھوں کے پیچھے اندھیرے میں منگلی بیٹھ گئی اور بے چینی سے شیر خان کا انتظار کرنے لگی۔

یہ انتظار واقعی بہت تکلیف دہ تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ شیر خان دیوار پھاندنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یا پکڑ لیا گیا ہے۔ پھر وہ سوچتی کہ شیر خان کوئی عام قسم کا کمزور طبیعت آدمی نہیں ہے۔ وہ ایک نڈر آدمی ہے جو اپنے کئی دشمنوں کو بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سماج دشمن جرائم پیشہ بدمعاشوں کو قتل بھی کر چکا ہے۔ منگلی نے سری لنکا میں شیر خان کی بہادری کے کارنامے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ وہ جیل کی آہنی سلاخوں میں قید ایک شیر تھا۔ جونہی سلاخیں ٹوٹیں وہ ایک جست لگا کر جیل کی دیوار پھاند گیا ہو گا۔ بس وہ آ ہی رہا ہو گا۔

اتنے میں اسے دور سے ایک ٹیکسی آتی دکھائی دی۔

منگلی نے اس پر نظریں گاڑ دیں۔ ٹیکسی آشرم سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔ ٹیکسی کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی جس نے دھوتی کرتا پہن رکھا تھا باہر نکلا۔ پہلی نظر میں منگلی اُسے نہ پہچان سکی کیونکہ اس کے خیال میں شیر خان کو قیدیوں کی وردی میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن دوسرے لمحے جب وہ آدمی بجلی کے کھمبے کی روشنی میں آیا تو منگلی کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ یہ اس کا محبوب شیر خان ہی تھا۔ وہ کھوکھے کے پیچھے بیٹھی اپنے شیر خان کو آتا دیکھتی رہی۔ وہ اس کی طرف آ رہا تھا کیونکہ برگد کا درخت اور کھوکھے اسی جانب تھے۔ منگلی کو ایسا لگا جیسے کوئی بہت طاقتور ببر شیر دونوں پاؤں پر چلتا آ رہا ہو۔ وہ کھوکھے میں سے باہر نکل آئی۔ شیر خان نے بھی منگلی کو دیکھ لیا تھا۔ اسے منگلی کے ساتھ وہ محبت اور وابستگی نہیں تھی جتنی منگلی کو تھی۔ وہ قریب آیا تو منگلی اس سے لپٹ گئی۔

"میں جانتی تھی میرا شیر ضرور آئے گا۔"

شیر خان نے منگلی کو بڑی مشکل سے الگ کیا اور بولا۔

"پیچھے طوفان مچ گیا ہو گا۔ ساری پولیس میری تلاش میں نکل کھڑی ہو گی۔ ہمیں جلدی کسی محفوظ جگہ پہنچ جانا چاہیے۔"

"وہ سالے تمہیں ہاتھ تو لگا کر دیکھیں۔ میں ایک ایک کا خون پی جاؤں گی۔" منگلی نے بڑی سرگوشی اور جوش کے عالم میں یہ جملہ کہا اور شیر خان نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو الگ کیا۔

"تم نے یہ کپڑے کہاں سے لیے؟"

"ایک جگہ ایک آدمی دکان بند کر رہا تھا بس اس سے چھین لیے۔ تم یہی سمجھ لو۔"

شیر خان نے بے نیازی سے جواب دیا۔ منگلی نے شیر خان کا مضبوط بازو ابھی تک اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔

"دیوار پھاندنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟"

منگلی بڑے لاڈ پیار سے یہ باتیں پوچھ رہی تھی۔

شیر خان نے بیزار ہو کر منگلی کا بازو ہٹاتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے کسی طرف نکل چلو۔ بہتر یہ ہے کہ ہم سڑکوں سڑک دلی کی طرف چل

پڑیں۔ وہاں سے مجھے اپنی بیٹی کی تلاش میں جموں جانا ہو گا۔"

منگلی نے پہلی بار شیر خان کو بتایا کہ اس کی بیٹی عائشہ شیرنی کو جموں دھوکے سے بھیجا گیا ہے جب کہ تم وہاں نہیں تھے۔ اسے یہی کہا گیا ہے کہ تمہارا باپ جموں میں ہے۔ اب تک یقیناً وہ جموں میں تمہیں نہ پا کر واپس چل پڑی ہو گی۔

شیر خان بولا۔

"جس کسی نے بھی میری بیٹی کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ لیکن اب ہم اسے کہاں تلاش کریں گے؟"

وہ دونوں وہاں سے نکل کر ایک ویران سے کھلے میدان کی طرف چل پڑے تھے جہاں اندھیرا تھا.........

"اب عائشہ کا تھوڑا بہت سراغ اگر لگ سکتا ہے تو جموں پہنچ کر ہی لگ سکتا ہے کیونکہ وہ جموں ضرور گئی ہو گی۔ اور ممکن ہے کہ ابھی تک جموں میں ہی ہو۔"

شیر خان نے ایک گہرا سانس لیا جو غراہٹ سے ملتا جلتا تھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا اور پوچھا۔

"یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ آشرم کہاں ہے؟"

منگلی نے کہا۔ "آشرم میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں وہاں تمہارے پکڑے جانے کا ڈر ہے ہم بڑی سڑک پر کوئی سواری تلاش کریں گے۔ اور پھر اس شہر سے باہر نکل جائیں گے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے۔"

جونہی وہ بڑی سڑک پر آئے ایک گاڑی ان کے قریب سے گزرنے کے بعد آگے جا کر رکی۔ ان میں سے تین چار پولیس کانسٹیبل چھلانگیں لگا کر باہر نکلے اور شیر خان اور منگلی کی طرف آئے۔ منگلی نے گھبرا کر کہا۔ "شیر خان پولیس!" جہاں وہ کھڑے تھے ان کے پیچھے کسی برساتی نالے کی ڈھلان تھی۔ دونوں نے ادھر چھلانگیں لگا دیں۔

برساتی نالے کی ڈھلان پر نیچے جھاڑیوں میں شیر خان اور منگلی رک گئے۔ ایک بنگالی سپاہی نے یہ حماقت کی کہ اس نے بھی اوپر سے چھلانگ لگا دی۔ ابھی شیر خان اور منگلی سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ اندھیرے میں بنگالی سپاہی ان کے اوپر لڑھکتا ہوا آن گرا۔ اب کس طرح ممکن تھا کہ یہ دبلا پتلا سا بنگالی کانسٹیبل شیر خان کے ہاتھوں سے بچ جاتا۔ شیر خان کی پوزیشن ہی ایسی تھی کہ وہ کسی کانسٹیبل پر رحم کھا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس پر رحم کھانے کا مطلب تھا کہ خود پھانسی کے تختے پر چڑھ جائے۔ جونہی بنگالی سپاہی شیر خان کے اوپر گرا اس نے وہیں اسے دبوچ لیا اور دوسرے لمحے اس کی گردن ایک طرف لٹک چکی تھی۔ منگلی نے شیر خان کو خبردار کیا۔

"دو سپاہی اوپر سے آ رہے ہیں۔"

اندھیرے میں شیر خان کو دو انسانی سائے ڈھلان پر اپنی طرف نیچے اترتے نظر آئے۔ وہ اپنے ساتھی کو آوازیں دے رہے تھے۔ شیر خان گھات لگا کر بیٹھ گیا اور انہیں نیچے آنے دیا۔ وہاں اندھیرا تھا جس کی وجہ سے سپاہی اپنے آدمی کی لاش کو نہ دیکھ سکے۔ منگلی اور شیر خان جھاڑیوں کے پیچھے تھے۔ منگلی نے اپنے زہریلے تیر کا ہتھیار سنبھال لیا تھا۔ شیر خان رائفل سے فائر کر کے دوسروں کو خبردار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے اشاروں ہی اشاروں میں ایک ایک سپاہی آپس میں بانٹ لیا تھا۔ سپاہی جھاڑیوں کے پاس آئے تو شیر خان نے آگے آنے والے بنگالی کانسٹیبل کی گردن پر سامنے کی جانب سے بھرپور ہاتھ مارا۔ وہ پیچھے گرا۔ دوسرے بنگالی پر منگلی نے زہریلا تیر چلایا مگر وہ خطا گیا۔ سپاہی نے منگلی کو پکڑ لیا۔ ساتھ ہی بنگلہ زبان میں اوپر جیپ میں بیٹھے اپنے ساتھی کو خبردار کر دیا۔

اتنی دیر میں شیر خان نے اسے بھی نیچے گرا لیا تھا۔ دوسرے لمحے ان کی گردنیں بھی ایک طرف کو ڈھلک گئیں۔ منگلی نے شیر خان کو بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔

"نالے کے پار آجاؤ۔" شیر خان نے اس کا ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔

"ذرا ٹھہرو۔" اس نے ایک سپاہی کی رائفل منگلی کو پکڑا دی۔ دوسری رائفل خود سنبھالی اور تیزی سے چڑھائی چڑھنے لگا۔ اسی دوران جو باقی ماندہ واحد سپاہی پولیس جیپ میں بیٹھا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کی آواز سن کر سڑک کے کنارے آکر نیچے ڈھلان میں جھانک رہا تھا۔ شیر خان نے اندھیرے میں دائیں بائیں جانب ہو کر پوری طاقت سے رائفل کا بٹ اس کی گردن پر مارا اور وہ ہلکی سی آہ کی آواز کے ساتھ ڈھلان پر لڑھک گیا۔

"جیپ میں آجاؤ۔ جلدی۔"

منگلی شیر خان کے پیچھے پیچھے دوڑی۔ پولیس کی جیپ خالی پڑی تھی۔ شیر خان نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی جیپ اسٹارٹ کر دی۔ منگلی لپک کر دوسری سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جیپ خالی سڑک پر اسی سمت کو دوڑنے لگی جس سمت منگلی اور شیر خان پہلے پیدل جا رہے تھے۔

شیر خان کو احساس تھا کہ وہ خطرے میں گھرا ہوا ہے۔ پولیس کو اس کے فرار کا علم ہو چکا ہے اور وہ اس کی تلاش میں ہے۔ شہر کے اہم ناکوں کی نگرانی بھی ہو رہی ہو گی۔ جیپ کو شیر خان کافی سپیڈ پر چلا رہا تھا۔ وہ جتنی جلدی ہو سکے کلکتہ شہر کے خطرناک علاقوں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کی عقاب جیسی نگاہیں سامنے سڑک کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کسی بھی جگہ سڑک پر ان کی پولیس سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں؟ یہ سوچ کر شیر خان نے ایک جگہ گاڑی کچے میں اتار کر درختوں کے اوٹ میں کھڑی کر دی اور بتیاں بجھا دی۔ منگلی نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ گاڑی کیوں کھڑی کی ہے؟" شیر خان نے کہا۔

"پہلے ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں صبح ہماری کہاں ہو گی اور آگے کون سا علاقہ ہے۔ کیونکہ میں اس جگہ سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔" منگلی کہنے لگی۔

"دیکھو شیر خان! ہم تمہاری بیٹی عائشہ کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ مجھے بالکل ٹھیک ٹھیک اطلاع مل چکی ہے کہ عائشہ جموں میں ہو گی۔ اسے یہ بتایا گیا ہے کہ تمہارا باپ جموں

میں ہے ظاہر ہے ہمیں جموں شہر ہی پہنچنا ہے۔"

"مگر جموں شہر سے پہلے کئی شہر آئیں گے اور میں پھانسی کی کوٹھڑی سے بھاگا ہوا مجرم ہوں سارے علاقے کی پولیس کو میرا حلیہ وغیرہ بتا کر خبردار کر دیا گیا ہو گا اس طرح ہم جی ٹی روڈ پر پولیس کی جیپ میں بیٹھے زیادہ دیر تک تو سفر نہیں کر سکیں گے؟"

"تو پھر تمہارے ذہن میں کوئی ترکیب ہو تو بتاؤ۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ جب تک دن نہیں نکلتا ہم جتنی دور نکل سکیں ہمیں نکل جانا چاہیے۔" شیر خان نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ابھی آگے چلتے ہیں۔ کوئی آبادی آئے گی تو وہاں یہ جیپ چھوڑ دیں گے اور کوئی دوسری سواری لے کر آگے چلیں گے۔"

اس نے ہیڈ لائیٹس بجھی رہنے دیں اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔ سڑک پر جیپ کافی تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ پو پھٹ رہی تھی کوئی دم میں صبح کا اجالا پھیلنے والا تھا۔ شیر خان سویرا ہونے سے پہلے پہلے کسی بڑے قصبے یا شہر کے قریب پہنچ جانا چاہتا تھا۔ کلکتے سے جموں تک کا بہت لمبا سفر تھا۔ ایک جگہ ریلوے کا پھاٹک آیا تو شیر خان نے جیپ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جانے والی سڑک پر ڈال دی۔

"ادھر کہاں جا رہے ہو؟" منگلی نے پوچھا۔

"تم چپ نہیں رہ سکتیں؟" شیر خان نے اسے ڈانٹ دیا۔

منگلی کو غصہ آگیا۔ وہ شیر خان سے محبت کرتی تھی اس لیے اس کی ڈانٹ سہہ گئی اور کچھ نہ بولی۔ کوئی چھ سات کوس کے سفر کے بعد ایک مضافاتی اسٹیشن آگیا۔ شیر خان نے ایک طرف جھاڑیوں اور کیلے کے درختوں کے پیچھے جیپ کھڑی کر دی۔

"کیا کرنا چاہتے ہو اب؟" منگلی نے سوال کیا۔ شیر خان رائفل اٹھا کر جیپ سے نیچے اتر آیا۔ منگلی بھی اتر پڑی۔ اس نے اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ آسمان پر صبح کی سفیدی پھیلنے لگی تھی۔ اسٹیشن کے باہر ایک چھکڑا کھڑا تھا۔ کھوکھے کے پاس دو آدمی زمین پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے کوئی گاڑی پکڑنی چاہیے۔ ریل گاڑی میں سفر کچھ محفوظ رہے گا۔"

منگی جیپ کے پائیدان پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"شیر خان! تم غلط بات سوچ رہے ہو۔ ٹرین میں ہر اسٹیشن پر چیکنگ ہو سکتی ہے۔ اس طرح پکڑے جانے کا زیادہ خطرہ ہے۔"

شیر خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس طرف دیکھ رہا تھا جدھر سے ایک ریل گاڑی چلی آ رہی تھی۔

"اور ہمارے پاس پولیس رائفل بھی ہے۔ ریلوے پولیس والے اسے پہچان لیں گے۔" انجن چھک چھک کرتا پلیٹ فارم میں داخل ہوا اور پھر ٹرین کھڑی ہو گئی۔ شیر خان بولا۔

"منگی! یہ مال گاڑی ہے۔ اس کی چیکنگ نہیں ہو گی۔ ہم اسی گاڑی میں سفر کریں گے۔" منگی کو یہ تجویز اچھی لگی۔ کہنے لگی۔

"اس کے سارے ڈبے بند ہیں۔"

"تم چلو تو سہی۔"

"وہ پیچھے کی طرف سے ریلوے لائن کراس کر کے مال گاڑی کے پاس آ گئے۔ ابھی منہ اندھیرے کا سماں تھا۔ شیر خان تیزی سے ایک' ایک ڈبے کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک ڈبے کا بڑا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے رائفل اندر پھینکی پھر اچھل کر ڈبے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے بعد منگی کو بھی اوپر چڑھا لیا۔ مال گاڑی کا یہ ڈبہ بالکل خالی تھا۔ شیر خان نے زور لگا کر دروازے کو تھوڑا سا مزید بند کر دیا۔ اب اس میں صرف ایک لمبی دراڑ ہی رہ گئی تھی جس میں سے باہر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ مال گاڑی کا گارڈ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ وہاں وہ کچھ کاغذات سمیٹ کر باہر نکلا تو سیٹی بجا دی۔ انجن ڈرائیور پہلے ہی سر باہر نکالے پیچھے پلیٹ فارم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گارڈ کی سیٹی سن کر اسے ہری بتی لہراتے دیکھا تو انجن اسٹارٹ کر دیا۔ گاڑی چھک چھک کرتی پلیٹ فارم پر کھسکنے لگی۔

شیر خان دروازے کی درز میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس طرف پلیٹ فارم نہیں تھا۔ سورج نکل آیا تھا۔ چاروں طرف صبح کی گلابی' گلابی روشنی پھیل رہی تھی۔ ایک تالاب گزرا جس کی دونوں جانب تاڑ کے درخت کھڑے تھے۔ پھر کھیت شروع ہو گئے۔ ٹرین

ایک خاص رفتار سے چلی جا رہی تھی۔

منگی نے شیر خان سے کہا۔

"دروازہ بند کر دو۔ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو کوئی اندر جھانکنے لگا۔"

شیر خان نے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ پورا بند کرنے سے ڈبے میں اندھیرا سا ہو گیا۔

منگی نے شیر خان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے شیر خان؟" شیر خان نے اس کا ہاتھ آہستہ سے کاندھے پر سے ہٹا دیا اور رائفل کو اپنی گود میں ڈالتے ہوئے بولا۔

"منگی تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟" یہ وقت محبتیں کرنے کا ہے؟" منگی بولی۔

"بہادر آدمی تو میدان جنگ میں بھی محبت کرنا نہیں بھولتے۔"

"بس اب چپ رہو۔ مجھے سوچنے دو۔" شیر خان نے ڈبے کی دیوار سے ٹیک لگا لی۔

منگی بھی اس کے ساتھ لگ گئی۔ شیر خان کو منگی کے جسم کی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آخر مرد تھا۔ کوئی برہم چاری نہیں تھا۔ مگر اس وقت اس کے جذبات پر اس کا مشن' اس کے مقاصد کا غلبہ تھا۔ اس نے منگی کو ویسے ہی پڑے رہنے دیا کہ یہ پاگل عورت ہے۔ شاید اسے اپنی زندگی میں کوئی پہلا مرد ملا ہے۔

یہ مال گاڑی کلکتے سے امرتسر تک جا رہی تھی۔ اس کے ڈبوں میں قسم' قسم کا مال لدا ہوا تھا۔ راستے میں بھی مال لادا اور اتارا جاتا تھا۔ ٹرین کا سفر جاری رہا۔ کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ بڑے اسٹیشن پر مال گاڑی کو لوپ لائن پر بھی کھڑا ہونا پڑتا تاکہ میل ٹرین گزر سکے۔ دوپہر کے وقت ایک بڑا اسٹیشن آیا۔ گاڑی کو یارڈ میں ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ یہاں ایک ڈبے میں سے مال اتارا جانا تھا۔ پچھلے ڈبے کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا ڈبہ لگانا تھا۔ شیر خان رائفل لے کر خود ڈبے کے اندر ہی بیٹھا رہا اور منگی کچھ کھانے پینے کا سامان لینے اتر کر پلیٹ فارم کی طرف چل دی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ کچھ روٹیاں اور مٹی کے آبخورے میں پانی اور مچھلی لے کر آ گئی۔ یہاں مال گاڑی ایک گھنٹے تک کھڑی رہی۔ اس دوران شیر خان چوکس رہا۔ خدا' خدا کر کے گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی۔ اسی طرح سفر کرتے کرتے سارا دن اور پھر ساری رات گزر گئی۔ گاڑی مشرقی پنجاب کے کھیتوں اور

ہرے بھرے میدانوں میں داخل ہو چکی تھی۔ شیر خان نے منگلی سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہیں کسی اسٹیشن سے جموں والی گاڑی پکڑنی ہو گی۔"

"جالندھر شہر سے گاڑی بدلیں گے۔"

منگلی نے شیر خان کے بازو کو سہلاتے ہوئے کہا۔ شیر خان نے اپنا بازو پیچھے کر لیا۔

منگلی تنک کر بولی۔

"اس رائفل کو تو بڑا سینے سے لگا کر رکھتے ہو۔ یہ ہمیں پکڑوا دے گی اب۔" شیر خان نے کہا۔

"یہاں پنجاب کے سکھ زمیندار کیا رائفلیں بندوقیں لے کر نہیں چلتے؟"

"نہیں۔ یہاں ایسا رواج نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا کریں۔ میں رائفل ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔"

شیر خان نے دروازے کی درز میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ کوئی بڑا شہر آ رہا تھا۔ یہ شہر جالندھر ہی تھا۔ اسی اسٹیشن سے انہیں گاڑی بدلنی تھی۔ مال گاڑی اسٹیشن کے ریلوے یارڈ والے ویران پلیٹ فارم پر جا کر رک گئی۔ شیر خان نے باہر جھانک کر دیکھا۔ پلیٹ فارم چونکہ دوسری طرف تھا اس لیے یہاں اسے کوئی آدمی دکھائی نہ دیا۔ شیر خان نے منگلی کو اشارہ کیا اور خود ڈبے میں سے نیچے کود گیا۔ پھر منگلی کو ہاتھ کا سہارا دے کر نیچے اتارا۔ وہ دوڑ کر سامنے ایک بہت بڑے شیڈ کے پیچھے آ گئے۔ یہاں کچھ فاصلے پر ٹاہلیوں کے نیچے ایک سڑک گزر رہی تھی۔ جہاں ریلوے یارڈ کی حدود ختم ہوتی تھی وہاں تار کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ شیر خان نے رائفل اپنے جسم کے ساتھ لگا رکھی تھی۔ منگلی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ایک سکھ قلی ریل کی پٹڑیوں میں سے گزرتا اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ سڑک پر رکشے اور تانگے چل رہے تھے۔ انہوں نے بظاہر بڑے اطمینان سے جنگلہ پار کیا اور سڑک پر آ کر درختوں کے نیچے چل پڑے۔ منگلی نے آہستہ سے کہا۔

"تمہاری رائفل ہمیں پکڑوا دے گی شیر خان۔"

"خاموش رہو۔" شیر خان نے اسے ہلکا سا ڈانٹ دیا۔ وہ ایک چوک میں سے گزر گئے۔ دن کا وقت تھا۔ شہر میں ہلکی بھاری ٹریفک جاری تھی۔ لوگ پیدل، سائیکل، رکشہ اور

اسکوٹروں پر آ جا رہے تھے۔ شیر خان کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کسی لاری اڈے پر چل کر جموں جانے والی لاری کا پتا کرنا چاہیے۔"

منگلی نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں بہت سی لاریاں کھڑی تھیں۔ شیر خان اسی طرف چلا۔ ایک لاری میں مسافر پہلے سے بیٹھے تھے۔ شیر خان نے ایک بوڑھے سکھ سے جموں جانے والی لاری کے بارے میں پوچھا۔ اس نے پیچھے کھڑی ایک خالی لاری کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اہیہ جاؤ گی۔"

ٹین کی چھت کے نیچے بنچوں پر اور فرش پر بہت سے ہندو سکھ مسافر بیٹھے تھے۔ منگلی اور شیر خان بھی ایک طرف الگ سے ہو کر بیٹھ گئے۔ شیر خان نے منگلی کو کچھ روپے دیے اور کہا۔

"پتا کرو۔ اگر ٹکٹ مل رہے ہوں تو جموں کے دو ٹکٹ لے آؤ۔"

منگلی نے ایک چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی کے پاس جا کر پوچھا کہ جموں کے ٹکٹ کہاں سے ملیں گے۔ اندر ایک نوجوان سکھ لڑکا جیکٹ میں ملبوس بیٹھا کاپی پر کچھ لکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"بی بی کتنے ٹکٹ چاہییں۔ لاری آدھے گھنٹے بعد جائے گی۔" منگلی نے دو ٹکٹ خریدے اور شیر خان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"وہ کہتا ہے لاری آدھے گھنٹے بعد جائے گی۔" شیر خان بڑے محتاط انداز میں ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے ٹکٹ لے کر جیب میں رکھ لیے اور منگلی سے کہا۔

"ذرا جائزہ لو۔ ہمیں کوئی مشتبہ نظروں سے تو نہیں دیکھ رہا؟" منگلی نے نظریں گھما کر چاروں طرف غور سے دیکھا اور بولی۔

"مجھے تو کوئی خاص آدمی نظر نہیں آیا۔" وہاں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ تب کہیں جا کر جموں جانے والی لاری میں مسافروں نے بیٹھنا شروع کیا۔ ایک سکھ اونچی آواز میں بولے جا رہا تھا۔

"جموں، جموں، جموں۔ چلو اک سواری لاری لاری جاری اے۔"

شیر خان اور منگلی بھی لاری میں سوار ہوئے اور پچھلی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ شیر خان کی رائفل کو دیکھ کر سکھ ڈرائیور نے ہنس کر پوچھا۔

"بھرا جی لائسنس والی اے ناں؟"

"ہاں جی مہاراج لائسنس کول اے۔"

"شاواشے۔ خیر بیٹھو ماراج۔"

شیر خان کے جواب نے ڈرائیور کو مطمئن کر دیا تھا۔ لاری روانہ ہوئی تو منگلی نے بھی سکون کا سانس لیا۔ سارا راستہ امن و امان سے ہی گزر گیا۔ دن ڈوب رہا تھا کہ راستے میں جگہ جگہ کھڑی ہونے کے بعد لاری جموں شہر میں داخل ہوئی اور اپنے اڈے پر جا کر ٹھہر گئی۔ شیر خان کے پاس اتنے پیسے تھے کہ وہ کسی ہوٹل میں ٹھہر سکتے تھے۔ مگر وہ کسی ایسے ہوٹل کی تلاش میں تھے جو شہر سے ذرا باہر واقع ہو۔ بازاروں میں چلتے چلتے آخر انہیں ایک دو منزلہ درمیانے درجے کا ہوٹل نظر آ گیا۔ یہاں انہوں نے میاں بیوی کی حیثیت سے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ کمرے میں ایک ہی پلنگ بچھا تھا۔ منگلی نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی پتنی بنایا ہے تو اب بھول نہ جانا۔" شیر خان نے دیوار کے ساتھ لگے پرانے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں صوفے پر سوؤں گا۔ تم پلنگ پر سو جانا۔"

سردی کا موسم تھا۔ پلنگ پر ایک لحاف اور ایک کمبل بھی تہہ کیا ہوا پڑا تھا۔ شیر خان نے منہ ہاتھ دھویا۔ منگلی نے بھی منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں کنگھی پھیری۔ اتنے میں ہوٹل کا سکھ ملازم لڑکا آ گیا۔

"بھوجن کمرے میں کریں گے یا نیچے آ کر؟" شیر خان نے کہا۔

"یہیں لے آؤ پتر۔" اور ساتھ ہی لڑکے کو دس روپے کا نوٹ نکال کر دے دیا۔ "یہ تمہارا انعام ہے۔ دس روپے اس لڑکے کے لیے بہت تھے۔ وہ بڑا خوش ہوا اور سلام کر کے چلا گیا۔ منگلی پلنگ پر لحاف اوپر کیے بیٹھی تھی۔ کیونکہ وہاں سردی کافی تھی۔ شیر خان

کمبل اوڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اب بتاؤ کہ ہم عائشہ کی تلاش کہاں سے شروع کریں۔ میں تو اس شہر میں پہلی بار آیا ہوں۔" منگلی بولی۔

"میں بھی صرف ایک بار پہلے آئی تھی میرا خیال ہے کہ تمہاری بیٹی کا سراغ ہمیں یہاں کے کسی جرائم پیشہ لوگوں کے اڈے سے مل سکے گا۔"

"وہ کیوں؟" شیر خان نے پوچھا۔ منگلی نے کہا۔

"وہ اس لیے کہ عائشہ کو یہ کہا گیا تھا کہ تمہارا باپ جموں میں قید ہے۔ ظاہر ہے وہ یہاں آئی ہو گی تو اس قسم کے لوگوں سے ہی اس کا رابطہ ہوا ہو گا جنہوں نے اسے بتایا ہو گا کہ شیر خان نام کا کوئی قیدی یا مفرور یہاں پر نہیں آیا۔" شیر خان نے سر کو آہستہ سے جھٹک کر کہا۔

"تم نے فضول بات کی ہے۔ بہر حال رات گزر جانے دو۔ کل صبح میں خود سراغ لگانے نکلوں گا۔"

منگلی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھانا کھانے کے بعد شیر خان نے بتی بجھائی اور کمبل اوڑھ کر صوفے میں گھس گیا۔ منگلی پلنگ پر لحاف میں دبک گئی۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے بہت جلد انہیں نیند آ گئی۔ صبح شیر خان کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ رات کو کسی وقت اٹھ کر منگلی نے اس کے اوپر لحاف ڈال دیا تھا اور خود کمبل اوڑھ کر پلنگ پر سمٹی سمٹائی سو رہی تھی۔ شیر خان نے جلدی سے اپنا لحاف اس پر ڈال دیا منگلی نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ مسکرائی۔

"میری جان! کیوں اتنی محبت جتا رہے ہو مجھ سے جب اس محبت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" شیر خان نے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ آرام سے پڑی رہو۔" سکھ لڑکا ناشتا لے کر کمرے میں آیا تو شیر خان نے اسے دس روپے کا ایک اور نوٹ دیا اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس سے پوچھا۔

"کیوں بھئی یہاں آس پاس کہیں دیسی شراب بھی ملتی ہے یا نہیں؟ ہم تو جب کبھی

پیتے ہیں تو گھر کی نکلی ہوئی شراب ہی پیتے ہیں یہ ولائیتی شراب تو ہمیں بالکل پسند نہیں۔" سکھ لڑکا کہنے لگا۔

"ہاں جی! آپ کہیں تو میں آپ کو لا دیتا ہوں۔" شیر خان نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں یار! ہوٹل میں جو دیسی شراب سپلائی ہوتی ہے وہ ٹھیک نہیں ہوتی۔ تم ہمیں کوئی ٹھکانہ بتا دو۔ میں خود وہاں جا کر دیکھ بھال کر لے آؤں گا۔ تم نہیں جانتے۔ یہ لوگ بڑی ملاوٹ کرنے لگے ہیں۔"

شیر خان کا مطلب یہی تھا کہ لڑکا اسے کوئی دیسی شراب کا اڈہ بتائے تاکہ وہ وہاں جا کر اس مقصد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے جس مقصد کو لے کر وہ اس شہر میں آیا تھا۔ سکھ لڑکے نے بتایا کہ یہاں سے دو چار میل دور ایک تالاب والا مندر ہے۔ اس مندر کے پیچھے ایک تکیہ ہے۔ وہاں دیسی شراب نکالی جاتی ہے اور شہر کو سپلائی ہوتی ہے۔ سکھ لڑکے کے جانے کے بعد منگی مسکرائی۔

"میں یہ سمجھ رہی تھی کہ تم اپنے واسطے دیسی شراب کا پوچھ رہے ہو۔ مگر اب معلوم ہوا کہ تم جرائم پیشہ لوگوں کا اڈہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ شیر خان نے کہا۔

"خدا بچائے شراب سے۔" منگی نے ہنس کر کہا۔

"جن لوگوں کی قسمت میں شراب نہیں لکھی ہوتی وہ یہی کہا کرتے ہیں۔" منگی شیر خان سے چھیڑ خانی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ ان دونوں نے ناشتہ کیا اس کے بعد شیر خان بولا۔

"تم کمرے میں ہی ٹھہرو۔ میں تالاب والے مندر کی طرف جاتا ہوں۔ زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ بہر حال تم یہاں سے کہیں مت جانا۔"

شیر خان نے رائفل پلنگ کے نیچے چھپا دی تھی اور منگی کو تاکید کی تھی کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ وہ ہوٹل سے نکل کر بازار میں ایک طرف چل پڑا۔ سکھ لڑکے نے اسے راستے کا تھوڑا بہت حدود اربع بتا دیا تھا۔ شیر خان اندازے سے سڑک پر چلنے لگا۔ چوک میں وہ بائیں جانب ایک بازار میں آگیا۔ بازار کے آگے کھیت آگئے۔ یہاں شیر خان نے ایک آدمی سے تالاب والے مندر کا پتا پوچھ لیا اور کچھ دیر بعد وہ تالاب والے مندر پہنچ

گیا۔ اس کے پیچھے دو چار گھنے درختوں کے نیچے شیر خان نے کچھ آدمیوں کو بدن پر تیل ملتے ورزش کرتے دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہی وہ تکیہ ہے جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ اکھاڑے کے قریب سے ہوتا ہوا اس چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا جو پیپل کے درخت کے نیچے بنا ہوا تھا۔ یہاں ایک آدمی گائے کو چارہ ڈال رہا تھا۔ سامنے ایک کوٹھری تھی جس کے باہر چارپائی پر ایک سر منڈا بوڑھا ہندو کمبل اوڑھے بیٹھا گلاس میں چائے پی رہا تھا۔

کوٹھری میں سے ایک ورزشی بدن والا ہندو باہر نکلا تو اس کی نگاہ شیر خان پر پڑی۔ ایک اجنبی کو اپنے ڈیرے پر دیکھ کر وہ سیدھا اس کے پاس آگیا۔ شیر خان نے خود کو مفرور مجرم ظاہر کیا اور عائشہ کا حلیہ بتا کر ان سے پوچھا مگر انہوں نے ٹھیک سے کوئی جواب نہ دیا۔ اس طرح شیر خان مختلف لوگوں سے ملا مگر اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی تو واپس آگیا منگی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔

"کچھ پتا چلا؟"

"اونہوں۔" شیر خان نے سر ہلا دیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ منگی بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"شیر خان! میرا دماغ کہتا ہے کہ عائشہ اس شہر میں نہیں ہے۔ وہ یہاں سے جا چکی ہے۔" شیر خان نے منگی کی طرف دیکھا۔

"تمہارے دماغ پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔"

"میری محبت پر تو اعتبار ہے نا؟" منگی نے بڑے لگاؤ سے کہا۔ شیر خان نے اس کا ہاتھ اپنے کاندھے سے ہٹا کر پرے کر دیا۔

"تو پھر تم کیا کہتے ہو؟ تمہارا کیا ارادہ ہے یہاں پر ہمارا زیادہ دیر بیٹھے رہنا بھی مناسب نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں بھی پولیس کو تمہارے فرار کی اطلاع پہنچ چکی ہو اور وہ تمہاری تلاش میں ہو۔"

پولیس کی طرف سے شیر خان اندر ہی اندر فکر مند ضرور تھا مگر اسے اپنی بیٹی کو بھی تلاش کرنا تھا۔ شاید یہی اب اس کی زندگی کا سب سے اہم مشن تھا۔ اس نے عہد کر لیا تھا کہ عائشہ اگر اسے زندہ مل گئی تو وہ اسے ساتھ لے کر جس طرح بھی ہوا واپس پاکستان چلا

جائے گا اور اس کی شادی کر کے باقی زندگی اپنے گھر کی چاردیواری میں گزار دے گا۔ کہنے لگا۔

"یہ شہر ہمارے لیے اجنبی ہے پولیس بقول تمہارے ممکن ہے ہماری گھات میں ہو۔ اگرچہ ابھی تک ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ کسی کو ہم نے اپنے پیچھے لگے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں کس سے پوچھوں؟ کس انداز میں پوچھوں کہ میری بیٹی کہاں ملے گی؟" منگلی بھی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"ایک کوشش مجھے کر دیکھنے دو تم اب آرام کرو اب میں نکلوں گی عائشہ کی تلاش میں۔"

"تم کہاں جاؤ گی؟" شیر خان نے نگاہیں اٹھا کر پوچھا۔

"میں سنیاسن ہوں۔ کسی بھی مندر یا دھرم شالہ میں جا کر معلومات حاصل کر سکتی ہوں۔ ان جگہوں پر اکثر لاوارث عورتیں آتی رہتی ہیں۔ یا کم از کم ان کے بارے میں سراغ مل سکتا ہے کہ کون عورت آئی تھی۔ اور اب کہاں گئی ہے۔"

شیر خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش رہ کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد شیر خان کمرے میں ہی رہا اور منگلی اپنے اسی سنیاسیوں والے لباس میں ہوٹل سے نکل کھڑی ہوئی۔ کافی دیر تک وہ شہر میں ادھر ادھر گھومتی پھری۔ جب وہ شہر سے ذرا باہر ایک مضافاتی بستی میں آئی تو اسے دور ایک برساتی پہاڑی نالے کے کنارے اونچے ٹیلے کے دامن میں ایک مندر دکھائی دیا۔ یہ مندر شہر کے دوسرے مندروں سے ہٹ کر تھا اور اسی قسم کے مندر مجرمانہ سرگرمیوں کا مرکز ہو سکتے تھے۔ منگلی مندر کی طرف چل پڑی۔ مندر کی ڈیوڑھی میں ایک موٹا تازہ مہنت زعفرانی گرم چادر میں اپنے بھاری بھرکم جسم کو لپیٹے چوکی پر بیٹھا پتھر کی چھوٹی سی کونڈی میں زعفران پیس رہا تھا۔ ایک بھرپور جوان سنیاسن کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کا ہاتھ رک گیا۔ باچھیں کھل گئیں۔ چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے چہرے کی کیفیت دیکھ کر ہی منگلی سمجھ گئی کہ یہ مندر کس قسم کا ہے اور یہ مہنت ایک اوباش آدمی ہے۔

منگلی نے مہنت کو پرنام کیا اور کچھ کہے بغیر ڈیوڑھی میں سے گزر گئی۔ آگے چھوٹی سی کوٹھری میں ماتا شیراں والی کا بت پتھر کی دیوار میں ابھرا ہوا تھا جس پر سیندور مل دیا گیا تھا۔

منگلی نے بت کو ماتھا ٹیکا۔ کچھ اشلوک پڑھے۔ پھر مہنت کے پاس آ کر ہاتھ باندھ کر بولی۔

"مہاراج! پرشاد دیجیے۔" ساتھ ہی منگلی نے پوٹلی میں سے پندرہ روپے نکال کر مہنت کو پیش کر دیے۔ مہنت نے روپے چوکی کے نیچے رکھ لیے اور ایک تھالی میں سے میٹھے چنے اور کچھ رتن جوت کے پھول منگلی کو دے کر کہا۔

"سنیاسن دیوی! تم کو پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا کس شہر سے آئی ہو؟" منگلی مہنت کے قریب بیٹھ گئی۔

"پجاری جی! سنیاسی لوگوں کا کوئی شہر نہیں ہوتا۔ وہ کسی جگہ بھی ایک رات سے زیادہ نہیں ٹھہرتے۔"

مہنت نے کھرل میں سے تھوڑا سا زعفران انگلی پر اٹھا کر سنیاسن کے ماتھے پر لگا دیا اور بولا۔

"دیوی ماتا تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔" منگلی اس اوباش مہنت کے شیطانی جذبات کو مزید برانگیخت کرنا چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج جب پجاری جی خوش ہو جائیں تو دیوی ماتا بھی خوش ہو جاتی ہے۔" مہنت نے جلدی سے منگلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"دیوی! تم تو دیوی ماتا کی اوتار ہو۔ کیا بات کہہ دی ہے تم نے۔ مگر ابھی میں تم سے اتنا خوش نہیں ہوا؟" منگلی نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔

"وہ وقت بھی آ جائے گا پجاری جی۔" پجاری تو آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس وقت مندر میں کوئی کوئی ہی پوجا کرنے آتا تھا۔ ویسے بھی پجاری کسی عورت سے اور خاص طور پر کسی جوگن سنیاسی ٹائپ کی عورت سے گھل مل کر باتیں کر رہا ہو تو لوگ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ یوگ ودیا کے اسرار و رموز حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پجاری نے تھوڑا قریب ہو کر کہا۔

"اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔" پجاری بے چین ہو کر اٹھنے لگا تو منگلی نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر وہیں بٹھا لیا۔

"پجاری جی! اتنی بے چینی اچھی نہیں ہوتی میں آج کی رات آپ کے مندر میں ہی

گزاروں گی۔" پجاری منت کی ایک بار پھر باچھیں کھل گئیں۔ فوراً چوکی پر بیٹھ گیا اور منگلی کے حسن و جمال کی تعریفیں شروع کر دیں پھر کہنے لگا۔

"میرے تو بھاگ جاگ اٹھے کہ آپ ایسی دیوی سنیاسن ہمارے مندر میں رات رہے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ میں نے اپنی کوٹھری میں بجلی کا ہیٹر بھی لگوا رکھا ہے۔" منگلی کو اس اوباش پجاری کے ناپاک عزائم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس سے کچھ ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"پجاری جی! میرا ایک داس ہے۔ اس کی بچی گم ہو گئی ہے۔ جوان لڑکی ہے۔ خوش شکل ہے۔ بال سنہری سنہری ہیں۔ اردو پنجابی بول لیتی ہے۔ کہیں تم نے اسے دیکھا ہو تو بتاؤ۔" پجاری سوچنے لگا پھر بولا۔

"یہاں تو میں نے اس حلیئے کی کسی لڑکی کو نہیں دیکھا۔ ویسے میں پتا کر کے بتا سکتا ہوں۔"

"کہاں پتا کرو گے تم؟" منگلی نے پوچھا۔ پجاری نے کہا۔

"ایک ٹھکانہ ہے۔"

"کون سا ٹھکانہ۔" منگلی نے سوال کیا۔

پجاری سمجھ رہا تھا کہ اگر اس نے سنیاسن کو وہ ٹھکانہ بتا دیا تو شاید وہ رات کو اس کے پاس نہ آئے۔ کہنے لگا۔

"یہ تو میں تمہیں رات کو بتاؤں گا۔ اپنے بجلی والے ہیٹر کے سامنے بیٹھ کر۔" منگلی نے فوراً کہا۔

"اچھی طرح سن لو پجاری جی! اگر تم مجھے اس ٹھکانے کے بارے میں ابھی نہیں بتاؤ گے تو میں رات اس مندر میں نہیں گزاروں گی۔" پجاری تو کانپ اٹھا۔ جلدی سے بولا۔

"ایسا ظلم نہ کرنا دیوی! بتاتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ یہاں ایک بڑا عیاش ڈوگرہ جاگیردار رہتا ہے۔ اس کی عمر تو کافی ہو گئی ہے۔ مگر عیاشیوں سے باز نہیں آیا۔ اس شہر میں جو کوئی بھولی بھٹکی عورت داخل ہوتی ہے اس جاگیردار کے آدمی اس عورت کو کسی نہ کسی طرح ورغلا کر اس کے پاس لے جاتے ہیں اور پھر وہ ڈوگرے جاگیردار کی حویلی سے کبھی رہائی

حاصل نہیں کر سکتی۔ اس جاگیردار کا ایک نوکر میرا واقف ہے۔ وہ مجھ سے کوئی راز نہیں چھپاتا۔ میں کل اس سے بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے جس لڑکی کی تمہیں تلاش ہے وہ جاگیردار کی حویلی میں ہی ہو۔ وہاں دوسرے ملکوں کے اسمگلر ٹائپ کے لوگ بھی اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔"

منگلی نے پوچھا کہ یہ حویلی کس جگہ پر ہے اس کے جواب میں پجاری نے کہا۔

"تم اکیلی وہاں جانے کا سوچنا بھی نہ دیوی نہیں تو تم بھی وہاں قید ہو کر رہ جاؤ گی۔" پجاری بڑا چالاک تھا۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔" ڈوگرہ جاگیردار کی حویلی یہاں سے کافی دور پہاڑوں میں ایک بڑی پراسرار جگہ پر ہے۔ وہاں تو پولیس بھی نہیں جاتی۔ جاگیردار نے سب کا وظیفہ لگا رکھا ہے۔"

"اس کا نام کیا ہے؟" منگلی نے پوچھا۔ پجاری آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

"یہ تو میں تمہیں رات کو بتاؤں گا۔ بجلی کے ہیٹر کے سامنے بیٹھ کر۔" اسے بجلی کے ہیٹر کے سامنے بیٹھنے کا بڑا شوق تھا۔ منگلی نے دل میں اس اوباش پجاری کو موٹی سی گالی دی اور کہا۔

"اگر تم مجھے اس جاگیردار کا نام نہیں بتاؤ گے تو میں رات کو مندر میں نہیں آؤں گی۔" عیاش پجاری پھر مار کھا گیا۔ کہنے لگا۔

"تم باز نہیں آؤ گی۔ تو سنو۔ صرف نام ہی بتاؤں گا۔ اس کا نام تو ارجن داس ہے مگر سب اسے راجہ صاحب راجہ صاحب کہہ کر بلاتے ہیں۔ اس کا یہی نام مشہور ہے۔" منگلی اٹھ کر جانے لگی تو پجاری باہر تک اس کے ساتھ آیا۔" دیوی! رات کو درشن ضرور دینا۔ ایک بات یاد رکھنا۔ راجہ صاحب کی حویلی کا رخ نہ کرنا۔ نہیں تو بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔ پھر میں بھی تمہیں اس عیاشی کے اڈے سے نہیں نکال سکوں گا۔ تمہیں جس عورت کی تلاش ہے اس کا ٹھور ٹھکانہ مجھے راجہ صاحب کا نوکر ہی بتا سکے گا۔ میں کل اسے مندر میں بلا کر بات کروں گا۔ رات کو درشن ضرور دینا۔ میں نے بجلی کا ہیٹر لگا رکھا ہو گا۔"

منگلی نے دل میں پجاری کو ایک اور گالی دی اور وہاں سے نکل آئی۔ ہوٹل میں آکر

شیر خان کو ڈوگرہ جاگیردار راجہ صاحب کے بارے میں ساری تفصیلات بتا دیں۔ شیر خان بولا۔

"جب اس جاگیردار کی حویلی کا پتہ معلوم نہیں کہ وہ پہاڑوں میں کس جگہ پر ہے تو ہم وہاں کیسے جاسکتے ہیں؟" منگلی نے کہا۔

"یہ تو کسی جگہ سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔" شیر خان کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ تم رات کو مندر جانے کی بجائے کل دن میں پجاری سے ایک بار پھر ملو۔ کہہ دینا کسی وجہ سے تم رات کو نہیں آسکی تھیں۔ اور دن کے وقت اس سے جیسے بھی ہو جاگیردار کی پراسرار حویلی کا پتا معلوم کرنا۔ پھر اکٹھے وہاں چلے چلیں گے۔ ہو سکتا ہے عائشہ کا وہیں سے کوئی سراغ مل جائے۔ ویسے مجھے امید نہیں کہ میری بیٹی اس عیاش جاگیردار کے قبضے میں ہو گی۔ کیونکہ اگر ایسی بات ہوتی تو یہ جاگیردار اب تک ہلاک ہو چکا ہوتا۔"

منگلی نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ وہ کل پجاری سے دوبارہ ملے گی اگلے دن منگلی دوپہر کے وقت مندر پہنچی تو پجاری کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ منگلی کو دیکھتے ہی حسرت بھرے لہجے میں بولا۔

"دیوی! میں نے بجلی کا ہیٹر ساری رات لگائے رکھا تمہارا بڑا انتظار کیا۔ ذرا سی آہٹ ہوتی تو کوٹھری سے باہر نکل کر دیکھ لیتا کہ شاید تم آئی ہو۔" منگلی نے کہا۔

"مہاراج! مجھے شما کر دیں۔ بس ایک ایسا ضروری کام پڑ گیا تھا کہ میں جس گھر میں ٹھہری ہوئی ہوں وہاں سے ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہ نکل سکی۔ وعدہ کرتی ہوں کہ آج رات ضرور آوں گی۔" پجاری ایک دم خوش ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"کیوں نہ ابھی تھوڑی دیر کے لیے اندر چل کر بیٹھیں۔ باتیں کریں۔ بجلی کا ہیٹر بالکل ٹھیک چلتا ہے۔" منگلی نے دل میں غصے سے کہا۔ میں تو تمہیں اسی بجلی کے ہیٹر پر بھون کر کھا جاوں گی۔ اوپر سے مسکرا کر کہنے لگی۔

"نہیں پجاری جی! ابھی مجھے پھر ایک ضروری جگہ پر جانا ہے۔ رات کو ضرور آوں گی۔ بلکہ شام کو ہی آجاوں گی۔ مگر یہ بتاؤ کہ راجہ صاحب کی حویلی کہاں پر واقع ہے؟" پجاری ایک دم چوکنا ہو گیا۔ سمجھ گیا کہ یہ سنیاسن صرف اپنا الو سیدھا کرنا چاہتی ہے۔ بولا۔

"دیوی! تم اب مجھے الو نہیں بنا سکتیں۔ میں تو راجہ صاحب کی حویلی کا پتہ تمہیں

رات کو ہی بتاؤں گا۔" منگلی بولی۔

"میں اپنے آپ پتا کر لوں گی۔" پجاری نے کہا۔

"پتا کر لینے سے کیا ہو گا۔ تمہیں جس لڑکی کی تلاش ہے اس کا پتا میری مدد کے بغیر کبھی حاصل نہیں کر سکو گی۔ تم راجہ کی حویلی میں گئی نہیں کہ تمہیں غائب کر دیا جائے گا اور پھر تمہاری لاش بھی وہاں سے باہر نہیں آئے گی۔ اب تمہارا کیا خیال ہے؟" منگلی نے بھی ایک فیصلہ کر لیا۔ کہنے لگی۔

"پجاری! میں تم سے کھل کر بات کرتی ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے مندر میں رات بسر کروں تو مجھے اپنے خاص آدمی کی مدد سے پتا کر کے بتاؤ کہ سنہری بالوں والی گورے رنگ کی کوئی لڑکی راجہ کی حویلی میں موجود ہے یا نہیں۔ اس کے بعد میں تم سے کوئی بات کروں گی۔" پجاری بھی بڑا گرگ باراں دیدہ تھا۔ فوراً مسکرا کر بولا۔

"دیوی! اگر تم نے بات کھل کر کی ہے۔ تو میں بھی تم سے کوئی راز نہیں چھپاؤں گا۔ میں نے آج صبح راجہ کے خاص نوکر کو یہاں بلوا کر سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔"

"کیا معلوم ہوا تمہیں؟" منگلی نے بے تابی سے پوچھا۔ پجاری نے یونہی جھوٹ موٹ کہہ دیا۔

"اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس حلیئے کی ایک لڑکی تین چار دن ہوئے راجہ کی حویلی میں لائی گئی تھی اور وہ اب وہیں پر موجود ہے۔" منگلی کو پہلے تو اس مکار پجاری کی بات پر یقین نہ آیا۔ پھر سوچا کہ ہو سکتا ہے اس نے کسی لالچ میں آکر سچ بول دیا ہو۔ پھر بھی اس نے اپنا دامن کھینچتے ہوئے کہا۔

"تو پھر پہلے میں اس بات کی تصدیق کر لوں کہ وہ لڑکی راجہ کی حویلی میں ہی ہے۔" پجاری ہنسا۔

"پگلی دیوی! تم ساری زندگی سر پٹختی رہو گی تب بھی تمہیں اس لڑکی کی شکل تک دکھائی نہیں دے گی۔ اس ڈوگرہ جاگیردار کی حویلی اس قسم کی عورتوں کے لیے اندھا کنواں ہے۔ جو عورت ایک بار اس میں گر جاتی ہے پھر کوئی اس کی شکل بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

منگلی دل میں پجاری کو گالیاں دیتی یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ آئی کہ مہاراج اب رات کو

ملاقات ہو گی۔ ہوٹل میں آکر جب اس نے شیر خان سے ذکر کیا کہ راجہ کی حویلی میں بقول پجاری کے ایک سنہری بالوں والی گورے رنگ کی لڑکی موجود ہے تو اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

"ہو سکتا ہے پجاری نے جھوٹ بولا ہو۔ مجھے یقین ہے میری بیٹی وہاں نہیں ہے۔ اور اگر ہو گی تو پھر اس کی لاش ہی وہاں ہو گی۔ عائشہ اپنی عزت کے لیے جان قربان کرنا اور دوسرے کی جان لینا جانتی ہے۔ میں نے اسے یہی تربیت دی ہے۔" منگلی کو شیر خان سے محبت تھی۔ عائشہ سے اسے اپنی بچیوں کی طرح پیار تھا۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر تم یہی سمجھتے ہو تو تم یہاں بیٹھو۔ میں راجہ کی حویلی کا ایک چکر ضرور لگانا چاہتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ پجاری جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ مجھے بھی بڑی پکی اطلاع ملی تھی کہ عائشہ جموں پہنچ گئی ہے۔ چونکہ یہاں اس کا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ عین ممکن ہے کہ وہ اس ڈوگرے جاگیردار کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔" شیر خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ایسا ممکن نہیں ہے۔ عائشہ ایک شیرنی ہے وہ اکیلی چار آدمیوں کو ہلاک کر سکتی ہے۔" منگلی نے کہا۔

"چلو اگر راجہ کی حویلی میں تمہاری شیرنی چار آدمیوں کو مار کر خود مر گئی ہو گی تب بھی اس کا علم تو ہو جائے گا۔ ہمیں پتہ تو چل جائے گا کہ عائشہ یہاں لائی گئی تھی۔ مگر اس نے مقابلہ کیا اور چار آدمیوں کو ہلاک کر کے خود بھی موت کو گلے لگا لیا۔" شیر خان نے سر اٹھایا اور بولا۔

"ہاں۔ یہ معلوم کرنے ہم راجہ کی حویلی میں ضرور جائیں گے۔ مگر پہلے ہمیں یہ پتا کرنا ہو گا کہ اسی بدبخت ڈوگرے جاگیردار کی حویلی پہاڑوں میں کس جگہ پر واقع ہے۔"

"یہ پتا چلایا جا سکتا ہے۔" منگلی نے آہستہ سے کہا۔ ایک دم سے شیر خان کو اپنے شرابی دوست کا خیال آ گیا۔ جو اسے عائشہ کی تلاش کے دوران ملا تھا کہنے لگا۔

"میں آج شام جاگیردار کی حویلی کا پتہ لگانے کی کوشش کروں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ اب تمہیں ہوٹل سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔"

سورج غروب ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ شیر خان ہوٹل سے نکل کر سیدھا تالاب والے مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شام کو اندھیرا پھیل رہا تھا۔ شیر خان کو یقین تھا کہ وہ دبلا پتلا شرابی مندر کے عقب میں جو شراب کا خفیہ اڈہ ہے وہاں پر ضرور موجود ہو گا۔ وہ عادی شراب نوش تھا اور ایسے لوگ سر شام اپنے اڈوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ شیر خان کا اندازہ درست نکلا۔ اسے وہی شرابی وہاں ایک درخت کے تھڑے پر بیٹھا مل گیا۔ ذرا پرے بانس کے ساتھ لٹکا ہوا ایک بلب جل رہا تھا۔ شیر خان نے اسے جاتے ہی پرنام کیا اور پھر کہا۔

"کیا حال ہے مکندی؟ میں ادھر سے گزر رہا تھا سوچا تمہیں ملتا چلوں۔" مکندی مسکرا دیا۔

"بس بھگوان کی کرپا سے جی رہا ہوں۔ پی رہا ہوں۔ اور کیا چاہیے۔ لو تم بھی پیو۔" شیر خان بولا۔

"یار مکندی! میں نے کہا نا کہ ڈاکٹر نے مجھے منع کر رکھا ہے ورنہ میں ضرور تمہارا ساتھ دیتا۔ تمہارے لیے اور شراب منگواؤں۔" مکندی بولا۔

"منگوا لو۔ شراب تو جتنی ملے کم ہے۔" وہ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ جلانے لگا۔ شیر خان نے اسے جیب سے دس روپے نکال کر دیے۔ مکندی نے نوٹ پکڑ کر ایک طرف رکھ دیا۔

"ابھی بوتل میں کچھ شراب ہے۔ اسے پی لوں۔ پھر دوسری بوتل بھی منگا لوں گا۔" شیر خان نے مکندی کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں پھر عیاش ڈوگرہ جاگیردار کا ذکر

چھیڑ دیا۔

"یار مکندی! یہ ڈوگرہ جاگیردار راجہ صاحب کیا چیز ہے؟ سنا ہے اس کی حویلی میں جو عورت ایک بار جاتی ہے پھر اس کی لاش بھی وہاں سے نہیں نکلتی۔" مکندی کو نشہ ہو گیا تھا۔ وہ سر کو دائیں بائیں جھول رہا تھا کہنے لگا۔

"بڑا پکا بدمعاش ہے سالا۔ حویلی میں اس نے بدمعاش پال رکھے ہیں۔ ایک بار میں وہاں گیا تھا۔ سالا شراب بڑی اعلیٰ پیتا ہے۔ کہتے ہیں اس کے پاس ایک ایسی شراب ہے جو چار سو سال پرانی ہے۔ مگر اس میں زیادہ نشہ نہیں ہوتا۔ ہمیں تو یہ دیسی پسند ہے۔ سالی۔ سانپ کی طرح کاٹتی ہے۔" شیر خان نے پوچھا۔

"اس بدمعاش کی حویلی ہے کہاں؟ کہتے ہیں کہ وہاں کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی؟"

مکندی نے راجہ کو پہلے تو دو تین گالیاں دیں۔ پھر شیر خان کو حویلی کا سارا حدود اربع بتا دیا۔ شیر خان نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

"حویلی میں کوئی خفیہ تہہ خانہ ضرور ہو گا جہاں وہ اغوا کی ہوئی عورتوں کو چھپا کر رکھتا ہو گا۔" مکندی بوتل میں سے شراب انڈیل رہا تھا اور ساتھ ہی جھوم بھی رہا تھا کہنے لگا۔

"سالے کی ساری حویلی ہی تہہ خانہ ہے بڑا بدمعاش ہے۔ ہیروئن بھی اسمگل کراتا ہے۔ انگریز بھی اس کے پاس آتے رہتے ہیں۔ بڑی عیاشی ہوتی ہے وہاں ساری ساری رات جوا اور شراب چلتی ہے۔" مکندی نے گلاس میں سے شراب کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلنے کے بعد کہا۔ "تم ٹھہرو میں بوتل لے آؤں۔" وہ لڑکھڑاتا ہوا جھونپڑے کی طرف گیا تو شیر خان وہاں سے چلا آیا۔ اسے عیاش ڈوگرہ جاگیردار کی حویلی کا پتہ معلوم ہو گیا تھا اب اس کا وہاں بیٹھنا بیکار تھا۔ ہوٹل میں آ کر اس نے منگلی کو راجہ کی حویلی کا پورا ایڈریس اور نقشہ بتایا تو وہ بڑی حیران ہوئی۔

"تم نے تو پوری جاسوسی کی ہے۔ اب میری بات مانو اور وہاں پہلے مجھے جا کر حالات کا جائزہ لینے دو۔ تمہارا اکیلے وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ تم ان لوگوں سے واقف نہیں ہو اور یہ علاقہ بھی تمہارے لیے اجنبی ہے۔" شیر خان نے کہا۔

"میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تم میرے ساتھ ہرگز نہیں جاؤ گی۔ تم اسی جگہ بیٹھو گی۔ میں

اکیلا جاگیردار کی حویلی میں جاؤں گا۔ اگر میری بیٹی وہاں ہوئی تو یقین کرو۔ مجھے اس کی خوشبو اس کے پاس پہنچا دے گی۔" منگلی نے کہا۔

"شیر خان! بھگوان کے واسطے کوئی عقل کرو۔ تمہارے پاس تو اسلحہ بھی نہیں ہے۔ یہ اتنی بڑی رائفل کہاں ساتھ لیے لیے پھرتے رہو گے۔ میری بات مانو اور مجھے پہلے جانے دو۔ میں تو سنیاسن جوگن بن کر جاؤں گی۔ مجھے کوئی نہیں روکے گا اور مجھ پر کوئی شک شبہ بھی نہیں کرے گا۔"

اب شیر خان کے دماغ میں بھی یہ بات آ گئی کہ اس کے پاس تو کوئی پستول وغیرہ بھی نہیں ہے۔ رائفل وہ کیسے ساتھ لے جائے گا۔ منگلی کی دلیل بڑی مضبوط تھی۔ جب منگلی نے زیادہ اصرار کیا تو شیر خان مان گیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم ہی پہلے جاؤ۔"

یہ منگلی کی حماقت تھی۔ کہ اس کا اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا جو اسے بے دھڑک ایک ایسے ماحول میں لیے جا رہا تھا۔ جہاں خونخواری درندگی اور وحشت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اگر منگلی آدم خور شیروں کے غار میں داخل ہو جاتی تو شاید ایک آدھ شیر اسے معاف کر دیتا مگر وہ جس غار میں داخل ہونے والی تھی وہاں اذیت پرست شیطان صفت لوگ رہتے تھے۔ جو درندوں اور جانور کے مقام سے بھی نیچے گر چکے تھے۔ منگلی کو زندگی کا ایک اندوہناک تجربہ ہونے والا تھا۔

ڈوگرہ جاگیردار کی حویلی شہر سے تھوڑی دور پہاڑی ٹیلوں کے درمیان واقع تھی۔ یہ دو منزلہ پرانی قسم کی عمارت تھی جس کی ہر منزل میں چھوٹے چھوٹے لکڑی کے فرش والے کئی کمرے تھے۔ پہلی منزل میں زمین دوز تہہ خانے بھی تھے۔ حویلی کے چاروں طرف پتھر جوڑ کر بنائی گئی بیس پچیس فٹ اونچی دیوار تھی۔ جیسے کسی قلعہ کی دیوار ہوتی ہے۔ اندر جانے کے لیے ایک پھاٹک تھا جہاں جاگیردار کے دو ڈوگرہ سابق فوجی سپاہی ہر وقت پہرے پر موجود رہتے تھے۔ حویلی کے ارد گرد اونچے اونچے سنگلاخ پہاڑی ٹیلے تھے۔ حویلی تک ایک چھوٹی مگر پختہ سڑک آتی تھی۔ جو ٹیلوں کے درمیان بل کھاتی آگے جا کر بانہال جانے والی سڑک کے ساتھ مل جاتی تھی۔ منگلی کو رات کے وقت چوروں کی طرح جانے کی

ضرورت نہیں تھی۔ وہ جوگی سنیاسیوں کے بھیس میں تھی اور اسے یقین تھا کہ کوئی بھی ہندو اس لباس کا احترام کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ دن کے وقت ڈوگرہ جاگیردار کی حویلی کی طرف چل پڑی۔ بانہال روڈ پر جہاں سے چھوٹی سڑک راجہ کی حویلی کی طرف نکلتی تھی۔ منگلی لاری میں سے اتر پڑی۔ وہ گیروے لباس میں تھی۔ گلے میں حسب معمول مالا ڈال رکھی تھیں۔ وہ سڑک پر پیدل چلنے لگی۔ دونوں جانب قد آدم جنگلی جھاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ سڑک کا ایک موڑ گھومی تو ایک آدمی جھاڑیوں میں سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ اس نے ڈوگری زبان میں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہی ہے۔ منگلی نے انگلی کا اشارہ آسمان کی طرف کر کے کہا۔

"ہم تو جوگی سنیاسی لوگ ہیں۔ سنا ہے ادھر ایک حویلی ہے جہاں بڑا نیک دل راجہ رہتا ہے۔ ہم اس راجہ کو ایک ایسا راز بتانے آئے ہیں۔ جس سے اس کی دولت کبھی ختم نہیں ہو گی اور اس کی نسلیں عیش کریں گی۔"

اس آدمی نے سگریٹ کا کش لگا کر اسے پاؤں تلے مسلا اور منگلی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ منگلی پہلا ایسا عام ہندو دیکھ رہی تھی جو اس کے سنیاس سے متاثر ہونے کی بجائے ہوسناک نظروں سے اس کے بدن کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے بڑی رعب دار آواز میں کہا۔

"ہمیں بتاؤ راجہ کہاں ملے گا؟ دیوتاؤں نے ہمیں اس کے پاس بھیجا ہے۔" وہ آدمی تھوڑا سا ہنسا اور آگے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"آگے چلی جاؤ۔ حویلی آجائے گی راجہ صاحب کی۔"

منگلی آگے چلی گئی۔ اسے اب بھی اپنے جوگیانہ روپ پر پورا اعتماد تھا۔ ایک موڑ مڑنے پر سامنے اونچی دیواروں والی حویلی آگئی۔ لکڑی کے بند پھاٹک پر تانبے کا پترا چڑھا ہوا تھا۔ اور دو سپاہی دونوں جانب پہرے پر کھڑے تھے۔ دیوار کے ساتھ دو پرانی جیپیں اور ایک ویگن کھڑی تھی جس کے نسواری شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ ایک جوگن کو پھاٹک کی طرف آتے دیکھ کر سپاہیوں نے اسے اشارے سے وہیں روک دیا۔ منگلی نے بازو بلند کیا اور اونچی آواز میں بولی۔

"راجہ سے کہو ہمیں دیوی دیوتاؤں نے بھیجا ہے۔ ہم تمہیں دیوتاؤں کا ایک خاص

سندیسہ دینے آئے ہیں۔"

پہرے داروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک نے ذرا آگے بڑھ کر منگلی سے کہا۔

"دیوی ماتا! یہاں سے واپس چلی جاؤ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

مگر منگلی تو ایک خاص مقصد ایک اہم مشن اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ وہ عائشہ شیرنی کا سراغ لگائے بغیر کیسے واپس جا سکتی تھی۔ اس نے سپاہیوں پر مزید اثر ڈالنے کے لیے اونچی آواز میں سنسکرت کے اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ پہرے داروں نے منگلی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ راجہ صاحب سے نہیں مل سکتی۔ وہ اس وقت اپنے مہمانوں کے ساتھ مصروف ہیں مگر منگلی اونچی آواز میں اشلوک پڑھتی گئی۔ اتنے میں حویلی کی دوسری منزل کی ایک لکڑی کی گیلری میں ایک دراز قد بڑی بڑی مونچھوں اور کرخت چہرے والا آدمی نمودار ہوا۔ اس کی داڑھی اور مونچھیں خضاب سے سیاہ کی ہوئی تھیں۔ عمر ساٹھ کے قریب ہو گی۔ ہیرے کے بٹنوں والی سفید براق شیروانی پہنی ہوئی تھی۔ سر پر زعفرانی رنگ کی پگڑی بندھی تھی جس کے سامنے سفید موتی چمک رہا تھا۔ یہ ڈوگرہ جاگیردار تھا جو راجہ صاحب کے نام سے مشہور تھا۔ اور جو اس حویلی کا بلا شرکت غیرے حکمران تھا۔ اس کے ہاتھ میں آدھا پیا ہوا فرنچ وائن کا گلاس تھا۔ اس نے بالوں بھری بھویں سکیڑ کر دیکھا کہ پھاٹک کے باہر صحت مند جسم والی ایک عورت جوگیانہ لباس میں کھڑی ہے اور بلند آواز میں اشلوک پڑھ رہی ہے۔

راجہ نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ پہرے داروں نے فوراً پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ منگلی نے بھی گیلری میں راجہ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کا لباس اور شان و شوکت کو دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ یہی ڈوگرہ جاگیردار ہے۔ وہ اس کو اپنے زیر اثر لا کر عائشہ شیرنی کا اتا پتہ معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اور اگر وہ اس حویلی میں موجود تھی تو اسے یہاں سے فرار کروانا چاہتی تھی۔ منگلی حویلی کے صحن میں داخل ہو گئی اس نے گیلری کے نیچے آکر اوپر راجہ کو دیکھا اور پرنام وغیرہ کرنے کی بجائے اس پر اثر ڈالنے کی خاطر بلند آواز میں کہا۔

"اگر تم ہی راجہ صاحب ہو تو سنو راجہ مجھے دیوی دیوتاؤں نے تمہیں ایک خاص

سندیسہ دے کر بھیجا ہے۔"

راجہ نے وائن کا گلاس گیلری میں پڑی سنگ مرمر کی میز پر رکھا۔ ہاتھ باندھ کر منگلی کو پرنام کیا اور اپنے خادموں کو حکم دیا۔

"دیوی جوگن کو بڑی عزت احترام کے ساتھ اوپر لے آؤ۔" خدمت گار منگلی کو گیلری کے نیچے دیکھ کر فوراً برآمدے میں بندوقیں لے کر آ گئے تھے۔ راجہ کا حکم سنتے ہی انہوں نے منگلی کو ساتھ لیا اور حویلی کی ڈیوڑھی میں جو زینہ تھا اس پر چڑھنے لگے۔ منگلی ان کے پیچھے پیچھے تھی۔

راجہ یعنی ڈوگرہ جاگیردار اس وقت اپنے پرانے اسمگلر دوست اور فرانس کے چھٹے ہوئے بدمعاش اور قاتل مسٹر شارل سے اپنے منشیات کے کاروبار کے بارے میں بڑی اہم گفتگو کر رہا تھا۔ سنسکرت کے اشلوکوں کی آواز اسے گیلری کی طرف لے گئی تھی۔ خدمت گار منگلی کو راجہ کے کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ راجہ نے بڑے ادب سے جھک کر منگلی کی تعظیم کی اور کہا۔

"دیوی جی! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" منگلی بڑی خوش تھی کہ یہ اوباش قسم کا طاقتور اور ظالم انسان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ منگلی کے اعتماد میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے نڈر لہجے میں کہا۔

"اے راجہ! دیوی دیوتا تم پر بہت مہربان ہیں۔ بھگوان جانے تم نے کون سا پن کیا ہے کہ دیوتا تمہیں نہال کر دینا چاہتے ہیں۔ میں ان کا خاص سندیسہ لے کر تمہارے پاس آئی ہوں۔"

راجہ نے بڑی ملائم آواز میں کہا۔

"دیوی جی! یہ میرے دھن بھاگ ہیں کہ دیوتا لوگ مجھ پر مہربان ہیں۔ یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ آپ دیوی دیوتاؤں کا سندیسہ لے کر میرے پاس آئی ہیں۔ میں آپ سے گزارش کروں گا کہ مجھے تھوڑی دیر کی اجازت دے دیں۔ میں اس وقت ایک کاروباری بات چیت کر رہا ہوں۔ آپ ساتھ والے کمرے میں تشریف رکھیں۔ میں ابھی آپ کی خدمت میں سیوا کرنے حاضر ہو جاؤں گا۔"

منگلی اس دوران وہاں مخمل کے صوفے پر بیٹھے ایک ہاتھ میں وائن کا گلاس اور دوسرے ہاتھ میں سلگتا ہوا سگار تھامے فرانسیسی اسمگلر شارل کا جائزہ لے چکی تھی۔ اسے یہ پختہ عمر مگر بھینسے کے ڈیل ڈول والا فرانسیسی آدمی کوئی خطرناک قاتل لگا۔ مگر اس وقت منگلی کی ساری توجہ راجہ صاحب کی طرف تھی۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے خوش نصیب راجہ! میں ساتھ والے کمرے میں بیٹھتی ہوں۔ مگر کسی کو میری خدمت کا حکم نہ دیا جائے۔ ہم سنیاسی لوگ کسی کے گھر سے پانی تک نہیں پیتے۔"

راجہ نے ذرا سا مسکرا کر سر جھکا دیا جیسے کہہ رہا ہو جو آپ کا حکم۔ منگلی ساتھ والے کمرے میں آ گئی۔ یہ کمرہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ سجا ہوا تھا۔ قالینوں کا فرش تھا۔ دیواروں پر سرخ مخمل کے پردے لٹک رہے تھے۔ آتشدان میں ہلکی ہلکی آگ روشن تھی جس کی وجہ سے کمرے میں بڑی پرسکون گرماہٹ تھی۔ دیوار کے ساتھ صوفے لگے تھے۔ درمیان میں سنگ مرمر کی کافی بڑی ٹیبل تھی۔ کارنس پر چاندی کے گلدان رکھے۔ اوپر ڈوگرہ جاگیردار راجہ کی مصور کی بنائی ہوئی روغنی تصویر سنہری چوکھٹے میں لگی تھی۔ سب سے نمایاں چیز ایک پلنگ تھا جس پر ریشمی بستر لگا تھا۔ مسہری اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ پلنگ کے پائے موٹے موٹے تھے اور ان پر چاندی کا پترا چڑھا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک چمکدار گلدان رکھا تھا۔ چھت منقش تھی جس کے وسط میں ایک فانوس روشن تھا۔ اس کمرے میں بظاہر کوئی کھڑکی یا روشندان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

منگلی نے اس اوباش آدمی کے بارے میں جو سنا تھا بالکل ویسا ہی یہاں منظر بنا ہوا ہے۔ یہ کسی عیش پرست جاگیردار کا بیڈ روم ہی ہو سکتا ہے۔ کارنس کے ساتھ ایک جانب اخروٹ کی لکڑی کی ایک منقش قد آدم الماری تھی۔ جس کے ایک پٹ پر آئینہ تھا۔ منگلی نے آئینے میں اپنی شکل صورت دیکھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے سراپا میں بھی ابھی بڑی کشش ہے۔ وہ اپنے آپ سے شرما سی گئی۔ اس نے جونہی الماری کا دوسرا پٹ کھولا تو دیکھا کہ اندر خانوں میں شراب کی قسم قسم کی بوتلیں ساتھ ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ منگلی نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ آتشدان میں بڑی دھیمی آگ روشن تھی۔ کمرے کی نیم گرم فضا میں منگلی کو بڑی راحت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس

کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ دنیا اور دنیا کے کاروبار جائیں جہاں جاتے ہیں۔ مجھے اس پلنگ پر لیٹ کر سو جانا چاہیے۔

باہر قدموں کی آواز آئی۔ منگلی جلدی سے بالکل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ راجہ بڑی شان سے پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"دیوی جی! مجھے شما کر دیجئے گا۔ میں نے آپ کو بڑا انتظار کروایا۔"

منگلی نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ اب یہاں بیٹھو اور دیوی دیوتاؤں نے تمہارے لیے جو سندیسہ بھیجا ہے اسے غور سے سنو اور اس پر عمل کرو۔"

راجہ بڑے ادب سے منگلی کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ جیسے جوگن کے احترام کی وجہ سے ہاتھ الگ نہ کرنا چاہتا ہو۔

"دیوی جی! حکم کریں، میں دیوتاؤں کا سندیسہ سننے کے واسطے بے چین ہو رہا ہوں۔"

منگلی نے سب کچھ پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا۔ کہنے لگی۔

"سنو راجہ! اندر دیوتا نے کہا کہ راجہ سے جا کر کہو کہ وہ چاند کی پہلی تاریخ کو اپنے محل کی چھت پر آدھی رات کو آئے۔ ہم اس کو ایک تحفہ دینا چاہتے ہیں۔"

راجہ بولا۔ "یہ میرے دھن بھاگ ہیں دیوی جی! میں ایسا ہی کروں گا۔ اندر دیوتا نے اور کیا کہا ہے۔"

منگلی نے جب دیکھا کہ یہ راجہ تو اس کا بالکل مطیع ہو چکا ہے تو کہا۔

"اندر دیوتا کا حکم ہے کہ تمہاری حویلی میں ایک سنہرے بالوں والی ایک ایسی لڑکی بھی آگئی ہے جو ہماری بھگتنی ہے۔ اس کو فوراً اپنی حویلی سے عزت کے ساتھ رخصت کر دو اور اس کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔"

راجہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"دیوی جی! یہاں تو ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے میری حویلی میں تو سوائے میری بیوی اور دو تین نوکرانیاں ہی ہیں۔ ان کے سوا کوئی غیر عورت نہیں ہے۔ دیوتا اندر کو مغالطہ لگا

ہے۔"

منگلی نے آواز میں تھوڑی سی گھن گرج پیدا کرتے ہوئے کہا: "تم کون ہوتے ہو اندر دیوتا کو جھٹلانے والے۔ خبردار ایسی بات پھر زبان سے نہ نکالنا۔ دیوتا تجھ پر مہربان ہیں۔ کہیں وہ ناراض ہو گئے تو اس حویلی کو الٹ کر رکھ دیں گے۔"

راجہ نے جلدی سے ہاتھ جوڑ دیے۔

"دیوی جی! مجھے معاف کر دیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ دیوتاؤں سے بھی مجھے معافی دلا دیں۔ ہو سکتا ہے کہ حویلی میں کوئی نوکر چاکر کسی سنہرے بالوں والی لڑکی کو کہیں سے لے آیا ہو۔ میں ابھی پتا کرواتا ہوں۔ اگر وہ لڑکی میری حویلی میں ہوئی تو میں اسے بڑی عزت کے ساتھ دھن دولت دے کر رخصت کروں گا۔"

منگلی بڑی خوش ہوئی کہ راجہ سیدھی راہ پر آگیا تھا۔ کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیوتا تمہیں معاف کر دیں گے۔ کیونکہ وہ ہماری باتیں اس وقت سن رہے ہیں۔"

"یہ میری خوش بختی ہے دیوی جی۔"

ڈوگرہ جاگیردار یہ کہہ کر صوفے پر سے اٹھا۔ وہ الماری کی طرف جانے لگا تو منگلی نے کہا۔

"سنہری بالوں والی لڑکی کی تلاش ابھی سے شروع ہو جانی چاہیے اے راجہ۔ دیوی دیوتاؤں کے کاموں میں دیر نہیں لگنی چاہیے۔"

اتنی دیر میں راجہ الماری کے پاس پہنچ چکا تھا اس نے وہیں سے پیچھے مڑ کر منگلی کی طرف ہاتھ جوڑے اور کہا۔

"آپ کے حکم پر ابھی عمل شروع ہو جائے گا دیوی جی! پہلے میں آپ کی کچھ سیوا کرنا چاہتا ہوں۔"

منگلی نے بے نیازی سے کہا۔

"میری یہی سیوا ہو گی کہ تم دیوی دیوتاؤں کے حکم کا پالن کرو۔"

راجہ نے الماری کا پٹ کھولا اور اس میں سے شراب کی ایک بوتل جس پر سنہری

ڈاٹ لگا تھا نکال کر لے آیا۔ وہیں سے ہی اس نے بڑے نازک قسم کے چھوٹے چھوٹے دو گلاس بھی اٹھا لیے تھے۔ منگلی کا ذرا سا ماتھا ٹھنکا۔ پھر سوچا کہ یہ شخص ایسی جرات نہیں کر سکتا۔ اس نے یہ ظاہر کرتے ہوئے جیسے اس نے راجہ کے ہاتھ میں شراب کی بوتل کو نہیں دیکھا کہا۔

"اب ہم کھلی ہوا میں جانا چاہتے ہیں۔ تاکہ دیوتاؤں کا آسمان پر درشن کر سکیں۔"

راجہ نے شراب کی بوتل صوفے کے آگے پڑی ہوئی سنگ مرمر کی میز پر رکھ دی۔ دونوں گلاس بھی پاس ہی رکھ دیے۔ اور منگلی کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا۔

"دیوی جی! دیوتاؤں کی بات ہو رہی تھی۔ تو ان کے نام بھی تھوڑی سی مدورا بھی پی لینی چاہیے۔" منگلی نے سخت لہجے میں کہا۔

"اے راجہ! یہ پاپ ہے۔ ایسا خیال بھی کبھی اپنے دل میں مت لانا۔"

راجہ نے دونوں گلاسوں میں شراب ڈال دی تھی۔

"دیوی جی! سارے دیوی دیوتا مدورا پیتے ہیں تو تم بھی ایک پیگ پیو۔"

راجہ نے ایک گلاس منگلی کی طرف کھسکا دیا اور دوسرا گلاس اٹھا کر پورے کا پورا پیگ حلق میں انڈیل کر دوسرا گلاس بنانے لگا۔

منگلی کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ مگر ابھی اس کے احمقانہ اعتماد نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ غصے میں آ کر بولی۔

"اے راجہ! تم دیوتاؤں کا اپمان کر رہے ہو اس گلاس کو پیچھے ہٹا لو۔ نہیں تو تم پر دیوتا اندر کا عذاب نازل ہو گا۔"

راجہ نے اپنی اچکن کی آستین میں سے سفید ریشمی رومال نکال کر اپنی مونچھوں کو بڑی نفاست سے صاف کیا اور بولا۔

"اندر دیوتا خود پیتا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں؟" منگلی ابھی تک غضبناک موڈ میں تھی۔ غصیلی آواز میں ڈانٹتے ہوئے بولی۔

"میں آخری بار کہتی ہوں راجہ۔" پھر ایکدم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں جا رہی ہوں۔ مگر یاد رکھو۔ تم دیوتاؤں کے عذاب سے نہیں بچ سکو گے۔" وہ تیز تیز قدم اٹھاتی

دروازے کے پاس آئی۔ اسے کھولنے لگی تو وہ بند تھا۔ پیچھے سے راجہ کی آواز آئی۔

"میری زہریلی ناگن! یہ دروازہ تو تمہارا دیوتا اندر بھی آجائے تو نہیں کھول سکے گا۔ جرمنی کا نمبروں والا آٹومیٹک تالا لگا ہے اس میں۔ واپس آجاؤ خاموشی سے۔" منگلی سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ اس کا اعتماد غائب ہو گیا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک کمزور عورت ہے اور ایک ایسے شخص کے ساتھ کمرے میں اکیلی ہے جو مرد بھی ہے۔ شرابی بھی ہے اور درندہ صفت بھی ہے۔ اس کے پاس زہریلے تیروں میں سے ایک تیر بھی نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو وہ کم از کم اس سے اپنا بچاؤ کر سکتی تھی۔ اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے اس آدمی کی حویلی میں آ کر کتنی بڑی حماقت کی ہے۔ اس دوران راجہ شراب کے مزید دو گلاس اوپر تلے پی چکا تھا اور اس کی باقی ماندہ درندگی بھی بیدار ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر منگلی کے پاس آیا۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مخمور سرخ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یہ پرانی سی چادر تم نے اپنے جسم پر کیوں لپیٹ رکھی ہے؟ میں تمہیں نئی ریشمی چادر دوں گا۔"

منگلی نے راجہ کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ راجہ گرتے گرتے سنبھلا۔ منگلی کے قریب آیا۔ اور اتنی زور سے اس کے منہ پر طمانچہ مارا کہ منگلی کی آنکھوں میں تارے ناچنے لگے۔ وہ شدید درد سے بلبلا اٹھی اور اس کا سر دروازے سے جا ٹکرایا۔ راجہ نے منگلی کو کلائی سے پکڑ کر گھسیٹا اور پلنگ پر پھینک دیا۔ ساتھ ہی اسے بڑی گندی گندی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ منگلی کا جسم برف کی طرح سرد پڑ گیا تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب راجہ کمرے سے باہر نکل گیا تو فرانسیسی قاتل شارل اندر داخل ہوا۔ منگلی نے چادر میں اپنے آپ کو لپیٹنے کی کوشش کی تو شارل ایک بھیڑیے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا اور اسے اتنا زدوکوب کیا کہ منگلی کے منہ سے خون نکل آیا۔ آدھے گھنٹے بعد فرانسیسی قاتل جھومتا جھامتا کمرے سے چلا گیا۔ ہر بار دروازہ اپنے آپ کلیک کی آواز کے ساتھ بند ہو جاتا۔ منگلی ادھ موئی حالت میں پلنگ پر نیم بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے بعد دروازہ کھلا تو

راجہ کے دو نوکر اندر آئے۔ انہوں نے منگلی کو پلنگ پر سے ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھایا اور کمرے کے باہر لے گئے۔ کمرہ ویران اور خالی رہ گیا۔ کمرے کی فضا میں خاموشی ملامت تھی۔ جس طرح گناہ کرنے پر آدمی کا ضمیر ملامت کرتا ہے۔

جب شام ہوگئی اور منگلی واپس نہ آئی تو شیر خان فکر مند ہوا خدا خیر کرے اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس گئی ہو۔ شیر خان کو یقین تھا کہ منگلی حویلی کے اندر ہی ہے۔ اگر باہر ہوتی تو ضرور آتی۔ ایک خیال اس کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ بہت ممکن ہے کمندی شرابی کی اطلاع درست ہو اور اس کی شیرنی بیٹی بھی اس بدمعاش راجہ کی حویلی میں قید ہو۔ شیر خان راجہ کی حویلی میں جانے کو تیار ہوگیا۔ اس کے پاس صرف ایک رائفل اور چند ایک فالتو گولیاں تھیں۔ چاقو تک نہیں تھا۔ وہ رات کا اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے پہاڑیوں میں واقع حویلی تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ شیر خان رائفل کے بغیر حویلی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے رائفل کو پتلون اور جیکٹ کے اندر بالکل سیدھا ڈال کر کپڑوں میں چھپایا اور کمرے کو بند کر کے ہوٹل سے نکل کر بازار میں آگیا۔ کمندی شرابی نے اسے جو راستہ بتایا تھا وہ اسی راستے پر چل پڑا۔ ایک جگہ چوک میں آکر اس نے رکشہ لے لیا۔ اس رکشے میں بیٹھ کر وہ باہنال روڈ پر کافی آگے تک چلا آیا۔ یہاں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں اس چھوٹی سڑک کو تلاش کرنے لگا۔ جو بڑی سڑک پر سے دائیں ہاتھ کو پہاڑیوں کی طرف جاتی تھی۔ سائیکل رکشہ زیادہ تیز نہیں چل رہا تھا۔ ابھی اتنا اندھیرا بھی نہیں ہوا تھا۔ آخر اسے ایک جگہ چھوٹی سی سڑک دائیں جانب پہاڑیوں کی طرف نکلتی نظر آگئی۔

شیر خان نے وہاں رکشہ چھوڑ دیا اور اونچی اونچی پہاڑیوں کے درمیان چھوٹی سڑک پر چلنے لگا۔ چلتے ہوئے پتلون کے اندر بالکل سیدھی کر کے چھپائی ہوئی رائفل اسے تنگ کر رہی تھی۔ بارونق بازاروں میں تو مجبوری تھی مگر یہاں سڑک دور تک ویران دیکھ کر شیر خان نے رائفل پتلون میں سے نکال کر ہاتھ میں تھام لی۔ وہ احتیاطاً سڑک سے ہٹ کر جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور بڑا چوکس تھا۔ جانتا تھا کہ راجہ نے راستے میں اپنے آدمی ضرور نگرانی پر لگا رکھے ہوں گے۔ یہ ایک اتفاق کی بات تھی کہ شیر خان حویلی کے

قریب پہنچ گیا اور اسے کوئی آدمی نہ ملا۔

سڑک کا موڑ مڑتے ہی اسے حویلی کی دوسری منزل میں کہیں کہیں مدھم روشنی نظر آئی۔ پھاٹک کے اوپر کوئی روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی پراسرار حویلی تھی۔ لگتا تھا کوئی چھوٹا سا آسیبی قلعہ ہے۔ وہ ایک طرف جھاڑیوں میں ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ پھاٹک کے باہر دونوں جانب دو آدمی اسٹولوں پر بیٹھے تھے۔ ان کی بندوقیں ان کے گھٹنوں پر پڑی تھیں اور وہ سگریٹ بیڑی پیتے ہوئے دھیمی آواز میں آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ اس قسم کی صورت حال سے شیر خان کئی بار گزر چکا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اس قسم کے جرائم پیشہ ماحول میں گزرا تھا۔ وہ کسی طرح حویلی کے اندر پہنچ کر سب سے پہلے منگلی کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ تو اسے یقین تھا کہ اسی حویلی میں ہی ہوگی۔ اس کے بعد وہ اپنی بیٹی شیرنی کا پتہ کرنا چاہتا تھا۔ پھاٹک سے ہٹ کر وہ حویلی کی دیوار کی طرف آگیا۔ دیوار کافی اونچی تھی اور شیر خان کے پاس تو کمند ٹائپ کی چیز بھی نہیں تھی جس کی مدد سے وہ دیوار پار کر سکتا۔ حویلی کے اندر بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کتے کے بھونکنے کی بھی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ واقعی یہ حویلی بڑی پراسرار تھی اور نہ جانے کیسے کیسے گھناؤنے جرائم اس کے اندر پروان چڑھ رہے تھے۔ شیر خان نے سوچا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کی بیٹی شیرنی اس حویلی میں نہیں ہے۔ وہ اس قسم کے ماحول میں زندہ رہ ہی نہیں سکتی۔ اگر اندر ہوگی تو شیرنی کی لاش ہی کسی جگہ احاطے میں دفن ہوگی۔ اور وہ ضرور دو چار کو مار کر مری ہوگی۔

شیر خان دیوار کے ساتھ ساتھ اس کے کونے تک چلا گیا۔ یہاں کوئی ایسا درخت بھی نہیں تھا جس کی شاخیں دیوار کے اندر تک پھیلی ہوئی ہوں۔ پھاٹک پر جو دو تین گاڑیاں کھڑی تھیں ان سے شیر خان کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اندر آدمی موجود ہیں۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ اگر اچانک کوئی آدمی سامنے مقابلے پر آگیا اور اس نے مجبوراً اس پر گولی چلا دی تو فائر کی آواز پر حویلی کے لوگ ہوشیار ہو جائیں گے اور اسے وہاں سے فرار ہونا پڑے گا۔ شیر خان اپنا مقصد حاصل کیے اور منگلی کا سراغ لگائے بغیر وہاں سے واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کا دیوار کے پار جانا ضروری تھا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ شیر خان دیوار کے

ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور مزید اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے دور سے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی ٹرک آہستہ آہستہ چلا آرہا ہو۔ ایک ترکیب اچانک اس کے ذہن میں آگئی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور حویلی کی دیوار سے ہٹ کر جھاڑیوں کے پیچھے سے ہوتا پھاٹک کے سامنے آگیا۔ ٹرک ابھی کافی پیچھے تھا۔ وہ سنسان اندھیری سڑک پر پیچھے کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ جہاں سڑک کا موڑ تھا وہاں اسے دوسری جانب سے گاڑی کی ہیڈ لائیٹس کی روشنی پڑتی نظر آئی۔ وہ دوڑ کر جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اندھیرے میں گاڑی کی روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ یہ ایک ٹرک تھا جس میں وزنی سامان لدا تھا اور وہ آہستہ آہستہ چلا آرہا تھا۔ جب ٹرک شیر خان کے آگے سے گزر گیا تو وہ اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ ٹرک میں خدا جانے کیا سامان بھرا ہوا تھا۔ اس نے ٹرک کی پچھلی سائیڈ کے بورڈ کو پکڑنے سے پہلے اندر اپنی رائفل پھینکی اور پھر خود بھی اچھل کر ٹرک میں چڑھ گیا اور سامان کے پیچھے چھپ گیا۔ ٹرک گیٹ پر آکر تھوڑی دیر کو رکا۔ چوکیداروں نے پھاٹک کھول دیا۔ ٹرک حویلی کے احاطے میں داخل ہو کر ایک طرف جا کر درختوں کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور نے نیچے اتر کر آواز دی۔

"چلو بکرم داس! سامان رکھوالو۔" جتنی دیر میں کسی کوارٹر سے بکرم داس نکل کر وہاں تک آتا شیر خان ٹرک سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا۔ وہ حویلی کے پچھواڑے آگیا۔ جہاں ایک کشادہ سے برآمدے میں کونے والے کمرے میں جو شاید کچن تھا بتی جل رہی تھی۔ ایک آدمی جالی دار دروازے کو کھول کر ٹرک کی طرف چلا۔ شاید یہی بکرم داس تھا۔ شیر خان لپک کر برآمدے میں آیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک زینہ اوپر والی منزل کو جاتا ہے۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اس نے دروازے کو ذرا سا دھکیلا۔ وہ کھل گیا۔ ایک زینہ نیچے جا رہا تھا۔ یہ ضرور تہہ خانے کو جا رہا ہے۔ شیر خان یہ سوچ کر زینہ اترنے لگا۔ نیچے ایک ڈیوڑھی سی آگئی۔ آگے پھر ایک دروازہ تھا۔ یہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ شیر خان نے کان دروازے کے ساتھ لگا دیا۔ اندر کسی عورت کی آواز آرہی تھی۔ وہ کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ الفاظ پوری طرح سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

شیر خان وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ ایک خیال اسے آیا کہ وہ دروازے پر دستک

دے۔ کوئی عورت آئے تو اسے وہیں دبوچ کر اس سے منگلی یا عائشہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ پھر سوچا کہ اس عورت نے شور مچا دیا تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔ مقابلہ شروع ہو جائے گا۔ وہ خود کو اپنی جان بچا کر اور دو تین کو ہلاک کر کے نکل جائے گا مگر جس کام کے لیے وہ وہاں سے آیا ہے وہ پورا نہیں ہو گا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی جگہ چھپ کر پہلے یہ سراغ لگائے کہ عورتیں کہاں پر ہیں اور پھر ٹھیک جگہ پر نشانہ لگا کر حملہ کرے۔ یونہی جوش میں آکر ہلہ بول دینے سے سوائے افراتفری کے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ شیر خان سیڑھیاں چڑھ کر دوبارہ برآمدے میں آگیا۔ بکرم داس باہر احاطے میں ٹرک سے سامان اتروا رہا تھا۔ شیر خان نے سوچا دوسرا زینہ چڑھ کر اوپر والی منزل پر جا کر دیکھنا چاہیے کہ وہاں کیا ہے۔ وہ دبے پاؤں زینہ چڑھنے لگا۔ یہ بہت پرانے ٹائپ کی عمارت تھی جہاں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ اوپر پھر ایک برآمدہ تھا۔ سامنے ساتھ ساتھ کمروں کے دروازے تھے جو سارے کے سارے بند تھے۔ کسی ایک کمرے کا بھی روشندان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ برآمدے کے دوسرے کونے پر کچن کے اوپر ایک کمرے کے دروازے کے نیچے سے تھوڑی تھوڑی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ شیر خان اس دروازے کے پاس آگیا۔ اس نے اوپر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ نیچے کوئی نہیں تھا۔ وہ فرش پر لیٹ گیا اور دروازے کے نیچے جو جگہ تھی اس میں سے اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ یہ ایک کشادہ کمرہ ہے۔ قالین پر گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں۔ درمیان میں بوتلیں اور گلاس پڑے ہیں۔ ایک بھاری مونچھوں اور بھرے بھرے چہرے والا آدمی جو ڈوگرہ جاگیردار تھا دو گاؤ تکیوں کا سہارا لیے گلاس منہ کے قریب رکھے سامنے بیٹھے ہوئے گورے رنگ اور چھوٹی چھوٹی سنہری فرنچ کٹ داڑھی والے پختہ عمر کے گرانڈیل آدمی سے باتیں کر رہا ہے۔ یہ آدمی شیر خان کو انگریز لگا۔ وہ دراصل فرانسیسی قاتل اور اسمگلر شارل تھا۔ اتنے میں عقبی دروازے کا پردہ ہٹا اور ایک آدمی جو نوکر لگتا تھا اندر آیا۔ جھک کر سلام کے اشارے سے کچھ کہا۔ جو شیر خان نہ سمجھ سکا۔ ڈوگرہ راجہ نے ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہا۔ نوکر ادب سے سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ اس کے کوئی پندرہ سیکنڈ بعد دو جوان عورتیں ایسی حالت میں کمرے میں داخل ہوئیں کہ انہوں نے گرم

چادروں میں اپنے جسم لپیٹ رکھے تھے۔ کمرے میں جو آتش دان تھا اس میں آگ جل رہی تھی۔ شیر خان کا دل اچھل کر حلق کر قریب آگیا۔

ان میں سے ایک منگلی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے اور وہ اس طرح سہمی ہوئی تھی جیسے اسے قتل کرنے کے واسطے وہاں لایا گیا ہو۔ شیر خان آنکھیں پھاڑے دروازے کی نچلی درز میں سے اندر دیکھ رہا تھا۔ فرانسیسی قاتل نے اٹھ کر منگلی کو پکڑا اور کھینچ کر اپنے پاس قالین پر بٹھا لیا۔ دوسری عورت اپنے آپ راجہ کے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔ وہ اتنی ڈری اور سہمی ہوئی نہیں تھی۔ وہ ہنس ہنس کر راجہ سے باتیں کر رہی تھی۔ فرانسیسی بدمعاش نے منگلی کی چادر کھینچ کر ایک طرف رکھ دی۔ شیر خان نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ کیونکہ چادر کے نیچے منگلی نے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا شیر خان نے دوسری بار آنکھیں کھول کر دیکھا کہ ایک نوکر طشت میں کچھ پھل رکھے فرانسیسی بدمعاش شارل کے قریب جھکا ہوا تھا۔ منگلی نے سر نیچے جھکا رکھا تھا جیسے وہ رو رہی تھی۔

شیر خان کا سر پھر گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اوپر سے اگرچہ وہ منگلی کے ساتھ سرد مہری کا سلوک کرتا تھا مگر دل کے اندر سے وہ اسے پیار کرتا تھا۔ اپنی بیوی کے بعد یہ پہلی عورت تھی جو اسے اچھی لگی تھی۔ اب جب اس نے منگلی کو اس حالت میں دیکھا کہ ایک انگریز ٹائپ کا بدمعاش اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے والا ہے تو وہ ساری منصوبہ بندی اور احتیاطیں بھول گیا۔ اس کے اندر کا جنگلی مرد بیدار ہو گیا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ پر آہستہ سے دستک دی۔ مقصد یہ تھا کہ کوئی دروازہ اندر سے کھولے گا۔ دستک کی آواز پر راجہ نے غصے سے دروازے کی طرف دیکھا۔

"یہ کون حرامی ہے؟" نوکر نے طشت ایک طرف رکھا اور تیز تیز قدموں سے دروازے پر آکر پوچھا۔

"بکرم داس! کیا بات ہے؟" اس کا خیال تھا کہ نیچے باورچی خانہ ہے وہاں سے بکرم داس کوئی چیز لے کر نہ آیا ہو۔ اگرچہ ایسا پہلے کبھی ہوا نہیں تھا۔ جب شیر خان نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ ایک بار پھر رائفل کا بٹ آہستہ سے دروازے پر مارا تو نوکر نے چٹخنی اتار کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے کھلتے ہی شیر خان نے ہلہ بول دیا۔ دھکا دے کر نوکر کو پرے

گرایا اور اوپر تلے دو فائر کر دیے۔ فرانسیسی بدمعاش شارل بڑا کائیاں اور چالاک جرائم پیشہ آدمی تھا۔ دروازے کے دھڑاک سے کھلنے کے انداز ہی سے سمجھ گیا کہ یہ کوئی راجہ کا دشمن ہے جو قتل کی نیت سے اندر آیا ہے۔ جب تک شیر خان فائر کرتا وہ قلا بازی لگا کر قالین کی دوسری طرف جا چکا تھا۔ دونوں گولیاں سامنے والے خالی صوفے میں جا کر پیوست ہو گئیں۔ راجہ نے دہشت سے چلا کر کہا۔

"اسے پکڑ۔" شیر خان نے شارل پر ایک فائر جھونک دیا مگر اتنی دیر میں شارل اپنا پستول نکال چکا تھا۔ وہ قالین پر لڑھک کر دوسری طرف ہو گیا اور وہیں سے لیٹے لیٹے شیر خان پر اوپر تلے تین گولیاں چلا دیں۔

یہ شیر خان کی حماقت تھی۔ یا جنگلی انسان والی اصلی اور فطری محبت کا جذبہ تھا جس نے اسے میدان میں لا کھڑا کیا تھا جہاں موت اس کے بالکل روبرو تھی۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ ان لوگوں کے پاس بھی اسلحہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ ان کی فائرنگ کی زد میں آسکتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے تو وہ یہی فطری محبت تھی جو اندھی نہیں تھی بلکہ حقیقی تھی۔ جس نے ابھی دنیا کی منافقت اور مصلحتیں نہیں سیکھی تھیں۔ جس نے ابھی یہ نہیں سیکھا تھا کہ بے غیرتی کو مصلحت اور وقت کا تقاضہ کہہ کر برداشت کر لینا چاہیے چنانچہ وہی ہوا جو آج سے ہزاروں سال پہلے جنگل میں رہنے والے سچے جذبوں والے قدرت کے دائمی اصولوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے انسانوں کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ یعنی محبت کی جنگ میں دونوں میں سے ایک کی موت یقینی ہوتی تھی۔ دو گولیاں شیر خان کے سینے میں اور ایک ناف کے اوپر پیٹ میں لگی۔ فرانسیسی بدمعاش شارل کا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا تھا۔ شیر خان گر پڑا۔ منگلی نے کمرہ کی روشنی میں شیر خان کو گرتے دیکھا تو چیخ مار کر اس کی طرف بڑھی۔ راجہ کے نوکر اندر آگئے تھے۔ راجہ نے بھی ایک نوکر سے پستول لے لیا تھا اور اسے تان کر کھڑا تھا۔ وہ گرج کر بولا۔

"یہ کون تھا لاش کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔" منگلی بلک بلک کر رونے لگی۔ "حرام زادی یہ تمہارا باپ تھا جو تم رو رہی ہو تم نے ہی اسے یہاں بلایا ہو گا۔ تجھ سے تو میں نمٹ لوں گا۔"

حویلی میں سے مسلح چوکیدار بھی فائرنگ کی آواز سن کر رائفلیں تانے اوپر آ گئے۔ ایک اجنبی کو خون میں لت پت اور راجہ کو زندہ دیکھ کر ان کی جان میں جان آ گئی۔ دو نوکر شیر خان کو بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر برآمدے میں لے گئے۔ راجہ نوکروں کو گالیاں دے رہا تھا۔

"حرام زادو۔ یہ اوپر کیسے آ گیا؟ کتے کے بچو! میرا ایک لاکھ روپے کا قالین خراب ہو گیا۔ اب اس پر گرا خون تمہارا باپ صاف کرے گا۔ سور کے بچو؟ میں تم سب کو گولی مار دوں گا۔" جو نوکر شیر خان کو گھسیٹ کر باہر لے گئے تھے ان میں سے ایک نے کہا۔

"دیکھو یہ مرا بھی ہے کہ ابھی زندہ ہے؟" دوسرے نے شیر خان کے خون میں لت پت جسم پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا۔

"مر گیا ہے یار۔ اس کو اٹھا کر گھاٹی والے نالے میں پھینک آتے ہیں۔ زندہ بھی ہو گا تو وہاں مر جائے گا۔ لاش رات کو لگڑ بگڑ کھا جائیں گے۔" انہوں نے شیر خان کو اٹھایا اور نیچے لے آئے۔ نیچے بکرم داس اور ڈرائیور اور دوسرے نوکر پہلے سے کھڑے تھے۔ شیر خان کو کوئی ہوش نہیں تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ وہ سب شیر خان کی لاش کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

"دیکھتے کیا ہو اٹھاؤ اسے۔" ایک نوکر نے دوسرے کو جھڑک کر کہا پھر انہوں نے شیر خان کو ایک بانس کی چارپائی پر ڈالا۔ چارپائی اٹھا کر حویلی کے عقبی دیوار کی طرف لے گئے جہاں ایک بڑا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ چارپائی چبوترے پر رکھ کر انہوں نے شیر خان کو اٹھایا اور دیوار کی دوسری طرف پھینک دیا۔ دوسری طرف گہری کھائی تھی۔ شیر خان کی لاش نیچے جھاڑیوں پر گری اور وہیں ایک جگہ پھنس کر رہ گئی۔

دوسری منزل میں ڈوگرہ جاگیردار نوکروں پر برس رہا تھا۔ گرج رہا تھا۔ اور شارل کی تعریف کر رہا تھا جس نے شیر خان کو عین موقع پر فائر کر کے ہلاک کر ڈالا تھا۔

"شارل! تمہارا نشانہ ٹھیک نہ ہوتا تو وہ مجھے مار ڈالتا میں تو نہتا تھا۔ اس کے پاس رائفل تھی۔ وہ میرا دشمن اور اس جوگن کا کوئی یار تھا۔" منگلی کو نیچے ایک الگ تہہ خانے کی کوٹھری میں لے جا کر بند کر دیا گیا تھا۔ خون آلود قالین نوکر تہہ کر رہے تھے۔ دوسری

عورت چادر لپیٹ کر صوفے کے کونے میں سہمی بیٹھی تھی راجہ نے اس کی طرف محبت سے دیکھا اور کہا۔

"تم کیوں گھبرا رہی ہو میری جان۔ یہاں کوئی دشمن آ جائے اور بچ کر چلا جائے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تمہارا بھی اگر کوئی یار ہے تو اسے بھی کہلوا بھیجو کہ ادھر آیا تو اس کا بھی یہی حال ہو گا۔" وہ عورت مسکرانے لگی۔ شارل نے اس کے بغل میں ہاتھ ڈال کر صوفے سے اٹھایا اور راجہ سے کہا۔

"اوکے راجہ ڈیئر' ہم دوسرے کمرے میں جا رہا ہے۔"

راجہ نے اوکے کہا۔ نوکروں کو چھ سات غلیظ گالیاں دیں اور اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا جہاں اس کے پلنگ پر چھبے کے غریب کاشتکار کی جوان بیٹی بیٹھی اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی تھی۔ راجہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے جلدی سے آنسو پونچھے اور چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ اسے اس گناہ کے جہنم میں آئے ہوئے ابھی ایک مہینہ ہی ہوا تھا اسے اس کے گاؤں سے راجہ کے آدمی اٹھا کر لائے تھے۔ وہ اس حقیقت سے باخبر ہو چکی تھی کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اسے زندہ یہاں سے باہر نہیں نکال سکتی۔ راجہ کے آدمیوں نے بھی اسے خبردار کر دیا تھا کہ اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی یا کسی طریقے سے باہر کوئی پیغام بھجوایا تو اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو قتل کر کے مکان کو آگ لگا دی جائے گی۔

اپنے محبوب شیر خان کی موت کے بعد منگلی کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک اٹھا تھا۔ شیر خان کو کتنی ہی گولیاں لگی تھیں۔ وہ گر پڑا تھا۔ اس نے پھر کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ کیسے زندہ بچ سکتا تھا۔ راجہ کے نوکروں نے تو اسے کہیں زمین میں دبا دیا ہو گا۔ منگلی تہہ خانے کی کوٹھری میں اکیلی بیٹھی یہی کچھ سوچ رہی تھی۔ اور اپنے محبوب شیر خان کی موت پر آنسو بہا رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ شیر خان کا بدلہ لوں گی۔ اس کی موت کا بدلہ لوں گی۔ پھر اچانک اس کا چہرہ جیسے کسی خیال سے ساکت ہو گیا۔ کہیں شیر خان زندہ ہی نہ ہو مگر ان لوگوں نے اسے کہاں پھینکا ہو گا۔ اگر زمین میں دبا دیا ہو گا تو اب تک شیر خان مر چکا ہو گا۔ اگر جنگل میں کہیں پھینکا ہے تو اس کو بچا لینا چاہیے۔

اسے بچایا جا سکتا ہے مگر کیا کروں؟ کس سے پوچھوں؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ منگلی کے بدن پر صرف ایک پرانی گرم کمبل نما چادر تھی۔ وہ اٹھ کر کوٹھری کے دروازے تک آئی۔ اس نے دروازے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"مجھے کوئی کپڑا دو میں ٹھنڈ میں مر جاؤں گی۔ بھگوان کے لیے مجھے کوئی کپڑا دو۔"

چوکیدار یا ریٹائرڈ ڈوگرہ سپاہی تہہ خانے کی ان دو، چار کوٹھریوں کے آگے تھوڑی دیر بعد راؤنڈ لگا کر پہرہ دیتا تھا وہ اتفاق سے اس وقت وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے منگلی کی آواز سنی تو رک گیا۔ اس وقت یہ ڈوگرہ سپاہی جس کا نام ماتا رام تھا اپنے بیوی، بچوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جس سے ملے اسے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ ڈوگرہ جاگیردار راجہ صاحب کا حکم تھا کہ کوئی نوکر ایک سال سے پہلے اپنے گھر نہیں جا سکتا۔ اسے یہاں دوسرے نوکروں کی طرح کھانے پینے کی بڑی سہولت تھی۔ روپیہ بھی بہت مل جاتا تھا۔ جسے وہ گھر منی آرڈر کروا دیتا تھا مگر اسے اپنی بیوی اور بچوں سے دوسرے نوکروں کے برخلاف بہت زیادہ محبت تھی۔ دوسرے نوکر تو ادھر ادھر بھی ہاتھ مار لیتے تھے مگر ماتا رام بڑا مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ صرف اپنی زمین چھڑوانے کے لالچ میں اس نے راجہ صاحب کی نوکری کر لی تھی۔ اب گھربار ہر وقت یاد آتا تھا۔ بیوی بچوں کی شکل آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ وہ کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے کیونکہ جس زمین کو ساہوکار سے چھڑانے کے لیے اس نے راجہ صاحب کی نوکری کی تھی۔ وہ زمین اس کے پاس واپس آچکی تھی۔ اب وہ محض روپے، پیسے کی خاطر اپنی بیوی بچوں سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ منگلی کی آواز سن کر وہ رک گیا کہنے لگا۔

"کیا بات ہے کیوں شور مچا رہی ہو؟" منگلی نے کہا "میں مر جاؤں گی مجھے کرتا شلوار لا دو۔" ماتا رام کے پاس کوٹھریوں کی چابیاں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ اس نے چابی لگا کر تالا کھولا اور دروازہ پیچھے کو دھکیلا تو دیکھا کہ کوٹھری میں جلتے کمزور بلب کی روشنی میں منگلی نیم عریاں حالت میں اس کے سامنے کھڑی ہے۔ ماتا رام نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا اور ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"اپنے بدن پر چادر کر لو بہن۔ یہ کیا کر رہی ہو۔" ماتا رام کی زبان سے اپنے بارے

میں بہن کا لفظ سن کر منگلی نے جلدی سے اپنا بدن چادر میں چھپا لیا۔ اس کے جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ وہ کچھ اور سوچ رہی تھی اور ماتا رام کوئی اور ہی بندہ نکل آیا تھا۔ خدا کے نیک بندے، خدا سے ڈرنے والے نیک بندے ہر مذہب ہر روپ ہر رنگ میں مل جاتے ہیں۔ منگلی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"بھائی مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا اگر بہن کہا ہے تو بھگوان کے واسطے اپنی مظلوم بہن کو اس نرگ سے نکالو۔"

ماتا رام نے اپنے منہ پر انگلی رکھ دی۔ "چپ رہو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کر کے دوبارہ تالا لگا دیا۔ منگلی مایوس ہو کر فرش پر سکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ شیر خان کو یاد کر رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کوٹھری کے آگے جو چھوٹا سا برآمدہ بنا ہوا تھا وہاں ماتا رام ٹہلتا ہوا دوسرے سرے تک گیا۔ اس کا دماغ ایک ہی لکیر پر بڑی تیزی سے چل پڑا تھا۔ اس کو خیال آیا کہ اگر کوٹھری کے اندر اس کی اپنی سگی بہن اس حالت میں قید ہوتی تو وہ کیا کرتا؟ اس کی بہن کو بھی راجہ کے بدمعاش اغوا کر کے وہاں لا سکتے تھے۔ یہ جو عورتیں یہاں گناہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دی گئی تھیں۔ یہ بھی کسی کی بہنیں ہی ہوں گی۔ ان کے بھی کوئی نہ کوئی کہیں نہ کہیں بھائی ضرور ہوں گے۔ ماتا رام کا دماغ چکر کھا گیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کونے والی آخری کوٹھری میں گیا۔ وہاں لکڑی کے تخت پر کتنے ہی لحاف کمبل اور کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ یہ ان عورتوں کے کپڑے تھے جو راجہ کی حویلی میں وہاں کے ظلم سہتے سہتے مر گئی تھیں۔ ماتا رام نے ان میں سے ایک پورے بازوؤں والا سویٹر کسی عورت کی کھدر کی شلوار اور کھدر کا سبز کرتا نکالا۔ کوٹھری کو بند کیا اور منگلی کی کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی کپڑے اس کی طرف پھینک دیے اور کہا۔

"اسے جلدی سے پہن لو بہن اور میرے ساتھ آجاؤ۔ جلدی کرو۔"

"کہاں؟"

ماتا رام کے دل میں سے گزرنے والی نیکی کی لہر کو منگلی سمجھ نہ سکی تھی۔ اس کے سوال پر ماتا رام نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تمہیں یہاں سے نکال رہا ہوں۔ بہن کہا ہے تو تمہارا بھائی بن کر دکھا رہا ہوں۔ جلدی کپڑے پہنو۔ میں باہر کھڑا ہوں دیر نہ کرنا۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے کے ساتھ باہر دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ رات کے دو بجے تک وہاں کوئی نہیں آئے گا۔ دو بجے رات کیسر سنگھ کو اس کی جگہ ڈیوٹی دینے وہاں آنا تھا۔ منگلی جلدی جلدی کپڑے بھی پہن رہی تھی اور حیران بھی ہو رہی تھی۔ کہ انسان چاہے برے سے برے ماحول میں پھنس جائے اس کے اندر کی نیکی کبھی نہیں مرتی۔ وہ اسے ہر قدم پر آواز دے دیتی ہے۔ اس کا ضمیر اسے ملامت بھی کر رہا تھا۔ کہ اس نے ماتا رام ایسے نیک دل انسان کو غلط کیوں سمجھا۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ چادر اوڑھی اور کوٹھری سے باہر نکل آئی۔ ماتا رام نے اسے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دوسرے کونے والی کوٹھری کے پاس جو زینہ تھا وہ چڑھنے لگا۔ اوپر والا دروازہ بند تھا۔ ماتا رام نے دروازے کو آہستہ سے کھولا اس کی آواز پیدا ہوئی باہر سے کسی نے بلند آواز میں پوچھا۔

"کون ہے بھئی؟" ماتا رام نے باہر آ کر کہا۔

"میں ہوں ماتا رام یار اور کون ہو گا۔" باہر بکرم داس چارپائی پر لحاف اوڑھے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کچھ پتا نہیں بھائی۔ آج تو ایک قاتل گھس آیا تھا۔ بھگوان نے کرپا کر دی۔ راجہ صاحب بچ گئے۔ میں تو ساری رات جاگ کر گزاروں گا۔" ماتا رام نے کہا۔

"تم کیوں نیند خراب کرتے ہو۔ جاؤ رسوئی میں گرم ہو کر سو جاؤ۔ میں جو پہرے پر ہوں جاؤ یہاں سردی ہے۔"

منگلی سیڑھیوں کے اندھیرے میں کھڑی دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ بکرم داس کے لیے ماتا رام کوئی اجنبی شخص نہیں تھا ویسے بھی اسے برآمدے میں لحاف میں دبکے ہونے کے باوجود سردی لگ رہی تھی۔ وہ چارپائی سے یہ کہہ کر اٹھا "اچھا بھائی تمہاری مہربانی ہے۔" اور باورچی خانے کی گرم فضا میں جا کر تخت پر لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ ماتا رام یونہی پہرہ دینے کے انداز میں ٹہلتا ٹہلتا باورچی خانے کے دروازے تک گیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ اس نے کہا۔

"دروازہ بند کر رہا ہوں۔ تمہیں سردی لگ جائے گی۔" اور ماتا رام نے کچن کا دروازہ بند کر دیا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ اس ویران پہاڑی مقام پر ایسا لگ رہا تھا جیسے آدھی رات ہو گئی ہو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ماتا رام دبے پاؤں زینے کے پاس آیا۔ منگلی پہلے ہی دیوار سے لگ کر کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ ماتا رام نے اشارہ کیا کہ باہر نکل کر بائیں جانب دیوار کے ساتھ چلی جاؤ۔ منگلی نے ایسا ہی کیا۔ وہ صبح سے اس جہنمی حویلی میں قید تھی اور پہلی بار تازہ ہوا میں باہر آئی تھی۔ اس حویلی کا ایک پچھلا دروازہ بھی تھا منگلی کو اس کا علم نہیں تھا۔ ماتا رام اسے حویلی کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلاتا عقبی دروازے کے قریب لے آیا۔ اس نے اندھیرے میں منگلی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے ذرا سا دبا کر سرگوشی کی۔

"یہیں کھڑی رہنا۔"

عقبی دروازے کی پہلے ڈیوڑھی آتی تھی۔ ڈیوڑھی کے اندر چارپائی بچھی ہوئی تھی اور یہاں کا چوکیدار ڈوگرہ ایک بوڑھا آدمی تھا جو لحاف میں دبکا اونگھ رہا تھا۔ اس دروازے کو استعمال کرنے کی کبھی کبھار ہی ضرورت پڑتی تھی۔ ماتا رام نے ڈیوڑھی میں جاتے ہی آواز دی۔

"تلسی دادا!" بوڑھے ڈوگرے نے لحاف منہ پر سے ہٹایا اور کہا۔

"ماتا رام تم ہو؟ کیا بات ہے۔ پھر کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے کیا؟"

"ارے نہیں دادا۔ سب ٹھیک ہے۔ میں تو ماچس لینے آیا ہوں۔ بکرم رسوئی میں اندر سے کنڈی لگا کر سو گیا ہے۔ مجھے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ سوچا تمہاری کوٹھری میں ماچس مل جائے گی۔" تلسی دادا چارپائی سے اترتے ہوئے بولا۔

"بھائی میں سگریٹ تو نہیں پیتا پر کوٹھری میں ماچس کا بکس ضرور رکھتا ہوں۔ تم بیٹھو۔ میں ابھی ماچس لے کر آتا ہوں۔" ماتا رام چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جب تلسی بابا ڈیوڑھی سے نکل کر اپنی کوٹھری کی طرف چلا گیا تو وہ اٹھا اور تیزی سے دیوار کے ساتھ دو چار قدم چل کر منگلی کے پاس آیا اور آہستہ سے کہا۔

"جلدی آؤ۔" منگلی ڈیوڑھی میں آ گئی۔ ماتا رام نے عقبی دروازے کی کنڈی اتار کر اس کا ایک پٹ کھولا اور کہا۔

"باہر دائیں طرف پتھروں میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔" منگلی دروازے میں سے گزر کر دائیں جانب مڑ گئی۔ ماتا رام وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تلسی بابا ماچس لے کر آگیا۔ ماتا رام نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر سگریٹ جلایا اور ماچس واپس کرتے ہوئے بولا۔

"تلسی بابا! میں راجہ صاحب کے حکم پر باہر دیوار کی نگرانی کرنے جا رہا ہوں۔ پہلے خیال تھا کہ تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ راجہ صاحب نے میری یہ خفیہ ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے۔ اب تمہیں بتا دیا ہے کوئی نوکر وغیرہ یہاں آکر میرا پوچھے تو اسے بالکل نہ بتانا۔ نہیں تو راجہ صاحب تم پر بھی سخت ناراض ہوں گے۔" تلسی بولا۔

"ماتا رام مجھے کیا ضرورت ہے کسی کو بتانے کی تم آرام سے جا کر اپنی ڈیوٹی دو۔"

ماتا رام عقبی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ تلسی بابا نے دروازہ بند کر لیا مگر اندر سے کنڈی نہ لگائی۔ کیونکہ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ ماتا رام کو تھوڑی دیر بعد واپس بھی آنا ہے۔

یہاں نیلے آسمان پر چمکتے ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ماتا رام دیوار کے ساتھ چلتا تھوڑا آگے گیا تو پتھروں میں بیٹھی منگلی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ماتا رام قریب آکر بولا۔

"اب جتنی تیز چل سکتی ہو میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔"

منگلی نے ماتا رام سے کہا۔

"مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں شیر خان کی لاش پھینکی گئی تھی۔" ماتا رام بولا۔

"بھگوان کے لیے اس وقت اپنی جان بچاؤ۔" منگلی نے غصے میں ماتا رام کو جھڑک دیا۔

"مجھے وہ جگہ بتاؤ۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ کر یہاں سے چلے جاؤ۔"

ماتا رام سمجھ گیا کہ اس عورت کا شیر خان کے ساتھ ضرور کوئی جذباتی قسم کا تعلق تھا۔ وہ اسے گھاٹی میں پتھروں اور چٹانوں کے پہلو سے ہوتا ہوا رات کے اندھیرے میں ایک جگہ لے گیا۔ یہاں ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ یہ پہاڑی نالہ تھا۔ اس میں پانی بڑی تیز رفتاری سے گزر رہا تھا ماتا رام نے کہا۔

"یہاں شیر خان کی لاش کو پھینکا گیا تھا۔ اب تک لاش پانی میں بہہ کر نہ جانے کہاں نکل گئی ہو گی۔"

"یہ نالہ آگے کہاں جاتا ہے؟" منگلی کے ہونٹ شدت غم سے بھینچے ہوئے تھے۔ ماتا رام نے اسے بتایا کہ یہ پہاڑی نالہ آگے جا کر دریائے توی میں گر جاتا ہے۔ پھر کہنے لگا۔

"منگلی بہن! یہاں زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں اوپر راجہ کے آدمیوں کو ہمارے فرار کا علم ہو گیا ہو گا۔"

منگلی نے گہرا سانس لیا اور ماتا رام کے پیچھے پیچھے چل دی۔ ماتا رام اس پہاڑی راستے سے باخبر تھا۔ وہ منگلی کو ایک خفیہ پہاڑی درے سے نکال کر شہر کی بڑی سڑک کے پاس لے آیا۔ یہاں سڑک پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کسی وقت سرینگر یا بانہال جانے والی کوئی لاری گزر جاتی تھی۔ ماتا رام کہنے لگا۔

"منگی بہن! اب میں اپنے علاقے کو جاتا ہوں میرے بیوی بچے مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ تم ایسا کرو کہ جموں سے کسی دوسری پرانت کی طرف چلی جاؤ۔ بہتر ہو گا کہ تم بنگال چلی جاؤ۔"

منگی کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ شیر خان کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا مرچکا ہے۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ مرگیا ہے۔ منگی نے اپنی آنکھوں سے فرانسیسی اسمگلر شارل کو اس پر تین گولیاں فائر کرتے دیکھا تھا۔ شیر خان نے تینوں گولیاں سینے پر کھائی تھیں۔ وہ کہاں زندہ رہا ہو گا۔ منگی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے ماتا رام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"ماتا رام! تم ایک اچھے انسان ہو۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔ تم نے مجھے ایک جہنم سے نکالا ہے۔" ماتا رام بولا۔

"کوئی بات نہیں منگی۔ تمہیں بہن کہا تھا تو تمہاری مدد کرنا میرا فرض بن گیا تھا۔ لاری آرہی ہے۔ میں سرینگر کی طرف جاؤں گا۔ تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔ لاری کی روشنی تم پر نہیں پڑنی چاہیے۔"

منگی سڑک کے کنارے ایک درخت کے پیچھے ہو گئی۔ ماتا رام نے سڑک پر آکر لاری کو ہاتھ دیا۔ لاری قریب آکر رکی۔ ماتا رام اس میں سوار ہوا اور لاری آگے روانہ ہو گئی۔ منگی تھکے تھکے قدم اٹھاتی شہر کی طرف چل پڑی۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ شہر کی طرف خوب روشنیاں تھیں۔ کسی طرف سے اسپیکر پر فلمی گانوں کی ریکارڈنگ کی آواز آرہی تھی۔ منگی نے اس سڑک کو پہچان لیا تھا۔ وہ کھیتوں میں پڑ گئی اور دھند میں ڈوبے کھیتوں میں سے گزرتی اس علاقے میں آگئی جہاں وہ ہوٹل تھا جس کے ایک کمرے میں منگی اور شیر خان رہ رہے تھے۔ ہوٹل کھلا تھا۔ منگی سیدھی کاؤنٹر پر گئی جہاں ہوٹل کا مالک بیٹھا حساب کتاب کر رہا تھا۔ اس نے منگی کو کمرے کی چابی دیتے ہوئے اس کے "خاوند" کے بارے میں پوچھا۔ وہ شیر خان کو اس کا خاوند ہی سمجھتا تھا۔ منگی نے کہا۔ وہ دوسرے شہر کام سے گیا ہے کل تک آجائے گا۔

کمرے میں آکر منگی نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جب کچھ دیر بعد اس کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو اس نے اپنے آپ کو ٹھیک کیا۔ دروازے پر لڑکے نے دستک دی۔ منگی نے دروازہ کھولا۔ لڑکے نے کھانا لانے کا پوچھا۔ منگی نے کہا۔

"کھانا میں کھا آئی ہوں۔ تم چائے لے آؤ۔" لڑکا چلا گیا۔ منگی اپنے آپ کو کمبل میں لپیٹ کر پلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بجلی کی روشنی میں اسے کھونٹی کے ساتھ لٹکے شیر خان کے کپڑے نظر آئے تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے آنسوؤں کو باہر نہ آنے دیا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ شیر خان کے قاتل فرانسیسی اسمگلر قاتل شارل سے اس قتل کا بدلہ لے کر رہے گی۔ لڑکا چائے لے آیا۔ چائے پینے سے منگی کے جسم میں گرمی آگئی۔ اسے جو سردی لگ رہی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اس نے بتی بجھا دی۔ پلنگ پر نیم دراز ہو گئی اور سوچنے لگی کہ وہ ڈوگرہ راجہ کے محل میں جا کر شارل سے شیر خان کا بدلہ کیونکر لے سکتی ہے۔ راجہ کے محل میں منگی کا جانا موت کے منہ میں جانے کے برابر تھا۔ اگر وہ بھیس بدل کر بھی جاتی ہے تو ضرور پہچان لی جائے گی اور پھر وہاں سے اس کے زندہ واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انہی سوچوں میں گم منگی کو نیند نے آلیا اور وہ بے سدھ ہو کر گہری نیند میں کھو گئی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دن کافی نکل آیا تھا۔ اور دروازے پر کوئی ہلکی ہلکی دستک دے رہا تھا۔ منگی نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ہوٹل والا لڑکا چائے وغیرہ کا چھوٹا سا گول ٹرے لیے کھڑا تھا۔

"میں تیسری بار ناشتہ لے کر آیا ہوں۔ آپ سو رہی تھیں۔"

منگی نے ناشتے کا ٹرے لے کر لڑکے کو بھیج دیا۔ منگی نے ناشتہ کیا اور کئی قسم کے خیالات نے اسے گھیر لیا۔ کبھی اسے شیرنی کا خیال آتا کہ وہ کہاں ہو گی۔ کیا معلوم وہ ابھی تک جموں شہر میں ہی ہو۔ جب اسے اپنے باپ کی موت کی خبر ملے گی تو غم سے اس کا برا حال ہو جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ شیرنی اگر جموں میں ہی ہے تو اسے کیسے ڈھونڈا جائے ناشتہ کرنے کو منگی کا ذرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھانا بھی ضروری تھا۔ منگی ناشتہ زہر مار کر کے اٹھی منہ ہاتھ دھو کر گیروے کپڑے پہنے کاندھوں پر شیر خان کا نسواری کمبل ڈالا اور ہوٹل سے نکل کر بازار میں ایک طرف چل پڑی۔ اپنی طرف سے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

منگلی نے اپنا حلیہ کافی تبدیل کر لیا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ راجہ کے جاسوس شہر میں پھرتے رہتے ہیں۔ منگلی شہر کے جنوبی علاقے کی طرف آگئی۔ یہاں کھلے کھیت بھی تھے اور آگے تھوڑا سا پہاڑی علاقہ بھی تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔

منگلی کو دھوپ بڑی اچھی لگی۔ وہ کھیتوں کو پیچھے چھوڑ کر نیم پہاڑی علاقے میں آگئی۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اور فرانسیسی قاتل شارل سے شیر خان کے قتل کا بدلہ لینے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ غیر شعوری طور پر وہ پتھروں میں اگی ہوئی جڑی بوٹیوں کو بھی دیکھتی جاتی تھی۔ کیونکہ آخر وہ سنیاسی عورت تھی اور جڑی بوٹیوں کی خاصی پہچان رکھتی تھی۔ اچانک اس کی نگاہ ایک خاص بوٹی پر پڑی۔

اس بوٹی کی شاخوں پر چھوٹی چھوٹی بیل لگی تھی جس کی شکل سانپ کے پھن سے ملتی جلتی تھی۔ سنیاسن منگلی کو یہ بوٹی بڑی دیر بعد دکھائی دی تھی۔ اس بوٹی میں خاص بات یہ تھی کہ اگر اس کے پھل کو توڑ کر کھا لیا جائے تو آدمی پر سانپ کے کاٹنے کا اثر نہیں ہوتا۔ بوٹی کا پھل ایک بار کھانے سے آدمی کم از کم ایک سال کے لیے سانپ کے زہر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ منگلی دل میں سوچنے لگی کہ قدرت نے ان جنگلوں میں جڑی بوٹیوں کی شکل میں کیسی کیسی انمول چیزیں بکھیر رکھی ہیں جن کا لاکھوں میں سے کسی ایک انسان کو ہی علم ہوتا ہے۔ ویسے بھی جموں آزاد کشمیر کا علاقہ قدرتی جڑی بوٹیوں کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ منگلی نے بوٹی کے تین چار پھل توڑ لیے۔ ایک پھل اس نے اسی وقت منہ میں ڈال لیا۔ اور باقی تین پھل کپڑے میں لپیٹ کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیے۔ یونہی منگلی کو خیال آیا کہ اس تریاق کو آزمانا چاہیے۔ اب وہ کسی سانپ کو تلاش کرنے لگی۔ وہ درختوں کے نیچے اگی ہوئی جنگلی جھاڑیوں میں آکر کسی سانپ کا بل ڈھونڈ رہی تھی کہ اچانک ایک جھاڑی میں سے کالے رنگ کا ڈیڑھ بالشت لمبا سانپ نکل کر سامنے آگیا۔ یہ سانپ جھاڑی کے پاس دھوپ سینک رہا تھا۔ کہ منگلی کا ہاتھ اس کے قریب پڑا۔ قدرتی طور پر منگلی نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ پھر اسے تریاقی صفت والی بوٹی کا خیال آگیا۔ جس کا پھل وہ کھا چکی تھی۔ وہ ابھی سانپ کو پکڑنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی۔ کہ سانپ نے پلک جھپکنے میں اچھل کر منگلی کے پاؤں پر ڈس لیا۔ اس کے ساتھ ہی منگلی نے اس پر زور

سے ہاتھ مارا اور سانپ کو وہیں دبوچ لیا۔ سانپ کی گردن منگلی کی انگلیوں میں تھی اور سانپ اس کی کلائی سے لپٹ گیا تھا۔

منگلی وہیں بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے پیر کو دیکھا سانپ نے پاؤں کے اوپر گھٹنے کے پاس ڈسا تھا۔ وہاں اس کے دانتوں کے دو نشان پڑ گئے تھے جس میں سے خون نکل کر وہیں جم گیا تھا۔ منگلی نے اپنے حواس کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم میں سانپ کے ڈسنے سے جو سستی اور غنودگی پیدا ہونی چاہیے تھی وہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کا جسم بالکل نارمل تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بوٹی نے سانپ کے زہر کو بے اثر کر دیا تھا۔ منگلی نے دلیری کے ساتھ ایک بار پھر سانپ سے اپنے ہاتھ پر ڈسوایا اور اس بار پھر سانپ کے زہر نے کوئی اثر نہ کیا۔ منگلی نے سانپ کو اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا اور جھاڑیوں سے نکل کر کچے راستے پر ٹہلنے لگی۔ وہ چھ سات منٹ تک ٹہلتی رہی۔ زہر کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی۔ منگلی کو یقین ہو گیا کہ اس نے صحیح بوٹی کا انتخاب کیا تھا۔

وہ پہلے سانپ کو وہیں جنگل میں چھوڑنے لگی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے سانپ کو اپنی چادر کے کونے میں باندھ کر اپنی کمر کے ساتھ لٹکا لیا۔ یہ سانپ مشکل کے وقت اس کے کام آسکتا تھا۔ زہریلے تیر تو اس کے پاس رہے نہیں تھے۔ یہ سانپ ہی اب اس کا ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا۔ منگلی ایک جگہ دھوپ میں بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔ کہ راجہ کے محل میں شارل کو ہلاک کرنے کے لیے وہ کس ترکیب سے جائے اسے شارل سے شیر خان کے قتل کا بدلہ ہر حالت میں لینا تھا۔ وہ شیر خان کے قاتل کو اس دنیا میں زندہ نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اب ایک سانپ اس کے قبضے میں تھا۔ اس سانپ سے وہ شارل کو ہلاک کرنے میں مدد لے سکتی تھی۔ کچھ دیر وہاں دھوپ میں بیٹھی منگلی یہی کچھ سوچتی رہی۔ شیر خان کے قتل ہو جانے سے اس کا دل کچھ دیر کے لیے بجھ سا ضرور گیا تھا مگر اب اس کی جگہ ایک نئی آگ روشن ہو گئی تھی۔ یہ انتقام کی آگ تھی۔ وہ شیر خان کے خون کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ اس کے خون کا بدلہ لیے بغیر منگلی کے دل کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو سکتی تھی۔

منگلی نے سوچا کہ اسے جس طرح بھی ہو آج رات ڈوگرہ راجہ کے پراسرار محل میں پہنچ کر شارل کو سانپ کی مدد سے ہلاک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ

شیر خان کا قاتل اپنے ملک واپس چلا جائے۔ وہ اٹھی اور ست قدموں کے ساتھ اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑی۔ وہ نیم پہاڑی جنگل میں اونچے نیچے راستوں سے ہوتی ایک کھلی جگہ پر آ گئی۔ جس کی ایک جانب اونچی چٹان کی ڈھلان تھی اور دوسری طرف ایک گہری کھائی تھی۔ یہاں اسے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی نظر آئی جو پہاڑی چٹان کی ڈھلان کی طرف جاتی تھی۔ وہاں سے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بھی دور سے نظر آ رہی تھی۔ منگلی کو اس جھونپڑی سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ اسے پیچھے چھوڑ کر پگڈنڈی پار کر کے دوسری طرف اونچی اونچی جھاڑیوں کے ساتھ چلنے لگی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ جس جھونپڑی کو وہ بے حقیقت سمجھ کر چھوڑ کر آ گئی ہے۔ اس کے اندر شیرنی چارپائی پر بیٹھی اپنے باپ شیر خان کے بارے میں سوچ کر کبھی اداس ہو جاتی ہے تو کبھی آگ ببھوکا سی ہو کر چارپائی سے اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے۔

یہ وہی جھونپڑی تھی جہاں خالصتان تحریک کا سردار شیرنی کو اپنے خاص آدمی مکھن سنگھ کی حفاظت میں یہ کہہ کر چھوڑ گیا تھا کہ یہ سردارنی میری بہن ہے۔ یہ جب تک یہاں رہنا چاہے اس کی اپنی جان دے کر بھی حفاظت کرنا۔ جس وقت منگلی وہاں سے گزر رہی تھی اس وقت ادھیڑ عمر مکھن سنگھ ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے کوئی جوگن عورت سمجھ رہا تھا جو اکثر اس علاقے میں پھرتی نظر آ جاتی تھیں۔

اچانک مکھن گھبرا کر اٹھا اور جھونپڑی کی طرف دوڑا۔ اس نے پولیس کی ایک جیپ کو بڑی تیزی سے جھونپڑی کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ جیپ پتھروں پر سے اچھلتی ہوئی تیز رفتاری سے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ منگلی نے بھی جیپ کو دیکھ لیا۔ وہ یہ سمجھی کہ پولیس اس کی تلاش میں وہاں آن پہنچی ہے۔

تھی۔ منگلی جلدی سے جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھ گئی۔ جیپ اس کے قریب سے نکلی اور چٹان کے دامن میں بنی ہوئی جھونپڑی کے پاس جا کر ایک دم رک گئی جیپ میں سے دو سپاہی اور ایک تھانیدار چھلانگیں لگا کر نکلے اور سیدھے جھونپڑی میں جا گھسے۔ منگلی یہ سارا تماشہ جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ جو سکھ دوڑتا ہوا پہلے جھونپڑی کی طرف گیا تھا وہ خدا جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ منگلی نے سوچا کہ ضرور یہاں جرائم پیشہ منشیات فروش

قسم کے لوگوں کا اڈہ ہو گا جہاں پولیس نے چھاپا مارا ہے۔ وہ اٹھ کر جانے ہی لگی تھی کہ زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔

اس نے دور ہی سے شیر خان کی بیٹی شیرنی کو پہچان لیا تھا۔ دو سپاہی اسے کھینچتے ہوئے باہر لا رہے تھے۔

"ہے بھگوان! یہ تو شیرنی عائشہ ہے۔" منگلی کے منہ سے اپنے آپ نکل گیا۔ وہ لپک کر جھاڑیوں کی دوسری طرف ہو کر چھپ گئی۔ تھانیدار کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ منگلی درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے پیچھے ہوتی ہوئی اس جگہ آ کر بیٹھ گئی جہاں سے پولیس کی جیپ اسے صاف نظر آ رہی تھی۔ شیرنی کو جیپ کے پاس لا کر تھانیدار نے گرج کر پوچھا۔ "تیرے دوسرے خالصتانی ساتھی کہاں ہیں؟" منگلی نے دیکھا کہ شیرنی نے سکھ سردارنیوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ زرد شلوار قمیص تھی۔ دوپٹہ ماتھے پر بندھا ہوا تھا۔ بغل میں کرپان لٹک رہی تھی اور ہاتھوں میں کڑا پڑا تھا۔ شیرنی نے بڑے وقار سے کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔"

تھانیدار نے شیرنی کو زور سے تھپڑ مارا شیرنی بپھر گئی اس نے بھی تھانیدار کو ایک زوردار طمانچہ جڑ دیا۔ تھانیدار کی کلاوہ والی ڈوگروں والی پگڑی نیچے گر پڑی۔ سپاہیوں نے شیرنی کو وہیں دبوچ لیا۔ تھانیدار اٹھ کر فائر کرنے ہی لگا تھا کہ رائفل کا ایک دھماکہ ہوا اور ایک سپاہی خون میں لت پت ہو کر زمین پر تڑپ رہا تھا۔ تھانیدار نے چلا کر کہا۔

"جیپ اسٹارٹ کرو۔ جیپ اسٹارٹ کرو۔ خالصتانی سکھ گھات میں ہیں"

ایک اور فائر ہوا مگر تھانیدار اور سپاہی شیرنی کو نیچے کھینچ کر زمین پر لیٹ گئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ جیپ کی طرف رینگ رہے تھے۔ منگلی نے اسی دوران اپنی کمر کے گرد بندھے ہوئے کپڑے میں سے زہریلے سانپ کو نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ وہ تھانیدار اور سپاہی پر اگر سانپ پھینکتی ہے تو اس بات کا خطرہ تھا کہ سانپ شیرنی کو بھی ڈس سکتا تھا۔ تھانیدار اور سپاہی نے شیرنی کو کھینچ کر جیپ میں ڈالنا چاہا تو شیرنی نے ایک دم سے اچھل کر تھانیدار کی کلائی پر پوری طاقت اور مہارت سے ہاتھ مارا۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ دوسرے سپاہی نے رائفل کا رخ شیرنی کی طرف کیا ہی تھا کہ شیرنی نے پستول دبوچ کر فائر جھونک

دیا۔ دوسرا سپاہی سینے میں گولی کھا کر پیچھے کو گرا۔ تھانیدار نے چھلانگ لگا کر پیچھے سے شیرنی کو قابو کرنا چاہا۔ لیکن شیرنی اب پوری طرح ہوشیار ہو چکی تھی اس نے پستول کا رخ تھانیدار کی طرف کر دیا۔ تھانیدار نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور کہا۔

"گولی مت چلانا۔ میں تمہیں آزاد کرتا ہوں۔"

اتنی دیر میں جھونپڑی کی طرف سے مکھن سنگھ دوڑتا ہوا آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اس نے چلا کر کہا۔

"سردارنی! فائر کیوں نہیں کرتی۔" شیرنی نے مکھن کی طرف دیکھا اس کا دھیان مکھن سنگھ کی طرف ہو گیا۔ بس اسی لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تھانیدار نے لپک کر شیرنی کے ہاتھ سے پستول چھینا اور اسے دبوچ کر پستول کی نالی اس کی کنپٹی کے ساتھ لگاتے ہوئے چلایا۔

"سردارا! بندوق پھینک دے نہیں تو میں تیری سردارنی کو شوٹ کر دوں گا۔ میں تین بار گنتی کروں گا۔ ایک..... دو..." شیرنی نے چیخ کر کہا

"سردار جی! بندوق نہ پھینک ..... فائر کر دو۔ میری پرواہ نہ کرو۔" مگر تھانیدار کے تین کہنے سے پیشتر ہی مکھن سنگھ نے بندوق زمین پر رکھ دی۔ تھانیدار نے حکم دیا۔

"زمین پر لیٹ جاؤ۔ زمین پر لیٹ جاؤ۔" مکھن سنگھ زمین پر لیٹ گیا۔ تھانیدار شیرنی کو دبوچ وہاں تک گیا۔ مکھن سنگھ کی بندوق اٹھا کر جیپ میں پھینکی۔ پھر شیرنی کو الگ کر کے اس پر پستول تان لیا۔

"سردارنی! اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میرے پستول میں ابھی کافی گولیاں ہیں۔ میں تمہیں ایک سیکنڈ میں شوٹ کر دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی تھانیدار نے اپنی پیٹی کے ساتھ بندھی ہوئی ہتھکڑی نکالی اور شیرنی کو دونوں ہاتھ پیچھے لے جانے کو کہا۔ شیرنی حملہ کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھی۔ مگر تھانیدار پستول تانے اس سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے دونوں سپاہیوں کی لاشیں خون میں لت پت وہاں پڑی تھیں۔ مکھن سنگھ اسی طرح زمین پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ تھانیدار نے جلدی سے شیرنی کو ہتھکڑیاں لگا دی۔ پھر اس کی گردن پر پیچھے سے پستول رکھے اپنے ساتھ ساتھ چلاتے ہوئے دونوں سپاہیوں کی رائفلیں اٹھا کر جیپ میں پھینکیں اور شیرنی کو بھی جیپ میں بیٹھنے کا حکم دیا۔

شیرنی ذرا ہچکچائی۔ تھانیدار نے اس کی گردن کے قریب فائر کر دیا۔ گولی شیرنی کے کان کے بالکل نزدیک سے ہو کر نکل گئی۔

"جیپ میں بیٹھو۔" تھانیدار چلایا۔ شیرنی نے ایک نظر مکھن سنگھ کو دیکھا اور بے بسی کی حالت میں جیپ میں بیٹھ گئی۔ تھانیدار دوسری طرف سے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دوڑ کر آیا۔ پستول کا رخ اس نے شیرنی کی طرف کیا ہوا تھا۔ اس نے اپنا اگلا پاؤں پائیدان پر رکھنے کے لیے اٹھایا ہی تھا کہ اسے اپنی پنڈلی پر کسی چیونٹی کے کاٹنے کا احساس ہوا اس نے اپنا خالی ہاتھ پنڈلی پر رکھا ہی تھا کہ جس سانپ نے پہلے اس کی پنڈلی کو ڈسا تھا اب اس کے ہاتھ پر بھی ڈس دیا۔ یہ سانپ منگلی نے اس کی طرف پھینکا تھا۔ تھانیدار نے زور سے ہاتھ کو جھٹکا۔ اس نے سانپ کو ایک طرف جھاڑیوں میں گھستے دیکھا۔ اس پر خوف طاری ہو گیا۔ سانپ کے زہر کا اثر ہو گیا تھا۔ اس کو چکر سا آ گیا۔ اور پہلے پستول اس کے ہاتھ سے گرا اور پھر وہ بھی جیپ کے پاس ہی گر پڑا۔ منگلی جھاڑیوں میں سے نکل کر شیرنی کی طرف دوڑی۔

"عائشہ! میں منگلی ہوں۔"

شیرنی نے منگلی کو دیکھا تو خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مکھن سنگھ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ منگلی نے تھانیدار کی پیٹی سے چابی نکال کر شیرنی کی ہتھکڑی کھول دی۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے ملیں۔

"خدا کا شکر ہے منگلی کہ عین وقت پر تم آ گئیں۔" مکھن سنگھ نے قریب آ کر منگلی سنیاسن کو غور سے دیکھا اور پوچھا۔ "سردارنی! یہ سنیاسن کون ہے؟" مکھن سنگھ بولا۔

"سردار جی! یہ میری منہ بولی بہن منگلی ہے۔" شیرنی نے کہا۔

"جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے ہمیں نکل جانا چاہیے۔ پولیس کی دوسری گارڈ یہاں آ سکتی ہیں۔"

منگلی شیرنی اور مکھن سنگھ جیپ میں بیٹھ گئے۔ مکھن سنگھ جیپ اسٹارٹ کر کے اسے وہاں سے نکال کر لے گیا۔ وہ نیم پہاڑی راستے پر تیزی سے جیپ کو ایک طرف لیے جا رہا تھا۔

"ہم کدھر جا رہے ہیں؟" شیرنی نے پوچھا۔

"بی بی! تمہیں خطرے سے دور لے جانا میری ڈیوٹی ہے میں تمہیں کٹھوعہ سے آگے جالندھر جانے والے راستے پر ڈال دوں گا۔ تم جالندھر گوردوارے میں چلی جاؤ وہاں تم محفوظ ہو گی۔ ہمارے آدمی وہاں تمہاری حفاظت کریں گے۔"

مکھن سنگھ اس سارے علاقے کو جانتا تھا۔ اور دن کی روشنی میں پولیس کی جیپ کو پہچانا جا سکتا تھا۔ مگر مکھن سنگھ جیپ کو ویران علاقوں پر سے لیے جا رہا تھا۔ منگلی ان علاقوں کو پہچانتی تھی۔ وہ شیر خان کے قاتل سے دور نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس نے ابھی عائشہ کو اس کے باپ کے قتل کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ پہلی بار جب مکھن سنگھ نے شیرنی کو سردارنی کہہ کر پکارا تو شیرنی نے منگلی کو اشارے سے خاموش رہنے اور کوئی سوال نہ پوچھنے کو کہا تھا۔ اس کے سکھوں ایسے پہناوے ہی سے منگلی سمجھ گئی تھی کہ شیرنی یہاں سکھ عورت کے روپ میں رہ رہی ہے۔ بلکہ چھپی ہوئی ہے۔ جیپ میں بھی وہ مکھن سنگھ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ منگلی پچھلی سیٹ پر تھی۔ ایک جگہ مکھن سنگھ نے جیپ کچے راستے پر اتار دی جو ایک گھاٹی کی طرف جاتا تھا۔ گھاٹی کی دوسری جانب پہنچ کر اس نے جیپ روک دی اور شیرنی سے بولا۔

"بی بی! یہاں سے آگے کٹھوعہ کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے اب آگے تمہیں اپنی حفاظت خود کرنی ہو گی۔ دو کوس کھیتوں کھیت جاؤ گی۔ تو ایک بہت بڑا آموں کا باغ ملے گا۔ وہ پار کرو گی تو نالہ آئے گا۔ اس کی دوسری طرف ایک گاؤں ہے وہاں سے تمہیں جالندھر جانے والی لاری مل جائے گی۔ سرداروں کو میرا فتح بول دینا۔"

مکھن سنگھ نے اپنی صدری کی جیب میں سے سو سو روپے کے چار نوٹ نکال کر شیرنی کو دیئے اور کہا۔

"جالندھر تک تمہارے لیے کافی ہوں گے آگے ہمارا پنتھ تمہیں سنبھال لے گا۔" مکھن سنگھ جیپ موڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شیرنی نے منگلی کی طرف دیکھا اور خوش ہو کر بولی۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہو۔ خدا کا شکر ہے۔ اب مجھے میرا ساتھی مل گیا ہے۔ مگر منگلی میں نے والد صاحب کو یہاں بہت تلاش کیا۔ مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہاں مجھے خالصتان تحریک کے سکھوں نے پناہ دے رکھی تھی۔ تم سناؤ۔ تم

یہاں کیسے پہنچیں کیا تمہیں میرے والد کے بارے میں کچھ پتا چلا؟؟"

منگلی نے شیرنی کو اس کے باپ کی موت کے بارے میں بتانے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ یہ بات وہ اس سے چھپانا نہیں چاہتی تھی اس نے شیرنی کو ایک طرف درخت کے نیچے بٹھا لیا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔ اپنے باپ کے قتل کا سن کر شیرنی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ اس طرح زندگی میں اس نے کبھی آنسو نہیں بہائے تھے۔ جب اس کے دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو اس کا خون انتقام کی آگ میں کھولنے لگا۔ اس نے منگلی سے کہا۔

"میں اپنے باپ کے قاتل سے جب تک بدلہ نہیں لے لوں گی چین سے نہیں بیٹھوں گی میں، میں واپس جموں جاؤں گی۔" منگلی نے شیرنی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"عائشہ بہن! انتقام کا لاوا میرے سینے میں بھی ابل رہا ہے۔ میں تمہارے باپ کے قاتل کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنا چاہتی ہوں اور یقین کرو میں ایسا کر کے رہوں گی۔ مگر اب ہمیں بڑی احتیاط سے اور ٹھنڈے دل سے کام لینا ہو گا۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ ڈوگرہ کے محل میں جانا اتنا آسان نہیں ہے۔ اب وہاں بہت زیادہ پہرہ ہو گا اور پھر پولیس تمہاری تلاش میں بھی لگی ہوئی ہے۔"

"چاہے کچھ ہو جائے۔" شیرنی نے بپھرتے ہوئے کہا۔ "میں اس بدمعاش ڈوگرے کی حویلی میں جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی اور شارل کے جسم کے ٹکڑے کر کے اسی طرح گھاٹی میں پھینکوں گی جس طرح اس نے میرے باپ ......" شیرنی جملہ پورا نہ کر سکی اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔ منگلی کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اس نے شیرنی کو تسلی دی۔

"روؤ گی تو تمہارے بہادر باپ کی روح کو دکھ ہو گا۔ ہمیں بہادر مردوں کی طرح شیر خان کے قتل کا بدلہ لینا ہو گا۔" شیرنی نے چادر سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ میرا باپ زندہ ہو تم نے اس کی لاش تو نہیں دیکھی نا۔" منگلی نے کہا۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر تمہارے باپ کو بالکل سامنے سے شارل کے پستول کی تین

گولیاں لگی تھیں۔ مجھے نہیں امید کہ شیر خان زندہ بچا ہو گا ۔ بہرحال یہ باتیں بعد میں سوچنے کی ہیں۔ پہلے تو ہمیں شیر خان کے قتل کا بدلہ لینا ہے جس شخص نے اسے میری آنکھوں کے سامنے گولیاں ماری ہیں میں قیامت تک اس کا پیچھا کروں گی۔ جب تک اپنے ہاتھوں سے اسے موت کے گھاٹ نہ اتار لوں گی چین سے نہیں بیٹھوں گی۔"

شیرنی کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ بے اختیار ہو کر اٹھی۔ دوسرے درخت کے پاس گئی۔ کرپان نکال کر درخت کے تنے پر زور سے ماری اور پھر درخت کے ساتھ سر لگا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ منگلی نے قریب جا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور شانوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"تم کیوں روتی ہو اب تو تمہارے دشمن روئیں گے۔" کافی دیر تک شیرنی اپنے بہادر اور محبت کرنے والے باپ کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہی۔ پھر منگلی کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"منگلی! شارل کی اگلی نسل نہیں چل سکے گی۔ یہ میں تمہارے سامنے عہد کرتی ہوں۔ جس حویلی میں میرے باپ پر ظلم کیا گیا ہے۔ اس کی مٹی بھی لوگوں کو نہیں ملے گی۔ تم مجھے صرف ایک بار وہ حویلی دکھا دو۔" منگلی نے کہا۔

"سب کچھ ہو جائے گا۔ کچھ باقی نہیں رہے گا۔ ابھی ہمیں کسی ایسی پناہ گاہ کی ضرورت ہے جہاں ہم کچھ دیر کے لیے چھپ کر اپنے پروگرام پر غور کر سکیں۔" شیرنی نے درخت کے تنے میں کھبی ہوئی کرپان زور سے نکالی اور اسے نیام میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"ہم مکھن سنگھ کے ٹھکانے پر واپس نہیں جا سکتے وہ جگہ پولیس نے دیکھ لی ہے۔ کیا تمہارے ذہن میں کوئی خفیہ جگہ یہاں ہو گی؟" منگلی کہنے لگی۔

"تمہارے باپ کے ساتھ میں جس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی وہاں بھی جانا اب مناسب نہیں ہو گا۔" شیرنی نے کہا۔

"منگلی! ہمیں اسلحہ بھی چاہیے۔" منگلی کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگی۔

"یہاں جموں چھاؤنی میں اسلحے کی ایک دکان ہے اسلحہ ہمیں وہیں سے مل سکے گا۔"

"ہم آدھی رات کو یہ دکان توڑ کر اسلحہ نکالیں گے" شیرنی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ منگلی اس کا منہ تکنے لگی۔

"ٹھیک ہے" منگلی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔" ایسا ہی ہو گا۔ ہمیں ایسا ہی کرنا ہو گا۔ مگر سب سے پہلے ہمیں راجہ کی حویلی کے آس پاس کوئی پناہ گاہ تلاش کرنی ہو گی۔" شیرنی بولی۔

"پہاڑیوں میں ہمیں ایسی کئی جگہیں مل جائیں گی۔ ہم ابھی چلتے ہیں۔" منگلی نے شیرنی کا بازو تھام کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"ابھی نہیں شیرنی' ذرا اندھیرا ہو لینے دو۔ ہم نے تھوڑی دیر پہلے پولیس کے تین اہلکاروں کو قتل کیا ہے۔ ہمارے سامنے ایک بڑا قیمتی مشن ہے۔ اب ہمیں ایک ایک قدم بڑی احتیاط سے اٹھانا ہو گا۔"

دونوں عورتیں وہیں جنگل میں شام ہونے تک بیٹھی رہیں جب سورج غروب ہو گیا اور شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو منگلی نے شیرنی کو ساتھ لیا اور وہ شہر کی طرف آنے کی بجائے پہاڑیوں کی طرف چل دی۔ کافی دیر تک پہاڑی راستوں پر چلتے رہنے کے بعد منگلی اس جگہ سیاہ چٹانوں کے درمیان آ گئی۔ جہاں سے بدکردار ڈوگرہ جاگیردار کی پراسرار حویلی کا ایک برج اندھیرے میں بھی آسمان کی طرف اٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ منگلی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیرنی سے کہا۔

"یہ اس حویلی کا برج ہے جہاں جرائم اور گناہ پلتے ہیں اور جہاں تمہارے باپ اور میرے دوست میرے ساتھی شیر خان کو قتل کر کے لاش گھاٹی میں گرا دی گئی تھی۔"

شیرنی خاموش مگر شعلے اگلتی نظروں سے رات کے اندھیرے میں نیلے آسمان کے پس منظر میں جاگیردار کی حویلی کے برج کو تکتی رہی۔ منگلی بولی۔

"ہمیں اس جگہ کوئی غار تلاش کر کے وہاں اپنی عارضی پناہ گاہ بنانی ہو گی۔ اس جگہ پر ہم لوٹا ہوا اسلحہ وغیرہ رکھیں گے۔ اور حویلی کو ایک ہی دھماکے سے اڑا دینے کی اسکیم تیار کریں گے۔" یہ اسکیم شیرنی کی تھی جو اس نے منگلی کو راستے میں بتا دی تھی اس نے کہا کہ تھا کہ میں اس حویلی کو اس طرح سے نیست و نابود کر دینا چاہتی ہوں۔ کہ لوگوں کو اس کے کھنڈر بھی نہ مل سکیں۔ شیرنی کو اتنی سمجھ ضرور تھی کہ جس عمارت کو تہس نہس کرنا ہو اس کی بنیادوں اور ڈاٹوں میں کس طرح سے اور کہاں کہاں گولہ بارود لگایا جاتا ہے وہ کہنے

لگی۔

"مگر منگی! شارل کو سب سے پہلے موت کے گھاٹ اتارنا ہو گا۔ اسے میں اپنے ہاتھوں اس ریان سے رک رک کر تڑپا تڑپا کر قتل کروں گی۔"

"وہ تو میرا بھی فرض بن چکا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں دیوتاؤں کے آگے قسم کھا رکھی ہے۔ کہ شارل کو کسی صورت میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ ہم دونوں اسے قتل کریں گی اس کے جسم کے ٹکڑے کریں گی۔ آؤ ان ٹیلوں میں کوئی ٹھکانہ تلاش کرتے ہیں۔" یہ سارا علاقہ پہاڑی تھا۔ اور جس مقام پر ڈوگرہ جاگیردار نے اپنی پر اسرار حویلی بنائی تھی وہ سارے کا سارا علاقہ اونچے اونچے دشوار گزار ٹیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں کوئی پناہ گاہ تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ جگہ جگہ کھڈیں نالے اور قدرتی غار تھے۔ شیرنی نے حویلی کے پیچھے ایک ٹیلے میں ایک غار میں ٹھکانہ بنا لیا۔ اب وہ رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ منگی اس کے پاس ہی تھی۔ اس نے شیرنی کو حویلی کے اندر کا سارا نقشہ سمجھا دیا تھا کہ کہاں کہاں کون کون سا کمرہ ہے۔ اور شارل کس کمرے میں رات کو سوتا ہے۔ باپ کا چہرہ شیرنی کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ سوچ کر اس کا خون کھول اٹھتا کہ اس حویلی میں اس کے پیارے بڑے بہادر اور باوقار باپ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنے باپ کے قاتل کے ساتھ اس حویلی کا بھی نام و نشان مٹا دینا چاہتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اس کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد باقی رہ گیا ہے کہ اپنے باپ کے قاتل کو بیدردی سے قتل کرے خواہ اس میں اس کی اپنی جان بھی کیوں نہ چلی جائے اس نے اپنی جان اپنے باپ پر پہلے ہی قربان کر رکھی تھی۔ جب رات گہری ہو گئی اور منگی نے شیرنی کو بتایا کہ اب بازار سنسان ہو گئے ہوں گے اور اسلحہ کی دکان بھی بند ہو گئی ہو گی تو شیرنی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ٹیلے کے غار سے نکلیں اور رات کے اندھیرے میں راستہ بناتیں شہر کو جانے والی سڑک کی طرف چل پڑیں۔

منگی اسلحہ کی دکان سے واقف تھی۔ اس نے شیرنی کو بتا دیا تھا کہ اسلحہ کی دکان پر کئی تالے لگے ہوئے ہیں اور رات بھر ایک مسلح چوکیدار پہرہ بھی دیتا ہے۔ شیرنی نے کہا تھا۔

"میں شیرنی ہوں۔ وہ مسلح پہریدار ایک بھیڑ ہے۔ سب سے پہلے میں اسے ہلاک کروں

گی۔"

شیرنی کی غضبناک جذباتی کیفیت دیکھ کر منگی کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اس کی کسی غلطی سے سارا منصوبہ دھرے کا دھرا نہ رہ جائے اور الٹا وہ پولیس کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ مگر شیرنی کی حالت ایسی تھی کہ وہ اس کے سامنے چپ تھی۔ اب اسے سمجھانا یا کسی قسم کی ہدایت دینا بیکار تھا۔ شیرنی نے اپنے باپ شیر خان کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ منگی شیرنی کو بازار کی پچھلی جانب سے لائی یہاں اندھیرا تھا۔ منگی نے شیرنی کو اسلحہ کی دکان دور سے دکھائی اور چوکیدار بھی دکھایا جو آگ کی انگیٹھی جلا کر دکان کے آگے بندوق لیے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ وہ بند دکانوں کے پیچھے سے ہوتی ہوئیں اسلحہ کی دکان کے عقب میں اینٹوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھ گئیں۔ شیرنی نے اردگرد کا اچھی طرح سے جائزہ لیا اور دھیمی آواز میں منگی سے کہا۔

"اس آدمی کو کسی طرح پیچھے بلانا ہو گا۔" منگی نے شیرنی کا ہاتھ دبایا اور سرگوشی کی۔

"میرے ایسی عورت کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تم یہاں اوٹ میں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔"

شیرنی اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے ہو گئی۔ اس نے کمرے کے گرد لپٹی ہوئی نائیلون کی باریک رسی کھول کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ اس رسی سے اسے مسلح چوکیدار کا کام تمام کرنا تھا۔ منگی دکان کے پیچھے سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ چوکیدار نے قدموں کی آہٹ سن کر دائیں جانب ایک عورت کو اپنی طرف آتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ کوئی فقیر قسم کی عورت ہے جو آگ تاپنے چلی آ رہی ہے۔ منگی قریب آئی چوکیدار اس کے جوگیانہ لباس سے بھی مرعوب نہ ہوا۔ وہ ہوس ناک نظروں سے منگی کی طرف تکنے لگا۔ منگی یہی چاہتی تھی۔ وہ چوکیدار کے پاس ہی سڑک پر بیٹھ گئی اور آگ پر ہاتھ تاپتے ہوئے بولی۔

"آج تو بڑی سردی ہے۔"

چوکیدار اس دوران دائیں بائیں پوری طرح دیکھ کر اطمینان کر چکا تھا کہ وہاں اور کوئی نہیں ہے اور میدان صاف ہے۔ اس نے جھک کر انگیٹھی میں لکڑی کو ہلانے کے بہانے منگی کے بازو کے ساتھ اپنا بازو لگا دیا۔ منگی نے جلدی سے بازو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی آگیا تو کیا کہے گا۔" چوکیدار شیر ہو گیا۔

"اری یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ چلو دکان کے پیچھے چل کر باتیں کرتے ہیں۔"

منگی کے ذہن میں اچانک خیال آگیا کہ ممکن ہے چوکیدار کے پاس دکان کی چابیاں ہوں۔ اگر ایسا ہو تو انہیں دکان کے تالے نہیں توڑنے پڑیں گے جو بڑا جان جوکھم کا کام تھا۔ اس نے مرد کو پاگل بنا دینے والی نظروں سے چوکیدار کی طرف دیکھا اور کہا۔

"دکان کے اندر چلتے ہیں۔ وہاں بڑے آرام سے باتیں کریں گے۔" چوکیدار جلدی سے بولا۔

چابیاں تو مالک کے پاس ہیں۔" پھر فوراً کہنے لگا۔ "تم یہیں بیٹھو۔ مجھے دکان کا پچھلا گودام والا دروازہ کھولنا آتا ہے جانا مت۔ میں ابھی آتا ہوں۔" منگی نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

"نہیں میرے راجہ' میں اب تمہاری ہوں۔"

چوکیدار کے ہاتھ سے بندوق گرتے گرتے بچی۔ اسٹول سے اٹھ کر اس نے خالی خالی نیم روشن بازار کا جائزہ لیا پھر دکان کے پیچھے چلا گیا جہاں گودام تھا اور جس کا دوسرا دروازہ دکان کے اندر ہی کھلتا تھا۔ شیرنی نے چوکیدار کو دکان کے عقبی حصے کی طرف آتے دیکھا تو چوکس ہو گئی۔ منگی کو یہی ڈر تھا کہ کہیں شیرنی چوکیدار پر حملہ نہ کر دے شیرنی اس لیے رک گئی کہ چوکیدار کو اس نے دکان کی کھڑکی والا چھوٹا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ منگی نے کوئی ڈراما رچایا ہے۔ شیرنی اینٹوں کے پیچھے ہی چھپ کر بیٹھی رہی۔ چوکیدار نے کھڑکی نما دروازے کا کیواڑ ہاتھ ڈال کر کھول لیا۔ جلدی سے واپس منگی کے پاس آگیا اور اسٹول پر بیٹھ کر انگیٹھی پر ہاتھ تاپتے ہوئے بولا۔

"میں نے گودام کی کھڑکی کھول دی ہے۔ تم پہلے پیچھے جاؤ۔ میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔" منگی نے اٹھتے ہوئے چوکیدار کا بازو بڑی محبت سے دبا دیا اور کہا۔ "جلدی آنا۔" چوکیدار کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ "جلدی جاؤ۔"

منگی نے دکان کے پیچھے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ شیرنی کو ساری اسکیم سمجھا دی۔ شیرنی کی آنکھیں اندھیرے میں واقعی شیرنی کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے کسی قسم کے

رد عمل کا اظہار نہ کیا خاموش رہی صرف اتنا کہا۔

"تم اب میری جگہ پر آجاؤ۔ تمہاری جگہ میں دکان کے اندر جاؤں گی۔"

منگی اور کوئی اعتراض کرنے لگی تو شیرنی نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس کھینچ لیا۔

"جیسے میں کہتی ہوں ویسے کرو۔ تم یہاں بیٹھو جب میں اشارہ کروں تو دکان کے اندر آجانا۔"

منگی کو ہکا بکا چھوڑ کر شیرنی تیزی سے گودام یا دکان کے ادھ کھلے عقبی دروازے یا دروازہ نما کھڑکی کے پاس گئی اور اندر داخل ہو گئی۔ منگی دھڑکتے دل کے ساتھ یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ ابھی بمشکل ایک منٹ ہی گزرا تھا کہ چوکیدار بھی بندوق کاندھے پر ڈالے یوں ٹہلتا ٹہلتا آگیا جیسے اپنے گشت پر ہو۔ دکان کے عقبی دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اس نے بڑے حساب کتاب سے دائیں بائیں ایک جائزہ لیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا تو دروازہ کھول کر دکان یا گودام کے اندر گھس گئی۔ اندر اندھیرا تھا۔ مگر اس اندھیرے میں شیرنی چوکیدار کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے منگی کو آہستہ سے پکارا۔

"اری کہاں ہو میری جان؟"

شیرنی نے اس کی جان نکالنے کا سارا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ جونہی چوکیدار اس کے قریب سے گزرا شیرنی کے دونوں ہاتھ بجلی کی تیزی سے اوپر اٹھے۔ نائیلون کی رسی نے چوکیدار کی گردن کو اپنے شکنجے میں لے لیا ایک زبردست جھٹکا لگا اور چوکیدار کی گردن ڈھلک گئی شیرنی نے اسے پرے گرا دیا۔

اس کی بندوق اٹھالی دکان سے باہر نکل کر منہ سے ہلکی سی سسکار کی آواز نکال کر منگی کو بلایا۔ منگی دوڑ کر دکان میں آگئی۔ انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ چوکیدار کی لاش اوندھی پڑی تھی۔ یہاں ایک دروازہ اسلحے کی دکان میں کھلتا تھا۔ یہ دروازہ بند تھا اور اس کی درزوں میں سے جلنے والے بلب کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ انہوں نے دروازے کو بندوق کی نالی ڈال کر کھول دیا۔ سامنے ایک کشادہ دکان تھی جس کی الماریاں اسلحے وغیرہ کے سامان سے بھری پڑی تھیں۔ شیرنی نے بندوق کی نالی کی مدد سے ایک الماری کا تالا توڑ ڈالا اور اندر سے شاٹ گنیں اور کارتوس کے ڈبے باہر نکال لیے یہاں اسے ایک شکاری

خنجر بھی مل گیا جو ریوالور کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ شیرنی نے اسے چمڑے کی پیٹی سمیت اپنی کمر کے گرد قمیص کے نیچے باندھ لیا۔ اس نے منگلی سے کہا کہ ہمیں ڈائنا مائٹ کی چھڑیوں کی ضرورت ہے مگر وہ یہاں دکھائی نہیں دے رہی۔ منگلی بھی ان ہی کی تلاش میں تھی۔

"میرا خیال ہے یہاں بارود کی چھڑیاں نہیں ہیں۔ پستولیں بندوقیں بہت پڑی ہیں۔"

ہاں شیرنی دکان کی الماریوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ باہر سڑک پر سے کوئی گاڑی گزری۔ منگلی کہنے لگی۔

"ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ باہر چوکیدار کو موجود نہ پا کر کسی کو شک پڑ سکتا ہے۔"

شیرنی ایک الماری کی طرف بڑھی۔ یہاں اسے ایک پستول نظر آیا تھا جس کے پاس ہی سائی لنسر کی فولادی نالی پڑی تھی۔ شیرنی نے پستول نکال کر نالی اس کے آگے لگا دی۔ سائی لنسر پستول میں پورا میگزین بھرا اور اپنے لباس میں اسے چھپا لیا۔

"ٹھیک ہے۔ اب یہاں سے نکل چلو جس چیز کی مجھے زیادہ ضرورت تھی وہ یہاں نہیں ہے۔"

وہ جلدی جلدی دکان کے پچھلے دروازے سے نکلیں اور اندھیرے میں واپس روانہ ہو گئیں۔ دونوں شارٹ گنیں اور میگزین کے دو ڈبے شیرنی نے اپنی چادر میں چھپا کر اپنے ساتھ لگا رکھے تھے۔ منگلی راستہ دکھا رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ پہاڑی ٹیلے میں اپنی پناہ گاہ میں بیٹھی تھیں۔ شیرنی نے دونوں گنوں میں میگزین بھر لیا تھا۔ منگلی نے اسے شارل کا پورا حلیہ ایک بار پھر بتایا اور کہنے لگی۔

"مگر اس وقت میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ میں اسے ہزاروں آدمیوں میں پہچان سکتی ہوں۔"

منگلی کا خیال تھا کہ وہ شیرنی کو صبح دن کی روشنی میں حویلی کے آس پاس لے جا کر اسے اس کی در و دیوار اور موقع دکھا دے مگر شیرنی اسی وقت اپنے باپ کے قاتل کو ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ منگلی نے کہا۔

"میں بھی یہی چاہتی ہوں شیرنی! مگر میں صرف اتنی تسلی کر لینا چاہتی ہوں کہ شارل

حویلی میں ہی ہے اور جس کمرے میں ہم دھاوا بولیں گی وہ اسی کمرے میں ہو گا۔ دوسری بات ہمیں یہ نہیں بھولنی چاہیے کہ میرے فرار کے بعد حویلی کی حالت اب پہلے جیسی نہیں رہی اور شارل بھی محتاط ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ اسے پتا ہے کہ میں شیر خان کو پیار کرتی تھی۔ اس کے قتل کے بعد حویلی سے فرار ہو چکی ہوں۔ اس اعتبار سے میں اس سے شیر خان کے خون کا بدلہ لے سکتی ہوں۔ چنانچہ بہت ممکن ہے کہ وہ حویلی سے چلا گیا ہو۔ یا پھر کسی خفیہ تہ خانے میں رات بسر کرتا ہو۔" شیرنی نے جھنجھلا کر کہا۔

"تم اس طرح وقت ضائع کر دو گی۔" منگلی نے کہا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ ہمیں کم از کم اس شخص کے بارے میں جس کو ہم ہلاک کرنے یہاں آئے ہیں پتا تو ہونا چاہیے کہ وہ کہاں پر رات کو سوتا ہے؟" شیرنی نے بے دلی سے پوچھا۔

"یہ تم کیسے پتا کرو گی؟ تم تو یہاں میرے پاس بیٹھی ہوئی ہو۔"

"اس کی ایک ترکیب میں نے سوچ لی ہے۔" منگلی نے جواب دیا۔

"وہ کیا ہے؟" منگلی کہنے لگی۔

"سندراں نام کی ایک عورت حویلی میں کھانا وغیرہ پکاتی ہے۔ وہ میری بڑی ہمدرد تھی اکثر میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے بڑی ہمدردی کی باتیں کرتی تھی وہ رات کو کام وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے گھر آ جاتی ہے جو یہاں سے تھوڑی دور ایک پہاڑی گاؤں میں ہے۔ اس سے شارل کے بارے میں سارا پتہ چل سکتا ہے کہ وہ رات کو حویلی میں کس جگہ سوتا ہے۔ وہ ہمارے لیے حویلی میں داخل ہونے کی سہولت بھی مہیا کر سکتی ہے۔" شیرنی نے تھوڑا سا غور کیا اور کہا۔

"تو پھر اس کے گاؤں ابھی چلتے ہیں۔ یہاں وقت ضائع کرنا فضول ہے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں میری طرف سے ابھی چلے چلتے ہیں۔"

چنانچہ وہ دونوں ٹیلے کے غار سے نکلیں اور سندراں کے گاؤں کی طرف چل پڑیں جو وہاں سے تین کوس کے فاصلے پر ایک برساتی نالے کے قریب واقع تھا۔ منگلی ایک دفعہ سندراں کے مکان پر جا چکی تھی۔ یہ مکان کیا تھا ایک جھونپڑا سا بنا ہوا تھا۔ جس میں

سندراں زندگی کے باقی دن گزار رہی تھی۔ وہ بوڑھی ہو رہی تھی۔ کوئی اولاد نہیں تھی۔ خاوند ڈوگرہ جاگیردار کی خدمت کرتے کرتے مر گیا تھا۔

اندھیری رات میں دونوں سہیلیاں سندراں کی جھونپڑی کے باہر آکر رک گئیں۔

سندراں دن بھر کے کام کاج سے تھک ٹوٹ کر گہری نیند سو رہی تھی۔ منگی نے جھونپڑی میں جا کر اسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ منگی نے دیے کی لو اونچی کر دی اور کہا۔

"سندراں! میں ہوں منگی مجھے پہچانا نہیں؟" سندراں لحاف ہٹا کر چارپائی پر اٹھ بیٹھی

"منگی ہو تم؟ یہاں کیسے آگئیں۔ تمہیں تو اس علاقے سے بھاگ جانا چاہیے تھا۔" پھر اس نے شیرنی کی طرف دیکھا۔ "یہ کون ہے؟"

منگی نے کہا۔

"یہ میری بہن ہے۔"

"تم اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو؟" سندراں نے حیران ہو کر پوچھا۔ منگی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"سندراں ماسی ہم تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آئی ہیں۔" منگی نے شیرنی کو مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سندراں سے کہنے لگی۔

"سندراں! تم مجھے اچھی طرح سے جانتی ہو۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے ظالم ڈوگرے کی قید سے رہائی دلانے کے لیے میرا خاوند آیا تھا جس کو ڈوگرے کے دوست شارل نے گولی مار کر مار ڈالا۔ اب میں تم سے اتنا پوچھنے آئی ہوں کہ مجھے صرف یہ بتا دو کہ شارل حویلی میں رات کو کس جگہ سوتا ہے۔ اور پھر کل کس وقت حویلی میں داخل ہونے میں ہماری مدد بھی کرو میں شارل سے اپنے آدمی کے خون کا بدلہ لینا چاہتی ہوں۔"

"اری منگی تو اس ولایتی انگریز کی بات کر رہی ہے جس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی؟"

"ہاں ماسی وہی۔ اس نے میرے آدمی کا خون کیا ہے میں اس سے بدلہ لینا چاہتی ہوں۔"

"تم نے دیر کر دی منگی۔ وہ ولایتی انگریز تو کل ہی بمبئی چلا گیا تھا۔" منگی نے انتہائی مایوسی کی نظروں سے شیرنی کی طرف دیکھا۔ شیرنی کا چہرہ ساکت اور پر سکون تھا۔

"تم یقین سے کہہ رہی ہو سندراں کہ وہ گورا ولایتی بمبئی چلا گیا ہے۔" سندراں نے ماتھے پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"منگی! میری ساری عمر ڈوگرہ راجہ کے اس کنجر خانے میں گزر گئی ہے۔ مجھے سب پتا ہوتا ہے کون کہاں سے آیا اور کہاں جا رہا ہے۔ اور پھر وہ ولایتی گورا تو مجھے سو روپیہ انعام بھی دے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا تم کھانا بڑا اچھا بناتی ہو۔ میرے ساتھ بمبئی چلو گی۔ میں نے کہا میری جوتی جاتی ہے۔" اب شیرنی نے پوچھا۔

"ماسی! تمہیں معلوم ہے وہ بمبئی میں کہاں جا کر ٹھہرا ہو گا؟" سندراں بولی۔

"جانے میری بلا وہ کہاں جا کر رہے گا۔ اری بمبئی میں راجہ کا ایک بنگلہ ہے۔ راج محل کہتے ہیں اسے وہیں جا کر ٹھہرے گا اور کہاں جائے گا۔"

"وہ اکیلا گیا تھا؟" منگی نے سوال کیا۔

"ہاں حویلی سے تو گاڑی میں اکیلا ہی گیا تھا۔" شیرنی راج محل کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"ماسی سندراں! کیا تم بتا سکتی ہو راج محل بمبئی میں کس علاقے میں ہے؟"

منگی نے بھی شیرنی کے سوال کی تائید کی۔

"ہاں ماسی! یہ بہت ضروری ہے۔ اگر تمہیں معلوم نہیں تو ہمیں حویلی سے معلوم کر کے بتا دینا۔"

سندراں نے ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔

"مجھ سے زیادہ کس کو معلوم ہو گا۔ میں تو خود راج محل میں ایک بار چھ مہینے، ایک بار دو مہینے راجہ کے ساتھ گزار چکی ہوں۔" منگی نے بے تابی سے کہا۔

"تو پھر ہمیں بتاؤ یہ راج محل کہاں پر ہے؟" سندراں نے کہا۔

"جب تم بمبئی کے بڑے اسٹیشن پر اترو گی تو وہاں کسی بگھی والے، کسی ٹیکسی والے سے راج محل کا پوچھ لینا۔ وہ تمہیں وہاں پہنچا دے گا۔ نہیں تو تم اندھیری نام کے علاقے میں چلی جانا۔ وہاں سے تمہیں کوئی بھی راج محل کا پتا بتا دے گا۔" شیرنی گہرا سانس بھر کر بولی۔

"منگی بہن! ہمیں اسی وقت ریلوے اسٹیشن پہنچ جانا چاہیے۔ شاید کوئی ریل گاڑی مل جائے جو ہمیں جموں شہر سے لے جائے۔" سندراں کہنے لگی۔

"ہو تو تم منگی کی بہن مگر لگتا ہے تمہیں یہاں کی ریل گاڑیوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ تمہیں صبح چھ بجے سے پہلے کوئی گاڑی نہیں ملے گی۔ چھ بجے ایک ریل گاڑی دلی کو جاتی ہے۔"

پھر وہ منگی کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"منگی! تیرے پیچھے تو راجہ کے غنڈے لگے ہوئے ہیں۔ تو دن کی روشنی میں پکڑی جائے گی ایسا کر کہ دن میری جھونپڑی میں رہ جا۔ شام ہو جائے تو چلی جانا۔ شام کے وقت ایک ریل گاڑی جالندھر پٹیالے کو جاتی ہے۔" منگی نے شیرنی کو مشورہ دیتے ہوئے کہا

"میرے خیال میں ماسی ٹھیک کہتی ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح دن یہیں گزار دینا چاہیے۔" شیرنی نے اندیشے کا اظہار کیا۔

"اور اگر وہ آدمی ہاتھ سے نکل گیا تو؟"

"وہ کہیں نہیں جاتا۔" منگی بولی۔ "وہ بمبئی میں ہی مل جائے گا۔" سندراں کہنے لگی۔

"ہاں ہاں وہ ابھی وہیں ٹھہرے گا۔ جب کبھی ادھر آتا ہے تو بمبئی میں بھی کچھ دن ضرور گزارتا ہے۔ اس کے بعد ولایت چلا جاتا ہے۔" شیرنی کو منگی کے ساتھ ساتھ دن کی روشنی میں اپنے پکڑے جانے کا بھی خطرہ تھا۔ چھ بجے دن نکل آیا ہوتا ہے۔ اس نے وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سندراں نے اٹھ کر پرانے صندوق سے ایک لحاف نکال کر انہیں دیا اور کہا۔

"یہیں سو جاؤ لحاف اوڑھ کر۔"

منگلی اور شیرنی وہیں زمین پر بچھی چٹائی پر لحاف اوڑھ کر لیٹ گئیں۔ وہ بے حد تھکی ماندی تھیں۔ سردی بھی انہیں خوب لگی تھی۔ پیدل چل چل کر برا حال ہو گیا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی سو گئیں۔ صبح اٹھیں تو دن کافی نکل آیا تھا۔ سندراں ان کے لیے مکئی کی روٹی اور چائے لے آئی۔ انہوں نے جھونپڑی کے اندر ہی ناشتہ کیا۔ منگلی نے کہا۔

"ماسی! یہاں گاؤں میں ہمارے بارے میں کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔" سندراں بولی۔

"میں کوئی بیوقوف نہیں ہوں۔ یہ ساری باتیں جانتی ہوں۔ تم آرام سے یہاں پڑی رہو۔ آج میں حویلی سے بھی دوپہر کے بعد واپس آجاؤں گی۔" سندراں ان دونوں کو جھونپڑی میں چھوڑ کر راجہ کی حویلی کی طرف چل دی۔ سندراں کے جانے کے بعد منگلی شیرنی سے کہنے لگی۔

"شیرنی! اس علاقے سے ہم جا تو رہے ہیں مگر اس علاقے کے جنگلوں پہاڑیوں میں جو جڑی بوٹیاں ہیں وہ ہندوستان کے کسی علاقے میں نہیں ملتیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں بیٹھو میں ان پہاڑیوں کا ایک چکر لگا کر آؤں۔ شاید کچھ قیمتی جڑی بوٹیاں مل جائیں یہ بمبئی میں ہمارے کام آسکتی ہیں۔"

شیرنی کو جڑی بوٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے منگلی کو بھیج دیا مگر تاکید کی کہ وہ آبادی کی طرف نہ جائے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سردی دھوپ کی وجہ سے کم ہو گئی تھی۔ منگلی ٹیلوں کے درمیان جھاڑیوں میں ادھر ادھر پھرنے لگی۔ اس کی تجربہ کار تیز آنکھیں ایک ایک جڑی بوٹی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ برساتی نالے کے دوسری طرف آگئی۔ یہاں اس کی نظر سانپ کے زہر کے تریاق والی بوٹی پر پڑی۔ اس نے اس کے پھولوں میں سے بوٹی کے کتنے ہی دانے نکال کر تھیلے میں سنبھال کر رکھ لیے۔ اچانک اسے وہ بوٹی نظر آگئی جس کے زہر سے وہ لنکا میں زہریلے تیر تیار کیا کرتی تھی۔ اس نے وہ بوٹی بھی توڑ کر اپنے پاس رکھ لی۔ دوپہر کو وہ واپس جھونپڑی میں آگئی۔ کچھ دیر بعد سندراں بھی پہنچ گئی۔ منگلی نے شیرنی کو دونوں جڑی بوٹیاں دکھائیں۔ سندراں ان کے لیے حویلی ہی سے پراٹھے پکا کر لے آئی تھی۔ جو سب نے مل کر کھائے سندراں کہنے لگی۔

"میں نے پتا کرا لیا ہے۔ دلی جانے والی گاڑی اسٹیشن سے پونے سات بجے چھوٹتی ہے۔"

"اچھا ہے۔" منگلی بولی۔ "اتنی دیر تک اندھیرا ہو جائے گا۔" سندراں نے منگلی کو بتایا کہ غنڈے اس کی تلاش میں امرتسر جالندھر کی طرف پہنچ گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے اسے راستے میں ہوشیار رہنا پڑے گا۔ منگلی نے زہریلی جڑی بوٹیوں کے زہر سے بانس کے کچھ تیر بنانے کا سوچا مگر یہاں اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ بوٹی کو پیس کر زہر کا سفوف بناتی اور بانس کی تیلیاں چھیل کر اس کی زہریلی سوئیاں تیار کرتی۔ انہوں نے شاٹ گنیں وہیں غار میں پھینک دی تھیں۔ شیرنی نے اپنے پاس صرف ایک سائیلنسر والا پستول ہی رکھا ہوا تھا۔ خنجر اس نے قمیص کے اندر کمر کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ منگلی کے پاس اپنے بچاؤ کے واسطے کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس کا خیال ایک بار پھر سانپوں کی طرف چلا گیا۔ اگر وہ اپنے پاس کوئی زہریلا سانپ رکھ لے تو یہ بڑا اچھا ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ سانپ کے تریاق والی بوٹی شیرنی کو بھی کھلا سکتی تھی۔ مگر وہاں اب سانپ پکڑنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ دیکھتے دیکھتے دن غروب ہو گیا۔ سندراں کہنے لگی۔

"میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ تمہارا اکیلے جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔ تم ایسا کرو ریلوے لائن کی طرف سے پلیٹ فارم پر پہنچو میں تمہارے ٹکٹ لے کر وہاں آجاؤں گی۔"

شیرنی نے سندراں کو کچھ روپے دیے اور منگلی کے ساتھ شام کے گہرے ہوتے اندھیرے میں جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔ دونوں نے کھدر کی نسواری اور کالے رنگ کی چادریں اس طرح اوڑھ رکھی تھیں کہ ان کے چہرے زیادہ نظر نہیں آتے تھے۔ سندراں گاؤں کی دوسری طرف سے ریلوے اسٹیشن کی طرف پہلے ہی روانہ ہو چکی تھی۔ سندراں نے بڑی عقلمندی سے کام لیا تھا۔ کیونکہ جب وہ اسٹیشن پر آئی تو وہاں پولیس موجود تھی اور آنے جانے والے مسافروں کی کڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ سندراں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں عورتوں نے رات کو اسلحہ کی ایک دکان بھی توڑی تھی۔ منگلی اور شیرنی کھیتوں میں ریلوے لائن کے ساتھ دور تک چلتی گئیں۔ کافی آگے جا کر وہ اوپر ریلوے ٹریک پر

چڑھ گئیں اور پھر واپس اسٹیشن کی طرف چلنے لگیں۔ پلیٹ فارم پر ایک گاڑی کھڑی تھی جس میں مسافر اپنا اپنا سامان وغیرہ رکھوا رہے تھے۔ کافی رش تھا۔ منگلی نے شیرنی کو ایک جگہ بنچ پر بٹھا دیا۔ کیونکہ اس کے لئے یہ جگہ منگلی کے مقابلے میں اجنبی تھی۔ خود مسافروں کے بیچ سے گزرتی ہوئی گیٹ کی طرف جا رہی تھی کہ سندراں نے پیچھے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

"میں ادھر ہوں۔" سندراں ان دونوں کے لیے جموں سے جالندھر تک کے دو ٹکٹ لے کر آئی تھی۔ اس نے منگلی سے شیرنی کے بارے میں پوچھا۔

"وہ ادھر بنچ پر بیٹھی ہے۔"

سندراں نے کہا۔ "باہر پولیس موجود تھی۔ اچھا ہوا کہ تم گیٹ کی طرف سے نہیں آئیں۔ یہ ٹکٹ لو اور جتنی جلدی ہو سکے کسی ڈبے میں گھس جاؤ باہر مت بیٹھی رہنا۔ میں جاتی ہوں۔"

منگلی ابھی سندراں کا شکریہ بھی ادا نہیں کر پائی تھی کہ سندراں مسافروں کی بھیڑ میں غائب ہو گئی۔ وہ تیزی سے شیرنی کے پاس آئی اور پھر دونوں ایک زنانہ ڈبے میں آ کر کونے میں مسافروں کے اسباب کے پاس بیٹھ گئیں۔ حلیے اور لباس سے وہ دیہاتی عورتیں لگ رہی تھیں۔ سائیلنسر والا پستول اور خنجر شیرنی نے لباس کے اندر چھپا رکھا تھا۔ اوپر سے وہ بڑے بھولے بھالے انداز میں دیہاتی عورت کی طرح بیٹھی تھی۔ منگلی کا لباس اب جوگنوں والا نہیں تھا۔ اس نے بھی دیہاتی عورتوں کی طرح شلوار قمیض اور گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ایک چھوٹا سا تھیلا اس کے پاس تھا جس میں سانپ کے تریاق اور زہریلے تیر تیار کرنے والی جڑی بوٹیاں تھیں۔ ریل گاڑی چل پڑی۔ شیرنی نے خدا کا شکر ادا کیا اور چادر سے منہ سر اچھی طرح ڈھانپ لیا کیونکہ موسم سرد تھا۔ گاڑی کے چلتے ہی مسافر عورتوں نے کھڑکیوں کے شیشے وغیرہ چڑھا دیے۔ جس سے ڈبے کی فضا نیم گرم ہو گئی۔ راستے میں ٹرین کو ریلوے ٹریک کی مرمت اور کسی ٹوٹے ہوئے پہاڑی نالے کے پل کی وجہ سے کئی بار رکنا پڑا جس کی وجہ سے ٹرین لیٹ ہو گئی۔ اور دن کو نو بجے جالندھر پہنچی۔ دونوں تھرڈ کلاس کے زنانہ ویٹنگ روم میں آ گئیں۔

ویٹنگ روم میں آ کر انہوں نے ناشتہ کیا اور بنچ پر بیٹھیں ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑ کر باتیں کرتی رہیں۔ منگلی جب پلیٹ فارم کی کنٹین پر ناشتہ وغیرہ لینے گئی تھی تو اس نے بمبئی جانے والی گاڑی کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ شام سے پہلے وہاں سے سیدھی بمبئی جانے والی کوئی گاڑی انہیں مل سکتی تھی۔ تین گاڑیاں دلی جانے والی انہیں مل سکتی تھیں۔ جن میں سے ایک گاڑی ایک گھنٹے بعد امرتسر سے آ رہی تھی۔ شیرنی اور منگلی نے آخر یہی طے کیا کہ وہ اس گاڑی میں بیٹھ کر دلی جائیں گی۔ وہاں سے پھر بمبئی جانے والی کوئی ٹرین پکڑ لیں گے۔

منگلی باہر جا کر دلی تک کے دو ٹکٹ خرید کر لے آئی۔ شیرنی خاص طور پر بڑی محتاط تھی۔ اور تیز نگاہوں سے کسی کسی وقت ماحول کا جائزہ لے لیتی تھی۔ جب امرتسر سے ٹرین آئی تو پلیٹ فارم پر آ گئیں۔ ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گئیں اور تھوڑی دیر بعد ٹرین اسٹیشن سے چل دی۔ پنجاب سے نکلنے کے بعد ان کا سفر نسبتاً محفوظ ہو گیا تھا۔ شیرنی کبھی کبھی اس تشویش کا اظہار کرتی کہ شارل کہیں بمبئی سے آگے کسی دوسرے ملک کی طرف نہ نکل گیا ہو۔ جس پر منگلی اسے تسلی دیتی کہ فکر نہ کرو۔ وہ جہاں بھی جائے ہم موت بن کے وہاں پہنچ جائیں گی۔ شیرنی نے کہا۔

"ہمارے پاس کوئی پاسپورٹ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ ہم یہ ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک نہیں جا سکیں گے۔ اس لیے شارل کا بمبئی میں موجود ہونا بڑا ضروری ہے۔"

ٹرین دلی کی طرف جاتے ہوئے اتر پردیش کے میدانوں اور کھیتوں میں داخل ہو چکی تھی۔ منگلی نے کہا۔

"تم کیوں فکر کرتی ہو۔" ہمارا شکار بمبئی کے راج محل میں ہی ہو گا۔"

موضوع بدلنے کی خاطر منگلی شیرنی کو ان جڑی بوٹیوں کے خواص کے بارے میں بتانے لگی جو اس نے جموں کی پہاڑیوں سے جمع کر کے تھیلے میں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے سانپ کے تریاق والی بوٹی کے متعلق تو شیرنی کو وہ پہلے ہی باخبر کر چکی تھی۔ کہنے لگی۔

"اس کا پھل تمہیں بمبئی پہنچ کر کھلا دوں گی۔ باقی جو دوسری بوٹی ہے۔ اس کو پیس کر چھان کر زہریلا سفوف تیار کر کے اسے پانی میں گھول کر بانس کی سوئیوں کے آگے لگانا ہو

گا۔ پھر اس کو دشمن پر پھینکنے کے لیے ایک پھونکنی بھی تیار کرنی ہو گی۔" شیرنی نے کہا۔

"یہ بک بک تم کیسے کر سکوں گی؟ بہتر یہی ہے کہ اس کی دس بارہ زہریلی سوئیاں تیار کر کے اپنے پاس رکھ لو۔ کوئی ایسا وقت پڑا تو دشمن کو چبھو دینا۔ مجھے تمہاری ان زہریلی سوئیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس خنجر اور پستول موجود ہے میں ان سے دشمن کو ہلاک کر سکتی ہوں۔" منگلی ہنس کر بولی۔

"میری پیاری شیرنی! یہ اپنے پاس رکھ لو جہاں تیرے خنجر پستول جواب دے جائیں گے میری یہ جڑی بوٹی بڑے کام آئے گی۔ اسے اپنے پاس رکھ لو۔" مگر شیرنی نے انکار کر دیا۔

"یہ تم ہی اپنے پاس رکھو۔" ٹرین دلی پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ شیرنی کے پاس اب زیادہ کرنسی نوٹ نہیں رہے تھے۔ انہیں دلی سے بمبئ تک کا کرایہ درکار تھا۔ تھرڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں آکر شیرنی نے تھیلی میں سے تہہ کئے ہوئے نوٹ نکال کر گنے۔ یہ کل اڑھائی سو روپے بنے تھے۔ منگلی نے کہا۔

"یہ روپے ہمارے لیے کافی ہیں۔ بمبئ پہنچ کر کوئی بندوبست کر لیں گے۔"

ویٹنگ روم میں ہی دونوں نے کھانا کھایا۔ معلوم ہوا کہ بمبئ جانے والی گاڑی دلی سے صبح سات بجے چلے گی۔ اب انہیں رات وہیں گزارنی تھی۔ منگلی کہنے لگی۔

"یہیں ویٹنگ روم میں پڑے رہیں گے۔ یہاں سے باہر جانا مناسب نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہاں زیادہ سردی بھی نہیں لگ رہی۔" منگلی بولی۔

"بمبئ میں تو موسم بڑا خوشگوار ہو گا بلکہ دن کے وقت گرمی بھی لگتی ہے۔ میں وہاں کئی بار جا چکی ہوں اس موسم میں بمبئ شہر کا موسم بڑا اچھا لگتا ہے مجھے۔"

شیرنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صرف یہی سوچ رہی تھی کہ اگر اس کے باپ کا قاتل شارل بمبئ سے جا چکا ہو گا تو پھر وہ کیا کرے گی؟ جس ملک میں وہ گیا ہے اس ملک کا ویزا اور پاسپورٹ وغیرہ کہاں سے بنوائے گی۔ اس سلسلے میں منگلی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ شیرنی پڑھی لکھی عورت تھی جب کہ منگلی بہادر اور دلیر ضرور تھی مگر وہ صرف خط نہ پڑھ سکتی تھی۔ وہ بھی ہندی کی لکھائی والا۔ اردو کے حروف بڑی مشکل سے اٹھاتی تھی۔

انہوں نے ویٹنگ روم کے ایک بنچ پر ہی رات گزارنے کو جگہ بنا لی۔ وہاں دوسری مسافر عورتیں بھی اپنے سامان اور بال بچوں کے ساتھ موجود تھیں جن کی وجہ سے ماحول میں کافی شور مچا ہوا تھا۔ یہ ساری باتیں شیرنی کے حق میں جاتی تھیں اس طرح کسی پولیس والے کا ادھر خیال نہیں جا سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ پنجاب سے نکل آئی تھیں۔ جہاں اس کے گرفتار ہونے کا زیادہ خطرہ تھا۔ کسی نہ کسی طرح انہوں نے رات بسر کر لی۔ دن نکلا تو پتہ چلا کہ بمبئ جانے والی گاڑی چار گھنٹے لیٹ ہے۔ شیرنی نے سر پکڑ لیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس کے باپ کا قاتل اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ منگلی یہاں بھی اس کی ڈھارس بندھاتی رہی۔ مگر اندر سے وہ بھی پریشان تھی کہ اگر شارل بمبئ کے راج محل سے چلا گیا ہو گا تو وہ کیا کرے گی۔

بہرحال انہیں وہیں ویٹنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرنا تھا۔ چار گھنٹے بعد گاڑی آ گئی۔ شاید یہ ٹرین کلکتے سے آ رہی تھی۔ ٹکٹ انہوں نے پہلے ہی سے خرید کر رکھ لیے تھے۔ ٹرین میں بڑا رش تھا۔ لیٹ ہونے کی وجہ سے رش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شیرنی اور منگلی کو ایک زنانہ ڈبے میں جگہ مل گئی۔ خدا خدا کر کے گاڑی دلی سے چلی آگے بڑا لمبا سفر تھا۔ ڈبے میں ان کے پاس رات کو سونے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مگر جب رات ہو گئی تو ڈبے سے کچھ مسافر عورتیں اتر گئیں اور شیرنی منگلی کے لیے ایک برتھ خالی ہو گئی۔

شیرنی نے منگلی سے کہا کہ تم اوپر جا کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ تمہارے بعد میں لیٹ جاؤں گی۔ منگلی برتھ پر چڑھ کر لیٹ گئی۔ چلتی گاڑی میں اسے جلدی نیند آ گئی۔ ٹرین رات کے اندھیرے میں چھوٹے چھوٹے، قصبوں، کھیتوں، جنگلوں میں گزرتی جا رہی تھی۔ شیرنی اپنی سیٹ پر ہی بیٹھی رہی۔ دوسری عورتیں جہاں بیٹھی تھیں وہیں گردنیں لٹکائے سو رہی تھیں۔ رات کے ایک بجے ایک بڑے شہر کے اسٹیشن پر ٹرین رکی تو منگلی کی آنکھ کھل گئی۔ اوپر سے جھانک کر شیرنی کو دیکھا۔ پھر نیچے اتر آئی اور بولی۔

"اب تم اوپر جا کر سو جاؤ۔ ابھی کل کا پورا دن سفر کرنا ہے۔ کل رات کو کسی وقت بمبئ پہنچیں گے۔" شیرنی کو واقعی نیند آ رہی تھی۔ وہ برتھ پر چڑھ کر سو گئی۔ ڈبے کی اکثر عورتیں سو رہی تھیں۔ یہ کوئی بڑا اسٹیشن تھا۔ منگلی کو چائے کی طلب ہوئی۔ وہ ٹرین سے اتر کر

پلیٹ فارم پر چائے کی کنٹین تلاش کرنے لگی۔ پلیٹ فارم پر کافی مسافر تھے جو ڈبوں میں سوار ہو رہے تھے۔ منگلی ٹرین کے پچھلے ڈبوں کی طرف آگئی۔ یہاں کونے میں اسے ایک چائے کی کنٹین نظر آگئی۔ کچھ مسافر پہلے سے وہاں کھڑے چائے پی رہے تھے۔ عورت وہاں کوئی نہیں تھی۔ وہ تو ایک مرد قسم کی عورت بن چکی تھی۔ ساری زندگی جنگلی درندوں اور جنگل کے ماحول میں گزری تھی۔ وہ بے دھڑک کنٹین کے کاؤنٹر پر آگئی اور چائے کے لیے کہا کاؤنٹر کے کونے پر ایک گرانڈیل قسم کا مشکوک شکل و صورت والا آدمی پہلے سے چائے پی رہا تھا۔ اس نے غور سے منگلی کو دیکھا۔ پھر چائے کا گلاس خالی کر کے کاؤنٹر پر رکھا اور منگلی کے قریب آکر کہنے لگا۔

"کہاں جا رہی ہو شریمتی جی۔" منگلی سمجھ گئی کہ یہ کوئی اوباش قسم کا آدمی ہے۔ فوراً بولی۔

"شریمتی نہیں بہن جی کہو۔" وہ آدمی کچھ شرمسار ہو کر بولا۔

"میرا مطلب تھا کہ تم پنجاب سے آئی ہو میں بھی پنجاب کا رہنے والا ہوں۔"

وہ منگلی سے اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں کرتا رہا جس کا منگلی بڑے اعتماد سے جواب دیتی رہی۔ اس نے چائے پی کر پیسے ادا کیے اور اپنے ڈبے کی طرف چل دی۔ وہ آدمی سر کھجاتا دوسری طرف چلا گیا۔ منگلی ڈبے میں آکر بیٹھ گئی اور پلیٹ فارم پر اس آدمی کو تکتی رہی کہ کہیں وہ کسی پولیس والے سے تو بات نہیں کرتا۔ مگر ایسی کوئی بات نہ تھی۔ انجن نے سیٹی دی۔ گارڈ نے ہری جھنڈی لہرائی اور ٹرین اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔ دوسرے روز بھی ان کا سفر جاری رہا۔ گاڑی رات کے وقت بمبئی کے بہت بڑے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ وہ رات انہوں نے اسٹیشن کے قریب ہی ایک گوردوارے میں بسر کی۔ اگلے دن منگلی نے شیرنی کو گوردوارے میں ہی رہنے کو کہا اور خود راج محل میں شارل کی موجودگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ ٹیکسی والے کو راج محل کا نام بتا دینا ہی کافی تھا۔ وہ منگلی کو وہاں لے گیا۔ اس نے ٹیکسی کچھ دور ہی رکوائی اور پھر ٹیکسی چھوڑ دی۔

یہ ایک بڑی کشادہ دو منزلہ کوٹھی تھی جس کے آگے بہت بڑا باغ تھا۔ کوٹھی پرانے طرز کی تھی۔ احاطے کی دیوار کافی اونچی تھی اور ساتھ ساتھ پام کے اونچے اونچے درخت لگے تھے۔ لوہے کا جنگلے والا دروازہ تھا جس کے باہر ایک ڈھیلی ڈھالی خاکی وردی والا آدمی پہرہ دے رہا تھا۔ منگلی نے کوٹھی کے احاطے کی دیوار کے چاروں طرف ایک چکر لگایا۔ یہاں رات کے اندھیرے میں کسی بھی جگہ سے دیوار پار کر کے اندر جایا جا سکتا تھا۔ درختوں کی شاخیں اور پرانی بیلیں دیوار پر جھکی ہوئی تھیں۔ اب اسے شارل کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ وہ گیٹ کے پاس آگئی۔ چوکیدار شکل و صورت سے ڈوگرہ معلوم ہوتا تھا۔ جب منگلی نے اسے پرنام کر کے اس سے بات کی تو اس کا قیاس درست نکلا۔ چوکیدار چنبے کا رہنے والا تھا۔ منگلی نے اپنے آپ کو بھی چنبے کے ایک گاؤں کی رہنے والی ظاہر کیا اور کہا کہ میرا آدمی مجھے دلی سے بمبئی سیر کرانے لایا تھا۔ وہ بازار کی بھیڑ بھاڑ میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ڈوگرے چوکیدار نے اوپر سے نیچے تک منگلی کو دیکھا۔ اسے منگلی میں کافی دلکشی نظر آئی۔ کہنے لگا۔

"کوئی فکر نہ کرو۔ تم وہ سامنے میری کوٹھری میں چل کر بیٹھو میں تمہارے آدمی کا پتا کراتا ہوں۔ اس کا حلیہ اور نام بتا دو۔"

منگلی نے یونہی ایک فرضی نام اور حلیہ بیان کر دیا۔ چوکیدار اسے احاطے کی دیوار کے ساتھ ہی پیچھے کی طرف ایک چھوٹی سی کٹیا میں لے آیا جہاں لوہے کی ایک چارپائی پر میلا سا بستر لگا تھا۔ ایک اسٹول پر پانی سے بھری ہوئی صراحی رکھی تھی۔ سلاخوں والی کھڑکی کے ساتھ دیوار پر شیشہ لٹک رہا تھا۔ رسی پر ایک تولیہ نیکر اور بنیان لٹک رہے تھے۔

"تم یہاں بیٹھ کر آرام کرو۔ میں تمہارے آدمی کا پتا کر کے آتا ہوں۔ فکر نہ کرو۔ اگر وہ نہ ملا تو میں ریڈیو پر اعلان کرا دوں گا۔ یہاں کا پتا بھی لکھا دوں گا۔ وہ خود اسے یہاں آکر چھوڑ جائیں گے۔" منگلی بولی۔

"بھگوان تمہارا بھلا کرے جلدی پتا کر کے آنا۔" چوکیدار چلا گیا۔ اس نے گیٹ کا دروازہ بند کر دیا۔ اسے جانا کہاں تھا۔ اِدھر اُدھر سے چکر لگا کر بیڑی پیتا واپس آگیا۔ کٹیا میں داخل ہوتے ہی خوش ہو کر بولا۔

"لو بھئی تمہارے آدمی کا نام حلیہ سب کچھ بتا دیا ہے۔ دو بار ریڈیو پر اعلان ہو گا۔ بس شام تک پولیس کے آدمی اسے یہاں خود آکر چھوڑ جائیں گے۔" منگلی جانتی تھی کہ وہ بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ مگر منگلی کو اس چوکیدار سے بڑی اہم معلومات حاصل کرنی تھی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے راج محل کی باتیں شروع کر دیں۔ یہاں کون راجہ رہتا ہے۔ اس کی رانی کیسی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ چوکیدار اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"بیڑی پیو گی۔"

"نہیں میں تمباکو نہیں پیتی۔" چوکیدار چائے بنانے لگا اور ساتھ ساتھ منگلی پر حملے کے لیے منصوبہ بندی تیار کرنے لگا۔ منگلی نے کہا۔

"میرا آدمی بتاتا تھا کہ یہاں ایک راج محل ہے جس کے اندر راجہ رہتا ہے اور ولایتی انگریز بھی وہاں آتے ہیں۔ کیا یہاں انگریزوں کا بادشاہ بھی آتا ہے؟" چوکیدار نے کہا۔

"اری نہیں۔ انگریزوں کا بادشاہ یہاں نہیں آتا۔ مگر ولایت کے آدمی ضرور آتے جاتے رہتے ہیں ان کو ہمارے راجہ صاحب سے کام جو ہوتا ہے۔ یہ لو چائے پیو۔"

چوکیدار نے کیتلی میں سے چائے گلاس میں ڈال کر منگلی کو دی۔ منگلی چائے کا گھونٹ بھر کر بولی۔

"مگر میں نے یہاں تھوڑی دیر پہلے ایک گورے کو دیکھا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ بڑا ہٹا کٹا تھا۔ وہ کون ہے تمہارا؟" چوکیدار جو اپنے گلاس میں چائے کی جگہ تاڑی پی رہا تھا اور جو اس سے پہلے بازار سے بھی تاڑی کے دو گلاس چڑھا آیا تھا ہاتھ کو جھٹک کر بولا۔

"اری وہ تو ولایتی غنڈہ ہے۔ شالا شالا اس کا نام ہے۔ بڑا لعنتی ہے۔ ہر وقت نشے میں دھت رہتا ہے۔"

منگلی نے چوکیدار کو آتے ہی بھانپ لیا تھا کہ یہ تاڑی چڑھا آیا ہے اور اب بھی اسے پتا چل چکا تھا کہ وہ گلاس میں تاڑی ہی پی رہا ہے۔ چوکیدار کے قریب ہوتے ہوئے بولی

"یہ محل میں رہتا کہاں ہے رے؟" چوکیدار نے کڑوا سا منہ بنا کر کہا۔

"اری تجھے اس سے کیا' چاہے جہاں بھی رہے۔" منگلی نے مسکرا کر کہا۔

"یہ تو اپنی میم کے ساتھ رہتا ہو گا۔" چوکیدار نے شارل کو گالی دی اور بولا۔

"سالا بڑا بدمعاش ہے۔ وہ سامنے جو اوپر والی منزل ہے کونے میں گول کمرہ دیکھ رہی ہو نا اس میں رات کو سوتا ہے۔ ساری رات وہاں اودھم مچا رہتا ہے۔ انگریزی گانوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔" منگلی مزید تصدیق کرنا چاہتی تھی۔

"سنا ہے یہ جموں میں راجہ کی حویلی میں کسی کا خون کر کے آیا ہے؟" چوکیدار چونکا۔

"تجھے ان باتوں سے کیا لینا ہے ری تو تو مجھے سی آئی ڈی والی لگتی ہے۔" تب منگلی نے دل پر پتھر رکھ کر چوکیدار کی گردن میں بازو ڈال دیا۔

"مجھے کیا لینا ہے۔ مجھے تو گاؤں میں کسی نے بتایا تھا کہ راجہ کی حویلی سے ایک گورا خون کر کے بمبئی چلا گیا ہے۔"

چوکیدار بھول گیا کہ وہ کیا بات کر رہا تھا۔ منگلی کے دوبارہ پوچھنے پر بولا۔

"ہاں ہاں یہ وہی گورا بدمعاش ہے۔ شالا نام ہے اس کا.... نام تو شاید کچھ اور ہے مگر یہاں سب اسے شالا صاحب ہی کے نام سے جانتے ہیں۔" منگلی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے میں تو بھول ہی گئی تھی میری ایک سہیلی بھی میرے ساتھ بمبئی آئی ہوئی ہے۔ وہ بے چاری سرائے میں میری راہ دیکھ رہی ہو گی۔ چلتی ہوں شاید میرا آدمی بھی وہاں پہنچ گیا ہو گا۔ یہاں آئے تو اسے یہیں بٹھا لینا۔" چوکیدار اسٹول پر بیٹھا ہکا بکا ہو کر منگلی کو تک رہا تھا۔ منگلی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میں رات کو دس بجے کے بعد آؤں گی۔ میری سہیلی بھی میرے ساتھ ہو گی تم یہاں اکیلے ہی ہونا۔ کسی دوسرے کو ہر گز نہ آنے دینا۔ نہیں تو ہم الٹے قدم واپس

چلی جائیں گی۔"

"میں اکیلا ہی ہوں گا۔ اکیلا ہی ہوں گا۔" چوکیدار بڑبڑاہٹ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا اور منگلی کٹیا سے نکل کر جا چکی تھی۔

گوردوارے میں آتے ہی اس نے شیرنی کو ساری کہانی بیان کر دی فوراً انہوں نے رات کے وقت شارل کو قتل کرنے کا پروگرام ترتیب دے دیا۔ چوکیدار کی مدد سے وہ دونوں شارل کے کمرے میں پہنچ سکتی تھی۔ شیرنی اور منگلی کو یقین تھا کہ جو حلیہ چوکیدار نے بیان کیا ہے وہ شارل کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ بہرحال یہ ایک چانس تھا۔ وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ منگلی کہنے لگی۔

"مجھے تو سو فیصد یقین ہے کہ یہ گورا شارل ہی ہے۔ اگر شارل نکلا تو وہ ہمارے ہاتھ سے بچ کر نہیں نکل سکے گا۔ اگر کوئی دوسرا گورا ہوا تو ہم ایک بار پھر اپنی خونی مہم کا آغاز کریں گی۔"

شیرنی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ اس کے باپ کا قاتل شارل ہی ہے۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی غیبی طاقت اس کے کان میں آ کر سرگوشی کر رہی ہے کہ یہ تمہارے باپ کا قاتل ہی ہے۔ اس سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لو۔ شیرنی نے خنجر منگلی کو دے دیا اور خود پستول بھر کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اب وہ بیتابی سے رات ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔ جب بمبئی شہر کے سمندر میں سورج غروب ہو گیا اور شہر کی عمارتیں روشنیوں سے جگمگانے لگیں تو ان دونوں نے گوردوارے کے لنگر سے کھانا کھایا۔ کوٹھری میں بیٹھ کر ایک بار پھر اپنے منصوبے پر غور کرنے لگیں۔ جب رات کے دس بج گئے تو وہ اپنے اپنے ہتھیار کپڑوں میں چھپا کر گوردوارے سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھیں اور راج محل کی طرف روانہ ہو گئیں۔

ادھر چوکیدار بھی ان دونوں کے آنے کی خوشی میں تاڑی کے مزید دو گلاس چڑھا چکا تھا۔ گیٹ رات کو نو بجے بند کر دیا جاتا تھا۔ اس کی رات کو ڈیوٹی ہوتی تھی اور وہ اس دوران دو تین بار سڑک پر آ کر دیکھ چکا تھا۔ آخر اسے دو عورتیں گیٹ کی طرف آتی نظر آئیں وہ جلدی سے ان کے پاس گیا۔ اس نے منگلی کو پہچان لیا ساتھ میں دوسری عورت کو

دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر خوشی سے پھول گئے۔

"ادھر آ جاؤ۔ ادھر۔" وہ ان کو لے کر تیزی سے اپنی کٹیا کی طرف چل پڑا۔ اس کے چلنے کے انداز سے شیرنی اور منگلی نے اندازہ لگا لیا کہ وہ چڑھائے ہوئے ہے۔ شیرنی نے منگلی کے کان میں سرگوشی کی۔

"اس کی کٹیا میں جاتے ہی اپنی کہانی شروع کر دینا۔" منگلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کٹیا میں چوکیدار نے بڑی صاف ستھری چادر چارپائی پر بچھائی ہوئی تھی۔ چائے سے بھری ہوئی کیتلی اور دو شیشے کے گلاس صاف کر کے اسٹول پر رکھے تھے۔

"لو پہلے چائے پی لو۔" اس نے گلاس میں چائے ڈال کر منگلی اور شیرنی کو دی۔

"تمہاری سہیلی بھی بڑی خوبصورت ہے۔" شیرنی نے چوکیدار کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھا۔ چوکیدار نے جلدی سے آنکھیں دوسری طرف کر لیں اور منگلی سے کہنے لگا۔

"میری جان! تمہارے آدمی کا کیا بنا۔" منگلی نے بے نیازی سے کہا۔

"گولی مارو میرے آدمی کو۔ اب تو تم ہی میرے آدمی ہو۔" چوکیدار کے کانوں سے تو خوشی سے جیسے دھواں نکلنے لگا۔ جلدی سے گلاس نیچے رکھ کر بیڑی سلگائی۔ دو کش لیے اور بولا۔

"اری کیوں نہیں۔ ہم تو تمہاری سہیلی کے بھی آدمی ہیں۔ یہ تو بالکل مدھو بالا ہے مدھو بالا۔ تمہیں اسٹوڈیو میں مدھو بالا سے بھی ملاؤں گا۔ اری وہ تو ہر ہفتے یہاں راج محل میں آتی ہے۔ اپنی بڑی دوست ہے۔"

منگلی اور شیرنی تھوڑا سا مزید وقت گزار دینا چاہتی تھیں۔ منگلی نے چوکیدار کو باتوں میں لگا لیا تھا۔ جب چوکیدار نے ذرا آگے بڑھنے کی کوشش کی تو منگلی نے کہا۔ "پہلے ہمیں راج محل کی سیر کراؤ۔" چوکیدار بولا۔

"اب تو رات ہو گئی ہے۔ رات کے وقت تو باہر کے کسی آدمی کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ دیکھو۔ گیٹ پر تالا لگا کر چابی میں نے اپنی جیب میں رکھی ہوئی ہے۔" شیرنی نے کہا۔

"یہ چابی مجھے دے دو۔" چوکیدار بولا۔

"توبہ کرو۔ یہ تو چابی میں کسی کو نہیں دے سکتا۔"

شیرنی نے بڑے آرام سے ڈوگرہ چوکیدار کی گردن پر دائیں جانب سے زور دار ہاتھ مارا۔ وہ پیچھے کو گرا۔ منگلی نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ بے چارہ تاڑی کی وجہ سے پہلے ہی مدہوش تھا۔ شیرنی کی ضرب نے اسے مزید نیم جاں کر دیا تھا۔ انہوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے بعد چارپائی پر لیٹا کر رسی سے باندھ دیا۔

چابی شیرنی کے ہاتھ میں تھی۔ کٹیا کی بتی کو بجھا دیا۔ منگلی نے خنجر کے دستے پر ایک ہاتھ قمیص کے اندر سے رکھ لیا۔ شیرنی کا دایاں ہاتھ پہلے ہی پستول پر تھا وہ راج محل کے احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اندھیرے میں چلتی گیٹ تک آئیں۔ شیرنی نے دائیں بائیں دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے منگلی کو اشارہ کیا۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ شیرنی نے چابی لگا کر گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا۔ دونوں تیزی سے احاطے میں داخل ہو گئیں۔ دروازہ پیچھے سے بند کر دیا گیا۔ منگلی آگے آگے تھی۔ جدھر اندھیرا تھا ادھر سے ہو کر برآمدے میں آئیں تو سامنے جہاں روشنی میں گول کمرے کی دیوار دوسری طرف گھوم جاتی تھی ادھر سے کچھ آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک بند گاڑی اسٹارٹ ہو کر روشنی میں آئی تو منگلی نے شیر خان کے قاتل شارل کو دیکھا۔ وہ گاڑی میں سوار ہو رہا تھا۔ گاڑی کی چھت پر دو سوٹ کیس لدے ہوئے تھے۔ منگلی نے بے اختیار کہا۔

"شارل۔ یہی تمہارے باپ کا قاتل ہے۔"

شیرنی نے پستول کی نالی اس کی طرف کی ہی تھی کہ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ منگلی نے شیرنی کا ہاتھ نیچے کر دیا۔

"ٹھہر جاؤ۔" اس نے سرگوشی کی۔ گاڑی شارل کو لے کر گیٹ کی طرف بڑھی۔" دو نوکر گیٹ کی طرف دوڑے انہوں نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی گیٹ سے نکل گئی۔ شیرنی نے منگلی کو ایک طرف کھینچا۔ منگلی نے شیرنی کے ہاتھ کو زور سے دباتے ہوئے کہا۔

"صبر کرو صبر کرو۔" ایک جیپ پیچھے سے آ کر رکی۔ ڈرائیور نے چلا کر کہا۔

"سامان پورا رکھ دیا صاحب کا۔" اوپر سے کسی نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں رکھ دیا ہے۔ جلدی سے صاحب کے پیچھے پیچھے جاؤ۔" شیرنی چھلانگ لگا کر

احاطے کی دیوار کی طرف دوڑی۔ منگلی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ شیرنی کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑی۔ شیرنی گیٹ سے باہر نکلی۔ شیرنی کے پستول سے ایک فائر ہوا۔ گولی ڈرائیور کے سر پر لگی اور جیپ ایک طرف کو گھوم کر رک گئی۔

شیرنی نے دوڑ کر ڈرائیور کی لاش کو سیٹ پر سے باہر پھینکا اور منگلی سے کہا۔

"بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ۔" منگلی لپک کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شیرنی نے اسٹیرنگ سنبھالا اور جیپ کو جتنی تیزی سے چلا سکتی تھی چلا کر وہاں سے نکال کر لے گئی۔ وہ چھوٹی سڑک پر پوری رفتار سے جیپ کو بھگائے لیے جا رہی تھی۔ یہ سڑک ختم ہوئی۔ بڑی سڑک آ گئی۔ یہاں اسے دور شارل کی گاڑی کی پچھلی لال بتیاں نظر آنے لگیں۔

"یہ اسی کی گاڑی ہے۔" شیرنی نے کہا۔

"ہاں۔" منگلی نے تائید کی۔

منگلی ابھی تک اپنے حواس کو سمیٹ نہ سکی تھی۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا۔ شیرنی کی خونخوار آنکھیں سڑک پر دور سے نظر آتی سرخ بتی پر جمی تھیں جو اب آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ منگلی نے کہا۔

"اپنی گاڑی کی بتیاں بجھا دو۔" شیرنی نے جیپ کی ہیڈ لائیٹس بجھا دیں۔ اس نے گاڑی کو ایک فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔

"یہ کہاں جا رہا ہے۔" شیرنی بڑبڑائی۔ منگلی کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"کچھ پتا نہیں۔ شاید یہ ہوائی جہاز پر کہیں جا رہا ہے۔" شیرنی کو سمندر کی مرطوب ہوا آنے لگی۔

"یہ سمندر کی طرف جا رہا ہے۔" منگلی کو دور کچھ روشنیاں دکھائی دیں جن کا عکس پانی میں پڑ رہا تھا۔ شیرنی سمجھ گئی کہ شارل کسی بحری جہاز پر سوار ہونے والا ہے اس نے یہ بات منگلی کو بھی بتا دی اور کہا۔

"میں اسے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے ہلاک کرنا چاہتی ہوں۔" منگلی نے کہا۔

"ہمیں احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ شارل کے باڈی گارڈ اس کے ساتھ ہیں۔" شیرنی نے غصیلی آواز میں کہا۔

"احتیاط کس چیز کی احتیاط' میں اپنی جان موت کے حوالے کر کے اپنے باپ کے قاتل کو ہلاک کرنے آئی ہوں۔"

شارل کی گاڑی سمندر کی طرف مڑ گئی۔ شیرنی نے اپنی جیپ کی رفتار ہلکی کر دی شارل کو ایک بار اپنے پیچھے سڑک پر کسی گاڑی کی روشنی دکھائی دی تھی۔ مگر پھر غائب ہو گئی تھی ۔ اس کے تو وہم میں بھی یہ بات نہیں تھی۔ کہ شیر خان کی بیٹی اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے اس کے تعاقب میں ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے پچھلی سیٹ پر پھیل کر بیٹھا تھا۔ ایک باڈی گارڈ اگلی سیٹ پر تھا اور دوسرا اس کے پاس ہی........ رائفل تھامے بیٹھا تھا۔ شارل کا ذاتی اسٹیمر سمندر میں لکڑی کے تختوں والی جیٹی کے ساتھ لگا تھا جس کے اوپر والے کیبن میں روشنی ہو رہی تھی۔ شارل کی گاڑی جیٹی پر چڑھ گئی اور اسٹیمر کے پاس آکر رک گئی۔ اسٹیمر میں سے دو آدمی جیٹی پر آ گئے۔ بھاری بھرکم شارل گاڑی سے نکلا باڈی گارڈ اس کے دائیں بائیں تھے۔ وہ تیز قدم اٹھاتا سیڑھی چڑھ کر اسٹیمر میں چلا گیا۔ شیرنی اور منگلی نے اسے اسٹیمر کے اندر جاتے دیکھ لیا تھا۔ شیرنی کی جیپ اندھیرے ساحل سمندر کے پام کے درختوں کے پیچھے کھڑی تھی۔ منگلی کہنے لگی ۔

"اگر یہ اب ہاتھ سے نکل گیا تو پھر....." شیرنی نے جیپ میں سے اترتے ہوئے کہا۔

"وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کی موت آ گئی ہے۔" میرے ساتھ آؤ۔ ہم پچھلی طرف سے اسٹیمر پر چڑھنے کی کوشش کریں گی۔"

سائیلنسر والا پستول شیرنی کے پاس تھا۔ منگلی کے پاس صرف خنجر ہی تھا۔ وہ اندھیرے میں چھپ کر چلتیں جیٹی سے آگے نکل کر اس جگہ آ گئیں جہاں سمندر میں چھوٹی چھوٹی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ پانی میں اتر گئیں۔ سمندر کی موجیں انہیں پیچھے دھکیلنے لگیں۔ شیرنی اور منگلی چٹانوں کا سہارا لیتے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ پانی ان کے کاندھوں تک آ گیا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اسٹیمر کے قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ اسٹیمر کے عقب میں صرف ایک بتی جل رہی تھی اور لنگر کی آہنی زنجیر صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ اب منگلی اور شیرنی سمندری لہروں میں تیر رہی تھیں۔ یہاں سمندر کا پانی گہرا تھا۔ شیرنی نے لنگر کی زنجیر کی طرف اشارہ کیا۔ منگلی اس کے پیچھے تیرتی چلی آ رہی تھی۔

شیرنی اس طرح تیر رہی تھی کہ پانی میں آواز پیدا نہ ہو اس نے لپک کر لنگر کی زنجیر کو پکڑ لیا اور پھر آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگی۔ اسٹیمر کوئی بڑا بحری جہاز نہیں تھا۔ سمندر کی سطح سے زیادہ سے زیادہ ایک منزل بلند ہو گا۔ شیرنی نے عرشے کے جنگلے میں سے سر نکال کر ڈیک کے کاریڈار کو دیکھا۔ وہاں کوئی آدمی اسے نظر نہ آیا۔ وہ عرشے پر چڑھ گئی۔ اس کے پیچھے منگلی بھی جنگلے کو پکڑ کر عرشے پر آ گئی۔ دونوں جھکی جھکی چلتیں اس زینے کے پاس آکر بیٹھ گئیں جو نیچے جاتا تھا اور جس کے اوپر آدھی چھت پڑی ہوئی تھی۔ شیرنی نے پستول ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس نے منگلی کو اشارہ کیا اور خاموشی سے زینہ اتر گئی۔ یہاں ایک کیبن تھا جہاں پٹرول یا ڈیزل آئل کے دو بڑے ڈرم دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ سامنے چھوٹا سا تنگ دروازہ تھا۔ جس میں سے ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ ادھر سے کسی کے گانا گاتے ہوئے کیبن میں آنے کی آواز سنائی دی۔ منگلی اور شیرنی تیزی سے تیل کے ڈرموں کے پیچھے ہو گئیں۔ ایک ملاح گنگناتا ہوا کیبن میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا وہ کونے میں رکھی لوہے کی الماری کی طرف گیا۔ وہاں سے کوئی بوتل اٹھائی اور گلاس میں مشروب انڈیلا۔ اسے حلق میں ڈالا۔ مزے سے سر کو ہلایا اور باہر نکل گیا۔ کیبن خالی ہو گیا۔ منگلی نے سرگوشی میں کہا۔

"ہمیں اوپر والے کیبن میں جانا ہے۔ شارل وہیں ہو گا۔"

شیرنی کا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اچانک گڑ گڑ گڑ کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی اوپر سے لنگر کھینچا جانے لگا۔ منگلی نے کہا:"اسٹیمر چلنے والا ہے؟"

شیرنی نے شدت جذبات میں آکر پستول کی نالی منگلی کی گردن سے لگا دی اور غضبناک سرگوشی میں کہا۔

"چپ رہو۔ مت بولو۔" اسٹیمر چل پڑا تھا۔ وہ ساحل سے ایک طرف گھوما اور پھر خاص رفتار کے ساتھ سمندر میں روانہ ہو گیا۔ منگلی نے برا نہ منایا۔ وہ شیرنی کی ذہنی کیفیت سے واقف تھی۔ شیرنی نے اپنے قریب پڑے ہوئے کین کو اٹھا کر سونگھا اس میں پیٹرول تھا۔ شیرنی نے ڈبے کا سارا پیٹرول تیل کے دونوں ڈرموں کے پاس اور سامنے والی دیوار پر انڈیل دیا۔ منگلی نے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ جانتی تھی کہ شیرنی کچھ سوچ سمجھ کر ہی ایسا

کر رہی ہے۔ لیکن ایک بات کا اسے یقین ہو گیا تھا کہ شیرنی اپنی زندگی کی بازی لگا چکی ہے۔ منگلی کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ خود مرکر بھی شارل کو مار ڈالنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

کیبن میں پیٹرول کی بو پھیل گئی۔ یہ بو کیبن سے نکل کر اوپر بھی جا سکتی تھی۔ شیرنی نے منگلی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں دبے پاؤں کیبن کے چھوٹے سے دروازے سے باہر کاریڈار میں نکل آئیں یہ نچلے ڈیک کا کاریڈار تھا۔ آگے پھر ایک زینہ تھا۔ شیرنی زینہ چڑھ کر اوپر جانے والے کیبن میں جانا چاہتی تھی۔ جونہی وہ زینے کی طرف بڑھی اوپر سے کوئی نیچے اتر رہا تھا۔ شیرنی اور منگلی جلدی سے پیچھے ہٹ گئیں۔ مگر وہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ وہ دوڑ کر واپس کیبن میں چلی جاتیں۔ ملاح نیچے آگیا۔ ابھی وہ شیرنی اور منگلی کی طرف مڑا ہی تھا کہ شیرنی کے پستول میں سے خاموش فائر ہوا۔ گولی ملاح کے سینے سے پار ہو گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ پیچھے کو گرا۔ منگلی نے شیرنی کو پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔

"کیبن والے تیل کو آگ لگا دیتے ہیں۔ اس طرح لوگ ادھر کو دوڑیں گے۔ ہمیں اوپر والے کیبن میں جانے کا موقع مل جائے گا۔"

شیرنی نے اپنی چادر پھاڑ کر اس کو آگ لگائی اور کیبن میں پھینک دیا۔ کیبن میں پیٹرول پہلے سے پھیلا ہوا تھا۔ فوراً آگ لگ گئی۔ شیرنی اور منگلی تیزی سے زینہ چڑھ کر اوپر ڈیک پر پہنچ گئیں۔ اسٹیمر کھلے سمندر میں چلا جا رہا تھا۔ نیچے کیبن میں ایک دھماکہ ہوا اور اسٹیمر کے پچھلے حصے کو آگ لگ گئی۔ اسٹیمر پر شور مچ گیا۔ ملاح ادھر ادھر سے نکل کر آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگے۔

شیرنی نے منگلی کو دوسری طرف سے آنے کا اشارہ کیا اور خود اس کیبن کی طرف دوڑی جہاں روشنی ہو رہی تھی اوز جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس کے باپ کا قاتل اندر ہی ہو گا۔ اسٹیمر کے نچلے کیبن میں لگی ہوئی آگ کے شعلے اب اوپر عرشے تک آگئے تھے۔ شارل اس وقت اپنے خاص کیبن میں داد عیش میں مصروف تھا کہ شور سن کر وہ باہر نکل آیا۔ جونہی وہ باہر آیا شیرنی نے اس پر اوپر تلے دو فائر کیے ایک گولی شارل کے کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ دوسری اس کے سر کے ایک انچ اوپر سے نکل گئی۔ شارل

نے پستول نکال کر اپنے باڈی گارڈ کو آواز دی۔ وہ چھلانگ لگا کر کیبن میں واپس گھسا اور کیبن کی دوسری طرف آکر پیچھے فائرنگ شروع کر دی۔ اسٹیمر رک گیا تھا اور آگ اوپر والے ڈیک کو نگلنے لگی تھی۔ دو ملاح آگ بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ شیرنی نے جیب سے میگزین نکال کر پستول میں بھرا اور شارل کا سر باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔ آگ کے شعلوں کی روشنی میں وہ اب دیکھی جا سکتی تھی۔ مگر منگلی پیچھے خنجر لے کر کھڑی اس کی نگرانی کی رہی تھی۔

شارل حیران تھا کہ یہ کون دشمن ہے جو سب لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسٹیمر میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے باڈی گارڈ زینے پر سے اوپر آگئے۔ وہ اندھا دھند فائر کرنے لگے۔ شارل نے انہیں چلا کر کہا۔

"کاریڈار میں پیچھے سے آؤ۔ دشمن اوپر ہے۔"

شیرنی نے بمبئی کی زبان میں بولا ہوا یہ جملہ سنا تو منگلی کو اشارہ کیا۔ منگلی عقب سے ہو کر کیبن کی چھت پر چڑھ گئی۔ شیرنی عرشے پر کیبن کی دیوار کے ساتھ چمٹ کر آگے رینگنے لگی۔ جونہی ایک گارڈ شیرنی کے پیچھے آیا اوپر سے منگلی نے اس کی گردن پر خنجر کا کاری وار کیا۔ خنجر نے گارڈ کی آدھی گردن کاٹ ڈالی وہ بے دم ہو کر نیچے گرا۔ منگلی نے نیچے چھلانگ لگا کر اس کی رائفل قبضے میں کی اور پیچھے اس گارڈ پر فائر جھونک دیا جو اپنے ساتھی کو گرتا دیکھ کر اس کی طرف بڑھا تھا۔ دوسرا گارڈ گولی کھا کر سیڑھیوں پر سے پیچھے کی طرف بھڑکتے شعلوں میں جا کر گرا اور اس کی بھیانک چیخ آگ کے شعلوں نے نگل لی۔ شیرنی اور منگلی شارل کے کیبن کی طرف دوڑیں مگر وہاں شارل نہیں تھا۔ آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ شعلے اب درمیانی کیبن تک آگئے تھے۔ ملاح سمندر میں چھلانگیں لگا کر ساحل کی طرف تیر کر پہنچنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ شیرنی نے منگلی کو ہاتھ سے دوسری طرف جانے کا اشارہ کیا۔ اب شیرنی نیچے جانے والے زینے کے قریب پستول لیے بیٹھی تھی اور منگلی کیبن کے قریب جھکی ہوئی پیچھے دیکھ رہی تھی کہ کوئی آدمی پیچھے سے آکر نہ حملہ کر دے۔ مگر وہاں اوپر والے ڈیک پر اب کوئی ملاح نہیں تھا۔ شارل نچلے کیبن میں بھری ہوئی شاٹ گن لیے آہستہ آہستہ زینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کیونکہ آگ کی تپش کیبن کی

دیواروں تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے یہ تو دیکھ لیا تھا کہ دو عورتیں اس کو ہلاک کرنے کی کوشش میں ہیں اور انہوں نے ہی اسٹیمر کو آگ بھی لگائی ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان عورتوں سے اس کی کیا دشمنی تھی۔

شارل نے لائف بیلٹ پہن لی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح وہ فائرنگ کرتا اوپر جائے اور اسٹیمر کے ڈیک سے سمندر میں چھلانگ لگا دے۔ شیرنی کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ شارل زیادہ دیر تک نیچے نہیں ٹھہرے گا۔ کیونکہ آگ وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ اسٹیمر میں پیچھے ایک اور دھماکہ ہوا اور وہ ایک طرف کو جھک گیا۔ شیرنی اور منگی نے ڈیک کے جنگلے کو پکڑ لیا۔ عین اس وقت شارل اندھا دھند فائر کرتا اوپر نکل آیا جونہی اس نے سمندر میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی ایک طرف سے شیرنی اور دوسری طرف سے منگی کی گولیاں اس کے جسم سے پار ہو گئیں۔ شارل لڑکھڑا کر گرا۔ شیرنی نے ایک نعرہ لگایا۔ اور جوش میں آکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شارل ابھی زندہ تھا۔ ابھی اس میں اتنی سکت باقی تھی کہ وہ اپنی شاٹ گن کا ٹریگر کم از کم ایک بار دبا سکتا۔

جونہی شیرنی اس کے سامنے کھڑی ہوئی شارل نے شاٹ کو اونچا کیا اور ٹریگر دبا دیا شیرنی پیچھے کو گر پڑی۔ اس کے پیٹ کا ایک حصہ دائیں جانب سے اڑ گیا تھا۔ منگی کے حلق سے بھیانک چیخ نکل گئی۔ اس نے رائفل پھینک دی اور خنجر نکال کر شارل پر ٹوٹ پڑی اور اس کے مردہ جسم پر پے در پے وار کر کے ٹکڑے کر دیے۔

ایک اور دھماکہ ہوا یہ دھماکہ پہلے دھماکوں سے سب سے زیادہ بھیانک تھا۔ اس دھماکے نے اسٹیمر کے ٹکڑے اڑا دیے۔ یہ ہمہ گیر تباہی اور موت کا آخری دھماکہ تھا جس نے دوست اور دشمن کے امتیاز کو بھی ختم کر دیا۔ نہ دوست باقی رہا۔ نہ دشمن باقی بچا۔ قتل کرنے والے بھی مر گئے۔ قتل ہونے والے بھی مر گئے۔ سمندر کی بلند موجیں اٹھ اٹھ کر اسٹیمر کے جلتے ہوئے باقی ماندہ ٹکڑوں کے شعلوں کو نگلنے لگیں۔ آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے اسٹیمر کے تمام ٹکڑے سمندر میں غرق ہو گئے۔ ساتھ ہی دوستوں اور دشمنوں کی لاشوں کے ٹکڑے بھی غرق ہو گئے۔ نہ شارل رہا، نہ منگی رہی، نہ شیرنی رہی۔ سمندر ان سب کو بہا لے گیا۔ پھر سمندر پر ایک گہرا سکوت چھا گیا۔ کھلے سمندر میں موجیں اپنے آپ اوپر

نیچے ہو رہی تھیں۔ اور پھر جب مشرق سے سورج کی سنہری کرنوں نے طلوع ہو کر سمندر کو دیکھا تو وہاں سوائے چند ایک تیرتے ہوئے جلے بجھے تختوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ جنہیں سمندر کی موجیں نہ جانے کن منزلوں کی طرف بہائے لیے جا رہی تھیں۔ شارل کہیں قتل ہوا تھا۔ اسٹیمر کہیں غرق ہوا تھا اور اس کے ٹکڑے نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آئے تھے۔

مگر شیرنی کی بچی کھچی لاش اسی جگہ سمندر کی تہہ میں پتھروں اور سنگ ریزوں کے درمیان پڑی تھی۔ یہاں کسی وجہ سے ہلکا سا تموج پیدا ہوتا تو شیرنی کی لاش اوپر نیچے ہو کر پھر ساکت ہو جاتی ہے۔ منگی کی لاش کا کچھ پتا نہیں تھا پھر مشرق کی طرف سے نہ جانے کہاں سے سفر کرتی ہوئی ایک پر اسرار لہر آئی جو سمندر کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اس نے شیرنی کی لاش کو جیسے آگے کو دھکیل دیا اور شیرنی کی لاش آہستہ آہستہ سمندر کی تہہ میں نیچے ہی نیچے ایک طرف سے بہنے لگی۔ یہ کون سی لہر تھی یہ کونسی پر اسرار طاقت تھی جو شیرنی کی لاش کو ایک خاص زیر آب سمندری چٹان کی کھوہ کی طرف لیے جا رہی تھی۔

چٹان کے پتھروں میں پہلے سے ایک لاش کا ڈھانچہ اٹکا ہوا تھا۔ گوشت مچھلیاں کھا گئیں تھیں۔ ہڈیاں نہ جانے کس طرح باقی رہ گئی تھیں۔ شاید اسی لیے کہ ان ہڈیوں کو اپنے جگر گوشے کا انتظار تھا۔ یہ ڈھانچہ شیرنی کے باپ شیر خان کی لاش کا ڈھانچہ تھا۔ جو لاش کی صورت میں ڈوگرہ راج کی حویلی سے پہاڑی نالے میں پھینکا گیا اور جسے پہاڑی نالے کا تیز رفتار پانی بہاتا ہوا جموں توی کے دریا میں لے گیا اور پھر دریا نے اسے سمندر کے حوالے کر دیا۔ گوشت سمندری مخلوق کی نذر ہو گیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی تھا اس کا بھی ہاتھ کہیں کسی پتھر سے اٹکا تو وہیں رہ گیا۔ پاؤں کہیں الگ ہو گیا۔ صرف ڈھانچے کی وہ ہڈیاں باقی بچی رہ گئی تھیں جن کے اندر کبھی بیٹی کی محبت سے بھرا ہوا دل دھڑکا کرتا تھا۔ ان ہڈیوں پر مونگے چمٹ گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ پتھر بن رہی تھیں۔ مگر ان پتھر کی تہوں کے نیچے بیٹی کے پیار کی شعاعیں اسی طرح نکل رہی تھیں اور اپنی بیٹی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کی جستجو میں تھیں اور پھر جب شیرنی کی لاش سمندر کی تہہ میں آکر بیٹھ گئی تو ان شعاعوں میں جیسے طوفان بپا ہو گیا۔ ایسا طوفان جو زمین پر اس وقت پیدا ہوا تھا۔ جب اس کی

فضاؤں میں چھائے ہوئے دھوئیں اور گیسوں کے سیاہ کالے بادل چھٹ گئے تھے اور زمین نے پہلی بار سورج کو دیکھا تھا۔ محبت۔ مامتا۔ شفقت کی انتہا۔ اولاد کی محبت کی ان شعاعوں کے چاند سورج ستارے تھے جو شیرنی کی لاش کے پاس سمندر کی لہریں بن کر جا پہنچے اور اسے اپنی آغوش میں لے کر چل پڑے۔ یہ دلہن کا اپنے بابل کے گھر کی طرف واپسی کا سفر تھا۔ ستاروں ایسی مچھلیاں شیرنی کی لاش کے اوپر رقص کر رہی تھیں۔ لہریں اسے آہستہ آہستہ اپنے باپ کی ہڈیوں کے پاس لے جا رہی تھیں۔ اور پھر........ پھر شیرنی کی لاش بیٹی کی لاش کا سر اس باپ کی لاش کے سینے کے پنجر کے ساتھ آ کر لگ گیا۔

بیٹی باپ سے مل گئی۔ سورج سے بچھڑی ہوئی کرن اپنے سورج کے ساتھ آن ملی۔

بیٹی کی ڈولی جا رہی ہے۔ باپ کی آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں۔

مت رو بابل! مت رو بابل!

بیٹیوں کے دکھ بڑے ہوتے ہیں۔